نگہ راز این ورق روشن سواد جلوہ خوانی کن

لسان الملک

جلد ۱ — بابتہ ماہِ ستمبر ۱۹۲۳ء — نمبر ۳

ایڈیٹر

سید محمد ضامن کنتوری

جائنٹ ایڈیٹر

سید منظر علی اشہر

دفترِ لسان الملک

دلاور گنج حیدرآباد دکن سے شایع ہوا

قیمت سالانہ ۵ر

قیمت ششماہی ۳ر

فی پرچہ ۸ر

۱۹۵۲ ۱۳۵۱ ف

ضوابط

(۱) لسان الملک خالص ادبی رسالہ ہے اسمیں کوئی ایسا مضمون شایع نہ ہوگا جو سیاست حاضرہ یا مباحث مذہبی سے متعلق ہو۔

(۲) رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں چھپ کر خریداروں کی خدمت میں پہنچے گا اگر کوئی پرچہ بروقت نہ پہنچے تو اندرون ماہ اطلاع دینے پر دوسرا پرچہ بلاقیمت گزرانا جائے گا۔

(۳) کسی صاحب کے نام پر رسالہ بغیر پیشگی قیمت وصول ہونے کے جاری نہ کیا جائیگا قیمت سالانہ (صہ) ششماہی (سے) معہ محصولڈاک اور فی پرچہ ۸ر علاوہ محصولڈاک۔

(۴) مضمون نگار حضرات سے استدعا ہے کہ جملہ مضامین بخط واضح تحریر فرمائے جائیں تاکہ کتابت و تصحیح کیوقت دقت نہو۔

(۵) جملہ خط وکتابت و ترسیل زرچندہ وغیرہ بنام اڈیٹر رسالہ ہونی چاہیے۔

جلد (۱) نمبر (۱) بابتہ ماہ جولائی سنہ ۱۹۲۳ عیسوی

ضوابط

(۱) لسان الملک خالص ادبی رسالہ ہے اسمیں کوئی ایسا مضمون شایع نہ ہوگا جو سیاست حاضرہ یا مباحث مذہبی سے متعلق ہو۔

(۲) رسالہ ہر انگریزی مہینے کے پہلے ہفتہ میں چھپ کر خریداروں کی خدمت میں پہنچے گا اگر کوئی پرچہ بروقت نہ پہنچے تو اندرون ماہ اطلاع دینے پر دوسرا پرچہ بلا قیمت گزرانا جائے گا۔

(۳) کسی صاحب کے نام پر رسالہ بغیر پیشگی قیمت وصول ہونے کے جاری نہ کیا جائیگا قیمت سالانہ (ﻋﮧ) ششماہی (ﻋﮯ) مع محصولڈاک اور فی پرچہ ۸ر علاوہ محصولڈاک۔

(۴) مضمون نگار حضرات سے استدعا ہے کہ جملہ مضامین بخط واضح تحریر فرمائے جائیں تاکہ کتابت و تصحیح کیوقت دقت نہو۔

(۵) جملہ خط و کتابت و ترسیل زرچندہ وغیرہ بنام اڈیٹر رسالہ ہونی چاہیے۔

جلد (۱) نمبر (۱) بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۳ء عیسوی

بزم لِسَانُ الملکؒ

حضرات محترم! لسان الملک کا پہلا نمبر آپ کی جوہر شناس نگاہوں کے سامنے پیش ہو رہا ہے، امید ہے کہ یہ نقش اول ہی قارئین کرام کی توجہ منعطف کئے بغیر نہ رہے گا اور اپنی سفارش آپ کرلے گا۔ ہم اون معاصرین و احباب کے تہ دل سے مرہون منت ہیں جنہوں نے اشاعت رسالہ سے پہلے ہی محض ہمارے اعتبار پر اوسکا خیر مقدم مخلصانہ اور حوصلہ افزا الفاظ میں فرمایا ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ لسان الملک کی پہلی ہی اشاعت میں ہمکو اپنے بعض قدیم عنایت فرماؤں کی خدمت میں ہدیہ مختصر تبریک پیش کرنے کا موقعہ ہاتھ آگیا جنکو بارگاہ خسروی سے بہ تقریب عقد ہمایونی اس ماہ میں خطابات جنگی سرفراز ہوئے ہیں لہذا ہم اون کی خدمات گرامی میں دلی مسرت کیساتھ مبارکباد پیش کرتے ہیں :۔

(۱) نواب فخر یار جنگ بہادر معتمد فینانس (۲) نواب اکبر یار جنگ بہادر معتمد عدالت وکوتوالی وامور عامہ (۳) نواب کرامت جنگ بہادر معتمد تعمیرات شاخ عام (۴) نواب مسعود جنگ بہادر ناظم تعلیمات (۵) نواب محمد نواز جنگ بہادر صدر ناظم کوتوالی اضلاع (۶) نواب علی نواز جنگ بہادر معتمد آبپاشی (۷) نواب احمد نواز جنگ بہادر معتمد نوآبادیات (۸) نواب سراج یار جنگ بہادر و (۹) نواب ضیاء یار جنگ بہادر و (۱۰) نواب جیون یار جنگ بہادر و (۱۱) نواب فاروق یار جنگ بہادر ارکان مجلس عالیہ عدالت سرکار عالے

مجلس تقدم العلوم

ادارۂ مجلس

(۱) رئیس (پریسیڈنٹ) نواب حیدر نواز جنگ بہادر محمد اکبر نذر علی حیدری صاحب۔

(۲) قایم مقام رئیس (وایس پریسیڈنٹ) نواب مہدی یار جنگ بہادر سید مہدی حسین صاحب بلگرامی۔ ام۔ اے (اکسن)

(۳) ناظم (ڈائرکٹر) ڈاکٹر ناظر الدین حسن صاحب ام۔ اے۔ ال۔ ال۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا۔

(۴) نائب رئیس (اسسٹنٹ پریسیڈنٹ) مولوی محمد عنایت اللہ صاحب بی۔ اے۔

(۵) معتمد۔ علّامہ سید مختار احمد صاحب مُخطّط اسلامی (ٹوپاگرافر)

(۶) شریک معتمد۔ مولوی سید وقار احمد صاحب وقّار۔

(۷) نائب معتمد۔ الف۔ مولوی سید غلام مصطفےٰ صاحب ذہین (ب) مولوی محمد حبیب اللہ صاحب رشدی

(۸) مدیر رسالہ مجلس۔ مولوی سید محمد ضامن صاحب کنتوری۔

(۹) رفیق مدیر۔ مولوی سیّد منظر علی صاحب اشہر

(۱۰) منتظم (دار الاشاعۃ) مولوی مظفر بیگ صاحب۔

مقاصد مجلس

(۱) رسائل علمیہ و انتقادیہ کا جاری کرنا (جب تک مجلس اپنا کوئی خاص پرچہ جاری نکرے رسالہ لسان الملک مجلس کا آرگن سمجھا جائے گا)

(۲) اردو کے ایک مختصر لغت کی تدوین و طباعت تاکہ طلبہ و اساتذہ اور عامۃ الناس اس سے استفادہ کرسکیں۔

(۳) اردو زبان کی تاریخ لکھنا (۴) مفید علوم و فنون کا ترجمہ کرنا۔

(۵) ہند و دکن کے علما و فضلا کے سوانح عمری لکھنا۔ (۶) اردو کتابوں کی تنقید کرکے انتقاد کو علیحدہ طور سے چھپوانا تاکہ لوگ غلطیوں سے واقف ہوتے جائیں۔

(۷) ادبی و علمی و اخلاقی مضامین نظم و نثر کو صحائف کی صورت میں شائع و طبع کرانا۔

(۸) اردو کے علاوہ دکھنی بھاشا سنسکرت اور مفید السنہ مروجہ کا ایک ایک لغت مدون کرکے چھپوانا۔ (۹) اردو رسم الخط میں ضروری اصلاح کرنا۔

(۱۰) اردو میں حروف طباعت (ٹائپ) کو رواج دینا۔

(۱۱) کتب علمیہ کا جمع کرنا۔

(۱۲) ادبا و شعرا کو علمی خطاب دینا۔

(۱۳) مصنفین و مولفین کو صلہ دینا۔

(۱۴) نصاب اردو کو انتقادی نظر سے دیکھ کر اسکی اصلاح کی کوشش کرنا۔

انتباہ۔ تفصیلی قواعد و ضوابط کے لئے دستور العمل ملاحظہ ہو جو علیحدہ منطبع ہوا ہے۔

لسان الملک

جلد (۱) | بابتہ ماہ جولائی ۱۹۲۳ء | نمبر (۱)

لسان الملک

تا دور اثر نشہ نمی اندوزد | از بادہ کسے چہرہ نمی افروزد
آں شعلہ کہ شمع بفروغ آرد کو | ہر کس بتو ہم نفسی می سوزد

لسان الملک کا نام نیا ہے صورت نئی ہے جنم بھوم نئی ہے لیکن نہ اسکا اڈیٹر ہی ملک کیلئے نیا ہے اور نہ اوس کے مقاصد۔ ہمارے احباب کو یاد ہوگا کہ اب سے بارہ سال پہلے ہم نے رائے بریلی جیسے کوردیہہ سے رسالہ استبصار محض زبان اردو کی خدمتگزاری کے لئے جاری کیا تھا (اگرچہ کہ ہمکو اردو کی خدمتگزاری کرتے ہوئے تیس سال سے زاید گزر چکے ہیں)۔ استبصار کے مقاصد میں اہم ترین مقصد یہ تھا کہ اولاً تو اردو خواں اصحاب میں عام طور پر علمی مذاق پیدا کیا جائے ثانیاً یہ کہ اخباری انشا پردازی کے ہاتھوں جو مظالم ادبیت کی جان پر ٹوٹ رہے ہیں اون سے غریب اردو کی حفاظت کیجائے۔

سال ڈیڑھ سال کی عمر جو اس مرحوم پرچہ کو نصیب ہوئی اور اس قلیل مدت میں جیسی کچھ خدمت اس نے اپنی ملکی زبان و ادب کی انجام دی وہ اوس کے معاونین اور ناظرین کے دلوں سے ابتک محو نہیں ہوئی ہے۔ واقعات زمانہ اور حوادث فلکی کی رفتار مشیت کی تابع ہے

عین اوسوقت پر جبکہ اوس کے پھولنے پھلنے کے دن قریب تھے، اوسکا اپنا ذاتی پریس قایم ہو چکا
تھا، اور خریداروں کی تعداد بھی اس نوبت پر آگئی تھی کہ اس کی قیام وبقا کی امید ہوسکتی تھی،
خود ہمارے باغ مرادیں باد خزاں کا گزر ہوا، نامراد طاعون کے ہاتھوں ساری مرادیں خاک میں
مل گئیں، خانہ بدوشی سے خانہ بربادی کی نوبت پہنچی، اور جو ہونا تھا وہ ہو کر رہا۔ ان مصائب وآلام
کے باوجود ہم نے چاہا کہ استبصار پریس کے منیجر صاحب ہماری عدم موجودگی کیوجہ سے رسالہ بند
نہ کریں، اور ہم حیدرآباد سے ان کو پرچہ مرتب کر کے بھیجا کریں مگر کیا ہوسکتا تھا۔ کشتی در
چین و ملاح در فرنگ، آخر استبصار بند ہو گیا! ہمارے اعتقاد کے موافق اس کی قسمت ہی
میں بند ہونا تھا اس لئے ہم بھی انا للہ وانا الیہ الراجعون کہکر چپکے ہو بیٹھے!

استبصار بند ہو چکا تھا، مگر اوسکا خار مفارقت بارہ برس سے مسلسل ہمارے دل میں
کھٹکتا رہا۔ ہر کام وقت اور صرف وقت کا مرہون ہوتا ہے۔ ہر کام کے لئے خدا کی مشیت اور
ارادہ شرط ہے۔ ان اللہ یفعل ما یشاء و یحکم ما یرید۔ ہم نے چاہا اور بہت چاہا، ایک قرن
تک چاہا کئے کہ پبلک کی خدمتگزاری کی خدمت کو ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ مگر اسکا وقت نہیں
آیا تھا۔ آخر آیا، اور نہایت مبارک زمانہ میں آیا۔ ایسے مبارک زمانہ میں جبکہ
تاجدار دکن آصف جاہ سابع خلد اللہ ملکہ کی توجہات شاہانہ اور ہمت ملوکانہ اشاعت علم و
ادب کی جانب بالعموم اور زبان اردو کی ترقی و اصلاح کی جانب بالخصوص مبذول ہے!

اب ہم زبان اردو کے تعلقات دکن پر ایک سرسری نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔ جاننے والے
جانتے ہیں کہ اردو کی پیدائش ایک بازاری زبان کی حیثیت سے ہوئی۔ ہندی قوم سے
ایرانی، عرب اور افغانی اقوام کے میل جول اور کاروباری ضروریات نے ملک کے مختلف
مقامات پر مختلف لب ولہجہ کے ساتھ ایک مشترکہ تقریری ہندو مسلم زبان کا تخم بو دیا جس نے
رفتہ رفتہ اسلامی ہندی کی صورت اختیار کر لی کچھ دنوں بعد اس عام خیال سے کہ یہ زبان
مغل شاہنشاہ کے لشکر سے تعلق رکھتی ہے اسکا نام اردو یا اردوے معلّیٰ رکھدیا گیا۔ لیکن حقیقت

نفس الامری یہ ہے کہ اردو یا صحیح معنوں میں ہندوستانی زبان کا مولد و منشا دہلی یا کسی اور خاص شہر یا مقام کو نہیں کہا جا سکتا؛ البتہ اتنا کہہ سکتے ہیں کہ شہر دہلی ہندوستان کا شاہنشاہی دارالحکومت ہونے کے اعتبار سے اس عام ملکی زبان کا گہوارہ کہلانے کا دوسرے شہروں کے مقابلہ میں زیادہ مستحق ہے۔ بہرکیف کچھ بھی ہو۔ اہل تحقیق جانتے ہیں کہ اردو کو ادبی عزت چاہے وہ کسی درجہ کی کیوں نہ ہو۔ سب سے پہلے دکن ہی نے بخشی تھی۔ جبکہ ریختہ یا تحریری اردو دہلی والوں کے نزدیک ؎ اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی۔ اس سے بہت پہلے کچھ اوپر دو سو برس پہلے۔ بیجاپور اور گولکنڈہ کے درباریوں کے کان نو اسخان اردو (دکنی) کی گل افشانیوں سے سبد گلفروش بنے ہوئے تھے، اور مجالس عزا میں مرثیے اور نثر میں نرم دلوں کو گداز کر کے ثواب آخرت سے بہرہ اندوز کر رہی تھیں۔

ہاں! تو دکن۔ اور محض دکن اُردو کا گہوارہ عافیت تھا جس نے اس بے ماں باپ کے بچہ کے حق میں آغوش مادر کا کام دیا۔ اور جب وہ کسی قدر دوڑنے پھرنے کے قابل ہوا تو اوسکو ادب کے درسگاہ میں لا بٹھایا۔ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ یہ بچہ یا بچی کہیے کچھ ایسی من موہنی تھی کہ اوس کی میٹھی میٹھی توتلی باتوں نے میر تقی میر جیسے نازک مزاج شاعر کو اپنے دام الفت میں گرفتار کر ہی تو لیا اور بیساختہ اسکی زبان سے کہلوا دیا ؎ معشوق جو تھا اپنا باشندہ دکن کا تھا۔ اور پھر میر جی کو اس لیلیٰ کے عشق میں اتنی محویت ہوئی کہ ''انا لاردو'' ؎ پکار اٹھے مگر واہ ری نظر انتخاب اور واہ رے ذوق قدردانی! دہلی والوں نے بھی اس دکنی معشوق کی ایسی آؤ بھگت کی کہ بادید و شاید اب کیا تھا، اب تو اوس کے حسن دل افروز کا شہرہ یہاں تک پہنچا کہ اس سرے سے اوس سرے تک دھوم مچ گئی، یہاں تک کہ دہلی کا آخری تاجدار مغل شاہنشاہ۔ اپنی اصلی زبان (فارسی) کو چھوڑ کر اردو کا اتنا بڑا شاعر ہوا کہ چار دیوان نظم کر ڈالے۔ پھر دوسرے ماتحت صوبہ جات، وہاں کے حکمرانوں

؎۔ اگرچہ انا لاردو کی ترکیب غلط ہے۔ لیکن نقل کفر کفر نباشد۔

اور رعایا وکا کیا مذکور!

اردو کا شباب آیا اور اسلامی حکومت کا آفتاب غروب ہو گیا! سرزمین ہند نے مغلیہ سلطنت کو رخصت کر کے انگریزی راج کا خیر مقدم کیا۔ اب اردو کی سرپرستی کون کرتا؟ اسکی وہی مثل ہوئی کہ سر منڈاتے ہی اولے پڑے۔ ؎

نشو و نما سے پہلے ہی پامال ہو گئے

ہم مثل سبزہ خلق تہِ آسماں ہوئے

لیکن یہ دوب بغیر پانی کے سرسبز رہی بغیر آبیاری کے شادابی حاصل کرتی گئی اور اگرچہ اسکا عمل از نفاشکست رہا اگرچہ اسکی نشو و نما کی رفتار دھیمی رہی پھر بھی یہ پھیلی، یہ بڑھی، روشوں پر پہنچی، چمنوں میں جگہ لی، خانہ باغوں کی آرائش کا ذریعہ بنی اور حسن پرست نگاہوں کے لئے طراوت بخش اور نور افزا ثابت ہوئی۔ سلطنت مغلیہ کا آفتاب غروب ہو گیا تو اردو نے لکھنؤ پہنچکر شاہ اودھ کے سایۂ عاطفت میں پناہ لی۔ لکھنؤ والوں نے اسے پوچ ولچر کا لقب نہیں دیا بلکہ اپنے مالکوں کی یادگار سمجھکر ہاتھوں ہاتھ لیا، سر آنکھوں پر بٹھایا، اور اوس کے ہر ہفت کرنے میں اپنی ساری قوت صرف کر دی۔ میر تقی، مرزا سودا، میر انشاء، میر حسن، مصحفی، جو اس گل نورسیدہ کے بلبل تھے وہ بھی لکھنؤ آ گئے اور ان کی بھی ویسی ہی عزت و توقیر کی گئی جیسی ان کے معشوق کی پھر خود لکھنؤ کی خاک سے آتش، ناسخ، امیر، خلیق، دبیر، انیس، عشق، اور سرور جیسے باکمال اٹھے اور اردو ادب کی ایک خاص صنف (شاعری) کو پایۂ تکمیل تک پہنچا کر چھوڑا۔ لیکن جس طرح کوئی قوم حقیقی طور پر ترقی نہیں کر سکتی جب تک اسکی مادری زبان میں اوسکو تعلیم نہ دی جائے، اسی طرح کوئی زبان اوس وقت تک ترقی یافتہ نہیں سمجھی جا سکتی جب تک اوس میں گزشتہ علوم و فنون کا سرمایہ معتد بہ مقدار میں موجود نہ ہو اور جدید علوم و فنون کے اخذ کرنے کے لیے اس کا دامنِ عمل کافی وسعت نہ رکھتا ہو۔ اس لئے ہم کہیں گے کہ اب تک اردو میں جو کچھ ہوا یا جو کچھ کیا گیا وہ تفننِ طبع کی

حد سے آگے نہیں بڑھا تھا۔ آگے بڑھتا کیونکر جبکہ انتزاع سلطنت کیساتھ جملہ قومی خصوصیات زوال پذیر ہو رہی تھیں تو ایک زبان ہی میں کیا سرخاب کے پر لگے تھے جو اجنبی حکومت کی منظور نظر ہو کر ترقی کرتی۔ انگریزی حکمراں قوم کی زبان تھی اور یہ بالکل فطری امر تھا کہ وہی تمام ملک پر اپنا سکہ جماتی۔ دہلی تباہ ہو چکی تھی، لکھنو تباہ ہو چکا تھا، اب اگر باقی تھا تو دکن جو اردو کی سرپرستی کرسکتا تھا۔ دربار آصف جاہی جس طرح اپنے دیگر خصوصیات میں دربار دہلی کا متتبع تھا اسی طرح آصفجاہ ششم کی مسندنشینی کے کچھ دنوں بعد تک یہاں کی سرکاری زبان بھی فارسی ہی رہی۔ آخر ایک وقت ایسا آیا کہ اردو کا اختر بخت پھر چمکا اور وہ دربار آصفجاہی کی سرکاری زبان قرار پائی۔ اور اگرچہ خاندان آصفجاہی کے اکثر فرمانرواؤں کو ذوق سخن سنجی ودیعت ہوا تھا لیکن شاید حضرت غفراں مکاں ہی اس سلسلہ کے پہلے بادشاہ ہیں جنہوں نے اپنے افکار عالیہ سے زبان اردو کو عزت بخشی اور اوس کے ساتھ اون قدیم تعلقات کو تازہ فرمایا جو سلاطین بیجاپور و گولکنڈہ نے قایم کیے تھے مگر ابھی وقت معہودہ دور تھا۔ اور ہندوستان کی اس ہونہار زبان کو حقیقی عزت کا خلعت کسی اور ہی مبارک ہاتھ سے ملنے والا تھا۔ چنانچہ فرمان واجب الاذعان مؤرخہ ۶ ذی الحجہ ۱۳۲۶ھ نے صادر ہو کر قیام جامعہ عثمانیہ کی صورت میں وہ خلعت اعزاز عطا فرمایا اور آخر وقت آگیا کہ اردو کے قدم کو میدان ترقی کی جانب بڑھتا ہوا دیکھا جائے۔

غرضکہ اردو کی ابتدا، اور انتہا (یعنے حالت موجودہ) پر نظر ڈالنے سے ہم بلاخوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ دکن ہی سے اسکی ادبی نشو ونما ہوئی اور دکن ہی سے اس کی تکمیل و ارتقا کی امید وابستہ نظر آتی ہے۔ اس اعتبار سے "لسان الملک" کا اجرا دکن کے پایۂ تخت سے جسقدر مبارک خیال کیا جائے کم ہے بالخصوص جب ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ تہذیب اخلاق کو چھوڑ کر سب سے پہلے اس میدان میں دکن ہی نے قدم رکھا تھا اور اردو کا سب سے زیادہ باوقعت علمی و ادبی پرچہ جس نے ولایتی ماہانہ پرچوں کے قدم بقدم چلنے کی کامیاب

کوشش کی رسالہ حسن تھا۔

لسان الملک کے اجرا سے ہمارا مقصود صرف اسی قدر ہے کہ جہاں تک ہو سکے ملک کی مشترکہ زبان کو علمی اور اخلاقی مضامین کا سرمایہ دار بنایا جائے اور ایسا لٹریچر پبلک کے سامنے پیش کیا جائے جو سلامتِ ذوق کے معیار سے گرا ہوا نہو۔ اگرچہ اس وقت شمالی ہند میں بہت سے رسالے شایع ہوتے ہیں لیکن حیدرآباد اس میدان میں بہت پیچھے ہے اور اب جبکہ یہاں مقامی یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم زبان اردو کو قرار دیا جا چکا ہے تو اس زبان کی ترقی و وسعت کے لئے ممکنہ ذرایع کی فراہمی اور اون کی تکمیل ہمارا مقدم فرض ہونا چاہیئے۔ اس فرض کی تکمیل کے لئے ہمکو حیدرآباد اور شمالی ہند کے بہترین اور سربرآوردہ انشاپردازوں اور مصنفین کی اعانت حاصل کرنے میں بڑی حد تک کامیابی ہو چکی ہے۔ اور آیندہ بہت کچھ توقع ہے۔

اس کے بعد ہماری ہمت افزائی کا بار صرف پبلک کے ذمہ رہ جاتا ہے۔

ہم ان سطور کو اپنے عزیز دوست مولوی سید منظر علی صاحب اشہر کا شکریہ ادا کئے بغیر ختم نہیں کر سکتے جنہوں نے مستقل طور پر اپنے اوقات فرصت شریک مدیر کی حیثیت سے لسان الملک کیلئے وقف کر دیئے ہیں۔ مولوی منظر علیصاحب قابل باپ (مولانا اشہری مرحوم) کے قابل فرزند ہیں جن کے نام سے دنیائے ادب کے کان بخوبی آشنا ہیں آپ کی ذات سے ہمکو قوی امید ہے کہ آپ ہر حیثیت سے ہمارے قوت بازو ثابت ہوں گے۔

ادیٹر

رباعی

پہچانتا ہوں میں خوب ہر ایک کی رگ
دلال بنے ہیں جو۔ ہیں دنیا کے ٹھگ
کرتے ہیں یہ میٹھی میٹھی باتیں جو عدیل
ہو جائیں گے نقد دل و دیں لیکے الگ

عدیل گنتوری

اردبیل

از جناب نواب مہدی یار جنگ بہادر (مولوی سید مہدی حسین بلگرامی) ایم - اے (آکسن)

Ardabil (Urdebil), Per. Ardabel

Arm. Artavet (later Artavel) یا Bed Firozan

اَرْدبیل (بہ فتح الف و دال سکون را و یائے معروف لیکن فارسی میں بہ یائے مجہول) ارمنی **اَرْتَوِیت** و **ارتَوِیل** (ہر دو بہ یائے مجہول)

ایران میں صوبۂ آذربائیجان کا نہایت شرقی شہر جو خطوطِ طول شرقی ۴۸ ½ ° و عرض شمالی ۳۸° میں بحر قزدین سے پورے ایک دن کی راہ پر تبریز سے جانب شرقی سو میل ہے یہ شہر ایک سطح مرتفع پر سمندر سے (۴۹۴۰) قدم کی بلندی پر واقع ہے اور چاروں طرف پہاڑوں سے محصور ہے اسکا قطر تقریباً چھ گھنٹے کی راہ ہے۔ شہر کی غربی سمت افسردہ آتش خیز پہاڑ **سَبلان** (بہ فتح سین و سکون با) ہے جسکو اب **سَوَلان** کہتے ہیں ۱۵۶۶۵ قدم کی بلندی پر اسکی سطح ہمیشہ برف سے ڈھکی رہتی ہے۔ شہر کے ارد گرد کئی میل تک کوئی درخت یا جھاڑی دکھائی نہیں دیتی لیکن اطراف و اکناف میں مصنوعی ذرایع آبپاشی سے سفید کھریا مٹی کو نہایت زرخیز بنالیا ہے چنانچہ شاداب و حاصل خیز کھیت اور سرسبز چراگاہیں جابجا نظر آتی ہیں۔ بلند موقع کیوجہ سے اس شہر کی آب و ہوا کسی قدر شدید لیکن ہمیشہ صحت بخش سمجھی گئی ہے یہاں انگور، نارنگیاں، اور خربزے نہیں ہوتے لیکن سیب اور ناشپاتیاں کثرت سے پیدا ہوتی ہیں۔ شہر اَرْدبیل دریائے **اَرَس** و **کُر** کے فاصل آب (پن ڈھال) میں واقع ہے **بَلِق صُو** (رود ماہی یا مچھلی کی ندی) جو سلسلۂ

کوہ سبلان کے جنوبی ڈھلان سے نکلتی ہے کئی شاخیں ہو کے اَردَبیل میں سے گزرتی
اور اول قرہ صُو کو پھر آہر کو شامل کرتی ہوئی دریائے اَرَس میں داخل ہوتی ہے۔ اَردَبیل
کے قریب گرم معدنی چشمے پائے جاتے ہیں جہاں سیاحوں کی بڑی آمدورفت رہتی ہے
انہی چشموں اور عمدہ آب و ہوا کے باعث دربار ایران کو اَردَبیل کی سکونت ہمیشہ مرغوب
وپسند خاطر رہی ہے۔ فردوسی، یاقوت وغیرہ نے بیان کیا ہے کہ اَردَبیل کو ساسانی
بادشاہ پیروز یا فیروز (۴۵۹ء۔۴۸۴ء) نے بسایا تھا یہی وجہ ہے کہ اسکو بادان
فیروز (عربی باذان فیروز یا آباذان فیروز) یا فیروزگرد (عربی فیروزکرد)
کہتے تھے۔ بنی امیہ نے اَردَبیل کو آذربائیجان کا انتظامی پایۂ تخت مقرر کیا تھا اور
اوس کے ساتھ ہی مراغہ کی فوج یہاں منتقل کردی تھی پھر عہد عباسیہ میں اَردَبیل کی جگہ
تبریز پایۂ تخت مقرر ہوا۔ علّامہ یاقوت نے اردبیل کو ۶۱۷ھ/۱۲۲۰ء میں دیکھا تھا تو وہ
آباد و شاداب شہر تھا اس کے بعد ہی مغلوں کی غارت گری شروع ہوئی۔ انہوں نے
اردبیل کو تاخت و تاراج اور تمام مسلمانوں کو تہ تیغ کردیا۔ کچھ دنوں کے بعد اَردَبیل کی
از سر نو تعمیر کیگئی اور وہ پہلے سے زیادہ خوشنما بنگیا۔ صفویہ کے عہد حکومت میں اَردَبیل
کی شوکت وعظمت اور رونق وشان اوج پر پہنچ گئی تھی آٹھویں صدی ہجری (چودہویں
صدی م) کے اوائل میں ایک نہایت عابد ومتقی شیخ صفیّ الدین ہوئے ہیں جنکا وصال
۷۳۵ھ/۱۳۳۵ء میں ہوا۔ آپ ساتویں امام حضرت موسیٰ کاظم کی اکیسویں پشت میں اور ایران کے
شاہانِ صفویہ کے جد اعلیٰ تھے آپ سے عامۂ خلایق کو نہایت حُسن اعتقاد تھا آپ کے جانشینوں
(صفویہ) کے عہد میں ایک قسم کی دینی حکومت قایم ہوئی جس کی فوجی قوت شیخ صدرالدین
(والد شیخ صفی الدین) کے آزاد کردہ ترکی غلاموں کی اولاد کے ہاتھ میں تھی۔ یہ غلام
قزل باش (سُرخ سر) کہلاتے تھے صدرالدین کا پانچواں قایم مقام اسمٰعیل خاندان
صفویّہ کا مؤسّس (بانی) ہوا ہے ۹۰۸ھ/۱۵۰۲ء میں اس نے اَردَبیل کے صوفیہ کے لقب

شیخ کو جو اس وقت تک اس کے پیشرو اختیار کرتے چلے آئے تھے ترک کر دیا۔ اور اپنا
قیام بھی تبریز میں بدل دیا۔ آخر صفوی بادشاہ کے انتقال کے بعد ۱۷۳۶ء میں یہاں
نادر شاہ نے تاج شاہی اپنے سر پر رکھا۔ انیسویں صدی کے اوائل میں شاہزادہ
عباس مرزا نے اردبیل کو اپنا مستقر بنایا اور اسمیں فرنگی وضع کا ایک قلعہ فرانسیسی سفیر
جنرل گارڈون کے اہتمام و نگرانی میں تعمیر کروایا۔ کیونکہ سلطنتِ روس کے مقابل
یہ خاص سرحدی شہر تھا۔ ۱۸۲۶ء۔ ۱۸۲۸ء کی جنگ میں جو ایران و روس کے مابین
ہوئی۔ روسیوں نے اَرْدَبیل پر قبضہ کر لیا تھا لیکن ۱۸۲۸ء میں مُصالحہ کی تکمیل کے بعد
یہ ایرانیوں کو واپس مل گیا۔ اَرْدَبیل کی مشہور ترین عمارت حضرت شیخ صفی الدین
قدس سرہٗ کا مقبرہ جامع مسجد میں واقع ہے جس کا بڑا احترام کیا جاتا ہے۔ اس روضہ
کی زیارت کے لئے زائرین کا جم غفیر آتا ہے اگرچہ اس مقبرے کو ۱۸۲۷ء میں تاراجِ
روسیوں اور پیہم زلزلوں نے بہت نقصان پہنچایا۔ تاہم یہ اب تک قابل قدر یادگار ہے
تھیل مین کا بیان ہے کہ قدیم تزئین و آرائش کے بیش بہا تختہ سنگ ہنوز موجود ہیں۔
داخلی فرش پر قدیم قالین بچھے ہوئے ہیں۔ اسمیں شاہان ایران کا عطا کیا ہوا نادر العصر
قدیم ایرانی و چینی ظروف کا ذخیرہ بھی ہے اس روضہ میں شیوخ صفویہ اور شاہ اسمٰعیل
صفی اوّل المتوفی ۹۳۰ھ / ۱۵۲۴ء کی بھی قبور ہیں۔ لیکن شیخ صفی کا مشہور کتب خانہ جو کبھی ایران
بھر میں سب سے بڑا تھا اب موجود نہیں ہے کیونکہ اس کو جنرل پاسکی وچ (روسی فیلڈ
مارشل) نے ۱۸۲۷ء میں سینٹ پیٹرزبرگ روانہ کر دیا تھا۔ اور وہاں وہ شاہی کتب خانہ
میں شریک کر لیا گیا۔ گارڈون کا بنایا ہوا قلعہ روسیوں کی تسخیر کے بعد سے غیر آباد و افتادہ
ہو گیا ہے چونکہ اردبیل بحر خزر و روسی سرحد کے قریب اور تبریز سے آستارہ، دلنکووان۔
(لنکران) کی تجارتی راہ پر واقع ہے اس لئے بحر قزوین اور ایران کی تجارت
اسی راہ سے گزرتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ ایک طرف تو تفلیس، دَرْبند اور بادکوبہ

اور دوسری جانب تبریز اصفہان و طہران کی تجارت کا خاص مرکز ہے قرونِ وسطیٰ خصوصاً صفویہ کے عہد میں اردبیل نہایت ہی آباد تھا فرنگی سیاحوں اولاریوس سنہ ۱۰۴۷ھ / ۱۶۳۷ء اور چاردن (سنہ ۱۶۷۱ء) نے اردبیل کو نہایت ہی سرسبز و شاداب شہر لکھا ہے انیسویں صدی م کے آغاز میں علی الخصوص لڑائیوں اور متواتر بھونچالوں سے اردبیل کی اگلی عظمت بہت کچھ جاتی رہی تھی۔ موریر نے سنہ ۱۸۱۳ء میں اردبیل کی مردم شماری صرف چار ہزار لکھی ہے لیکن بعدازاں اس کی آبادی میں بتدریج ترقی ہوتی گئی حتی کہ آجکل اس کے باشندوں کی تعداد کا تخمینہ سولہ سے بیس ہزار ہے صنیع الدولہ نے مرآۃ البلدان (سنہ ۱۲۹۴ھ) میں لکھا ہے کہ "اردبیل آذربائجان کا معظم شہر ہے بالوک چای کے دائیں کنارے اور تبریز سے جانب مشرق (۱۴۰) ذراع پر واقع ہے اسکی آب و ہوا ہر قسم کی زراعت و فلاحت کے مساعد اور اسکی زمین ہر طرح کی کشتکاری کے قابل ہے اسکا قلعہ فتح علیشاہ خاقانِ مغفور کے زمانہ سلطنت میں نواب نائب السلطنہ عباس مرزا مبرور ولیعہد دولت علیہ ایران نے جنرل گاردان فرانسیسی (جو نپولین کیجانب سے سفیر بن کر آیا تھا) کی نگرانی میں بنوایا تھا۔ بالجملہ یہ شہر زمانہ صفویہ میں بہت آباد و معمور رہا۔ طلاب و محصلین کے لئے کثیر اوقاف مقرر کئے گئے۔ اردبیل کا شہرۂ آفاق کتب خانہ جسمیں بیشتر عربی اور کمتر فارسی و ترکی کتابیں تھیں اور جنکی جلدیں طلائی اور نقرئی تھیں، اب باقی نہیں رہا ہے سنہ ۱۱۵۹ھ / ۱۷۴۶ء میں نادر شاہ افشار نے اردبیل کے نزدیک دشت مغاں میں اپنی تلوار کو غلاف سے نکالا اور جو خدمات ممالک ایران کے لئے کی تھیں انکو بیان کیا پھر تلوار کو نیام کر کے کہا اب تک جو کچھ ہو سکا میں نے کیا اس کے بعد اپنے لئے بادشاہی اختیار کی۔ ایران کے سرداروں اور بزرگوں نے متفقاً اس کی سلطنت کو قبول کر کے اس کو نادر شاہ بنا دیا۔ تشریفاتِ تاج گزاری (رسومِ تخت نشینی) اردبیل میں ادا کئے گئے چونکہ اردبیل

۵ گارڈن عہد نپولین

تفلیس۔ طہران ۔تبریز۔ بادکوبہ (باکو) گیلان اور دربند کی راہ پر واقع اور ایک معتبر تجارت خانہ ہے تاورنیہ فرانیسی تاجر نے جو بہ زمان شاہ عباس ثانی ایران میں آیا تھا، لکھا ہے کہ "اَرْدَبیل میں ریشم کی تجارت کی گرم بازاری ہے اس زمانے میں اس شہر کے لوگوں کا تقدس اس درجہ بڑھا ہوا ہے کہ شراب مطلق نہیں پیتے، بلکہ اس بستی کے رہنے والے ارامنہ بھی مسکرات کا استعمال نہیں کرسکتے ایران کے لوگ دور دراز شہروں سے اعتقاد مذہبی یا خاندان صَفَوِیّہ کی خوش آمد سے شیخ صفی الدین کے مقبرہ کی زیارت کے لئے آیا کرتے ہیں اس مقبرہ کے حوالی میں کئی مدارس و مساجد ہیں۔ مدرسوں کے دروازے نقرئی ہیں ضریح مرقد شیخ صفی پر چاروں گوشوں میں سونے کے انبار لگا رکھے ہیں گنبد کی چھت سے سونے اور چاندی کی قندیلیں لٹک رہی ہیں" اولاریوس ہولسٹن (ڈنمارک) کے سفیر نے جو شاہ عبّاس اول کے دربار میں مامور تھا اردبیل کے زمانہ قیام میں لکھا ہے کہ "اردبیل آذربائجان کے قدیم شہروں میں سے ہے اور ایران کے سلاطین عظیم الشان کا مقرِّ حکومت تھا اب بادشاہ ایران کے جدّ اعلیٰ کا مدفن ہے اردبیل کا قدیم نام اربلا (؟) تھا باشندوں کی زبان ترکی ہے یہ شہر پہاڑوں سے گھرا ہوا وسط صحرا میں واقع ہے فصل پائیز (پت جھڑ یا خزاں) میں امراض مزمنہ بڑھ جاتے ہیں۔ خصوصاً مرض نوبہ (نوبتی یا موسمی بخار) جو گیلان سے سرایت کرتا ہے اس فصل میں دوپہر کو تند باد (تیز ہوا) چلتی ہے جس سے لوگوں کی زبان پر یہ ضرب المثل ہے (صبائے اَرْدَبیل نیم کردبیل) خانہ باغوں اور بستان سراؤں کی یہ کثرت ہے کہ جو مسافر باہر سے اس شہر میں آتا ہے اسکو ایک صحیفہ گلزار و مرقع بہار نظر آتا ہے۔ اَرْدَبیل کے کتب خانہ کی گنبد نما چھت کے نقل دانوں (پھل اور مٹھائی رکھنے کے طبق) میں بہت بڑے بڑے چینی کے پیالے رکھے ہوئے ہیں۔ مقبرۂ شیخ صفی کے آش پز خانہ (باورچیخانہ) سے

روزانہ تین مرتبہ ہزار ہزار آدمیوں کو عمدہ غذا از قسم پلاؤ و آش تقسیم کیجاتی ہے۔ طعام کے وقت اطلاع عام کے لئے نقارہ بجایا جاتا ہے۔ باورچیخانے کے اخراجات کے لئے دیوانی سے روزانہ پچاس تومان بلکہ اس کے دوچند عطا کئے جاتے ہیں۔ اردبیل میں ان اصحاب کی قبور ہیں (۱) شیخ صفی الدین رحمۃ اللہ (۲) شیخ صدر الدین پسر شیخ صفی الدین (۳) شیخ زین الدین پسر شیخ صدر الدین (۴) سلطان حیدر شہید پسر شیخ زین الدین (۵) شیخ جنید پسر سلطان حیدر (۶) شاہ اسمعیل پسر شیخ جنید (۷) شاہ طہماسپ پسر شاہ اسمعیل (۸) شاہ اسمعیل ثانی پسر شاہ طہماسپ (۹) شاہ محمد خدا بندہ" اس شہر میں ایک خوبی یہ ہے کہ پہاڑ کے دامن میں جانب جنوب واقع ہے۔ جس سے بحر خزر کی گرم زہریلی ہوا رک جاتی ہے۔ سلاطین صفویہ کے عہد میں اردبیل ایران کے عام مجرموں وملزموں کا ملجا و ماوی تھا اگر کسی شخص کو جرم شدید کے ارتکاب سے بیم جاں ہوتا۔ اور وہ بھاگ کر شیخ صفی کے مقبرہ میں بست بیٹھ جاتا تو وہ اماں پا جاتا تھا آنحضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک جوڑ نعلین شریفین زینت افزائے مقبرہ شیخ صفی ہیں۔ مرحوم ملا احمد اردبیلی جو اجلہ علماء و مشاہیر شعرا سے تھے اسی شہر کی طرف منسوب ہیں۔ انتہی۔ نزہتہ القلوب میں لکھا ہے کہ" اردبیل چوتھی اقلیم سے متعلق ہے اسکا طول جزائر خالدات سے ۸۲ درجہ ۲۰ دقیقہ اور عرض خط استوا سے ۳۸ درجہ ہے اس کی بنیاد کیخسرو ابن سیاوش کیانی نے کوہ سبلان کی تلیٹی میں رکھی ہے آب و ہوا نہایت سرد ہے غلہ کے سوا یہاں اور کسی قسم کی پیداوار نہیں ہوتی۔ اردبیل کی آبرسانی کوہ سبلان کی ندیوں سے ہوتی ہے ان کا پانی سریع الہضم ہوتا ہے بدیں وجہ باشندے اکال (پُرخور) ہوتے ہیں اکثر لوگ شافعی اور شیخ صفی الدین علیہ الرحمہ کے مرید ہیں کورۂ اردبیل میں سنو گاؤں ہیں جو سب سردسیر ہیں۔ کوہ سبلان (سوالان) کی چوٹی پر

ایک بہت مستحکم قلعہ ہے جسکو دِژ بہمن رُوئین دِژ کہتے ہیں۔ شاہنامہ میں ہے کہ جب کیخسرو اور فری برز ابن کے کاؤس میں بادشاہی کے لئے نزاع ہوئی تو حصولِ سلطنت کا انحصار اسی قلعہ پر ہوا۔ فری برز فتح سے عاجز رہا لیکن کیخسرو نے قلعہ سر کر لیا اور بادشاہ قرار پایا۔ یہ قلعہ اب ویران ہو گیا ہے۔ قصر دِژ رشیدان جو بابکِ خرّمِ دین کے مقابل تھا کوہ اردبیل میں جیلان کی جانب واقع ہے۔ اردبیل کی مال گزاری (حقوق دیوانی) از روئے دفتر (رجسٹر) پچاسی ہزار دینار ہے۔ اِصطخری نے ذکر کیا ہے کہ اردبیل باحصار شہر ہے۔ چوڑائی یا لمبائی کوئی دو ثلث فرسخ ہے۔ مکانات پختہ اینٹ اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ یہاں سا خلو فوج رہتی ہے۔ اردبیل کا شہر مشہور ہے۔ اس کے نوا بع نہایت زرخیز ہیں۔ مقدسی نے اردبیل کے قلعہ بازاروں، جامع مسجد اور اوس کے وسیع حوالی کا بیان کیا ہے۔ خاندان صفویہ کے عہد میں تمام ایران کا دارالحکومت پہلے پہل اردبیل ہوا۔ بعد ازاں تبریز پھر تختِ شاہی اصفہان میں منتقل ہوا۔

افکار وحشت

از جناب مولوی رضا علی صاحب وحشت (کلکتہ)

نشاط جاودانی آشنائے کامِ جاں کردم
زنامِ لذت آگینش کہ من وردِ زباں کردم

درودے گفتم و شوقِ نہانِ خود عیاں کردم
حدیثِ عظمتش را آنچہ شایاں بود آں کردم

زذکر او لبِ خاموش را ذوقِ سخن دادم
زیاد او دل اندوہگیں را شادماں کردم

ببزمش مدعایم بود عرضِ دردمندیہا
چو از آدابِ محفل بیخبر بودم فغاں کردم

چناں افسانۂ او شوق را افزود در محفل
کہ شب ذکر جمیلش داستاں در داستاں کردم

چراغ آشنائی کردہ ام روشن بدل وحشت
بحمد اللہ کہ سامانِ نشاطِ جاوداں کردم

اصطلاحات علمیہ

از جناب ڈاکٹر مرزا محمد ہادی صاحب بی۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔
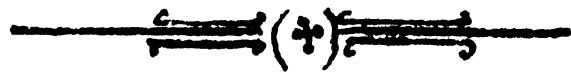
زبانوں کی ماہیت پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دو قسم کی زبانیں عالم میں موجود ہیں۔ پہلی قسم وہ زبانیں جو بلا آمیزش دوسری زبانوں کے اعلیٰ درجہ کی ترقی پر فائز ہیں۔ ہر باریک خیال کے لئے اسیں الفاظ مل سکتے ہیں ایسی زبانیں فلسفی مطالب کے ادا کرنے کے لئے نہایت موزوں اور علمی زبان ہونے کیلئے آمادہ ہیں جیسے عربی سنسکرت یونانی لاطینی وغیرہ۔ دوسرے وہ زبانیں جو مثل پہلی قسم کے نہ کثیر الالفاظ ہیں نہ ترقی کی ہوئی ہیں۔ یہ زبانیں ابھی گویا بنی نہیں ہیں بلکہ معرضِ ساخت میں ہیں اس کی بھی دو قسمیں کیجا سکتی ہیں اس اعتبار سے کہ بعض ان میں سے دوسری کامل زبانوں سے اسقدر الفاظ مستعار لے چکی ہیں جتنی ضرورت اب تک ہوئی ایسی زبان انگریزی ہے۔ انگریزی زبان سیکسن زبان کی ترقی پائی ہوئی صورت ہے اس زبان میں یونانی اور لاطینی سے تعداد کثیر الفاظ کی شریک ہو چکی ہے سیکسن میں کل دو ہزار لفظ تھے منجملہ اون کے صرف پانچسو مستقل تھے۔ صرف جزئیات کے نام موجود تھے کلیات کے نام ہی نہ تھے۔ مثلاً بھائی بہن۔ ماں۔ باپ۔ خالہ۔ پھوپھی۔ یہ لفظ تو سیکسن میں موجود تھے۔ مگر قرابت اور رشتہ داری کے لئے کوئی نام نہ تھا اس لئے کہ رشتہ مقولات ثوانی سے ہے جس سے یہ زبان عاری تھی۔ لاطینی سے ریلیٹیو رشتہ داری کے لئے لفظ مستعار لیا گیا۔ گائے۔ بیل۔ بھیڑ۔ بکری۔ آدمی کے لئے الفاظ سیکسن میں موجود تھے مگر حیوان جو ان کی جنس قریب ہے اوس کے لئے لفظ موجود نہ تھا لفظ اینمل (حیوان) لاطینی سے لیا گیا غرضکہ مرکبات اضافی

جو محسوسات سے قریب تر تھے اون کے نام ملتے تھے مگر کلیات جنس اور جنس عالی
مثلاً جوہر کے لئے کوئی نام نہ تھا۔ دوسری زبانوں سے انگریزی میں الفاظ مستعار
لینے کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ انگریزی میں اب دو ڈھائی لاکھ لفظ موجود ہیں
یہ لفظ لاطینی اور یونانی سے لئے گئے ہیں اگرچہ اور زبانوں نے بھی انگریزی کو مالامال
کیا ہے لیکن زیادہ تر حصہ لاطینی اور یونانی کا ہے۔

دوسری قسم ایسی زبانوں کی جو معرض ترقی میں ہیں اردو زبان ہے یہ ابتدا ہی
سے ایک مخلوط زبان ہے اسکا ڈھانچہ ہندی بھاکھا سے ماخوذ ہے چنانچہ جملہ
مصادر بسیط مثل ہونا۔ کرنا۔ دھرنا۔ کھانا۔ پینا۔ سونا یہ سب بھاکھا۔ کے ہیں اگرچہ
صورت بدلی ہوئی ہے اور الفاظ فارسی اور عربی سے ماخوذ ہیں دریں ولا زمانے
کی ضرورتوں سے اور حضور لامع النور خلد اللہ ملکہ کی توجہ سے علوم کے ترجمے اس
زبان میں کئے جاتے ہیں اور جدید الفاظ کے بنانے کی ضرورت درپیش ہے
اس مقصد کے لئے ضرور ہے کہ اور زبانوں سے مدد لیجائے۔ دو صورتیں جدید
الفاظ کی ساخت کے لئے اختیار کیجا سکتی ہیں ایک تو یہ کہ اردو زبان کے موجودہ
الفاظ میں غیر زبانوں سے اضافہ نہ کیا جائے بلکہ انہیں موجودہ لفظوں کی ترکیب
اور کاٹ چھانٹ کر کے جدید الفاظ پیدا کئے جائیں۔ یہ الفاظ اکثر بدنما اور
غیر مانوس ہوجاتے اور اردو کی لطافت بالکل غائب ہوجاتی ہے یہ ترکیبیں ایسی
مضحک ہوتی ہیں کہ طبع مستقیم اوس سے نفرت کرتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ
عربی سے اور احیاناً فارسی سے الفاظ لئے جائیں۔ اردو زبان کی ماہیت عربی
الفاظ کی شرکت سے عدم موانست نہیں رکھتی جسقدر الفاظ عربی سے لئے گئے
ہیں وہ ایسے کھپ گئے ہیں کہ بالکل ستاروں کی طرح جڑے ہوئے معلوم
ہوتے ہیں۔ دوسری خوبی یہ ہے کہ مجاز کے لئے عمدہ موقع ملتا ہے خواہ لغوی

معنے کچھ ہی ہوں لیکن علمی اصطلاح جو مفہوم تجویز کرے وہی اوس کے معنے ہو جاتے ہیں۔ اگلے وقتوں میں جب عربی میں ترجمے کئے گئے تھے اوسوقت عربی میں بعینہ یہی مشکل درپیش تھی جواب اردو میں ہے۔ قدیم مترجمین نے اکثر صورتوں میں یونانی الفاظ رکھ لئے تھے۔ مگر ایک لفظ اپنی زبان سے بھی اوس کے لئے تجویز کر دیا تھا مرور ایام سے یونانی الفاظ جو غیر مانوس تھے استعمال سے حذف ہو گئے اور عربی الفاظ جو بطور ناکامل ترجمے کے تجویز کئے گئے تھے وہ اپنے معنے کے افادہ میں کامل ہو گئے اور وہی اب مستعمل ہیں۔ مثلاً جب ارسطاطالیس کی .... منطق کا ترجمہ کیا گیا تھا تو (کیٹی گوری) کے مقابل کوئی لفظ موجود نہ تھا لہذا یونانی لفظ کو معرب کر کے قاطیغوریاس بنایا گیا اور مقولہ اسکا ترجمہ کیا گیا۔ مرور ایام سے قاطیغوریاس اب صرف قدیم تصانیف میں محفوظ ہے۔ لیکن اہل علم کی زبانوں پر مقولہ اور اوسکی جمع مقولات عشر بے تکلف جاری ہے۔ ہرگز ابتدائی حال میں مقولہ اوس مفہوم کو ادا نہ کرتا تھا جو قاطیغوریاس سے مقصود تھا لیکن زمانہ مقولہ کی لفظ کو اوسکا قایم مقام بنا کے رہا۔ یہی حال سولوجسموئس کا ہے اب سولوجسموس کو کوئی نہیں جانتا البتہ انگریزی درس وتدریس کی بدولت پھر ہمارے سامنے آتا ہے مگر اب قیاس اوسکا حقیقی قایم مقام زبان میں موجود ہے۔

اردو زبان کو علمی زبان بنانے کے لئے ایک کوشش ابھی اور باقی ہے۔ اوسکی طرف ابھی تک توجہ نہیں کی گئی۔ اب اوسکا وقت آگیا ہے وہ یہ ہے کہ عربی فلسفہ کی اصطلاحیں بعینہ اردو میں لے لی جائیں اس کے لئے اول تو اصطلاحات کی لغت خود عربی میں موجود ہے۔ مگر وہ لغت تنہا کافی نہیں ہے مناسب یہہ ہے کہ متداول کتب فلسفہ اور منطق سے الفاظ کا انتخاب کر کے ایک لغت مدون کیجائے اسمیں نہ صرف عربی کتابوں کے الفاظ بلکہ فارسی اور اردو میں جو علمی

ذخیرہ موجود ہے اس کے الفاظ بھی انتخاب کر لئے جائیں۔ مثلاً عربی سے شفا اشارات کلمۃ الاشراق تہافتہ الفلاسفہ شرح مواقف شرح مقاصد شروح تجرید وغیرہ علم اصول فقہ کی اصطلاحیں۔ فارسی زبان سے اخلاق ناصری۔ اخلاق جلالی۔ دانش نامہ۔ غیاث منصور۔ کیمیائے سعادت۔ اردو ترجمہ احیاء العلوم امام غزالیؒ ترجمۂ قانون شیخ الرئیس۔

یہ علمی ذخیرہ اصطلاحات جوان کتابوں سے لیا جائیگا وہ اردو کو علمی زبان بنانے کیلئے کافی ہوگا۔ اور خوبی اسکی یہ ہے کہ یہ لفظیں غیر مانوس اور مضحک نہ ہوں گی۔ جن سے طبیعت نفرت کرتی ہے۔ آئندہ اس معاملہ میں اور کچھ عرض کیا جائے گا۔

شُعاعِ خورشَید

از میر خورشید احمد صاحب ہیڈ کلرک فارن آفس شملہ

ترنم ریز میں رہتا ہوں موسیقار کی صورت　　نوا میں میرا ہر تار نفس ہے تار کیصورت
وفور جوشِ وحشت میں مرا کیا رنگ بدلا ہے　　ہے تن صورت گریباں کی گریباں تار کیصورت
نہیں پھولوں سمانے پھر تو چھالے میری تلووں کے　　کہیں جب دیکھتے ہیں وادی پر خار کیصورت
طفیل دیدۂ خونبار ہوں گلشن سے مستغنی　　مرا دامن مرے اشکوں سے ہے گلزار کیصورت
سنبھالا ہوش جب سے بخت کو خفتہ ہی دیکھا ہے　　نہ دیکھی خواب میں بھی طالع بیدار کیصورت
مدد اے جوش وحشت پھر مرے آئینۂ دل میں　　نظر آتی ہے سیر سبزہ سے زنگار کیصورت

ترے نظارہ سے لطف تکلم مجھکو حاصل ہے
ترے دیدار سے پیدا ہے اک گفتار کیصورت

فلسفۂ جنون

از جناب مولوی سید وہاج الدینصاحب گنتوری۔ بی۔ اے۔ بی۔ ٹی

جنون کی ماہیت

جنون، خبط، پاگل پن، یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں لیکن بہت کم لوگ ایسے ہیں جو ان کے حقیقی مفہوم یعنے "ماہیت جنون" سے واقف ہوں کسی سے سوال کرو کہ جنون کیا ہے، اگر تمہارا مخاطب طب یا نفسیات کا ماہر ہے تو تمہیں جواب ملیگا "جنون سے مراد اختلال نفسی ہے"۔ اگر وہ عامی ہے تو تم سے کہیگا کہ "فتور عقل کا نام جنون ہے"۔

طب میں جتنی تعریفیں 'جنون' کی کیگئی ہیں اون سب میں خواہ علت کہو یا ماہیت سمجھو 'اختلال نفسی' ضرور داخل ہے۔ عدالتوں میں اکثر اوقات مجرم یا گواہ کے مجنون ہونے یا نہ ہونیکا سوال پیش ہوتا ہے، اور بریت یا قبول شہادت دونوں کا انحصار اسی فیصلہ پر رکھا گیا ہے۔ پر بہم اگر تم کتب قانونی میں جنون کی کوئی جامع تعریف، یا اوسکا قطعی معیار تلاش کرو، تو وہاں تین بیانات ایک دوسرے سے متضاد تمکو نظر آئیں گے۔

(۱) قتل کے مقدمات میں، اگر یہ ثابت کیا جا سکے، کہ ارتکاب جرم کے وقت قاتل کا ذہن جرم کی اہمیت، اور اوس کے مستحسن یا قبیح ہونیکو نہیں سمجھ سکتا تھا، تو مجرم 'مجنون' قرار دیا جاتا ہے، اور پاداش جرم سے بچ جاتا ہے۔ یہاں معیار، استدلال کی صحت ہے

(۲) قانون شہادت، جنون کا معیار کچھ اور قرار دیتا ہے، یہاں معنی کی حقیقت یا اوس کے حسن و قبح سے بحث نہیں کیجاتی، بلکہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاہد نے بوقت شہادت، "بہ ثبات ہوش و حواس" دبہ درستی حافظہ، گواہی دی ہے یا نہیں، اگر یہ باتیں نہیں ہیں، تو جھوٹی گواہی، یا دروغ حلفی کا مواخذہ اوس سے نہیں کیا جاسکتا، اس صورت میں

دکھیو تو جنون کا معیار کچھہ اور ہی ہے۔

(۳) اگر کوئی عورت قانونی طریقہ پر اپنے شوہر سے علحدہ ہونا چاہے، اور یہ عذر کرے کہ اوسکا شوہر مجنون ہے، تو اوسوقت عدالت کی تحقیقات کا مرکز یہ ہوتا ہے کہ "شوہر اپنے کاروبار زندگی کو اچھی طرح چلا سکتا ہے یا نہیں" یہاں دکھیو تو طرز عمل کی خرابی، فتور عقل کو مستلزم سمجھی جاتی ہے۔

سطور بالا میں ہم نے عدالتی معیار جنون کی تین صورتیں پیش کی ہیں اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ یہ تینوں ایک دوسرے سے کسی حد تک متبائن ہیں اگر (۱) اور (۲) پر غور کرو تو معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں صورتوں میں جو کچھہ معیار جنون مقرر کیا جاتا ہے وہ محض قیاسی ہے کسی حاکم عدالت کے پاس یہ ثابت کرنے کے کون سے ذرایع ہیں کہ مجرم "معنی کی حقیقت کو نہ سمجھہ سکتا تھا؟ یا یہ کہ "شاہد" بوقت شہادت "ثبات عقل و ہوش و حواس" نہ رکھتا تھا؟ دوسروں کے نفوس کی کیفیات کا علم بغیر کسی مظہر خارجی کے ہمیں کیونکر ہو سکتا ہے؟ اگر کوئی شخص ساکت و صامت بیٹھا ہو، تو تمھارے پاس اوس کے واردات نفسی کا اندازہ لگانے کی کونسی صورت ہے؟ اگر دو آدمی پاس پاس بیٹھے ہیں اور اون میں سے ایک ذی عقل و صاحب ہوش اور دوسرا فی الواقع مجنون ہے، لیکن دونوں خاموش ہیں، تو تم کس بنا پر کہہ سکتے ہو کہ اس صورت میں اختلال نفسی ہے، اور دوسری صورت میں نہیں ہاں مگر جب یہی دونوں آدمی کوئی فعل کریں تو اوسکو دیکھکر تم البتہ اون کیفیات نفسی کا اندازہ لگا سکتے ہو جنکا یہ فعل مظہر ہے۔

یہی غلطی ہے جو عام طور پر ماہیت جنون کے متعلق کیجاتی ہے۔ کیفیات نفسی کو، جن کا ہم قطعیت کیساتھ اندازہ نہیں لگا سکتے، معیار جنون مقرر کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ ہمارے ادراک سے باہر ہوتی ہیں؛ (۱) اور (۲) میں یہی غلطی پائیجاتی ہے (۳) اس سے بری ہے، کیونکہ اوسمیں "کیفیات" کے بجائے "مظاہرات" کو معیار قرار دیا گیا ہے، یعنے یہہ کہ

فلاں شخص اپنے کاروبار زندگی کو اچھی طرح چلا سکتا ہے یا نہیں"۔ اس مضمون کو پڑھتے وقت یہی بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ اختلال نفسی اور جنون مرادف الفاظ نہیں ہیں، اور یہ کہ "جنون" کا صحیح معیار اگر کچھ ہو سکتا ہے، تو وہ حرکات و سکنات، رفتار و گفتار، یا مختصراً یوں کہو کہ "طرز عمل" ہے۔ برخلاف اسکے اگر "اختلال نفسی" کو معیار فرض کرلو تو ایک اور پیچیدگی پیدا ہوتی ہے، وہ یہ کہ بہت سی باتیں ہم سے ایسی سرزد ہوتی ہیں کہ جنکو ایک معنی میں "اختلال نفسی" کا معلول کہا جا سکتا ہے لیکن پھر بھی دائرہ جنون میں داخل نہیں کیا جا سکتا۔ زید کی حس بصری سرخ اور سبز رنگوں میں تمیز کرنے سے عاجز ہے، قوت تمیزی کا یہ تعطل، توازن نفسی کے درہم و برہم ہونیکو مستلزم ہے۔ لیکن زید کو کوئی مجنون نہیں کہتا۔

(۲) میرے پاس ایک دوکاندار ماہواری حساب لیکر آتا ہے، میں دیکھتا ہوں کہ تیرہ روپیہ دس آنہ واجب الادا ہیں، اور یہ رقم گن کر دوکاندار کے حوالہ کرتا ہوں، وہ میری طرف حیرت سے دیکھکر دبی زبان سے کہتا ہے کہ "تین روپیہ اور دیجیے"۔ غور سے حساب کو دیکھتا ہوں تو واقعی سولہ روپیہ دس آنہ ہیں، میری قوت باصرہ بھی اچھی خاصی ہے، روشنی بھی کافی ہے، ۶ کا ہندسہ بھی صاف لکھا ہوا ہے، ظاہر ہے کہ یہ التباس نگاہ خلل نفسی کی کسی صورت کی وجہ سے ہے، لیکن تم مجھے مجنون نہیں کہہ سکتے۔

(۳) میرا دوست محمود ہمیشہ کا تیز مزاج مشہور ہے، شام کو چار بجے جب وہ دفتر سے واپس آکر چاء پینے بیٹھتا ہے تو خفیف سے خفیف باتوں پر بہت جلد مشتعل ہو جاتا ہے ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ چاء میں شکر زیادہ ہوگئی، اوس نے غصہ میں گرم چاء کی پیالی نوکر پر پھینک ماری"۔ تاثرات طیش و غضب کا یہ مبالغہ آمیز اظہار محمود کے نفس میں کسی نہ کسی (عارضی) رخنہ کا پتہ دیتا ہے، لیکن محمود کو کوئی مجنوں نہیں کہتا۔ مذکورہ بالا تینوں مثالوں میں دیکھو کہ باوجود اسکے کہ تحسسات[۱]، ادراک[۲]، اور تاثرات[۳] میں خلل رونما

ہوا، لیکن 'جنون' کا حقیقی معنوں میں اطلاق کسی ایک صورت پر بھی نہیں ہو سکتا۔

ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ حالت جنون میں اختلال نفسی، خواہ محسوسات کی صورت میں ہو یا درک کی، خیالات میں ہو یا "تاثرات" میں، سرے سے ہوتا ہی نہیں۔ نہیں ہوتا ضرور ہے۔ لیکن جس طرح سمندر کے پانی میں نمک کا وجود ہوتا ہے اور سمندر کے پانی کو نمک نہیں کہہ سکتے، اسی طرح 'جنون' کا مرادف صرف اختلال نفسی ہی نہیں ہو سکتا بلکہ اور بہت سی باتیں جنون کے مفہوم میں داخل ہیں۔ 'کیفیات نفسی' میں مجموعہ خیالات احساسات و جذبات سے عبارت ہیں۔ وہ سب کے سب نام ہیں ہمارے دماغ کے مراکز اعلیٰ کے وظیفہ طبعی کے۔ اول الذکر کو ثانی الذکر سے منفک نہیں کیا جا سکتا۔ پس ہم کہنا کہ فلاں شخص کو 'اختلال نفس' کی شکایت ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ اوس کے دماغ کے لئے مراکز اعلیٰ اپنے اپنے متعلقہ وظائف باحسن وجوہ انجام نہیں دیرہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے جملہ مظاہرات نفسی، حرکات و سکنات، رفتار و گفتار، کردار جن کے لئے ہم نے طرز عمل کی اصطلاح استعمال کی ہے، سب کے سب اعلیٰ مراکز اعصابی کی تحت میں ہیں۔ لہذا اعصاب کی ترتیب، اور اون کے وظائف میں خلل واقع ہونے سے ان سب میں بھی بے عنوانی پیدا ہو جاتی ہے، اور اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے آپ کو خارجی حوادث و عوارض سے مطابق نہیں کر سکتا، اور یہی چیز یعنے "عدم مطابقت بہ حالات خارجی" جنون کا حقیقی مظہر ہے۔ اگر کوئی شخص بے تکلف احباب کے حلقہ میں بیٹھکر اپنے آپ کو بہ تکرار رستم کہے لیکن روزانہ کاروبار زندگی کو معمولی ذی ہوش آدمیوں کی طرح انجام دے تو تم اوس کو مجنون نہیں کہہ سکتے، اب اگر یہی شخص اپنی بیوی کو تہمینہ، اور اپنے بیٹے کو سہراب کے نام سے یاد کرے، سنجیدگی، اور متانت کے مواقع پر کسی لکڑی کو 'گرز گراں' کہکر ہلانے لگے، یا اپنے بیٹے کی قمیص کھولکر 'مہرہ' تلاش کرنے لگے تو اوس صورت میں البتہ عقل و شعور کی عدالت سے اس شخص کے مجنون

ہونیکا فیصلہ صادر ہوگا؛ کیونکہ اس سے اپنے آپ کو حالات و واقعات خارجی سے مطابق کرنیکی صلاحیت بالکل مفقود ہو گئی ہے، اور اس کے اعلیٰ مراکز اعصابی مختل ہو گئے ہیں مثلاً اس مخصوص صورت میں ممکن ہے کہ شاہنامے کے ضرورت سے زیادہ مطالعے نے اس کے متخیلہ پر اس حد تک قبضہ کر لیا ہو کہ وہ استدلال کے قابو سے باہر ہو گیا ہو اور حقیقت اور غیر حقیقت میں تمیز نہ کر سکتا ہو۔ غرضکہ اس بحث سے ہم جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں وہ یہ ہے کہ جنون صرف اختلال نفسی کا نام نہیں ہے بلکہ اختلال وظیفہ اعصابی اور فقدان ملکہ مطابقت بماحول کا بھی اوس میں حصہ ہے، اور ان تینوں کا مشترکہ عمل جنون کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

سطور بالا میں جو تعریف جنون کی کیگئی اوسکو ایک لحاظ سے دیکھو تو اون تعریفات پر ضرور فوقیت حاصل ہے جو محض 'اختلال نفسی' یا طرز عمل کو معیار قرار دیتی ہیں، لیکن پھر بھی اسکی وسعت نقص کا پہلو لئے ہوئے ہے، اور معمولی باتیں، مثلاً سہو، نسیان، ذہول، التباس نگاہ، عدم قابلیت استحضار¹، سوء استدلال، سب کی سب اسکی تحت میں آجاتی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کو عدم مطابقت بحالات خارجی سے تعبیر کر سکتے ہو۔ اس اعتبار سے 'زید' میں، اور محمود تینوں مجنون قرار پاتے ہیں حالانکہ عرف عام میں جنون کا اطلاق تینوں میں سے کسی ایک پر بھی نہیں ہوتا۔ پس ضرور ہوا کہ اون حدود کا بھی لحاظ کیا جائے جن کی ماتحت جنون کی مذکورہ بالا تعریف حقیقی معنوں میں صادق آجائے۔ اور یہ کچھ ایسا مشکل کام نہیں ہے۔

فرض کرو کہ تمھارے پیش نظر ایک مقفل دروازہ ہے جسکی کنجی تمھارے پاس ہے تم قفل کھولنے کی کوشش کرتے ہو لیکن ناکام رہتے ہو، اس ناکامی کے

¹ "تحفظ" اور "استحضار" یہ دونوں نفسیات کی اصطلاح ہیں، حافظہ کے دو عمل ہیں تحفظ سے واقعات کا ذہن میں محفوظ رکھنا اور "استحضار" سے اون کا بروقت ضرورت ذہن کے سامنے لے آنا مراد ہے۔

تین سبب ہو سکتے ہیں (۱) ممکن ہے کہ کنجی میں خرابی ہو، اوسکی نالی میں کوئی چیز اٹکی ہوئی ہو، یا اوس کے دانت گھس گئے ہوں (۲) ممکن ہے کہ قفل میں خرابی ہو، اوسکا کھٹکا ٹوٹ گیا ہو، یا زنگ کیوجہ سے اوس کے پرزے جم گئے ہوں، غرضکہ خواہ کنجی خراب ہو یا قفل میں نقص ہو، تمھاری کوشش ناکام رہتی ہے۔ لیکن ان دو کے علاوہ ایک اور بھی صورت ہوسکتی ہے (۳) وہ یہ کہ نہ کنجی خراب ہو اور نہ قفل، بلکہ تمھارے کھولنے کے طریقے میں کوئی نقص ہو، مثلاً یہ کہ تم کنجی کو ٹھیک طور پر نہیں بٹھاتے یا یہ کہ اوسے غلط رُخ میں گھما رہے ہو، تمھاری کوشش اب بھی ناکام رہے گی، لیکن کنجی یا قفل کی خرابی کیوجہ سے نہیں بلکہ تمھارے کھولنے کے طریقے کے نقص کیوجہ سے۔

بالکل یہی حال ہماری مطابقت بہ ماحول کا ہے، اگر دماغ انسانی کو کنجی فرض کرلو اور ماحول کو قفل مانو، تو ناکامی کے یہی تین اسباب ہوسکتے ہیں یا تو دماغ فطرۃً کوئی نقص رکھتا ہے، یا ماحول بہت کچھ پیچیدہ ہے یا یہ کہ دونوں اپنی معمولی حالت پر ہیں لیکن طریقہ مطابقت میں نقص ہے۔ یہی آخری شق دائرہ جنون میں داخل ہے، اور پہلی دو صورتیں اوس کے حلقہ سے باہر ہیں۔

ایک بہرا آدمی اپنے خیالات میں منہمک سڑک پر چلا جا رہا ہے پیچھے سے آنیوالی گاڑی کی آواز وہ نہیں سُن سکتا۔ اور اوسکی زد میں آجاتا ہے یہ شخص مطابقت بہ حالات خارجی (اچک کر ایک طرف ہو جانا) سے قاصر رہا لیکن قصور "کنجی" کا ہے اگر یہ شخص سماعت سے محروم نہ ہوتا تو یقیناً گاڑی کے راستہ سے ہٹ جاتا، اور اپنے آپ کو بچا لیتا۔ دوسری صورت یہ ہوسکتی ہے کہ نہ تو ہمارے دوست کی سماعت میں فرق ہے اور نہ وہ کچھ ایسا ضعیف و کمزور ہے کہ دوڑ نہ سکے لیکن پھر بھی راستہ میں اتنا شور ہو رہا ہے کہ اوسکو پیچھے سے آنیوالی گاڑی کی آواز نہیں سنائی دیتی، اور یہ شخص گاڑی کے نیچے آجاتا ہے اس صورت میں قصور "قفل" کا ہے حالات خارجی پیچیدہ تھے جس کی

وجہ سے یہ شخص ان سے مطابقت کرنے سے قاصر رہا۔ غرضکہ ان دونوں صورتوں میں ہم اس شخص کو مجنون نہیں کہہ سکتے۔ ایک تیسری صورت اور بھی ہوسکتی ہے کہ نہ تو یہ شخص حسِّ باصرہ سے محروم ہے۔ اور، حرکت سے قاصر، اوسکی حسِّ سامعہ بھی اچھی خاصی ہے سڑک بھی صاف ہے۔ اور سامنے سے آنیوالی گاڑی اچھی طرح نظر آتی ہے، لیکن یہہ شخص بجائے اسکے کہ ایک طرف ہوجائے، بیچ میں کھڑا ہوکر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر گاڑی کی طرف دیکھتا ہے، بچنے کی کوشش نہیں کرتا اور بالآخر گاڑی کی زد میں آجاتا ہے۔ اب اس صورت میں نہ تو کنجی (دماغ) کا قصور ہے، نہ قفل (ماحول) میں نقص ہے بلکہ طریقہ مطابقت کی خامی ہے۔ اور یہی صورت فی الحقیقت جنون کی ہے۔

مذکورۂ بالا اثمال کا تعلق ادراک سے تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ کیفیات نفسی کے ہر شعبہ پر مذکورۂ بالا معیار کا اطلاق ہوسکتا ہے۔ میرے دوست محمود کے مبالغہ آمیز تاثرات غیظ وغضب جب تک کہ اثرات ماحول (دفتر کی محنت شاقہ، افسر بالا کی ناراضی) کیوجہ سے ہیں تب تک وہ یقیناً دائرۂ جنون سے باہر ہے، لیکن اگر یہہ وقت اوسکا یہی حال رہے تو محمود کے مجنون ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ اسی طرح سے اگر میری شکایت (التباس نظر) عارضی ہے تب تک سہو ہے، لیکن دوکاندار کے بتانے کے باوجود اگر میں اس پر مصر ہوں کہ ۶ اکا عدد نہیں بلکہ ۱۲ کا ہے تو یہ مستقل فریب نگاہ مجھہ میں جنون کے شائبہ کا پتہ دیگا۔ زید کو مجنون اسوجہہ سے نہیں کہہ سکتے کہ خرابی جو کچھہ ہے، کنجی کی ہے یعنے اوس کے اعصاب مختلف رنگوں میں تمیز کرنے سے عاجز ہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ مطابقت بماحول کے کسی جز کو لو، تمکو یہی کیفیت نظر آئے گی۔ اگر ناکامی کی وجہ حالات خارجی کی پیچیدگی، یا دماغ انسانی کی فطری یا عارضی خامی ہے تو اُس صورت میں اُسے غلطی، سہو، فروگذاشت وغیرہ کا نام دے سکتے ہو، لیکن اگر ماحول ایسا ہے جیسا کہ معمولاً اور طبعاً ہوا کرتا ہے۔ یا دماغ کی حالت ویسی ہے جیسی کہ

اوسط درجہ کے صحیح دماغ والوں کی ہوتی ہے اور صرف طریقہ مطابقت میں یہ تکرار خلل ہے تو اس عدم مطابقت بحالات خارجی کو جنون کا مرادف کہنا پڑے گا خواہ یہ اختلال طرز عمل کا ہو یا تحسسات کا، جذبات کا ہو یا استدلال کا، ادراک کا ہو یا حافظہ کا۔

جنون کی ماہیت کے متعلق مذکورہ بالا بیان اگر صحیح مان لیا جائے تو اوسکی کچھ فروعات اور بعض ضروری نتایج بھی پیدا ہوتے ہیں جن سے بحث کرنا خارج از دلچسپی نہ ہوگا +

(باقیدارد)

دیکھ لے

از جناب مولوی سید نثار احمد صاحب تاج واحمدی

یہ قصر و بام و گنبد و مینار دیکھ لے　　پھر ان شکستہ قبروں کے آثار دیکھ لے

یہ تاج و تخت والے ہیں بوریا نشیں　　اور یہ ہیں چند قوم کے سردار دیکھ لے

یہ ہیں امام وقت یہ ہیں صوفی زماں　　اور اب فنا ہے غاشیہ بردار دیکھ لے

اہل دول بھی دفن یہاں ہیں ہزار ہا　　اے نیچۂ ہوس کے گرفتار دیکھ لے

حسن عمل کی قوم ہیں وہ سرد مہریاں　　اور یہ فنا کی گرمئ بازار دیکھ لے

ہاں ہاں شکستہ حالی اعیان قوم دیکھ　　سرسبزی ارازل و انفار دیکھ لے

بیٹوں کی باپ ماں سے صف آرائیاں بھی دیکھ　　بھائی سے بھائی برسر پیکار دیکھ لے

کیا پوچھتا ہے حلت و حرمت کا مسئلہ　　بنتے ہیں کس طریق سے زردار دیکھ لے

غافل! جہالتوں کا ہے انجام بدتری　　اس ایک ہی نتیجہ کو سو بار دیکھ لے

تو محفل رقیب میں جاتا ہے احمدی
آنحضرتِ فدا کا بھی دربار دیکھ لے"

مآلِ سرکشی

از جناب مولوی سید محمد عسکری صاحب عدیلؔ گنوری

آج دل خود بخود جو گھبرایا　　شہر سے دشت میں چلا آیا
تھی جو خاطر دلِ پریشاں کی　　سیر کرنے لگا بیاباں کی
تازگی ہر درخت کی دیکھی　　سادگی سنگ سخت کی دیکھی
خوش نما کیفیت بوٹوں کی　　اور فضا زرد زرد پھولوں کی
اک طرف سبز سبز ہریادل　　نرم ہے مثلِ چادرِ مخمل
کہیں خودرو طرح طرح کے پھول　　جنکو حاصل نظر کا حسنِ قبول
کہیں آبِ رواں کہیں چشمے　　نہ پھرے اپنے جب لگا دے جمے
بہنا آبِ رواں کا تھم تھم کے　　جا بجا کائی رہگئی جم کے
سب کو دکھلاتے ہیں بہار اپنی　　چھاؤں دیتے ہیں یادگار اپنی
دفعتہً اک ہوائے تند چلی　　جس کی تیزی بہت ہی دلکو کھلی
خاک اڑانے لگی بیاباں میں　　پتیاں لائی بھر کے دامن میں
اک طرف ایک گردباد اٹھا　　یا دلِ دشت سے فساد اٹھا
میں یہ سمجھا کہ روحِ مجنوں ہے　　جوشِ وحشت میں یوں گرگوں ہے
یا کہ آتی ہے ناقہ پر لیلیٰ　　نعشِ مجنوں پہ کرنے واویلا
اتنے میں اور بھی بلند ہوا　　دیکھتے دیکھتے دوچند ہوا
ناگہاں لیکے کوہ سے ٹکّر　　منتشر ہو گیا وہ سرتاسر
دیکھ کر یہ مآلِ سرتابی　　یاد آئی نصیحتِ سعدی *

* ہرکہ بیہودہ گردن افرازد
خویشتن راز گردن اندازد

نقشِ قدم

از جناب مرزا مہدی خاں صاحب کوکب - اے - آر - ایس - ایم - ایم - آر - اے - ایس - ایف - جی - ایس -

باب اوّل

نقشِ قدم

میں شاید مشکل سے آدھ گھنٹہ سویا ہوں گا - کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجنی شروع ہوئی جو میرے مکان اور کوتوالی کے صدر دفتر سے ملا ہوا تھا -

اس گھنٹی کی آواز یا کمرے میں آگ جلنے کی سرسراہٹ کے سوا اور کوئی چیز میری توجہ کو اپنی طرف پھیرنے والی نہ تھی -

کئی روز سے برابر یہ اتفاق پیش آ رہا تھا کہ مجھے راتوں کو کام کے لئے باہر جانیکا اتفاق ہوا تھا اوسی زمانہ میں ایک سنگین مقدمہ سے فراغت ملی تھی جسمیں ایک بہت ہی چالاک دغاباز کو ۱۴ سال کی سزا ہوئی - اس لئے میں نے سونے کے قبل اپنی خوابگاہ کی کھڑکیوں کے پردے چھوڑ دیئے تھے آرام سے سوسکوں - اوس دھندلی روشنی میں جو دریچوں کے پردے میں سے چھن کر آتی - اور صبح کے ورود سے خبر دیتی تھی - ٹیلیفون کی طرف بڑھا - گھنٹی کے جواب میں میں نے گھنٹی بجائی -

کون ہے؟ کیا تم کرافرڈ ہو؟

میں نے جواب دیا " جی ہاں میں ہوں " اور مجھے معلوم ہوا کہ اوسطرف پولیس کے افسر اعلیٰ ہیں جو مجھ سے گفتگو کر رہے ہیں -

مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہیں اسوقت جگایا لیکن کوئی چارا نہ تھا -

میں نے پوچھا "کیا اور کوئی حاضر نہیں ہے"۔

"اس کام کے لایق دوسرا کوئی موجود نہیں ہے"۔

"معاملہ کیا ہے"۔

"تم بوڑھے جج ٹریورز کو تو پہچانتے ہو"۔

"بخوبی"۔

"مر گئے"۔

"حیرت ہے! میں نے تو کل ہی اون کو دیکھا تھا"۔

"مگر اب تو وہ مر گئے ہیں"۔

"یہہ کب اور کیسے؟"

"آج ہی رات کو۔ اسمیں کچھہ شبہ پایا جاتا ہے۔ ان کے بھتیجے نے اسی وقت اطلاع دی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ تم فوراً جاؤ اور قبل اس کے کہ کوئی اور اسمیں دست اندازی کرے ذرا واقعات دریافت کرلو"۔

میں کچھہ بڑبڑانے لگا کیونکہ چندروز سے مجھے سونا نصیب نہیں ہوا تھا اور میں نے ارادہ کرلیا تھا کہ اوسکی تلافی کرلوں گا۔ لیکن فرض منصبی کے خیال نے میری مدد کی اور میں نے جواب دیا "دس منٹ میں جاتا ہوں"۔

"تم جانتے ہو ان کا مکان کہاں ہے"۔

"جی ہاں"۔

"ذرا اون کے بھتیجے کا بھی خیال رکھو۔ وہ کچھہ مشتبہ سا نظر آتا ہے ضرور کوئی مجرمانہ کارروائی ہوئی ہے۔ المناک حادثہ ہے"۔

"بہت اچھا۔ میں دوپہر تک اسکی اطلاع دونگا"۔

ٹیلیفون کو چھوڑکر میں دریچوں کی طرف بڑھا اور پردے الٹ دیئے۔

اخیر جاڑوں کے موسم کی صبح تھی۔ شہر نیویارک کی اس سنسان سڑک پر جہاں میرا مکان تھا اتنے سویرے کسی طرح کی چہل پہل نظر نہیں آتی تھی۔

کچھ لوگ اپنے اپنے کاموں پر نکلے تھے ایک دودھ کا چھکڑا اور ایک روٹی والے کی گاڑی گرما گرم روٹیاں گاہکوں کے مکان پر تقسیم کرتی پھرتی تھی۔ بس جو کچھ تھا یہی تھا۔ میں نے جمائی لی۔ انگڑائی لی۔ اور سوچنے لگا کہ آخر کیوں لوگ دوسروں کے معاملے میں اسقدر دلچسپی لیتے ہیں حتی کہ مرنے والوں کو بھی نہیں چھوڑتے۔

دس منٹ ختم ہو گئے میں مکان سے نکل کھڑا ہوا اور تھوڑے عرصہ میں اسٹیشن پر پہنچکر اوس ریل کا انتظار کرنے لگا۔ جو وہاں سے جانے والی تھی۔ ریل آئی۔ میں سوار ہوا اور ٹیلیفون آنے کے ایک گھنٹے کے اندر شہر کے اوس اسٹیشن پر پہنچ گیا جو سنٹرل پارک سے چنداں دور نہ تھا۔

گزشتہ شب میں سخت طوفان آیا تھا اور جب تک اس کا زور رہا بالکل گرم ملکوں کے طوفان کی سی حالت تھی۔ بجلی کی چمک اور رعد کی کڑک نے شہر کے آرام و سکون میں رات کے بارہ بجے سے خلل ڈال رکھا تھا۔ اسوجہ سے صبح کی ہوا اب تک کہر سے دھندلی ہو رہی تھی۔ میں تیزی کیساتھ اپنے منزل مقصود کی طرف چلا۔ اس نواح میں ٹریورز کا مکان اسقدر مشہور تھا کہ بچہ بچہ اس سے واقف تھا۔

میں بہت جلد مکان کے احاطہ تک پہنچ گیا جسکا رقبہ نصف ایکر سے زیادہ بلکہ شاید ایک ایکڑ ہوگا۔

یہاں پر میں نے پولیس کے سپاہی کو جو رات کی نوکری پر تھا اور جس کی گزر میں یہہ مکان واقع ہے۔ اپنی طرف آتے دیکھا۔

وہ مجھے اچھی طرح پہچانتا تھا میں نے اوس سے مصافحہ کیا اور مجھے خیال آیا کہ اوس سے کچھ حال دریافت کروں۔

میں نے پوچھا "ٹام۔ کیا کل شب کو تمھاری گذر میں کوئی حادثہ ہوا؟"۔

"کوئی غیر معمولی حادثہ تو نہیں ہوا مگر تم یہ سوال کیوں کرتے ہو؟"

وہ نہایت تیز ہوش تھا اور میرے مطلب کو فوراً تاڑ گیا میں نے کہا۔

"ہاں۔ کل رات جج کے مکان سے کوئی چیز جاتی رہی ہے اور مجھے اسکی دریافت کے لئے بھیجا گیا ہے"۔

"کیا نقب لگائی گئی ہے؟ عجب"۔

"شاید"

"دیکھیئے طوفان کے بعد ہی میں نے ایک دھندلی شکل کو دیکھا کہ اوس دیوار کے شکستہ حصہ سے اس طرف آرہی ہے۔ میں نے پہلے تو خیال کیا کہ کوئی مخمور آدمی ہے جو میری طرف لڑکھڑاتا چلا آتا ہے اور اپنا ہاتھ سر پر رکھتا جاتا ہے لیکن جب میں نے اوسکا تعاقب کیا تو وہ دفعتہ ایسا غائب ہو گیا گو یا زمین شگافتہ ہو کر اوسکو نگل گئی"۔

اس بات کے سُننے سے مجھے دلچسپی پیدا ہوئی اور ہونی چاہیئے کیونکہ مجھے پہلا سُراغ ہاتھ لگا۔ میں نے خیال کیا کہ شاید یہ شخص جو رات کو اوس ٹوٹی ہوئی دیوار کیطرف لڑکھڑاتا ہوا نکل گیا وہی ہو جو جج کی ہلاکت کا ذمہ دار ہے۔

"مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ ٹام۔ اگر یہ معلوم ہو سکے کہ وہ کون شخص تھا؟"

"شاید میں بتلا سکوں۔ کیونکہ۔ دیکھیے۔ وہ اسی چراغ کے نیچے سے گذرا اور غائب ہو جانے سے پہلے اوس نے پلٹ کر دیکھا تھا۔ اس خوف سے کہ شاید کوئی اسکا تعاقب تو نہیں کرتا ہو مجھے اوسکا چہرہ ایسا بھیانک اور خوفناک نظر آیا کہ خدا نہ کرے میں پھر ایسی صورت دیکھوں لیکن میں نے اوسے آگے دیکھا ہے اور شاید آپ کو اوسکا حلیہ بتلا سکوں۔ دیکھیے ایک شخص چند دنوں سے اس نواح میں گشت لگاتا ہوا نظر آتا ہے جو نہایت مفلوک الحال اور دل شکستہ معلوم ہوتا ہے ایسا شخص کسی کام کے کرنے میں تامل نہیں کر سکتا۔ میں نے ایک

مرتبہ اسکو ویلین بنیئے کی دوکان میں دیکھا تھا۔ جو ساتویں سڑک پر ہے آپ تو اوس دکان کو اچھی طرح جانتے ہیں جہاں ہم دونوں نے اوس فرانسیسی سکہ قلب بنانے والے کو بالاخانہ پر گرفتار کیا تھا؟"

"ہاں۔ مجھے خوب یاد ہے۔ کیا تم خیال کرتے ہو کہ اوسکا پتہ وہاں ملے گا؟"

"ویلین اوسکو پہچانتا ہے مجھے یاد پڑتا ہے کہ اسکو مسٹر جبری کہکر پکارتا تھا"

"شکریہ۔ ٹام۔ تم نے مجھے اس مکان میں داخل ہونیسے قبل جو اتنا پتہ دیدیا یہ بہت اچھا ہوا"

"آئیے تو میں آپ کو وہ دیوار بھی دکھادوں جہاں سے وہ کود پڑا تھا اور اوس کا بدحواسی سے کودنا حالت خوف کو ظاہر کررہا تھا۔ اوسوقت میں سڑک کے اوس سٹپے ہوئے حصہ پر اوس درخت کے قریب کھڑا ہوا تھا جب وہ یہاں سے باہر نکلا"

"ذرا ٹھہر جاؤ وہاں قدم نرکھو"

"کیوں؟ کیا ہے؟"

"قدموں کے نشان ہیں۔ یہ بارش کے موقوف ہوجانے کے بعد کے ہیں اسسے کچھ پتہ چلے گا۔ تم نے کہا کہ یہ شخص طوفان کے موقوف ہوجانے کے بعد نظر آیا"

"جی۔ ہاں۔ یقیناً"

"تو پھر اوسی کے قدم کے نشان ہیں"

میں نشانوں کا امتحان کرنے کیغرض سے جھکا۔ یہ نشان کسی معمولی آدمی کے پاؤں کے نہ تھے۔ ان سے ظاہر تھا کہ جوتا عمدہ ساخت کا ہے۔ لیکن پرانا۔ اور کسی اناڑی موچی نے اوس کے دونوں تلو ں میں بھدا سا ترچھا پیوند لگایا ہے۔ اگر اس پولیس افسر سے مجھے کوئی اطلاع نہ بھی ملی ہوتی تو بھی یہ پیوندار جوتے کا نشان بجائے خود ایسا عجیب الہیئت تھا۔ جو مجرم کا پتہ لگانے کو کافی تھا۔

"ایک بات اور ہے وہ شخص غالباً کچھ مال و اسباب لیکر نہیں گیا کیونکہ جب میں نے اوسے بھاگتے ہوئے دیکھا تو اوس کے ہات میں کوئی پوٹلی وغیرہ نہ تھی۔"

میں نے یہ کب کہا کہ چوری ہوئی۔"

"معاف فرمایئے آپکے استفسار کے میں نے یہی معنے لئے تھے گو آپ نے اس لفظ کا استعمال نہیں کیا تھا"

"میں نے صرف اتنا کہا تھا کہ کوئی چیز جاتی رہی ہے"

"بیشک۔ لیکن جب کوئی چیز کھوئی جائے تو اس کے معنے یہی ہیں کہ چوری گئی ہوگی۔

"نہیں۔ ہمیشہ نہیں"

"تو پھر کیا چیز جاتی رہی مسٹر کرافرڈ۔"

"جان"۔

اس کے سنتے ہی اوسکو سکتہ سا ہو گیا اور اوس نے گھبرا کر پوچھا" تو صاحب کیا کسی کا خون ہوا ہے"۔

"ہمیں اب تک معلوم نہیں یہ کہنا ذرا دشوار ہے کہ اصل بات کیا ہے کیونکہ میں واقعات سے واقف نہیں ہوں لوگ اس زمانہ میں خودکشی بھی کر لیتے ہیں ممکن ہے کہ جج صاحب نے خودکشی کر لی ہو"

"تو کیا وہ بوڑھا جج مر گیا"؟

"ہاں۔ اور میں اسی کی تفتیش کے لئے بھیجا گیا ہوں۔ دیکھو ٹام جو کچھ تم نے دیکھا ہے۔ اس کے متعلق ایک لفظ بھی کسی سے نہ کہنا۔ جب تک کہ میرا صریح حکم تمکو ملے کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے اوسے بیان کرو"۔

"آپ کا مطلب خاموش رہنا ہے؟۔

"مجھے یقین ہے کہ میں تم پر بھروسا کر سکتا ہوں۔ خدا حافظ"۔

بجائے اس کے کہ میں سیدھا اوس پختہ راستہ سے جج کے احاطہ کے پھاٹک تک

چلا جاؤں میں دیوار کو جہاں وہ پست تھی پھاند گیا احاطہ نہایت عمدہ حالت میں تھا
اور دیوار کا یہ شکستہ حصہ حال ہی میں منہدم ہوا تھا جسکی تعمیر عنقریب ہونیوالی تھی۔

یہہ ایک قدیم شاندار عمارت تھی جسکا ایک حصہ پتھر کا اور باقی چونے اور اینٹ کا تھا
اگرچہ عمارت بالکل سادہ تھی، اور باہر سے قدیم ولندیزی (ڈچ) نمونہ کی تھی مگر اندر نہایت
آراستہ تھی کیونکہ جج صاحب بڑے آدمی تھے۔

درختوں کے نیچے نیچے چلتے ہوئے میرے لئے چنداں مشکل نہ تھا۔ کہ اون
پیوندار جوتوں کے نشان دیکھتا ہوا جاؤں۔ کیونکہ وہ شخص اسی راستہ سے آکر گیا تھا۔
یہ نقش قدم جو مکان تک پہنچے تھے بعض جگہہ رات کی شدید بارش کیوجہہ سے
مٹ گئے تھے۔ لیکن مجھے معلوم ہو گیا کہ وہ شخص اوس احاطہ میں طوفان آنے کے قبل
داخل ہوا تھا۔

گو کہ اوسوقت شدید تاریکی ہو گی لیکن وہ بظاہر اپنے راستہ میں ہر قسم کے موانع سے
بچتا ہوا گیا تھا اور اس سہولت کیساتھ کہ گویا روز روشن تھا اوس کے پاس کوئی لالٹین
بھی نہ تھی۔ کیونکہ ٹام نے اسکا ذکر نہیں کیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس احاطہ کے جغرافیہ سے
اچھی طرح سے واقف تھا۔

میں نے ان باتوں کو خوب ذہن نشین کر لیا کیونکہ آئندہ ان سے کام نکلنے کی امید
تھی۔ ان نشانوں کی سیدھ پر چلتا ہوا میں پھولوں کے چمنوں میں اور درختوں کے جھنڈوں
میں سے گذرا یہاں تک کہ مکان کے روبرو پہنچگیا۔ اس مکان میں قبر کی سی خاموشی تھی۔
اور یہ نقش قدم مکان کے اطراف میں نہیں تھے بلکہ ایک مخصوص دریچہ کے نیچے دفعتاً ختم
ہو گئے تھے۔

یہ تو یقین ہے کہ چور چکار جو اوس عمارت میں چوری کی غرض سے داخل ہو گا۔
وہ سب سے پہلے مکان کے اطراف میں چکر لگائے گا۔ اور تمام دروازوں اور دریچوں کو

دیکھے گا تاکہ معلوم کرلے کہ کوئی کھٹکا یا زنجیر غفلت سے کھلی نہیں رہ گئی۔ جس سے اُس کے کام میں سہولت ہو۔ دوسری بات یہ تھی کہ اس شخص کا کوئی خاص مطلب تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ کہاں جارہا ہے۔

وہاں کے ماحول کو خوب ذہن نشین کر لینے کے بعد تاکہ میں پھر اس موقعہ کو پہچان سکوں میں اوس قدیم عمارت کے سامنے آپہنچا۔

وہاں نہایت سکون و خاموشی کی حالت تھی اور اس عظیم الشان شہر کے اطراف کے شور و غوغا سے وہ حصہ بالکل مامون تھا۔ اس لئے کسی کے دل میں بھی یہ خیال نہیں ہوسکتا۔ کہ اس بہشت میں زمانہ حال کے قابیل نے قدم رکھ کر ایک انسان کی نہایت سفاکی سے جان لی ہوگی۔ اور ایک محترم اور معزز شخص کا قتل اوسی کے مکان میں واقع ہوا ہوگا۔

میری زبان سے بیساختہ نکلا "افسوس"۔ کیونکہ ہم پولیس والوں میں بھی بسبب انسان ہونے کے اپنے پیشہ سے ہٹ کر انسانی ہمدردی کا احساس موجود رہتا ہے۔ میں پلٹا اور گھنٹی کے بٹن کو دروازہ پر دیکھ کر اوسے دبایا۔ ساتھ ہی اس کے گھنٹے کی آواز اوس مکان میں گونجنے لگی۔ جو مجھے قبرستان کے گھنٹے کی سی آواز معلوم دی ⁂

رباعیات

از جناب مولوی سید احمد حسین صاحب امجد

ہر شخص نیا روپ دکھاتا ہے
ہر شخص نیا راگ سُناتا ہے
دنیا کی تماشہ گاہ میں ہر انسان
فرض اپنا ادا کر کے چلا جاتا ہے

دیگر

میں نام لیا کروں نہ کیونکر تیرا
کیوں بندہ بنوں نہ بندہ پرور تیرا
تڑپا دیا کہہ کے ہائے نحن اقرب
ہے میری رگ گلو پہ خنجر تیرا

ے اس رباعی کے قافیہ میں ایطا ہے مگر اچھا شعر اس کا سخا ملکم۔ لکھتے ہیں۔

رنج و خوشی

گاہے چنیں گاہے چناں

از جناب خان بہادر مولوی مرزا سلطان احمد صاحب بی۔اے

یہ فیصلہ کون کرے کہ دنیا میں رنج زیادہ ہے یا خوشی؟ ہاں یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ انسان ہمیشہ خوشی کا جویاں اور خواہاں رہتا ہے۔ سچ پوچھو تو ساری عمر اسی لئے اور اسی خواہش میں گزر جاتی ہے۔ انسان سمجھتا ہے کہ خوشی اوسکا پیدایشی حق ہے، جس سے وہ محروم نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ ہم خوشی کی تصویر تو نہیں لے سکتے، مگر رہتے اوسی کی تلاش میں ہیں، کہ وہ ہماری چاہتی محبوبہ ہے۔ اوس پر کبھی کبھی یہاں تک بھی قبضہ جما لیتے ہیں کہ وہ کسی دوسرے کے پاس نہ جائے، صرف ہمارے ہی قابو میں رہے گو ہمیں رنج وغم ہی سے سابقہ پڑتا ہے، مگر فطرتاً چاہتے ہیں کہ خواب میں بھی رنج وغم کی ڈراونی شکل دکھائی نہ دے۔ اگر ہم ایک طرف خوشی کی تلاش میں رہتے ہیں تو دوسری طرف اس فکر و تردد میں کہ رنج ہم سے دور رہے۔ باوجود اس تگاپو اور اس کوشش کے کہ رنج ہمارا گلوگیر نہو، اور یہ تکلیف اور یہ صورت غم اب میں بھی دکھائی نہ دے ہم کبھی نہ کبھی اُس کے شکار ہو ہی جاتے ہیں۔ یہ بلائے ناگہانی برسوں کا اثاثہ مسرت گھنٹوں اور منٹوں میں فنا اور خاک سیاہ کر کے رکھ دیتی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ انسان ہر حالت میں خوش رہ سکتا ہے۔ خوشی ایسی چیز نہیں جو تلاش سے بھی نہ مل سکے، جو منت پذیر یا پابند ہو۔ کسی نے خوشی سے پوچھا کہ تو کہاں ملتی ہے؟ جواب ملا کہ جہاں تیرا جی چاہے۔ گھر میں، سفر میں، جنگل میں ویرانے میں، گاؤں میں شہر میں، جاگتے سوتے، اٹھتے بیٹھتے، جہاں انسان کا دل ہوگا میں بھی وہیں ہوں گی

خوشی خانم نے اپنے ٹھکانے تو بہت سے بتا دیئے۔ مگر جب خواہان خوشی تلاش میں نکلتے ہیں تو انہیں پتہ لگتا ہے کہ ان وادیوں میں بھی بعض دفعہ خوشی کا قیام اور نشان نہیں ملتا۔ بڑی بات اور بڑا ذریعہ دل بتایا ہے۔ جھگڑا تو یہی ہے کہ دل ہی پہلو میں نہیں ہوتا۔ اگر اس کے ساتھ ہی خوشی یہ افسون بھی بتا دیتی کہ دل ضبط و قبض میں کیونکر رہ سکتا ہے، تو کچھ بات بھی تھی۔

جب تک یہ ٹوٹکا نہ ملے تب تک بیدلی کی حالت میں کیونکر خوشی کا مستقر تلاش ہو سکتا ہے یہ بالکل درست ہے کہ اگر دل میں صبر و قناعت ہو تو خوشی کسی نہ کسی رنگ میں جھلک دکھا ہی جاتی ہے۔ لیکن ان صفات کا پیدا ہونا بھی تو آسان نہیں۔

اس منزل پر پہنچنے کا بڑا گُر تو یہ ہے کہ ہم دنیا کے کاموں اور شغلوں سے ایک حد تک لاپروا اور فارغ ہوں۔ رنج و راحت کی تصویر ایک ہی اثر اور ایک ہی کشش رکھتی ہے کیا یہ طریق عمل آسان ہے اور کیا ہر طبیعت اس ماحول میں رہکر یوں ہی رہ سکتی ہے؟ تجربہ تو شاہد ہے کہ بہت تھوڑے طبائع اس مسلک پر چلنے کے خواہشمند ہوتے ہیں جب حالت یہ ہے تو پھر خوشی کی پری کیونکر قابو میں آسکتی ہے؟

یہ ضروری نہیں کہ اگر ایک شخص کوئی بات نہ کر سکے، کسی مسلک پر نہ چل سکے، تو دوسرے بھی نہ چل سکیں کوشش شرط ہے خوشی کے دو مسکن ہیں:۔ دماغ اور دل۔ ہاں! رنج و غم کے یہی دو مستقر ہیں۔ یہ دونوں ایک ہی وقت میں تو ان دونوں متنفرات میں ٹھہر نہیں سکتے۔ ایک کے قیام سے دوسرے کی نفی ہوگی۔ اگر دل و دماغ کی ڈوری اپنے ہاتھ میں ہے تو بقول خوشی کے ہر رنگ میں ہم خوشی کا درشن اور خیر مقدم کر سکتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ امیر اور دولتمند، یا صاحب اقبال مقابلۂ عوام الناس کے زیادہ تر خوش رہتے ہیں ظاہری طور پر تو یہ ٹھیک ہے لیکن اگر امر واقعہ دیکھا جائے تو آبھی کلام ہے قناعت اور صبر و شکر امیروں کے حصہ میں اسقدر نہیں آتے جس قدر غریبوں کے

حصہ میں آیا کرتے ہیں امیروں کی زندگی جو کچھ ملمع اور تصنع رکھتی ہے وہی عملِ خوشی و مسرت کے منافی ہوا کرتا ہے۔

بڑی بڑی خوشیوں کی تلاش میں رہنا اگر ہم بڑے بڑے لوگوں پر چھوڑ دیں تو ہمارے واسطے چھوٹی چھوٹی خوشیاں بھی نعمت ہو سکتی ہیں۔ اگر بڑی بڑی خوشیوں کے ہوتے انسان خواب راحت سے محروم ہو اور رات بھر بے چینی میں گزار دے تو دولت و اقبال کی خوشیاں بھی وبال جان ہو جاتی ہیں جو لوگ چھوٹی چھوٹی خوشیوں سے مسرت حاصل نہیں کرتے اور بڑی بڑی خوشیوں کی تلاش میں رہتے ہیں وہ اپنے ہاتھ سے سرمایہ مسرت کو رائگاں کر دیتے ہیں۔

انسان کو خوشی سہولت سے یوں بھی حاصل ہو سکتی ہے کہ محسوساتِ خاطر میں کمی کیجائے، تکلیف دہ آرزو سے دامن طلب کو پاک اور صاف کیا جائے زیادہ دوڑ میں اگر یہ فاصلہ زیادہ طے ہوتا ہے لیکن دم پھولنے سے تکلیف بھی تو زیادہ ہوتی ہے لمبی ڈور میں کبھی کبھی پتنگ ناگہاں کٹ بھی جاتا ہے جو چیز اپنے قابو سے نکل جائے اوس سے راحت جیسی کچھ حاصل ہو سکتی ہے ظاہر ہے۔ یہ خواہش کرنا کہ زندگی بھر رنج ہو ہی نہیں، ایک تکلیف دہ خواہش ہے۔ ہاں! رنج وغم میں دل قابو میں رکھنا بجائے خود ایک طمانیت ہے ہمارے اضطراب کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اکثر ہم اپنے مقابلہ میں دوسروں کو خوش جانتے ہیں جو شخص ہمیشہ دوسرں کی ہنڈیا اور سالن پر نظر رکھے اوسے گھر کا سالن اور گھر کی ہانڈی کبھی مزہ نہیں دے سکتی۔ دوسروں کو خوش جان کر ذاتی خوشی سے مایوس ہو جانا بجائے خود ایک رنج ہے۔

اگر ہمارے مقابلہ میں کچھ ایسی بھی ہستیاں ہیں جو ہم سے نسبتہً کم خوش ہیں؛ یا جن کی حالت ہم سے اچھی نہیں تو یہ بھی ہماری طمانیت اور شانتی کا موجب ہے جو شخص کشتی میں بیٹھے ہوئے کسی دوسرے شخص کو مچھوے میں تیرتے دیکھے وہ یہ تو فیصلہ

کر سکتا ہے کہ اوسکی حالت اور اسکی افتاد نسبتہً اچھی ہے۔ جسے گھر میں کھانا ملتا ہے وہ ادس گدا گر سے کہیں اچھا ہے جو دن رات کا آذوقہ دریوزہ گری سے بہم پہنچاتا ہے۔ ہماری داویلا سے رنج جو آنے والا ہے دور تو ہو نہیں سکتا اور یہ بھی لازمی ہے کہ باعتباً تقاضائے بشریت ہمارے دل و دماغ پر اسکا اثر بھی ہو، اور ہم کم و بیش کڑھیں بھی اگر تجویز و تردد پر بھی وہ رفع نہیں ہو سکتا اور ہم اسکی زد سے بچ نہیں سکتے تو پھر سکون طبیعت کا ایک ہی علاج ہے کہ ہم حوالہ بہ تقدیر کر کے خاموش رہیں۔ تقدیر نہ ہی عدم تیسر اسباب ہی کو وجہ بنالو۔

بعض لوگ تقدیر سے دست و گریباں ہوتے ہیں جلد بازی سے کام لیتے ہیں۔ یہ تو ایک آخری علاج ہے جب انسان کوشش کرتے کرتے تھک جاتا ہے تو ہاتھ پاؤں ہلانے سے بھی رہجاتا ہے، اور کہنے لگ جاتا ہے۔

ہرچہ بادا باد ما کشتی در آب انداختیم

ڈوبتے کو تنکے کا سہارا بھی کافی ہوتا ہے اگر تمام ابنائے جنس کی حالتیں یکساں ہوتیں تو ایک بات بھی تھی اور اضطراب بھی واجب کہ ہم سب کو کیوں ایک ہی تسمے پیا ہر دو باگیا ہے جب حالات و کوائف میں فرق ہے تو مقابلتہً ایک ہستی دوسری ہستی کو دیکھکر تسلی حاصل کر سکتی ہے۔ خوشی کا وجود تو ہے، مگر کمیاب۔ خوشی ہر حالت میں خوشی ہے، مگر چونکہ ہم خود بدلتے رہتے ہیں۔ اسی واسطے خوشی کی خواہش اور رنگ کا بدلنا بھی ضروری ہے۔ شباب میں جو باتیں خوشی کی ہوتی ہیں پیری میں ادن کے خیال اور دھیان سے تو خوشی ہوتی ہے، لیکن عملی رنگ میں وہی باتیں تکلیف دہ ہو جاتی ہیں۔ لوگ کہا کرتے ہیں کہ میاں دنیا بدل گئی، اب تو مزے اور لطف کا دور رہی نہ رہا یہ درست نہیں۔ دنیا اور دنیا کے لطف و مزے تو وہی رہتے ہیں ہم وہ نہیں رہتے سالن اور روٹی کا مزہ تو وہی ہے، مگر منہ میں دانت نہ رہنے سے مزا نہیں آتا۔ انسان

ہر تیسرے سال بدلتا ہے لیکن جانتا نہیں کہ کیا کچھ تغیر ہو رہا ہے، اور کیونکر آہستہ آہستہ تو لوں
اور جذبوں ہی میں نہیں بلکہ جسم میں بھی فرق پیدا ہو رہا ہے۔ شباب اور پیری کی خوشیوں یا
خوشیوں کے معیار میں بھی فرق ہوتا ہے بچپن میں بچے اگر کھلونوں سے خوش ہوتے
ہیں تو عالم شباب میں اُن کی خوشی و مسرت کے کچھ اور ہی سامان ہوا کرتے ہیں۔ اگر
شباب میں علی پہلو چند خوشیوں کا موجب ہوتا ہے تو پیری میں بعض وقت شباب کی
یاد ہی لطف دے جاتی ہے، مگر محض عارضی۔

رنج سے احتراز اور خوشی کی تلاش فطرت انسانی کا ایک پیدائشی حق ہے۔ مگر یہہ
کہنا کہ زندگی بھر رنج سے سابقہ ہی نہ پڑے۔ خوشی کی تلاش میں خواہ مخواہ روڑا اٹکانا ہی
جو نکہ سمندر میں بعض وقت جہاز اور کشتیاں ڈوب بھی جایا کرتی ہیں، خود کو سمندر کے عجائب
و مناظر سے خود ہی محروم کر دینا ایک قسم کی خودکشی ہے۔ رنج کا مقابلہ بھی ایک خوشی ہی ہے
جدائی کے خوف سے مطلوب کی یاد نہ کرنا بجائے خود ایک تکلیف دہ مرحلہ ہے۔ جدائی اگر
رنج ہے تو امید وصال میں رہنا ایک خوشی ہے۔ اگر رنج کی ہستی زیادہ تر تخیلات سے
وابستہ ہے تو خوشی کی اُس سے زیادہ ہے اس کیساتھ اگر امید بھی ہو تو مایوسی کا سماں
چنداں تکلیف دہ نہیں ہو سکتا۔ یہ سارا ٹھاٹھ یا سارا عالم عالم اسباب ہے رنج اور خوشی
بھی اسباب ہی کے تحت عمل پذیر ہیں۔ جب تک عالم اسباب ہے، تب تک خوشی اور
رنج بھی ہے ہماری زندگیاں اور ہماری زندگیوں کی افتاد اور رفتار کہہ رہی ہے کہ وہ ایک
حالت میں نہیں رہتی رہتی رہے گی۔

جس طرح ہم سایہ کو پکڑ نہیں سکتے، حالانکہ خود ہمارے ہی بدن کا عکس ہوتا ہے،
اسی طرح ہم اپنی کسی حالت کی نسبت بھی یہ امید نہیں کر سکتے کہ ہمیشہ اوسے قیام اور ثبات
ہی رہیگا جب اوسے ثبات و قیام حاصل نہیں تو ہماری خواہشات کیونکر اس گھاٹ
اتر سکتی ہیں۔ عروس بہار کی یہ خواہش کہ اس کے بعد خزاں کا دور نہ آئے اور اسکے

دامن پر یہ داغ نہ لگے، ایک تکلیف دہ اور مایوس کن خواہش ہے۔ دلہن کا یہ کہنا کہ جو لطف اور جو مسرت عروسی جوڑے میں ہے وہی دوسرے جوڑوں میں ہو ایک خیال خام ہے۔

پہلی محبت کا پچھلی محبت سے مقابلہ کرنا ایسی باتیں ہیں جو خیال میں تو آسکتی ہیں لیکن عمل پذیر نہیں ہوسکتیں۔ کنواری اور بیوہ کی شادی میں اور امنگ میں فرق ہوتا ہے۔ حالانکہ دونوں کی شادی ہوتی ہے۔ زوال اور قیام وثبات میں فرق ضروری ہے۔ ہمیں بنایا ہی اسواسطے گیا ہے کہ ہم دونوں قسم کے مزے چکھیں، اور دونوں قسم کا تماشا دیکھیں۔ گو ایک مزا تلخ ہے اور دوسرا شیریں۔ چمن زندگی میں عروسان بہاری کی وہ کثرت اور وہ مقبولیت ہوتی ہے کہ باغ زندگی سے نکلنے کو جی نہیں چاہتا، اور آمد خزاں سے وہ دل شکن سماں پیش آتا ہے کہ باغ میں دم بھر بھی ٹھہرنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ کیا کوئی باغ زندگی ان دونوں قسم کے سامان مسرت اور سامان رنج وکدورت سے خالی رہ سکتا ہے؛ عروس بہار باوجود اسقدر حسن ونزاکت کے بھی خزاں کی آمد روک نہیں سکتی۔ اپنی جگہہ خالی کرتی ہے؛ گویا خود ہی خزاں کو اپنے ہاتھوں گل وگلزار پر فنا کی درانتی چلانے کے واسطے جائزہ دیجاتی ہے جو طاقت ایک کو دوسرے سے جائزہ دلاتی ہے، یا ایک کی جگہہ دوسرے کو بٹھاتی ہے، جب اوسکی مرضی یلوں ہی ہو تو ہم کیا کرسکتے ہیں، ہماری خواہش ایسے زبردست قانون کے مقابلہ میں کیونکر عہدہ برا ہوسکتی ہے۔

گر تو نمی پسندی تغیر کن قضا را

الانسان باللسان

از جناب مولوی مرزا محمد بہادر صاحب بی اے درجہ دوم مجسٹریٹ ضلع

یہی چاہیے بشر کو جو زبان اپنی کھولے
کہ وہ سوچ لے سمجھ لے تو پھر اسکے بعد بولے

جو سمجھ خدا نے دی ہے تو زباں کر اُسکے تابع
وہی عقلمند ہے بس کہ سمجھ سے کام جو لے

ہے زباں گو دہن میں اسے دل سے ہے تعلق — رہے یہ جو دل کے تابع تو یہ موتیوں کو رولے
وہ ہے جاہل اور ناداں جو زباں پہ آئے کہدے — کہ ہے کور اوس سے بہتر کہ چلے نہ بے ٹٹولے
نہ کہے زباں سے اف بھی جو نہ سود مند دیکھے — رہے سوز غم میں جلتا جو ہوں قلب میں پھپھولے
کرے غیر جو شماتت یہ ہے دوسری مصیبت — یہ ہے کون عقلمندی کہ خود اپنا راز کھولے
جسے ہو نہ درد اصلا تو پھر اوس سے کچھ کہے کیوں — نہ کرے زباں سے شکوہ جو بھر آئے دل تو رولے
ہے زباں کی عقل رہبر تو ہلا زباں سمجھکر — کہ جو راستہ نہ جانے تو کسی کے ساتھ ہولے
جو کلام دلنشیں ہو تو نہ کر تو اس کو اخفا — ملے تجھکو تخم مثمر تو خوشی سے اوسکو بولے
تری عقل ہے کسوٹی تری عقل ہے ترازو — تجھے چاہیئے کہ کس لے تجھے چاہیئے کہ تولے

جو سخن کہ مثل گوہر ترے لب تک آئے یاور
اوسے رشتۂ بیاں میں تجھے چاہیئے پرولے

جو سخن ہو مثل گوہر تو ہر ایک ہوگا خواہاں — یہ جواہر ایسے ہونگے کہ زمانہ ہوگا حیراں
یہ وہ گوہر شبیں ہیں کہ نہیں نظیر جن کی — یہ وہ لعل بے بہا ہیں کہ ہیں خجل بدخشاں
جو کلام پر اثر ہو وہ ہے غیرت جواہر — کہ مقابلے میں اسکے نہیں اونکا کوئی پرساں
وہ ہیں چند سنگریزے تو جگر کے ہیں یہ ٹکڑے — نہیں اون میں ایسی خوبی جو ہے لطف انمیں پنہاں
وہ ہیں کوہ کے جگر میں نہ ہے قلب انکا مسکن — وہ زمیں کے نیچے پنہاں تو یہ آسماں پہ رخشاں
در و لعل کی یہ قیمت کہ فقط ہیں بہر زینت — یہ کلام میں ہے قدرت کہ بنے فقیر سلطاں
جو کلام دلستاں ہے وہ بہار بیخزاں ہے — یہ صفت کہاں گلوں میں کہ وہ ہیں خزانسی ترساں
وہ ہیں چند دن میں فانی یہ بہار جاودانی — نہ سموم کا ہے صدمہ نہ ہے آفت زمستاں
یہ زمانہ سلف کا ہے اک آئینہ جو دیکھو — ہوئے منکشف اسی سے وہ جو راز سب تھے پنہاں
کوئی اسکا ہو مقابل نہ کہیں گے ہم تو یاور — ہے کلام میں ہر اک شے جو کھلی ہو چشم عرفاں

صوبہ لاہور عہد اکبر میں

از جناب مولوی سید مختار احمد صاحب

ہمارے کرم فرما مولوی سید مختار احمد صاحب اُن خاموش کام کرنیوالے اصحاب میں سے ہیں جنکا اوڑھنا بچھونا علم وعمل ہے ممکن ہے کہ شمالی ہند کے حضرات آپ کے نام سے واقف نہوں، اس لئے کہ آپکی نشو ونما حیدرآباد ہی میں ہوئی ہے لیکن دکن کا ہر صحیح المذاق اور علم دوست آدمی آپ سے شخصی نہیں تو روحانی تعارف ضرور رکھتا ہے۔ آپ آجکل آئین اکبری کے اردو ترجمے، تصحیح اور تحشی کے کام میں مصروف ہیں۔ ذیل کا مضمون اسی کتاب کا ایک باب ہے جو 'لسان الملک' کے لئے عنایت فرمایا گیا ہے جس کے لئے ہم اپنے عزیز دوست کے کمال مرہون منت ہیں اور مترقب ہیں کہ آئندہ بھی اس سلسلہ کو جاری رکھا جائے گا (ایڈیٹر)

صوبہ لاہور تیسری اقلیم سے (متعلق ہے) اس کا طول دریائے ستلج سے دریائے سندھ تک (۱۸۰) کوس اور عرض بھنبر[عہ] سے چوکھنڈی (جو ستگرہ[عہ] کے متعلقات سے ہے) تک (۸۶) کوس ہے۔

حدود اربعہ مشرق سرہند۔ شمال کشمیر۔ جنوب بیکانیر واجمیر۔ مغرب ملتان۔

معظم دریا چھ ہیں۔ سب شمالی پہاڑ سے نکلتے ہیں۔

اوّل ستلج (جس کا قدیم نام شتدر[سہ] ہے) کا منبع کوہ کاہلور ہے۔ اس کے کنارے پر روپڑ۔ ماچھی واڑہ۔ لودھیانہ۔ واقع ہیں یہ دریا بوہ[للعہ] (بوپر) کے گھاٹ پر بیاہ سے

سہ خلاصۃ التواریخ میں بھنبر لکھا ہے ۱۲ عہ ست گراھ۔ گوگیرہ۔ (ضلع منٹگمری) سے جانب مشرق ۳۲ میل راوی پر واقع ہے ۱۲ سہ متعارف شتدرد ۱۲۔ للعہ از توابع پرگنہ ہیبت پور پٹی ۱۲۔

ل جلتا ہے۔

دوم۔ **بیاہ** (بیاس) جسکا قدیم نام **بپاشا** (وپاس) ہے اس دریا کے منبع کو **بیاہ کند** (بیاس کنڈ) کہتے ہیں جو کوہ **کُلو** کے نزدیک ہے سلطان پور اس ندی کے (دہنے) کنارے واقع ہے۔

سوم۔ **راوی** جسکا قدیم نام **ایراوتی** ہے۔ بھدرال کے پہاڑوں سے نکلا ہے صوبہ کا مقر حکومت **لاہور** اس کے ساحل پر واقع ہے۔

چہارم۔ **چناب**۔ اسکا اصل نام **چندر بھاگا** ہے۔ کھتوار (کشتوار) پہاڑ کی چوٹی سے دو خوشگوار اور شیریں چشمے جاری ہیں ایک **چندر** اور دوسرا **بھاگا** کہلاتا ہے یہ دونوں کشتوار کے پاس باہم ملکر چندر بھاگا کہلاتے ہیں **بہلول پور** **سودھرہ** اور **ہزارہ** اس دریا پر واقع ہیں۔

پنجم۔ **بہت** (**جہلم**) جسکا قدیم نام **بدستا** ہے یہ دریا کشمیر میں پرگنہ ویر (ناگ) کے ایک چشمے سے نکلتا اور **سری نگر** کشمیر کے دار الحکومتہ میں سے گزر کر ہندوستان میں آتا ہے۔ قصبہ **بھیرہ** اس کے کنارے واقع ہے۔

صحیح ایراوتی ہے ۱۲ بھدرا (ن) ۱۲۔ چناب بالکسر۔ بعض اس کی اصل چین آب بتاتے ہیں یعنے وہ دریا جو چین سے نکلکر آتا ہے۔ سنسکرت نام اسکنی اور یونانی اکسنیز ہے ۱۲۔ بہلول پور اور اور ماچھی واڑہ ضلع لدھیانہ تحصیل سمرالہ میں واقع ہیں ۱۲۔

سودھرہ۔ وزیرآباد سے شمال مشرق چار میل پر ہے ۱۲۔

ہزارہ۔ ضلع شاہ پور میں عرض شمالی ۸ ۳۲ - اور طول شرقی ۱۸ ۷۳ پر واقع ہے۔

بھیرہ۔ ضلع شاہ پور میں دریائے جہلم کے شرقی کنارے پنڈ دادن خاں سے جانب جنوب مغرب دس میل پر ایک مشہور و قدیم شہر ہے ۱۲۔

ششم۔ سندھ[۵] (اٹک) اسکا سرچشمہ کشمیر و کاشغر کے مابین بتاتے ہیں بعض کہتے ہیں کہ ختا (مشرقی چین) میں ہے۔ حدود سواد (سوات) اٹک بنارس اور چوپارہ سے گزر کر بلوچستان میں داخل ہوتا ہے۔

پانچ دوآبے۔ خداوند عالم (شہنشاہ اکبر) نے اس خطہ زمین کا نام جو ستلج اور بیاہ کے مابین ہے۔ بیتھ جالندھر (دوآبہ بست جالندھر) رکھا اسی طرح جو قطعہ بیاہ اور راوی کے مابین ہے اسکو باری جو راوی اور چناب کے بیچ میں ہے۔ اسکو رچنا جو علاقہ چناب اور بہت کے درمیان ہے اسکو جیٹہٹ (دوآبہ جج یا چنبہ) اور جو سرزمین بہت و سندھ کے مابین ہے اسکو سندھ ساگر سے موسوم کیا۔ مسافت ستلج سے بیاہ تک بچاس کوس اور بیاہ سے راوی تک سترہ کوس۔ راوی سے چناب تک تیس کوس اور بہت سے سندھ تک اٹھسٹھ کوس ہے۔

پنجاب آباد ملک ہے۔ آب وہوا مساعد اور کشت کاری اور زرخیزی میں بے مثل ہے عموماً کوؤں کے پانی سے آبیاری کیجاتی ہے۔ جاڑے کا موسم ایران و توران کی طرح شدید نہیں لیکن ہندوستان کے اور مقامات سے سخت ہوتا ہے شہنشاہ (اکبر) کی توجہ سے ایران توران وہندوستان کی منتخب پیداوار بہم پہنچی ہے۔ خربوزہ سال بھر ہوتا ہے پہلی فصل اسوقت ہوتی ہے جب آفتاب برج ثور و جوزا (اپریل مے وجون) میں آتا ہے دوسری جب سرطان و اسد (جون۔ جولائی و اگسٹ) میں پہنچتا ہے جب موسم ختم ہو جاتا ہے تو اول کشمیر سے پھر کابل بدخشاں اور توران سے منگوایا جاتا ہے۔ برف شمالی پہاڑوں سے ہر سال لاکر لطف اٹھایا جاتا ہے۔ گھوڑا عراقی سے مشابہ اور بہت بہتر ہوتا ہے۔ بعض مقامات (خصوصاً بیاس و جہلم) میں ریگ شوئی (جھالاگری) کرنے سے سونا۔ چاندی۔ تانبا۔ بھنگار (روئی) جست۔ پیتل اور سیسا نکلتا ہے۔ ہر قسم کے نادرہ کار صناع و ہنرمند موجود ہیں

۵ دریائے سندھ کو مسلمان جغرافین (مثلاً مقدسی) نے مہران لکھا ہے البیرونی کتاب الہند صفحہ (۲۶۰) میں بیان کرتا ہے کہ دریائے سندھ شہر آرور یا آلور (جواب ویران ہو گیا ہے اور جس کے کھنڈر روہڑی کے قریب ہیں) سے گزر کر مہران کہلاتا ہے

تخطیط۔ **لاہور**۔ دوآبہ باری میں بڑا شہر ہے آبادی و وسعت میں اس شہر کا کوئی مثل نہیں۔ قدیم زیچوں میں اس کا نام **لہاور** لکھا ہے اس کا طول (جزائر خالدات سے) ۱۰۹ ۲۲ اور عرض (خطِ استوا سے) ۳۱ ۵۰ شمالی ہے اس عہدِ حاضر میں قلعہ وارک پکی اینٹ سے تعمیر کیا گیا ہے چونکہ کئی دفعہ مقرِ حکومت رہا ہے۔ اس لئے بہت سی رفیع الشان اور دل فریب عمارات و آمینہ بنی ہوئی ہیں اور دلکشا اور سر سبز و شاداب باغ لہلہاتے ہیں یہاں ہر ملک کا آدمی پایا جاتا ہے جسکی نفیس و لطیف صنعت و دست کاری دیکھکر عقل حیران رہجاتی ہے۔ رقبہ اور آبادی کی گنجائی کی کوئی حد نہیں **نگر کوٹ** پہاڑ پر ایک شہر ہے اس کے قلعے کو (گڑھ) **کانگڑہ** کہتے ہیں۔ جو بلند پہاڑ کی چوٹی پر ہے۔ شہر کے نزدیک **مہامایا** (بھوانی) کا مندر ہے جسکو مظہرِ ایزدی (ایشور پرکاش) سمجھتے ہیں دور دراز سے تیرتھ کے لئے آتے اور مرادیں پاتے ہیں۔ تعجب کی بات یہ ہے کہ اپنی حاجت روائی کے واسطے زبان کاٹ ڈالتے ہیں۔

کسی کی تو چند ساعت میں اور کسی کی ایک دو روز میں درست ہوجاتی ہے اگرچہ حکما کے نزدیک زبان کا بڑہنا ممکن ہے لیکن اسقدر سرعت کیساتھ ایک نہایت حیرت انگیز بات ہے۔ علم الاصیاطیر (دیومالا) میں مہامایا کو مہادیو کی بیوی لکھا ہے لیکن اس فرقہ کے علما مہامایا سے مہادیو کی قدرت مراد لیتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ مہامایا اپنے شوہر مہادیو کی اہانت پر اپنے آپے سے گزر گئی (اور اپنے جسم کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے) جو بہار جگہہ گرے۔ یعنی سر اور بعض اعضا کشمیر کے پہاڑ میں کامراج کیطرف اسکا سار دھا نام رکھا اور بعض حصہ دکھن میں بیجاپور کے نزدیک جسکو **تلجا بھوانی** کہتے ہیں اور جو عضو شرق میں کامروپ کے علاقہ میں پہنچا وہ **کامچھا** (**کاماکھیہ**) کھلایا اور جو عضو اپنی جگہہ پر قایم رہا' وہ **جالندہری** کے نام سے مشہور ہوا اور یہ یہی سرزمین ہے اس کے قرب و جوار میں (**مقام جوالا مکھی**) کئی جگہہ سے مشعل و چراغ کیطرح شعلے نکلتے ہیں لوگ جاترا کے لئے جاتے ہیں اور قسم

قسم کی چیزیں اون شعلوں میں ڈال کر جلانے کو مبارک جانتے ہیں۔ ان کے اوپر ایک عالیشان گنبد بنایا گیا ہے۔ جہاں لوگوں کا حیرت خیز ہنگامہ ہوتا ہے اس کا حقیقی سبب تو گندھک (نفط) کی کانیں ہیں لیکن عوام الناس اسکو خارق عادت سمجھتے ہیں۔

دوآبہ سندھ ساگر میں شمس آباد کے نزدیک **بالناتھ جوگی** کا مندر (معبد) ہے جس کو **بالناتھ (گورک ناتھ) کا ٹلہ** کہتے ہیں۔ مرتاضان ہندوستان خصوصاً جوگی اس کا بڑا احترام کرتے اور جاترا کے لئے بکثرت آتے ہیں۔

اسی کے نواح میں **نمک سنگ** نکلتا ہے۔ بیس کوس لمبا ایک پہاڑ ہے۔ جس میں سے نمک کھود لیتے اور اٹھا کر کنارے پر لے آتے ہیں۔ جسقدر نمک نکالا جاتا ہے اس کے چار حصص کیے جاتے ہیں۔ تین حصے کان کنؔ اور ایک حصہ مزدور لیتے ہیں۔ ان سے تاجر خرید کر دور دور لیجاتے ہیں۔ ایک من کی قیمت آدھ سے لیکر دو دام تک ہوتی ہے زمین دار ہر حمال سے دس دام وصول کرتا ہے اور تاجر کو ہر سترہ من نمک پر ایک روپیہ سرکاری محصول ادا کرنا پڑتا ہے۔ بہت ہنرمند دستکار نمک سے طبق۔ سرپوش۔ رکابیاں اور چراغ دان تراش کر بناتے ہیں۔

اس صوبے کے پانچ دوآبے ۲۳۴ پرگنوں پر مشتمل ہیں۔ پیمایش کی ہوئی زمین ۱۶۱۵۵۶۴۳ بیگہ اور تین بسوہ ہے مالگزاری ۵۵۹۴۵۸۴۲۳ دام (معادل ۱۳۹۸۶۴۶۰ روپیہ سکۂ کلدار - ۹ آنہ - ۲ پائی) ہے منجملہ اس کے ۹۸۶۵۵۹۴ دام (= معادل ۲۴۶۶۳۹ روپیہ سکہ کلدار - ۱۳ آنہ - ۷ پائی) بسیورغال ہے۔ متعینہ فوج میں ۵۴۴۸ سوار اور ۴۲۶۰۸۶ پیادہ ہیں۔

ع ہاں کو لاشہ کش کہتے ہیں۔ خلاصۃ التواریخ ۱۲۔

ترانۂ عشرت

از جناب خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

ہے آرزو قاتل ترا یوں آخری دیدار ہو
اک ہاتھ میں سر ہو مرا اک ہاتھ میں تلوار ہو

صحن چمن ہو ابر ہو اور بام گلنار ہو
کافر ہو ایسے وقت میں مے سے جسے انکار ہو

آئینہ رکھکر سامنے تم اپنا منہ دیکھا کرو
حائل ہمارے وسط میں اک آہنی دیوار ہو

اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے خدا نے تجھکو
فرد تسلیم کیا ناز و ادا نے تجھ کو

اے سکندر کہیں قسمت سے سوا ملتا ہے
ایک قطرہ نہ دیا آب بقا نے تجھ کو

مرگ دشمن پہ مسرت کی ضرورت کیا ہے
کہ رہائی تو نہیں دی ہے قضا نے تجھ کو

تیرا کرم عام کسے ڈھونڈ رہا ہے
عشرت کے برابر کا گنہگار کہاں ہے

کلامِ ابر

از جناب منشی غلام دستگیر صاحب ابر (حیدرآبادی)

نام جس وقت ترا منہ سے نکل جاتا ہے
گرتے گرتے یہ گنہگار سنبھل جاتا ہے

سچ ہے اک زینۂ تنزل کا ہے معراج عروج
سر پہ خورشید جب آتا ہے تو ڈھل جاتا ہے

یاد رکھو ادا مجھے مایوس پھرانے والے
بات رہجاتی ہے اور وقت نکل جاتا ہے

کام یاروں کے خوشامد سے نکل جاتے ہیں
قلب سکہ بھی چلا دینے سے چل جاتا ہے

ایک ہیں آپ کہ ہوتا نہیں کچھ دل پہ اثر
ابر کے رونے پہ پتھر بھی پگھل جاتا ہے

ہند قدیم کی تعلیم

آریوں نے بہت سی امنگوں کے ساتھ اپنے وطن (ایران) کو خیرباد کہہ کر اوس سرزمین کا رخ کیا جسے وہ لوگ آریہ ورتھ کہتے تھے، اور جواب مدتہائے دراز سے ہندوستان کہلاتا ہے۔ مورخین مغرب نے اون کی ترقی کو چار دوروں میں تقسیم کر کے بودھ مذہب کی ہزار سالہ حکومت کو بھی اسی میں داخل کیا ہے ان میں پروفیسر میکس ملر اور ڈاکٹر گستا دلی بان شریک ہیں۔ لیکن مشہور ہندی تاریخ نگار مسٹر رومیش چندر دت آنجہانی نے گھر کے حالات سے واقف ہونے کی حیثیت سے زمان و مکان دونوں کا لحاظ کر کے تقسیم مغربی میں ایک دور کا اضافہ کر دیا ہے۔ اسطرح عصر ویدا، دوران رزم، عہد برہمن، اور زمانۂ بودھ دوران قایم ہوئے۔ علم، دولت اور حکومت کے کمال سے انسانی تمدن مکمل ہو جاتا ہے، اور باوجودیکہ ان مسافروں نے مدارج تمدن کو کمال پر پہنچا دیا ہے، لیکن تیئیس صدی کی مسلسل حکومت اور ایک طولانی زمانہ کی علمی و عملی ترقی کے حالات کو ہم قصص و حکایات کے اندر دفن پاتے ہیں، اور تاریخ نگاروں کو کسی قدر دقت کے ساتھ تاریخی مواد دستیاب ہوتا ہے۔

ان ایرانی نژاد مسافروں نے اپنے پہلے دور (عصر ویدا) میں پنجاب کے سرسبز قطعات اور سیر حاصل میدانوں کو مسخر کیا۔ اس دور کے ادب میں صرف پنجاب کا بیان ہے، اور گنگا جمنا کے نام استعارۃً آجاتے ہیں دوران رزم میں وہ پنجاب سے آگے بڑھے اور اب نیا وطن (پنجاب) اون کے سایہ میں آگیا۔ سب سے پہلے کورو نواح دہلی میں اور پنچالا اطراف قنوج میں آباد ہوئے۔ اس کے بعد ہی کسالا نے اودھ میں، کاسی نے بنارس میں، اور وانڈھا نے مغربی بہار میں اپنی راجدھانیاں قایم کیں۔

اس دور میں آریہ رشیوں کو غیر آریہ صوبہ جات اور غیر معروف قطعات ملک کے دیکھنے اور مشرقی و جنوبی بہار، دکن، مالوہ، گجرات، اور سندھ کی سیر کرنیکا موقع ملا تیسرے دور (عہد برہمن) میں انہیں میخلوں نے کوہ وندھیاچل کی سنگین دیوار کو توڑا، اور نہ صرف متذکرہ بالا حصص میں اپنی آبادیاں قایم کیں، بلکہ غیر آریہ خاندانوں کو برہمنی تہذیب میں رنگ دیا، بادی النظر میں آج اس امر کی تمیز مشکل ہے کہ آریہ اور غیر آریہ ہنود میں کیا فرق ہے مذہبی اور سیاسی تغیرات جن کی بنا پر باقی دو دور (بودھ اور پران) قایم ہوئے، یا تو رانی نسل کے راجپوت فاتح بنکر قدیم تہذیب میں جذب ہو گئے اون میں کوئی ایسا اہم تغیر تاریخ میں نمایاں نہیں جس کی بنیاد بہادری اور فتحمندی ہو۔ اب فاتحانہ جوش سرد اور اندرون ملک غیر آریہ اقوام کے مقابلہ کے لئے میدان رزم تنگ ہو چکا تھا۔

اس ملک کی قدیم تاریخ کا مبصر اسے امر واقعہ خیال کرتا ہے کہ عصر ویدی ہی میں ایک گروہ تحصیل و تکمیل علوم کی جانب متوجہ تھا اس دور میں وہ عام آریوں کا شریک حال رہا۔ دوسرے دور میں تقسیم عمل کے نام سے اوس نے علوم کو اپنے قبضہ میں کرلیا، اور تیسرے دور میں دوسروں پر اپنا تفوق ثابت کر کے ابد الآباد تک کے لئے اپنے اجداد کے پیدا کئے ہوئے علم کا وارث بنگیا۔ اس سے ہماری مراد برہمنوں کے اوس زبردست گروہ سے ہے جس کے عالی دماغ افراد نہ صرف ہندؤں کے پیشوائے مذہب کی حیثیت سے ہر زمانہ میں پیش پیش رہے ہیں بلکہ علمی میدانوں میں بھی اون کے ہم وطنوں میں سے کوئی اون سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اگرچہ آریہ قوم کی باقی دو جماعتیں (چھتری اور ویش) اس نعمت سے محروم نہیں ہیں، لیکن غیر آریہ مفتوح (شودر) کو اپنے فاتحین کے خوان کرم سے جسقدر حصہ ملا اوس کے ذکر سے ہند قدیم کی تاریخ خاموش نہیں ہے!۔

تیئیس سو برس کے طولانی عرصہ میں آریہ ہنود نے جو علوم پیدا کئے اونکا ذکر

دلچسپی سے خالی نہیں۔ آریہ شوق ترنم اور ذوق شعری اپنے ساتھ لائے تھے۔ ہمیں یہہ دونوں اون کے ہر جزو زندگی میں شریک نظر آتے ہیں؛ یہاں تک کہ اون کا مذہب بھی نغمہ اور شعر سے خالی نہیں!۔ آریہ رشی روزانہ زندگی کے خیالات اور شالوں سے بڑے بڑے نتایج نکالا کرتے تھے۔ اون کا متخیلہ نہایت زوردار تھا، اور تناسب لفظی اُنہیں اسقدر پسند تھا کہ وہ اپنے کلام سے خود وجد میں آجاتے تھے طبابت جس نے بعد کو یونانی اثر سے اس ملک میں معقول ترقی کی، ویدی آریوں میں ابتدائی حالت میں تھی، اور امراض کے علاج میں زیادہ ترمنتروں سے کام لیا جاتا تھا۔ رگ وید کی تدوین پندرہ سو سال قبل مسیح عصر ویدیں کی گئی۔

تدوین علوم کے لئے دوران رزم زیادہ مفید ثابت ہوا۔ اس دور میں سام وید، اجلی کالی یجر وید، اور اتھر وید کی تدوین عمل میں آئی، اور اپنشد لکھے گئے۔ مہابھارت اور رامائن کے واقعات اور یہ دونوں رزمیہ نظمیں جن کی بدولت اس زمانہ کو دوران رزم کہا جاتا ہے اسی دور کی یادگار ہیں۔ دوران رزم میں آریہ رشیوں نے رسمیات سے آئینی دستور العمل پیدا کیا، اجرام سماوی کا مطالعہ کرکے علم نجوم کے اصول قرار دئے اور منازل قمر مقرر کئے۔ ہم اسی زمانہ میں علم الانسان، اصول قربانی، علم فال و تعبیر اور علم الشیاطین کا وجود پاتے ہیں، اور آریوں کے دوسرے علوم میں ہمیں علم الاوقات علم منطق، علم اخلاق، علم تشریح، اور قواعد کے نام نظر آتے ہیں۔

عہد برہمن نے جو علمی تغیر عالم ہنود میں پیدا کیا۔ اس کا نمونہ اوس ادبی مجموعہ کو بتایا گیا ہے جو سوترا کے نام سے مشہور ہے۔ سلطنت کی وسعت نے دماغوں میں روشنی پیدا کردی تھی، اور خیالات کو آگے بڑھنے کا موقعہ مل گیا تھا۔ اس دور میں طبیعتیں اختصار پسند ہوگئی تھیں، اور انشاء ادب میں ضرورت کو مقدم سمجھا جاتا تھا سروتا سوترا میں بلداؤں اور چڑھاووں کے اصول قلمبند کئے گئے تھے، دھرما سوترا میں

رسم ورواج نے قانون کی صورت اختیار کرلی تھی، اور گھریا سوترا میں اصول معاشرت بتائے گئے تھے اس مجموعہ کا نام کلپاسوترا بھی تھا۔ عہد برہمن کی ادبی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مذہبی زبان کے لغات اور ان کے تلفظ کی صحت کا خاص طور پر خیال کیا گیا تھا۔ ہندی نجوم نے یونانی اثر میں آکر بڑی ترقی کی۔ لیکن اس عہد کے رشیوں کے مساعی کو زمانہ فراموش نہیں کرسکتا۔ مورخین کو اسمیں اختلاف ہے کہ علم نجوم میں ہنود کے استاد چینی تھے یا کلدانی۔ علوم فلسفہ، الٰہیات، ریاضیات، اور نظریات کو اس دور سے خصوصیت ہے، اور قربانگاہ کی ضرورتوں نے مہاتما برہمنوں کو ہندسہ (جیومیٹری) کی جانب مائل کردیا تھا۔ ان سب میں اختصار سے کام لیا گیا تھا، تاکہ پڑھنے پڑھانے میں آسانی ہو۔

بودھ مذہب کے دور میں مہاتما گوتم بودھ نے دھرم کا سنکھ پھونکا لیکن ہنود دھرم شاستر کی تدوین کیجانب متوجہ رہے پرا ن کا زمانہ آریہ قوم کے عروج کا آخری دور اور اس لحاظ سے ممتاز ہے کہ اوسمیں مہارشیوں کے سپوتوں نے ایک بار اور کروٹ لی اور پرانوں کو قلمبند کرکے اپنے اجداد کے پیدا کئے ہوئے علوم خصوصاً نجوم، طب، ریاضی، شاعری، اور قصص وحکایات کو ایک گونہ ترقی دی۔ بودھ مذہب نے فن تعمیر کی ابتدا کی تھی اور اب پرانے زمانہ کے ہنود میں بھی ہم اس فن کا خاص شوق پاتے ہیں، بعض مورخین جبر ومقابلہ کو بھی اسی دور کی پیداوار بتاتے ہیں، لیکن کوئی کلام نہیں کہ ڈراما کو پرانوں کے دور سے خصوصیت حاصل ہے۔

ابتدائی دور میں نہ تو علوم کی کثرت تھی اور نہ باوجود تلاش کے اس زمانہ کا کوئی اصول تعلیم ہماری نظر سے گزرا۔ لیکن دوران رزم اور عہد برہمن میں ہم تعلیم کو اوس زمانہ کے مناسب حال باقاعدہ پاتے ہیں، یہاں تک کہ یہی اصول بعد کو ہندو تعلیم میں سنگ بنیاد کا کام دیتے ہیں اپنی ترقی کے زمانہ میں راجگان ہند اہل علم کو

مدعو کر کے اون کے کلام کا لطف حاصل کرتے تھے، اور راجکماروں اور سردار زادوں کو بھی ان صحبتوں میں شریک ہونے کا موقعہ ملتا تھا لیکن یہ نوجوان فنون حرب کے بڑے شایق ہوتے تھے اون کی تعلیم میں شہسواری اور وید مقدس کی زبانی تعلیم بھی داخل تھی، اور رتھ بانی تو لڑکپن ہی سے سکھائی جاتی تھی۔ مہا بھارت کے بزدآزما کشتی، پٹہ بازی، تیراندازی، اور شہسواری سے خوب واقف تھے، اور یہی حال رامائن کے دونوں بہادروں کا تھا۔ اس زمانہ میں ہم شہرزنی کا نام بھی سنتے ہیں۔ پانڈو (مہا بھارت) کے فرزندوں میں سے ارجن کو فن موسیقی میں ورتا کی راجکماری کا استاد بنایا گیا ہے۔ آریہ اخلاق میں ہمیں ہر قسم کا نمونہ نظر آتا ہے۔ مہاراجہ رام چندر جی حسن خلق کی سچی تصویر تھے۔ اون کی اطاعت پذیری، صبر و استقلال، اور ایفائے عہد کو سب تعریف سے یاد کرتے ہیں۔ لچھمن جی اور سیتاجی کی وفاداری کچھ کم قابل تعریف نہیں، اور ہم تو بھرت جی کی اس حق شناسی کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ انہوں نے بڑے بھائی کو حکومت سپرد کر دی۔ دکن کے غیر آریہ ہنود اس لحاظ سے من حیث قوم قابل تعریف ہیں کہ انہوں نے حق کے لئے ایک غیر آریہ حکمراں کے مقابلہ میں ایک آریہ شہزادہ کی امداد کی۔

دوران رزم میں پرساد کے نام سے مدرسے قایم کیے جاتے تھے، اور حسب قاعدہ اون میں کسی معلم امور ہوتے تھے جن مواضع میں چھوٹے پرساد کھولے جاتے تھے اونمیں معلمین کی تعداد تین چار سے زیادہ نہ ہوتی تھی۔ عہد برہمن میں پرساد کی جگہہ سوترا چرن نے حاصل کر لی۔ یہ طرز تعلیم ملک کے تمام بڑے مرکزوں میں جاری تھا، اور چونکہ اسمیں اختصار سے کام لیا گیا تھا سب اسے پسند کرتے تھے۔ اہل علم خصوصاً وہ لوگ جو ترک دنیا کر کے صحرا نشین ہوجاتے تھے، اپنے اہل وطن کی تعلیمی خدمت میں مصروف ہوتے تھے آٹھ، دس، یا بارہ سال کے سن میں لڑکے

معلم کے حوالہ کر دیے جاتے تھے؛ جہاں بارہ برس یا اس سے زیادہ مدت تک رہ کر وہ اپنے اوقات عزیز کو معلم کی خدمتگزاری اور دریوزہ گری میں بسر کرتے، اور اپنے بزرگوں کی تعلیم حاصل کرتے تھے۔ شاگرد ہوتے وقت طلبہ معلم کے سامنے لکڑی پیش کیا کرتے تھے شاید اس دستور سے یہ مراد ہو کہ اونکا جسم اور لکڑی دونوں پنڈت جی کے حوالہ ہے۔ حق یہ ہے کہ طلبۂ علم کی خاطر صعوبت برداشت کرنے میں اوس زمانہ کے بزرگ

جور استاد بہ زمہر پدر

کو اپنے پیش نظر رکھتے تھے۔ طلبہ کو روزانہ سبق ملا کرتے تھے اور تعلیم ڈنڈے کے زور سے دیجاتی تھی۔ وطن واپس ہونے کے وقت شاگرد حسب حیثیت اوستاد کی خدمت میں دکشنا (نذر) پیش کیا کرتے تھے۔

برہمن برہما کی نشانی اور شاستر کے محافظ خیال کیے جاتے تھے اُن کی تمام عمر تحصیل و تعلیم علوم میں صرف ہوتی تھی، اور ملکی علوم کے قایم رکھنے کے لیے اون کے دماغ صفحۂ قرطاس کا کام دیتے تھے۔ وہی مذہبی فرائض کو تقسیم کرتے تھے، اور مذہبی معلومات میں اہل وطن کی امداد اون کے فرائض میں داخل تھی۔ برہمنوں کے فرایض سختی کے ساتھ محدود تھے اپنے تفوق کے زمانہ میں اُنہوں نے اپنی زندگی کو چار حصوں میں تقسیم کیا تھا۔ لڑکپن میں وہ تحصیل علوم اور کسب اسرار مذہب میں، جوانی کو شادی اور خانہ داری میں، ادھیڑ عمر کو خانہ نشینی اور بے تعلقی میں، اور بڑھاپے کو مراقبہ میں صرف کیا کرتے تھے اس طریقہ کو چھتری اور ویش بھی اختیار کر سکتے تھے، لیکن شودر ہر قسم کی تعلیم سے محروم تھا کوئی شودر وید کو سن لیتا یا کسی مذہبی کتاب کو پڑھ لیتا تو تعزیراً اوس کے کانوں میں کھولتا ہوا تیل ڈالا جاتا تھا تعلیم عامہ (جس سے غیر آریہ شودر کو کوئی واسطہ نہ تھا) مذہب، اخلاق اور قانونِ وقت پر

مشتمل تھی۔ بعد کے دوروں میں کم و بیش یہی اصول آریہ ورتھ میں جاری رہے۔

لیکن ایک مصلح کی حیثیت سے جو اصول مہاتما گوتم بودھ نے قرار دیے اون میں زیادہ رواداری پائی جاتی ہے، اور بودھ مذہب کے قایم کردہ اصول اخلاق کا درجہ برہمنوں کے اصول سے بلند تر ہے۔ بودھ اصول میں دردمندی، پارسائی، اور مساوات موجود ہے۔ بدکرداری کی طرح بدخیالی بھی گناہ ہے، اور نجات کا مدار خواہشات نفسانی کی فنا پر ہے بودھ مذہب رہبانیت کا حامی ہے، لیکن ہیں اوس کے خوان کرم پر شودر، پاریا، چنڈال، برہمن دوش بدوش نظر آتے، اور عورتیں بھی اس سے فیضیاب پائی جاتی ہیں۔ بودھ جی کے نصایح میں والدین اور اولاد، استاد اور شاگرد، میاں اور بیوی دوست اور مصاحب، اور مذہبی رہنماؤں کے لئے ہدایات موجود ہیں۔ اولاد کے متعلق والدین کے جو فرائض مقرر کئے گئے ہیں اون میں (۱) اولاد کو برائیوں سے بچانا (۲) صداقت اور (۳) علوم و فنون کی تعلیم (۴) اس کے لئے موزوں جوڑا مہیا کرنا اور (۵) اسکو ورثہ حوالہ کردینا بھی شریک ہیں۔ اسی طرح اولاد کو ہدایت کی گئی ہے کہ (۱) والدین کا بار اٹھائے (۲) ضروری خاندانی فرائض کو ادا کرے (۳) والدین کے مال کی حفاظت کرے (۴) والدین کا لائق جانشین بننے کی سعی کرے اور (۵) جب والدین قضا کرجائیں تو عزت کے ساتھ اون کی یادگار قایم کرے۔ مہاتما نے شاگرد اور اوستاد کے لئے جو اصول قرار دیے ہیں اون میں شاگرد کو حکم ہے کہ (۱) استاد کے سامنے تعظیم سے رہے (۲) اوسکی خدمت کرتا رہے (۳) اوس کی اطاعت کرے (۴) اوسکی ضرورت مہیا کرے اور (۵) اوسکی تعلیم کی جانب متوجہ رہے۔ اوستاد کو حکم ہے کہ شفقت کے ساتھ شاگردوں کو (۱) حسنات اور (۲) علم و حکمت کی تعلیم دے (۳) انہیں یہہ بتائے کہ علم کو مضبوط پکڑیں (۴) اون کے دوستوں اور ساتھیوں کے سامنے اون کی تعریف کرے اور (۵) خطرہ سے اون کی حفاظت کرتا رہے۔ بودھ رہبانو نکے

فرایض میں یہ بھی داخل تھا کہ بچوں کی تربیت کرتے رہیں، اور انہیں والدین کا احترام سکھائیں۔

یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ مہاراجہ اشوک نے اپنی وسیع مملکت میں بلاتفریق مذہب تعلیم دینے کی سعی کی جس کی شہادت اوس کے وہ احکام دیرہے ہیں جو سنگین لاٹوں پر کندہ کئے گئے تھے۔ مہاراجہ کے احکام یہ ہیں:۔ مذہب کے واعظین سادہوں برہمنوں، اور ہر قسم کے فقرا و مساکین کے سامنے بلا کسی روک کے وعظ بیان کریں گے تاکہ جو لوگ نیک ہیں اونکو خوشی حاصل ہو، اور جو مذہبی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، اور جو قیدی ہیں اون کو آزادی حاصل ہو۔ میرے پاکدامن واعظین حکمت اور رحمت کے کلمات ہمارے بھائیوں اور بہنوں کے سامنے بیان کریں گے۔ اور نیک بندوں کو ترغیب و تحریص کریں گے، اور جو بندے گناہوں کے بوجھ سے دبے جاتے ہیں انہیں نجات دیں گے، اور یہ واعظین میرے ملک کے دور دراز حصوں تک دورہ کرتے رہیں گے۔

علمی حیثیت سے اگرچہ اہل ہند نے اس کے بعد کافی ترقی کی، لیکن ہمیں طرز تعلیم میں کوئی فرق نظر نہیں آتا!۔ فقط

(سید منظر علی اشہر جائنٹ ایڈیٹر)

---

(۱) شہید وفا

ترجمۂ اینک آرڈن مصنفہ لارڈ ٹنی سن

اس مثنوی کا کچھ حصہ ۱۹۰۵ء میں رسالہ مخزن لاہور میں شایع ہوچکا ہے مگر سلسلہ قائم کرنے کے لئے ہم اس کو ابتدا ہی سے شروع کرنا مناسب سمجھتے ہیں تاکہ پوری

——— :از مثنوی ہدیۂ ناظرین ہو سکے : ———

اک سلسلہ ہے پہاڑیوں کا — بہتا ہے جس کے نیچے دریا
ان میں کئی ایک جو درے ہیں — کف سے اور ریت سے بھرے ہیں
آگے اک گھاٹ کی برابر — ہیں سامنے لال لال کچھ گھر
ہے بیچ میں اک پرانا گرجا — آثار قدیم کا نمونہ
آگے چلکر سڑک بنی ہے — اونچی ہوتی چلی گئی ہے
دیکھو جو ادھر نظر اٹھا کے — گرنی[1] کے بلند ہیں منارے
گرنی کے عقب میں جو سماں ہے — قوت دل و قوت رواں ہے
اونچا سا وہ مرغزار دلکش — سبزے کی وہ بہار دلکش
دکھلاتے ہیں جو رخ رخ کا پھیر — ڈنمارکیوں کے جابجا ڈھیر
وہ بیچ میں کنڈ خوشنما سا — جیسے تھالی میں ہو کٹورا
بیری کے جا بجا گھنے جھنڈ — خوان بنا ہے جنسے یہ کنڈ
موسم میں ہیں لڑکے بیریوں سے — دامان مراد آکے بھرتے
سو سال ہوئے اسی جگہہ پر — باہم لب ساحل آکے اکثر
کھیلا کرتے تھے تین لڑکے — گو تینوں کے گھر جدا جدا تھے
ایک ان میں حسین ایبی لی تھی — تھی رشک شباب جسکی طفلی
ہرچند تھا سن صغیر اوسکا — بستی میں نہ تھا نظیر اوسکا
لڑکا اک دوسرا فلپ تھا — گرنی والے کا جو تھا بیٹا
تھا جان وہ مادر و پدر کی — اک شمع یہی تھی انکے گھر کی
تھا تیسرا اینک آرڈن نام — ملاح کا طفل بے سرانجام
طوفان نے بے پدر کیا تھا — بچپن میں یتیم ہو گیا تھا

[1] کلوں سے چلنے والا کارخانہ۔

تینوں شیر و شکر تھے باہم — دنیا کا نہ تھا انہیں کوئی غم
طفلانہ تھا کاروبار ان کا — بس کھیل تھا روزگار انکا
ساحل کی گری پڑی غنیمت — ان کے حق میں تھی ایک دولت
انبار کہیں تھے رسیاں کے — ٹکڑے کہیں ڈھیر بادباں کے
بوسیدہ کہیں سے جال اٹھالائے — کشتی کوئی پانی سے ہٹالائے
ریتی کے محل بنا رہے ہیں — کچھ لطف اسی میں پا رہے ہیں
شور امواج دیکھتے ہیں — وہ گھر تاراج دیکھتے ہیں
ہر روز اسیطرح ہیں آتے — اور نقش قدم ہیں چھوڑ جاتے
لے جاتی ہے جنکو لہر آکے — تا چشم حباب ہیں جگہ دے
ٹیلے کے نیچے ایک ہے غار — مثل دل عاشق گرفتار
کھیلا کرتے تھے واں یہ اطفال — تھے حال میں اپنے مست خوشحال
جتنے ہیں امور خانہ داری — طے ہوتے تھے بول وہ باری باری
ہے صاحب خانہ گر فلپ آج — اینک کا کل کے روز ہے راج
لیکن بنتی تھی روز اینی — دونوں کیساتھ گھر کی بیوی
گاہے ماہے تھا یوں بھی ہوتا — اینک کئی روز رہتا تنہا
آتا جو فلپ تو کرکے تکرار — کہتا یہ کہ میں ہوں گھر کا مختار
دیتا تھا فلپ جواب اوس کو — بیوی میری بھی ہے یہ خوشخو
باہم جھگڑا جو پیش آتا — اینک جو قوی تھا فتح پاتا
اسوقت فلپ بہ یاس و حسرت — بھر کر آنکھوں میں اشک خجلت
اینک کو بُری بھلی سناتا — کہتا جو جی میں اسکے آتا
صورت یہ دیکھتی جب اینی — ثالث دونوں میں آپ بنتی

جگ ٹوٹنے کا ملال کرتی | آنکھیں رو رو کے لال کرتی
کہتی نہ لڑو ہماری خاطر | رکھنی ہے مجھے تمھاری خاطر
باہم تم کو نہ لڑنے دوں گی | بی بی دونوں کی میں بنوں گی
ازبس صبح بہار طفلی | صبح کاذب کی تھی سپیدی
گزرے وہ دن شباب آیا | بالائے سر آفتاب آیا
آئی جو ہوائے باغ الفت | دونوں لگے کھانے داغ الفت
دل میں چبھے عشق کے جو کانٹے | بلبل ہوئے دونوں ایک گل کے
گو دل سے قلب کے بھی لگی تھی | ہونٹوں پر مہر خامشی تھی
انیک کو ایک دھن یہی تھی | دن رات ادھیڑ بن یہی تھی
یعنے جو بچ سکے بچائے | کشتی ایک اوس سے مول لائے
جب آدمی کے ہوں کچھ اطوار | اپنی کے لئے بنائے گھربار
اپنی کو بھی اسی کی تھی چاہ | گو دل کی لگی سے تھی نہ آگاہ
ہر دم رہتا تھا دھیان اسی کا | تھا خانۂ دل مکاں اسی کا
تھا انیک زبس خیال اُن کا | پھل بھی ویسا ہی نیک پایا
ماہی گیروں میں منزلوں تک | اونچا ہوا خوب نام انیک
تھا ایک ہی وہ میانِ ساحل | خوشحال جفاکش اور پُر دل
کشتی رانی بھی جانتا تھا | اس کام کو بھی وہ کر چکا تھا
طوفان میں تین بار پھنس کے | پائی تھی نجات اجل کے منہ سے
اب وہ مشاق کارداں تھا | اچھا خاصہ جہازراں تھا
چلتا تھا خوب کام اسکا | مشہور تھا سب میں نام اسکا

(ضامن کنتوری) (باقی دارد)

ہندوستان میں صنعتی ترقّی

اس کا رونا تو بہت دنوں سے رویا جانے لگا ہے کہ ہندوستان کی قدیم صنعتیں معدوم ہوگئیں اور ہوتی جارہی ہیں۔ حال کی سیاسی جدوجہد نے اقتصادیات میں بھی حصہ لیا اور سودیشی تحریک کی وجہ سے بعض مردہ حرفتیں پھر زندہ ہوگئیں شاید زندہ ہوجانے کا خیال درست نہ ہوگا۔ یوں کہیئے کہ بعض حرفتیں جو سکرات کے عالم میں تھیں انہوں نے فوری ہیجان کی گرمی پہنچنے سے کچھ دنوں کے لئے سنبھالا لے لیا۔ خصوصاً دستی پارچہ بافی نے۔ لیکن مرے مردے اکھیڑ کر اور ان میں بجلی دوڑا کر جیتی جاگتی دنیا کا کام نہیں چلایا جاسکتا۔ ترقی یافتہ ممالک کی مشنری کے مقابلہ میں نیم مردہ انسانوں کے ہاتھ پاؤں کیا کام دیںگیں گے؛ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان میں صنعتی ترقی دینے کے خیال کو قطعاً ترک کردینا گناہ بلکہ گناہ عظیم ہے۔ خودکشی کا مترادف ہے! لیکن جب تک ہندوستانی سرمایہ دار کلوں کے لئے دوسری اقوام کے محتاج ہیں اوسوقت تک کچھہ نہیں ہوسکتا۔ مانا کہ وہ ملکی مصنوعات ہی استعمال کرنیکا عزم بالجزم کرلیں۔ لیکن ملکی مصنوعات کہاں سے آئیں گے؛ دستی محنت ضروریات ملک کا مقابلہ نہیں کرسکتی اور کلیں بنانیوالے جب یہ دیکھیں گے کہ آپ انہیں سے آلات صنعت خرید کر اُنہیں کے بازاروں کو سرد کرنا چاہتے ہیں تو وہ تھوڑی بہت امداد جو آج آپ کو دیرہے ہیں کل یہ بھی نہ دیں گے۔ اس لئے سرمایہ داروں کا فرض ہے کہ وہ جلد سے جلد میکانیات کی طرف رجوع ہوں اور اسکا انتظام کریں کہ ضروری کلیں ہندوستان ہی میں تیار ہونے لگیں۔

ہمکو ماڈرن ریویو کلکتہ میں اس خبر کو پڑھکر نہایت خوشی ہوئی کہ کلکتہ اور پیرس کے مسٹر گھوش ہندوستان میں ایک انجنیری (میکانی) کارخانہ اس غرض سے کھولنے والے ہیں کہ اسمیں چل گاڑیاں (آٹو موبلیس) تیار ہوا کریں۔ اس کارخانہ کا سرمایہ زیادہ ہندوستانی ہوگا اور محنت بھی ہندوستانی ہوگی مسٹر گھوش لکھتے ہیں کہ فرانس کے ایک بہت مشہور کارخانہ نے اُن سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہر طرح چل گاڑیوں کی تیاری میں ان کی مدد کریگا۔ اور انجنیروں اور کاریگروں کو ہندوستان بھیجکر مسٹر گھوش کے آدمیوں کو اس کے لیے تیار کر دیگا۔ اسوقت لکھو کھا چل گاڑیاں (موٹریں بسین۔ موٹر لاریاں) مغربی ممالک سے آتی ہیں۔ انجن تو انجن ان کے لکڑی کے ڈھانچے تک بیرونی ممالک سے آتے ہیں۔ کوئی وجہ نہیں ہے کہ سرمایہ لگایا جائے اور شفیق معلم کام سکھانے کے لیئے مل جائیں تو آپ وہ کام نہ کرسکیں جو دوسرے کرتے ہیں۔ آخر کارخانہ ٹاٹا آیرن ورکس کی بنیاد ڈالی گئی اور وہ چل نکلا۔ مگر ایک ٹاٹا آیرن ورکس ہندوستان جیسے وسیع براعظم کی ضروریات کا تکفل نہیں کرسکتا جب تک کہ بیسیوں بلکہ سیکڑوں کارخانے ملک میں ایسے قایم نہ ہو جائیں۔ ہماری دلی آرزو ہے کہ ملک اس مبارک کام میں مسٹر گھوش کا صرف ہاتھ ہی نہ بٹائے بلکہ خدا جلد وہ دن لائے کہ مختلف شہروں کے سرمایہ دار اس عالی ہمت ہستی کے تقلید کے لیئے کمرہمت کس کر اٹھ کھڑے ہوں ؎ پیش ہمت کار ہا دشوار نیست۔

(ایڈیٹر)

دستۂ گل

از۔ جناب منشی غلام دستگیر صاحب

میری تقدیر کہ ایسے پہ مرا دل آئے — جو تصور میں بھی آئے تو بمشکل آئے

غم کے بادل میں جھلک دیتی ہے کوئی برق امید
جیسے طوفاں میں نظر دور سے ساحل آئے

راہرو کو ہو قدم آگے بڑھانا مشکل
دل میں گر وسوسہ دوری منزل آئے

بے سبب محویت اتنی نہیں ہوتی اے ابر
صاف ظاہر ہے کہ تم کھو کے کہیں دل آئے

اطہر۔ جناب سید محبوب علی حیدرآبادی

تم جو وعدے پہ نہ اے حور شمائل آئے
دل میں کیا کیا مرے اندیشۂ باطل آئے

مجھ کو یہ ڈر ہے مرے رونے پہ ہنسنے والے
کسی کافر پہ نہ تیرا بھی کہیں دل آئے

حسن اخلاق سے غیروں کو جو اپنا کر لے
وہ بھی اپنا نہ ہوا اوس سے بھی ہم مل آئے

دل تڑپنے لگا آنکھوں میں بھر آئے آنسو
دیکھنے جب وہ تماشہ سر بسمل آئے

اثر۔ جناب میر افتخار علی صاحب

اتنی امید پہ میں نزع میں دم لیتا ہوں
جس کی تصویر ہے آنکھوں میں وہ قاتل آئے

کہنے والے کی وجاہت کو نہ دیکھو ہرگز
بات سننے میں اگر کام کے قابل آئے

تصور۔ جناب سید علی نواز صاحب

ٹوٹ کر دل نے بہر رنگ صفا کی حاصل
ایک آئینہ سے سو جلوے مقابل آئے

سینہ داغوں سے ہے کثرتکدۂ جلوۂ شمع
کنج عزلت میں نہ کیوں گرمی محفل آئے

گلفشانی ہی سہی تیری گلی میں قاتل
ہر قدم خون چھڑکتا ہوا بسمل آئے

یا الٰہی نہ کسی کی بھی ہو یوں قطع امید
کہ ترے ہو ہو کے سخن تا لب سائل آئے

ساقی۔ جناب شرف الدین صاحب

کام اتنی کشش حسرت بسمل آئے
موت آئے بھی تو شرمندۂ قاتل آئے

عشق میں گرم روی نے نہ دیا کام کبھی
جل بجھے مثل شرر جب سر منزل آئے

میں وہ رہرو ہوں کٹے راہ اگر پاؤں تھکیں
دور افلاک ہے قطع منازل آئے

کشمکش سے تری موجوں کی محیط الفت
دل طوفاں زدہ شاید لب ساحل آئے

شباب۔ جناب میر محمد معین الدین خاں صاحب

قرب منزل سے ہو طے کر کے مراحل آئے　　پار دریا سے ہوئے ہیں لب ساحل آئے
جا کے بازار حسیناں میں کیا یہ سودا　　گھر سے ہشیار گئے آئے تو غافل آئے
میرے مولا ترا مداح نہ کیونکر ہو شباب　　جب کہ قرآن میں ہیں تیرے فضائل آئے

ضامن۔ سید محمد ضامن کنتوری

رہرو راہ طلب کیا سوئے منزل آئے　　موج پھر موج نہیں گر لب ساحل آئے
کیا بتائیں دیئے کیا صورت ہستی نے فریب　　آئے بھی ذہن میں تو معنی باطل آئے
دشت مجنوں نہیں میرا دل ویران لیلی　　یاں کوئی آئے تو بے ناقہ و محمل آئے
نامرادی ہے سر و برگ مراد ضامن　　برق بن جائے جو اندیشۂ حاصل آئے

عابد۔ جناب حکیم محمد عابد صاحب لکھنوی

درد سے راستے بھر تھامے ہوئے دل آئے　　اپنے گھر تک ترے کوچہ سے بمشکل آئے
یوں تو گرداب غم و رنج سے مشکل ہے نجات　　لاش بہتی ہوئی شاید لب ساحل آئے
کیوں مری لاش پہ روتا ہے جھکائے ہوئے سر　　دیکھ تجھ پہ کوئی الزام نہ قاتل آئے
کیا کہیں کس سے کہیں حال شب غم عابد　　اب خدا سے یہ دعا ہے نہ کہیں دل آئے

مزاج۔ جناب سید نثار احمد صاحب

بچ کے نکلے کہ ترے تیر کے شامل آئے　　پر کسی طرح مگر آرزوئے دل آئے
آج بیگانگی دہر سے فرصت پائی　　لے اجل تیرے مسافر سر منزل آئے
عشق میرا نہیں باور نہیں، اللہ کرے　　میرے آگے یہ مرا دعوے باطل آئے
تیری خاطر یہ کیا ننگ گوارا ہم نے　　جانتے تھے کہ یہ ہے غیر کی محفل آئے

واصفی۔ جناب عبد الصمد صاحب

ہیں نہ تڑپوں کبھی تسکیں دم بسمل آئے　　وہ جو آجائے تو قابو میں مرا دل آئے

کیا ترے ظلم کی میں داد خدا سے چاہوں — جب زباں پر مری فریاد بمشکل آئے

لاکھوں مشتاق سرِ راہگذر تجھے ظالم — ہائے کس کس کے ترے زیرِ قدم دل آئے

عید سے بڑھکے جو خوش خوش نظر آتے ہو تم — واصفیؔ یہ تو کہو کس کے گلے مل آئے

یٰسین۔ جناب غلام یٰسین صاحب جمعدار جاگیروا

کسی عنوان کوئی حور شمائل آئے — نہ سہی وصل وہ بنکر مرا قاتل آئے

دل کے جانیکی حقیقت تجھے ہوگی معلوم — میرے مانند کسی پر جو ترا دل آئے

وہ غریقِ یمِ الفت ہوں مری نظر دل میں — موجۂ آب بشکل لبِ ساحل آئے

جمع یٰسینؔ کی بالیں پہ ہیں حوریں دمِ مرگ — ڈر ہے ان میں سے کسی پر نہ کہیں دل آئے

بہ چچا (غزل مذاقیہ) جناب سید اسحاق احمد صاحب دہلوی۔

مجلسِ شعر میں سب عاقل و کامل آئے — ہم بھی لکھے نہ پڑھے نام کے فاضل آئے

بس سمجھ لو کہ پڑی خانہ خرابی کی بناء — کسی احمق کا کسی پر جو کبھی دل آئے

میں جو بی۔ اے میں ہوا فیل تو کیا غم ہے چچا — عشق بازی میں تو نمبر میرے فاضل آئے

جلد (۱) نمبر (۲) بابتہ ماہ اگست ۱۹۲۳ء عیسوی

بزمِ لسانُ الملک

تبریک

مبارک ہو جمیع مسلمانانِ عالم اور جمیع اقوام ایشیا کو وہ دن، وہ گھڑی اور وہ ساعت جبکہ ٹرکی کے حق میں باعزت صلحنامہ پر دستخط ہوئے۔

اور

خدائے برتر و توانا جلد وہ دن لائے کہ مسلمان پھر اپنی گزشتہ عظمت و شوکت کا نمونہ بنکر دنیا کی نگاہوں کو خیرہ کرنے کے قابل ہوں۔ این دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

تشکرات

ہم اپنے مقامی معاصرین میں نظام کالج اردو میگزین اور رسالہ ترقی کے مرہون منت ہیں جنہوں نے سب سے پہلے ہماری طرف معاصرانہ اخوت کا ہاتھ بڑھا کر اپنے گرانبہا پرچوں سے تبادلہ منظور فرمایا۔ ہم ان کی نسبت انشاء اللہ آیندہ کسی نمبر میں اپنی مفصل رائے کا اظہار کریں گے۔ اسوقت صرف اسی لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں کہ دار السلطنت آصفیہ کے یہ دونوں ہونہار رسالے اپنی ظاہری و باطنی خوبیوں کے لحاظ سے اسکے مستحق ہیں کہ علم دوست اصحاب انکا خیر مقدم گرمجوشی کیسا تھ کریں۔ ترقی کا سالانہ چندہ (عہ) اور نظام کالج میگزین کا (للعہ) ہے حجم دونوں کا کم و بیش ۴۸ صفحہ ہے۔

ہم اُن سربرآوردہ اہل قلم و اہل علم حضرات کے بھی متشکر ہیں جنھوں نے خطوط کے ذریعہ سے اپنی قیمتی رائیں لسان الملک کی نسبت ظاہر فرمائی ہیں۔ آئندہ نمبر سے ہم اسکا انتظام کریں گے کہ اس طرح کی حوصلہ افزا تحریرات کے اقتباس کے لئے جگہ نکالیں۔

آخر میں ہم اُن ادب نواز اور علم دوست حضرات کا شکریہ ادا کرنا بھی اپنا فرض سمجھتے ہیں جنہوں نے پہلے ہی نمبر پر لسان الملک کی خریداری منظور فرماکے پیشگی قیمتوں سے ہماری حوصلہ افزائی ہماری امید سے زیادہ فرمائی ہے اور اگر اسی طرح قدر دانی کا ثبوت ملتا رہا تو غالباً ہم بہت جلد لسان الملک کے حجم میں اضافہ کرنیکے قابل ہو جائیں گے۔ اس لئے کہ لسان الملک کے اجرا سے ہمارا منشا محض اپنی قومی و ملکی زبان کی خدمت ہے نہ کہ تجارت یا ذاتی منفعت ۔

(ایڈیٹر)

لسان الملک

جلد (۱) بابتہ ماہ اگست ۱۹۲۳ء نمبر (۲)

حدیقہ عثمانی

(۱)

عماد الملک

مندرجہ بالا عنوان اوس کتاب کا نام ہے جو اسوقت ہمارے شریک عمل مولوی سید منظر علی صاحب اشہر کی زیر تالیف ہے۔ آپ نے حدیقہ عثمانی کے چیدہ ابواب سے وقتاً فوقتاً لسان الملک کے صفحات کی تزئین کا ارادہ کر لیا ہے جس سے سب سے پہلے بزرگ ہند نواب عماد الملک بہادر کے حالات ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں۔ نواب صاحب کی عظیم الشان شخصیت خاک ہند کے ذرہ ذرہ پر آفتاب کی طرح روشن ہے اور اس قابل تقلید ہستی کے حالات کا مطالعہ کرنا ہر نوجوان کے لیے سبق آموز ہے۔ اڈیٹر

عماد الملک بہادر (نواب مولوی سید حسین صاحب بلگرامی) خلف اکبر مولوی سید زین العابدین صاحب مرحوم۔ آپ کا وطن تو بلگرام مین نواح اودھ ہے لیکن ولادت باسعادت ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۲ء میں بمقام صاحب گنج ضلع گیا (صوبہ بہار) واقع ہوئی۔ ابھی عمر شریف چار یا پانچ سال سے زیادہ نہ ہو گی کہ سایۂ دامان مادر سر سے اٹھ گیا

آپ کی مکتبی تعلیم سات سال کے سن میں بمقام **مانک گنج** (ڈھاکہ) و مدھ پور (بھاگلپور) **کلکتہ** اور **ڈھاکہ** کے معلمین سے شروع ہوکر تقریباً چودہ سال کی عمر تک جاری رہی۔ جیسا کہ اوس زمانہ کے ذی استعداد خاندانوں کے شریف زادوں کا دستور تھا، فارسی کے بعد عربی کا درس جاری ہوا، اور باقاعدہ طور پر نصاب نظامیہ کی تکمیل کی گئی۔ اس سے فراغت حاصل ہوئی، تو آپ نے انگریزی کی جانب توجہ فرمائی، اور **بھاگلپور**، **کلکتہ** اور **پٹنہ** کے مدارس میں داخل ہوکر ٹھیک ڈھائی سال میں انٹرنس کے امتحان میں بدرجۂ اعلیٰ کامیابی حاصل فرمائی۔ یہ واقعہ ۱۸۶۲ء کا ہے۔ اگلے سال پریسیڈنسی کالج **کلکتہ** سے ایف اے کا امتحان بدرجۂ اعلیٰ پاس کیا۔ ۱۸۶۴ء میں جب آپ تھرڈ ایر کلاس میں تعلیم پارہے تھے، آپ کے والد ماجد نے **بلگرام** لیجاکر آپ کی شادی سید[۵] محمد ذکی صاحب مرحوم کی صاحبزادی سے کردی، اس لئے سال مذکور میں آپ تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔ اگلے سال پھر پڑھنا شروع کیا، اور ۱۸۶۶ء میں کیننگ کالج **لکھنؤ** سے بی اے کی سند بدرجۂ اعلیٰ حاصل فرمائی۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ آپ کا تعلیمی زمانہ ہمیشہ حوصلہ مندی اور ہمت افزائی سے معمور رہا، اور تمام سرکاری امتحانات کی کامیابی کے مواقع پر آپنے اپنی محنت اور روشن دماغی کی بدولت وظایف حاصل فرمائے۔

بعد فراغ تعلیم کسی سرکاری عہدہ کے لئے سعی کرنے کے بجائے (جسکا مل جانا ذاتی قابلیت اور خاندانی وجاہت کے اعتبار سے کچھ زیادہ مشکل نہ تھا) آپ نے **کیننگ کالج**

۵۔ سید صاحب مرحوم بلگرام کے خوش باش شرفا اور اپنے وقت کے خوش فکر شعرا میں سے تھے۔ مرحوم کے کلام سے یہیں دو شعر ہاتھ لگے جنکو ہم اپنے ناظرین کے تفنن طبع کی غرض سے اس موقع پر پیش کرتے ہیں۔

ذکی ہم سرگزشت غم سے خاطر شاد کرتے ہیں * تڑپ جاتے ہیں جب دل کا تڑپنا یاد کرتے ہیں

قفس میں تھے تو روتے تھے سدا سیر چمن کو ہم * چمن میں ہیں تو ذکر خاطرہ صیاد کرتے ہیں

لکھنؤ میں عربی کی پروفیسری کو قبول فرمالیا، اور چھ سال تک اس خدمت کو انجام دیتے رہے آپ کا یہ طرز عمل اسوجہ سے اور زیادہ قابل تحسین قرار پاتا ہے کہ عربی ادبیات کی تکمیل اور اکابر فضلاے لکھنؤ کے فیض صحبت کے شوق میں عدالت کی کرسی پر درس و تدریس کی مسند کو آپ نے ترجیح دی۔ چنانچہ ایک عرصۂ قلیل کے لئے مفتی میر عباس مولانا حامد حسین، اور میر انیس اعلی اللہ مقامہم جیسے کاملین کا فیضان صحبت آپ کو نصیب ہوگیا۔ اسی عرصہ میں آپ نے تعلقداران اودھ کے انگریزی اخبار لکھنؤ ٹائمس کی ادارت کے فرائض بھی بلاشرکت غیرے انجام دیئے۔ اور پانیر جیسے ذی اثر پرچہ کے مقابلہ میں اپنا زور تحریر دکھاتے رہے۔

۱۸۷۲ء میں سر سالار جنگ اعظم بتقریب سیر و سیاحت لکھنؤ تشریف لے گئے تو جنرل بیرو نے اُن کی خدمت میں مولوی سید حسین کی تقریب کی، اور اس مردم شناس مدبر اعظم کے اصرار پر معتمد خاص (پرائیوٹ سکرٹری) کی حیثیت سے جون ۱۸۷۳ء میں آپ حیدرآباد آگئے، شمالی ہند سے مولوی مہدی علی (محسن الملک) مولوی مشتاق حسین (وقار الملک) اور مولوی چراغ علی (اعظم یار جنگ) وغیرہ کی آمد بہت بعد کی بات ہے سلک ملازمت میں داخل ہوکر مولوی صاحب نے اپنے فرائض کو اس خوبی کے ساتھ انجام دیا کہ آقا اور گرد و پیش کے تمام لوگ آپ کا بیحد احترام کرنے لگے۔ اس باب خاص میں آپکی مسلمہ لیاقت کے سوا جفاکشی، وفاداری، بے لوثی اور دیانت داری کو بڑا دخل ہے اور آپکے ان صفات پر رازداری کی اعلیٰ صفت کا اضافہ کیا جاسکتا ہے جو مہمات سلطنت کی بجاآوری کے موقعہ پر کسی ذمہ دار شخص کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ۱۸۷۶ء میں سر سالار جنگ مرحوم نے یورپ کا سفر کیا تو اون کے نوعمر معتمد بھی لازمی طور پر اون کے ساتھ تھے۔ مولوی سید حسین صاحب کے اوسوقت کے فرائض پر معتمدی امور متفرقات کیخدمت کا اضافہ ولایت سے واپس آنے پر ہوا۔

۱۸۸۲ء میں حضرت غفراں مکان صدر آرائے مسند شہریاری ہوئے تو مولوی سید حسین، علی یار خاں بہادر موتمن جنگ کے خطابات سے سرافراز ہو کر حضرت کے سرکاری سکرٹری مقرر ہوئے اوس زمانہ میں آپ کو ان خدمات کے سوا معتمدی کونسل اور معتمد صرف خاص مبارک کے فرایض بھی انجام دینے پڑتے تھے پیشی خسروی کے اہم و نازک فرایض کو آپ نے ایسی راستبازی کے ساتھ انجام دیا کہ نہ صرف حضور مرحوم کی نگاہ میں آپ کو عز و وقار حاصل ہوا بلکہ رزیڈنسی کے صاحبان انگریزی بھی آپکی اعلیٰ لیاقت اور عمدہ اوصاف کے قائل ہو گئے۔ عماد الدولہ اور عماد الملک کے وقیع خطابات آج ہیں حضرت غفراں مکاں کی اوسی زمانہ کی پیاپے عنایتوں اور قدر افزائیوں کو یاد دلا رہے ہیں، جو یکے بعد دیگرے ۱۳۰۰ھ اور ۱۳۰۸ھ میں عطا فرمائے گئے تھے۔

نواب عماد الملک بہادر کا رحجان طبیعت ابتدا ہی سے ملک کی تعلیمی ترقی کی جانب رہا ہے۔ اپنے دوران ملازمت سابقہ میں قلمے و سخنے آپ تمدن کے اس ضروری شعبے کو قابل قدر امداد پہنچاتے رہتے تھے، لیکن ۱۸۸۷ء میں تمام دنیاوی اقتدار سے قطع نظر کر کے اپنی عمر میں ایک بار اور سررشتہ تعلیم کی جانب آپ نے رجعت فرمائی، اور پیشی خسروی کے عہدہ جلیلہ سے سبکدوشی حاصل فرما کر قلمرو آصفیہ کے صیغہ تعلیمات کو اپنے تعلیمی تجربات و معلومات کے سایہ میں لے لیا۔ اوسوقت اگرچہ حیدر آباد میں جدید طرز تعلیم کی ابتدا ہو گئی تھی، اور مدرسوں کی تعداد دو سو چوّن تھی، جن میں بیس ہزار چھ سو چونسٹھ طلبہ تعلیم حاصل کرتے تھے، مگر آپ کے عہد نظامت میں مدارس کی تعداد میں سہ چند اضافہ ہوا، اور طلبہ کا شمار اس سے بھی زیادہ ہو گیا محکمہ تعلیمات و متعلقات تعلیم میں بیسیوں اصلاحیں عمل میں آئیں، لیکن نواب صاحب نے کبھی اس نتیجہ پر فخر نہیں فرمایا۔ البتہ اخبار ٹائمس (لندن) نے آپ کے تعلیمی خدمات کا جن موقر

الفاظ میں اعتراف کیا ہے وہ ضرور قابل غور ہیں۔

ان کی بعض رپورٹوں سے یہ حقیقت بالکل منکشف ہو جاتی ہے، کہ جو دقیق مسائل اُن کے سامنے آئے اُنہیں انہوں نے نہایت دانشمندی سے حل کیا۔ ان رپورٹوں سے یہی نہیں کہ ان کے مصنف کی وسعتِ نظر ظاہر ہوتی ہے، بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ وہ تعلیم کا حقیقی دوست ہے علم کو علم بالذات سمجھ کر اوس سے ایک شیفتگی رکھتا ہے، اور اوسکی عالمانشان کہیں ہاتھ سے جانے نہیں پاتی۔

ہم اس موقعہ پر یہ بیان کر دینا ضروری خیال کرتے ہیں کہ فن تعلیم کے ماہر و مبصر ہونے کی حیثیت سے نواب عماد الملک تعلیم کو تزکیۂ نفس اور تہذیب اخلاق کا ذریعہ جانتے ہیں۔ آپ کے نزدیک تربیت تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے، اور بغیر تربیت کے تعلیم غیر مفید ہی نہیں بلکہ مضر ثابت ہوتی ہے۔ مغرب میں تعلیم و تربیت دوش بدوش چلتی ہیں، پس مشرق میں مغربی (اور ہمارے نزدیک کسی) تعلیم کو تربیت سے الگ کر کے رائج کرنے کے نتائج لازمی طور پر ہمیشہ مضر ہوں گے۔ رٹ رٹا کر امتحان پاس کرنے کا طریقہ آپ کی رائے میں ہر حیثیت سے مذموم و مضر ہے۔ اس کے بجائے کنڈر گارٹن (بستان الاطفال) کے اصول پر اسکولوں کو رواج دینا چاہیئے۔ نواب صاحب نے تعلیم کا اصل اصول شفقت اور تربیت کو قرار دیا ہے بچوں کی اتالیقی کے لئے آپ تعلیم یافتہ استانیوں کو موزوں خیال فرماتے ہیں حیدر آباد میں آج اس غرض کے لئے آپ ہی کی سعی سے بکثرت استانیاں نظر آتی ہیں۔

سنہ ۱۹۰۷ء میں صاحب وزیر ہند کو اپنی کونسل میں ہندوستانی ممبروں کے شریک کرنے کا اختیار حاصل ہوا تو لارڈ مارلے نے جن دو شخصوں کو نامزد فرمایا۔ اُن میں سے ایک نواب عماد الملک بہادر تھے۔ چنانچہ آپ نے قلمرو آصفیہ کی خدمت

نظامت تعلیمات سے وظیفہ حاصل فرماکر ۱۱؍ نومبر ۱۹۰۷ء کو سب سے پہلے ہندوستانی کی حیثیت سے انڈیا کونسل کے اجلاس میں شرکت فرمائی۔ اخبار ٹائمس (لندن) نے آپ کی شرکت کو کونسل کی اوسوقت تک کی پنچاہ سالہ تاریخ کا ایک اہم واقعہ قرار دیا، اور خود لارڈ مارلے نے اسے تعلقات ہند و برطانیہ کی تاریخ میں منجملہ اہم ترین واقعات کے شمار کیا۔ اوسوقت مال، عدالت و امور عامہ، اور مخزن کے نام سے تین صیغہ جات میں انڈیا کونسل کا کام منقسم تھا۔ نواب عماد الملک بہادر نے جملہ صیغہ جات میں کام کرکے بکرات و مرات لارڈ مارلے سے خراجِ تحسین حاصل فرمایا۔ لیکن انگلستان کی سردی کی برداشت نہ ہونے کے باعث مدت رکنیت کے خاتمہ سے قبل (جو ۱۰؍ نومبر ۱۹۱۴ء کو ختم ہوتی تھی) آپ نے نومبر ۱۹۰۹ء ہی میں کونسل کو خیربا‌د کہا۔ اسی دوران میں بتقریب نوروز (یکم جنوری ۱۹۰۸ء کو) اعلیحضرت ملک معظم اڈورڈ ہفتم کی پیشگاہ سے آپ کو ستارۂ ہند (سی۔ ایس۔ آئی) کا خطاب عطا ہوا۔

نواب عماد الملک بہادر اپنے اختیار کردہ وطن حیدرآباد تشریف لے آئے تو امید کی جاتی تھی کہ اب آپ بقیہ عمر آرام و سکون میں بسر فرمائیں گے۔ لیکن اعلیحضرت خلد اللہ ملکہ نے نواب سالار جنگ بہادر ثالث کو قلمدانِ وزارت سپرد فرمانے کے وقت، اس امر کو محسوس فرمایا کہ مہمات سلطنت کی انجام دہی کے لئے نوعمر دیوان کو کسی کہنہ مشق مشیر کی ضرورت ہے، چنانچہ اس کام کے لئے حضرت خداوند نعمت کی نظر انتخاب نواب عماد الملک پر پڑی، اور مشیر خاص کے لقب سے آپ کو مدار المہام وقت کا مشیر خاص مقرر فرمایا۔ اس منصب جلیلہ پر آپ دو سال سے زیادہ کارفرما رہے۔

حضور والسرائے کی صاحب اقتدار کونسل کے لئے رکن تعلیمات کا جدید عہدہ قائم ہوا تو وسیع مملکت ہند کے صیغہ تعلیمات کو اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے

آپ سے فرمایش کیگئی، لیکن آپ نے بوجہ پیرانہ سالی اوس کے قبول کرنے سے افسوس کے ساتھ معذرت ظاہر فرمائی۔

واقعات کے تسلسل کے لحاظ سے ہم نواب **عماد الملک** بہادر کے بعض اہم ترین حالات کے بیان کرنے سے قاصر رہے؛ جن کو اب بیان کرتے ہیں۔ آپ کے رکن رکین سلطنت آصفیہ ہونے کے باعث جو فوائد ملک و قوم کو پہنچے اون کا مکمل تذکرہ تو **حدیقۂ عثمانی** کی مختصر گیری کے منافی ہے، لیکن بعض ضروری منافع کا ذکر خلاف موقع نہ ہوگا۔ **سر سیّد احمد خاں** مرحوم معاملات قومی میں ہمیشہ آپ کو اپنا موید خاص خیال فرماتے تھے **علیگڈھ کالج** (موجودہ جامع اسلامیہ) اور **محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس** کے آپ قدیم ٹرسٹی و رکن ہیں۔ مسلمانان ہند کے ان دونوں تعلیمی مرکزوں کے سوا **دار المصنفین اعظم گڈھ** اور **انجمن ترقی اردو** پر آپ کے احسانات خاص ہیں۔ یہ اس پر بھی مزید ہے کہ مختلف حصص ہند میں جن قومی و تعلیمی درسگاہوں کو دولتِ آصفیہ سے شاہانہ امدادیں حاصل ہورہی ہیں، اُن سب کی تہ میں آپ کا ہاتھ کام کرتا نظر آئے گا۔ خود حیدر آباد میں **مدرسۂ اعزہ**، زنانہ مدرسہ **مطبع دائرۃ المعارف**، **کتبخانۂ آصفیہ**، **مدرسۂ تعلیم المعلمین**، **مدرسۂ انجنیرنگ** **مدرسۂ صنعت و حرفت اورنگ آباد** اور **نظام کلب** محض آپ کی تحریک پر قائم ہوئے اور سالہائے دراز سے طالبان نزدیک و دور کو حقیقی فوائد سے بہرہ اندوز کررہے ہیں۔ یہاں یہ امر قابل فرد گذاشت نہیں ہوسکتا کہ **مدرسۂ اعزہ** اور **نظام کلب** کے قیام کے وقت **مولوی شیخ احمد رفعت یار جنگ** مرحوم اور **محی الدولہ رسول یار خاں** مرحوم ان کاموں میں آپ کے بہت بڑے موید اور دست و بازو تھے۔

اگرچہ نواب **عماد الملک** بہادر ہندوستان کی قومی و ملکی زندگی میں کبھی طبل و علم لیکر نہیں نکلے، لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جب کبھی آپ کو مفید ملک **مقاصد** میں

شریک ہونے کی ضرورت محسوس ہوئی، آپ نے اپنی قابل قدر امداد سے دریغ نہیں فرمایا۔ قیام کانگریس کے وقت سر سیّد احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کو اس سے علیحدہ رہنے کی تحریک کی، تو آپ نے نہایت زور کے ساتھ ایک انگریزی تحریر کے ذریعہ اس کی تائید فرمائی۔ اس طرح محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے دو بار (ایک مرتبہ سر سیّد کی زندگی میں بمقام میرٹھ اور دوبارہ محسن الملک کی تحریک پر بمقام رامپور) آپ نے اپنی قوم کو مسائل تعلیم سے آگاہ فرمایا۔ آپ کا خطبہ صدارت رامپور جو انگریزی انشا پردازی کا بہترین نمونہ ہے عام طور پر ہندوستان و انگلستان کے با اثر حلقوں میں پسندیدہ نگاہوں سے دیکھا گیا، اور حقیقت شناس مشاہیر وقت نے اسکی خوبی مطالب اور معلومات مفیدہ کا اقرار کر کے نہایت فراخ حوصلگی کے ساتھ داد سخن دی؛ یہاں تک کہ خود لارڈ کرزن جن کے ہاتھ میں اسوقت قلمرو ہند کی حکومت تھی، اسکو دیکھ کر اثر پذیر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اس موقعہ پر ماہر و مبصر تعلیم کی حیثیت سے یونیورسٹی کمیشن کا ممبر مقرر فرما کر، لارڈ موصوف نے حکومت ہند کی جانب سے، نواب صاحب کی اعلیٰ قابلیت کا اعتراف فرمایا۔ کمیشن کے ساتھ آپ نے تمام مملکت ہند کا دورہ فرما کر اسکو اپنے مفید مشوروں سے فائدہ پہنچایا۔

جب نواب صاحب وائسریگل کونسل کے ممبر مقرر ہوئے تو اس حیثیت سے آپنے موازنہ ۱۹۰۳ء کے موقع پر ابتدائی تعلیم کی توسیع کے باب میں کروروں غیر تعلیم یافتہ ہندوستانیوں کی وکالت فرمائی ان مفید مباحث کی یاد دلوں میں اب تک تازہ ہے۔

نواب عماد الملک بہادر اپنے ملک اور اپنی قوم کو نہایت متانت کیساتھ میدان سیاست میں گامزن دیکھنا پسند فرماتے ہیں؛ چنانچہ آپ کے اس خیال کا اثر اس اڈریس سے بھی نمایاں ہے جسے مسلمانان ہند نے اکتوبر ۱۹۰۶ء میں ہز ہائنس سر آغا خاں کی زیر صدارت لارڈ منٹو کی خدمت میں پیش کیا تھا اس اڈریس کے

حسنِ ادا اور قوتِ استدلال کو عام طور پر پسند کیا گیا، اور کوئی کلام نہیں کہ اوس کے پیش ہونے کے بعد سے مسلمانان ہند کی سیاسی تاریخ میں ایک زرین باب کا اضافہ ہوگیا۔

مدراس یونیورسٹی میں، جس کے نواب **عماد الملک** قدیم دیانتر فیلو ہیں، السنہ مشرقیہ سے متعلق آپ کی رائے کا خاص وزن ہے نومبر ۱۹۱۶ء میں یونیورسٹی مذکور کے چانسلر (گورنر صاحب مدراس) نے کانووکیشن اڈریس دینے کی غرض سے آپسے فرمایش کی۔ آپ نے جو فاضلانہ خطبہ اس موقعہ پر ارشاد فرمایا اوس سے واضح ہوتا ہے کہ مسائل و معاملات تعلیم پر آپ کو کس قدر بصیرت حاصل ہے۔

۱۹۱۹ء میں **حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس** کے اندر آپنے جو **خطبۂ صدارت** ارشاد فرمایا وہ آپ کی پبلک زندگی کا غالباً آخری باب ہے۔ یہ قابل دید و لایق داد خطبہ جس کی کتابت کی عزت اوسوقت جامع اوراق کو عطا کی گئی تھی، صرف چند ساعت میں تحریر کیا گیا تھا اس کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ دکن کے تعلیمی مرض خانہ کے اس نباض نے ٹھیک اوسی رگ پر ہاتھ ڈالا ہے جو زیادہ پُر درد ہے۔ فی الحقیقت جبتک مشرقی علوم اور مشرقی السنہ کی جانب ہمارا ملک توجہ نہ کرے گا، اور اپنے محاسن مذہبی پر عمل پیرا نہ ہوگا، اسوقت تک ترقی ناممکن ہے۔

مولوی سید حسین بلگرامی کی زندگی کا تذکرہ خواہ کتنا ہی مختصر کیوں نہ ہو، جب تک اوس میں آپ کے ادبی خدمات کا ذکر نہ کیا جائے، ناتمام رہے گا۔ آپ کو عربی و انگریزی زبانوں میں نظم و نثر لکھنے پر یکساں قدرت حاصل ہے، اور واسطی کے تخلص کے ساتھ آپ کا انگریزی کلام عرصہ تک شایع ہوتا رہا ہے۔ مذکورہ بالا دو زبانوں کے بعد ہی فرانسیسی کا نمبر آتا ہے مقرر کی حیثیت سے آپ کا شمار نامآور مقررین میں نہیں، باوجود اس کے آپ کے بیان میں متانت اور شستگی ضرور ہے اور آپ کی

نفز پر میں کام کی باتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ ہم اس سے قبل ذکر کر آئے ہیں کہ لکھنو ٹائمس کے صفحات پر نواب صاحب نے بدو شباب میں زور قلم دکھایا تھا آپ حیدر آباد تشریف لائے تو یہاں مخزن الفوائد کے نام سے اپنی مادری زبان میں ایک مفید عام رسالہ جاری فرمایا۔ یہ اوس زمانہ کی بات ہے جب حیدر آباد سے کوئی رسالہ شایع نہ کیا جاتا تھا۔ جن لوگوں کے پاس اس کے پرچے محفوظ ہیں وہ اب بھی کم و بیش نصف صدی قبل کی اعلیٰ انشا پردازی کا لطف حاصل کرتے رہتے ہیں اردو زبان میں نواب صاحب کی کتاب رسائل عماد الملک آپ کے مضامین و خطبات کا بہترین مجموعہ ہے۔ انگریزی میں حیات سالار جنگ اول کے تذکرۂ مملکت آصفیہ کے سوا قرآن پاک کا ناتمام ترجمہ وہ علمی کارنامہ ہے جو تنہا بقائے نام کے لئے کافی ہے۔ باوجود پیرانہ سالی آپ کے انہماک کی یہ کیفیت ہے کہ جامع علیہ عثمانیہ کی مجلس وضع مصطلحات علمیہ میں آپ نمایاں حصہ لیتے رہتے ہیں، اور تہذیب و اشاعت کتب قدیمہ کا جدید سررشتہ تمامتر آپ کے ہاتھ میں ہے۔

نواب صاحب کا زیادہ تر وقت کتب خانہ میں گزرتا ہے، اور اب آپ کا مشغلہ کتب بینی ہے آپ اہل علم کے قدر شناس ہیں، اور آپ کا مکان خادمان علم کا مرجع ہے نو عمر اہل قلم آپ کے مشوروں سے استفادہ کرتے اور آپ کی رہنمائی [illegible] میدان ادب میں گامزن ہوتے ہیں۔ صاحبان فضل و کمال کے آپ بہت بڑے معاون ہیں، اور سرکاری و غیر سرکاری طور پر بیشمار اہل قلم آپ کی ذات سے مالی فائدہ حاصل کرتے رہے ہیں جامع اوراق کو بھی نواب صاحب کے خیالات سے استفادہ حاصل کرنے کا موقع ملا ہے، اور یہ امر ہمیشہ اس کے لئے موجب فخر و ناز رہے گا کہ نواب عماد الملک بہادر نے ان چند معنی خیز الفاظ میں .... سے ۱۶ اکتوبر ۱۹۱۷ء کو صدائے آفرین بلند فرما کر اس کی ہمت افزائی فرمائی۔

آپ کی کتاب ...... کی بابتہ میں نے ایک طویل عریضہ حضور میں گزرانا تھا جس میں کتاب کی خوبیاں تفصیل کے ساتھ بیان کی تھیں، اور یہ عرض کیا تھا کہ آپ کتاب خود پیش کریں گے، یا کسی کے ذریعہ پیش کرائیں گے میں نے خود پیش نہیں کی، کیونکہ آپ کی اجازت درکار تھی اور اسمیں جو عرضی شامل ہے اوس پر آپ کے دستخط نہ تھے میں نے بہت آپ کا انتظار کیا مگر جب آپ سے ملنے کا اتفاق نہ ہوا تو میں کتاب اپنی بستر پر چھوڑ آیا۔ اگر آپ کہیں تو سید مہدی حسین (موجودہ مہدی یار جنگ) کو لکھہ کر کتاب نکلوالی جائے اور آپ کے حوالہ کیجائے"

خداوند عالم اس ذات ستودہ صفات کو دیر گاہ قایم اور طالبان علم کو اس سے کامگار رکھے!۔

سید منظر علی اشہر جائنٹ اڈیٹر و مولف حدیقہ عثمانی۔

(حیدرآباد دکن قدیم رسالۂ عبداللہ)

الماضی لایذکر

از حضرت حبیب کنتوری مرحوم و مغفور

مندرجہ ذیل نظم مولانا حبیب کنتوری اعلی اللہ مقامہ کے افکار گوہر نثار کی یادگار ہے۔ مرحوم کو دنیا نے صرف ایک ابتدائی شاعر کی حیثیت سے پہچانا ہے، اس لئے کہ آپ کا مطبوعہ دیوان بجز ایک قصیدۂ مدحیہ کے تمام و کمال غزلیات پر مشتمل ہے ہر چند کہ آپ کی غزلیں بھی سرتاسر اخلاق و معارف کے نکات فاضلہ سے مملو ہیں اس لئے آج ایک نمونہ ہم مرحوم کے غیر مطبوعہ کلام سے ہدیۂ ناظرین کر رہے ہیں جس کے دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ مولانا حبیب کی ہمہ گیر طبیعت نئے رنگ کی شاعری پر بھی کیسی قدرت رکھتی تھی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ شاعر وکیل زمانہ ہوتا ہے اور اوس کے دل پر

ماحول کا اثر اسی طرح پڑتا ہے جیسے آئینہ میں عکس۔ (اشہرا)

ہے شب ماہ میں بیٹھا ہوا اک شخص ملول　　رات کہتی ہے کہ اے باغ حوادث کے پھول

کیوں مرے چاند کے سایہ میں ہے ایسا غمگیں　　تھاہ پیدا ترے دریائے تفکر کی نہیں

وہ تغیر تری ہر چین جبیں سے ہے عیاں　　سطح دریا پہ جو ہوتا ہے تلاطم کا سماں

کہہ رہی ہیں تری گھبرائی ہوئی یہ سانسیں　　دل میں اندوہ کے نشتر ہیں الم کی پھانسیں

شور امواج کا عالم ہے نمایاں جن سے　　بحر جمعیت خاطر میں ہے طوفاں جن سے

ہو گئی کیا وہ بشاشت وہ ظرافت ہوئی کیا　　خندہ روئی ہوئی کیا اور وہ طلاقت ہوئی کیا

کھو دیا کس کی نظر نے وہ ترا لطف مذاق　　وہ ادائیں ہوئیں کیا؟ لوگ تھے جن کے مشتاق

ہو گئی کیا وہ روانی وہ طبیعت کی چہل　　جس لگاوٹ پہ طرحدار بھی جاتے تھے پھسل

صحبتیں کیا ہوئیں وہ کیسی ہے یہ تنہائی　　سچ بتا مجھ کو یہ حالت تجھے کیونکر بھائی

جیبت اٹھا سن کے یہ دریائے تفکر کا غریق　　بولا سن کرتی ہے گر حال کی میرے تحقیق

ہوں میں تنہا نہیں اس وقت کوئی محرم راز　　گرچہ حسرت و ارماں سے مرا دل ہے گداز

کبھی آجاتا ہے گزری ہوئی حالت کا خیال　　برہمی صحبت عشرت کی بڑھاتی ہے ملال

آرزوئیں کبھی کر دیتی ہیں پیدا اک جوش　　عالم یاس میں خود اٹھتا ہے سینے سے خروش

کبھی سمجھاتی ہے رفتار جہاں کی حالت　　رائیگاں وقت نہ کھو۔ جھیل نہ بیجا زحمت

یہ مسلم ہے کہ عالم کی ہے ہر شے گزراں　　عیش کی طرح گزر جائیگا کلفت کا سماں

کر لے دل سرد ہر اک چیز سے راحت ہے یہی　　بھول کر بیٹھ ہر اک شے کو فراغت ہے یہی

چار دن کے لئے ہر وقت سہے کون الم　　چھوٹ جائے گا جو۔ خود اسکو نہ کیوں چھوڑ دیں ہم

فکر باقی نہیں اب کوئی جو ہونا ہے وہ ہو　　مغتنم جانوں گا میں ہر نفس ہستی کو

واقعے پچھلے مرے پیش نظر تھے اس دم　　عالم فکر میں تھا تازہ حوادث کا الم

آج آیا تھا مجھے اپنا لڑکپن کیوں یاد — قابل شرم ہے اس عہد کی ہر اک روداد

عقل ناقص تھی مری اور ارادے ناقص — غور کرتا ہوں تو افعال تھے سارے ناقص

غم کو لازم تھا سبب اور نہ خوشی کو بنیاد — تھوڑی سی بات کا ہوتا تھا اثر دل پہ زیاد

بے محل خواہش مطلوب بہ وہ سر دھننا — ہر گھڑی اپنی ہی کہنا نہ کسی کی سننا

رو کے جس راہ سے کوئی وہی چلتے رہنا — باتوں باتوں میں ہر اک آن مچلتے رہنا

ہوتی رہتی تھی ہر اک دم متغیر حالت — منقلب صورت بازیچہ تھی وہ ہر حالت

بھول ہی جانے کے قابل ہے جو اسکی امنگ — لطف کیا جب نہ رہا اپنی طبیعت کا وہ رنگ

ہے نہ وہ عشق کی گرمی نہ جنوں کا وہ جوش — جس سے رہتی تھی خبر پاؤں کی نا سر کا ہوش

اک جگہہ بیٹھے سے ہوتی تھی طبیعت بیکل — گھر نہ خوش آتا تھا لگتا تھا سہانا جنگل

دیتی تھی قلب کو تسکین پہاڑوں کی ہوا — وقت ناوقت وہ گھبرا کے اکیلے پھرنا

سر پہ ٹوپی جو نہیں ہے تو نہ ہوش نہ تھا — لاگ تھی دل کی بناوٹ کا وہ کچھ جوش نہ تھا

اڑ کے پڑ جاتے تھے آنکھوں میں اگر سر کے بال — بار بار انکا ہٹانا بھی نہ ہوتا تھا وبال

ہوتی تھی دھوپ میں پھرتے جو سیری مجھکو — اور آتی تھی نظر چھاؤں گھنیری مجھکو

جان کر سبزۂ نورستہ کو فرش مخمل — لیٹ جاتا تھا سنبھالے ہوئے دل اپنا بیکل

در در رہتا تھا مجھے سبزے کی پامالی کا — غیر کا رنج ذرا بھی تھا نہ خوش حالی کا

سے - یہ اوس وقت کی یاد ہے جب آپ جوان تھے اور حیدرآباد نہ آئے تھے - آپکی وضع وہی تھی جو اس زمانہ میں لکھنؤ کے خوش وضع نوجوانوں کی ہوا کرتی تھی - سارے سر میں بال جنمیں سے پھلیل ٹپکتا رہتا تھا سر پر چوگوشیا یا لبِ کی چڑھی ہوئی ٹوپی، جسم میں چکن یا جالی کا کرتہ، اور اوپر سے نہایت باریک شربتی تنزیب یا ادھی کا انگرکھا، دردامن گوٹ کا، عرض کا سنجاف دار پاجامہ اوسمیں بھی دو دو کلیاں پڑی ہوئی - جس نے مولانا حبیب کو بڑھاپے میں دیکھا ہے وہی آپ کے جوانی کے حسن اور اس البیلی وضع کا صحیح تصور کر سکتا ہے - (اشہر)

قلب کو دیتی تھی تفریح وہ ساون کی ہوا ہوتا تھا ابر کا سایہ مری وحشت کی دوا

سامنے جھوم کے جب کالی گھٹا آتی تھی بنکے جنگل کی ہوا روح فزا آتی تھی

پاکے آزادیوں میں وقت موافق اپنا کرتا تھا شاہد مقصود کے ملنے کی دعا

کبھی پاتا تھا اگر اپنی طبیعت موزوں نظم کرتا تھا فراقیہ ہزاروں مضموں

وجد کرتا تھا خود اشعار پر اپنے ہر بار تھا حقیقت میں وہ ہرچند طبیعت کا بخار

کیا ستم ہے مجھے کس خبط نے گھیرا تھا ابھی یاد کرتا تھا میں اوس اپنی لٹی دولت کی

مدتوں میں جسے محنت سے کیا تھا یکجا رات دن جس کے لئے رنج و تعب جھیلا تھا

جسکی الفت میں عزیزوں سے ہوا میں بدظن جس ستمگر نے رفیقوں کو بنایا رہزن

جس کے ہاتھوں سے ہوا میری صداقت کا خون رائے صائب کو کیا جسنے مبدل بہ جنوں

کرکے مجبور نکالا مجھے جس نے گھر سے نوجوانی میں چھڑایا پدر و مادر سے

فکر میں جسکی ہوئی طاعت معبود قضا جسکی امید پہ بندوں کو خداوند کہا

اسپہ طرہ یہ ہے آخر نہ رہی وہ خود بھی مجھ کو منہ پھیر کے دیکھا بھی نہ جسوقت چلی

دل دکھا دیتی ہیں یاد آکے پرانی باتیں آنے والے ہیں وہ دن اور نہ وہ اگلی راتیں

عیش ہے طول امل سے جو نہو مضطر دل وجہ کلفت ہے بہرحال غم مستقبل

مطمئن ہوگیا اب قلب مرا اس گر پر
عمل آئندہ ہے۔ الماضی لا یذکر۔ پر

رباعی حضرت عدیل کنتوری

لاریب ہیں جو ناظم انداز سخن رہتے ہیں وہی گوش بر آواز سخن

باتوں میں دلوں کو کرکے تسخیر عدیل سامع کو دکھا دیتے ہیں اعجاز سخن

اودھ کا ایک فرمانروا

از جناب مولوی خواجہ عبدالرؤف صاحب عشرت لکھنوی

سلطنت اودھ میں سب سے زیادہ داتا اور سب سے زیادہ عقلمند بادشاہ جو گذرا ہے وہ اشرف الوزرا، اعظم الامرا نواب یمین الدولہ مرزا سعادت علیخاں بہادر ناظم الملک مبارز جنگ بہادر تھے۔ جب زمام حکومت ان کے ہاتھ آئی تو آصف الدولہ بہادر کے وقت کے اہلکار، مصاحبین، ارکان دولت، موافق، منافق سب نگاہوں پر چڑھے ہوئے تھے مگر بمقتضائے عقل سال بھر تک کسی سے خبر نہ ہوئی۔ خود ساٹھ برس کے جہاندیدہ آدمی تھے۔ راجہ ٹکیت رائے کے نشاط باغ میں جلسۂ عیش و عشرت گرم رہتا تھا۔ پہلی نظر ان کی نائب السلطنت نواب سرفراز الدولہ مرزا حسن علیخاں پر پڑی جو حرف آشنا نہ تھے مگر انتظام ملکی و مالی کے مختار تھے اور نواب آصف الدولہ بہادر کے زمانہ کے عیش کر چکے تھے۔ نواب سعادت علیخاں نے بظاہر بہت نوازش فرمائی اور تقرب خاص دیا لیکن پس پردہ ان کے اخراج کی فکر ہونے لگی۔ یہ موٹے بہت تھے اپنی خواصی میں بیٹھنے کا حکم دیا۔ انگریزی خواصی میں اتنی جگہ کہاں کہ ایک ہاتھ میں چھتری اور ایک ہاتھ میں مورچل لے کر اتنا جسیم آدمی سما سکے۔ غرض بٹھائے گئے اور زبردستی ٹھائے گئے۔ کچومر نکل گیا، اس پر مورچل ہلانے کا حکم ہوا۔ دو چار دن کے حسن خدمت سے ان کا دم ناک میں آگیا، مرزا نے اپنا حال سرجان شور گورنر جنرل سے بیان کر کے سفارش طلب کی۔ گورنر جنرل نے بوجہ احسن بادشاہ سے سفارش کی۔ بادشاہ نے جواب دیا، آپ کی سفارش سے میں اتنا کر سکتا ہوں کہ بے شرط

خدمت نیابت ان کی تنخواہ مقررہ پچیس ہزار روپیہ ماہوار دیا کروں لیکن یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک جاہل کو سلطنت کا نائب بنالوں۔ مرزا صاحب نہ پڑھے نہ لکھے نافہم۔ اس صورت میں امورات مالی و ملکی کیونکر سر انجام پا سکتے ہیں۔ گورنر جنرل نے جواب معقول پاکر سر جھکا لیا۔

باورچیخانہ کا خرچ عہد آصف الدولہ بہادر میں بے حد تھا۔ آپ نے تمام کاغذات ملاحظہ کرکے زاید اور فضول مصارف کو قلمزد کر دیا اور خیانت کی باز پرس کی۔ صرف دو باورچی خانے رہے ایک غلام علیخاں کی نگرانی میں اور دوسرا محمد روشن کے اہتمام میں۔

خدمات میں اولاد اور عزیزوں کو شامل کر لیا۔ شہزادہ شمس الدولہ نواب احمد علیخاں صاحب نائب و جنرل فوج مقرر ہوئے۔ شہزادہ نواب شمس الدولہ مرزا محمد علیخاں کو دیوان عدالت مقرر کیا۔ شہزادہ نواب عماد الدولہ بہادر معین الملک ضرغام جنگ مرزا جعفر علیخاں بہادر کو خدمت اخبار ملکی تفویض ہوئی۔ یہ سب شہزادے تھے لیکن بے خدمت تنخواہ نہیں ملتی تھی۔

شہزادہ مرزا جہانگیر جب اپنی ناشایستہ حرکتوں سے دہلی سے بدر کیے گئے تو سیدھے لکھنؤ کی طرف رخ کیا۔ کیونکہ لکھنؤ میں شرفا اور اہل ہند کی عزت تھی۔ مرزا قتیل اور قاضی محمد خاں اختر، میر تقی میر، میر سوز، میر حسن، مرزا سودا، نواب طالب علیخاں عیشی، انشاء اللہ خاں، جرأت، مصحفی، معروف، میر تقی ترقی، یقین، ہوس، مظہر سب یہاں آکر مالا مال ہو چکے تھے اور لکھنؤ کے اکابرین کا تذکرہ تمام ہندوستان اور تمام یورپ میں بطور فسانہ کے بیان ہوتا تھا۔ مرزا جہانگیر جب لکھنؤ میں داخل ہوئے، شاہ اودھ نے بہت عزت کی، ان کے استقبال کو آئے اور تمام شہر کو از سر نو آراستہ کیا۔ ایکسو اشرفی نذر دی، دوسو روپیہ روز خاصہ کا

خرچ مقرر کیا۔ چند روز میں شہزادہ نے اپنی بیجا حرکتوں سے تمام شرفائے دہلی کو بدنام کیا۔ بادشاہ اودھ کو روز اخبار پہنچتے تھے دانتوں میں انگلی دبا کر افسوس کرتے۔ رفتہ رفتہ شہزادے کی حرکتوں نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ آخر شاہ اودھ نے برہم ہو کر رزیڈنٹ بہادر سے ان کے متعلق مشورہ کیا، وہ خود ان کی تمام کیفیت سے واقف تھے شہزادہ کی مخالفت میں تائید کی۔ آخر رزیڈنٹ بہادر کے حکم سے راتوں رات سوار ہو کر الہ آباد چلے گئے۔

سال بھر میں ایک مرتبہ موسم بہار میں بادشاہ سیر و شکار کو تشریف فرما ہوتے تھے نشانہ بندوق میں قادر انداز تھے انتظام لشکر بہت اچھا تھا۔ شہر کے خوش باش اور بے فکر تفریح کے حیلہ سے لشکر کے ساتھ ہو لیتے تھے کچھ رات رہے سے سواری نکلتی تھی، کئی سو فانوس کی روشنی سواری کے جلو میں ہوتی تھی۔ صبح کا وقت، تاروں کا جھلملانا شہنا نوازوں کا بھیرویں الاپنا، خوش الحان پرندوں کے چہچہے بہت لطف دکھاتے تھے خوانچہ والے ساتھ ساتھ جاتے تھے۔ راستے میں اکثر مظلوم رعایا کی دادخواہی ہوتی تھی ملک کی آبادی اور غیر آبادی کا پتہ معلوم ہوتا تھا، تعلقداروں سے محاسبہ ہوتا تھا۔ ایکدن حضور دہریرے میں تھے، صبح کو ایک شیر ہاتھیوں کے حلقہ میں آگیا، کئی سو ہاتھیوں نے حلقہ کر لیا تھا۔ شیر گھبرا کے بڑے صاحب کے ہاتھی پر جھپٹا اور جست کر کے ہاتھی کی سونڈ سے چمٹ گیا۔ فیل بان نے دل کڑا کر کے گجباگ ماری، ہاتھی نے ٹھوکر کھائی اس کے جھونک میں بڑے صاحب بھی ہودے سے شیر کے سامنے گر پڑے شیر چاہتا تھا کہ دبا بیٹھے اتنے میں بادشاہ نے تاک کر ایسی گولی ماری کہ شیر تڑپ کر دور جا گرا۔ چاروں طرف سے واہ واکی صدا بلند ہوئی اور بڑے صاحب شکر گزار ہوئے کہ آج بادشاہ نے پنجۂ اجل سے ہمکو بچا لیا لیکن بہت دہشت کھا گئے تھے اس لئے خس کی فنس میں سوار ہو کر اپنے خیمہ میں آئے۔

مردم شناسی کا یہ حال تھا کہ جو صاحب کمال دہلی یا حیدر آباد دکن سے پریشان ہوکر آتا، چند روز سلام کے بعد وظیفۂ شاہی مقرر ہوجاتا۔ میر انشاء اللہ خاں اور مرزا محمد تقی ترقی اسی سرکار میں بار یاب تھے۔

کوئی شخص بغیر رسید نکاسی شہر سے باہر نہیں جا سکتا تھا۔ کوئی مسافر دس روپیے سے زیادہ لیکر لکھنو کے کسی ناکہ سے نہیں گزر سکتا تھا۔ بعض اہلکار نے اچار کے گھڑوں میں اشرفیاں بھر کر اپنے وطن کو بھیجنا چاہا تھا۔ ناکہ پر کہار معہ بھنگی گرفتار ہوئے یہ مال رائے رتن چند کا تھا مگر سزا کے خوف سے کسی نے اقرار نہیں کیا۔ اشرفیاں شاہی خزانہ میں داخل ہوئیں یہ خاص ملکی محبت تھی، وہ چاہتے تھے کہ ہمارا ملک آباد اور شاداب رہے۔

ضبط اوقات کا یہ حال تھا کہ منہ اندھیرے قبل طلوع آفتاب محلسرا سے برآمد ہوکر گھوڑے پر سوار ہواخوری کو سوئے باغ دلکشا تشریف لے جاتے تھے۔ دو گھڑی کے بعد واپس آکر ہاتھی پر سوار ہوتے، جلوس سواری معہ ڈنکہ کے آگے ہوتا۔ راہ میں مسافر اپنی عرضیاں پیش کرتے، غریب مظلوم اپنے استغاثے دیتے، اُن کو ملاحظہ فرماکر حکم اور دستخط فرماتے۔ آٹھ بجے سواری واپس آتی۔ نو بجے چاء پانی کا دربار ہوتا تھا۔ کرسی نشین امرا مقربان خاص پہلو میں یار دبرو فروکش ہوتے تھے، سردارانِ فوج، معززین، خواجہ سرا باریاب سلام ہوتے تھے اور عرض بیگی کھڑے ہوکر ادب قاعدہ سے سلام کراتا تھا، برآمدے میں روشن چوکی، شہنائی اور بینڈ باجہ بجتا تھا ہر شنبہ کو نواب رزیڈنٹ بہادر اس صحبت میں شریک ہوتے تھے اور بعد چاء پانی کے خلوت خاص ہوتی تھی۔ تیسرا دربار دس بجے سے گیارہ بجے تک ہوتا تھا۔ یہ حضور کے خاصے کا دربار تھا۔ مقربانِ خاص، اردلی خاص، وزیر سلطنت شریک دستر خوان ہوتے تھے۔ گیارہ بجے دربار برخاست ہوتا تھا اس کے بعد محل سرا میں تشریف لیجاتے

اور کچھ دیر استراحت فرماتے تھے بارہ بجے چوتھا دربار ہوتا تھا۔ اسمیں کاغذات ملکی
ومالی ملاحظہ فرماتے، بعد تحقیق کے دستخط سے مزین فرماتے اور اسی دن دفتر اجرا سے
حکم جاری ہوتا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ معائنہ کاغذات میں رات ہوجاتی تھی۔ شام کے وقت
دو اسپہ گاڑی یا تامجاں پر سوار ہوکر مع جلوس سواری کسی گنج کی طرف تشریف لیجاتے
اور نرخ غلہ خود دریافت فرماتے تھے۔ ساتھ ہی عام لوگوں کی خریداری بھی ملاحظہ
فرماتے تھے۔

بادشاہ سلامت کا خیال تھا کہ جو ممالک ازروئے معاہدہ سرکار انگلشیہ کے قبضہ
میں ہیں اور جن کی میعاد سی سالہ ختم ہوگئی ہے اون کو گورنمنٹ کے انتظام سے نکال
لوں گا۔ اور اپنا ایک سفیر گورنر جنرل کے پاس رکھوں گا۔ اِدھر تو نواب سعادت علیخاں
بہادر ان فکروں میں منہمک تھے اُدھر کارکنان قضا و قدر کے پیش نظر
کچھ اور ہی انتظام و اہتمام تھا آدمی لاکھ اپنی عقل آرائیاں کرے
مگر ہوتا اوسی طرح ہے جس طرح سرنوشت کا قلم جاری
ہوا ہے۔

قضا سے کسی کا بس نہیں چلتا حسب معمول چار گھڑی دن رہے خاص بازار سے
بارہ دری میں داخل ہوئے، مداری گویے کا گانا سنکر انعام دیا، شب کے خاصے میں
پالک کا ساگ خشکہ اور چند پھلکے تناول فرمائے، تھوڑی دیر بعد یخنی کا معمول تھا۔ خاصہ
طعام عوری قاب میں آتا تھا جس میں زہر اثر نہ کرے، بڈھن خاں آبدار یخنی کا گلاس لایا
نوش فرمانے کے بعد پہلو کے تکیہ پر سر رکھنا چاہا، خواص نے سر اپنی گود میں لے لیا۔ کہا
کرتے کا بند کھول دو گرمی معلوم ہوتی ہے اتنے میں گردن کا منکا ڈھل گیا، کچھ بلغم
گلے میں آکر اٹک گیا۔ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر جو کچھ کہا وہ سمجھائی نہ دیا۔ اتنے میں روح
نے پرواز کیا۔ خواص نے دھانی رضائی اڑھا دی۔ رات کو نو بجے تھے۔ سہ شنبہ کو قریب

دوپہر کے دریا پر غسل دیا گیا۔ غسال نے بیان کیا کہ منہ سے خون جاری تھا۔ نواب غازی الدین حیدر کے مکان میں مدفون ہوئے۔ بڈھن خاں آبدار نے کہا کہ درحقیقت نمک حرامی کی سزا دنیا ہی میں ملجاتی ہے۔ ہم نے پانچہزار کے لالچ میں سعادت علیخاں کو یخنی میں کالا گرگٹ دیا تھا جس کا مال یہ ہوا کہ نہ روپیہ رہا نہ دولت۔ آل رہی نہ اولاد آج ہم محتاج ہوکر در بدر پھرتے ہیں۔

سولہ برس گیارہ مہینے اکیس روز سلطنت کی۔ اس قلیل مدت میں چودہ کرور روپیہ خزانہ عامرہ میں اُن کے حسن انتظام سے اور داخل ہوا۔

اسمیں شک نہیں کہ اگر نواب سعادت علیخاں بہادر کی زندگی وفا کرتی تو سلطنت اودھ کے دن پھر جاتے اور بہت اچھا انتظام ہوجاتا لیکن ان کے حسن انتظام کا راز کھل جانے سے اون کی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔ اسی لئے عقلا نے کہا ہے کہ اپنا راز کسی پر ظاہر نہ کرے، ایک بیدار مغز بادشاہ کے لئے اخفائے راز ضرور ہے نواب سعادت علی خاں قیصر باغ کی پشت پر ایک گنبد کے امام باڑہ میں خواب ناز فرمارہے ہیں اور اگرچہ اون کے مزار پر کچھ ابھی روشنی نہیں ہوتی ہے مگر اون کے کارنامے آج تک اون کا نام روشن کئے ہوئے ہیں۔ سعادت گنج انہیں کی آباد کی ہوئی بستی ہے قبر ایک تہہ خانہ کے اندر ہے جو بہت تاریک ہے اور ایک مختصر عملہ قرآن خوانوں کا بھی ملازم ہے۔

از جناب ثاقبؔ کانپوری

کیونکر نہ شکوہ سنج ہوں جب کیف درد سے — خود چارہ ساز ہی مجھے ناآشنا ملے
ثاقبؔ کی راہ عشق میں اللہ ری محویت — سجدے کئے جہاں پہ ترے نقش پا ملے

غالب اور بیدل

آخر وہ کس مپرسی کا زمانہ گزر گیا جس کا رونا عمر بھر غالب مرحوم کو رہا؛ اور جب ایک طرف تو اون کے کلام پر ان الفاظ میں تنقید کی جاتی تھی۔

کلام میر سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے ۔۔۔ مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

اور دوسری جانب بیچارہ غالب اس عنوان سے عذر خواہی کرتا تھا کہ:۔

"ازبس ہے مرا کلام مشکل ابدل ۔۔۔ سُن سُنکے اُسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش ۔۔۔ گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل"

اب تو شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو جسکو اردو شاعری سے دلچسپی ہو اور غالب کو نہ جانتا ہو، اور شاید ہی کوئی غالب کا جاننے والا ایسا ہو جس نے اون کا یہ مقطع نہ سُنا ہو:۔

طرز بیدل میں ریختہ لکھنا ۔۔۔ اسد اللہ خاں قیامت ہے

غالب کا قصور "گویم مشکل" سوا اس کے اور کیا ہو سکتا ہے کہ وہ "طرز بیدل" میں ریختہ کہتے یا کہنا چاہتے تھے؛ جیسا کہ وہ ایک اور مقطع میں فرماتے ہیں:۔[۵]

اسد ہر جا سخن نے طرح باغ تازہ ڈالی ہے ۔۔۔ مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

غالب نے جس ذات فضیلت آیات کو اپنا پیشرو بنایا، جس خرمن سے خوشہ چینی کی جس تودۂ کلاں سے مشت خاک اٹھائی اوس کے تصوف، اوس کے فلسفہ، اور اوسکی شاعری کا پایہ وہی بہتر سمجھ سکتا ہے جو خود بھی ویسا ہی دل ودماغ رکھتا ہو۔ بیدل کی تخئیل

۵۔ یہ مقطع غالب کے دیوان نسخہ حمیدیہ میں موجود ہے ۱۲۔

اور اون کا اُسلوبِ بیان عام شاعروں کی تخئیل اور اُسلوب بیان سے اسقدر بلند اور ورا، الورا ہے کہ ہم جیسا شخص اگر اپنے قصور فہم کا اعتراف بھی کرنا چاہے تو اُنہیں کے الفاظ میں اسطرح کر سکتا ہے:-

ذرۂ بیدست وپا در بارگاہ آفتاب　　بال عجز افشاند اما غافل از آداب شد

یا اگر کچھ کہنے کی جرأت کرے جب بھی اتنا ہی کہہ سکتا ہے کہ بیدل نے یہ کہا ہے:-

انچہ کلکم می نگارد محض حرف وصوت نیست　　ہوش می باید کہ دریابد زبانِ بیدلی

گرہمہ جبریل باشد مرغ فہم آگاہ نیست　　تاچہ پرواز است محو آشیانِ بیدلی

ہر کہ از خود شد تہی از ہستی مطلق پر است　　سجدہ بنجواہد حضور آستانِ بیدلی

از حباب من سراغ گوہر نایاب گیر　　یک نفس چیدہ است بحر انجا دکانِ بیدلی

اب دیکھنا یہ ہے کہ غالب نے اس "دکانِ بیدلی" سے "گوہر نایاب" کا سُراغ لگانے میں سعی کی، اور اُنہیں گوہر نایاب ہدست ہوا اگر دوسرے قدو قامت کا، دوسری آب وتاب کا، دوسری قدر وبہا کا! حقیقت مہر روشن کا حکم رکھتی ہے جسے کوئی پردہ چھپا نہیں سکتا حتیٰ کہ پردۂ شب! مرزا بیدل اور مرزا غالب میں - اگرچہ مرزا دونوں تھے - فرق مراتب ہے؛ اس لئے وہ اُن حدود میں تو نہ پہنچ سکے جو بیدل کے خاص حدود تھے، پھر بھی اپنی فطری عالی خیالی، صائب رائے، اور غور غائر کی مدد سے ایک جدید طرز کے موجد ہوئے اور راپنا راستہ الگ نکال لے گئے.

ہر چند "طرز بیدل میں ریختہ لکھنا قیامت تھا" لیکن "اسد اللہ خاں" نے لکھا[ه]! دیکھنا یہ ہے کہ اس مقتدی نے اپنے امام کی پیروی کس طرح اور کس حد تک کی؟ اس لئے ذیل میں دونوں بزرگوں کی دو ہمطرح غزلیں اور چند متفرق اشعار درج کئے

ه. لکھنو کے محاورہ میں اسموقع پر کہنا بولتے ہیں لیکن ہم نے یہاں غالب ہی کی اصطلاح کو دُہرایا ہے

جاتے ہیں تاکہ دیکھنے والے دیکھیں اور سمجھنے والے سمجھیں۔

آجکل جبکہ غالب کے مہملات اور غالب کے الہامات کی بحث بہت دور و شور سے چھڑی ہوئی ہے، ممکن ہے کہ لوگ ہماری نسبت بھی سوءِ ظن یا حسنِ ظن سے کام لیں، اس لئے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ ہم صرف اوس دعوے کی دلیل پیش کر رہے ہیں جو غالب نے اپنے اس مقطع میں ہے

طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہے

کیا ہے اور بس۔ سب جانتے ہیں کہ بچہ جب پیدا ہوتا ہے تو کوئی زبان، کوئی خیال، اور کوئی معلومات اپنے ساتھ لے کر نہیں آتا۔ وہ جو کچھ دوسروں سے سنتا اور سیکھتا ہے وہی اوسکا علم ہوتا ہے، جسکو اوس کے ذاتی تجربے، مشاہدے، اور استقرا کی تسکین وسیع کرتی رہتی ہے۔ جس طرح چراغ سے چراغ جلتا ہے، اسی طرح خیال سے خیال پیدا ہوتا ہے۔ شاگرد اپنے اُستاد سے اور اُستاد اپنے اُستاد سے سیکھتا ہے۔ اُستاد چاہے آدمی ہو یا کتاب، ہمارے معلومات و تجارب کے ذخیرے میں بہت بڑا حصہ دوسروں کا ہے اور بہت کم ہمارا اپنا۔ غرضکہ شاعر طبع موزوں فطرت سے پاتا ہے لیکن واقعات و خیالات بیشتر مستعار ہوتے ہیں اور کمتر ذاتی؛ البتہ اُسلوب بیان اور ترتیب جُمل کی کامل حقیت کا۔ اگر وہ مالک ہو۔ تو ہو بھی سکتا ہے۔

یاد رکھو کہ اگر تم کسی خاص فن میں کمال حاصل کرنا چاہتے ہو، تو تمھارا پہلا قدم صاحبانِ کمال کی پیروی میں اٹھنا چاہیئے۔ یہی پیروی اور تقلید تم کو اوس منزل تک پہنچائے گی جہاں سے اگر تم اپنے لئے کوئی راستہ الگ نکالنا چاہو تو نکال سکو گے۔ اوسوقت تم بجائے پیرو اور مقلد ہونے کے پیشرو ہو گے اور امام! یہی مرزا غالب نے کیا، اور اسی سے وہ اوس بلند مقام پر پہنچا جہاں آج دنیا اوس کو دیکھ رہی ہے۔ لوگ اسکو جو چاہیں کہیں ہم ارتقائے ذہنی کا ذریعہ کہیں گے اور

یہی ارتقائے ذہنی کا واحد ذریعہ ہے۔

اب ہم اپنے ناظرین کو زیادہ زحمت انتظار دینا نہیں چاہتے۔ وہ آئیں اور دیکھیں کہ ایک باکمال کے گلزار خیال سے ایک جویائے کمال نے کیسے کیسے پھول اور پتیاں جمع کیں اور کس سلیقہ سے اون کا گلدستہ بنا کر ہماری نظر فریبی کا ساماں مہیّا کیا:۔

بیدل	غالب
راز داری ہا بمعنی کوس شہرت بودہ است	دیکھ کر در پردہ گرم دامن افشانی مجھے[1]
چوں حبیا از پوشش غیب است عریانی مرا	کر گئی وابستۂ تن میری عریانی مجھے

بیدل کے (رازداریہا کوس شہرت بودہ است) نے غالب کو در پردہ گرم دامن افشانی کر دیا، ممکن ہے کہ گرم دامن افشانی ہونے کا خیال اس مصرع سے پیدا ہوا ہو جو بیدل کے مطلع کا دوسرا مصرع ہے ع۔ پیچ و تاب شعلہ باشد نقش پیشانی مرا۔ دوسرے مصرع میں سے حیا کو اڑا دیا، پوشش غیب کو پوشش تن سے بدلا، اور قافیہ عریانی ہی قایم رکھا، شعر بنگیا اور الگ بنا. لیکن اگر آپ پوچھیں کہ بنا کیا؟ تو میں عرض کرونگا کہ میرا مرغ فہم جبریل بننے کی صلاحیت نہیں رکھتا ہے۔

---

[1] یہ مضمون لکھنے کے بعد مجھے دیوان غالب کا نسخہ حمیدیہ دیکھنے کو ملا. اوس میں دو غزلیں اسی طرح میں ہیں. اور پہلی غزل میں جو قدیم مطبوعہ دیوان سے خارج ہے. یہہ قافیہ اسطرح نظم ہوا ہے ؎

شوق ہے شل حباب از خویش بیرون آمدن
ہے گریباں گیر فرصت ذوقِ عریانی مجھے

پہلے مصرعہ میں 'حباب' کاتب کی غلطی معلوم ہوتی ہے غالباً وہاں بھی حیا ہی ہوگا۔ ۱۲

غالب	بیدل
۲ تنگئ تیغ نگاہ یار کا سنگ فساں	میرود از موج بر باد فنا نقش حباب
مرحبا میں کیا مبارک ہے گرانجانی مجھے	تیغ خونخوار است بیدل چین پیشانی مرا

چین پیشانی کی تیغ کے نیام میں تیغ نگاہ کو جگہ دی، زود میری کے عوض گرانجانی دکھائی، خیال کے ساتھ مصرعوں کی ترتیب کو بھی پلٹا، اس طرح ایک نیا کالبد تیار کیا اور اوسمیں 'مرحبا میں' کے ذریعہ سے روح پھونکی، قادر الکلامی دکھائی اور شعر الگ کر لے گئے، مرحبا!

غالب	بیدل
کیوں نہ ہو بے التفاتی اسکی خاطر جمع ہے	احتیاج خود شناسی جوہر آئینہ نیست
جانتا ہے محو پرسشہائے پنہانی مجھے	من اگر خود را نمیدانم تو میدانی مرا

بہ غور دیکھئے 'بے التفاتی'، اور 'محو پرسشہائے پنہانی' کے ٹکڑے آئینے کی خود نشناسی اور پنہاں شناسی شخص مقابل سے مستعار ہیں۔ پھر محویت اور 'خاطر جمعی' کی جھلک بھی اسی آئینے میں نظر آتی ہے جو ہمہ تن حیرت ہے۔ یہ پاکیزہ استخراج بیشک خراج تحسین کا مستحق، اور ارتقائے خیال کی عمدہ مثال ہے۔

غالب	بیدل
۳ میرے غمخوانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی	مدعمرم یکقلم چوں شمع در وحشت گزشت
لکھدیا منجملۂ اسباب ویرانی مجھے	آشیاں نہ ہم برنیاورد از پریشانی مرا

۲ یہ شعر خارج شدہ غزل میں اسطرح ہے ؎ وا کیا ہرگز نہ میرا عقدۂ تار نفس ٭ ناخن بریدہ ہر تیغ صفاہانی مجھے ٭ اور پیشانی کا قافیہ غالب نے مطلع میں نظم کیا ہے جو یہ ہے۔ ؎ نے جبیں کہتی ہے شرم قطرہ افشانی مجھے ٭ موج گرداب حیا ہے چین پیشانی مجھے اب اس مطلع اور بیدل کے شعر کو ملا کر دیکھیئے۔

۳ یہ شعر جدید دیوان میں اسطرح ہے ؎ بلبل تصویر ہوں بیتاب اظہار تپش ٭ جنبش نال قلم جوش پریشانی مجھے ٭

اب اہل نظر دیکھیں کہ یہ شعر بیدل کے شعر سے کسقدر اقرب ہے، اور ہمارا خیال کہاں تک درست تھا۔

بظاہر یہ دونوں شعر ایک دوسرے سے کوسوں دور نظر آتے ہیں۔ لیکن یہہ فریبِ نظر ہے۔ بیدل کے پانچ لفظ قلم، شمع، وحشت، آشیاں، اور پریشانی، غالب کے خیال کی بنیاد ہیں۔ وہاں حالتِ پریشانی ہے یہاں اسباب ویرانی، وہاں قلم ہے یہاں رقم، وہاں آشیانِ وحشت ہے یہاں خانۂ غم، وہاں منجملۂ اسباب خانہ داری ایک شمع ہے اور یہاں مرزا صاحب بہ نفس نفیس! فرمایئے کہ غالب جیسے قادر الکلام کو اتنی مستحکم بنیاد پر غمخانہ تیار کر لینا کیا دشوار تھا؟

غالب	بیدل
واے واں بھی شورِ محشر نے نہ دم لینے دیا[1]	داغِ شوقم تہمت الفت با تن آسانی مرا
لے گیا تھا گور میں ذوقِ تن آسانی مجھے	پیچ و تاب شعلہ باشد نقش پیشانی مرا

ان دونوں شعروں میں صرف تن آسانی کا قافیہ، اور تن آسانی کے عدم امکان کا خیال مشترک ہے۔ باقی بیدل کے بیان اور غالب کے بیان میں حیات و ممات کا فرق ہے۔
لیکن ہم بیدل کا ایک شعر اور نقل کرتے ہیں جسکا خیال ممکن نہیں کہ غالب کے ذہن میں موجود نہ ہو اور نہ قیاس یہ چاہتا ہے کہ یہ شعر غالب کی نظر سے گزرا ہی نہ ہو جبکہ وہ فنا فی بیدل نظر آتے ہیں۔ شعر یہ ہے اور کتنا اچھا ہے:-

مردہ ہم بیم قیامت دارد آرمیدن چہ قدر دشوار است

اس سادہ شعر اور غالب کے پُر تکلف شعر میں وہی فرق ہے جو میر تقی اور میر انیس اور میر تقی اور مرزا سودا کے ان اشعار میں ہے یا جو حقیقت اور بناوٹ میں ہوتا ہے۔

[1] یہ شعر جدید دیوان میں اسطرح بصورت مطلع نظر آتا ہے ؎ تر جبیں رکھتی ہے شرمِ قطرہ افشانی مجھے موجِ گردابِ حیا ہے جبینِ پیشانی مجھے ۔ یہ شعر ہم نے غالب کے مطلع کے فٹ نوٹ میں بھی دیا ہے یہاں بھی دیتے ہیں۔ اب ناظرین خود بیدل کے دونوں شعر اور غالب کے دونوں شعر ایک جگہہ کرکے دیکھیں کہ غالب نے بیدل کے مطلع اور شعر سے کیونکر اپنا مطلع اور شعر نکالا ہے ہم نے پہلے جو کچھ لکھا تھا وہ اصول انتقام کے لحاظ سے مبنی بر قیاس تھا مگر اب ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔ غالب کا وجود شعر کی بہ اصلاح

میر

ہاتھوں پہ یہ جھُرّیاں نہیں ہیں
پیری جامہ کو چُن رہی ہے

انیس

یہ جھرّیاں نہیں ہاتھوں پہ ضعف پیری نے
چنا ہے جامۂ اصلی کی آستینوں کو

میر

سرھانے میر کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

سودا

سودا کی جو بالیں پہ ہوا شور قیامت
خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے

غالب

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

بیدل

جلوہ مشتاقم بہشت و دوزخم منظور نیست
میروم از خویش در ہر جا کہ میخوانی مرا

قافیہ الگ ہے، مضمون الگ ہے، بندش الگ ہے، مگر خیال کے کھیلنے کے لئے جگہہ موجود ہے۔ بیدل کی مشتاقی جلوہ نے غالب کو معشوق کا وعدہ دیدار یاد دلایا، اور بس یہیں سے شعر کی بنیاد پڑی۔ انتظار میں چشم بہ در اور چشم براہ ہونا کوئی نئی بات نہیں، مگر غالب نے "تم نے مجھے میرے گھر کی دربانی کیوں سونپی ہے" کہہ کر اسمیں نئی جان ڈال دی، اور یہی شاعر کا کمال ہے۔ ع لفظے کہ تازہ ہست بمضمون ابراست
نو شعر کی غزل میں چھ شعر تو ہو گئے (ملحوظ خاطر رہے کہ بیدل کی غزل کے بھی آٹھ ہی شعر ہیں) اب رہے تین شعر۔[شہ]

بدگماں ہوتا ہے وہ کافر نہ ہوتا کاشکے
اسقدر شوق نوائے مرغ بستانی مجھے

شہ جدید دیوان میں ایک شعر اور ہے۔ ضبط سوز دل ہے وجہ حیرت اظہار حال + داغ ہے مہر دہن جوں چشم قربانی مجھے + یہ شعر بالکل غالب کا معلوم ہوتا ہے۔ مگر حیرت بالائے حیرت اوسوقت ہوتی ہے جب بیدل کا یہ شعر ہماری نظر کے سامنے آتا ہے:۔ ہ
در طلسم حیرت ما ہیچکس را بار نیست + چشم قربانی کمینگاہ خیال دیگر است +

ہاں نشاطِ آمدِ فصلِ بہاری واہ وا پھر ہوا ہے تازہ سودائے غزلخوانی مجھے
وہی مرے بھائی کو حق نے از سر نو زندگی میرزا یوسف ہے غالب یوسف ثانی مجھے[۵۶]

ان میں مقطع مختص المعنی ہے۔ دوسرا شعر محض بھرتی کا ہے۔ اور پہلا خاص غالب کے اختراعات میں سے ہے۔ طوطی پر معشوق کا رشک کھانا اگرچہ ایک انوکھی بات ہے مگر مرزا نے اور بھی باندھا ہے ؎ کیا بدگماں ہے مجھ سے کہ آیینہ میں مرے + طوطی کا عکس سمجھا ہے زنگار دیکھکر +

یہ مطلع غزل تھی، اب ایک غزل اور لیجیے جو دو غزلوں سے متخرج ہے۔ بیدل کے دیوان میں آپ کو دو غزلیں ایک ہی جگہ دکھائی دیں گی۔ ان میں ایک کی ردیف سوختن ہے اور دوسرے کی ردیف آتش است اور قافیہ صحرا، دریا وغیرہ۔ ایک کی ردیف اور دوسرے کے قافیہ نے غالب کو صحرا جل گیا' کی طرح سمجھائی۔ ایک شعر مرتب ہوگیا۔ اب دیکھیے کہ وہ شعر کیا ہے اور اوسکا ماخذ کیا ہے:-

غالب	بیدل
ہیں عدم سے بھی پرے ہوں ورنہ غافل بارہا	جز بہ گمنامی نشان امن نتواں یافتن
میری آہِ آتشیں سے بال عنقا جل گیا	ورنہ از پرواز ماتا بال عنقا آتش است

ہم نے مطلع کو چھوڑ کر پہلے جو درمیانی شعر کو لیا ہے اوسکی وجہ ظاہر ہے کہ جو شعر لیا گیا ہے وہ نقل مطابق اصل کا حکم رکھتا ہے۔ 'غافل بارہا' کے ٹکڑے کو' جو غالب کے پاس محض برائے بیت ہے' نکال کر مقابلہ کیجیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ دونوں مصرعوں میں غالب کی ذاتی پونجی کتنی ہے؛ اس کے بعد اصل و نقل کے فرق کو بھی ملاحظہ فرمایئے یہ مفروضہ مسلمات کی حد میں آگیا ہے کہ عنقا کا مقام عدم ہے۔ بیدل کہتا ہے کہ عنقا معدوم، مگر اوسکا نام موجود اور زبانوں پر کھچا کھچا پھرتا ہے' اور اس کشاکش نے اذیت کو

[۵۶] یہ مقطع اصلاح مکرر کے وقت بڑھایا گیا ہے ورنہ سابقہ غزل میں آٹھ ہی شعر تھے۔

مفقود کر دیا ہے۔ نتیجہ یہ کہ عدم میں بھی اس مفقود ہے لہذا مقام گمنامی میں اوسکا سراغ لگانا چاہیئے۔ مطلب یہ کہ اپنا نام و نشان دونوں کو مٹا کر راجع الی الاصل ہوجا ورنہ عنقا کی طرح معدوم ہوجانا بھی جبتک کہ تو تو ہے تجھکو ناموں نہیں بنا سکتا۔ غالب نے جزو گمنامی سراغ "من نتواں یافتن" کے خیال کو "میں عدم سے بھی پرے ہوں" کہکر ظاہر کیا اور جو کہا وہ محض ادعا ہے بلکہ ادعائے محض۔ اسی سے کہنے والوں نے یہہ کہا کہ ایک ہی شخص سے نقیضین کا مرتفع ہونا کہ وہ نہ معدوم ہو نہ موجود بمعنی ہے۔ اب دوسرا شعر لیجیے۔

بیدل	غالب
نبست بیدل بیقراری ہائے شوقم بے سبب	عرض کیجے جوہر اندیشہ کی گرمی کہاں
از دم گرم نفس را در تہ پا آتش است	کچھہ خیال آیا تھا وحشت کا کہ صحرا جل گیا

قافیے کی اجنبیت پر نہ جائیے۔ بیدل کے منقولہ شعر سے اوپر کے شعر کا قافیہ صحرا ہے جسکو باوجود غیر منقولہ ہونے کے غالب نقل کرلے گئے۔ اب مضمون کو دیکھیے۔ بیدل کی بیقراری شوق ترقی پذیر ہوکر غالب کی وحشت بن گئی۔ وہاں شوق کی بیقراری نے تنفس کو تیز کرکے نفس کو آتش زیر پا کر دیا۔ یہاں وحشت کی تحریک نے جوہر اندیشہ کو اتنا گرمایا کہ آگ بھڑک اٹھی اور صحرا جل گیا۔ مگر واہ ری قدرت! شعر کو کہاں سے کہاں لے گئے کہ پتہ بھی نہیں چلتا۔ البتہ یہاں پر ایک نکتہ ملحوظ خاطر رہے کہ بیدل کا شعر حقیقت کا آئینہ ہے اور غالب کا شعر محض ادعائے شاعرانہ۔

بیدل	غالب
زمردمک نگہم داغ شد چو شمع خموش	دل مرا سوز نہاں سے بے محابا جل گیا
فروغ دیدۂ بیدار شمع وارم سوخت	آتش خاموش کے مانند گویا جل گیا

بیدل کہتا ہے کہ رشتہ نگاہ میں شمع خاموش کی طرح مردمک سے گل بندھا اور دیدۂ بیدار کے فروغ نے مجھے شمع کے مانند جلا ڈالا یعنے شمع خموش کر دیا۔ دیدہ جمال یار کو دیکھے

کبھی بیدار یا خوش نصیب ہو سکتا ہے ورنہ خفتہ یا بد بخت ہوگا۔ مگر جمال یار کا دیدار نصیب ہونے پر خرمن صاعقہ کی خبر برآمد ہونا بھی لازمی ہے جسکو شاعر نے "نگہم داغ شد او شمع وارم سوخت" کہہ کے ظاہر کیا۔ غالب نے اس شعر سے صرف شمع خاموش کو لیا اور اوسے آتش خاموش کہا اور شعر تیار کیا جیسا کچھ تیار کیا۔

غالب کی اس غزل میں تین شعر اور ہیں۔

دل میں ذوق وصل و یاد یار تک باقی نہیں آگ اس گھر میں لگی ایسی کہ جو تھا جل گیا

دل نہیں تجھکو دکھاتا ورنہ داغوں کی بہار اس چراغاں کا کروں کیا کارفرما جل گیا

میں ہوں اور افسردگی کی آرزو غالب کہ دل دیکھکر طرز تپاک اہل دنیا جل گیا

یہ تینوں شعر طبیعت کی آمد کا نتیجہ ہیں اور انصاف یہ ہے کہ بہت اچھے ہیں۔

غالب	بیدل
نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا	بہ ہستی تو امید است نیستی ما را
ڈبویا مجھکو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا	کہ گفتہ اند اگر ہیچ نیست اللہ است

الغرض دونوں اشعار کے فرق کو ملاحظہ فرمائیں بالخصوص بیدل کے پہلے مصرع کی ترکیب وخیال کو۔ اگرچہ یہ مضمون صدہا طرح سے شعرائے متصوفین کے کلام میں بندھا ہے لیکن "بہ ہستی تو امید است نیستی ما را" کہکر بیدل نے اوسمیں ایسی نئی روح پھونکی ہے جس سے بہتر ناممکن ہے۔

غالب	بیدل
ستایش گر ہے زاہد اسقدر جس باغ رضواں کا	صورت دہے بہشتے متہم داریم ما
وہ اک گلدستہ ہے ہم بیخودوں کے طاق نسیاں کا	چوں حیات آئینہ بر طاق عدم داریم ما

بیدل کے مصرع ثانی میں حیات وحباب دونوں طرح معنی پیدا ہوتے ہیں لیکن میرے پاس جو نسخہ ہے اوسمیں حیات ہی چھپا ہوا ہے۔ خیر جو کچھ ہو بیدل کے شعر میں

بہشت کو یہ الفاظ ظاہر صورت وہی، اور آئینہ طاقِ عدم کہا گیا ہے۔ غالب نے طاق عدم کو طاقِ نسیان اور آئینہ کو گلدستہ کہکر اپنا شعر الگ کرلیا۔ اتنا اشارہ ایک نادرالکلام شاعر کی رہنمائی کے لئے بہت کافی تھا۔

غالب — بیدل

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولیٰ برق خرمن کا ہے خونِ گرم دہقاں کا

شعلہ کاراں را بہ خاکستر قناعت کردن ست
ہر کجا عشق است دہقاں سوختن ہم حاصل است

ابھی تک غالب کے شارحین شعر کا اصلی مطلب سمجھانے سے قاصر ہیں، شاید آئندہ کوئی صاحب سمجھیں اور سمجھا سکیں۔ ہماری سمجھ میں تو اتنا آتا ہے کہ بیدل کا دہقانِ عشق شعلہ کار ہے، اور حاصل کشت خاکستر اور سوختن۔ غالب کے دہقان کا خون گرم ہو رہا ہے (غالباً کشاورزی کی مشقت سے) اور گرم بھی اتنا ہوا کہ برق بنگیا اب خرمن کا جلنا لازمی اور حاصل وہی سوختن اور خاکستر یا غالب کے الفاظ میں "خرابی" غالب نے پہلا مصرع بدلا اور بجائے حاصل و خاکستر کے تعمیر و خرابی لائے؛ اچھا کیا کیونکہ اگر شاہ و وزیر محلوں میں رہتے ہیں تو غریب کسان بھی پھوس کی جھونپڑی بنا کر رہتا ہے۔ لیکن مضمون کو جدا کرنے کی کوشش میں غالب خود مضمون سے جدا ہو گئے۔ کہاں تو برق و خرمن کی لاگ دکھا رہے تھے اور کہاں تعمیر و خرابی کے جھگڑے میں جا پھنسے۔ ہیولیٰ اور صورت کی کشمکش تخیل نے شعر کو مختل کردیا غالب مرحوم نے اس مضمون کو کئی جگہ کہنے کی کوشش کی ہر ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

کارگاہ ہستی میں لالہ داغ ساماں ہے
برق خرمن راحت خون گرم دہقاں ہے

غالب — بیدل

بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

حرف چندیکہ صرف التفات
چوں تامل کنی نہ آسانست
غافل گردیدن دنیا سودن
نیست مشکل چو آدمی بودن

غالب	بیدل
جب بہ تقریب سفر یار نے محمل باندھا	محمل ما چوں جرس جوش طپش ہائے دل است
تپش شوق نے ہر ذرہ پر اک دل باندھا	شوق پیمدار و درین وادی قدم داریم ما
تیشہ بغیر مر نہ سکا کوہکن اسد	زندگی در بند رسم و قید عادت بودہ است
سرگشتہ خمار رسوم و قیود تھا	دست دست تست بشکن ایں طلسم سنگ را

پہلے دونوں اشعار میں توافق معنی اور اتحاد لفظی اسقدر واضح ہے کہ کسی تشریح کی ضرورت نہیں۔ تیسرے شعر میں بندش نمایاں ہے، لیکن بیدل نے جو "طلسم سنگ" کے توڑنے کی ہدایت کی ہے اسی سے غالب کا خیال کوہکن اور تیشہ کی جانب منتقل ہوا۔ باقی غالب کا دوسرا اور بیدل کا پہلا مصرع تقریباً ایک ہی فرق صرف اتنا ہے کہ وہاں بند عادت ہے اور یہاں سرگشتگی خمار!

غالب	بیدل
گلہ ہے شوق کو دل میں بھی تنگی جا کا	دل آسودہ ما شور امکاں در نفس دارد
گہر میں محو ہوا اضطراب دریا کا	گہر دزدیدہ است اینجا عنان موج دریا را

دونوں شعروں کے ثانی مصرعے ہوبہو ایک ہیں، صرف بندش کا فرق ہے اوپر کے مصرعوں کو لیجیے تو معلوم ہوگا کہ بیدل کے دل آسودہ میں اسقدر وسعت ہے کہ اُس کے ایک نفس میں شور امکاں کو جگہہ مل گئی، اور غالب کا دل وسیع (وسیع اس لئے کہ بھی کی تاکید وسعت کو ظاہر کر رہی ہے) اتنا تنگ ہے کہ شوق اُس میں نہیں سماسکتا یا شوق اسقدر افزوں ہے کہ دل کی وسعت اُس کیلئے ناکافی ہے۔ ع۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بہ کجا؛ مگر غالب کو بیدل سے جو خیال لینا تھا وہ صرف اتنا ہی کہ موتی میں دریا سما گیا، اور اوسنے یہ خیال لے لیا! کہنے والے کہیں گے کہ لفظ اضطراب خاص غالب کا ہے؛ مگر دیکھنے والے دیکھتے ہیں کہ بیدل کا دریا بھی

اسپ برق رفتار کی طرح مضطرب ہو رہا ہے جب تو اسکی لگام کھینچنے کی ضرورت داعی ہوئی۔ بہرکیف مرزا غالب کا استخراج نہایت پاکیزہ ہے اور ہم اوسکی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتے!۔

غالب — بیدل

جاں کیوں نکلنے لگتی ہے تن سے دم سماع
گر وہ صدا سمائی ہے چنگ و رباب میں

گر شوی محرم نوائے پردۂ تمکین ساز
کے فریب نغمہ نیرنگت از جا می برد

دونوں شعر دور دور ہیں۔ عبارات تشبیہی سے قطع نظر کر کے دیکھیئے! ایک کہتا ہے کہ اگر تو اوسکی صدا کا محرم ہے تو نغمۂ نیرنگ کو سنکر تیرا دل کیوں ڈانوا ڈول ہوتا ہے۔ دوسرا کہتا ہے کہ اگر اوسکی آواز چنگ درباب کے پردے میں ہوتی تو اوس کا خاصہ ہے جاں نوازی نہ کہ جاں گدازی۔ اب دیکھیئے کہ بیدل کے ہاں فریب نغمۂ نیرنگ سے دل کا ڈانوا ڈول ہونا اسوجہ سے ہے کہ سامع پردۂ تمکین ساز (حقیقت) کی نوا سے نا آشنا ہے۔ اور غالب کے ہاں سامع (فریب نغمہ نیرنگ) کو سنکر جان کا نکلنے لگنا (دل کا جگہہ چھوڑ دینا) اسوجہ سے ہے کہ چنگ و رباب میں اسکی (ساز حقیقت کی) آواز ہی نہیں ہے (بلکہ فریب نغمہ نیرنگ ہے)۔ کون کہے گا کہ یہ دونوں شعر الگ الگ ہیں۔ یہ قادر الکلامی کی شان ہے کہ ظاہری شکل و صورت میں نقل کو اصل سے الگ کر دکھایا ہے۔

غالب — بیدل

اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

در عالم تقئید کہ جوش صور است
ہر موج بصد رنگ تپش جلوہ گر است

ہے مشتمل نمود صور پر وجود بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں

اما در عالم شہود و اطلاق
صد بحر و ہزار موج و کف یک گہر است

اصل مضمون تصوف کے مسائل جلیلہ میں سے ہے اسلوب بیان غالب و بیدل کا اسقدر ایک دوسرے کے قریب تر ہے کہ اس کی نسبت کچھ لکھنے کی حاجت نہیں۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے:۔

غالب	بیدل
ہے غیبِ غیب جسکو سمجھتے ہیں ہم شہود	ہمہ غیب است شہود اینجا نیست * جلوہ اخفاست نمود اینجا نیست
ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں	نتواں جلوۂ مطلق دیدن * آنکہ این پردہ کشود اینجا نیست

ان اشعار کا حال بھی اوپر کے اشعار کا سا ہے، اس لئے ان کو بھی ہم بغیر اظہار رائے ناظرین کرام کی نظر حقیقت شناس کے سپرد کرتے ہیں۔

غالب	بیدل
بساطِ عجز میں تھا ایک دل اک قطرۂ خوں وہ بھی	عشق ہر جا ادب آموز تپیدن باشد
سو رہتا ہے بہ انداز چکیدن سرنگوں وہ بھی	خونِ بسمل عرقِ شرم چکیدن باشد

غالب کے شعر میں بیدل کے خونِ بسمل کا قطرۂ خوں موجود اور اسی طرح صرف چکیدن ہے عجز و سرنگونی کا ماخذ بیدل کی ادب آموزی ہے۔ بیدل کے ہاں اسی ادب آموزی عشق سے خونِ بسمل عرقِ شرم بنکر ٹپکا ہے، مگر غالب کے قطرۂ خون یعنے دل کے سرنگوں ہوکر ٹپکنے کی وجہ غیر حاضر ہے

غالب	بیدل
باغ پا کر خفقانی یہ ڈراتا ہے مجھے	بسکہ بارو تے تو دارم ز گلستاں وحشت
سایۂ شاخِ گل افعی نظر آتا ہے مجھے	بر سرم سایۂ گل پنجۂ شاہیں آمد

غالب کا شعرانہ کا انداز وہی ہے جو بیدل کا ہے، صرف وہاں سایۂ گل کی تشبیہ پنجۂ شاہیں سے ہے اور یہاں سایۂ شاخِ گل کی افعی سے۔ باغ اور خفقان اور گلستاں اور وحشت دونوں کے پاس موجود ہیں، اب رہا کیا؟ ہمارے بزرگ محترم

علامہ طباطبائی نے اس شعر کا ماخذ نظیری نیشاپوری کے اس مشہور شعر کو بتایا ہے۔ ؎

بزیر شاخ گل افعی گزیدہ بلبل را نوا گران نخوردہ گزند را چہ خبر

مگر یہاں صرف افعی و شاخ گل کے الفاظ مشترک ہیں ورنہ اور کوئی لگاؤ نظیری کے شعر سے غالب کے شعر کو نہیں ہے۔

یہ چند اشعار مشت نمونہ از خروارے ہیں۔ ہم نے اس مضمون میں صرف یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ غالب مرحوم نے جو دعویٰ جا بجا بیدل کی خوشہ چینی کا کیا ہے وہ بجا نہیں ہے ہر چند کہ مرزا صاحب طرز بیدل میں ریختہ لکھنے کی کوشش میں جا بجا الجھ گئے ہیں مگر غالباً اس طرح کے اشعار ان کی ابتدائی مشق کے افکار ہیں، انتہائی رنگ جو غالب کا ہے وہ اسقدر نکھرا اور چوکھا ہے جو بہت کم کسی اردو شاعر کو نصیب ہوا ہے اور ہم پھر یہی کہیں گے کہ محض "دکان بیدلی" کے مشتری بننے سے یہ "گوہر نایاب" اُن کو ہاتھ آئے۔

حالت ظرف کچھ بھی ہو کیف نہیں رہیں کم
بادہ وہی ہے جام میں جو کہ خم و سبو میں تھا
طالب من کنتوری

کلامِ ساقی

داغ ہے دل پر مرے نقش سویدا کیوں نہ ہو
بار خاطر ہے مجھے میری تمنا کیوں نہ ہو

عشق کا مارا نڑپتا ہے ہر اک آواز پر
شور نا مانوس ناقوس کلیسا کیوں نہ ہو

ہوں وہ مجنوں داغ عریانی نہ ڈھانکا جائیگا
سایہ افگن لاش پر دامان صحرا کیوں نہ ہو

رنج ناقدری سے دل رک رک کے ہو جاتا ہے بند
موج زن طبع رواں مانند دریا کیوں نہ ہو

دشمن اہل وفا ہے عالم کون و فساد
بر سر پرخاش ساقی مجھ سے دنیا کیوں نہ ہو

نقش قدم

باب دوسرا

طوفان کا سانحہ

مجھے دروازے پر کچھ زیادہ ٹھہرنا نہیں پڑا۔ ایک نوجوان نے دروازہ کھولا جس کو میں نے فوراً پہچان لیا کہ یوجین ٹریونج صاحب کا بھتیجا ہے۔ میں نے سلام کیا۔

"کیا آپ پولیس کے صدر دفتر سے آئے ہیں"؟

"جی ہاں میرا نام آرچبالڈ کرافرڈ ہے"۔

"مسٹر کرافرڈ! آپ کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی اگرچہ معاملہ جو ہماری ملاقات کا باعث ہوا ہے نہایت دردانگیز ہے"۔

"آپ کے ہاں شب کو بڑا سانحہ گذر گیا"۔

"ہاں۔ میرے غریب چچا کو کسی بیدرد بدمعاش نے قتل کیا ہے"۔

"خودکشی کا تو کوئی گمان نہیں ہے"؟

"مطلق نہیں میری ناتجربہ کار آنکھیں بھی اسکو قبول نہ کرینگی"۔

"کوئی فکر کا مقام نہیں مسٹر ٹریوز! ہم سراغ رساں لوگ بہت گہرے رازوں کی تفتیش کرنے کے مشاق ہیں اگر انسانی قوت سے ممکن ہے تو اطمینان رکھئے کہ میں اصل حقیقت کو دریافت کرلوں گا اور بہت جلد قاتل کا پتہ لگا دوں گا۔ آپ بھی غالباً مجھ سے اسی بات کے خواہشمند ہوں گے بلالحاظ اس کے کہ میری تفتیش سے کس پر آنچ آئے گی"!

ہم دونوں دروازہ کے پاس کھڑے ہوئے تھے اور صبح کی ہلکی روشنی اُسکے

چہرہ پر پڑ رہی تھی اوس کی صورت سے کسی قدر پریشانی کے آثار ظاہر ہوتے تھے، جیسے کوئی شخص قلبی اضطراب میں مبتلا ہو۔

میرے سوال پر وہ کچھ جھجکا اور اوس کے چہرے پر سرخی نمود ہوئی مگر دفعتہً جاتی رہی اوس نے دروازے کی دستی کو دبایا اور دانت پیسے۔ میں نے بھی اس کی ان حرکات کو نظر انداز نہیں کیا۔ آخر بولا کہ:۔

"جی ہاں۔ میرا یہی مطلب ہے کہ پوری طرح سے دریافت ہو اور مجرم کو سزا ملے بلا لحاظ اس کے کہ اسکا اثر کس پر پڑے"۔

فوراً مجھے خیال آیا اور میں اپنے دل میں کہنے لگا" اہا مسٹر یوجین ٹریورز۔ دو میں سے ایک بات ضرور ہے۔ یا تو تم جانتے ہو کہ تمھارے چچا کا قاتل کون ہے یا یہ کہ تمکو سخت بدگمانی اور شبہ ہے۔ یہ میرے مفید مدعا ہوگا کہ یہاں سے جانے کے پہلے تمھارے دل کا حال دریافت کرلوں"۔

اس کے بعد میں نے بآواز بلند کہا" مہربانی فرماکر مجھے اوس کمرے میں لے چلیئے جہاں جج صاحب مقتول ہوئے ہیں"۔

"ضرور۔ آیئے۔ میرے ساتھ چلیئے" یہ کہکر باہر کا دروازہ بند کرلیا۔ تھا

اوس ہال میں فی الجملہ تاریکی تھی لیکن میں نوجوان مسٹر ٹریورز کو اپنے سامنے دیکھ رہا تھا اور انکے پیچھے چلا جا رہا وہ ایک کمرہ میں داخل ہوا جو مکان کی پہلی منزل میں تھا اور اپنی طبیعت پر کسی قدر زور دیکر کہا "میرے چچا اکثر وقت اسی کتابخانہ میں صرف کرتے تھے اور یہیں مارے گئے"۔

مجھے ایسے ہولناک منظروں کے دیکھنے کی عادت تھی کیونکہ اپنے پیشہ کے لحاظ سے اکثر مجھے ایسی چیزوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے لیکن میں اعتراف کرتا ہوں کہ اوس سفید ریش بوڑھے جج کو آرام کرسی پر اسطرح مردہ پڑے ہوئے دیکھنا ایک منظر ایسا تھا کہ میں کانپ اٹھا۔ میرے دل میں ...... کے سانحہ کا خیال گزرا جو چند

سال قبل واقع ہوا تھا جہاں چوروں نے ایک دولتمند بوڑھے آدمی کو اوس کے روپیہ کے لئے قتل کیا تھا اور مجھے یاد آیا کہ اوس واقعہ کی سچی حقیقت مطلق معلوم نہیں ہو سکی۔

"مسٹر ٹریورز۔ کیا آپ مجھے تھوڑی دیر کے لئے یہاں تنہا چھوڑ سکتے ہیں؟ میں تنہائی میں کام کرنے کو پسند کرتا ہوں"۔

"بیشک جناب۔ میں پاس کے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔ جو وقت آپکو میری ضرورت ہو آپ اس سامنے کے کمرہ کے دروازے کو کھٹکٹا دیجئے۔ میں آپ سے آملوں گا"۔

یہ کہکر وہ چلا گیا اور میں اوس کمرے میں مردے کے ساتھ تنہا رہ گیا اور اوسکو جھک کر دیکھنے لگا۔

مقتول جج طالبعلمانہ مذاق کا آدمی تھا اگرچہ وہ عدالت سے مستعفی ہو چکا تھا اور اگرچہ وہ اپنے فرض منصبی میں سخت گیر اور ارادے کا مستقل تھا مگر اوس کے بشرے سے پایا جاتا تھا کہ وہ اپنی خانگی معاشرت میں بڑا خوش مزاج ہوگا۔ اوس کے صرف ایک ہی زخم آیا تھا جس سے بیشک قلب کو صدمہ پہنچا ہوگا لیکن مجھے ایک بات سے تعجب ہوا۔

ایسی صورتوں میں بہت خون نکلنا چاہیئے تھا مگر ان کے سفید قمیص پر ایک ہی سُرخ دھبا دل کے مقام پر نظر آتا تھا جو ایک چھوٹی تشتری کے برابر ہوگا۔

اتنا تو میں سمجھا کہ خون اندر کی جانب رجوع ہوا ہوگا۔ لیکن مجھے آلہ جارحہ کی تلاش تھی۔ ایک پتلی سی چھری سے ضرور یہ نتیجہ حاصل ہو سکتا ہے۔ بہرحال نعش کو تھوڑی دیر کے لئے اپنی حالت پر چھوڑ کر میں نے کمرہ کی دوسری چیزوں کا معائنہ شروع کیا۔

دولتمندی نے اس بوڑھے طالب علم کو موقع دیا تھا کہ اپنے کتب خانہ میں قیمتی کتابوں کے خزانے اکٹھا کرے اور کتابیں بھی ایسی جو سونے میں تولنے کے لائق تھیں۔

بڈھا جج اس کمرہ میں اور اس نادر و بیش بہا ذخیرے کے بیچ میں جسکے جمع کرنے میں اُسکی عمر کے اخیر سالوں کا بہت بڑا حصہ صرف ہوا تھا مرا ہوا پڑا تھا۔

کیا یہ ممکن ہے کہ کوئی مجنوں رقیب جسکو کتابوں کے جمع کرنے کا خبط ہو کسی قیمتی کتاب کی لالچ میں اس فعل کا مرتکب ہوا ہو؟

اس خیال کو میں نے دور از کار سمجھ کر دل سے نکال دیا۔ کیونکہ کوئی بھی اتنی سی بات کے لئے ایسی سفاکی نہیں کر سکتا اور میں نے ان لوگوں کو جو کتاب کے خبط میں مبتلا ہوتے ہیں حد درجہ کا شریف جنٹلمین پایا ہے۔

بہر حال خوش قسمتی نے فوراً میری مدد کی مجھے کوئی چیز فرش پر پڑی ہوئی نظر آئی جو کتابخانہ کے میز کے نیچے تھی۔ بیشک یہ وہی حربہ تھا جس سے یہ ہولناک عمل واقع ہوا تھا اور قتل کے بعد یہیں پھینکدیا گیا تھا۔

جب میں نے اوسے اٹھاکر دیکھا تو وہ ایک عجیب شکل کی چھڑی تھی یعنے ایک ایسا حربہ جسے کسی سیاح نے شاید اپنے دور و دراز سفر میں خرید کر کے بطور یادگار کے رکھا ہو اوسکا پھل تپلا تھا جسکو میں تپلی چھری ہی کہنا مناسب خیال کرتا ہوں۔

جج کے جسم سے خون کے باہر نہ نکلنے کی وجہ یہی ہے کیونکہ ضرب لگاکر چھری کو کھینچ لینے کے ساتھ ہی زخم کا منہ بند ہو گیا ہوگا اور خون اندر ہی اندر بہا ہوگا اسی وجہ سے زیادہ خون باہر نہ نکل سکا۔

چھری کے پھل پر خون جمگیا تھا میں نے اوسکو اُسی حالت میں اپنے سفید رومال میں لپیٹ کر چھپالیا اور اوس وقت کے لئے رکھ چھوڑا کہ جب ضرورت ہو تو دفعتہً کسی کو دکھلاکر اوس کے چہرہ کی حالت کا مشاہدہ کروں کہ اوس پر کیا اثر ہوتا ہے۔

اس کے بعد میں نے کمرہ کی دوسری چیزوں کو دیکھنا شروع کیا تاکہ معلوم کرلوں

کہ آیا چور کی شہادتیں بھی دستیاب ہوسکتی ہیں یا نہیں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ میں اوس اپنے پہلے سراغ کو یہیں بھولا تھا۔ یعنے نقش قدم کو جو یہ بتا رہا تھا کہ کوئی شخص نہایت اضطراب کی حالت میں ٹریورز کے مکان سے عجلت کے ساتھ طوفان کے بعد نکل بھاگا تھا۔

یہ تو میرا فرض تھا کہ ایسی سب نشانیوں اور علامتوں کا پتہ چلا کر اصل سبب تک پہنچوں اور اوس کی حقیقت سے اطلاع حاصل کردں۔ شاید میرا طرز عمل ایسے کام کے لئے بالکل اوس دستور العمل کے مطابق نہ ہو جو دوسرے مفتشین نے تحقیقات کے لئے مقرر کیا ہے لیکن میں اپنے خبط میں الو کھا ہوں اور میرا عقیدہ ہے کہ کسی شخص کے جانچنے کے لئے کامیابی بڑا جزو ہے۔ پچھلے زمانہ میں میں نے چند ایسے کام کئے تھے جن میں مجھے ناموری حاصل ہوئی تھی اور میرے افسر اعلیٰ تیار تھے کہ ہمیشہ عجیب ترین بھیدوں اور پوشیدہ جرموں کی دریافت کے لئے مجھے موقعہ دیں۔

میں نے اوس کمرہ کی چیزوں کو نہایت بے ترتیبی کی حالت میں پایا۔ نہ اس وجہ کہ وہاں قاتل و مقتول میں کوئی باہمی کشمکش ہوی تھی۔ بلکہ اس وجہ سے کہ ایک میز جو اوس کمرہ کے ایک گوشہ میں تھی کھلی ہوئی تھی اور فرش پر کاغذات بکھرے ہوے تھے جیسا کہ کسی نے اوس میں سے کسی خاص کاغذ کی تلاش کی ہو۔ یہ کام کس کا ہوگا؟ کیا خود اوس بوڑھے جج کا کام تھا یا اوس شخص کا جس نے اوسے اس بیباکی سے قتل کیا؟۔

جج ٹریورز انتظام و احتیاط میں مشہور تھا اور یہ بالکل بعید از قیاس تھا کہ اوس نے میز کے خانوں میں سے کاغذات وغیرہ اس بے ترتیبی کے ساتھ نکال کر بکھیر دیے ہوں لیکن یہ بات غیر ممکن بھی نہ تھی۔

مجھے انگیٹھی میں کچھ راکھ نظر آئی جس کے اوپر کچھ نیم سوختہ کاغذات موجود تھے

بندوں پر بہت مہرباں ہے۔ لیکن اگر بالفرض معبود کا کوئی وجود نہیں ہے یا انسانی معاملات سے اسکو کوئی سروکار نہیں ہے تو ایسی خود غرض اور تاریک دنیا میں رہنے سے کیا فائدہ؟ مگر حق یہ ہے کہ واجب الوجود ہے، مخلوق سے اس کا گہرا تعلق ہے، اور انسان کو یہ اختیار بخشا گیا ہے کہ حقیقی مصائب سے خود کو بچائے۔ اگر بدی کا حقیقی وجود ہے تو یہ بالکل انسان کے اختیار میں دیدیا گیا ہے کہ اس کے پاس نہ پھٹکے جس نے انسانکو ابتر نہیں بنایا وہ انسانی زندگی کو کیوں بدتر بنائے گا؟ خالق نے آرام و تکالیف کے امتیاز کو نظر انداز نہیں کیا ہے، قدرت سے یہ عظیم غلطی سرزد نہیں ہوئی ہے اس دنیا میں بغیر کسی تفریق کے ہر شخص کو برائی بھلائی پیش آتی ہے لیکن بالتخصیص موت و زندگی ذلت و عزت اذیت و راحت یہ تمام چیزیں نیک و بد ہر شخص کے لئے یکساں مقدر ہیں، مگر یہ نیرنگیاں زندگی کو بہتر و بدتر بنانے کے لئے کوئی اثر نہیں رکھتیں نیکی و بدی کے لحاظ سے فی نفسہ یہ مدارج اختلاف ہیچ ہیں۔

(۱۲) کس قدر جلد چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ مادی دنیا میں اجسام کا سلسلہ ہر لحظہ معرض تغیر و فنا میں رہتا ہے۔ کچھ عرصہ میں صفحۂ حافظہ سے ان کی یاد مٹ جاتی ہے تمام ذی ہوش مخلوق کی ماہیت کیا ہے؟ بالخصوص ان کی جو ترغیب سے مائل کرتے یا ترہیب سے ڈراتے ہیں، اور اپنی نمایشی شہرت کے شور و غل سے زمین و آسمان کو سر پر اٹھا لیتے ہیں سب ذلیل حقیر تغیر پذیر اور فانی ہیں۔ عقل کے شایاں یہ ہے کہ غور سے مشاہدہ کرے، ہر چیز کی تہ پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ کن کی رائیں اور صدائیں شہرت اور بقائے دوام کا خلعت پاتی ہیں۔

(۱۳) موت کیا ہے؟ اگر انسان نظر غائر سے دیکھے اور قوت متخیلہ کی مدد سے تمام ذہنی نتائج کو پیش نظر رکھے تو وہ قانون قدرت کے عمل کے سوا اسکو کچھ نہ پائے گا اور اگر کوئی شخص قدرت کے عمل سے خوف زدہ ہو جاتا ہے تو وہ ایک بچہ

یعنے عقل سے بے بہرہ ہے۔ مگر یہ نہ صرف قدرت کا عمل ہے بلکہ ایک ایسا مرحلہ ہے جو قدرت کے مقاصد پورے ہونے کا پیش خیمہ ہے۔

(۱۴) خدا کا تقرب کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ یہ قوت کس طرح پیدا ہوتی اور اس کی اہلیت کیونکر حاصل کی جاسکتی ہے؟ یہ امور اہم ہیں مگر ہر ایک انسان کو ان پر غور کرنا ضرور ہے۔

(۱۵) اس شخص سے زیادہ کوئی بدقسمت نہیں جو ہر چیز کی ٹوہ میں رہتا ہے زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور ہمسایوں کے عیوب کے تجسس ہی میں اپنے قیاس کو مصروف رکھتا ہے مگر اس حقیقت کو فراموش کئے ہوئے ہے کہ اپنے ہی اندرون قلب کی اصلاح اور خلوص کے ساتھ اُس کا تزکیہ کافی ودافی ہے۔ تزکیہ نفس سے مراد یہ ہے کہ خود فراموشی اور جذبات کی غلامی سے وہ پاک وصاف ہو اور قدرتی و انسانی برتاؤ پر اسکو بے اطمینانی نہ ہو کیونکہ جو کچھ قدرت کی طرف سے ہے وہ اپنی خوبی کی وجہ سے شکرگزاری کا مستحق ہے۔ انسان کا ردیہ بوجہ ہم رشتہ ہونے کے باہم محبوب ہونا چاہیئے۔ بعض اوقات نیک و بد سے جہالت کے باعث بعض کا برتاؤ کسی حد تک ہمارے جذبۂ رحم کو متحرک کرتا ہے اس لئے کہ ان کا یہ نقص اس سے کچھ کم نہیں ہے جو ہیں سفید و سیاہ میں تمیز کرنے سے محروم رکھتا ہے اگر آنکھوں کا اندھا رحم کا مستحق ہے تو دل کا اندھا اس سے زیادہ مہربانی کا استحقاق رکھتا ہے۔

(۱۶) خواجہ تو ہزار سال جئے بلکہ دس ہزار سال تک زندہ رہے مگر یاد رکھ موجودہ زندگی کے بعد (اس دنیا میں) کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ زندگی خواہ کیسی ہی طویل کیوں نہ ہو بالآخر بحر فنا میں چھوٹے اور بڑے سب ملکر ایک ہو جاتے ہیں زمانہ حال سب کے لئے یکساں ہے اگرچہ ماضی یکساں نہیں ہے! اور جو کچھ گذر گیا وہ اب خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ انسان نہ ماضی کو کھو سکتا ہے نہ مستقبل کو ضایع

کرسکتا ہے. کیونکہ جو کچھ انسان کے پاس نہیں ہے دوسرا اس سے کیونکر چھین سکتا ہے یہ دو باتیں ذہن نشین کرلو کہ تمام چیزیں روز ازل سے یکساں شکل میں ہیں اور ایک دائرہ میں ظہور پذیر ہو رہی ہیں اسکا کچھ مضائقہ نہیں کہ ایک آدمی ان ہی چیزوں کو سو برس دو سو برس یا غیر محدود عرصہ تک دیکھے. دوسرے یہ کہ سب سے زیادہ عمر پانیوالا اور وہ جو سب سے زیادہ جلدی مرتا ہے، آخر کار دونوں کا انجام ایک ہی ہوتا ہے اگر یہ سچ ہے کہ صرف وہی جو زیر تصرف ہے اس کا مقبوضہ ہے اور جو کچھ انسان نہیں رکھتا اس سے وہ محروم بھی نہیں ہو سکتا تو فقط حال ہی ایسی چیز ہے جس سے انسان محروم کیا جا سکتا ہے۔ پس حال کی قدر کرو اور اسکو ضایع نہونے دو۔ جملہ اعمال کا ابتدائی سرچشمہ خیال ہے دنیا میں جو کچھ بھی نمود ہے وہ سب خیال کا ظہور ہے۔

(۱۸) انسان کی روح اوس کو آزار پہنچاتی ہے (۱) جبکہ وہ کائنات پر بار گراں ہوکر دوسروں کے آزار کا باعث ہوتی ہے۔ جو کچھ وقوع میں آتا ہے اس سے کبیدہ خاطر ہونا فطرت سے اپنے آپ کو جدا کرنا ہے۔ حالانکہ تمام دیگر غیر قدرتی اشیا بے تعلق نہیں ہوتیں (۲) جبکہ وہ اپنے کسی ہم جنس سے قطع تعلق کر لیتا ہے یا متوجہ بھی ہوتا ہے تو ضرر رسانی کی نیت سے جیسا کہ غضبناک اشخاص کا وطیرہ ہے (۳) جب کہ وہ لذت واذیت سے مغلوب ہو جائے (۴) جبکہ اس سے کوئی ایسا فعل ظہور میں آئے جو راستی و خلوص قلبی کے خلاف ہو (۵) جبکہ کوئی کام یا کوئی لمحہ ایسا ہو جس کا کوئی مقصد و مدعا نہ ہو اور بغیر انجام بینی کے بے پروائی سے گزارا جائے پس بہتر یہ ہے کہ حقیر سے حقیر کام بھی انجام سوچ کر سر انجام پائے ذی عقل مخلوق کے شایاں یہ ہے کہ وہ عقل کی مطیع ہو اور قانون اخلاق کو اپنا رہبر بنائے۔

(۱۹) انسانی زندگی میں وقت بہتا دریا ہے وہ ہر لحظہ تغیر و قیاس سے تصور مبہم ہے

اجسام کی تحلیل و ترکیب تغیر پذیر ہے، روح غیر محسوس ہے۔ مقسوم قدرت کا محکوم ہے
اور شہرت و معدلت سے محروم ہے۔ المختصر ہر شے جو جسم سے تعلق رکھتی ہے وہ چشمۂ رواں
اور جو روح سے متعلق ہے وہ نظر سے نہاں ہے۔ زندگی کشمکش کا میدان اور مسافر کی
گذرگاہ ہے۔ شہرت کے بعد تاریکی و گمنامی ہے اس حالت میں انسان کے لئے اصول
زندگی کیا ہونا چاہیئے؟ ایک اور صرف ایک چیز "فلسفہ" انسان کا رہنما ہو سکتا ہے مگر ایسا
فلسفہ نہیں جو رسمی اور نمایشی ہو۔ فلسفہ کا مدعا یہ ہے کہ نفس کی باگ انسان کے اختیار
میں ہو۔ تند مزاجی اور ضرر رسانی سے بری، لذت و اذیت کے احساس سے بالاتر ہو
کوئی فعل بغیر مقصد کے ظہور میں نہ آئے باطل پرستی اور ریاکاری کا شائبہ بھی نہ ہو۔
دوسروں کے کرنے یا نہ کرنے کی مطلق پرواہ نہ کی جائے۔ علاوہ ازیں جو کچھ واقع ہو
اور مقدر میں پیش آئے اسکو اپنے بنیادی منبع سے آیا ہوا تصور کر کے بخوشی قبول
کیا جائے اور بالآخر مطمئن قلب کے ساتھ موت کو خوش آمدید کے جذبہ میں لبیک
کہنے کے لئے مستعد و منتظر رہے موت عناصر کی تحلیل کے سوا اور کیا ہے؟ اور اس کا
عمل دخل ہر لحہ تمام کائنات میں جاری ہے اگر مسلسل تغیر و تبدل میں مختلف اجزا کو
کوئی نقصان نہیں تو تمام عناصر کی تحلیل و تبدیل سے کیوں خوف زدہ ہونا چاہیئے!
یہ قانون قدرت کے مطابق ہے اسمیں کچھ برائی نہیں ہے۔ فقط

یہ نری پست ہمتی اور ہمیعنی بطالت ہے اگر کوئی شخص محض اس خیال سے کچھ نہ کرے
کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا! یا جو کچھ وہ کرے گا اسکو دوسرے اس سے بہتر کریں گے! ہر انسان
کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔ ہر انسان ایک اچھی مثال قایم کر سکتا ہے! ایک کے لئے ہو یا ہزار کے لئے!
ہر شخص میں اسکی قابلیت ہے کہ وہ کم یا زیادہ نیکی اور سچائی کو آگے بڑھائے طغیان و کج رائی کی راہ میں روڑا اٹکائے
ہر شخص کو ایک نہ ایک ایسا شخص ملسکتا ہے جسکو وہ نصیحت کرے تعلیم دے اور پاکیزہ زندگی کا رستہ بتائے (اڈیٹر)

غزل

از جناب مولوی مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

فنا کے وقت اگر دل میں محبت دوست کی ہوگی
ہمارے سوگواروں کو عوض غم کے خوشی ہوگی

ہمیں یہ دیکھنا ہے اپنے حشر انگیز نالوں سے
مزاج دوست میں پیدا کہاں تک برہمی ہوگی

مرقع غم کا یعنے دل کی میت آؤ دکھلا دیں
مگر پہلے یہ بتلا دو تمہیں کتنی خوشی ہوگی؟

یہ امید اُن سے رکھیے لذت غم جو نہ سمجھے ہوں
بھلا میری زباں سے اور شکایت آپکی ہوگی؟

ذرا جذبات حسن و عشق کو اور آگے بڑھنے دو
تمہیں ہنسنے سے رونے سے ہمیں وابستگی ہوگی

اگر زندہ رہا دل اہل باطن دیکھ ہی لیں گے
غم فرقت میں اک اک سانس شرح دوستی ہوگی

فسانہ طور کا اہل نظر کو یہ بتاتا ہے
نہ جانا جلوہ گاہ ناز میں اور نہ ہنسی ہوگی

وفا اس عہد میں اک لفظ بےمعنی ہے اے محشر
ہمارا تجربہ اتنا بتاتا ہے کبھی ہوگی

غزل

از جناب مولوی غلام مصطفیٰ صاحب ذہین

غم کہیں کس سے زمانہ میں ہے غمخوار کہاں
در یکتا ہیں مگر کوئی خریدار کہاں

ایک ہنگامہ ہے میخانۂ دنیا کیا ہے
جس کو دیکھو وہ یہاں مست ہے ہشیار کہاں

جلوہ آرا نہیں کس جا سے تجلی تیری
کوئی موسی کی طرح طالب دیدار کہاں

بس ہے ہو جائے اگر رحمت و بخشش کی نظر
ہم گنہگار ہیں نعمت کے سزاوار کہاں

کیا کریں گر نہ کریں درد و الم ضبط ذہین
غم کہیں کس سے زمانہ میں ہے غمخوار کہاں

استاد کا خط شاگرد کے نام

مترجمہ جناب مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی صدر محاسب سرکار آصفیہ

اپنی کتاب حدیقہ عثمانی کے لئے حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے مشاہیر وقت کے حالات کی تلاش میں ہمیں اپنے بزرگ محترم جناب مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی کی الماریاں کھولنے اور بستے ٹٹولنے کا اتفاق ہوا۔ اسی ضمن میں ایک تحریر دکھائی دی جو مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے مشہور اور ہر دل عزیز پرنسپل مسٹر تھیوڈر بک نے سید صاحب موصوف کے نام ۱۶ اپریل ۱۸۸۹ء کو علیگڈھ سے بھیجی تھی۔ مسٹر بک اپنے شاگردوں کو بجائے اولاد سمجھتے تھے اور اون کے زمانہ کے طلبہ بھی بزرگوں کی طرح اپنے شفیق استاد کا ادب ملحوظ رکھتے تھے۔ خط کے لفظ لفظ سے شفقت و محبت کی بوے خوش آتی ہے' اور اسکا فقرہ فقرہ اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ شفیق معلم کی نگاہ میں سعید شاگرد کا مرتبہ کیا تھا۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ ہمارے طلبہ کے لئے یورپ کا سفر معمولی سی بات ہے' ربع صدی گذرنے پر بھی یہ خط اون کے لئے چراغ ہدایت کا کام دے سکتا ہے سید صاحب نے مہربانی سے ہمارے لئے خط کا ترجمہ فرمادیا ہے' اور ہم شکریہ کے ساتھ بجنسہ اسکو ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اشہر

مائی ڈیر محمد حسن! ۔ آج آپ کا خط پاکر مجھے بہت خوشی ہوئی' اور یہ سنکر کہ آپ بغرض تعلیم علم فلاحت انگلستان جارہے ہیں کمال مسرت حاصل ہوئی۔ آپ میرے والد اور والدہ سے ضرور ملئے گا۔ اُن کا پتہ ذیل میں درج ہے اور اُنہیں یہ خط دیجئے گا جو میں اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ وہ آپ سے ملکر بہت خوش ہوں گے مجھے آپ بہت یاد آتے ہیں اور اکثر آپ کا خیال کرتا رہتا ہوں بالخصوص اسوجہہ سے کہ یہاں کالج میں ایک

طالب علم بالکل آپ کے سے ہیں، یعنے نام بھی نام اون کا سید محمد حسین ہے اور صورت بھی آپ سے بہت مشابہ ہے انہیں دیکھ کر آپ بہت یاد آتے ہیں۔ مجھے بہت توقعات ہیں کہ آپ انگلستان میں کامیاب رہیں گے، کیونکہ آپ کا سن پختہ ہے، اور آپ محنت کے عادی ہیں (یہ اور بات ہے کہ حیدرآباد جانے سے آپ کے عادات بدل گئے ہوں) اور آپ کی عمر اتنی ہوگئی ہے کہ آپ نیک و بد کو اچھی طرح سمجھ سکیں، اور اپنے خصائل کو مضبوط رکھ سکیں۔ تاہم بحیثیت استاد میں آپ کو چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں مہربانی سے صبر کے ساتھ انہیں سُنیئے اور ایک جوان صالح کی طرح گرہ میں باندھیے۔

پہلی نصیحت تو یہ ہے کہ آپ انگلستان میں اپنے ہم مذہب نوجوانوں کے اخلاق اور طرز معاشرت کی ہرگز ہرگز تقلید نہ کریں۔ اگر آپ کسی نیک نفس اور راست باز شخص سے تعارف پیدا کرنا چاہیں تو آپ کوشش کر کے مرزا کاظم حسین سے ملیں، اور اُن سے ملاقات پیدا کریں۔ میں نے ایسا راست باز شخص بہت کم دیکھا ہے، اور وہ میرے دوست ہیں۔ اب رہے دوسرے حضرات اُن کا میں کیا ذکر کروں۔ بہتیرے اُن میں سے تو ایسے ہیں کہ اس سے دوچند روپیہ صرف کرتے ہیں جتنا کہ کبھی میں نے صرف کیا تھا۔ آپ یہ مت سمجھئے کہ زیادہ روپیہ صرف کرنے سے آپ انگلستان میں ایک بھلے آدمی تسلیم کئے جائیں گے ایسا نہیں ہے۔ آپ کو چاہئے کہ بہت کفایت شعاری کے ساتھ زمانہ تعلیم بسر کریں۔ بجائے کیب کے آہنی بس میں سوار ہوں اگر ریل میں سفر کرنے کی ضرورت ہو تو تھرڈ کلاس میں سفر کریں۔ باوجود ان تمام کفایت شعاریوں کے آپ کو محسوس ہوگا کہ وہاں کسقدر گرانی ہے آپ ضرورت سے زیادہ اپنے لباس پر روپیہ صرف نہ کریں۔ گو میں یہ نصیحت تو کر رہا ہوں مگر گمان غالب یہ ہے کہ جب آپ وہاں پہنچیں گے اور کافی روپیہ آپ کی جیب میں ہوگا۔ آپ یہ خیال کر کے کہ روپیہ بہت دنوں کے لئے کافی ہوگا فراخ دلی کیساتھ صرف

کرنا شروع کریں گے، یہاں تک کہ آپ کو اپنی غلطی ایک دن خود محسوس ہو گی۔
میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ آپ وہاں خوب محنت کریں، کیونکہ اگر آپ وہاں محنت نہ کریں گے تو آپکا نہ صرف وقت ضایع ہو گا، بلکہ آپ بڑے خسارہ میں رہیں گے، اس لئے کہ آپ کا طرز معاشرت مسرفانہ ہوجائے گا، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ آخر عمر میں آپ تکلیف اٹھائیں گے۔
میری تیسری نصیحت یہ ہے کہ آپ کبھی شراب کے پاس نہ جائیں اور ہمیشہ یاد رکھیں کہ قرآن (شریف) نے اسکو قطعاً ممنوع قرار دیا ہے۔ نوجوانان ہند جب شراب پینا شروع کرتے ہیں تو اکثر فنا فی الخمر ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک قہر عظیم ہے آپ کو چاہئے کہ ہمیشہ پرہیزگار رہیں۔ یہ یاد رکھیئے کہ محض مشاہدہٴ ترقی تمدن اور مادی دولت و ثروت یا اسباب معیشت کے دیکھنے سے آپ خواہ مخواہ انگلستان کی ہر ایک شے کی خواہ وہ اچھی ہو یا بری پرستش نہ کرنے لگیں مسٹر ابلی ایک دفعہ مجھہ سے ذکر کرتے تھے کہ انہوں نے اس امر کو بغور معائنہ کیا ہے کہ نوجوان مسلمان طلبہ جو انگلستان آئے انہیں یہاں آنے سے کوئی فائدہ نہوا؛ کیونکہ ہماری تہذیب و تمدن کی تصویر کے مادی پہلو نے انہیں مبہوت کر دیا، اور تمول و سامان معیشت کی نمایش سے اُن کے خیالات برگشتہ اور اُن کے اخلاق خراب ہوگئے۔ آپ یقین مانیئے کہ مجھے اپنے وطن سے نہایت انس ہے۔ اگر میرے ملک میں بجز تمول اور ظاہری تہذیب کے کوئی اور بات قابل فخر نہ ہوتی تو میں ضرور کہتا کہ یہ ملک ہرگز کسی تعریف کا مستحق نہیں ہے اور غالباً اس کا وہی حشر ہو گا جو امپیریل روم کا ہوا۔ مگر نہیں، ہرگز ایسا نہیں ہے!۔ انگلستان میں ایک خاص شریف النفس طبقہ شرفا کا ہے، جو ظاہری نمایش کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ انگلستان سے واقف ہوں اور وہاں سے مستفید ہو کر واپس آئیں تو آپ اس طبقہ کے لوگوں سے شناسائی پیدا کیجیے۔ آپ کو چاہیئے

بندوں پر بہت مہربان ہے لیکن اگر بالفرض معبود کا کوئی وجود نہیں ہے یا انسانی معاملات سے اسکو کوئی سروکار نہیں ہے تو ایسی خود غرض اور تاریک دنیا میں رہنے سے کیا فائدہ؟ مگر حق یہ ہے کہ واجب الوجود ہے، مخلوق سے اس کا گہرا تعلق ہے، اور انسان کو یہ اختیار بخشا گیا ہے کہ حقیقی مصائب سے خود کو بچائے۔ اگر بدی کا حقیقی وجود ہے تو یہ بالکل انسان کے اختیار میں دیدیا گیا ہے کہ اس کے پاس نہ پھٹکے جس نے انسانکو ابتر نہیں بنایا وہ انسانی زندگی کو کیوں بدتر بنائے گا؟ خالق نے آرام و تکالیف کے امتیاز کو نظر انداز نہیں کیا ہے قدرت سے یہ عظیم غلطی سرزد نہیں ہوئی ہے اس دنیا میں بغیر کسی تفریق کے ہر شخص کو برائی بھلائی پیش آتی ہے لیکن بالتخصیص موت و زندگی ذلت و عزت اذیت و راحت یہ تمام چیزیں نیک و بد ہر شخص کے لئے یکساں مقدر ہیں، مگر یہ نیرنگیاں زندگی کو بہتر و بدتر بنانے کے لئے کوئی اثر نہیں رکھتیں نیکی و بدی کے لحاظ سے فی نفسہ یہ مدارج اختلاف ہیچ ہیں۔

(۱۲) کس قدر جلد چیزیں غائب ہو جاتی ہیں۔ مادی دنیا میں اجسام کا سلسلہ ہر لحظہ معرض تغیر و فنا میں رہتا ہے۔ کچھ عرصہ میں صفحۂ حافظہ سے ان کی یاد مٹ جاتی ہے تمام ذی ہوش مخلوق کی ماہیت کیا ہے؟ بالخصوص ان کی جو ترغیب سے مائل کرتے یا ترہیب سے ڈراتے ہیں، اور اپنی نمایشی شہرت کے شور و غل سے زمین و آسمان کو سر پر اٹھا لیتے ہیں سب ذلیل حقیر تغیر پذیر اور فانی ہیں عقل کے شایاں یہ ہے کہ غور سے مشاہدہ کرے، ہر چیز کی تہ پر نظر ڈالے اور دیکھے کہ کن کی رائیں اور صدائیں شہرت اور بقائے دوام کا خلعت پاتی ہیں۔

(۱۳) موت کیا ہے؟ اگر انسان نظر غائر سے دیکھے اور قوت متخیلہ کی مدد سے تمام ذہنی نتائج کو پیش نظر رکھے تو وہ قانون قدرت کے عمل کے سوا اسکو کچھ نہ پائے گا۔ اور اگر کوئی شخص قدرت کے عمل سے خوف زدہ ہو جاتا ہے تو وہ ایک بچہ

یعنے عقل سے بے بہرہ ہے۔ مگر یہ نہ صرف قدرت کا عمل ہے بلکہ ایک ایسا مرحلہ ہے جو قدرت کے مقاصد پورے ہونے کا پیش خیمہ ہے۔

(۱۴) خدا کا تقرب کیونکر حاصل ہوتا ہے؟ یہ قوت کس طرح پیدا ہوتی اور اس کی اہلیت کیونکر حاصل کی جاسکتی ہے؟ یہ امور اہم ہیں مگر ہر ایک انسان کو ان پر غور کرنا ضرور ہے۔

(۱۵) اس شخص سے زیادہ کوئی بدقسمت نہیں جو ہر چیز کی ٹوہ میں رہتا ہے زمین و آسمان کے قلابے ملاتا ہے اور ہمسایوں کے عیوب کے تجسس ہی میں اپنے قیاس کو مصروف رکھتا ہے مگر اس حقیقت کو فراموش کئے ہوئے ہے کہ اپنے ہی اندرون قلب کی اصلاح اور خلوص کے ساتھ اُس کا تزکیہ کافی روانی ہے۔ تزکیہ نفس سے مراد یہ ہے کہ خود فراموشی اور جذبات کی غلامی سے وہ پاک و صاف ہو اور قدرتی و انسانی برتاؤ پر اسکو بے اطمینانی نہ ہو کیونکہ جو کچھ قدرت کی طرف سے ہے وہ اپنی خوبی کی وجہ سے شکرگزاری کا مستحق ہے۔ انسان کا ردیہ بوجہ ہم رشتہ ہونے کے باہم محبوب ہونا چاہیے۔ بعض اوقات نیک و بد سے جہالت کے باعث بعض کا برتاؤ کسی حد تک ہمارے جذبۂ رحم کو متحرک کرتا ہے اس لئے کہ ان کا یہ نقص اس سے کچھ کم نہیں ہے جو ہمیں سفید و سیاہ میں تمیز کرنے سے محروم رکھتا ہے اگر آنکھوں کا اندھا رحم کا مستحق ہے تو دل کا اندھا اس سے زیادہ مہربانی کا استحقاق رکھتا ہے۔

(۱۶) خواجہ تو ہزار سال جئے بلکہ دس ہزار سال تک زندہ رہے مگر یاد رکھو موجودہ زندگی کے بعد (اس دنیا میں) کوئی دوسری زندگی نہیں ہے۔ زندگی خواہ کیسی ہی طویل کیوں نہ ہو بالآخر بحر فنا میں چھوٹے اور بڑے سب ملکر ایک ہو جاتے ہیں۔ زمانہ حال سب کے لئے یکساں ہے اگرچہ ماضی یکساں نہیں ہے؟ اور جو کچھ گذر گیا وہ اب خواب و خیال سے زیادہ وقعت نہیں رکھتا۔ انسان نہ ماضی کو کھو سکتا ہے نہ مستقبل کو ضایع

کر سکتا ہے۔ کیونکہ جو کچھ انسان کے پاس نہیں ہے دوسرا اس سے کیونکر چھین سکتا ہے
یہ دو باتیں ذہن نشین کر لو کہ تمام چیزیں روز ازل سے یکساں شکل میں ہیں اور ایک
دائرہ میں ظہور پذیر ہو رہی ہیں اسکا کچھ مضائقہ نہیں کہ ایک آدمی ان ہی چیزوں کو
سو برس دو سو برس یا غیر محدود عرصہ تک دیکھے۔ دوسرے یہ کہ سب سے زیادہ عمر پانیوالا
اور وہ جو سب سے زیادہ جلدی مرتا ہے، آخرکار دونوں کا انجام ایک ہی ہوتا ہے
اگر یہ سچ ہے کہ صرف وہی جو زیر تصرف ہے اس کا مقبوضہ ہے اور جو کچھ انسان
نہیں رکھتا اس سے وہ محروم بھی نہیں ہو سکتا تو فقط حال ہی ایسی چیز ہے جس سے
انسان محروم کیا جا سکتا ہے۔ پس حال کی قدر کرو اور اسکو ضایع ہونے دو۔ جملہ
اعمال کا ابتدائی سرچشمہ خیال ہے دنیا میں جو کچھ بھی نمود ہے وہ سب خیال کا
ظہور ہے۔

(۱۸) انسان کی روح اوس کو آزار پہنچاتی ہے (۱) جبکہ وہ کائنات پر بار گراں
ہو کر دوسروں کے آزار کا باعث ہوتی ہے۔ جو کچھ وقوع میں آتا ہے اس سے کبیدہ
خاطر ہونا فطرت سے اپنے آپ کو جدا کرنا ہے۔ حالانکہ تمام دیگر غیر قدرتی اشیا بے تعلق
نہیں ہوتیں (۲) جبکہ وہ اپنے کسی ہم جنس سے قطع تعلق کر لیتا ہے یا متوجہ بھی ہوتا ہے
تو ضرر رسانی کی نیت سے جیسا کہ غضبناک اشخاص کا وطیرہ ہے (۳) جب کہ وہ لذت
واذیت سے مغلوب ہو جائے (۴) جبکہ اس سے کوئی ایسا فعل ظہور میں آئے جو راستی
وخلوص قلبی کے خلاف ہو (۵) جبکہ کوئی کام یا کوئی لمحہ ایسا ہو جس کا کوئی مقصد ومدعا
نہ ہو اور بغیر انجام بینی کے بے پروائی سے گزارا جائے پس بہتر یہ ہے کہ حقیر سے حقیر
کام بھی انجام سوچ کر سرانجام پائے ذی عقل مخلوق کے شایاں یہ ہے کہ وہ عقل کی
مطیع ہو اور قانون اخلاق کو اپنا رہبر بنائے۔

(۱۹) انسانی زندگی میں وقت بہتا دریا ہے وہ ہر لحظہ تغیر وفنا میں سے تصور مبہم ہے

اجسام کی تحلیل و ترکیب تغیر پذیر ہے روح غیر محسوس ہے ، مقسوم قدرت کا محکوم ہے اور شہرت و معدلت سے محروم ہے ۔ المختصر ہر شے جو جسم سے تعلق رکھتی ہے وہ چشمۂ رواں اور جو روح سے متعلق ہے وہ نظر سے نہاں ہے ، زندگی کشمکش کا میدان اور مسافر کی گذرگاہ ہے ۔ شہرت کے بعد تاریکی و گمنامی ہے اس حالت میں انسان کے لئے اصول زندگی کیا ہونا چاہیئے ؟ ایک اور صرف ایک چیز فلسفہ' انسان کا رہنما ہو سکتا ہے مگر ایسا فلسفہ نہیں جو رسمی اور نمایشی ہو ۔ فلسفہ کا مدعا یہ ہے کہ نفس کی باگ انسان کے اختیار میں ہو ۔ تند مزاجی اور ضرر رسانی سے بری ، لذت و اذیت کے احساس سے بالاتر ہو کوئی فعل بغیر مقصد کے ظہور میں نہ آئے باطل پرستی اور ریاکاری کا شائبہ بھی نہ ہو ۔ دوسروں کے کرنے یا نہ کرنے کی مطلق پروا نہ کی جائے ۔ علاوہ ازیں جو کچھ واقع ہو اور مقدر میں پیش آئے اسکو اپنے بنیادی منبع سے آیا ہوا تصور کر کے بخوشی قبول کیا جائے اور بالآخر مطمئن قلب کے ساتھ موت کو خوش آمدید کے جذبہ میں لبیک کہنے کے لئے مستعد و منتظر رہے ، موت عناصر کی تحلیل کے سوا اور کیا ہے ؟ اور اس کا عمل دخل ہر لحظہ تمام کائنات میں جاری ہے اگر مسلسل تغیر و تبدل میں مختلف اجزا کو کوئی نقصان نہیں تو تمام عناصر کی تحلیل و تبدیل سے کیوں خوف زدہ ہونا چاہیئے ! یہ قانون قدرت کے مطابق ہے اسمیں کچھ برائی نہیں ہے ۔ فقط

یہ نری پست ہمتی اور ہیمنی بطالت ہے اگر کوئی شخص محض اس خیال سے کچھ نہ کرے کہ وہ کچھ نہیں کر سکتا ! یا جو کچھ وہ کرے گا اسکو دوسرے اس سے بہتر کریں گے ! ہر انسان کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے ۔ ہر انسان ایک اچھی مثال قایم کر سکتا ہے ! ایک کے لئے ہو یا ہزار کے لئے ! ہر شخص میں اسکی قابلیت ہر کہ وہ کم یا زیادہ نیکی اور سچائی کو آگے بڑھائے طغیان و کج رائی کی راہ میں روڑا اٹکائے ہر شخص کو ایک نہ ایک ایسا شخص ملسکتا ہے جسکو وہ نصیحت کرے " تعلیم دے " اور پاکیزہ زندگی کا رستہ بتائے (اڈیٹر)

غزل

از جناب مولوی مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی

فنا کے وقت اگر دل میں محبت دوست کی ہوگی
ہمارے سوگواروں کو عوض غم کے خوشی ہوگی

ہمیں یہ دیکھنا ہے اپنے حشر انگیز نالوں نے
مزاج دوست میں پیدا کہاں تک برہمی ہوگی

مرقع غم کا یعنے دل کی میت آؤ دکھلا دیں
مگر پہلے یہ بتلا دو تمہیں کتنی خوشی ہوگی؟

یہ امید اُن سے رکھیئے لذت غم جو نہ سمجھے ہوں
بھلا میری زباں سے اور شکایت آپکی ہوگی؟

ذرا جذبات حسن و عشق کو اور آگے بڑھنے دو
تمہیں ہنسنے سے رونے سے ہمیں دلبستگی ہوگی

اگر زندہ رہا دل آہل باطن دیکھ ہی لیں گے
غم فرقت میں اک اک سانس شرح دوستی ہوگی

فسانہ طور کا اہل نظر کو یہ بتاتا ہے
نہ جانا جلوہ گاہ ناز میں اور نہ ہنسی ہوگی

وفا اس عہد میں اک لفظ بےمعنی ہے اے محشر
ہمارا تجربہ اتنا بتاتا ہے کبھی ہوگی

غزل

از جناب مولوی غلام مصطفیٰ صاحب ذہین

غم کہیں کس سے زمانہ میں ہی غمخوار کہاں
در یکتا ہیں مگر کوئی خریدار کہاں

ایک ہنگامہ ہے میخانۂ دنیا کیا ہے
جس کو دیکھو وہ یہاں مست ہی ہشیار کہاں

جلوہ آرا نہیں کس جا سے تجلی تیری
کوئی موسیٰ کی طرح طالب دیدار کہاں

بس ہے ہو جائے اگر رحمت و بخشش کی نظر
ہم گنہگار ہیں نعمت کے سزاوار کہاں

کیا کریں گر نہ کریں درد و الم ضبط ذہین
غم کہیں کس سے زمانہ میں ہی غمخوار کہاں

استاد کا خط شاگرد کے نام

مترجمہ جناب مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی صدر محاسب سرکار آصفیہ

اپنی کتاب حدیقۂ عثمانی کے لئے حیدر آباد فرخندہ بنیاد کے مشاہیر وقت کے حالات کی تلاش میں ہمیں اپنے بزرگ محترم جناب مولوی سید محمد حسن صاحب بلگرامی کی الماریاں کھولنے اور بستے ٹٹولنے کا اتفاق ہوا۔ اسی ضمن میں ایک تحریر دکھائی دی جو مدرسۃ العلوم علیگڈھ کے مشہور اور ہر دل عزیز پرنسپل مسٹر تھیوڈور بک نے سید صاحب موصوف کے نام ۱۶ اپریل ۱۸۸۹ء کو علیگڈھ سے بھیجی تھی۔ مسٹر بک اپنے شاگردوں کو بجائے اولاد سمجھتے تھے اور اون کے زمانہ کے طلبہ بھی بزرگوں کی طرح اپنے شفیق استاد کا ادب ملحوظ رکھتے تھے خط کے لفظ لفظ سے شفقت و محبت کی بوئے خوش آتی ہے، اور اسکا فقرہ فقرہ اس امر کا پتہ دیتا ہے کہ شفیق معلم کی نگاہ میں سعید شاگرد کا مرتبہ کیا تھا۔ ایک ایسے زمانہ میں جبکہ ہمارے طلبہ کے لئے یورپ کا سفر معمولی سی بات ہے ربع صدی گذرنے پر بھی یہ خط اون کے لئے چراغ ہدایت کا کام دے سکتا ہے سید صاحب نے مہربانی سے ہمارے لئے خط کا ترجمہ فرمادیا ہے، اور ہم شکریہ کے ساتھ بجنسہ اسکو ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔ اشہر

مائی ڈیر محمد حسن!۔ آج آپ کا خط پاکر مجھے بہت خوشی ہوئی، اور یہ سنکر کہ آپ بغرض تعلیم علم فلاحت انگلستان جارہے ہیں کمال مسرت حاصل ہوئی۔ آپ میرے والد اور والدہ سے ضرور ملئے گا۔ اُن کا پتہ ذیل میں درج ہے اور اُنہیں یہ خط دیجئے گا جو میں اس کے ساتھ بھیج رہا ہوں۔ وہ آپ سے ملکر بہت خوش ہوں گے مجھے آپ بہت یاد آتے ہیں اور اکثر آپ کا خیال کرتا رہتا ہوں بالخصوص اسوجہہ سے کہ یہاں کالج میں ایک

طالب علم بالکل آپ کے سے ہیں یعنے نام بھی نام اون کا سید محمد حسین ہے اور صورت بھی آپ سے بہت مشابہ ہے انہیں دیکھ کر آپ بہت یاد آتے ہیں۔ مجھے بہت توقعات ہیں کہ آپ انگلستان میں کامیاب رہیں گے، کیونکہ آپ کا سن پختہ ہے، اور آپ محنت کے عادی ہیں (یہ اور بات ہے کہ حیدرآباد جانے سے آپ کے عادات بدل گئے ہوں) اور آپ کی عمر اتنی ہو گئی ہے کہ آپ نیک و بد کو اچھی طرح سمجھ سکیں، اور اپنے خصائل کو مضبوط رکھ سکیں۔ تاہم بحیثیت استاد میں آپ کو چند نصیحتیں کرنا چاہتا ہوں مہربانی سے صبر کے ساتھ انہیں سُنیئے اور ایک جوان صالح کی طرح گرہ میں باندھیئے۔

پہلی نصیحت تو یہ ہے کہ آپ انگلستان میں اپنے ہم مذہب نوجوانوں کے اخلاق اور طرز معاشرت کی ہرگز ہرگز تقلید نہ کریں۔ اگر آپ کسی نیک نفس اور راست باز شخص سے تعارف پیدا کرنا چاہیں تو آپ کوشش کر کے مرزا کاظم حسین سے ملیں، اور اُن سے ملاقات پیدا کریں۔ میں نے ایسا راست باز شخص بہت کم دیکھا ہے، اور وہ میرے دوست ہیں۔ اب رہے دوسرے حضرات اُن کا میں کیا ذکر کروں۔ بہتیرے اُن میں سے تو ایسے ہیں کہ اس سے دو چند روپیہ صرف کرتے ہیں جتنا کہ کبھی میں نے صرف کیا تھا۔ آپ یہ مت سمجھئے کہ زیادہ روپیہ صرف کرنے سے آپ انگلستان میں ایک بھلے آدمی تسلیم کئے جائیں گے ایسا نہیں ہے۔ آپ کو چاہیئے کہ بہت کفایت شعاری کے ساتھ زمانہ تعلیم بسر کریں۔ بجائے کیب کے آمنی بس میں سوار ہوں اگر ریل میں سفر کرنے کی ضرورت ہو تو تھرڈ کلاس میں سفر کریں۔ باوجود ان تمام کفایت شعاریوں کے آپ کو محسوس ہو گا کہ وہاں کسقدر گرانی ہے آپ ضرورت سے زیادہ اپنے لباس پر روپیہ صرف نہ کریں۔ گو میں یہ نصیحت تو کر رہا ہوں مگر گمان غالب یہ ہے کہ جب آپ وہاں پہنچیں گے اور کافی روپیہ آپ کی جیب میں ہو گا۔ آپ یہ خیال کر کے کہ روپیہ بہت دنوں کے لئے کافی ہو گا فراخ دلی کیساتھ صرف

کرنا شروع کریں گے؛ یہاں تک کہ آپ کو اپنی غلطی ایک دن خود محسوس ہو گی۔

میری دوسری نصیحت یہ ہے کہ آپ وہاں خوب محنت کریں؛ کیونکہ اگر آپ وہاں محنت نہ کریں گے تو آپکا نہ صرف وقت ضایع ہو گا، بلکہ آپ بڑے خسارہ میں رہیں گے، اس لئے کہ آپ کا طرز معاشرت مسرفانہ ہو جائے گا، جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ آخر عمر میں آپ تکلیف اٹھائیں گے۔

میری تیسری نصیحت یہ ہے کہ آپ کبھی شراب کے پاس نہ جائیں اور ہمیشہ یاد رکھیں کہ قرآن شریف نے اسکو قطعاً ممنوع قرار دیا ہے۔ نوجوانان ہند جب شراب پینا شروع کرتے ہیں تو اکثر فنا فی الخمر ہو جاتے ہیں۔ یہ ایک قہر عظیم ہے آپ کو چاہیئے کہ ہمیشہ پرہیزگار رہیں۔ یہ یاد رکھیئے کہ محض مشاہدۂ ترقی تمدن اور مادی دولت و ثروت یا اسباب معیشت کے دیکھنے سے آپ خواہ مخواہ انگلستان کی ہر ایک شے کی خواہ وہ اچھی ہو یا بری پرستش نہ کرنے لگیں مسٹر ابلی ایک دفعہ مجھ سے ذکر کرتے تھے کہ انہوں نے اس امر کو بغور معائنہ کیا ہے کہ نوجوان مسلمان طلبہ جو انگلستان آئے انہیں یہاں آنے سے کوئی فائدہ نہوا؛ کیونکہ ہماری تہذیب و تمدن کی تصویر کے مادی پہلو نے انہیں مبہوت کر دیا، اور تمول و سامان معیشت کی نمایش سے اُن کے خیالات برگشتہ اور اُن کے اخلاق خراب ہو گئے۔ آپ یقین مانیئے کہ مجھے اپنے وطن سے نہایت انس ہے۔ اگر میرے ملک میں بجز تمول اور ظاہری تہذیب کے کوئی اور بات قابل فخر نہ ہوتی تو میں ضرور کہتا کہ یہ ملک ہرگز کسی تعریف کا مستحق نہیں ہے اور غالباً اس کا وہی حشر ہو گا جو امپیریل روم کا ہوا۔ مگر نہیں، ہرگز ایسا نہیں ہے!۔ انگلستان میں ایک خاص شریف النفس طبقہ شرفا کا ہے، جو ظاہری نمایش کے پردے میں چھپا ہوا ہے۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ انگلستان سے واقف ہوں اور وہاں سے مستفید ہو کر واپس آئیں تو آپ اس طبقہ کے لوگوں سے شناسائی پیدا کیجیے۔ آپ کو چاہیئے

کہ انگلستان کے نیک نفس راستباز مردوں اور عورتوں سے ملئے، جن سے گویا انگلستان کی حقیقی عظمت مفہوم ہے۔ اگر آپ معمولی عیش پسند یار باش لوگوں سے ملتے جلتے رہے تو آپ کوئی اخلاقی نفع نہ اٹھائیں گے۔ انگلستان کی تصویر علاوہ خوشنما پہلو کے بدنما پہلو بھی رکھتی ہے۔ جو فلاکت اور جہالت لندن کے مشرقی گوشہ کے غربا میں پائی جاتی ہے وہ غالباً کہیں نہ ہوگی۔ میں نے ہندوستان میں تو اس کا نظارہ نہیں کیا۔ اب رہی شان وشوکت اور انگلستان کے تمدن و تہذیب کی ظاہری نمایش، آپ یاد رکھئے کہ آپ کے پیغمبر صلعم اور اون کے اصحاب کبار ایسے معمولی جھونپڑوں میں رہتے تھے جن کو ہم اپنے نوکروں کے رہنے کے قابل بھی نہ سمجھیں گے، مگر کیا حقیقی عظمت و جلال تھا کہ جب باہر نکلے تو سارے عالم کو منور کر دیا۔ اصلی عظمت و بزرگی دل سے تعلق رکھتی ہے۔ اوسے ظاہری نمایش کی ضرورت نہیں۔ میری رائے میں یورپ کی نمایشی تہذیب حد سے تجاوز کر چکی ہے۔ تاہم میں یہ ضرور کہوں گا کہ ابھی اوسیں حقیقت کا لگاؤ باقی ہے۔ پس آپکو چاہیئے کہ اوس حقیقت کا پتہ لگائیں، تاکہ آپ اوس سے کافی طور پر فائدہ اٹھاسکیں ہمیشہ یہ یاد رکھئے کہ آپ کو آخر کار یہیں ہندوستان میں اپنے بھائی ہندوں کیساتھ بسر کرنا ہوگا۔ اگر آپ آن کے ساتھ رہنے کے قابل نہ بن سکے تو آپکا انگلستان جانا ایک فعل عبث ہوگا۔

اپنے استاد کی دعائیں لیجئے، اور یقین جانیئے کہ میں آپ کی کامیابی و ترقی کی خبر کا اشتیاق کے ساتھ منتظر رہوں گا۔

آپ کا بزرگ استاد۔ (دستخط) تھیوڈور بک (پرنسپل ایم۔ اے او کالج۔ علیگڈھ)

نیز پر ارادہ کبھی شکار نہیں کیا جاسکتا جبتک شاہباز عمل اسکے تعاقب میں نہو؛ اسوقت سے میرے دل کا پہلا خیال میرے ہاتھ کے پہلے عمل کا زیر مشق ہوگا۔ (اڈیٹر)

فرقت نصیب کی عید

از جناب مولوی سید معجز حسین صاحب لکھنوی

بے یار روز عید شب غم سے کم نہیں جام شراب دیدۂ پرنم سے کم نہیں

وہ بیچین کر دینے والی ہستی۔ البیلی ہستی چھبیلی ہستی۔ آہ کیا بتاؤں کہ وہ کون ہے میں چاہتا ہوں کہ اوسکی راہ میں میرے قدم نہ اٹھیں۔ میں اکثر اپنے تئیں روکتا ہوں لیکن نہ معلوم وہ کونسی ایسی چیز ہے جو میرے قدموں کو بار باراوس کی جستجو میں اٹھادیتی ہے۔ دل کیوں آپ ہی آپ اوسطرف کھنچتا ہے۔ تخیل جس جگہہ جم گیا ہے وہاں سے ہٹنے کا نام نہیں لیتا۔ آنکھیں کیوں مجسم انتظار بن گئی ہیں۔ اسکی وجہہ سوائے اس کے اور کچھہ سمجھہ میں نہیں آتی کہ تاثرات حسن اور جذبات محبت میں گھر گیا ہوں۔ دل پر حسن کی کارفرمائی ہوچکی ہے یا حسن میرے اریکۂ قلب پر شاہانہ انداز سے متمکن ہوچکا ہے۔ اسکو حسن کی کرشمہ سازی خیال کیا جائے یا فسونگری سمجھہ لیا جائے یا اور جو جی چاہے۔ دیار محبت میں جو لوگ رہے اور جنہوں نے وہاں کی ہوا کھائی ہے اُن کے قلوب پر حسن وعشق کے اثرات منبسط ہو چکے ہیں۔ گل وبلبل کی داستان۔ سرو قمری کا افسانہ۔ انہی کیفیات کا ترانہ ہے۔ پپیہے کی زبان پی کہاں پی کہاں رٹتے رٹتے گھس گئی۔ لیکن محبت کے اثرات اوس کے قلب سے نہ مٹے ہیں نہ مٹ سکتے ہیں۔ محبوب کا فراق ہمیشہ پیچھے ہٹنے کے بجائے آگے بڑہنے پر مجبور کرتا ہے۔ محبوب کی یاد عشاق کے دلوں پر صیقل کا کام توضرور کرتی ہے۔ لیکن ایسی یاد کا غیر تمناہی سلسلہ جان لیوا بھی ہوجایا کرتا ہے۔ ع

پی کہاں پھر پی کہاں پھر پی کہاں گرہی رٹ ہے یہی دھن ہے تو نیزا جی کہاں

عید موسم بہار میں آئی اور چلی بھی گئی۔ آفتاب نکلا اور ڈوب بھی گیا۔ رات ختم

ہوئی اور پھر دن نکل آیا لیکن کوئی اسی انتظار میں ہے کہ وہ آئیگا اور اس طرح آئے گا
کہ اوس کے ہر ہر قدم اور خرام ناز پر وارفتوں اور شیدائیوں کے ایک نہیں بلکہ سیکڑوں
دل نثار ہو جائیں۔ شعر

تیری رفتار میں سو فتنے نہاں ہیں ظالم تیری آنکھوں میں قیامت نے جگہ پائی ہے

ابتدائے آفرینش سے دنیا پرستشکدہ حسن رہی ہے۔ حسن والوں کے حسن کا چار دانگ
عالم میں شہرہ رہا ہے وہ بہائم صفت انسان جن کے خمیر میں خونریزی۔ غارتگری۔ قتل اور
اسی قسم کے سنگین جرایم پوشیدہ ہیں اون کی بھی گردنیں کسی ناز آفرین ہستی کے کمان
ابرو کے سامنے خم ہو جانے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ حسن ہی ایک ایسی چیز ہے جو جابروں
اور ظالموں کو آن کی آن میں مسخر کرسکتا ہے۔ محبت آشنا دل لذت درد چشیدہ دل۔
پرستش کنندہ دل تو پہلے ہی سے اوسکا ہو چکا ہے۔

آفتاب غروب ہو چکا ہے۔ شفق سرخ پیکر ماہتاب کے نیلوفری حسن پر نثار ہے ستارے
نکل آئے ہیں۔ چودھویں رات ہے۔ آسمان سے دودھ کی ایسی صاف وشفاف چاندنی
پڑ رہی ہے۔ چاند کے پرتو حسن سے دنیا کی ہر شے پر ایک غیر معمولی رونق چھائی ہوئی ہے
اسوقت خمخانۂ فلک پر بھی رندوں کا جمگھٹا ہے محفل سکوت کی ہے اور دور چل رہا ہے ماہتاب
اپنے دست نگاریں سے کاسۂ نقرئی میں سنہرے رنگ کی صاف ستھری شراب بھر بھر کر
اپنے پرستاران حسن کو فیاضی کے ساتھ دے رہا ہے۔ ستارے جو اوس کے جمال جہاں آرا کے
شیفتہ ہیں دیدہ بازی میں مصروف نظر آتے ہیں۔ عجب چمک دمک ہے۔ عجیب رونق ہے
بادہ نوشان فلکی محو جمال یار ہیں۔ چاند اور ستاروں کے پرتو سے کائنات کے ذرہ ذرہ میں
ایک خاص قسم کی دلفریبی و دل آرائی پیدا ہو گئی ہے۔ قدرت کے کارخانہ میں سب کچھ
مہیا ہے کسی چیز کی کمی نہیں۔ مگر یہ تمام دلفریبیاں اور دل آرائیاں کسی سوختہ ساماں کے
قلب کو روشنی سے معمور اور مسرور نہیں کرسکتی ہیں۔

وہ دل جو کسی ناز آفریں ہستی کے خرام ناز پر مٹا ہوا ہو۔ وہ دل جو کسی کی مستانہ اور دلربایانہ چال کو دیکھکر ششدر رہجاتا ہو۔ وہ دل جس کے لئے کسی کے روئے انور کا نظارہ ایک ایسا زریں اور بیش بہا موقعہ ہو سکتا ہے جس کی میزان میں کوئی دوسری چیز نہیں تُل سکتی بلکہ ایک خلوص کا نظارہ جسمیں ریا و فریب کو مطلقاً دخل نہ ہو۔ زاہد شب زندہ دار کے سو سجدوں سے بہتر ہے۔ یہ قول مفتیان وقت کا نہیں۔ عالمان زمانہ کا نہیں اگر اس کی تشریح و توضیح سننا ہے تو اون سے سنو جو بادہ آشامان محبت ہیں۔ شراب محبت سے مخمور ہو کر سر درسرمدی سے کیف یاب ہو گئے وہی کچھ بیان کرسکیں گے اور وہی کچھ کہہ سکیں گے۔ وہ تبلادیں گے کہ فلک محبت کا چاند کیا ہے اوس کے ستارے کیسے ہیں اُن کی چمک کیسی ہے وہ کس طرح نور پاش ہوتے ہیں وہ دل جو مجسم انتظار بنگیا ہو۔ وہ دل جو پہلے سے قربان گاہ حُسن پر چڑھ گیا ہو۔ وہ دل جو رقت انگیز ولولوں سے اٹا اٹا ہوا وسکو یہ فلکی محمل اور چاند کی چھپی روشنی کیا سرور بخش سکتی ہے۔ ایسے عالم میں کچھ عجب نہیں ہے کہ بجائے اوپر دیکھنے کے وہ سرنگوں ہوجائے۔ بادہ نوشان محبت اُن شرابیوں میں نہیں ہیں جو وقتیہ جام مئے کے نشہ سے بیخود ہو کر بےتُکی اور بےسُری الاپیں لگانے لگتے ہیں۔ اون کی زبان تو کیا چیز ہے اون کے روئیں روئیں سے محبت کی موسیقی ہر وقت اور ہر لحظہ جاری رہتی ہے اون کو بیخود بنانے والے اور سرشار کردینے والے دوسرے ہی اسباب ہوا کرتے ہیں اون سے پوچھو کہ وہ قدرتاً متوالی آنکھیں جسمیں سُرمہ کی تحریر کا بھی اضافہ کیا گیا ہو کس حد تک پُرکیف اور باثر ہو سکتی ہیں۔ ایسی آنکھوں کی ایک محبت بھری نظر دنیا و مافیہا سے فراموش کردینے کے لئے کافی سے زیادہ خیال کیجا سکتی ہے۔ شعر

خیالِ چشمِ مستِ ناز نیں تھا ۔۔۔ میں اپنے ہوش میں برسوں نہیں تھا

کسی پریشاں حال کی حسرت بار نظروں نے خوشی کی چمک اسوقت پیدا ہو سکتی ہے اور

اضطراب و وارفتگی دور ہوسکتی ہے جبکہ مد مقابل کی بھی آنکھوں میں کچھ محبت کی جھلک نظر آجائے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں پیمان وفا بندھ جائے۔ نہیں تو بقول شاعر۔

دیکھ لیا عزیز اگر اُسنے نگاہ تیز سے
طبقۂ دل الٹ گیا دورجہاں پلٹ گیا

عید کو گزر کر زمانہ ہوگیا۔ لیکن کوئی فرقت نصیب کسی کے خیر مقدم کرنے کے انتظار میں چشم براہ ہے۔ کسی کی آنکھ سے وہ چاند سا چہرہ۔ وہ موہنی صورت۔ وہ متوالی آنکھیں جنہوں نے چل چل کر کسی کے دل کو چند دقیقوں میں مسخر کر لیا تھا اوجھل ہیں۔ اُسی کی یاد ہے۔ اُسی کا خیال ہے۔ اُسی کی طلب ہے۔ اُسی کی خواہش ہے۔ آہ! آہ! کیا بہار کے دن اب کے بھی یوں ہی گذر جائیں گے اور وہ نہ آئے گا۔ نہ آئے گا۔ نہ آئے گا!!

(۲) شہید وفا

گذشتہ سے پیوستہ

کی جھیل کے طے ہر ایک مشکل
اکیسویں عمر کی جو منزل

ذاتی کشتی خرید لایا
چلتے ہوئے کام کو بڑھایا

سرمایہ جو کچھ ہوا فراہم
بنیاد امید ڈالی محکم

گرنی کی سڑک پہ گھر بنایا
چھوٹا خوش وضع صاف ستھرا

مقصد کا حصول دل میں ٹھانا
اپنی کے لئے کیا ٹھکانا

پایا موقع جو حسب دلخواہ
اسکو کیا حال دل سے آگاہ

جب آیا بہار کا وہ ہنگام
اور موسم گل کی جانفزا شام

اوس گاؤں کے پیر و طفل و برنا
آئے پئے سیر سوئے صحرا

جھولی لئے کوئی کوئی ڈالی — ہنزل[۵] چنتے تھے ڈالی ڈالی
لیکن تھا فلپ کا باپ بیمار — ساتھ آ نہ سکا وہ سب کے ناچار
آنے میں جو ہوگئی ذرا دیر — قسمت نے دکھایا اور ہی پھیر
آیا تھا یہاں لئے ہوئے ذوق — تھا آنکھوں کو دیدِ یار کا شوق
ٹیلے پہ چڑھا تھا با صد ارماں — قسمت نے دکھائی شکل حرماں
نزدیک نشیب کے جو پہنچا — جھاڑی تھی گھنی جہاں تو دیکھا
اینک اور اَنّی دست در دست — بیٹھے ہیں شراب عشق سے مست
اینک کا رُخِ تعب کشیدہ — سرد و گرم زمانہ دیدہ
اور اوسکی وہ چشم ہائے میگوں — اندازہ نمائے دشت و ہاموں
اک جان بہارِ دلکش عشق — اک شعلہ فروشِ آتشِ عشق
اُنکے چہرونپہ جو لکھا تھا! — اوسکی قسمت کا فیصلہ تھا
دونوں کو لب بلب جو دیکھا — سینہ سے اک دھواں سا اُٹھا
آہستہ سے بسملوں کے مانند — دل باختہ بیدلوں کے مانند
جھاڑی میں اتر گیا وہ غمگیں — جی کھول کے زار نالیاں کیں
خوشیاں سب اُدھر منا رہے تھے — حرماں جان اسکی کھا رہے تھے
آخر اُٹھا چلا بہ مشکل — گھر کی لی راہ داغ بردل
اللہ نے پھر یہ دن دکھایا — اینک کا مدعا بر آیا
گرجا میں خوشی خوشی جرس نے — شادی کے بجائے شادیانے
دن کٹنے لگے ہنسی خوشی سے — کس لطف سے سات سال گزرے
آپس کا خلوص اور محبت — محنت کی کمائی اور قناعت

(ضامن کنتوری) (باقیدارد)

۵ ایک قسم کے جنگلی بیر۔

فہرست مضامین

بزمِ لسان الملک

تصحیح

کتابت کی غلطی سے ماہ اگسٹ کے پرچے میں صفحہ ۳ سطر ( ) پر بجائے سید زین الدین حسین کے سید زین العابدین چھپ گیا ناظرین کرام صحت فرمالیں ؂

شکر و شکایت

ہمارے معزز معاصرین علیگڈھ میگزین اور رہبر دکن حیدرآباد نے جن قیمتی الفاظ میں لسان الملک پر تنقید فرمائی ہے اسکے ہم تہ دل سے شکرگزار ہیں۔ علیگڈھ میگزین ہمارے حصہ نظم کو فرسودہ خیال کرتا ہے، اسکو ہم اختلاف مذاق پر محمول کرتے ہیں۔ شعر و شاعری کی نسبت ہماری جو رائے ہے اسکو انشاء اللہ آئندہ کسی موقعہ پر ظاہر کریں گے ؂

رہبر دکن کاغذ کو زیادہ نظر فریب دیکھنا چاہتا ہے اور یہ ممکن ہے، بشرطیکہ دیسی صنعت کی اس خفیف ہمدردی کو بھی نظرانداز کر دیا جائے۔ ہمکو اپنے مقامی ہمعصر سے اسکی مخلصانہ شکایت بھی ہے کہ تبادلہ تو درکنار جس پرچہ میں ریویو کیا گیا ہے وہ بھی ہم تک نہ پہنچا۔ غالباً یہ انتظامی عملہ کی فروگذاشت ہوگی۔ سنا گیا ہے کہ مشرق گورکھپور اور النساء حیدرآباد نے بھی ریویو کئے ہیں مگر یہ پرچے اب تک ہمکو وصول نہیں ہوئے۔ رسالہ اصلاح کھجوہ ضلع سارن بعد تبادلہ وصول ہوا ہے جسکا شکریہ پیش کیا جاتا ہے۔

رسالہ ترقی حیدرآباد بھی ہمارے دلی شکریہ کا مستحق ہے کہ معاصرانہ فرض کی ادائگی سے چشم پوشی نہیں کی۔ ہمعصر نے ہمارے ادبی روایات کی نسبت جس حسن ظن کا اظہار فرماکے لسان الملک سے اس کے پورے نہ ہونے پر اپنی مایوسی ظاہر کی ہے اس کے متعلق ہم اس سے زیادہ کچھ نہیں عرض کرسکتے کہ ہم کیا اور ہماری دعوت کیا

ع ہر کس بہ تو ہم نفسے می سوزد۔ البتہ جو الفاظ ترقی نے علیگڈھ میگزین کی طرف منسوب کئے ہیں وہ ہمکو میگزین میں نظر نہیں آئے، اور یہ مقام حیرت ہے۔

رسید کتب

لسان الملک کے اجرا کے بعد سب سے پہلے جو کتاب ہمارے دفتر پر وصول ہوئی وہ تصویر بلاغت مصنفہ جناب نواب عزیز جنگ بہادر المتخلص بہ ولا ہے اس فارسی مسدس میں حضرت سرور کائنات صلعم کا سراپائے مبارک نہایت خوبی و نازک خیالی کے ساتھ نظم فرمایا گیا ہے اس سے پہلے فارسی میں اس رنگ کی کوئی نظم دیکھنے میں نہیں آئی۔ جناب ولا مستحق مبارکباد ہیں کہ وہ اس دشوار گزار راستہ کو نہایت عمدگی و آسانی سے طے کر گئے۔ کتاب ملکی کاغذ پر نواب صاحب کے ذاتی مطبع میں خاص اہتمام سے طبع ہوئی ہے اور مصنف سے درخواست کرنے پر مفت مل سکتی ہے ؂

نگہ را زیں ورق روشن سواد جلوہ خوانی کن

لسان الملک

نمبر (۳)	بابتہ ماہ ستمبر ۱۹۲۳ء	جلد (۱)

صہبائے عشق

موج بہ چیند ز بحر جوشش سودائے عشق — در خورِ زنجیر نیست سلسلہ برپائے عشق

دیدۂ لیلی نگر بایدت اے مدعی — تا بہ کنی مثلِ قیس سیرِ تماشائے عشق

کام و لبش را مباد بادۂ کوثر حلال — تا نہ چشید شیخ شہر بادہ ز مینائے عشق

چشم نظرباز بود غمزہ رگِ دل کشاد — مایۂ ہفت آب شد قطرۂ دریائے عشق

حسنِ جہانگیر را پردہ ز گیسو کشید — دام نہاد از حیا در رہِ عنقائے عشق

عیسیِ مریم کجاست مژدۂ رفعت دہید — زینۂ بامِ علاست باز چلیپائے عشق

حسن بہ چندیں ظہور رو بہ خفا می نہد — ما چو خس افتادہ ایم در رہ مجرائے عشق

دل چو بری شد ز لوث باب فراخی کشود — وسعتِ عالم نمود ذرۂ بیدائے عشق

نسخۂ ہستی ہمہ یک سبقِ دو اسم بود — ہفت ورق در نوشت مرحلہ پیمائے عشق

مستی ضامن نگر بادہ بہ سجادہ ریخت
شیخ حزینش چو شد ساقیِ صہبائے عشق

ضامن کنتوری

حدیقہ عثمانی (مسٹر حیدری)

ہمنے حدیقہ عثمانی سے نمبر (۲) کیلئے نواب عماد الملک بالقابہ کے حالات انتخاب کئے تھے اس نمبر کے لئے نواب حیدر نواز جنگ بہادر کی ذاتی شخصیت اور ملکی و قومی کارناموں نے ہماری نظر انتخاب کو اپنی طرف کھینچ لیا ہمکو امید ہو کہ آپکے حالات نہ فقط دلچسپی سے دیکھے جائیں گے بلکہ ملک و قوم کے لئے سبق آموز ثابت ہوں گے۔ (ایڈیٹر)

حیدر نواز جنگ بہادر (نواب محمد اکبر نذر علی حیدری صاحب) خلف سیٹھ نذر علی صاحب۔ آپکا آبائی وطن تو کھمبات ہے لیکن ولادت بمقام بمبئی سیٹھ نذر علی صاحب نامی گرامی تاجر کے شکوہ علی میں ۸ نومبر ۱۸۶۹ء کو ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جو زیادہ تر دین و مذہب سے تعلق رکھتی تھی مکان میں اپنی والدہ صاحبہ و نانیصاحبہ (جسٹس بدرالدین طیب جی کی حقیقی ہمشیرہ) پائی جب آٹھ سال کی عمر کو پہنچے تو کھبت واڑی (بمبئی) کے انگلو ورنیکیولر اسکول میں داخل کیا گیا اسکے بعد الفنسٹن ہائی اسکول اور سینٹ زیویرز کالج میں آپکی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا گیا؛ جہاں سے سترہ سال کی عمر میں آپ نے اعزاز کے ساتھ بی۔ اے کا امتحان پاس کرلیا۔ یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ آپ کا تعلیمی زمانہ شروع سے آخر تک ہمت افزا و لایق تحسین رہا؛ یعنے آپ ہر امتحان میں قابل تعریف طور پر کامیاب ہوتے اور وظائف حاصل فرماتے رہے۔ بی۔ اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد آپ نے بی ایل کے امتحان کی تیاری کر کے اُس کا پریویس پاس کرلیا۔ لیکن اس اثنا میں چونکہ گورنمنٹ کی جانب سے انڈین فینانس کے امتحان میں شریک ہونے کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آگیا تھا، اس لئے قانون کے امتحان کا خیال ترک کر کے آپ نے انڈین فینانس کے امتحان میں مقابلہ کی تیاری کی، اور اس امتحان میں سب سے اول آئے۔

آپ کی اس نمایاں کامیابی کے لحاظ سے فبروری ۱۸۸۸ء میں بمقام ناگپور صیغہ حساب کے ایک افسر کی حیثیت سے آپ کی تعیناتی عمل میں آئی؛ جہاں دو سال کے قیام کے زمانہ میں آپ نے سیتابلڈی کلب میں شریک ہو کر مختلف جماعتوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی روح پھونکنے میں بڑی حد تک کامیابی حاصل کی نیز وہاں کے مسلمانوں کی اصلاح حال کے

مقصد کو مدنظر رکھ کر انجمن حامی اسلام کی بنیاد ڈالی؛ جس کے آپ لائف پریسیڈنٹ (صدر مادام الحیات) بنائے گئے۔ اور اس کے متعلق تعلیم مسلمانان کی غرض سے آپ نے ایک اسلامی اسکول بھی قایم کیا! جو ترقی کرتے کرتے ہائی اسکول کے درجہ کو پہنچ گیا۔ اس مدرسہ سے ابتک مسلمانان صوبہ متوسط تعلیمی تمتع حاصل کر رہے ہیں۔

جولائی ۱۸۸۹ء میں آپ لاہور کے کرنسی آفس میں منتقل کئے گئے۔ تقریباً ایک سال وہاں کام کرنے کے بعد آپ کا تبادلہ کلکتہ کو ہوا، اور وہاں تین سال تک آپ متعین رہے۔ اس کے بعد آپ بحیثیت اسسٹنٹ اکاونٹنٹ جنرل الہ آباد میں تعینات کئے گئے؛ جہاں آپکی سعی و کوشش سے میور سنٹرل کالج الہ آباد کے مسلمان طلبہ کے لئے بورڈنگ ہاوس (دارالاقامت) کا قیام عمل میں آیا۔ جب اپریل ۱۸۹۳ء میں آپ کا تبادلہ وہاں سے بمبئی کو ہوا تو الہ آباد کی جماعت ہنود نے اوس وقعت و منزلت کا مظاہرہ، جو آپ کے شریفانہ و ہمدردانہ برتاؤ سے اس کے دل میں آپ کی طرف سے جاگزیں ہو گئی تھی، ایک شاندار و داعی جلسہ ترتیب دے کر کیا۔

سنہ ۱۹۰۰ء میں آپ بحیثیت ڈپٹی اکاونٹنٹ جنرل مدراس میں تعینات کئے گئے۔ قیام مدراس کے زمانہ میں انجمن اسلامیہ و محمڈن لٹریری سوسائٹی کی ترقی و فروغ میں نمایاں حصہ لیا۔

اپریل سنہ ۱۹۰۱ء میں تمام ہندوستان و برھما کے سرکاری مطابع کے حساب کی جانچ پڑتال کا کام خاص طور پر آپ کے سپرد ہوا اور انجام دہی فرائض کے اثنا میں آپ کو ہندوستان اور برھما کے بڑے بڑے مقامات کے دیکھنے کا موقعہ ملا۔ ہر پریس کے متعلق آپ نے متعدد مفصل و مکمل تنقیحی رپورٹیں گورنمنٹ ہند میں پیش فرمائیں؛ جن کے متعلق گورنمنٹ آف انڈیا نے اظہار خوشنودی فرمایا۔

سنہ ۱۹۰۵ء میں ماہر فینانس ہونے کی بناء پر آپ کے خدمات عہدہ صدر محاسبی کیلئے سرکار عالی میں مستعار لئے گئے؛ جس کے فرایض با آئین بہیں آپ نے انجام دیئے۔ اوس

زمانہ میں سر جارج کیسن واکر معین المہام فینانس کے پیش نظر جو بہت سی فینانشل اصلاحیں تھیں اُن میں آپ سے مشورہ و مدد لینے کی غرض سے اُنھوں نے سرکار سے خواہش کر کے آپ کو سنہ ۱۹۰۷ء میں معتمدی فینانس کی خدمت پر ترقی دلائی۔ اس منصب پر فائز ہو کر آپ نے فینانس کے اصلاحی و انتظامی امور میں سر جارج کو خاطر خواہ مدد دی؛ جس کا اعتراف انھوں نے اپنے بجٹ نوٹ میں اس طرح کیا۔

"گذشتہ نو سال کے فینانس کے کاموں کے جو منافع مختصر طور پر بیان کئے جاتے ہیں اون میں گزشتہ پانچسال تک اول بحیثیت صدر محاسب، زاں بعد من حیثیت معتمد فینانس مسٹر حیدری نے نمایاں اور موثر طور پر حصہ لیا تھا۔ جہاں تک مقامی حالات اجازت دیتے تھے ریاست کے مخارج پر زیادہ اثر پذیر طریق سے قابو حاصل کر لیا گیا ہے، اور جو امور فینانس سے تعلق رکھتے ہیں اُن پر سررشتہ فینانس اپنے اقتدار کو کام میں لانے کامیاب ہو تمام کام دفتر میں ٹھیک وقت پر انجام پاتا ہے۔ حالی اور کلدار کا نرخ مبادلہ فی الحال پورے طور پر قابو میں لایا جا چکا ہے۔"

خردہ کے نرخ کی اصلاح، سرکار عالی میں گریڈ کے طریقہ کی اجرائی، یوروپین و ایشیائی تعلیمی وظائف کے لئے بذریعہ کمیٹی امیدواروں کا انتخاب، سول سروس کلاس کا دوبارہ قیام، اعلیٰ خاندان کی لڑکیوں کی تعلیم کے لئے محبوبیہ گرل سکول کا افتتاح زیادہ تر مسٹر حیدری کی کوششوں اور مشوروں کا رہین منت ہے۔

جولائی سنہ ۱۹۱۱ء میں آپ معتمدی عدالت و کوتوالی و امور عامہ کی خدمت پر منتقل کئے گئے چونکہ اس معتمدی سے سررشتہ تعلیمات کا راست تعلق تھا اس لئے آپ کے اس معتمدی پر فائز ہونے سے ملک و قوم کو بیشمار تعلیمی برکتیں حاصل ہوئیں بقول اخبار ملٹن:-

"آپ کا عہد معتمدی عدالت و کوتوالی بعض اُن صیغوں کی انتظامی اصلاحوں کے لحاظ سے جو آپ کے زیر نگرانی تھے قابل یادگار تھا۔ ترقی تعلیم کے متعلق جو خدمات

آپ نے انجام دیے وہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ مسٹر حیدری کا نام اگر اُن کے بعد باقی رہے گا تو وہ بلاشبہ اُن وسیع العمل اصلاحات کے باعث باقی رہیگا جو اس ملک کی تعلیم میں آپ نے کی ہیں۔ معتمدی عدالت و کوتوالی کی خدمت کا جائزہ لینے کی تاریخ سے آپ کی دلی خواہش یہ تھی کہ اس ملک میں اعلیٰ تعلیم کے طریقہ کی بنیاد قومی اور روایتی اصول پر رکھی جائے، اور اس میں زمانہ دراز سے جو اس قسم کی قباحتیں چلی آرہی ہیں، جنہوں نے تمام ہندوستان خصوصاً حیدرآباد میں یونیورسٹی کی تعلیم کو ناقابل اطمینان بنا رکھا ہے وہ سب دور ہوجائیں۔ عثمانیہ یونیورسٹی کا تخیل جس نے آگے چلکر عملی صورت اختیار کی تمام و کمال آپ ہی کی کوشش کا نتیجہ تھا، جو ہمیشہ آپ کے پیش نظر رہتا تھا۔ اس مقصد پر پہنچنے کے قبل آپ کو اس کی داغ بیل ڈالنے میں بہت کچھ محنت اٹھانی پڑی، کیونکہ جس بنیاد پر یونیورسٹی کی تعلیم صحیح معنوں میں ہونی چاہیئے وہ عملاً اس مملکت میں مفقود تھی۔ ابتدائی اور ثانوی تعلیم نے اس حد تک ترقی نہیں کی تھی جس کے لحاظ سے حیدرآباد میں جداگانہ یونیورسٹی کے قیام کی کافی طور پر کفالت کی جاتی اس لئے قیام یونیورسٹی کی موزونیت پیدا کرنے کے لئے آپ نے ملک میں درسگاہوں کا جال پھیلانے میں ہمہ تن کوشش کی۔ قیام عثمانیہ یونیورسٹی کے متعلق ان کوششوں میں جو کامیابی ہوئی وہ بڑی چیز ہے، جس کی بنیاد پر آئندہ نسلیں حیدرآباد کے متعلق آپ کے خدمات کو پاس گزاری و احسانمندی کے ساتھ یاد کرتی رہیں گی۔"

معتمدی عدالت و کوتوالی کے ممتد زمانہ میں ملک کے اندر باہر آپ نے ملک و قوم کے شاندار تعلیمی اور عام فلاح و بہبود کے خدمات انجام دے۔ اس خدمت کے فرائض انجام دینے کے اثنا میں آپ ۱۹۱۲ء کے طاعون کی انتظامی کمیٹی کے معتمد مقرر ہوئے افضل گنج کے جنرل ہسپتال کو مریضوں کے لئے زیادہ راحت رساں بنانے کی غرض سے اُسکی عمارت کی

توسیع کی تحریک آپ نے پیش کی، جس کے مطابق اب اوسی موقعہ پر جو آپ نے تجویز کیا تھا ایک وسیع و شاندار عمارت رود موسیٰ کے ساحل کے متصل تعمیر ہو رہی ہے مجلس عالیہ عدالت کی جدید خوشنما عمارت کا موقعہ بھی آپ ہی نے پسند و منتخب کیا تھا۔

۱۹۱۵ء میں آپ حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس کے اولیں اجلاس کے صدر منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۶ء میں مسلمانان جنوبی ہند نے اپنی تعلیمی کانفرنس منعقدہ وانمباڑی کی صدارت کے لئے آپ کو منتخب کیا، اور اس کی کرسی صدارت سے مسٹر حیدری نے اون کو بمقام وانمباڑی ایک اسلامی کالج کے قیام کی جانب متوجہ فرمایا، اور اجلاس کانفرنس میں آپنے معارف نواز و علم و ہنر پرور شاہ دکن خلد اللہ ملکہ کی جانب سے کالج کے متعلق شاہانہ امداد کا اعلان فرمایا۔ آپ کے خطبۂ صدارت کا یہ اثر ہوا کہ اُس موقعہ پر پچاس ہزار سے اوپر چندہ کا وعدہ کالج کی عمارت کی تعمیر کے متعلق ہو گیا۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمانان وانمباڑی کی ایک جماعت کے غلط طرز عمل اختیار کر لینے سے قیام کالج کی تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی اور ہندوستان کی سب سے بڑی اسلامی ریاست نے جو امداد پیش کی تھی اوس سے تمتع حاصل کرنے کا موقعہ کھو دیا۔ ۱۹۱۷ء میں مسٹر حیدری، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ کلکتہ کے صدر منتخب ہوئے، اور وہاں جو خطبۂ صدارت آپ نے ارشاد فرمایا اوسمیں بطور پیش بینی اُن امور کا واضح طور پر ذکر فرما دیا تھا جو دنیائے تعلیم میں عنقریب پیش آنے والے تھے۔

آپ کو علمی دنیا میں یہ امتیاز بھی حاصل ہے کہ آپ متعدد یونیورسٹیوں؛ یعنے مدراس، بمبئی، ڈھاکہ اور حیدرآباد کے فیلو (رفیق) اور علیگڈھ یونیورسٹی کے ٹرسٹی ہیں۔

۱۹۱۴ء سے مملکت آصفیہ میں جو سررشتۂ آثار قدیمہ قایم ہے اس کی سیادت و قیادت بھی آپ ہی کے تفویض ہے، اور آپ ہی کے حسن توجہ سے ممالک محروسہ سرکار عالی کی

بہت سی بیش بہا صناد ید کے دست برد زمانہ سے محفوظ رہنے کا بندوبست ہو گیا ہے؛ خصوصاً ایلورا، اجنٹا، اور ممالک محروسہ کے دوسرے مقامات کے ہندی صنعت تعمیر کے قدیم نمونوں کے محفوظ کرنے میں جو سعی و کوشش آپ نے فرمائی ہے وہ زمانہ قدیم کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کی سپاس گزاری کی متوجب ہے۔

معتمدی عدالت و کوتوالی کے فرائض انجام دینے کے آخری زمانہ؛ یعنی اواخر سنہ ۱۹۱۹ء سے اوائل سنہ ۱۹۲۰ء تک اپنے فرائض مفوضہ کے علاوہ آپ نے مسٹر ویکفیلڈ صدر ناظم صنعت و حرفت کے رخصت پر جانے کے باعث سررشتہ صنعت و حرفت کے متعلق اُن کے فرائض بھی انجام دے، اور سررشتہ مذکور کی کارروائیوں کا انکشاف آپنے بذریعہ ایک مبسوط یادداشت (نوٹ) کے فرمایا؛ جن کو معلوم کرنے کے لئے پبلک اشتیاق کے ساتھ منتظر تھی۔ آپ کی توجہ سے سررشتہ صنعت و حرفت کے انتظام میں بھی بہت سی اصلاحیں عمل میں آئیں، اور اس سررشتہ کی سرپرستی کو چھوٹی چھوٹی صنعتوں کے صناعوں تک وسعت دی۔ کاغذ سازی کی مردہ صنعت میں جان ڈالی، سمینٹ کے کارخانے کے ابتدائی مراتب طے فرمائے، روغن براری کے دستی کولھوں کی تعلیم و توسیع کا پارچہ بافی کے دستی کرگھوں کی طرح انتظام فرمایا۔ ملک میں معادن کے بکثرت موجود ہونے کے لحاظ سے جیالوجیکل سروے (پیمایش طبقات الارض) کی ضرورت کی جانب سرکار عالی کو متوجہ کیا۔ غرض بہت سی کام کی باتیں اس سررشتہ کے متعلق آپ سے ظہور میں آئیں، جنکی صراحت کا یہ موقعہ نہیں ہے۔

اپریل سنہ ۱۹۲۰ء میں آپ نے سرکار عالی کی ملازمت سے سرکار عظمت مدار کی ملازمت پر عود فرمایا، اور بمبئی میں درجہ اول کے اکاونٹنٹ جنرل کی حیثیت سے تعینات کئے گئے۔ یہ رینک (رتبہ) اس سے قبل کسی دیسی شخص کے حصہ میں نہیں آیا تھا گو آپ نے وہاں چند ہی ماہ اس خدمت کے فرائض انجام دیئے، لیکن اپنی طبعی اور خلقی خوش خلقی

وہمدردی سے اپنے ماتحتین کو اپنا گرویدہ بنالیا۔ چنانچہ جب آپ نے اس خدمت سے وظیفہ لیکر پھر اپنی سابقہ خدمت پر حیدرآباد آنے کا تہیہ فرمالیا تو آپ کے ماتحتین نے اظہار تشکر کے طور پر ایک عمدہ فوٹو لیا؛ جس کی ایک کاپی تو آپ کے نذر کی گئی اور دوسری بطور یادگار بمبئی کے دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل میں آویزاں ہوئی:

معاودت حیدرآباد کے موقعہ پر باشندگان پائے تخت آصفی بلاتفریق مذہب و ملت بیحد مسرور ہوئے۔

جولائی ۱۹۲۱ء میں مسٹر گلانسی کے یہاں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونے پر صدرالمہامی فینانس اور رباب حکومت کی رکنیت کا منصب جلیلہ خالی ہوا تو بارگاہ خسروی سے ازراہ عطوفات شاہانہ وقدر افزائی ملوکانہ اس کے لئے آپ کا انتخاب عمل میں آیا؛ جو طبقہ خاص و عام میں نظر استحسان سے دیکھا گیا۔ صدرالمہامی فینانس کا جائزہ حاصل کرنے کے بعد آپ کو سرکاری وملکی اغراض کے لحاظ سے پرامیسری نوٹوں کے ذریعہ کم و بیش پچھتر لاکھ روپیے قرض حاصل کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ مدت معینہ کے اندر رقم مطلوبہ سے زیادہ رقم جمع ہوگئی، اور آپ کی اس شاندار کامیابی پر منجانب حضرت اقدس واعلیٰ اظہار خوشنودی فرمایا گیا۔

اسی زمانہ میں تشریف آوری شہزادہ ویلس کے انتظامات کے لئے حسب ایماء حضرت اقدس واعلیٰ ایک کمیٹی اعلیٰ عہدہ داراں کی منعقد ہوئی؛ جس کی صدارت کی عزت آپ کو بخشی گئی۔ معزز مہمان کی راحت رسانی کے انتظامات مناسب وموزوں ثابت ہوئے، اور انتظامی کمیٹی کے صدر کی حیثیت سے ان انتظامات کے کامیاب بنانے میں جو محنت ومشقت آپ نے برداشت کی تھی اُس کے صلہ میں شہزادہ ویلس بہادر نے اپنا فوٹو جس پر شہزادہ ممدوح کا مانوگرام مع دستخط ثبت تھا اپنے دست مبارک سے بطور یادگار مرحمت فرماکر آپ کو سربلندی عطا فرمائی۔

صدر المہامی فینانس کے حلقہ اثر میں چونکہ سررشتہ ریلوے بھی ہے اس لئے آپ کی توجہ سے انتظام ریلوے میں متعدد اصلاحیں عمل میں آئیں؛ جن کی تفصیل اس موقعہ پر طوالت سے خالی نہ ہوگی۔

یہ عرض کر دینا خلاف موقعہ نہیں کہ مسٹر حیدری کی ان دماغ سوزیوں اور جاں کاہیوں کا صلہ بیشگاہ خداوندی سے "حیدر نواز جنگ" کے خطاب کی صورت میں بہ تقریب جشن سالگرہ مبارک جمادی الآخر ۱۳۴۱ھ میں آپ کو عطا فرمایا گیا۔

آپ کے حالات زندگی کا جو مختصر سا خاکہ ان اوراق پر کھینچا گیا ہے وہ نامکمل رہے گا اگر آپ کی شریک زندگی بانوئے محترمہ کے اُن احسانات عمیم کا شکرگزاری کے ساتھ مختصر طور پر ذکر نہ کیا جائے، جو آپ کی ذات ستودہ صفات سے بنی نوع انسان پر ہوئے ہیں۔ اُن احسانات کا ذکر کرنے سے قبل اتنا بتا دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ جسٹس بدر الدین طیب جی کے بھائی نجم الدین طیب جی کی صاحبزادی ہیں؛ جو عربی فارسی کے جید عالم اور طیب جی فرم کے مالک تھے۔ یہ شریف خاتون ۱۸۹۳ء میں مسٹر حیدری کے حبالہ نکاح میں آئیں، اور اس کے بعد صاحب موصوف سے جتنے قومی اور رفاہ عام کے کام انجام پائے ان میں آپ اُن کی دست راست بنی رہیں۔ چنانچہ ۱۹۰۸ء میں حیدر آباد کے اندر رود موسی کی تباہی انگیز طغیانی آئی تو آپ نے مصیبت زدگان طغیانی کی اعانت خصوصاً پردہ نشین خواتین کی خبرگیری کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں فرمایا؛ جس کا ثواب بارگاہ ایزد متعال سے تو آخرت میں ملے گا، مگر یہاں بھی سرکار عظمت مدار سے اس کار خیر کے صلہ میں آپ کو درجۂ اول کا تمغہ طلائی قیصر ہند عطا ہوا۔ پھر اس کے بعد جب کبھی حیدر آباد میں طاعون کی مصیبت آئی آپ نے مریضوں کی خبرگیری اور اُن کو دوائیں تقسیم کرنے میں ہمیشہ پیش قدمی کی؛ جو دوسری خواتین کے لئے باعث تقلید ثابت ہوئی۔ ۱۹۱۹ء کے عالمگیر انفلوئنزا کے زمانہ میں جب کہ حیدر آباد میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس مہلک مرض میں

مبتلا تھے، اپنے ہاتھوں سے دوائیں بناکر اور مریضوں کے گھروں پر گشت لگاکر انہیں دوائیں پہنچائیں، اور اُن کی ہر طرح خبرگیری کی۔ جزاہا اللہ فی الدارین خیراً۔

سید منظر علی اشہر (حیدر آباد دکن۔ قدیم رسالہ عبداللہ)

اسرارِ حیات

از جناب مولوی سید وہاج الدین صاحب شمیم کنتوری بی اے۔ بی۔ ٹی۔

وہ چیز کیا ہے جسے تم حیات کہتے ہو
عدم کو جس کے 'فنا' اور 'ممات' کہتے ہو

حیات نام ہے جس کا تبادُ شے کیا ہے
خمار موت ہے جس کا وہ کیف مے کیا ہے

جدا الحد کو کرے مہد سے وہ فصل ہے کیا
ملائے اصل کو جو اصل سے، وہ وصل کیا ہے

وہ ملک کیا ہے جو مجھ سے چھپنے تو میں رہوں
ذرا سی دیر میں انساں سے مشت خاک بنوں

وہ روح کیا ہے جو رقصاں ہزار ستاروں میں
چمکتی پھرتی ہے ذروں میں اور شراروں میں

وہ روح کیا ہے درخشاں جو آفتاب میں ہے
اور انتشار سے جس کے مہک گلاب میں ہے

وہ لہر کیا ہے جو قطرے کو جان دیتی ہے
خودی سکھا کے خدا کا نشان دیتی ہے

خودی ہے وہ جسے تم سب حیات کہتے ہو
فنا خودی کی ہے جس کو ممات کہتے ہو

اس آئینہ میں اگر زنگ آنا جاتا ہے
زمانہ اس کی جلا کو مٹاتا جاتا ہے

کسی نے زیست کو ہستی مستعار کہا
کسی نے دشت فنا کا اسے غبار کہا

کہا کسی نے کہ دنیا سراب ہے یکسر
حیات اپنی ہے مثل حباب سر تا سر

کسی نے خواب گراں ہے اسے کیا تعبیر
کسی نے اس کو کہا درس مرگ کی تفسیر

خودی، اساس جو ہنگامہ جہاں کی ہے — وہ جنس جس سے یہ رونق ہر اک دکان کی ہے
وہ نور جس کی ضیا ساری کائنات میں ہے — اوسی کی روشنی اس محفل حیات میں ہے
اوسی خودی کو یہ غافل غلط نما سمجھے — بقا کے راز کو سرمایۂ فنا سمجھے
پڑا جو راہ میں جنگل تو ہوش کھو بیٹھے — چبھے جو خار تو کعبہ سے ہاتھ دھو بیٹھے

ڈرے عمل سے رموزِ بقا کو بھول گئے
خودی کو بھول کے ناداں خدا کو بھول گئے

وہ دل کہ جس میں نہیں ذوق جستجو پیدا — وہ سر نہ جس میں ہو سودائے آرزو پیدا
وہ ہاتھ ہوں خلش خار سے گریزاں جو — وہ ذوق خواب میں رہتا ہو گل بداماں جو
وہ آنکھ ڈھونڈے فقط دلکشی جو پھولوں کی — نہ بھائے دید جسے دشت کے ببولوں کی
وہ گوش جو ہو طلبگار نغمۂ شادی — صدائے قلب شکستہ کا جو نہ ہو عادی
وہ لوگ دشت نوردی سے جو ہراساں ہوں — خیال آبلہ پائی سے رخنہ در جاں ہوں
کہیں جو وادیِ دشوار میں ہو ان کا مقام — تو جھک کے دور سے منزل ہی کو کریں وہ سلام
جو پوچھو سچ تو فنا کے ہیں وہ علم بردار — تباہ ہونے کی شکلیں ہیں مٹنے کے آثار

یہ سب ہیں مجرم فطرت سزا کے قابل ہیں
جفا جو سہہ نہ سکیں وہ فنا کے قابل ہیں

یہی وہ ہیں جو مصاف حیات میں دب کے — اصول طرفہ بناتے ہیں اپنے مطلب کے
خجل جو ہوتے ہیں اپنے قویٰ کی پستی سے — بہ تنگ آتے ہیں اوروں کی چیرہ دستی سے
تو زور و فتح کو نفسانیت بتاتے ہیں — شکست و ضعف کو انسانیت بتاتے ہیں
نظر جو آتی ہے اپنے بدن کی عریانی — تو انکسار کی لے کر ردائے نورانی
جہاں میں صبر و تحمل کے راگ گاتے ہیں — برہنگی کے عیوب اس طرح چھپاتے ہیں
جو کرنی پڑتی ہے اوروں کی انکو گدیہ گری — تو کسر نفس کی کرتے ہیں اوسپہ بخیہ گری

جو دیکھتے نہیں کچھ زور دستِ لاغر میں
چھپا کے اوسکو قناعت کی پاک چادر میں

جہاں میں خدمت اصنام کرتے پھرتے ہیں
خدا کے حکم کو بدنام کرتے پھرتے ہیں

نہ ہوسکیں جو حریفوں سے اپنے عہدہ برا
تو ضعف و عجز کو کہتے ہیں شانِ استغنا

بہ نکِ نفس نہیں، ان کو صیدِ نفس کہو
ہر ایک بات کو تم ان کی کبدِ نفس کہو

اسیرِ پنجۂ حرص و ہوا کہو ان کو
فریب خوردۂ رنگِ فنا کہو ان کو

ازل سے تھے جو قوی اب حقیر بن بیٹھے
لٹا کے جنسِ خودی کو فقیر بن بیٹھے

بقا کی کشمکشوں کو وبالِ جاں سمجھے
ہے ماں کی گود مگر دار امتحاں سمجھے

رہا ہے رات کی صحبت میں کیا مزا باقی
نگاہِ شوق کو ہے دورِ نو کی مشتاقی

پرانے بادہ پرستوں میں اب وہ ذوق نہیں
شراب تلخ کا اس میکدے میں شوق نہیں

کہاں ہے رندوں میں اگلا سا جوشِ آزادی
اسیرِ خواب بنی میکدے کی آبادی

صلائے عام میں ساقی کی اب وہ زور کہاں
اِدر اُدر کا اب اس بزم میں وہ شور کہاں

پتنگے سوز کی وحشت سے آشنا نہ رہے
جفائے عشق تھا جنکو وہ باوفا نہ رہے

رباب و چنگ کے نغمے ہم نواز نہیں
جگر میں شمع کے وہ سوز اور گداز نہیں

جنوں پسند جنوں سے ہوئے ہیں بیگانے
بھول بھولے ہیں۔ پر سو رہے ہیں دیوانے

یہ کشتگانِ "فنا" ہیں انہیں جلا ساقی
خُمِ حیات سے ہاں بھر کے جام لا ساقی

پلا دہ بادہ کہ ان بیخودوں کو ہوش آئے
نئے سرے سے ترے وحشیوں کو جوش آئے

(جناب بیخود موہانی)

رخصت اے درد و الم، صبر و تواں، ہوش و خرد
لائی ہے پیغام راحت بیخودی میرے لئے

میرا مرنا رہ گیا اہلِ وفا میں یادگار
موت نے بدلا لباس زندگی میرے لئے

لسانُ الملک اور تعلیم

از جناب خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب ایم اے۔ سابق ممبر کونسل بہاولپور

انسان کا یہ فطری حق ہے کہ جہاں تک وہ ترقی کر سکتا ہے کرے اور اس مرکز پر جا کر دم لے جہاں اس کی ترقی اور تفرج کے ابواب بند ہو جاتے ہیں ہر انسان یہ حق رکھتا ہے کہ ان حدود تعلیم و تدریس تک جا پہنچے جن تک وہ پہنچ سکتا ہے اگر کوئی انسان اس قسم کا ذہن اور ہمت رکھتا ہو کہ ان سب مراحل تک رسائی کر سکے تو کوئی اس کا مزاحم نہیں ہو سکتا۔ لیکن ہم اس کے ساتھ ہی یہ بھی جانتے ہیں کہ سب انسان ذہن اور طبیعت و ہمت میں یکساں نہیں ہوتے اور یہ بھی کہ انسانوں کے مطلوبات اور خواہشات بھی ایک نمونہ نہیں رکھتیں۔ جس طرح انسان کی فطرت اور ذہن جداگانہ ہیں اسی طرح مطلوبات اور خواہشات بھی جداگانہ ہیں اگر دنیا میں اقتصادیات کی ایک ہی نوع ہو تو دنیا کی تمام ترقی یافتہ اور پر رونق منڈیاں چند ہی گھنٹوں میں اجڑ جائیں۔ یہہ اسی بوقلمونی کا صدقہ ہے کہ جو طبایع اور خواہشات میں پائی جاتی ہے۔

اگر تمام انسانوں کی اشکال ایک ہی قسم کی ہوتیں اور اگر سب انسانوں کے خیالات میں یک جہتی ہی ہوتی تو پھر محفل دنیا پھیکی پھیکی اور بغیر کسی قسم کی دلچسپی کے ہوتی دنیا میں کاروباری دنیا کے اندر امیروں کی بھی ضرورت ہے اور بڑے آدمیوں کی بھی مانگ ہے، لیکن اگر ان کے ساتھ ساتھ ہی غربا اور متوسطین کی جماعتیں نہ ہوتیں تو تکلیف ہی ہوتی۔ اقتصادیات اور دنیا کی تمام کاروباری منڈیوں میں عام لوگ ہی کار برآ ہیں بڑی بڑی ہستیاں انہیں کے صدقے اپنی اپنی زندگیوں کو کامراں بنا رہی ہیں بیشک لشکروں اور فوجوں میں کمان افسر ہی بہت کچھہ وقعت اور اثر رکھتے ہیں لیکن اگر

سپاہی نہ ہوں، اور دوسرے چھوٹے چھوٹے افسران کے مددگار نہ ہوں تو کوئی حکومت سرسبز نہ ہو سکے۔ سپاہی اور چھوٹے چھوٹے افسر جو کام یا جس قسم کی امداد دیتے ہیں ان کی افسران بالا کے کاموں سے زیادہ تر ضرورت ہوتی ہے۔

تعلیمی ڈگریاں

یہ لازمی ہے کہ ہر قوم جو تعلیمی حدود سے گزرنا چاہتی ہے اس کے اکثر افراد ڈگری یافتہ بھی ہوں، بی۔اے بھی ہوں، ان سے بھی جو اعلیٰ درجہ کی ڈگریاں ہیں وہ بھی حاصل کریں علمی مرکزوں میں جو ممتاز مرکز ہیں ان تک بھی ان کا بہت سا حصہ جا پہنچے، اور اعلیٰ تعلیم سے بہت سی ہستیاں ممتاز ہوں، لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں کہ عام تعلیم سے گزر کر سب کے سب اوپر کے درجوں ہی کی خواہش اور لئے میں دیوانہ وار ساعی ہوں ڈگریاں اور اعلیٰ تعلیم ایک امتیازی طرہ ہے، جو فیصدی دس بیس کے سروں پر زیب دستار ہونا چاہیئے، نہ یہ کہ ساری قوم ہی اس دھن میں لگی رہے۔ اگر ایسا ہو تو اقتصادیات اور عام کاروباری زندگی میں کون حصہ لے گا؟ اور ان لازمی منڈیوں کی رونق کیونکر ہوگی؟ اگر ہر شخص بی۔اے اور ایم اے ہی ہو جائے تو دنیا کے وہ کام کاج کون کرے گا جو ان ڈگریوں کے مفہومات سے دوسرے درجہ پر ہیں؟ تجربہ ثابت کر رہا ہے کہ انگلستان اور یورپ کے دیگر ترقی یافتہ حصوں اور قوموں میں سب سے زیادہ فیصدی دس آدمی یا دس افراد بھی بمشکل بی اے ایم اے ہوتے اور اعلیٰ تعلیم پاتے ہیں؛ صدہا اور ہزارہا طالب علم دوسرے اغراض کاروباری کے تحت پہلے ہی تعلیم چھوڑ بیٹھتے ہیں۔

وجوہ ترقی یورپ

یورپ اور انگلستان کی ترقی اور کامیابی کے وجوہ میں سے ڈگریاں اور اعلیٰ تعلیم ایک آخری اور محض اعزازی وجہ ہے۔ سب سے زیادہ اہم اور ترقیات کی محرک وجہ عام تعلیم ہے۔ اب تک یورپ کی قوموں میں جس قدر موجد اور صناع گزرے ہیں ان میں سے فیصدی دو بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ نہ تھے

ایک فلاسفر کیونکر ان کاموں میں حصہ لے سکتا ہے جو عام زندگی سے وابستہ ہیں؟ اسکے دماغ میں تو فلسفیانہ خیالات متموج ہوتے ہیں؛ وہ معمولی کاروبار اقتصادی میں کیونکر دلچسپی لے سکتا ہے؟ ایک مصور تصویر بنا سکتا ہے، لیکن وہ ارسطو اور بقراط، یا ہربرٹ اسپنسر کی تھیوریوں (نظریات) پر جرح کر بحث نہیں کر سکتا۔ اس کا قلم خط و خال اور نقش و نگار کی وضاحت تو کر سکتا ہے مگر سقراطی قیاسات کا حامل نہیں ہو سکتا!

ایک لوہار اور بڑھئی دنیا کے فوائد کا اعلان تو دے سکتا ہے اور چند ایسی چیزیں بھی بنا سکتا ہے، جو عام کاروباری زندگی میں مدد رساں ہوں، لیکن کانٹ اور برکلے کے دور دراز قیاسات کا معلن نہیں ہو سکتا! اس کا دماغ کام کرنے کے واسطے زیادہ ترموزوں ہے، خیال پروری کا عادی نہیں؛ اس کی خیال پروری اس حد تک ہوگی جو عام دنیا کے فوائد کی حامل اور محرک ہو سکتی ہے۔ وہ ان خیالات کا حامل اور محرک نہیں ہو سکتا جو دماغ سے پیدا ہو کر دماغ ہی میں ختم ہو جاتے ہیں اور سوائے چند لفظی بحثوں کے اور کوئی سبیل اور کوئی نتیجہ نہیں رکھتے۔

اعلیٰ تعلیم کی ضرورت

اعلیٰ تعلیم کی ضرورت سے ہمیں انکار نہیں جیسے اس بات سے انکار نہیں کہ قوموں کے افراد میں بہت سے افراد کو دولت مند، اور خصوصیت سے ممتاز ہونا چاہیئے لیکن اسکا منشا یہ نہیں ہو سکتا کہ وہ افراد جو دنیا کی بوقلموں منڈیوں کی رونق اور اعتبار کے موجب ہیں ان کا وجود ہی نہ ہو۔ امتیازات خاصہ کے ساتھ امتیازات عامہ کی بھی سخت ضرورت ہے۔ دماغ اور دل کے ساتھ ہاتھوں اور پاؤں کی بھی ضرورت ہے۔ یہ وہ جوارح ہیں جن پر خصوصیت سے ممالک اور قوموں کی ترقی اور عروج کا مدار ہے۔ ہمارے ملک میں اول تو تعلیم کا چرچا ہی نہیں ہے؛ چرچا ہونے پر وہ پود اور وہ گروہ جو اقتصادیات اور عام کاروباری زندگی میں مفید ثابت ہو سکتا ہے دن بدن دم توڑ رہا ہے۔ تعلیم حاضرہ سے دو ہی اغراض وابستہ ہوتے ہیں۔

(۱) محض ڈگریاں۔

(۲) ملازمت۔

کیا ان دونوں اغراض اور خواہشات کے تحت ہندوستان ترقی کرسکتا ہے؟ ایک تیسری شق اور بھی ہے وہ پالٹکس (سیاسیات) کا مشغلہ ہے. بعض لوگ اب اس مرحلہ میں بھی قسمت آزمائی کرتے ہیں. ہرشخص اعلیٰ اور متوسط یا کم تعلیم پاکر یہی چاہتا ہے کہ یا تو ڈگری سے مستفید ہو' اور یا سرکاری نوکری مل سکے. فیصدی چار بھی تجارت اور اقتصادیات کی جانب متوجہ نہیں ہوتے۔

دیکھو تو سہی

ڈگری یافتگاں میں سے اب تک کتنے ایسے افراد ہیں جو اس ملک اور ان قوموں میں رہکر موجد اور صناع ثابت ہوئے ہیں؟ یا جنھوں نے کالجوں سے نکلتے ہی تجارت اور اقتصادیات کی جانب رجوع کیا ہو اور ابھی کس حد تک انہیں کامیابی بھی ہوئی ہو فیصدی دو بھی نہیں. کیا اس پر ہم اور ہماری قومیں ترقی پاسکتی ہیں یا وہ آسایش مل سکتی ہے جو چاہیئے؟

ہندوستان کی سرزمین میں اگر اس وقت فیصدی (۵) بھی ڈگری یافتہ سمجھہ لو تو ان میں سے فیصدی ایک بھی ان راہوں سے گزرنا پسند نہیں کرتا ان سب کے عموماً مطمح نظر رہ کر یہی ہوتا ہے کہ کسی دفتر کی کرسی مل جائے یا زیادہ سے زیادہ وکیل ہوکر روپیہ کمائیں۔

لسان الملک کی صدا لسان الملک کی صدا اسوقت کیا ہے؟ یہ کہ ملک اور قوموں کے بچوں میں سے فیصدی ۷۵. اقتصادیات اور تجارت اور دیگر کاروباری زندگی کے کاموں اور ضروریات میں حصہ لیں کیونکہ بغیر اس کے قوموں اور ملک کی ترقی نہیں ہوسکتی' اور نہ وہ بات حاصل ہوسکتی ہے جو چاہے. لوگ لسان الملک کی

صدا نہیں سنتے، اور اگر سنتے ہیں تو اس پر غور نہیں کرتے۔ سنو سنو! ملک اور قوموں کی زبان اور لسان سے کیا کچھ الفاظ اور فقرات نکلتے ہیں اور ان کا مطلب کیا ہے؟ اعلیٰ تعلیم اور ڈگریاں علمی امتیازات، موتی اور جواہر ہیں لیکن ہر شخص کی پگڑی اور دستار میں موتیوں اور جواہرات کا طرہ نہیں لگ سکتا، اور نہ ہر ایسا طرہ باز کاروباری زندگی، تجارت اور اقتصادیات میں محرک آسایش اور موجب ترقی ہو سکتا ہے۔ موتیوں اور جواہرات کے طرے بھی اسی صورت میں زیب دستار ہو سکتے ہیں کہ جب خال خال ہوں۔ اگر سب کی پگڑیوں میں موتی اور جواہرات ہی ہوں تو امتیاز کہاں رہے گا؟

نظیر

یورپ، بالخصوص انگلستان کی نظیر ہی لے لو، جہاں باوجود اسقدر زور و قوت تعلیم و تدریس کے بھی بمشکل دس فیصدی اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ڈگری یافتہ نہیں ہوتے۔ ان میں سے فیصدی (۵، ۷) گویا اقتصادی اور تجارتی شاخوں میں لگ کر ملک و قوم کی مزید آسایش کا موجب اور محرک ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ کاروباری طبقوں میں فلاسفروں کی ضرورت نہیں ہے، سائنس دانوں اور اقتصادیوں کی ضرورت ہے۔

سرمایہ داری

ہمارے لوگ کہا کرتے ہیں کہ جب تک سرمایہ نہ ہو تب تک ہم کس طرح اقتصادیات اور تجارت میں حصہ لے سکتے ہیں؟ الحق سرمایہ اور سرمایہ داروں کی بھی ضرورت ہے۔ لیکن ہم سست بھی بہت کچھ واقع ہوئے ہیں۔ جن کے پاس سرمایہ ہے وہ کب ان راہوں سے گزرنا پسند کرتے ہیں؟ ان کی بھی ہمتیں نہیں بندھتیں! وہ بھی تو تھیوریوں (نظریات) ہی میں بسر کرتے ہیں۔ سرمایہ دو قسم کا ہے

ایک سرمایۂ شخصی۔

دوسرا سرمایۂ قومی۔

ہم ان دونوں سرمایوں کے وجود سے انکار نہیں کر سکتے۔ بعض شخصیتیں اس وقت شخصی

سرمایہ ہی رہتی ہیں، اور اس کے مقابلہ میں اگر ہم قومی سرمایہ کی بنیاد رکھنی چاہیں تو وہ بھی کسی نہ کسی پہلو سے اٹھ سکتے ہیں، صرف توجہ درکار ہے۔ سال بھر میں کوئی دس بارہ ہزار کے قریب لڑکے انٹرنس پاس کرتے ہیں، اگر ان میں سے ہر سال ایک ہزار اور کم سے کم پانسو طالب علم ہی مشترکہ طور پر کوئی تجارتی اور اقتصادی کام شروع کریں تو کتنا بڑا سرمایہ ہو سکتا ہے؟ اور کس قدر لوگ ہر سال کام میں لگ سکتے ہیں۔ مگر ایسا کون کرے؟ ہر شخص کو تعلیم سے فارغ ہونے کے ساتھ ہی کچہریوں کی کرسیاں تلاش کرتا ہے، دفتروں کی لذتیں ہر وقت زبان پر رہتی ہیں۔ بہرحال صرف ابتدائی تعلیم یافتگاں ہی نہیں بلکہ ڈگری پانے والے بھی فیصدی (۷۵) عموماً یہی راہ لیتے اور اسی کے کشتہ ہیں۔

تعلیم کی حدیں تعلیم کی حدود ایک سی نہیں ہیں۔ کوئی حد کسی جگہہ ختم ہوتی ہے اور کوئی کسی جگہہ۔ ہر حد میں ہمارے داخلہ کی ضرورت ہے۔ لیکن ہر شخص داخل ہونے والے کو چاہیے کہ ضروریات عائدہ کے مطابق داخلہ کی سند حاصل کرے مختلف ابواب میں سے گزرنا واجب ہے۔ اگر سب لوگ ایک ہی دروازہ سے گزریں گے تو راستہ تنگ ہو کر تکلیف کا موجب ہوگا۔ جداگانہ ابواب ہیں، اور تم بھی جداگانہ ابواب ہی سے گزرو اور دیکھو کہ اس کے اندر کیا کچھہ مہیا کیا گیا ہے۔ ؎

صد نقش بستہ اند پس پردۂ امید الا کہ از درمژہ برہم زدن میا

قدرت نے جو مختلف ابواب دار دنیا میں رکھے ہیں وہ ہمارے بند کرنے سے بند نہیں ہو سکتے، اور وہ اس واسطے بنائے گئے ہیں کہ ان سب میں سے اپنے اپنے مذاق اور ضرورت کے مطابق گزریں۔ ہر شخص یہ حق رکھتا ہے کہ کسی نہ کسی دروازے سے گزرے اور کار کر کے دکھائے، لیکن ہر شخص یہ حق نہیں رکھتا کہ صرف ایک ہی دروازے میں سے گزرنے کا قصد کرے۔ کیونکہ اس طریق عمل سے دوسرے ابواب کی بندش لازم آئے گی۔

وہ کرو جو

زمانہ چاہتا ہے! اگر زمانہ اعلیٰ تعلیم کی درخواست کرتا ہے تو وہی حاصل کرو اور اگر اس کے ساتھ ہی کچھ اور بھی چاہتا ہے تو وہ بھی کر کے دکھاؤ تاکہ تمہیں ہر پہلو سے بمصداق

تمتع زہر گوشۂ یافتیم

فائدہ اور آسایش اٹھانے کا موقع مل سکے۔ فقط

جذبات مزاج

از جناب مولوی سید نثار احمد صاحب مزاج دوم تعلقدار ضلع رائچور

وہ حسن عالم آرا کب بے نقاب ہوگا
ناکامیاب حسرت کب کامیاب ہوگا

کب تک عدو کی خاطر مجھ پر ستم رہیگا
اس ظلم ناروا کا کب سدِّ باب ہوگا

چتون پھری ہوئی ہے بگڑے ہوئے ہیں تیور
جاں پر بنے گی کس کی کس پر عتاب ہوگا

اپنی تو عمر ساری ناکام ہی گذری
جو کامیاب ہوگا وہ کامیاب ہوگا

جنت کے گلستاں سے پھینکے گئے جہاں ہیں
اب اور اس سے بڑھکر کیا انقلاب ہوگا

آتے ہیں اوسکو اے دل سو ڈھنگ دلبری کے
بیشک فسونگری میں وہ لاجواب ہوگا

مہماں اگر ہوئے ہیں وہ خواب میں عدو کے
خواب عدو بھی میری تعبیر خواب ہوگا

مرنے کے بعد میں ہوں اور میرا داغ دل ہے
میری لحد پہ روشن یہ آفتاب ہوگا

ارتقاءِ حرّیت

حریت یا آزادی کا مفہوم

حریت یا آزادی ایک کیفیت ہے، اور کیفیات کا لفظی تعریف میں محدود کرنا دشوار ہے، اس لئے آزادی کی بھی صحیح تعریف کرنا دشوار ہے۔ ہم مثالوں کے مشاہدے سے آزادی کا خیال ذہن نشین کر سکتے ہیں، لیکن ہمارا علم اس کے متعلق غیر تیقن ہے۔ خود لفظ آزادی پر اگر غور کیا جائے تو وہ وسیع معنوں میں اپنی حقیقی کیفیت کو ظاہر نہیں کرتا۔ مختلف زبانوں میں جسقدر الفاظ آزادی کے معنوں میں مستعمل ہیں، اُن سب کی یہی حالت ہے۔ آزادی کے مفہوم کو ذہن نشین کرنے کے لئے پہلے ہم امتحاناً اس کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:-

"خارجی دباؤ کی عدم موجودگی میں اپنے حسب مرضی کام کرنیکے حق یا اقتدار کو آزادی کہتے ہیں۔ . . . . "

انگریزی کا محاورہ ہے کہ فلاں شخص ایسا آزاد ہے جیسے ہوا۔ یہ انتہائے آزادی کی مثال ہے، اس لئے کہ عام خیال کے موافق ہوا جس رخ پر چاہتی ہے چلتی ہے۔ لیکن یہ خیال بھی غلط ہے، کیونکہ ہوا کا چلنا بہت سے قوائے عالمہ کے تابع ہے، جیسے آفتاب، سمندر، صحرا وغیرہ۔ بہرنہج اتنا تو ہے کہ جس انسان کو ہوا کی طرح آزاد کہا جائے اسکی نسبت یہ قیاس قایم ہوسکتا ہے کہ وہ تمدنی قیود سے اس حد تک آزاد ہے جتنا کہ ایک صحرانشین جوگی ہوسکتا ہے۔ یا جس طرح ایک شاعر وہی دنیا میں رہکر اپنی نسبت فخریہ کہتا ہے۔

وہ گدا ہوں جانتا آپ کو سلطانِ وقت ✤ سر پہ جبتک چتر نیلی یہ نیاں گردش میں ہے

شاعر کا منشا اس کہنے سے یہی ہو سکتا ہے کہ وہ آزاد ہے اوس پر کوئی خارجی دباؤ نہیں ہے' وہ جو چاہے کر سکتا ہے' وہ اپنی طبیعت کا آپ مختار اور بادشاہ ہے؟ یا جیسے ایک دوسرا شاعر کہتا ہے۔

چل کے اب ایسی جگہہ رہیئے جہاں کوئی نہ ہو
ہمنشیں کوئی نہ ہو ہمداستاں کوئی نہ ہو

غور کرو تو اس رُہبانی آزادی کے معنے یہی ہوئے کہ بنی آدم ایک دوسرے سے قطع تعلق کر کے ذرات منتشر کی طرح صحراؤں اور جنگلوں میں پھیل جائیں اور اون کا بڑا حصہ روزانہ صحرائی درندوں کی غذا بنتا رہے! مگر کیا اس حیوان متمدن سے' جسمیں فطرت نے انس واجتماع کا مادہ کوٹ کوٹ کے بھرا ہے' یہ ممکن ہے کہ وہ اس طرح کی زندگی اختیار کر سکے؟ نہیں اور کبھی نہیں! اس لئے کہ خاندان کے وجود میں آتے ہی اس طرح کی رُہبانی آزادی کافور ہو جاتی ہے' اور جہاں ہم نے اجتماع کو تسلیم کیا' چاہے وہ دو ہی آدمیوں کا اجتماع کیوں نہ ہو' اس کے یہ معنے ہوں گے کہ ہم نے محدودیت اور بیرونی دباؤ کو تسلیم کر لیا' طوعاً کیا ہو یا کرہاً۔

اس صورت میں ضرور ہوا کہ ہم اپنی پہلی تعریف آزادی میں ہیئت اجتماعی کے زیر اثر ترمیم کریں۔ کیونکہ ہیئت اجتماعی کی صورت میں اگر آزادی کا وجود مان لیا جائے جب بھی کسی نہ کسی درجہ کے بیرونی دباؤ کا موجود رہنا لازمی ہے۔ مذہب تعلیم دیتا ہے کہ خدا کی بندگی کامل آزادی ہے۔ پھر کیا ہمارے تخیل آزادی سے خدا کی بندگی کا بیرونی دباؤ خارج ہے۔ کیا اس بندگی الہی کا محرک طبعی میلان ہے یا محض جبری تعمیل احکام کے طور پر ہم اس طریق عمل کو اپنی زندگی کا حقیقی مقصد سمجھے ہیں؟ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اوس بندگی میں جو کامل آزادی کا حکم رکھتی ہے استدلال۔ دلی میلان اور خارجی دباؤ باہم مل کر اس طرح کام کرتے ہیں جسکا ہمکو احساس بھی نہیں ہوتا' اور ہم نہایت خوشی سے

بلا جبر و اکراہ فرایض بندگی ادا کرتے ہیں۔ غرض جبکہ میلان طبعی اور احکام خارجی اسطرح شیر و شکر ہو جائیں اور ان کی خواہش عمل اتنی قوی ہو کہ بیرونی دباؤ کا احساس باقی نہ رہے اوسوقت کہا جائے گا کہ کامل آزادی حاصل ہے۔ کامل آزادی سے مراد جبری اطاعت نہیں ہے چاہے وہ خدا کی بندگی ہی کیوں نہ ہو! جو آزادی طمانیت قلب کے لئے لازمی ہے، اس سے مراد وہ طرز عمل ہے جو اتحاد مستقیم پر مبنی، اور جبر و اکراہ سے بری ہو، اور جس کی وجہ سے آزادی اطمینان قلب یا مسرت حقیقی کی شرط لازمی ہو جائے اس لئے بغیر ایسی آزادی کے جو حقیقی مسرت کی شرط لازمی ہو انسانی شخصیت کا کامل ارتقا ناممکن ہے یہاں پر مسرت کی تعریف جو معلم اول ارسطو نے کی ہے لکھدینا ضروری ہے۔ وہ کہتا ہے کہ "مسرت انسان کے قوائے عملی کو اس خوبی سے کام میں لانے کا نام ہے کہ ان کے کامل ارتقا کے لئے راہ پیدا ہو سکے" دوسرے لفظوں میں اسی مفہوم کو اس طرح ادا کر سکتے ہیں کہ "مسرت انسان کی کامل ارتقائے شخصیت میں مضمر ہے"۔

اوپر کے استدلال سے ہم اس نتیجہ پہ پہنچتے ہیں کہ کامل آزادی تو اسی طرح النادر کالمعدوم کا حکم رکھتی ہے جس طرح مسرت۔ لیکن دونوں کا ادراک ان کے شیون سے ہو سکتا ہے۔ حقیقی آزادی اور حقیقی مسرت کا وجود ممکن ہے کہ کسی ایسے عالم میں ہو جسکو عالم مثال، بہشت یا عالم ملکوت کہا گیا ہے، اور جہاں صرف آسمانی فرشتے یا مجرد روحیں رہتی ہوں گی۔ لیکن دنیائے متمدن میں تو یہ ناممکن ہے کہ لاتعد آدمیوں کی قوت استدلال اتنی قوی اور ضمیری احساس ایسا صحیح ہو کہ ان کے عمل کو صحیح راستہ پر لانے کے لئے بیرونی دباؤ کی حاجت نہ ہو۔ شاذ و نادر ہی دماغ ایسے ہوتے ہونگے جن کے تخیلات و احساسات بجائے خود قانون کا حکم رکھتے ہوں، اور وہ اپنی شخصی قوت سے اعلیٰ ترین اصول کی فضا میں داخل ہو کر آزادی کی تکمیل کر سکتے ہوں، ورنہ ایسے تو بہت ہیں جو آزادی کے لئے سعی ضرور کرتے ہیں، مگر ان کی سعی مشکور ہونے کے

بجائے بے اعتدالیوں سے ٹکرا کر چور چور ہو جاتی ہے، اور موجودہ جماعتی اصول و قوانین ہی ان کی حد پرواز سے بالاتر ثابت ہوتے ہیں۔

یہ بدیہی بات ہے کہ آزادی مختلف شیون رکھتی ہے اور اس کی جھلک انسانی زندگی کے ہر پہلو میں نظر آتی ہے۔ مثلاً ہم ایک انسان کو آزاد یا حُر کہہ سکتے ہیں جبکہ وہ معمولی معاشرتی اور قانونی دباؤ سے بری اور اپنا آپ مالک ہو۔ یعنے وہ اپنی مرضی سے سوچ سکتا ہو، بول سکتا ہو، کام کر سکتا ہو، اپنی روزی آپ کماتا ہو، قانون کی نظر میں اس کے حقوق دیگر شہریوں کے مساوی ہوں، وہ جس مذہب یا طریق کو چاہے اپنی خوشی سے اختیار کر سکے اور جس عقیدے یا اصول کو چاہے اپنے اختیار سے ترک کر سکے۔ اسی طرح وہ رعایا آزاد کہلائے گی جس کا ہر بالغ و عاقل فرد حکومت میں آواز رکھتا، اور حکومت کے طریق عمل کو اپنے نقطۂ خیال کے موافق کرنے کے لئے لوگوں کو اپنا ہم نوا بنانے کی کوشش کر سکتا ہو۔ یوں ہی وہ قوم آزاد کہی جائے گی جس کے امور داخلی و خارجی کا انصرام بغیر کسی دوسری قوم کی مزاحمت و مداخلت کے اس کی اپنی صوابدید کے موافق انجام پاتے ہوں۔ ان کے علاوہ آزادی کی اور بھی صورتیں ہیں۔ خانگی آزادی جیسے زن و شوہر اور ولد و والد کے حقوق میں ایک دوسرے کی عدم مداخلت، اقتصادی آزادی یعنے اجرت، مزدوری، تجارت، حرفت وغیرہ کے حقوق کے تعین کی آزادی، معاشرتی آزادی یعنے رسوم و قیود ملی و مقامی کے ترک و اختیار کی آزادی۔ یہ تمام صورتیں آزادیوں کی ایسی ہیں کہ ایک کو دوسرے سے کچھ تعلق نہیں۔ آزادی کی مختلف صورتوں میں ترقی ضرور ہوئی ہے، لیکن یہی کہ اگر ایک ملک نے ایک طرح کی آزادی میں قدم آگے بڑھایا ہے تو دوسرے نے دوسری میں اگرچہ اس مضمون میں صرف آزادی ملی سے بحث کرنا مقصود ہے لیکن اسی ضمن میں بعض دوسرے اقسام آزادی کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے خصوصاً دماغی آزادی کو جس کے بغیر قومی و ملی آزادی وجود ہی میں نہیں آسکتی۔

اقتدار کی ماہیت

اب ہم مضمون کو آگے بڑھانے سے پہلے اقتدار و بندگی کی ماہیت پر نظر ڈالیں گے - ایک حکیم کا قول ہے کہ آدمی آزاد پیدا ہوا ہے پھر بھی وہ ہر جگہہ زنجیروں میں جکڑا ہوا دکھائی دیتا ہے. لیکن تجربہ کہتا ہے کہ اس قول کو پلٹ کر یوں کہنا چاہیئے کہ آدمی پا بہ زنجیر پیدا ہوا تھا مگر وہ رفتہ رفتہ آزادی حاصل کرتا جاتا ہے اقتدار کی سب سے ابتدائی صورت کی نسبت یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہا جا سکتا، لیکن قرین قیاس یہ ہے کہ اقتدار کا جذبہ ابتداءً ماں کی اوس محافظتی قوت سے پیدا ہوا جو اوس کو اپنے بچوں پر حاصل ہوتی ہے، اور کہیں کہیں، اس سے گھٹ کر، باپ کو. جیسا کہ بعض اُن حیوانات میں پایا جاتا ہے جو خلقتاً انسان سے بہت دور نہیں ہیں. دوسری طرف حشرات کے اُن گروہوں کو دیکھئے جو انسان سے بہت پست درجے میں ہیں. جیسے چونٹیاں اور شہد کی مکھیاں، جنہوں نے غالباً انسان کے صفحہ ہستی پر نمودار ہونے سے بہت پہلے سے گروہ بندی یا ہیئت اجتماعی اختیار کر رکھی ہے. اور اگرچہ ان کا مقصود اس گروہ بندی سے خاندان کی حفاظت ہے، مگر ان کی ملکہ کی نسبت بمشکل یہہ کہہ سکتے ہیں کہ اسکو کوئی اقتدار حاصل ہوتا ہے. اس سے بھی کم اقتدار نردں کو ہوتا ہے جو مدت کیلئے منتخب ہو کر بعد میں قتل کر دیے جاتے ہیں. انسان کی صورت میں ہم، بہر نوع، والدین کو اقتدار کے ابتدائی مجسمے فرض کئے لیتے ہیں. اور یہ اس لئے کہ ان کو نوزائیدہ بچوں کی پرورش اور حفاظت کی قدرت حاصل ہوتی ہے؛ اور جہاں وہ ان کو خطرے سے بچاتے اور ان کی حیات کی حفاظت کرتے، وہاں غصے اور سوء مزاجی کے وقت سزا دیتے اور زجر و توبیخ سے بھی کام لیتے. بچے ان کی اطاعت کرتے، کچھہ تو اس وجہ سے کہ حصول غذا اور دفع مضار کا وہی ذریعہ ہوتے، وہی ان کے دوزخ کو پاٹ سکتے اور وہی سردی گرمی، درندوں اور موذی جانوروں سے انکی حفاظت کر سکتے تھے؛ اور کچھ اس لئے کہ اگر وہ خلاف اطاعت عمل کرتے تو خود والدین ہی سے ان کو صدمہ پہنچنے کا خوف

بہتا تھا. ازمنہ قبل تاریخ کے خاندانوں میں طرح طرح کے اجرام اقتدار کا ہونا ضروری ہے' اور آج بھی اگر دیکھا جائے تو اُن گروہوں میں بھی' جو ابتک ابتدائی حالت وحشت میں ہیں اقتدار پایا جائے گا. اس لئے کہ بغیر اقتدار کی موجودگی کے انسانی جماعتوں کا ارتقائے تمدن خارج از قیاس معلوم ہوتا ہے۔

محض معمولی سلسلۂ تناسل وتوالد' ازدواج باہمی اور امتداد زمانہ کی وجہ سے خاندانوں نے فطری طور پر ترقی کر کے قبائل کی صورت اختیار کی' جیسے ہرنوں' بھیڑوں' اور دیگر جماعتی حیوانوں کے گلے بن جاتے ہیں' جن کا مقصد مشترکہ کوشش سے غذا حاصل کرنا اور ایک دوسرے کی حفاظت کرنا ہوتا ہے. بالکل جانوروں کے گلوں کی طرح قبائل میں بھی یہ ہوتا ہے کہ قبیلے میں جو فرد' یا مجموعہ قبائل (قوم) میں جو قبیلہ سب سے زیادہ حفاظتی یا جارحانہ قوت رکھتا ہو وہ سردار تسلیم کیا جاتا ہے' یعنے دوسروں پر اُسکو تفوق اور سبقت حاصل ہوتی ہے. ابتدائی زندگی میں حصول غذا کی صلاحیت کے بعد طاقت اور جارحانہ قوت کو تقدم حاصل ہوتا ہے' اور جو فرد یا مجموعۂ افراد زیادہ طاقتور اور جنگ کے لئے اصلح ہو وہ بہت جلد امتیاز حاصل کرلیتا ہے کیونکہ حصول غذا کی جدوجہد استمراری اور معین اندازہ پر ہوتی ہے' مگر جنگ کا خطرہ اضطراری اور غیر معین ہوتا ہے' اور اُس پر فوری حیات وممات کا دارومدار ہے.

خطرہ جب مشترکہ ہو تو زیادہ تر انسان اور انسان کے باہمی سلسلۂ اتحاد کے مستحکم بنانے کا باعث ہوتا ہے. مشترکہ مراتع ومزارع کے خیال کے مقابلے میں' اندرونی حفاظت کا احساس اور خارجی جبر کی مدافعت کا خیال' زیادہ سرعت اور مضبوطی کے ساتھ قبائل کو اقوام میں اور اقوام کو ملک میں متحد کرنے کا باعث ہوتا ہے۔

بس یہی جبر خارجی کی مدافعت کا احساس تھا جس نے اُس شخص کو' جو دشمن کے مقابلہ میں قبیلے کی حفاظت سب سے بہتر طریقے پر کر سکتا تھا. برتری واقتدار کے

سب سے اونچے درجے پر پہنچایا' اور اُس کے ہمجنس اُس کی دفاعی اور جارحانہ طاقت کی پناہ حاصل کرنے کے لئے اوسکو سب سے زیادہ امتیازات، حقوق، اور مقبوضات دینے پر بخوشی رضامند ہو گئے۔ رفتہ رفتہ وہ مذہبی اقتدار کا بھی حامل ہو گیا، وہ اپنی طاقت کی بدولت موید من اللہ اور اوس کی قربانیاں مقبول بارگاہ خداوندی سمجھی جانے لگیں۔ یعنے یہ سمجھا جانے لگا کہ جو قوت یا قوتیں مافوق الفطرۃ ایسی ہیں جن کا ہاتھ انسانی کاموں کے بنانے اور بگاڑنے میں شریک ہے، یہ شخص اُن سے قریب تر ہے اور اون کو اپنے حسب مراد رضامند کر سکتا ہے تاکہ وہ دشمن کے مقابلے میں اس کی تائید کریں۔ اور جب فی الواقع اسکو دشمن کے مقابلے میں فتح حاصل ہوتی تو اوس کی روحانیت اور تقرب بہ قوائے الٰہیہ کا اعتقاد اور بھی قوی و راسخ ہو جاتا۔ خصوصاً مفتوح قوم کے دلوں میں، جو اس کے حالات طفولیت سے ناواقف ہوتے۔ فتح کی یادگار یا اعزاز میں اسکو چھڑیاں، عصے، امتیازات (طرّے وغیرہ) دیئے جاتے جنہوں نے بالآخر عصائے سلطنت، تاج خسروانی، اور شمشیر سپہبدی کی صورت اختیار کی، اور اس طرح شاہی کی بنیاد قائم ہوئی، اور یہ شخص بادشاہ ہوا۔

دنیا کی ہر ابتدائی قوم میں اس طرح کی صورتوں کا پیش آنا بہت قرین قیاس ہے۔ اس کی مشہور تاریخی نظیر ہمارے سامنے بنی اسرائیل کی ہے، جنہوں نے باوجود الٰہی احکامات کے اور باوجود فہمایش و ہدایت کے اس پر اصرار کیا کہ دوسری قوموں کی طرح ہمکو بھی بادشاہ چاہیئے۔ اُن سے کہا گیا کہ بادشاہ کو اپنے اوپر مسلط کر لینے کا نتیجہ یہی ہوگا کہ تم اس کے غلام اور تمھاری عورتیں اس کی کنیز ہو جائیں گی۔ لیکن انہوں نے نہ مانا اور اسی پر اڑے رہے کہ مثل دوسری قوموں کے ہم کو بھی ایک بادشاہ چاہیئے جو ہمارے نزاعات باہمی کو فیصل کرے اور ہمارے لئے دشمن سے برسرپیکار ہو۔ غرضکہ ہدایت وتلقین ایک نہ چلی اور اپنی ہی بات و رہی۔

بعض حکما کی رائیں حاکم و محکوم کے تعلقات کے متعلق اسی طرح کے تاریخی واقعات پر مبنی ہیں چنانچہ ہابس کا عقیدہ یہ تھا کہ رعایا کو چاہیئے کہ اپنے تمام حقوق بادشاہ کے ہاتھ ہیں دیکر اُس کی کامل اطاعت کا قلادہ گلے میں ڈال لے۔ وہ لکھتا ہے کہ:-

"میثاق سلطنت اس طور پر موثق ہونا چاہیئے کہ ہر شخص ہر شخص سے کہے کہ میں اپنے حکومت کرنے کے حقوق کو' جو مجھے اپنے نفس پر حاصل ہیں' اس شخص کے یا اس جماعت کے سپرد کرتا ہوں' اس شرط پر کہ تو بھی اپنے ایسے ہی حقوق اُسکو سپرد کردے' اور اوس کے تمام احکام کو بری طرح تسلیم کرے"۔

اسی سلسلے میں وہ اس جماعت یا ہیئت دستوری کو خداے مجازی ٹھہراتا ہے جو خداے حقیقی کے بندوں کے امن و امان کی ذمہ دار ہے۔ اگرچہ ہابس اپنی تقریر میں ہیئت اجتماعی یا دستوری کا ذکر کرتا ہے لیکن حقیقت میں اُس کی مراد بادشاہی یا شخصی حکومت کی تائید کرنا ہے' اور اگرچہ وہ اس کا مقر نہیں ہے کہ اس کا یہ نظریہ قدیم تاریخی واقعات پر مبنی ہے لیکن اس سے اغماض نہیں کیا جاسکتا کہ وہی باسی آش اس کاسہ میں بھری ہے' اور یہ وہی شکل ہے جو زمنہ قبل تاریخ میں صورت پذیر ہوا کرتی تھی یعنے افراد جماعت کی شخصی آزادیوں کا ایک فرد واحد کے زیر اثر دیا جانا جو سرپنچ' مکھیا' سردار' راجہ' یا بادشاہ کہلاتا تھا' اور جو اس کا ذمہ دار ہوتا تھا کہ اپنے گروہ قبیلے یا اقوام کے افراد کی اجنبیوں اور دشمنوں سے حفاظت کرے' اور جس کے صلے میں اسکو ہدایا' امتیازات اور مقبوضات پیش کیے جاتے تھے۔ اس سے بڑھکر یہ ہے کہ ہابس کے خداے مجازی کا مفہوم اُن خیالات سے قریب تر ہے جو زمنہ نامعلوم سے بادشاہ کی الوہیت کے متعلق دنیا کے اکثر حصوں میں پائے جاتے تھے اور اُس کے شخص و نفس کو پاک و بے خطا سمجھا جاتا تھا۔ یہی خیالات تھے جن کی بدولت شاہی اقتدار یہاں تک نوبت پکڑتا تھا کہ وہ اپنے ملک اور اپنی رعایا و برایا کا مختار کل ہوا کرتا تھا' وہ اُن کے جان و مال کا

مالک تھا وہ جو چاہتا قانون بناتا اور جس قانون کو چاہتا توڑ دیتا۔ وہ قوم تھا، وہ ملک تھا، وہ سلطنت تھا، غرضکہ جو کچھ تھا وہ اسی کی ایک ذات تھی۔ جبھی تو فرانس کے لوئی چہاردہم نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ سلطنت! سلطنت کس کو کہتے ہیں؟ میں سلطنت ہوں" لیکن کسی کی یہ ہمت نہ پڑی کہ اوس سے اس جملے کے معنے پوچھے یا اس دعوے کی مصنوعی حقیقت سے انکار کرے۔ جری سے جری اور بہادر سے بہادر آدمی بھی بادشاہ کے احکام سے سرتابی تو کجا آنکھ بھر کے اُس کی طرف دیکھنے کی بھی جرات نہ کرسکتا تھا یورپ اور امریکہ سے باہر یہ خیالات نہایت مضبوطی کے ساتھ اب تک لوگوں کے دلوں میں جاگزین تھے مگر غیر یورپینوں میں جاپان کی حالیہ فتح نے قسطنطنیہ سے پکینگ تک ایک نئی لہر جد وجہد آزادی کی دوڑادی۔ بریں ہم اب تک جاپان کے جنرل سرکاری تحریرات میں اپنی فتوحات کو شہنشاہ کے تقدس مآب شخصیت کے اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں جس سے اُسکی شان الوہیت کی جھلک پائی جاتی ہے۔ یورپ سے بھی اس خیال کا قطعی استیصال ابھی تک نہیں ہوا ہے وہاں بھی روس کی شکست کو زار کی بداعمالیوں کا نتیجہ سمجھا جاتا ہے اور جنگ عظمیٰ کے نتایج بد کا ذمہ دار قیصر کو ٹھرایا جاتا ہے یہی نہیں بلکہ جہاں دستوریت ہے اور بادشاہ محض برائے بیت ہوتا ہے وہاں بھی لوگ اُس کی تقدس مآبی کے قایل ہیں۔

اگرچہ شاہی اقتدار کی قوت و طاقت بہت بڑھی ہوئی ہے لیکن شخصی اقتدار محض اسی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ علما اور ان کی جماعتیں خاندانوں کے بزرگ اور سرزادے گروہوں قبیلوں اور ملتوں کی منتخب جماعتیں یا پنچاتیں اور سبھائیں بھی کسی نہ کسی پردے میں عوام پر اپنا اقتدار جمانے کی کوشاں رہتی ہیں اور اسطرح اقتدار و آزادی کی جنگ برابر جاری ہے۔ (باقی دارد)

ضامن کنتوری

شہید وفا (مسلسل)

گذشتہ سے پیوستہ

مسعود بہ عہد ہفت سالہ — صحت اور عیش میں گزارا
اولاد بھی حق نے کی کرامت — دختر ہوئی پہلے اک عنایت
بیٹی کی صدائے گریہ جس دم — پہنچی گوشِ پدر میں پیہم
سونچا انجام کار مولود — پیدا ہوا یہ خیال محمود
جو ہو سکے بیش و کم بچائے — تعلیم اچھی اُسے دلائے
ماں باپ میں جو کسر ہے باقی — اولاد میں اس کی ہو تلافی
پورے کئے شمس نے جو دو دور — فوت ہوئی اس خیال کو اور
یعنے ایک تھا جب سفر میں — آغوشِ محیطِ پُر خطر میں
یا یہ کہ رواں میانِ بر تھا — راہ خشکی میں رہ سپر تھا
از بسکہ گزر تھا اُس کا ہر جا — بازار ہی تک نہ تھا وہ جاتا
ایک ایک گلی تھی اُسکی چھانی — سب ڈیوڑھیاں شہر کی تھیں جانی
اُسکا وہ نقرہ رنگ رہوار — اور رہ آورد بحر؎ ذخار
پہچانا ہوا تھا ہر بشر کا — تھا زینت خواں ہر ایک گھر کا
ہوتی تھی رسائی اُسکی واں پر — ڈیوڑھی ہے قدیم اک جہاں پر
طاؤس کا در پہ معرکہ ہے — ہر ایک طرف بنا ہوا ہے
اُس کی ہر جمعہ کی غنیمت — واں ہوتی تھی زیب خوان نعمت
اس حال میں جب تھی اپنی تنہا — بیٹا خالق نے اس کو بخشا

؎ مچھلیاں

نعل شب تاب ہاتھ آیا　　تنہائی کا غمگسار پایا

* * * * *

آخر آیا اک انقلاب اور　　جیسا کہ ہے اس جہاں کا طور
یاں سے کوئی پانچ کوس اُتر　　قایم ہوا اک جدید بندر
اینک اکثر وہاں تھا جاتا　　پیدل کبھی گہ براہ دریا
اکبار وہیں گیا ہوا تھا　　مستول جہاز پر چڑھا تھا
تقدیر میں رنج تھا مقدر　　اوپر سے گر پڑا پھسل کر
جب ساتھیوں نے اسے اُٹھایا　　اک پسلی کو شکستہ پایا
یوں گھر میں پڑا تھا جب وہ بیمار　　لایا نخل مراد پھر بار
پیدا ہوا اور ایک بیٹا　　بیمار و نحیف و مضمحل سا
وہ فاقہ کشی وہ تنگدستی　　حق نے دیا اُسے اور ساجھی
ہر چند کہ تھا وہ مرد ہشیار　　سنجیدہ و حق پرست و دیندار
تاہم دل میں شکوک آئے　　ہر سمت سے ابر فکر چھائے
رہنے لگا اس طرح سے بیتاب　　جیسے کوئی ہو شب کو بدخواب
تکلیف عیال کا الم تھا　　اپنی کی مفلسی کا غم تھا
کرتا تھا یہی دعا خُدا سے　　محفوظ رکھ ان کو ہر بلا سے
مجھ پر جو گزرنی ہو گزر جائے　　لیکن ان پر نہ کوئی آنچ آئے
کیا جانے وہ کون سی گھڑی تھی　　مقبول ہوئیں دعائیں اس کی
پہلے یہ جس جہاز پر تھا　　آیا اک روز مالک اُس کا
دیکھا تو بری تھی حالت اس کی　　حد سے گزری تھی عسرت اس کی
کہنے لگا اب جہاز میرا　　ہے چین کی سمت جانے والا

مدت چھ ہفتوں کی ہے باقی — تاریخ روانگی ہیں جس کی
کرتے ہو اگر قبول خدمت — ہے اک ملاح کی ضرورت
اینک یہ سن کے ہو گیا شاد — سمجھا اس لطف کو خدا داد

* * * * *

دل پر جو گھٹا تھی غم کی چھائی — وہ باد مراد نے ہٹائی
گو فکر کا اب بھی کچھ اثر تھا — لیکن وہ صرف اسی قدر تھا
جیسے ہلکا سا کوئی جھالا — سورج پہ ہو جس نے پردہ ڈالا
جس سے دریا کا آب شفاف — آتا ہو نظر کثیف و ناصاف
یوں فکر زن و خیال فرزند — دیتے تھے نہ اس کو ہونے خرسند
فرقت کا ملال جاں گزا تھا — عسرت کا خیال غم فزا تھا
ڈر تھا کہ یہ فاقوں سے مرینگے — آخر مرے پیچھے کیا کریں گے
لے دے کے تھی صرف ایک کشتی — دل سے اس کو عزیز جو تھی
کرتا تھا وہ اس طرح اسے پیار — ہو عاشق اسپ جیسے اسوار
ہرچند اسے بیچنا ستم تھا — لیکن کچھ اور تھا نہ چارہ
ٹھہری یہی رائے آخرکار — کشتی کو بیچ ڈالو ناچار
قیمت جو ملے وہ لے لوا کے — اشیائے تجارتی منگا کے
اک چھوٹی سی دکاں سجا دو — اس ڈھرّے پہ اپنی کو لگا دو
ہوں جس میں بہم وہ چیزیں ساری — ملاحوں میں ہو مانگ جن کی
فی الوقت یہ شکل ہے بسر کی — آیندہ ہو جو خدا کی مرضی
چل نکلی جو یہ دکانداری — آگے تقدیر ہے ہماری
دو چار سفر یوں ہی کریں گے — دامان مراد کو بھریں گے

سرمایہ جو ہوگیا فراہم — بیٹھیں گے وطن میں آکے خود ہم
کردیں گے وسیع کارخانہ — رکھیں گے ٹھاٹھ تاجرانہ
اولاد کو خوب دیں گے تعلیم — اچھی ان کی کریں گے تعلیم
محنت سے جو کسب زر کرینگے — راحت میں دن بسر کریں گے

* * * * *

آخر اپنیک بجائے خود جب — طے دل میں یہ باتیں کرچکا سب
آہستہ گھر کی سمت آیا — اپنی کو ملول بیٹھا پایا
آغوش میں تھا مریض فرزند — جو اسکا تھا آخری جگر بند
شوہر کی مگر جو دیکھی صورت — چہرے پر آگئی بشاشت
خوش ہو کے اٹھی قریب آئی — بیٹے کو باپ پاس لائی
مہر پدری سے بوسہ دیکر — گودی میں لیا وہ طفل لاغر
نازک اُسے ضعف سے جو پایا — دست شفقت سبک پھرایا
کی اپنی سے گفتگوئے الفت — آتی تھی جس سے بوئے الفت
حرف مطلب مگر چھپایا — کہنا چاہا پہ دل بھر آیا
دیتا خبر فراق کیونکر — بات آج کی جو تھی ٹالی کل پہ
آخر قفل سکوت توڑا — جانے کا شگوفہ اسنے چھوڑا

(باقی دارد) ضامن کنتوری

گر طبع نہ از اہل کرم رم میداشت — میداں بہ یقیں کہ سرکشی کم میداشت
از سجدۂ ہیچ کس نمی کرد ابا — شیطاں گر صحبتے بہ آدم میداشت

مرزا بیدل رح

روح کی آواز

از جناب سید مطلب حسین صاحب عالی لکھنوی

(۱)

لوگ کہتے ہیں کہ انسان فطرتاً زود سیر واقع ہوا ہے۔ کیسی ہی نعمت کیوں نہ ہو، کچھ عرصہ کے بعد اس کی طبیعت پھر جاتی ہے اور وہ نئے محبوب، نئی دلچسپیوں، اور نئی دلکشیوں کا متلاشی ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ ایسا ہوتا ہو لیکن جمیل کو یا تو فطرت نے صبر کا غیر معمولی حصہ عطا کیا تھا اور یا جدت اور تبدیل حالات سے اس کو نفرت تھی۔ وہ اپنی قسمت پر شاکر، اپنی آمدنی کو کافی اور اپنے مکان کو نہایت آرام دہ خیال کرتا تھا۔ اس کی بیوی خاتون نہ بہت حسین تھی نہ دولت مند۔ وہ غریب ماں باپ کی لڑکی تھی۔ اور جب شادی ہوئی، تو وا جبی ہی وا جبی جہیز لائی تھی۔ اس کو اتفاق کہئے یا خاتون کی بدنصیبی کہ شادی کو دس برس گزرنے کے باوجود اُس کے ہاں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جمیل نے اس پر بھی صبر کیا۔ جمیل کے بعض دوست اس بدنصیبی کا ذمہ دار خاتون کو ٹھہراتے اور عقد ثانی کی فرمائش کرتے، لیکن جمیل ہمیشہ یہ کہکر ٹال دیتا کہ "اگر یہ میری قسمت کا قصور نہ ہوتا تو شروع ہی سے کیوں ایسی بیوی ملتی؟"

غرض اسطرح ماہ و سال گزرے، زمانہ تیزی سے کسی غیر معلوم مقصد کی طرف بڑھتا رہا۔ جمیل کے قابل رشک اور قابل تقلید گھر کی خوش حالی، فراغبالی، اور میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات میں کسی قسم کا فرق نہ ہوا۔ وہ بندۂ خدا، بیوی سے اُسی پیار و محبت ملتا اور دونوں ایک دوسرے کا غم غلط کرتے رہتے۔ قصبہ کے وہ خاندان جو خانہ

خانہ جنگیوں کا مرکز بنے رہتے تھے اور جہاں اگر روزانہ نہیں تو دوسرے تیسرے ضرور کوئی نہ کوئی فساد اٹھتا رہتا، جمیل کے گھر کو رشک اور حسرت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے محلہ کے شوہر جمیل کو خوش قسمت سمجھتے کہ اسکو ایسی اچھی بیوی ملی ہے اور بیویاں خاتون کو قسمت کا دھنی کہتیں کہ اسکو ایسا اچھا شوہر ملا ہے۔

(۲)

لیکن ایک دن جب صبح صبح محلے میں یہ خبر پھیلی کہ جمیل نے اپنی بیوی کو طلاق دیدیا ہے تو سب کو تعجب تھا اور حیرت۔ مردوں نے جمیل سے پوچھا، عورتوں نے خاتون سے لیکن جواب سب کو یہی ملا کہ ”خدا کی یہی مرضی تھی، قسمت میں یہی بدا تھا۔ اس کی فکر ہی کیا ؟“ اپنی عورتوں نے جو کل تک جمیل کی تعریفیں کرتی تھیں، آج غریب پر اعتراضات کی بوچھار کر دی۔ کوئی کہتی تھی کہ ”جمیل کو اس عمر میں اولاد کی ہوس ہوئی ہے“ دوسری کہتی نہیں بھائی کوئی اور بات ہے“۔ ایک بڑھیا جسکو زبان درازی میں محلے کی تمام عورتوں پر فوقیت تھی، ہانکے پکارے یہاں تک کہ خود جمیل کے منہ پر کہتی کہ ان میاں کو بڑھاپے میں جو چونچلے سوجھے ہیں اور نئی نئی دلہن لانے کا شوق چرایا ہے“ غرض جتنے منہ اتنی باتیں جمیل سب کچھ سنتا اور ہنسکر ٹال دیتا۔ ادھر خاتون کسی کی بات کا کوئی جواب نہ دیتی۔

لیکن اب سوال یہ تھا کہ خاتون کہاں جائے اور کیا کرے ؟ قریب ہی ایک بوڑھے پیشکار رہتے تھے۔ انہوں نے ازراہ ہمدردی کہلا بھیجا کہ اگر آپ میری لڑکی کو کلام پاک اور سینا پرونا سکھانا منظور کریں تو آپ کے تمام اخراجات کا کفیل میں ہوتا ہوں۔

(۳)

بیچاری خاتون اگر اس موقع سے فائدہ نہ اٹھاتی تو کیا کرتی ! باپ چچا پہلے ہی مر چکے تھے۔ ماں نے بے کسی، بے بسی اور غربت کی زندہ اور متحرک تصویر بن کر اکلوتی بیٹی کا ساتھ دیا تھا۔ لیکن دو برس پہلے وہ بھی عالم بالا کو سدھار چکی تھی۔ خاتون نے طبیعت عورتوں کی

پائی تھی۔ لیکن صبر بعض مستقل مزاج مردوں کا سا۔ اس نے اپنی حالت پر آنسو نہیں بہائے، رونی صورت نہیں بنائی، اور نئے مکان میں پیشکار صاحب کے ہاں صبر و سکون سے زندگی کے دن کاٹنے لگی۔ باوجوادث کا پہلا جھونکا اکثر انسان کے ہوش و حواس، عقل و تدبیر سب کو کھو دیتا ہے۔ لیکن ایسا بھی ہوتا ہے کہ مصیبت کے بعد انسان میں صبر و توکل کی ایک شان پیدا ہو جاتی ہے اور وہ سخت سے سخت مصیبت کو برداشت کرنے اور کڑے سے کڑے امتحان کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ خاتون دن میں لڑکی کو پڑھاتی، اپنا سیتی پروتی اور اوپر کے کام کاج میں دوسروں کا ہاتھ بٹاتی۔ رات کو کئی کئی گھنٹے دعائیں مانگتی نمازیں پڑھتی، اور وظیفے میں مشغول رہتی۔

(۴)

جاڑا، گرمی، برسات سب یکے بعد دیگرے گزر گئے۔ لیکن خاتون کے معمول میں کوئی فرق نہ آیا۔ اس نے جو انداز پہلے دن اختیار کیا تھا اسی کو نباہتی رہی۔ ایکدن جب اسی اس حالت میں بسر کرتے کرتے کئی سال ہو چکے تھے، اور لوگ اسکی تباہی و بربادی کے افسانے کو بالکل فراموش کر چکے تھے، خاتون رات میں سوتے سے بیدار ہوئی۔ تمام عالم سائیں سائیں کر رہا تھا۔ سب لوگ غافل سو رہے تھے۔ کبھی کبھی ہوا کی حرکت سے درختوں کے پتے وغیرہ ہلجاتے تھے۔ اور پھر وہی خاموشی۔ خاتون پلنگ پر اٹھکر بیٹھ گئی۔ خواب میں اس نے محسوس کیا تھا کہ مجھے کوئی پکار رہا ہے ابھی اسے بیٹھے چند ہی سکنڈ گزرے تھے کہ کسی کی آواز کان میں پھر آئی "خاتون"

وہ اٹھی چادر اوڑھی، اور باہری دروازہ کھولکر اس میں باہر سے قفل لگایا کنجی لیے ہوئے اپنے خاوند جمیل کے گھر کی طرف روانہ ہوئی۔

(۵)

جمیل دو دن سے بیمار تھا۔ ہر وقت غشی کا عالم طاری رہتا تھا۔ ہوش حواس غائب تھے۔

خاتون دو دفعہ پکارنے کی آواز سن چکی تھی اب جو جمیل کی پٹی کے قریب پہونچی تو تیسری دفعہ اُس نے پھر وہی آواز سنی "خاتون" اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پاس رکھی ہوئی دوا جو کسی ہمسایہ کی عنایت سے آگئی تھی۔ اٹھا کر چند قطرے اُسکے حلق میں ڈالدئے۔ صراحی سے پانی پلایا اور پٹی پر بیٹھکر پنکھا جھلنے لگی جمیل سوتا رہا۔ خاتون پنکھا جھلتی رہی۔ جب چار بجے کی آواز کان میں آئی، وہ اٹھی۔ فریضہ سحری ادا کیا۔ تمام انبیا اور اولیا کا واسطہ دے دے کر جناب باری میں جو دعائیں اسنے مانگیں، وہ کس کیلئے تھیں؟ کیا جمیل کی صحت کیلئے؟

اِس کے بعد اُس نے پھر چادر اوڑھی اور جس طرح آئی تھی اسی طرح اپنی جائے قیام پر واپس آئی۔ اب اس کا یہی معمول تھا۔ کسی کو اُس کی حالت کی اطلاع نہ تھی اور شاید اپنے دل کی حالت سے وہ بھی لاعلم تھی۔

(۶)

ساتویں شب، جب خاتون حسب معمول اپنے شوہر کی تیمارداری میں مصروف تھی جمیل یکبارگی بستر پر اٹھکر بیٹھ گیا۔ اسنے اپنی نظریں، خاتون کے چہرہ پر گاڑدیں تھوڑی دیر بعد ہاتھ جوڑ کر بولا "میری خطا معاف کردو" خاتون خاموش تھی، لیکن زباں کے بجائے آنکھیں اظہار خیالات کررہی تھیں یعنے دلی جذبات آنسوؤں کی شکل میں ظاہر ہورہے تھے۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر بول نہ سکتی تھی۔ واپس آنا چاہتی تھی مگر قدم نہ اٹھ سکتے تھے۔ وہ ہاتھ سے خاوند کو اِس حرکت سے منع کرنا چاہتی تھی لیکن ہاتھ کی طاقت سلب ہوچکی تھی۔

اسی حالت میں جب آدھ گھنٹہ گزر گیا تو جمیل نے آہستہ آہستہ اور نحیف آواز میں پوچھا "کیا تم نے میری آواز سن لی تھی"؟

خاتون بھرآئی ہوئی آواز سے رُک رُک کر بولی "ہاں۔ ہاں"..................

ایسا تو ہو

از جناب مولوی سید غلام مصطفٰے صاحب ذہین

مضطرب کر دے کہانی میں اثر ایسا تو ہو
رات بھر سونے نہ دے خوفِ سحر ایسا تو ہو

نشتر ایسا دلنشیں ہو جائے جو کھٹکا کرے
لینے دے دم بھر نہ دم در جگر ایسا تو ہو

ہو نہ محتاج دوا ایسا مرض ہو لا علاج
ہو نہ ممنون مسیحا دردِ سر ایسا تو ہو

ہو تو دل ایسا کہ غم کھانے سے ہو جائے یہ سیر
تھک نہ جائے زخم کھانے سے جگر ایسا تو ہو

خانۂ دل میں رہے انوارِ عرفاں کا ہجوم
ہو سمائی اک خدائی کی یہ گھر ایسا تو ہو

سوزِ دل ایسا ہو جس سے جل اٹھیں داغِ جگر
دل لہو ہو کر بہے زخمِ جگر ایسا تو ہو

وہ نبی اپنا ہے جو محبوب ہے اللہ کا
رحمتہ للعالمیں خیر البشر ایسا تو ہو

ہم تڑپتے ہیں کہ ملجائے مگر ملتا نہیں
دل کو تڑپا دے کوئی صاحب نظر ایسا تو ہو

ہے بشر ہی اشرف مخلوق پھر اس میں ہو شر؟
آب و تاب آبرو ہو یہ گہر ایسا تو ہو

آدمیت ہی نہ ہو جس میں تو وہ کیا آدمی
شر مٹائے خیر کر گزرے بشر ایسا تو ہو

ناقصوں کی دلفریبی کیا ہنر ہے اے ذہین
عقل کامل کو تحیر ہو ہنر ایسا تو ہو

رو کھی پھیکی جو کچھ ملے شکر کرو
دینے والا جو تمکو دے شکر کرو

جمعیتِ دل ہی کا لقب ہے جنت
ہر حال میں خوش رہو۔ اے شکر کرو

ولہ

اے شیخ عبادت کا بھی تخمینہ رہے
زہد اسلئے ہے کہ قلب بے کینہ رہے

اتنا نہ رگڑ کہ ہاتھ سے دونو جائیں
نے زنگ رہے اور نہ آئینہ رہے

نقشِ قدم

باب تیسرا

اندھا راستہ

اس کپڑے کے ٹکڑے نے مجھے فکرمند کر دیا۔ کیونکہ میں اِس حقیقت کو نظر انداز نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مقتول کی مٹھی میں مضبوطی کیسا تھ بند تھا۔ دو باتیں میرے خیال میں گزریں۔ پہلے تو یہ کہ شاید مقتول اسے ہاتھ میں لے کر معائنہ کر رہا ہوگا کہ دفعتہً اس پر حملہ ہوا اور شاید یہ کپڑا کسی گزشتہ زمانہ کی یادگار ہو۔ دوسرے یہ کہ ممکن ہے کہ یہ ٹکڑا قاتل کے لباس کا ہو جو آخری کشمکش میں پھٹ کر مقتول کے مٹھی میں رہ گیا۔

یہ کپڑا سیاہ رنگ اور سادہ قسم کا تھا جیسا کہ ہزاروں عورتیں روزمرہ کے لباس میں استعمال کرتی ہیں۔ اسوجہ سے مشکل معلوم ہوتا تھا کہ اس سے سراغ رسانی میں کوئی مدد مل سکے۔ اتنا تھا کہ اس کے گوٹ نچی ہوئی معلوم ہوتی تھی، کتری ہوئی نہ تھی۔ مینے اس کی شکنوں کو صاف کیا اور تہ کر کے حفاظت سے اپنی جیب میں رکھ لیا۔ اور پھر ارادہ کیا کہ ٹریورز کو بلا لوں۔ مینے دروازہ کھٹ کھٹایا اور وہ اندر داخل ہوا۔

میں نے جوجیمس ٹریورز کے متعلق اپنے دل میں ایک معیار قایم کر لیا تھا اور اس نتیجہ پر پہونچا تھا کہ اس کی شخصیت بڑی حد تک قابل اعتنا ہے گو اب تک ایسی بات نہیں دیکھی گئی تھی جس سے اسکی فطرت پر کوئی رائے قایم کیجا سکتی۔

جب وہ کمرے میں داخل ہوا تو اُسنے چار طرف نظر دوڑائی تاکہ معلوم کرے

ہیں اتنی دیر تک اس کمرہ میں کیا کرتا رہا۔
لیکن جب اسنے کسی چیز کو درہم برہم نہیں پایا تو اُسے ضرور تعجب ہوا ہوگا۔
"فرمائیے۔ مسٹر کرافرڈ! میں آپ کی کیا خدمت بجالا سکتا ہوں" اتنا کہکر بیٹھ گیا۔
اس کی حالت سے میں اسبات کو اچھی طرح سے محسوس کرتا تھا کہ وہ بےچین ہے لیکن اسکی بےچینی بلحاظ واقعات طبعی تھی۔ اسکا چچا مارا گیا تھا، اور جرم پردۂ خفا میں تھا یہ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ قوی دل لوگ بھی ایسی حالت میں بےچین ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس بارے میں اس سے کوئی شکایت نہیں۔ البتہ مجھے اسبات سے تعجب تھا کہ اس بےچینی کا کوئی خاص سبب بھی ہے یا نہیں۔
میں نہایت بے پروائی کیساتھ ایک کرسی کو آگے کھینچکر اسکے سامنے بیٹھ گیا مگر اس طرح کہ کھڑکی سے جو روشنی آتی ہے وہ راست اوسکے چہرہ پر پڑے تاکہ میں اسکے دلی جذبات کا مطالعہ اسکے چہرہ کے تغیرات سے کرسکوں۔ یہ ممکن ہی کہ آدمی زبان سے جھوٹ کہے۔ مگر چہرے کے تغیرات کی روک تھام ذرا مشکل ہوتی ہے۔
"مسٹر ٹریور پہلے یہ فرمائیے کہ آپ کے چچا اس کمرے میں روپیہ تو نہیں رکھا کرتے تھے"
"بعض اوقات ان کے پاس بڑی بڑی رقمیں رہتی تھیں۔ لیکن میں نہیں کہہ سکتا کہ کل شب کو بھی کچھ تھا یا نہیں"
"وہ رقم کہاں رکھتے تھے؟"
"سامنے کے میز میں"
میں اُس میز کی طرف بڑھا۔ ایک چھوٹی سی کنجی اس میز کے خانہ میں لگی ہوئی تھی میں نے کنجی گھمائی خانہ آسانی کے ساتھ کھل گیا۔ لیکن خالی تھا۔
"اہا۔ یہ تو شبہہ کی بات ہے" اُسنے کہا۔

"کیونکر؟"

"جب آپ نے سوال کیا میں نے کہا تھا کہ مجھے نہیں معلوم کہ کل شب کو اسکے پاس کچھ تھا یا نہیں" لیکن اب مجھے یاد آیا کہ کل رات کو اس خانے میں کچھ رقم ضرور موجود تھی میں نے کچھ کرایے کی رقمیں سات سو تینتیس ڈالر کے نوٹ لاکر دئیے تھے ۔ انہوں نے ایک بستہ نوٹوں کا اُس خانے میں سے نکال کر میرے لائے ہوئے نوٹ اسمیں رکھکر اُس بستے کے اطراف نیلا فیتہ باندہ کر بستہ اُس خانہ میں رکھدیا تھا"۔

میں نے اس بیان کو بہت دل لگاکر سنا اور میرے ذہن میں یہ بات آئی کہ اوس نوٹوں کے بستے کیساتھ سراغ کا ایک اہم سر رشتہ وابستہ ہے۔

"مسٹر ٹریورز۔ اسوقت کیا بجا تھا؟"

"پونے دس بجے ہونگے"۔

"کیا آپ کچھ دیر سے آئے تھے؟"

"نہیں ۔ لیکن کرایہ کی رقم کو لانا بھول گیا تھا ۔ اور اپنی خواب گاہ میں جانیسے قبل مجھے یاد آیا"۔

"آپ نے کہا اون کے پاس اور بھی رقم تھی"۔

"جی ہاں ۔ مگر میں نہیں کہہ سکتا ہوں کہ کتنی تھی"۔

"کیا وہی بستہ جو سبز فیتے سے بندھا ہوا تھا؟"

"نیلے فیتے سے"۔

"ہاں ۔ نیلے فیتے سے ۔ کیا وہ بھی اتنا ہی تھا جتنا کہ آپکا دیا ہوا بستہ تھا؟"

"تقریباً ۔ لیکن ممکن ہے کہ وہ نوٹ کم قیمت کے ہوں"۔

"بجا ہے"۔ اور اس نوجوان کی ذہانت سے مجھے بہت خوشی ہوئی ساتھ ہی اس کے یہ بھی خیال ہوا کہ وہ کوئی بات مجھ سے پوشیدہ رکھتا ہے۔

میں نے اپنی تقریر اس طرح شروع کی " فرض کیجیے کہ ہم کہیں کہ اوس بستے میں ایک ہزار ڈالر کے نوٹ تھے یا صحیح رقم بتلانے کے لئے ہم کہیں کہ اوس میں ایک ہزار اور ترسٹھ ڈالر تھے جب جج صاحب نے اوس خانے کو بند کیا۔"

یہ میں نے اس لئے کہا کہ جب میں نے اوس خانے کو کھولا تھا تو اوس میں ایک پرچہ ملا جس پر بہت سارے اعداد لکھے ہوئے تھے اور سب سے اخیر عدد یہی تھا جو میں نے بیان کیا۔

میں نے دیکھا کہ وہ پریشان ہو کر میری طرف حیرت سے دیکھنے لگے کہ میں نے یہہ خاص عدد کس غرض سے انتخاب کیا۔

" مسٹر کرافرڈ۔ میں خیال کرتا ہوں کہ یہ کل رقم اوس میز کے خانہ میں تھی۔"

" تعجب ہے کہ چور نے دوسری قیمتی چیزیں نہیں لیں" یہہ کہہ کر میں نے ہیرے کی گھنڈی اور گھڑی کی طرف اشارا کیا۔

" سچ تو ہے۔ یہ عجیب بات ہے۔ شاید وہ ڈرا ہوگا کہ ان کا سراغ لگ جائے گا۔ میں نے سنا ہے کہ چور اس کے متعلق بہت احتیاط کرتے ہیں۔"

" جی ہاں۔ یا شاید اوس نے رقم پہلے نکال لی ہو اور اُسی وقت آپ کے چچا اپنی نیند سے کرسی پر چونک پڑے ہوں اور چور نے خوف کی حالت میں اُن پر حملہ کر دیا ہو۔ اور پھر خوف زدہ ہو کر وہاں سے بھاگ نکلا ہو۔"

یہہ جو میں نے کہا تو میرا عقیدہ یہ نہیں تھا بلکہ اس کے کہنے میں میری کوئی غرض مخفی تھی۔ اس بات کے سننے سے انکے چہرے پر پریشانی کے آثار پیدا ہوئے۔

" میں آسانی کے ساتھ خیال کر سکتا ہوں کہ جو کچھ آپ نے کہا شاید ایسا ہی ہو مجھے یقین ہے کہ آپ اس خیال کی پیروی کر کے چور کی نہیں قاتل کی تلاش میں کوشش کریں گے۔"

پچھلے الفاظ کے کہنے میں اوسکی آواز میں فی الجملہ تزلزل پایا گیا لیکن اس نے اوس بحس و حرکت جسم کی طرف جو کرسی پر تھا نظر کی۔ گویا کہ اوس مردہ کی موجودگی اس کو بیچین کر رہی تھی۔

"جناب من۔ آپ اس کے متعلق مطلق پریشان نہوں جس ہاتھ نے یہ بزدلانہ حملہ کیا پہلے میں اوسے ڈہونڈ نکالوں گا۔ اور یقین کیجیے بہت جلد۔"

"میں امید کرتا ہوں مسٹر کرافرڈ۔ کہ آپ ضرور کامیاب ہوں گے۔"

"جسوقت آپ نے یہ رقم اپنے چچا کو دی تو کیا یہ کھڑکی کھلی ہوئی تھی؟"

"کھلی ہوئی تھی مجھے اچھی طرح سے یاد ہے۔"

"کیونکر"

"اس لئے کہ میں بیخیالی میں چرٹ پیتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ دفعتہً مجھے خیال آیا کہ چچا صاحب کو چرٹ کی بو ناگوار ہے تو میں نے کھڑکی کے پاس جاکر چرٹ باہر پھینک دیا۔"

"آئیے آپ خود ملاحظہ فرما لیجیے اُس ٹیلے سے جو یہاں سے کوئی بیس فٹ ہے تمام کمرے کے اندر کا حصہ اچھی طرح سے دکھلائی دیگا۔ خصوصاً جب کہ اندر روشنی ہو۔"

"بیشک ایسا ہی ہے اگر کوئی شخص وہاں تاک میں لگا ہو مثلاً کسی شخص نے سر شام سے آپ کے پیچھے آکر یہاں تک آپ کا پتہ لگا لیا ہو اور جانتا ہو کہ آپ کے پاس روپیہ ہے اور اوس ٹیلے پر بیٹھ رہا ہو تو اُس نے ضرور آپ کو روپیہ دیتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا۔ اور آپ کے چچا کو بھی میز کے خانہ میں نوٹ رکھتے ہوئے دیکھا ہوگا۔"

"جی ہاں"

"خیر۔ اب بتلائیے کہ آپ یہاں کتنی دیر ٹھہرے رہے؟"

"شب کو؟"

"جی"

"پاؤ گھنٹے سے کم"۔

"کیا آپ میں اور آپ کے چچا میں محبتانہ تعلقات تھے"؟

وہ اس سوال سے ذرا جھجکا۔ مگر جرأت سے جواب دیا۔ "نہیں"۔

"اس کی کیا وجہ"؟

"کیا اس کا جواب دینا ضرور ہے"؟

"بیشک۔ بہتر ہوگا کہ ہم حقیقت حال سے واقف ہوں"۔

"میرے چچا کی تحت ولایت ایک لڑکی مسماۃ مس بیاٹریس ہاتھورن ہے جو میری منگیتر ہے"۔

"کیا یہ اُنہیں کی تصویر ہے"؟ یہ کہہ کر میں نے ایک حسین لڑکی کی روغنی تصویر کی طرف اشارہ کیا جو دیوار سے لٹکی ہوئی تھی اور جہاں سے جج صاحب اپنی کرسی پر بیٹھے ہوئے اُسکو دیکھ سکتے تھے وہ چہرہ ایسا تھا جس نے مجھے بھی والہ و شیدا بنا لیا اور جسے میں گھنٹوں دیکھ کر بھی سیر نہ ہو سکتا تھا۔

"جی ہاں۔ یہ اُنہیں کی تصویر ہے"۔

"کیا آپ کے چچا نے شادی کرنے سے منع کیا تھا"؟

"جی ہاں"

"کس وجہ سے"؟

اس پر اس نے خشونت کے ساتھ جواب دیا "وہ بیاٹریس کو اپنے لئے چاہتے تھے" یہ سنکر میں نے تعجب سے بیساختہ سیٹی بجائی اور مکرر اوس مردہ شخص کی طرف نظر ڈالی۔

بیشک وہ کچھ ایسا بوڑھا نہ تھا اگرچہ اُس کی مونچھیں اور بال سفید ہوگئے تھے عمر کے

اس دور میں اس کا کسی کا عاشق ہونا چنداں تعجب خیز نہ تھا۔ اگرچہ اُس نے سالہا سال سے اپنے آپ کو عشق کے حملوں سے بچایا تھا لیکن اوس حسین لڑکی کے حسن دلفریب نے اُس کے دل پر قبضہ کر لیا ہوگا۔

"اچھا تو یہ بتلائیے کہ اُس نوجوان لڑکی نے ان کی خواہش کی نسبت کیا خیال ظاہر کیا؟"

اس کے چہرے سے اسوقت بھی بےچینی سی ظاہر ہوئی اس نے جواب دیا۔

"اُس لڑکی نے مجھ سے صاف صاف کہا کہ وہ چچا ڈانیل کو ناپسند کرتی ہے مگر ان کے سامنے جاکر وہ مسحور سی ہو جاتی تھی یا شاید خائف ہو جاتی ہو۔ لیکن مجھے اس کی وجہ معلوم ہوئی۔ میرے دل میں یہ شبہ بھی پیدا ہو کہ شاید بیاٹریس کا کوئی گہرا راز انکو معلوم ہوگا لیکن مجھے اس خیال کو دل میں جگہ دینے کی جرأت نہوئی۔"

ایک ناگہانی وحشتناک گمان میرے دل میں گذرا اور میں نے بے ساختہ اپنا ہاتھ اپنے سینے کے اُس حصے پر رکھا جہاں وہ پاکٹ بک تھی جس میں میں نے وہ سیاہ لباس کا ٹکڑا رکھا تھا۔

"معاف فرمائیے۔ میں نے مس ہاتھورن کو نہیں دیکھا ہے کیا وہ ماتمی سیاہ لباس پہنتی ہیں۔"

"جی ہاں۔ وہ عموماً سیاہ لباس پہنتی ہیں اگرچہ وہ مخصوصیت سے سوگ میں نہیں ہیں۔"

میری تحقیقات کی زنجیر میں یہ ایک نئی کڑی بڑھ گئی ۔ مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مجھے اس خیال سے ایک گونہ وحشت اور تشویش ہوئی کہ میں ایسی خوبصورت لڑکی کی طرف سے ایک ایسے خوفناک جرم کے متعلق بد گمان ہو جاؤں ۔

اسوقت تک مجھے قاتلوں کے ساتھ جو معاملات پیش آئے تھے میں نے ان کو ہمیشہ مکار و حیلہ باز پایا تھا جن کے دلی جذبات اور مکاری آن کے چہرہ سے ظاہر ہوتے تھے بخلاف اس کے یہ لڑکی ایک خوش منظر خواب کی تصویر تھی یہ کیونکر کہوں کہ اوسکی تصویر ایک غلط شبیہ تھی جس سے اصلی حالت ظاہر نہیں ہوتی تھی اوس کی صورت ایسی تھی کہ ہر شخص کے دل کی غارتگری کر سکتی تھی مگر ایسی نہ تھی کہ کسی کے قلب میں چھری بھونک دے۔

اگرچہ اس مقدمہ نے میری توجہ کو اپنی جانب مبذول کر لیا تھا لیکن اب تو اوس نے میرے دل پر قبضہ کر لیا تھا اور یہ چھوٹی چھوٹی باتیں میرے دل میں کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی تھیں۔

"مسٹر ٹریورز۔ کیا آپ بتلا سکتے ہیں کہ وہ کس قسم کا آلہ تھا جس نے آپ کے چچا کی جان لی"؟

"نہیں"۔

"آپ کے دل میں کوئی گمان گزرا ہے"؟

"میں نے اون کے قمیص کے چھاتے پر خون کے نشان دیکھے ہیں بلکہ ایک زخم بھی جس سے مجھے ایسا معلوم ہوا کہ کسی نے ان کی گولی ماری ہوگی"؟

"اہا۔ آپ نے بالکل اس کا خیال نہیں کیا کہ بحالات موجودہ یہ بات کس قدر ناممکن ہے"۔

"کیسے ناممکن ہے"؟

اس لئے کہ کوئی اور نشانی نظر نہیں آتی۔ یہ کمرہ سولہ فٹ مربع سے زیادہ وسیع نہیں۔ آپ کے چچا اپنی کرسی پر اس کے وسط میں بیٹھے ہوئے تھے پس جس شخص نے گولی ماری ہوگی۔ وہ سات آٹھ فٹ کے فاصلہ سے زیادہ دور نہ ہوگا۔

ایسے فاصلہ پر جلی ہوئی بارود کی علامت ہونی چاہیئے"۔
"یعنے ان کے قمیص کے چھاتے پر"؟
"جی ہاں۔ کیا ایسی کوئی علامت آپ کو نظر آتی ہے؟"۔
اُس نے دیکھنے کی کوشش کی اور میں اُس کو دیکھ رہا تھا کہ وہ اوس مردہ جسم کے قریب کانپ رہا تھا۔
"بیشک کوئی علامت تو نظر نہیں آتی"۔
"تو اس بات سے آپ کی رائے کا تصفیہ ہوجاتا ہے اس کے علاوہ مجھے وہ حربہ ملا ہے جس سے یہ خوفناک قتل واقع ہوا"۔
یہ سنکر اُس نے ایک گہری سانس لی۔ بعد اس کے اپنی طبیعت پر زور دیکر میری طرف دیکھا۔
"کیا میں اوس حربہ کو دیکھ سکتا ہوں"؟
"میں خود آپ کو دکھانا چاہتا تھا۔ دیکھئے"
جونہی اس کی نظر اوس پر پڑی اس کے چہرہ سے معلوم ہوا کہ وہ اسکو پہچانتا ہے۔
"مسٹر ٹریورز۔ کیا آپ اس چھُری کو پہچانتے ہیں"؟
"جی ہاں"۔
"آپ نے اسے کہاں دیکھا ہے"؟
"اسی کمرے میں"۔
"تو یہ جج صاحب ہی کا مال ہے"؟
"جی ہاں۔ انہوں نے اس کو کئی سال قبل نیپلز میں خریدا تھا"۔
"وہ اسے کس کام میں لاتے تھے"؟

"اکثر کاغذات اور کتابوں کے اوراق کاٹنے کے لئے میں نے اسکو ان کی میز پر اور مکان کے مختلف مقامات میں دیکھا ہے۔"

"کیا اپنے کمرہ میں بھی؟"

"میں نے ایکبار ایک میگزین کے اوراق کاٹنے کے لئے اسے منگایا تھا۔"

"کیا مس ہاتھورن نے بھی اسکو استعمال کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ یہ چھری اُن کے کمرہ میں بھی رہی ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے اسکو کل اُن کے کمرہ میں بھی دیکھا تھا جبکہ میں اس کے سامنے سے گذر رہا تھا اور میں نے اُسے کتابخانہ کے کمرہ میں منگوایا تھا کہ اُس سے کام لوں۔"

مجھے شبہ ہوا کہ اس کا بیان سچ ہے کہ نہیں۔ کیونکہ تجربہ سے میں انسانی خاصیتوں سے اچھی طرح واقف ہوں اور جب میں کسی شخص سے کچھ پوچھنا شروع کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ سچ کہتا ہے یا خلاف بیانی کرتا ہے۔

"آپ اس خون سے جو اس کے تپلے پھل پر ہے دیکھ سکتے ہیں کہ یہ وہی حربہ ہے جس سے یہ سفاکانہ فعل واقع ہوا ہے۔"

"جی ہاں۔ شاید اُس بدمعاش نے اسکو میز پر سے اٹھالیا ہو اور اپنا کام کر کے پھینک دیا ہو۔ مسٹر کرافرڈ۔ یہ آپ کو کہاں ملا؟"

"زمین پر اُس کونے میں پڑا ہوا تھا جہاں کہ قاتل نے اسے پھینکدیا تھا۔"

"میں اس کے متعلق کیا کروں؟ غالباً کوروز کی تحقیقات ضرور ہو گی یہ بہت سخت معاملہ ہے جس سے ہمکو کام پڑا ہے۔"

"میرے افسر اس کا انتظام کر دیں گے۔ آپ فقط سوالات کے جواب صحیح صحیح دیجئے اور باقی امور کو مجھ پر چھوڑ دیجے اور کسی کو اس بات کی خبر نہ ہونے دیجے کہ اس مکان میں کوئی سراغرساں تحقیقات کے لئے آیا ہے۔"

"کوروز کے لوگ کس وقت آئیں گے؟"

"اس کو ابھی چند گھنٹوں کی دیر ہے اور میرے افسر کوروز کو تھوڑی دیر ٹھہرا رکھیں گے تاکہ مجھے تحقیقات کے لئے فرصت ملے۔"

"تو اب میں آپ کی مدد کس طرح کرسکتا ہوں؟"

"میں چاہتا ہوں کہ مس ہاتھورن سے ملوں۔"

وہ میری اس خواہش سے کسی قدر متفکر ہوا مگر استقلال سے کام لے کر کہا۔

"بہت خوب میں ابھی اُن کو بلاتا ہوں"۔　　(باقی دارد)

کدھر گئے

ازجناب مولانا سید محمد عسکری صاحب عدیل کنتوری

کیا کیا شفیق دوست جہاں سے گزر گئے　　ڈھونڈھا بہت پتہ نہیں چلتا کدھر گئے

رستہ ملا تو بڑھ گیا یاروں کا قافلہ　　ہم ہاتھ مل رہے ہیں کہ پیچھے ٹھہر گئے

کیونکر نہ روئیں خوں کے اشکوں سے رات دن　　زندہ تھی جن سے قوم وہی لوگ مر گئے

اک ایک اُن میں بزم ادب کا چراغ تھا　　دیکھیے کوئی بغور وہ کیا کام کر گئے

دار فنا ہے مزرعۂ اعمال خوب و زشت　　اٹھے جو نیک نام وہی نامور گئے

جو جس کے جی میں آئے وہ کہتا ہے بیدریغ　　بازیچہ ہے جو بزم سے اہل اثر گئے

اب کیا رہا ہے گور کی منزل بھی ہے قریب　　سمجھئے گا شام کو نہ گئے تو سحر گئے

جینے کا یہ مزہ ہے کہ جب آنکھ بند ہو
سب یہ کہیں عدیل خدا بخشے مر گئے

فلسفۂ جنون

از جناب مولوی سید وہاج الدین صاحب کنتوری بی۔ اے، بی۔ ٹی

۲

(سلسلہ کیلئے دیکھو لسان الملک نمبر (۱) جلد (۱))

گزشتہ مضمون میں ہم بتا چکے ہیں کہ جنون کا حقیقی منظہر اگر کچھ ہو سکتا ہے تو وہ کسی فرد کے طریقہ مطابقت بہ ماحول کا نقص ہے، جس کی وجہ سے وہ خارجی حالات سے اپنے آپ کو موافق نہیں کر سکتا۔ ہم یہ بھی کہ چکے ہیں کہ عدم مطابقت بہ حالات خارجی تین وجوہ سے ہو سکتی ہے، یا تو یہ کہ کسی فرد میں فطرتاً کوئی نقص ہو (یعنی کنجی خراب ہو) یا ماحول بہت کچھ پیچیدہ ہو (یعنی قفل کا قصور ہو) یا ان دونوں صورتوں میں سے کوئی بھی صورت نہ ہو، لیکن اوس فرد کے طریقہ مطابقت میں خرابی ہو، اور اس آخری صورت کو ہم نے گزشتہ صحبت میں جنون کا معیار قرار دیا تھا۔

اس میں شک نہیں کہ مذکورۂ بالا معیار جنون بمقابلہ دوسرے عدالتی اور متعارف معیاروں کے، بہت کچھ حقیقت کا حامل ہے، پھر بھی اسکو کامل اور سچا معیار نہیں کہا جاسکتا۔ صرف یہ کہدینے سے کہ فلاں شخص حوادث وعوارض خارجی سے خود کو مطابق نہیں کر سکتا، اوس شخص کا مجنون ہونا ثابت نہیں کیا جاسکتا۔ سب سے پہلے تو یہی دیکھنا پڑتا ہے کہ خود اوس شخص کے خواص اور صفات کیا ہیں۔ پھر ماحول کی جانچ کرنی پڑتی ہے، تب کہیں عدم مطابقت یا مطابقت کا حکم لگایا جاسکتا ہے اگر ایک شخص بلا وجہ چیخ چیخ کر روئے اور سینہ کوبی کرے، تو اوس صورت میں عام طور پر وہ مجنون کہا جائے گا لیکن اگر اس شخص پر مصائب کا حملہ ہو، اوس کا شدید نقصان ہوگیا ہو، یا کسی عزیز کے مرنے کی خبر اُس نے سنی ہو، تو اوس صورت میں

اوس کا رویہ " فطری اظہار غم " کے نام سے موسوم کیا جائے گا۔ اس مثال میں
تم دیکھتے ہو کہ اوس شخص کا ایک ہی طرز عمل محض حالات کی تبدیلی کی وجہ سے
کیا سے کیا ہو گیا۔ ایک اور مثال لو۔ فرض کرو کہ ایک شخص اپنے کمرے کی
کھڑکی میں سے سڑک پر کود پڑے۔ اس حرکت کو عام طور پر مجنونانہ کہا جائے گا
لیکن اگر کمرے میں آگ لگ گئی ہو، تو اوس صورت میں یہی فعل دور اندیشی پر
محمول کیا جائے گا۔ ان مثالوں سے یہ بتلانا مقصود ہے کہ جنون کے ہونے
یا نہونے کا ثبوت اوسوقت تک بہت کچھ نامکمل اور ناقص ہے جب تک کہ حالات کو
بھی پورا پورا لحاظ نہ کیا جائے جیسے آباد کی سڑکوں پر اگر کوئی شخص بالکل برہنہ
گلے میں کوڑیوں کا ہار ڈالے ہوے، ناک میں مرغی کا پر لگائے ہوئے نظر پڑے
تو شہر کے لڑکوں کے لئے دل لگی کا ایک اچھا خاصہ ذریعہ پیدا ہو جاے اور
ذی شعور افراد اوسے فاترالعقل کہنے میں کچھ بھی تامل نہ کریں۔ لیکن اگر یہی شخص
افریقہ کے دور دراز اور غیر مہذب حصوں میں اس ہئیت کذائی کے ساتھ پھرے،
تو شاید وہاں کی آبادی کا ایک نہایت ہی ممتاز رکن سمجھا جائے۔ جس طرح سے
کہ معمولی کاروبار زندگی مثلاً تجارت، ملازمت وغیرہ میں تاوقتیکہ کسی شخص کی
اہلیت اور پھر اوسکے مفوضہ کام کی نوعیت اور اس کی ضروریات کو نہ دیکھا جائے
اوسوقت تک اوس شخص کی کامیابی یا ناکامی کا کوئی سچا اندازہ نہیں کیا جاسکتا
اسیطرح سے مطابقت بہ ماحول میں بھی "شخص" اور "ماحول" دونوں کی حالتوں
اور کیفیتوں کو برابر ذہن کے سامنے رکھنا پڑتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر فرد کے
تاثرات، خیالات، طرز عمل وغیرہ حالات خارجی کی مناسبت سے بدلتے رہتے
ہیں، اور جو باتیں ایک قسم کے حالات میں ناموزوں یا مجنونانہ ہو سکتی ہیں، وہی
حالات کی تبدیلی کے ساتھ دوسرے ہی رنگ میں نظر آتی ہیں۔ ذیل کے واقعات سے

جوایک مستند ڈاکٹر کے بیان کردہ ہیں تم کو اچھی طرح معلوم ہو جائے گا کہ بغیر خارجی حالات کا لحاظ کئے ہوئے کسی کو مجنون کہدینا بعض وقت کسقدر غلط ہوتا ہے۔

(۱)

"ایک شخص کا مقدمہ کسی عدالت کے روبرو پیش ہوا، مقصود یہ ثابت کرنا تھا کہ یہ شخص مجنون ہے، واقعات بھی اس فیصلے کی تائید کرتے تھے۔ یہ شخص ایک معزز عہدہ پر فائز اور خوش حال تھا، لیکن عرصہ سے اپنے مکان اور عزیزوں کو چھوڑ کر لندن کی ایک غیر معروف گلی میں سکونت پذیر تھا۔ عدالت نے اسکے مجنون ہونے کا فیصلہ صادر کیا۔ لیکن اوسکے ایک دوست کو یہ انہام سخت ناگوار ہوا، چنانچہ اسنے ثبوت پیش کئے تو معلوم ہوا کہ اس بدنصیب شخص کی بیوی مر چکی ہے، اوس کی اکلوتی لڑکی کسی کے ساتھ فرار ہو چکی ہے، اوسکے لڑکے روپیہ کیلئے اوسے بے طرح دق کرتے ہیں۔ چنانچہ مصائب کے اِس ہجوم سے بچنے کے لئے یہ شخص عزلت گزین ہو گیا ہے"

(۲)

"دوسرا واقعہ ایک اور شخص کا ہے جسے خود میں اور چار دوسرے ڈاکٹر مجنون کہہ چکے تھے۔ یہ شخص لندن کے مضافات میں رہتا تھا، اور میرا صورت آشنا تھا۔ یہ ایک علٰحدہ مکان میں رہتا تھا، اسکے پاس گاڑیاں، ملازم، باغ غرضکہ جملہ لوازمات خوشحالی موجود تھے۔ مجھے ایک دن اوسے دیکھنے کی غرض سے طلب کیا گیا۔ مجھ کو کہا گیا کہ کچھ ہفتوں سے یہ شخص صاحب فراش ہے، کھانا نہیں کھاتا، اور کہا کرتا ہے کہ "میں کرسمس تک زندہ نہیں رہ سکتا" لوگوں نے کہا کہ اوسکی حالت مالیخولیا کی سی ہے۔ وہ برابر اپنی سیہ کاریوں اور بداعمالیوں کا ذکر کرتا رہتا ہے روز حشر کے خیال سے خائف ہے، اور اکثر یہ پوچھا کرتا ہے کہ "کیا پولیس مجھے پکڑنے کے لئے

آگئی" میں خود اس مریض کے کمرے میں گیا، اور سے دلاسا دینے کے بعد میں نے کہا کہ تم اپنے خیالات بدلنے کی کوشش کرو۔ اوس نے جواب دیا کہ یہ سب فضول کوشش ہے۔ میں بہت تھوڑے دنوں کا مہمان ہوں۔ جب صبح ہوتی ہے تو مجھے یہ خدشہ لگا رہتا ہے کہ میں آج ضرور گرفتار کر لیا جاؤں گا۔ دوسرے دو ڈاکٹروں نے بھی مالیخولیا ہی تشخیص کیا، دسکی بیوی سے دریافت کیا گیا کہ اگر کوئی بات ایسی ہوئی ہو جس نے اس شخص کا قلب الٹ دیا ہو تو بتائے۔ لیکن اوس نے کچھ نہ بتایا۔ چند ہفتوں کے بعد اسکا ایک عزیز اس سے ملنے آیا۔ اوسکی زبانی معلوم ہوا کہ یہ شخص بتائیں کے کسی وفد کا عامل تھا اور برسوں سے غبن کرتا چلا آیا تھا، آخر جب اسے یقین ہو گیا کہ افشائے راز ناگزیر ہے تب اوس کی صحت پر برا اثر پڑا، اور وہ اس مرض کا شکار ہوا۔ اپنی سیہ کاریوں کے متعلق جو کچھ باتیں یہ شخص کرتا تھا، اور جن کو سننے والے مالیخولیا کا اثر سمجھتے تھے، وہ سب سچ نکلیں۔ یہ بھی سچ تھا کہ پولیس اسکی تلاش میں ہے۔ عزت بچانے کیلئے غبن کا روپیہ اسکے اعزہ نے داخل کر دیا۔ اسکے داخل ہونیکے بعد یہ شخص اچھا ہو گیا، اور تقریباً تین سال تک زندہ رہا۔"

مذکورۂ بالا مثالوں سے ہمارے معیار جنون کی پہلی اہم تفریع تو معلوم ہو گئی اور وہ یہ کہ حالات اور فرد، دونوں کا بغور و خوض معائنہ ناگزیر ہے۔ دوسری ضروری بات جو اس مسئلہ کے سلسلہ میں (کہ طریقہ مطابقت کا نقص جنون کا مترادف ہے) غور طلب ہے، وہ طرز عمل کی صحت پذیری ہے۔ اگر کوئی شخص کسی سبب سے عدم مطابقت بہ ماحول کا ملزم قرار پائے، تو اوسکو مجنون کہنے سے قبل یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ یہ شخص دوسری، تیسری، چوتھی مرتبہ خود اپنی غلطی دیکھ کر اوسے صحیح کر لیتا، اور اسطرح حالات خارجی سے اپنے آپ کو

مطابق کرسکتا ہے یا نہیں ۔ اگر طریقہ مطابقت بہ ماحول علی التواتر غلط ہو تو جنون کا اطلاق البتہ ہو سکتا ہے ۔ جب ہمارا دوست محمود چائے کی کیتلی نوکر پر پھینک مارتا ہے، لیکن بعد کو اپنے طرزِ عمل کی غلطی محسوس کر کے دل ہی دل میں نادم ہوتا ہے اور جب ہم دوکاندار کے بتانے سے کہ چھ کا ہندسہ ہے، اسے قبول کرلیتا ہوں، تو میں اور محمود دونوں دائرہ جنون سے باہر ہو جاتے ہیں ۔ سرسام، یا دماغی بخار کے دورہ میں جب لوگ التباس نگاہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، لیکن بعد کو اپنی حالت صحیح کر سکتے ہیں، تو اُن کو مجنون نہیں کہا جا سکتا ۔ مجنونانہ التباسات' فریب' اور غلطیاں صحت پزیر نہیں ہوا کرتیں اور یہ جو عام مثل مشہور ہے کہ "دیوانہ سے جو بحث کرے وہ بھی دیوانہ ہے" یہ اُسی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے جسے ہم بتا آئے ہیں ۔ قفل میں تم کتنا ہی تیل کیوں نہ ڈالو، اگر اسے کھولنے کا طریقہ ہی خراب ہے، تو قفل بند کا بند رہیگا ۔

ہمارے مذکورہ بالا بیان کا اطلاق طرزِ عمل پر اتنا ہی صحیح ہے جتنا کہ تحسسات' تاثرات' یا خیالات پر ۔ مجنونانہ طرزِ عمل صحت پزیر نہیں ہوا کرتا ۔ جب تک حالت جنون قائم ہے تب تک زجر و توبیخ' استدلال' سمجھانا بجھانا سب قطعاً بیکار ہے ۔ واضح رہے کہ ہمارا یہ دعوے ہرگز نہیں ہے کہ مجنونانہ عادتوں کا علاج ناممکن ہے ۔ اگر جنون کا علاج تم کردو' تو یقیناً مجنونانہ طرزِ عمل خود بخود جاتا رہے گا ۔ بغیر جنون کا علاج کئے ہوئے' طرزِ عمل کی تصحیح ناممکن ہے ۔ اس سے یہ سمجھنا چاہیئے کہ سزا' اور جزا' جو عام طور پر زندگی میں محرکات عمل ثابت ہوتے ہیں مجنونانہ طرزِ عمل کو متاثر نہیں کر سکتے ۔ بات یہ ہے کہ مجنونوں کے تمام افعال مجنونانہ نہیں ہوا کرتے' اُن میں کا اچھا خاصہ حصہ دائرہ جنون سے باہر ہوتا ہے

اور یہی حصہ سزا کے خوف، یا انعام کی ہوس سے متاثر ہوسکتا ہے۔ ہاں وہ افعال جو مجنونانہ ہوں، بے شک صحت پزیر نہیں ہوتے، اور جب تک جنون کا اثر باقی ہو سزا اور جزا سے اون میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کیجا سکتی۔

کسی شخص کا خاص خاص حالات کے ماتحت مجنونانہ افعال کرنا، لیکن دوسری باتوں میں معمولی ذی ہوش افراد کی طرح زندگی بسر کرنا بہت کچھ تعجب خیز تو معلوم ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے۔ مجانین کو یہ سمجھکر کہ وہ اپنے کسی فعل قول، خیال پر کچھ قدرت نہیں رکھتے، معاف کردینا، اور دار المجانین سے سزا کا استعمال اٹھادینا مذکورہ بالا خیالات کی روشنی میں جائز نہیں ٹھیرایا جا سکتا جنون کی خاص الخاص وجہ، جسمانی حیثیت سے، اعلی ترین مراکز اعصابی کے وظائف میں اختلال کا رونما ہونا ہے۔ لیکن یہ لازمی نہیں ہے کہ ان اعلی ترین مراکز کے ساتھ ساتھ درمیانی اور زیرین مراکز اعصابی بھی مختل ہو جائیں۔ یہی وجہ ہے کہ ایک پاگل شخص پیچیدہ اور دشوار خارجی حالات سے تو اپنے آپکو مطابق کرنے سے قاصر رہتا ہے لیکن دوسری حیثیتوں سے دیکھو تو اوس کا رویہ میری تمھاری طرح ہوتا ہے۔ ایسے "پاگل" بھی ہوتے ہیں جو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کرتے ہیں، لیکن تجارت اور دوسرے کاروبار زندگی کو معمولی آدمیوں کی فراست کے ساتھ کرتے ہیں۔ شاید یہ مثل "دیوانہ بکار خود ہوشیار" اسی حقیقت کی مظہر ہے۔

مذکورہ بالا بیان سے شاید تم کو یہ خیال پیدا ہوگیا ہو کہ چونکہ ہر "دیوانہ" خاص خاص باتوں میں "ہوشیار" ہوتا ہے، اسلئے ہر "ہوشیار" بھی کسی کسی بات میں "دیوانہ" ضرور ہے، اور شاید تم اپنی تائید میں یہ مثل پیش کرو کہ "ہر کس بخیال خویش خبطے دارد" لیکن یہ استدلال بجائے خود ایک خبط ہے

ہر شخص غلطیوں کا مرتکب ہوتا ہے، ہر شخص خارجی حالات سے کبھی کبھی پوری طور پر مطابقت کرنے سے بھی قاصر رہتا ہے، اور بے توجہی، یا کام کی وقت، یا حالات کی نامساعدت کے باعث ہر شخص کسی کام کی بجا آوری میں کوتاہی بھی کرتا ہے، لیکن غور کرو اور بتاؤ کہ کیا ان سب باتوں کی بناء پر دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہر ہوشیار کسی نہ کسی بات میں دیوانہ ضرور ہوتا ہے، یہ دعویٰ بالکل صحیح نہیں۔ صحیح جو کچھ ہے وہ صرف اسیقدر ہے کہ ہر شخص کسی نہ کسی وقت عارضی طور سے پاگل ہو جاتا ہے، ہمارا مشاہدہ بھی اسکو ثابت کرتا ہے ہر شخص کی زندگی میں کم و بیش ایسے مواقع ضرور آتے رہتے ہیں جب کہ اوس کے خیالات، یا تاثرات، یا افعال کی سوائے جنون کے اور کوئی توجیہ پیش نہیں کیجا سکتی۔ بعض مواقع پر تو ہم اس عارضی اختلال کے اسباب سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی اسکے اسباب واضح ہوتے ہیں۔ شراب کے اثرات سرسام کے دورے اور طویل دماغی محنت یا بے خوابی کی وجہ سے اکثر اس قسم کے افعال سرزد ہوا کرتے ہیں اور بہت کم لوگ ایسے ہیں، جن سے یہ افعال صادر نہ ہوتے ہوں۔ غور کیا جائے تو اس بیان میں، اور اس خیال میں کہ ہر ہوشیار کسی نہ کسی بات میں دیوانہ ضرور ہوتا ہے زمین آسمان کا فرق ہے کسی نہ کسی بات میں دیوانگی سے یہ مطلب ہوگا کہ جب کبھی وہ بات ہوگی تو یہ شخص دیوانوں کیطرح اوسے کرے گا لیکن ایسا کرنے والے کو ہوشیار، کہنا ہی غلط ہے، طرز عمل کی غیر صحت پزیری، اور دیوانگی کے رویہ کا استمرار اوس شخص کو مجنون ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

ماہیت جنون کے متعلق جو کچھ خیال ہم نے اپنے پہلے مضمون میں ظاہر کیا تھا، اوس کی دو تفریعات کو تو تم دیکھ چکے۔ لیکن ایک اور یعنے تیسری تفریع

ابھی باقی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ چونکہ جنون اعلیٰ مراکز اعصابی کے اختلال اور طریقہ مطابقت بہ ماحول کی خرابی کا نام ہے، لہذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ وہی ایک شخص جو پیچیدہ حالات میں مجنون کہا جاسکتا ہے، حالات کی سادگی کیساتھ مجنون نہیں رہتا۔ یہ بیان صداقت آمیز ہے۔ اگر تم نے پہلے پہل کسی دار المجانین کا معائنہ کیا ہوگا تو تم کو بہت سے "پاگلوں" کی ظاہرا فراست اور ہوشیاری دیکھ کر تعجب ضرور ہوا ہوگا۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ یہی کہ یہ لوگ جو دنیا کے وسیع، اور پیچیدہ تعلقات سے، اپنے جنون کی وجہ سے، عہدہ برآ نہیں ہوسکتے تھے، پاگل خانے کی سادہ زندگی میں مطابقت بہ حالات سے عاجز نہیں رہے۔ گویا ان کو ایک ایسی دنیا میں رکھ دیا گیا جس سے مطابقت کرنا ان کے لئے دشوار نہیں ہے یا یوں کہو کہ بجائے اسکے کہ اُن کو حالات سے مطابق کیا جائے، حالات کو اُن کے حسب حال اور مطابق بنا لیا گیا، اور جنون کو شہ دینے والی کوئی چیز رکھی ہی نہیں گئی۔ دار المجانین کے قیام کا اساسی اصول، اور اوس کی کامیابی کا اصلی راز مذکورۂ بالا تفریع ہی ہے۔ جنون پرور، اشیاء کو خارج کرکے، مجنونوں کو ہوشیار بنایا جاتا ہے۔ لیکن انہی لوگوں کو اگر تم دنیا میں بھیجدو، تو بہت ممکن ہے کہ دوسرے ہی دن اُن کا سابقہ جنون پھر عود کر آئے سب کچھ خارجی حالات پر منحصر ہے۔

گزشتہ بحث سے ہم جنون کی ماہیت کے متعلق حسب ذیل دو نتیجوں کا استنباط کرسکتے ہیں۔ اوّلاً تو یہ کہ جنون نام ہے کسی فرد کے طریقہ مطابقت بہ ماحول کے اختلال کا، اور ثانیاً یہ کہ جسمانی اعتبار سے جنون کا مواد ہمارے اعلیٰ مراکز اعصابی ہیں، اسلئے کہ حالات خارجی سے مطابقت کرنا انہی مراکز کا وظیفہ طبعی کہا جاسکتا ہے۔ ایک اور بات یاد رکھنے کی یہ ہے کہ ہمارے دماغ کے اعلیٰ ترین مراکز میں عصبی تہیجات دو علحدہ علحدہ راستوں سے داخل ہوتے ہیں۔

ایک قسم کے تہیجات تو ہمارے مرکز انہضام سے دماغ کی طرف اور دماغ سے مرکز انہضام کی طرف آتے جاتے رہتے ہیں، اور ان کا ذہنی مظہر شعور ذات ہوا کرتا ہے۔ تہیجات کی دوسری قسم وہ ہے کہ جب عصبی تحریکات دماغ سے اعضائے حسی، مثلاً آنکھ، کان، ناک، زبان، تالو، جلد کی طرف نزول، یا پھر ان اعضائے حسی سے دماغ کے مرکز اعلیٰ تک صعود کریں، اور ہمارے عضلات کو خاص خاص حرکات کی تحریک دیں مثلاً جب میرا ہاتھ آگ سے جلتا ہے، تو جلن کی حس جلد سے دماغ تک جاتی ہے، اور دماغ سے ہاتھ کے عضلات کو تحریک پہنچتی ہے، اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ میں اپنا ہاتھ کھینچ لیتا ہوں جس طرح سے قسم اول کے تہیجات شعور ذات کے محرک ہوتے ہیں اسی طرح سے قسم دوم کے تہیجات کا نتیجہ شعور حالات خارجی، یا ماحول کی واقفیت ہوا کرتا ہے چونکہ یہ دونوں اقسام اعلیٰ مراکز اعصابی میں ختم ہوتے ہیں، اس لئے ان مراکز کے افعال دوگونہ ہوتے ہیں، یعنے شعور ذات اور شعور حالات خارجی، اور جب ان میں اختلال پیدا ہوتا ہے، تو ایک طرف تو طرز عمل اور دوسری طرف افعال معدہ، دوران خون وغیرہ پر بھی اثر پڑتا ہے۔

جنون کی صورت میں کل جسم کے تغذیہ پر اثر ہوتا ہے ممکن ہے کہ یہ اثر کم ہو، لیکن ہر صورت جنون میں اس کا شائبہ کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے، اور اس کا بہترین ثبوت جلد، انگلیاں بال وغیرہ کے معائنہ سے ملتا ہے، اس لئے کہ یہ چیزیں داخلی افعال معدہ، دوران خون وغیرہ کی خارجی مظہرات کہی جاسکتی ہیں۔ جنون، اور جلد کی حالت میں تغیر، یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم کہی جاسکتی ہیں، اور اول الذکر کے خفیف یا شدید ہونے کی مناسبت سے جلدی تغیرات بھی خفیف یا شدید ہوا کرتے ہیں۔ اکثر حالت جنون میں، جلد خشک اور سخت ہو جاتی ہے، بال سخت اور کڑے ہو جاتے ہیں، ناخن بے ڈھنگے، دبے ہوئے یا کنارے دار ہو جاتے ہیں کبھی کبھی جلد بہت کچھ مرطوب رہا کرتی ہے اور جلد ہی جلدی

جھڑنا شروع ہوتی ہے۔ اُس میں سے ایک قسم کی تیز، اور ناگوار بو آنے لگتی ہے سخت جنون کے دورے کے بعد ناخنوں کا جھڑ جانا مشاہدہ میں آچکا ہے دماغی حالتوں اور کیفیتوں کے اعتبار سے، بال اور جلد کے رنگوں میں بھی فرق آجایا کرتا ہے، چنانچہ شدت غم، یا تردد کی وجہ سے بالوں کا سفید ہوجانا، صرف عام طور پر مشہور ہی نہیں ہے بلکہ مستند ڈاکٹروں کے معائنہ میں آچکا ہے۔غرض یہ کہ اعلیٰ مراکز اعصابی میں جو کچھ بے ترتیبی بھی ہو، تغذیہ پر اوس کا اثر لامحالہ پڑتا ہے، اور چونکہ مرکز انہضام سے دماغ کی طرف جانے والے تہیجات شعور ذات پیدا کرتے ہیں، اس لئے حالت جنون میں شعور ذات، یعنے اپنی ذات کے متعلق واقفیت بھی کم ہوجاتی ہے، خوشی یا غم کے تاثرات میں فرق آجاتا ہے، بے وجہ غم، اور بے سبب خوشی اکثر جنون کی صورتوں میں دیکھنے میں آتے ہیں۔خود اپنی "ذات" بدلی ہوئی نظر آتی ہے، کبھی خود کو مردہ تصور کیا جاتا ہے، کبھی اپنی حالت مافوق الفطرت دکھائی دیتی ہے یہ سب شعور ذات کے اختلال کے نتائج ہیں اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے، تو خود کو حالات سے مطابق کرنے کی صلاحیت بھی جاتی رہتی ہے اور طریقہ مطابقت بہ ماحول میں نقص واقع ہوتا ہے، جس کا نتیجہ طرز عمل کی خرابی، بدترتیبی، غیر صحت پذیری، یا ایک لفظ میں "جنون" ہوتا ہے۔

اسقدر بحث کے بعد ہم ماہیت جنون کو بطور خلاصہ ان الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں کہ "جنون نام ہے کسی فرد کے طریقہ مطابقت بہ ماحول کی خرابی کا۔ چونکہ یہ مطابقت اعلیٰ مراکز اعصابی کی بدولت واقع ہوتی ہے، اس لئے ہر 'جنون' کا خاص الخاص باعث ان مراکز کا اختلال ہوا کرتا ہے اور اسی اختلال سے دوسرے ضمنی خلل رونما ہوتے ہیں۔ طرز عمل[1] (جو ان مراکز اعلیٰ کا وظیفہ طبعی ہے) شعور[2] (جو اعلیٰ مراکز کی بدولت پیدا ہوا کرتا ہے) مختل ہوجاتا ہے چونکہ شعور، تاثرات

اور خیالات کے مجموعے کا نام ہے اس لئے تاثرات اور خیالات میں بھی خلل واقع ہوتا ہے شعور کی دو بڑی بڑی قسمیں، شعور ذات اور شعور حالات خارجی ہیں پس جنون میں یہ دونوں بھی کم و بیش جاتے رہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ ہر صورت جنوں میں، تین عنصر لامحالہ موجود رہتے ہیں۔

(۱) اعلیٰ مراکز اعصابی کی تنظیم میں خلل۔

(۲) طرز عمل کی بے ترتیبی۔

اور (۳) شعور کا اختلال۔

نیز ہر صورت جنوں میں شعور کا اختلال، تاثرات، خیالات، شعور ذات، اور شعور حالات خارجی کے اختلال کو مستلزم ہوا کرتا ہے ان سب باتوں کا موجود رہنا لازمی ہے، یہ اور بات ہے کہ ان کی آمیزش یا اجتماع کے طریقے مختلف ہوں جنون کے عناصر سہ گانہ یہی ہیں البتہ ان تینوں کی ترکیب، ترتیب، اور تشکیلات مختلف ہوتی ہیں، اور مختلف اقسام جنون کا باعث ہوتی ہیں۔ آئندہ کسی صحبت میں جنوں کے مختلف اقسام سے بحث کریں گے +

تا کجے ہجر میں زندہ رہے غم کھانے کو　　موت آجائے کہیں آپ کے دیوانے کو

ساغر عمر ہمارا ہوا جب سے لبریز　　دیکھتے ہیں نگہ یاس سے پیمانے کو

دل مضطر ہی نہ سمجھے تو قصور اسکا ہے　　ورنہ احساں ہے جو لوگ آتے ہیں سمجھانے کو

جذب تاثیر محبت نے دکھایا یہ اثر　　خود وہ آئے ہیں جنازہ مرا اٹھوانے کو

رکھ کے خنجر مری گردن پہ اٹھا لیتا ہے　　آگ لگ جائے ستمگر ترے ترسانے کو

قید وحشت میں جنوں خیز تھا اطہرؔ کا مزاج
موت نے آکے رہا کر دیا دیوانے کو

سید یعقوب علی اطہر

افکار شکسپیر

از جناب مولوی سید تفضل حسین صاحب ناثر

تشفی

جب قسمت اور دنیا کی آنکھوں میں اپنے تئیں ذلیل و خوار پاکر میں اکیلا بیٹھا ہوا اپنی حرماں نصیبی پر روتا ہوں اور بہرے آسمان کو اپنے نارسا نالے سننے کی زحمت دیتا ہوں اور اپنے آپ پر نظر ڈالتا ہوں اور اپنی تقدیر کو کوستا ہوں۔

اور آرزو کرتا ہوں کہ میں فلاں شخص کی جگہ ہوتا، جس کا دل میری نسبت امید ول سے زیادہ مالامال ہے اور میرے خط و خال ایسے ہوتے جیسے فلاں کے ہیں اور اس شخص کا ہنر اور اُس کی نظر مجھے میسر ہوتی اور جو نعمت مجھے زیادہ ملتی اسی کی ناشکری کرتا۔

مگر خوشا نصیب، جبکہ میں ان خیالات میں سرشار ہوتا ہوں اور آپ اپنی تحقیر کرتا ہوں، دفعتہً مجھے تیرا دھیان آتا ہے اور تب میری حالت مثل اس چنڈول کے ہو جاتی ہے جو نور کے تڑکے سنسان زمین سے بلند ہو کر ہوا میں اڑتا ہے اور اپنے ترانوں کو کروبیوں کا آویزۂ گوش کر دیتا ہے۔

حق یہ ہے، تیری محبت آگیں یاد ایسی دولت عطا کرتی ہے کہ اسوقت میں بادشاہوں کے ساتھ تبدیل حال کرنے میں اپنی کسر شان سمجھتا ہوں۔

جسم اور روح

اے غریب روح! اے مرکز میری گناہگار دنیا کی، جس کو تیری وابستہ سرکش قوتوں نے خراب و خستہ کر رکھا ہے، تو اپنے قلعہ کے اندر پڑی ہوئی کس لئے

گھٹتی رہتی ہے اور قحط و فاقہ کی بپتا کیوں بھرتی ہے، حالانکہ تو اسکی بیرونی دیواروں کی تزئین و آرایش میں اتنے کثیر مصارف اٹھارہی ہے؟
ایک بوسیدہ محل اور اس قلیل میعاد کی خاطر اتنی زیر باری؟ کیا کیڑے مکوڑے جو اس جنس فضول کے وارث ہونے والے ہیں، تیری جائداد کو کھا نہ جائیں گے؟ کیا تیرے کاشانہ کا یہی انجام ہے؟
تو اے روح، اپنے ملازم کو تکلیف میں ڈال کر خود نفع اٹھا اور اس کو فقر و فاقہ میں مبتلا کرکے اپنا ذخیرہ بڑھا دنیا کی نکمی گھڑیاں بیچکر آخرت کی کار آمد گھڑیاں خرید۔
اس طرح تو موت کو ہلاک کردیگی جو آدمیوں کو ہلاک کرتی رہتی ہے اور جب موت ایک مرتبہ ہلاک ہوجائے تو پھر مرنے کا کھٹکا باقی نہیں رہتا۔

وقت اور حسن

فولاد ہو یا کہسار، ساحل ہو یا بحر ذخار، جب ان پر فنا کا افسوسناک حکم جاری ہے تو اس کے آگے بھلا حسن کا کیا زور چلتا ہے؟ یہ تو پھول سے بھی نازک تر ہے۔
ہائے۔ چلہ شکن زمانہ کی دستبرد کا کمزور کلائیاں کیونکر مقابلہ کریں گی، حالانکہ سنگ خارا کی مضبوط سے مضبوط چٹانوں اور محکم ترین آہنی دروازوں کو بھی وقت فرسودہ کردیتا ہے۔
ہائے! کیسا دل کو ہلا دینے والا خیال ہے! افسوس، اس معدن کا بہترین جواہر پارہ رہزن وقت کے صندوق میں بند ہونے سے کب تک بچا رہے گا؟ کون چابکدست ہے جو اس کے تیز رفتار پاؤں کو پے کردے؟ کون بہادر ہے جو اسے حسن کو تاراج کرنے سے باز رکھے؟
آہ! کوئی نہیں، ایک میرے قلم کے سوا! بشرطیکہ اس کا جادو چل جائے اور میری سیاہ تحریر میں میرے محبوب کا نام قیامت تک چمکتا رہے۔

غزل

جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیزؔ

ہوس دولتِ دنیا بھی بلا ہوتی ہے
جتنا کم کیجئے اتنی ہی سوا ہوتی ہے

ان حسینوں کی عجب طرز جفا ہوتی ہے
روٹھنے میں بھی لگاوٹ کی ادا ہوتی ہے

رُک گئی تیغ ستم حلق پہ چلتے چلتے
نہ جدا کرتی ہے سر کو نہ جدا ہوتی ہے

تھام لیتا ہے وہیں بڑھ کے مجھے دستِ سبو
بیخودی میں جو ذرا لغزشِ پا ہوتی ہے

بیوفائی کی محبت میں شکایت کیسی
جیسی ہوتی ہے خطا ویسی سزا ہوتی ہے

خلشِ الفتِ اغیار نکالوں کیونکر
کہیں یہ پھانس کلیجے سے جدا ہوتی ہے

نہ رہی اب تو کسی بات کی الجھن دل میں
جنبشِ دستِ مژہ عقدہ کشا ہوتی ہے

مست کر دیتی ہے مستانہ ادا ساقی کی
موجِ مے سے بھی سوا ہوش ربا ہوتی ہے

زور چلتا ہے پیالے پہ پیالہ ساقی
روز میخانے پہ گھنگھور گھٹا ہوتی ہے

چٹکیاں لیتی ہیں رہ رہ کے نگاہیں انکی
ٹیس پہلو میں جدا دل میں جدا ہوتی ہے

بیکسی قابلِ عبرت ہے مریضِ غم کی
نہ دعا کرتا ہے کوئی نہ دوا ہوتی ہے

نیند آجاتی ہے آنکھوں میں دمِ ذبح عزیزؔ
دامنِ تیغ کی کیا خوب ہوا ہوتی ہے

فہرست مضامین

تبریک

بہ تقریب پیش کشی ڈگری اعزازی سلطان العلوم بہ بارگاہ اقدس ہمایونی اعلحضرت قدر قدرت ظفر اکز الیٹیسڈ ہائی نس سر میر عثمان علیخاں بہادر نظام الملک آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہ ودوام دولتہٗ سرپرست اعلیٰ جامعہ عثمانیہ منجانب مجلس اعلیٰ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد

موج زد چوں علم از ایمائے سلطان العلوم
بحر شد ہر قطرہ دریائے سلطان العلوم

خازن تقدیر از گنجینۂ اسرار غیب
ریخت صد گنج ہنر در پائے سلطان العلوم

پیش از یک گوی تاری نیست مہر آسماں
نور دانش را مقر سیمائے سلطان العلوم

شاہ معنی آفریں روح معانی تازہ کرد
کیست در نظم سخن ہمتائے سلطان العلوم

صد ہزاراں طوسی و فارابیش شد کاسہ لیس
بوعلی دروی کش مینائے سلطان العلوم

حضرت عثمان ما آرے . امون وقت
شد دکن بغداد از امضائے سلطان العلوم

جامعہ را صورت تمکیں ننیہ مدانی کہ داد؟
جنبش کلک گہر آمائے سلطان العلوم

آنکہ افلاطون دوراں وارسطو زمان است
آرے می زیبد در اطغرائے سلطان العلوم

علم را خود وجہ نازش باد اعزاز قبول
چوں پزیرا گردشہ تمغائے سلطان العلوم

یارب ایں رخشندہ مہر فضل و دانش زندہ باد
تخت شاہی باد دایم جائے سلطان العلوم

ضامن بے مایہ کہ بود تا گوید مدح شاہ
نطق مواج است از ایمائے سلطان العلوم

لسان الملک

نمبر (۴)	ماہ اکتوبر ۱۹۲۳ء	جلد (۱)

داستانِ اردو

از ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیالؔ

ادبی دنیا میں شاید ہی کوئی ایسا ہو جسے ادیب الملک نواب سید نصیر حسین خاں صاحب خیالؔ کی ذات پر فخر و ناز نہ ہو۔ یوں تو تقریباً بیس سال سے اُن کے قلم کی شہرت عام رہی ہے، لیکن جب رسالہ ادیب (الٰہ آباد) میں اُن کا ایک مضمون

خالاؤں کا مارا آغا

شایع ہوا، تو اس امر کا بجا اعتراف کیا گیا کہ زبان اردو انگریزی ادب کے بالمقابل آگئی اور چارلس ڈکنس کے لاجواب مضامین کا جواب دینے کے لائق ہو گئی۔ اس مضمون کے شایع ہوتے ہی اہل نظر کی نگاہیں نواب خیال پر پڑنے لگیں، اور اُن کے انداز بیان نیز اُن کی معلومات سے فائدہ حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ یہ معلوم تھا کہ نواب صاحب عرصہ سے اردو زبان کی تحقیق اور اس کے اخذ اور اس کی تدریجی ترقی پر کچھ تحریر فرمانا چاہتے ہیں اس لحاظ سے جب ملک میں ایک اردو کانفرنس کی بناء ڈالے جانے لگی، اور ہندو مسلم رشتہ کے

مستحکم کرنے کی فکر ہوئی تو اہل الرائے نے اس کانفرنس کی صدارت کے لئے نواب خیال کو منتخب فرمایا۔
۱۹۱۶ء کے دسمبر میں لکھنو میں جب کانگریس و مسلم لیگ کے اجلاس ہو رہے تھے، یہ کانفرنس بھی منعقد ہوئی۔
اس موقع پر بحیثیت صدر کانفرنس نواب صاحب نے جو خطبہ ارشاد فرمایا وہ اردو کے لئے مایۂ ناز ثابت ہوا۔
'داستان اردو' اسی بے نظیر خطبہ کا کتابی نام ہے جسے بعد نظر ثانی صاحب ممدوح نے پبلک سے شایع کرنیکا وعدہ کیا تھا۔

لسان الملک کے اجرا کے وقت ہم نے اپنے محترم دوست سے اصرار کیا کہ وہ بھی اس رسالہ کو اپنے زور قلم سے سرفراز فرمائیں۔ ہم ممنون ہیں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر توجہ کر کے 'داستان اردو' کا ایک باب ہمیں مرحمت فرمادیا۔
اس حصہ داستان کا نام "اردو کا دوسرا دور" ہے اور چونکہ اس دور کو دکھن سے خاص تعلق حاصل ہے، اس لحاظ سے اس کا لسان الملک میں شایع ہونا بہت ہی موزوں ہے۔ اہل نظر اس مضمون کو بغور پڑھیں اور دیکھیں کہ اسمیں اردو زبان کس رنگ میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ اشہر

اردو کا دوسرا دور

مہاراشٹری یا مرہٹی۔ یہاں (ہند) کی مختلف بھاکھاؤں کے ذکر میں مہاراشٹری کا نام آچکا ہے۔ اس بھاکا کو اپنے صوبہ مہاراشٹر یعنے (قدیم) دکھن سے نسبت تھی۔ یہ زبان بھی کناری[1] (کنڑی)

[1] کناری، غیر آریہ اور دراوڑی زبان (مثل تامل، تلنگی اور ملدی وغیرہ) کی ایک شاخ ہے جینیوں کے عروج کیوقت بعض دراوڑی زبانیں اپنے کمال پر آرہی تھیں کہ جینیوں کو زوال ہوگیا۔ ادی پپا اور ابھی نواپپا دو جینی شاعر والمیکی کا لیداس کا جواب نکلے۔ انھوں نے مہابھارت اور راماین کے قصوں کو اپنی زبان میں دہرایا۔ یہ دراوڑی زبانیں مٹ چکی تھیں مگر مرہٹی کے لئے زیادہ تر مشہور سیواجی نے سیو اکر کے قومیت کا جوش دکھایا، اور اب تلک مہاراج نے اُسے اپنی قومیت کا ٹیکا بنایا! کناری کے ابھارنے کے لئے گو بظاہر کوئی پولیٹیکل کوشش نہیں کیگئی، مگر ریاست میسور نے اسے اپنے دامن میں لے کر پرورش کرنا شروع کردیا اور حیدرآباد میں اردو کے متعلق اسی کا جواب دیا جارہا ہے۔

وغیرہ کی طرح غیر آریہ اور درویدی (زبان) کی ایک شاخ ہونے اور ہند کی اور زبانوں سے الگ اور دور رہنے کے سبب سے اُن کے اثر سے خالی تھی مگر جبکہ (راجہ) رام چندر جی نے راون کو مار کر لنکا کو پھونکا تو سارا دکھن اُن کی مٹھی میں تھا۔ وہ گھر (کوسل یا قدیم اجدھیا) لوٹے تو رستہ کھلا، اور ان دو (آریہ اور غیر آریہ) زبانوں میں اپنا پا بڑھا۔

سورج بنسیوں[1] اور چندر بنسیوں کے وقت تک گو دربار، درباریوں اور مہاتماؤں کی زبان سنسکرت ہی تھی، مگر عوام کا روزمرہ بھاشا ہی تھی، اور وہ اپنے بولنے والوں کی کثرت تعداد کے باعث دور دور پھیل کر اور عام ہوکر سنسکرت کو دبا رہی تھی۔ ہندو دہرم کا بھرم جب تک قایم رہا سنسکرت کا بول بھی بالا رہا، مگر ادھر بودھ مت نے برہمنی مذہب کو زیر کیا اور اُدھر جین مت نے اُسے کمزور۔ اور اس وجہ سے سنسکرت بھی یوں اکھڑی کہ پھر جم نہ سکی۔

گوتم جی گو سورج بنسیوں کے ایک چاند تھے اور اُن کی زبان شاہی تھی، مگر یہ دیکھکر کہ موجودہ مذہب (ہندو دھرم) سنسکرت کے مقدس ظرف دان میں بند ہے جسے عوام اور خصوصاً شدر چھو نہیں سکتے، اور وہ زبان اُن کی سمجھ سے بھی اب تک باہر ہے اور اُن کے لب و لہجہ سے بھی میل نہیں کھاتی، انہوں نے اپنا کلام و وعظ رعایا اور عوام کی بھاکا[2] میں شروع کیا، کہ وہی اُن کی اصلی اور فطری زبان تھی۔ سب نے اُنہیں سمجھا، اُن کی پیروی کی، بودھ مت پھیلا اور اس وجہ سے

---

[1] سورج بنسی اور چندر بنسی دونوں نہایت مشہور خاندان بہت عرصہ تک اندرپت (دلی) اور کوسل (اودھ) میں حکمراں رہے ایک خاندان کے نام سے مہابھارت معنون ہے، اور دوسرے کے نام سے رامائن منسوب۔

[2] گوتم جی نے کسی ایک زبان میں اپنا وعظ نہیں کیا۔ بہار و کاشی میں اُن کی زبان پوربی (بھاشا) تھی اور پنجاب میں پنجابی۔ پالی کو اُن سے نسبت دینا صحیح نہیں۔ یہ بھاکھا اُن کے بہت دنوں بعد دکھن کے اطراف میں اور پھر بودھی دنیا میں اس وجہ سے پھیلی کہ اُن کے اور اُن کے مرید راجاؤں کے پند و احکام زیادہ تر اسی زبان میں شایع ہوئے، اور کتابوں پر کندہ کئے گئے۔

نہ صرف ہندو دھرم ہی ناس ہوا بلکہ اس کی مذہبی زبان (سنسکرت) بھی مٹنے لگی!۔

شمالی ہند میں یہ انقلاب ہو رہا تھا کہ وسط ملک سے گھٹا کی طرح جین مت اٹھا اور بہت جلد اُدھر چھا گیا اس مذہب کا مرکز اجین صوبۂ مالوا تھا، اور اس کے بانیوں کی زبان سنسکرت سے مختلف اور زیادہ تر مہا بھاشا[۵۱] تھی۔ آخر اُس طرف بھی ہندو دھرم کمزور پڑا اور سنسکرت کا چراغ ٹمٹمانے لگا۔ اس مذہب کے بعض راجاؤں نے اس زبان (سنسکرت) کو سنبھالنا چاہا، مگر پھر وہ چل نہ سکی، اور آخر وہ صوبہ بھی سنسکرت کی قلمرو سے نکل گیا۔

اُس زمانہ میں کہ یہاں (ہند میں) اس طرح ملکی و مذہبی انقلاب ہو رہے تھے، برج (قدیم متھرا) میں بھاشا براج رہی تھی، اور اس کا اثر عرصہ سے گہرا اور عام ہو رہا تھا۔ بھاگوں سے اُسے زمین بھی موافق ملی جہاں وہ خوب پنپی اور خوب پھیلی اور سنسکرت کی کمزوری سے وہ زور آور ہوتی چلی۔ سارے ہند میں پھری، پورب تک گئی اور وہاں پوربی (بھاشا) کہلائی۔ اسی طرح چکر کھائی اور اپنا اثر پھیلاتی اجین و مالوا تک پہنچی اور پھر دکھن کی طرف اُتر کر مہاراشٹری سے جا ملی، اور آخر اُس کی ثقالت[۵۲] مٹا کر اور اپنی فصاحت کا سکہ جما کر اُسے مرہٹی بنا آئی!۔

دکھنی۔ مذہب و زبان کی اس گردش کے زمانہ میں مسلمان اِدھر آئے، اور آریاورت

۵۱۔ مہا بھاشا۔ وہ زبان جو اُس وقت کے شرفا اور ممتاز لوگوں کی تھی، اور جس میں سنسکرت کے موزوں و مناسب الفاظ کے ساتھ اُس کے تشبیہ و استعارے اور فصاحت و بلاغت بھی شامل ہو گئی تھی۔

۵۲۔ یہاں سنسکرت کے عام نہ ہونے کی وجہ یہی تھی کہ اس کے الفاظ عوام کی زبانوں پر بمشکل چڑھتے تھے یہی حال اکثر دریدی زبانوں کا تھا۔ بھاشا اس ثقالت سے پاک تھی، اور جہاں جہاں اُس کا اثر پڑا وہاں کی زبانیں فدا بلکی اور رواں ہو گئیں۔ بھاشا کی قایم مقام اردو کا بھی یہی حال ہے، سنسکرت اور عربی اُس کے مطلب کی نہیں، اور نہ انگریزی اُس کے ڈھب کی ہے۔ ہاں فارسی سے مل جاتی اور ہندی سے تو بے تکلف کھیلنے لگتی ہے!۔

ملکِ ہند بن گیا۔ ان نئے واردین میں اول عرب تھے، جن کی معاشرت اور خصوصاً زبان کا اثر پھیلنے لگا۔ سندھ زیادہ متاثر ہوا، اس لئے کہ وہ عربوں کا مستقر تھا۔ برج اور سندھ بہت دور نہ تھے، اس وجہ سے برج بھاشا اور عربی میں معانقہ ہونے لگا۔ عربوں کے بعد یہاں ترکی نشان اڑے، اور سندھ و پنجاب سے لے کر بنگالہ تک لہرائے۔ خلجیوں کے وقت میں جہاں پورب سر ہوا، وہاں دکھن بھی اُن کے ہاتھ آکر شمال کا دست نگر ہو گیا۔ ان ترکوں کی اصلی زبان گو ترکی تھی، مگر فارسی اُن پر غالب اور اُن کا طرۂ دستار بنی ہوئی تھی۔ یہ دونوں زبانیں یہاں کے لئے بیگانہ نہ تھیں۔ ترکی ہندیوں کی گویا ہمسایہ اور فارسی سنسکرت کی بہن ہی تھی، اس لئے اس زمین پر اُن کا حق شفعہ قایم ہو گیا۔ اب شمالی ہند میں فارسی درباری و سرکاری زبان بن کر سرداری کرنے لگی، اور جب ملک کافور کی حکمتوں سے دکھن خلجیوں کے زیر نگین ہوا تو فارسی کا نقش وہاں اور بیٹھا، اور جس طرح شمال میں بھاشا فارسی سے مل کر اپنی کچلی اتار رہی تھی اُسی طرح دکھن میں مرہٹی اس سے بغلگیر ہو کر اپنا روپ بدلنے لگی۔ اُس وقت تک ملک دکھن میں مہاراشٹر ایک علیحدہ صوبہ تھا، مگر جب خلجیوں نے پورے دکھن کو فتح کر لیا تو صوبۂ مہاراشٹر کو بھی لے کر سارے ملک کا ایک ہی نام یعنے دکھن رکھ دیا، اور وہاں کے رہنے والوں نیز وہاں کی زبان کا لقب دکھنی پڑ گیا۔

دکھنی اردو۔ ہندوستان میں جب مغلئی دور ہوا تو آخر بھاشا بھی اُن کے دربار کی زینت بنی۔ بابر[1] نے اُسے خاص عزت بخشی۔ اُسوقت اس مخلوط زبان اور ترقی یافتہ بھاشا کا نام اردو

---

[1] بابر شاعر اور نہایت خوش مذاق تھا اوسوقت کی اردو میں بھی اُس نے شعر کہے۔ بادشاہ اس طرح اس زبان کو عروج دیتا اور ہندی تخیل کو یوں سراہتا ہے:

مج کا نہ ہوا کچ ہوس مانک و موتی (کچھ، مونگا)
فقرا اہلیغہ بس بولغوسیدر پانی در روتی! (بجز، روٹی)

بادشاہ کہتا ہے کہ مجھے موتی و مونگا درکار نہیں، فقیر مست ہوں، ایک گردۂ نان اور ایک کوزۂ آب بس ہے۔

پڑ چکا اور پھیل چکا تھا، اور عوام کا روزمرہ یہی زبان تھی۔ ہمایوں کے فتح گجرات اور سلطان بہادر کی شکست پر شمال و دکھن میں پھر نیا اور گہرا رشتہ قایم ہوا۔ آمد و رفت کا رستہ کھلا اور پھر لین دین کی بدولت ان دونوں جگہوں کی زبانیں ملنے اور پھیلنے لگیں۔ یہ مزاجاً دو تہ تغیر ... ہوئیں، اور جب اُردو کی سرداری کا زمانہ اور دکھن پر عالمگیر کی چڑھائی کا وقت آیا تو اسے اقتدار کے باعث یہ اُردو اُدھر بھی قبضہ کر کے شمشیر و زبان بن بیٹھی، اور اس طرح پرانی دکھنی کو دکھنی اردو کا نیا مگر موزوں خطاب مل گیا!

دکھنی دربار۔ انقلابوں کے بعد جب دکھنی ریاستیں (بیجاپوری و نظام شاہی وغیرہ) ہند سے علٰحدہ اور خود مختار ہوئیں تو اُن کا نظام سلطنت بھی شاہان ہند کے اثر سے آزاد ہو کر اپنے ملکی اثرات کا غلام ہو گیا۔ شاہان ہند (مثل علاء الدین[1] و خضر خاں وغیرہ) کی طرح سلاطین دکھن کے محلوں میں بھی ہندی رانیاں آئیں اور اُن کا گہرا اثر ہوا۔ سلطان یوسف عادل شاہ کی ملکہ بوبوجی[2] اور سلطان محمد علی کی بادشاہ بیگم مشہور بھاگ متی[3] تھیں، جنہوں نے پولٹیکل تھیٹر میں بڑے پارٹ (حصے) لئے۔ محل جب ایسی رانیوں سے آباد ہوں اور سلطان و وزیر جب اُن کے تابع فرمان ہوں تو اُن کی زبانوں کا اثر کس طرح نہ پڑتا اور اُن سے کون زیر نہ ہوتا ہو گا! علاوہ اس کے احمد نظام شاہ ترکی و ایرانی نہیں بلکہ اصلاً برہمن تھا، اور اسمٰعیل نظام شاہ کی ماں عرب اور ترکن نہیں بلکہ کوکنی تھی! اس وجہ سے وہاں کی زبان میں انقلاب کا آجانا، اور بعد کو ملکی زبان کا اُبھر آنا کیا مشکل تھا! مشہور گنگو (مرہٹہ برہمن) عربی و فارسی میں بھی فاضل اور عالم تھا۔ یہ مشیر سلطنت بنا اور اس کے قوت و اقتدار سے ملک میں بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ مرہٹے دفتر میں

---

[1] علاء الدین خلجی کی کملادیوی اور خضر خاں کی دیول دیوی کے نام جریدۂ عالم پر ہمیشہ ثبت رہیں گے۔

[2] بوبوجی مکند راؤ مرہٹہ کی بہن تھی۔ اس کے کارنامے تاریخ دکن میں مشہور ہیں۔

[3] یہ وہی بھاگ متی ہے جس کے نام پر بھاگ نگر آباد کیا گیا، جو بعد کو حیدرآباد بن گیا۔

گھسے اور آخر ابراہیم عادل شاہ کے وقت تک ملکی دفتر فارسی سے دکھنی ہوگیا! سلطنت کے شیروں اور اہل دفتر کی ریشہ دوانیوں کے آگے کسی اور کا زور کیا چلتا۔ ملا ظہوری اور محمد قاسم فرشتہ کو فارسی کے اقتدار کے لئے اپنا پسینہ بہاتے رہے مگر کوئی زبان کسی ملک سے گم ہوکر پھر نہیں ملتی۔ دکھنی اردو آخر بڑھی اور خوب بڑھی، اور پھر کچھ دنوں بعد عام زبان ہونے کا شرف حاصل کر لینے کے علاوہ وہ اہل علم و ادب کے اظہار خیالات کا آلہ بھی بنی، اور اب اسی دکھنی اردو میں جذبات نکلنا شروع ہو گئے!۔

دکھنی اردو کی شمالی اردو پر فضیلت۔ اردو کی تاریخ پر نظر کر کے خیال پیدا ہوتا ہے کہ جس زبان کو بابر نے منہ لگایا اور جو شاہ جہاں کی چہیتی کہلائی اس کا جوڑا دلی کے لال قلعہ میں قطع ہوا ہوگا۔ ہونا تو یہی چاہیے تھا، مگر ایسا ہوا نہیں! بلکہ اس کے خلاف اس کا جامہ دکھن اور وہاں کے معمولی گھر میں تیار ہوا!

سچ کہا ہے کہ ضرورت ایجاد کی ماں ہے۔ شمالی ہند میں ایک عرصہ تک فارسی عام اور حاکم و محکوم دونوں کے قلم کی زبان بنی رہی۔ اس وجہ سے اظہار مطالب و جذبات کے لئے کسی آلہ کی مدت تک ضرورت پیدا نہ ہوئی۔ برخلاف اس کے دکھن تھا جہاں عوام کی طرح سرکاری دفتر تک کی زبان ملکی ہو چکی تھی۔ اس لئے اب جو وقت آیا تو جذبات عام زبان میں لکھنے لگے۔ اس ایجاد نے دکھنی (اردو) کو شمالی اردو پر فوقیت دے کر افضلیت کا تاج اس (دکھنی) کے سر پر رکھ دیا!۔

اردو کا پہلا جامہ۔ یوں تو ہندوستان میں محمود (غزنوی) کی آمد کے بعد ہی سے واقعہ کربلا کی یاد تازہ کرتے رہنے کا دستور ہو گیا تھا، لیکن مغلئی دور سے قبل یہ غم و ماتم یہاں عام اور اسے دوام نہ ہو سکا۔ یہ واقعہ معمولی نہ تھا کہ اس کا اثر جلد مٹ جاتا۔ حجاز برابر اس سے متاثر رہا، اور عراق میں اس کی بدولت انقلاب پر انقلاب ہوتے رہے۔ بنی امیہ اسی کی پاداش میں فنا ہوئے، اور بنی عباس اسی غم کا علم اٹھا کر دنیا میں ابھر سکے۔ چنگیزیوں کے خروج

اور بغداد کی تباہی میں بھی اس کا نام شریک رہا۔ لیکن خاص پولٹیکل ضرورت کے علاوہ اور محض اخلاقی جہت سے اس واقعہ کو مدت تک کوئی اہمیت نہیں دی گئی۔ اور گو محقق طوسی[1] کے اثر سے عراق عرب و ایران میں یہ غم کچھ دنوں تک تازہ رہا، مگر ایران کے انقلاب نے اسے بھی صدمہ پہنچایا، اور آخر صفویوں کے زمانہ سے قبل وہاں بھی اس غم کو استحکام نہ ہو سکا۔

عرصہ کے بعد شمالی و مغربی ایران میں ایک بزرگوار شیخ صفی الدین (شاہان صفویہ کے جداعلیٰ) ظاہر ہوئے، جن کی بزرگی و کرامت اُن اطراف میں بہت مشہور ہوئی۔ انہوں نے اس واقعہ کے اخلاقی پہلو پر بھی نظر کر کے اُس کے جلوہ دینے میں فکر کی۔ شیخ کا مستقر اردبیل تھا ان کے مرید اُس حصہ ملک میں بہت تھے اس وجہ سے ترکوں اور خصوصاً ترکمانوں میں یہ غم و ماتم اثر کر گیا۔ لیکن جب تک فارس میں صفویوں کی سلطنت جم نہ لی اس واقعہ کو چنداں اہمیت حاصل نہ ہوئی اُنھوں نے اپنی مملکت کے قایم کرتے ہی اس غم کو رونق دینا شروع کیا، اور اُس وقت سے یہ ماتم ایرانیوں ہی کا نہیں بلکہ عام مسلمانوں کا قومی ماتم بن گیا۔

ہمایوں نے شیرشاہ کے ہاتھوں سے تنگ آ کر جب ایران کی راہ لی تو یہ غم والم وہاں جاری و ساری ہو چکا تھا۔ ہمایوں بھی اس قومی ماتم میں اُن کا شریک رہا۔ بیرم (خانخاناں دخان بابا) اس کا محرم و دمساز اس سفر میں اُس کے ساتھ تھا وہ ایرانی تھا اور اپنے بھائیوں کی خوبو سے واقف۔ اس معاملہ میں ہمایوں کو اُس نے اور ابھارا کہ ایران اُسکے موافق اور شاہ ایران اُس کا دوست ہو جائے۔ اس تدبیر سے سارا ملک ہمایوں کا طرفدار اور بادشاہ اُس کا حامی ہو گا۔

کہتے ہیں کہ شاہ فارس (طہماسپ) نے شاہ ہند (ہمایوں) کو امداد کا وعدہ کرتے وقت

---

[1] علامہ شیخ نصیر الدین طوسی علیہ الرحمۃ۔

اُس سے عہد لیا کہ بعد فتح ہند وہ اس غم و ماتم کو ہندوستان میں بھی تازہ کرکے زندہ رکھے گا۔ ہمایوں کو ایرانی لشکر کی مدد سے ہندوستان پر دوبارہ تسلط حاصل ہوا تھا۔ اس لحاظ سے اور پھر اپنے عہد کے خیال سے اُس نے اس واقعہ کی یادگار یہاں بھی قایم کردی۔ بیرم خاں اس میں پیش پیش اور ایرانی امراء کے ہمراہ اس غم کا علم برپا رکھنے پر ہمیشہ کمربستہ رہا، اور جب سے ایران کی طرح ہندوستان میں بھی اس واقعہ کی یاد عام ہوکر اسے استحکام ہوگیا۔

چونکہ ہندو بھی مسلمانوں کے اس قومی ماتم میں بے تکلف شامل ہوئے اس وجہ سے اس غم میں یہاں کا خاص رنگ بھی شریک بلکہ غالب رہا۔ قدیم مصریوں اور یونانیوں کی طرح ہندی بھی اپنی شادی وغم میں موسیقی کو خاص جگہ دیتے ہیں، اور وہ اُن کی ایک متبرک اور مذہبی چیز مانی جاتی ہے۔ مسلمانوں کے اس غم کا رواج یہاں اول اسی موسیقی کی آس سے پڑا اور بڑھا کہ اس کے درد کی انتہا نہیں، اور پھر ایک مذہبی قوم کے رنگ سے وہ جدا بھی نہیں!

اس ملک کی قدیم شاعری کا ذکر، داستانِ اردو کے دورِ اول میں آچکا اور یہ بیان کیا جاچکا ہے کہ بھاشا نے ویدوں سے کیا کُچھ لیا اور اُس کے ادب وشاعری نے کس طرح اخلاقی و مذہبی رنگ اختیار کرلیا۔ سنسکرت کی تقلید میں اس زبان (بھاشا) میں بھی اول بار زیادہ تر بھجن ہی نظم ہوئے، اور پھر اخلاق اور پند و نصایح سے یہ زبان سیر کی گئی۔ ایسی نظمیں عموماً دو، دو چار چار مصرعوں میں ختم کردی جاتی تھیں کہ جلد یاد ہوجائیں اور اُن کا اثر دیرپا ہو۔ دو مصرعوں والی نظم کا نام دوہا یا دُہرا پڑا، اور چار مصرعوں والی نظم کو چوبولا کہا گیا۔ یہاں جب اُس واقعہ عظیم کی یاد تازہ ہوئی تو اس طرح کی نظمیں بہت مقبول تھیں، اس لئے اس طرز و وزن میں وہ نوحے اور ماتم کہے گئے جو محرم کے جلوس میں ایک خاص لے اور دُھن میں پڑھے جاتے تھے۔ ایسی نظم عموماً قدیم بھاکا میں ہوتی تھی کہ ہر روگ کے لئے اُس سے موزوں تر زبان پیدا نہیں ہوئی۔ ان نظموں کا رواج بڑھا اور جب تک سوز ایجاد نہ ہولیا اور ان نوحوں اور ماتموں نے مسدس[1] کا رنگ اختیار نہ کرلیا اُس کا

[1] بعض لوگوں کا خیال ہے کہ مسدس کے بانی سودا ہیں۔ مگر صحیح نہیں۔ میر حیدر شاہ دکھن جو دلی گئے تھے اور ہیں اُن کے مسدس (مراثی) موجود اور ہمارے پاس بھی ہیں۔

زور کم نہ ہوا۔

شمالی ہند میں یہ غم اس طرح مانا اور محرم اس طرح منایا جاتا تھا، لیکن دکھن میں حالت بالکل مختلف تھی۔ ہمایوں سے کم وبیش نصف صدی قبل جب یوسف عادل شاہ کی بدولت وہاں کی ریاستیں (بیجاپوری و نظام شاہی وغیرہ) آزاد ہوئیں تو دکھن نے اس باب میں اور رنگ پکڑا۔ عادل شاہ نے نذر کی تھی کہ بیجاپور کی فتح اور اپنی مملکت کے قائم ہو جانے پر وہ خطبہ میں ائمۂ اہلبیت کے مقدس ناموں کو بھی شریک کرے گا۔ اور ان معصوموں کو اپنا ذریعہ نجات سمجھ کر غم محرم کو وہاں زندہ کردیگا۔ یہ دعا اور یہ نذر قبول ہوئی۔ اور تب سے اس کی سلطنت میں سرکاری طور پر بھی ہر سال یہ غم تازہ اور برپا کیا جانے لگا۔ اور پھر نظام شاہیوں اور قطب[1] شاہیوں میں بھی مجالس میلاد و مجالس عزا کا خاص[2] دستور ہو گیا۔

ہندوستان کی طرح دکھن میں بھی مجالس میں عموماً پرانی زبان کے نوحے اور مرثیے یا اخیر میں فارسی شعرا کا کلام اور خصوصاً محتشم کاشی کے (مشہور ہند) واقعہ خوانی کے طرز پر ایرانی لہجہ میں پڑھے جاتے تھے۔ مگر اول تو بھاشا کا سا لوچ، ہند کی کسی اور زبان میں نہ تھا، دوسرے دکھنی نوحہ وغم کے لئے زیادہ موزوں بھی نہ تھی، اور پھر وہ زبان پھیکی پڑ چکی، اور فارسی بھی وہاں سے گویا رخصت ہو چکی تھی، اور دکھنی اردو کا رنگ شوخ نکلا تھا، اس وجہ سے اب جذبات کا اس نئے رنگ میں نکلنا ضرور بلکہ ناگزیر ہوا، اور آخر اس نئی زبان (دکھنی اردو) کے مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا؛ جس کا سالار و سرتاج

---

[1] موجودہ سرکار نظام، قطب شاہیوں کی جانشین ہے، اس لئے وہاں بھی سرکاری طور پر محرم منایا اور اس کا غم کیا جاتا ہے۔

[2] جس طرح دلی میں دکھنی شہزادوں اور امیروں کی بدولت اردو کا نام نکلا، اسی طرح انہیں دکھنیوں کی وجہ سے وہاں مجالس عزا کا عام دستور ہو گیا۔

شیخ تاج الدین نوری[1] نکلا۔ اس کا دعوی و بیان ہے کہ،۔

کوئی نظم اسمیں تو کرتا نہ تھا — دلے سب تعصب دیا ہم مٹا

نہ کچھ خوف کھایا نہ جھجکا ذرا — و ہم مرثیے سے سہل کر دیا

شروع میں کیا نظم کل واقعا — دہم تک کا احوال پورا لکھا

میں جب اسکو لوگوں کے آگے پڑھا — عجب حال عاشور[2] خانہ میں تھا

---

[1] نوری، تین بزرگوں کا نام وتخلص ہے۔ ایک ملا نوری جو ہندوستانی تھے، دوسرے شیخ شجاع الدین نوری بیجاپوری جو ہمارے اس وقت ممدوح ہیں، اور تیسرے سید شجاع الدین نوری (گجراتی) جو تاناشاہ کے دربار میں تھے۔ ان تینوں کی شہرت اور ناموں کے ایک ہونے کی وجہ سے اشتباہ ہوئے اور تذکروں نے عجیب خلط مبحث کر دیا۔ انسائیکلوپیڈیا میں یہ نوری دکھنی اردو کے اول شاعر تسلیم تو کئے گئے لیکن ان کا زمانہ تاناشاہ کا عہد بتایا گیا! یعنے جبکہ دکھنی اردو کا آخری دور تھا، پھر چونکہ ملا نوری (ہندی) کو بھی ابو الفضل سے رابطہ رہا اس لئے یہ پہ اور شیخ شجاع الدین ایک سمجھ گئے کہ وہ بھی ابو الفضل وفیضی کے خاص لوگوں میں سے تھے۔

ملا امیر کابلی ایک مشہور مورخ ہے جس نے عہد جہانگیری میں تاریخ فتح گجرات لکھی۔ اسمیں وہ ناقل ہے کہ مرزا جان (اکبری) سے اور شیخ شجاع الدین نوری بیجاپوری سے خاص ربط تھا مرزا جان جب اکبر کے حکم سے گجرات جانے لگا تو فیضی کی صلاح سے نوری کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ شیخ نوری صاحب کمال تھا۔ اس نے اپنی زبان (دکھنی) میں واقعہ کربلا کا مفصل حال سب سے پہلے لکھا، اور یہ اوس کی ایجاد ہے! پھر صاحب تاریخ فتح گجرات نے یہ مقطع بھی درج کر دیا ہے،۔

اما ماں سے اسکا ملے گا صلہ — ہے نوری ہی موجد تو اس طرز کا

یہ تاریخ ایشیاٹک سوسائٹی میں تھی، اور پیرس کے نیشنل (قومی) کتب خانہ میں اسکا ایک تحفہ نسخہ موجود ہے۔ نوری کا یہ کلام اور اس کے اکثر مراثی مجھے حیدرآباد میں ملے!۔ [2] عاشور خانہ، امام باڑا۔

جن وانس کرتے تھے سب واہ وا　که دکھنی میں لکھا ہے کیا مرثیا

زباں اپنی میں کس نے ایسا لکھا　کبھی اس سے پہلے سنانے پڑھا

الاماں سے اس کا ملے گا صلہ　کہ ہے نوری ہی موجد تو اس طرز کا

معلوم ہوتا ہے کہ آج کی طرح اُسوقت بھی یہاں، ملکی چیزوں پر غیر ملکی اشیا کو فروغ دیا جاتا تھا اور زبان کے متعلق تو یہ بدعت عام تھی مگر قانون فطرت اس کے خلاف ہے، اور وہ غیر فطری چیزوں کو پامال کر دیتا ہے۔ اُسوقت بھی ایسا ہی ہوا، اور اب بھی ایسا ہی ہونے والا ہے۔ لیکن کم لوگ اسے سمجھتے اور بہت کم لوگ اسے برتتے ہیں۔ صد آفریں نوری پر کہ بروقت وہ فطرت کے اس راز کو سمجھا، اور بہت جلد اپنا فرض ادا کرنے پر تیار ہو گیا! اپنی زبان سے تعصب و نفرت کے غلط خیال کو اُس نے مٹایا، اور اُس سے رغبت و محبت کے صحیح خیال کو قائم کر دیا! یہ تھا اردو کا پہلا وہ جامہ جو دلی کے لال قلعہ کے عوض دکھن کے ایک معمولی گھر میں تیار ہوا، اور نوری کے سے خیاط کے ہاتھوں سے وہ اردو کے عریاں تیلے کو پہنایا گیا!

شیخ شجاع الدین اصلاً بیجاپوری تھا۔ سفر علم کا شوق اُسے دور دور لے گیا۔ بہت دنوں تک آگرہ میں ابوالفضل و فیضی کے ساتھ رہا۔ ابوالفضل کے بچوں کو پڑھاتا اور فیضی کو اسکی نل دمن کی ترتیب میں مدد دیتا رہا۔ نوری کی زبان اُس کے ہمعصروں بلکہ بعد کے شعرا اور ادبا سے بہت زیادہ صاف ہے، اور اس کی خاص وجہ اُس کا شمالی ہند میں قیام ہے، جہاں کی زباں بھاشا کی قائم مقام ہونے کی وجہ سے سلیس و صاف، اور ہمیشہ لوچدار رہی ہے۔

نوری نے اپنی زبان کی بسم اللہ اس واقعہ سے کر کے مرثیہ گوئی کا ایک مکتب کھول دیا ابراہیم عادل شاہ کے وقت میں ظہوری تک مرثیے کہنے بیٹھ گیا، مگر قصائد کی طرح اُس کے مراثی مقبول نہ ہو سکے؛ کیونکہ دہاں کی زبان میں مرثیہ گویوں کا ایک خاص گروہ پیدا ہو گیا تھا، اور مرثیے عام شہرت حاصل کر چکے تھے۔ نوری کے بعد ہاشم علی برہانپوری نے مرثیہ گوئی میں نام نکالا۔ اس کا ایک قطعہ بہت مشہور ہے۔ ۵

کوئی نہ تھا بیگانہ از ہند و خطا — ظلم تھا سب خویش و سب اقوام کا
ختم ہے یوں امتحان و یو بلا — ختم ہے جو حق سنیں پیغام کا
تھا برا اولادِ شفیع المذنبینؐ — ظلم بجید در جہاں اقسام کا
زخم لاگا مرتضیٰ کے سر اُپر — گر پڑا جوں آفتاب اس بام کا
زہر دے، مارے حسنؑ کو کرے — سبز تھا وو چہرۂ گلفام کا
کربلا میں تھا حسینؑ ابن علیؑ — آج غم ہے گا انہیں ایام کا

یہ ہے نمونہ اُس مرثیہ گوئی کا نوری نے جس کی ابتدا اپنی زبان میں کر کے اردو کا نام بلند کر دیا!۔

پُرانی تحقیقات کے بموجب چونکہ ولی نظم اردو کا باوا آدم تسلیم کر لیا گیا اس لئے یہ بھی یقین آگیا کہ غزلوں سے اس کی ابتدا ہوئی اور پھر سمجھ لیا گیا کہ محض گل و بلبل کی اس کی آشنائی رہی، اور اسوجہ سے ہماری اردو کا دائرہ تنگ نظروں میں ہمیشہ تنگ ہی نظر آیا۔ اردو نظم کی حکایت تو سُن چکے کہ اس زبان کی بسم اللہ کیونکر ہوئی۔ اب بعد کو نثر کا قصہ بھی دُہرایا جائیگا کہ اُس میں بھی اردو کی زبان پھوٹی تو اُسی ذکر میں جس نے عالم میں ایک صاف و سادہ اخلاق پھیلایا، اور ہمیشہ پھیلاتا رہے گا!۔

دکھنی ادب کا عروج و زوال۔ یہ سولھویں صدی عیسوی کا ذکر ہے کہ دکھن میں شعر و شاعری کی ابتدا ہوئی، اور سترھویں صدی کے آخر میں اُسکی انتہا ہوگئی! اس ڈیڑھ سو برس کے مختصر عرصہ میں وہاں ادب اردو نے جو ترقی کی وہ حیرت انگیز ہے۔

نوری و ہاشم نے تو زیادہ تر مرثیہ گوئی کو اپنا شعار زندگی اور اپنی عاقبت کا سرمایہ بنایا، لیکن اُن کے بعد وہاں کے ادب و شاعری نے قدم آگے بڑھایا، اور وہ ہر میدان میں نظر آئے، اور پھر تو مرثیوں کے ساتھ مثنویوں، قطعوں اور غزلوں کا خزانہ بھی جمع ہونا شروع ہوگیا۔ ہندوستان کی طرح وہاں بھی مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں نے اپنی مشترکہ

زبان کی پرورش و پرداخت اور اُس کے پروان چڑھانے میں بڑی فکریں اور جدو جہد کی کوششیں کیں۔ ان دونوں قوموں نے ملکر دکھنی اردو کا وہ ذخیرہ جمع کردیا کہ اُس سے کتبخانے بھر گئے اور اس کا نام اتنا بلند کردیا کہ ہندوستانیوں اور دلّی والوں کا وہ ورد زبان ہوکر اُن کے لئے ایک سبق ہوگیا۔ جن لائق حضرات نے اپنی زبان کی ایسی خدمتیں کیں اُن کا ذکر ایک نشست میں ممکن نہیں مگر اُن میں جو خاص طور پر مشہور ہوئے اُن کا ذکرِ خیر فرض ہے اور اُسے ادا کرتا ہوں۔

اُن میں اول رام راؤ یاد آتے ہیں کہ قطب شاہی امرا میں سے تھے۔ ہند و ہوکر جہاں اپنی رامائن کا قصہ دکھنی میں کہنے بیٹھے وہاں جنگ کربلا کی حکایت بھی سنائی اور اپنے عزیز بھائیوں (مسلمانوں) سے شکریہ اور داد لی۔

سیوا بھی خاص ذکر کے قابل ہیں جن کے مرثیے اس قدر مشہور و مقبول ہوئے کہ تخلص کے وزن اور تحریر کے اشتباہ سے اُن میں کے اکثر سودا (مرزا رفیع) کی تصنیف سمجھے گئے اور اُن کی کلیات میں آخر درج ہوگئے مگر زبان کا جوہری دونوں اُستادوں کے طرز و زبان کو بآسانی پرکھ سکتا ہے۔ سیوا نے ۱۶۸۱ء کے لگ بھگ روضۃ الشہدا اور قانون اسلام کی سی کتابیں لکھیں، جو بہت مقبول ہوئیں۔

بعد کو کاظم علی مرثیہ گوئی میں شہرۂ آفاق ہوئے ؎

اے نابکاراں! دیں کا چھپّر گرانا کہاں روا؟
سرورِ نبی کی آل کوں، یو دکھ میں نہالیا کہاں روا؟

انہیں کے ایک مشہور مرثیہ کا مطلع ہے۔ کاظم نے شاہنامہ کا خلاصہ بھی نظم کیا اور رستم و سہراب کی یادگار جنگ کا نقشہ اپنی زبان میں کھینچا۔

پھر فتح علی ادب و انشا میں مشہور ہوئے، اور اپنے تذکرہ (شعرا) کی بدولت زندہ ہے۔ اسی طرح افضل الدین خاں نے مثنوی راجہ رام لکھ کر شہرتِ دوام حاصل کی۔

قطب شاہ بھی چمکے اور اپنی مثنوی رسول اکرم (غالباً ۱۰۶۱ء) کے طفیل سے مشہور ہو گئے۔ دیدار صاحب اپنی مثنویات، ماہ منور (سوداگر بچہ) و شمشاد بانو اور دختر فرنگ کی بدولت فرنگستان پر بھی قبضہ کر بیٹھے۔ ان کی مثنویاں ترجمہ ہو کر وہاں مقبول ہوئیں!۔

نشاطی (ابن نشاطی) نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے زمانہ میں اپنی پھول بن (مثنوی) کا گلدستہ سجایا، جس سے باغ دکن مہک اٹھا۔ بادشاہ کے حضور میں یہ شعر عرض کر کے:۔

شہاں کا شاہ عبداللہ غازی　　اچھو تم حق سوں اسکی پیش بازی

سعادت کے نین کا نور ہے توں　　شجاعت کے گلشن کا سورے نوں

اُس نے اپنا وہ ہدیہ نذر کر دیا!۔

نصرتی۔ مولانا (ملا) نصرتی لقب۔ سلطان علی عادل شاہ (والیٔ بیجاپور) کے دربار کے ملک الشعرا۔ یہ دکھن کے میر حسن ہیں، جنہوں نے گلشنِ عشق کی سی بے نظیر مثنوی لکھی، اور اُس میں منوہر اور مدمالتی کے حسن و عشق کا مشہور قصہ نئے طرز و انداز پر نظم کیا۔ مثنوی میں چار ہزار سے اوپر اشعار ہیں جن کا اکثر حصہ اس وقت بھی پڑھنے بلکہ ورد کرنے کے لائق ہے۔ قصہ نہایت دلچسپ و رنگیں اور فارسی و ہندی تشبیہوں اور استعاروں سے بھرا ہوا ہے۔ قدیم زبان سے اگر قطع نظر کر لیا جائے تو گلشنِ عشق بلا مبالغہ (مثنوی) سحر البیان کا جواب ہے، اور اس پر نصرتی اور دکھنی جتنا فخر کریں بجا ہے! مولانا نے مثنوی کی ابتدا اپنے ایک سیر قصیدے کے اس شعر سے کی ہے:۔

رکھا ہوں گلشنِ عشق اسم اس رنگیں قصص کا میں
کرے جس جہت کے پھولاں کی فلک شوق سنے گلبانی

ہر تازہ بیان کے شروع میں اس قصیدے کے ایک شعر کی سُرخی ہے، اور اسی طرح مثنوی ختم کی ہے نعت کی بسم اللہ:۔

جو نعت سرورِ عالم محمد مصطفیٰ کا ہے
کھلایا گلشن ہستی اول جس نور کا پانی

منقبت:-

علی کا منقبت ہیکل محباں کے و لا کا ہے
علی کا اسم عالی لے کہ جم مشکل ہو آسانی

اپنے پیر کی تعریف میں۔

ثنائے حضرت مخدوم دیں سید محمد کا
کہ ہے یو عاشق سرمست جامِ قرب ربانی

اپنے بادشاہ علی عادل شاہ کی مدح میں:-

یو مدحِ خسروِ عالم علی عادل شہِ غازی
ہنر کے ملک میں جس سے سمجھ کا تخت ارزانی

معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی انہوں نے سلطان کے تقاضوں سے لکھی۔ بار بار بادشاہ کو مخاطب کر کے فخر و ناز کرتے اور بات بات پر داد کے امیدوار ہیں۔ اس کی اور اس کے بزرگوں کی مدح میں رطب اللسان ہیں، اور اسی بیان پر کلام کو شروع اور ختم کرتے ہیں۔ شروع

جو شاہ دکھن ہے علی جس کا ناؤں ترا سایہ تس سر اچھو جیو چھاؤں

ختم-

زہے شاہ عادل علی حق گزیں وہ سلطاں محمد کا ہے جانشیں
جگت گر، براہیم شاہ زمن کیا تھا جو کر باغ، ملک دکھن

گلشنِ عشق کی تاریخ تصنیف:-

کہا اس کی تاریخ یو ہجرتی مبارک یو ہے ہدیۂ نصرتی
۱۰۵۷ھ

بحری۔ نام قاضی محمود۔ صوفی مشرب عالم تھے، اور اس درجہ با وقعت کہ عالمگیر کے دربار تک پہنچ سکے
ان کا نام زیادہ تر ان کی مثنوی من لگن سے روشن ہوا۔ یہ صوفیانہ و عارفانہ مثنوی (تقریباً
ہزار اشعار کی) اورنگ زیب کے نام معنون کی گئی، اور (غالباً) دکھن ہی میں بادشاہ کو نذر دی گئی
اپنی اس مثنوی کا عنوان اور اسکا نام وہ یوں بتاتے ہیں:۔

ہر تن کوں تلاش جوں ہے تن کی — یوں من کو لگن ہے من لگن کی۔

پھر نفس کو مخاطب کرکے اپنا نام لیتے اور دعا کرتے ہیں:۔

بحری جو پڑا ہے غیر کے بار — اے غار کے یار اُسے ہو غمخوار

مثنوی کی ابتدا سنو۔ حمد

اے! روپ ترا رتی رتی ہے — پربت پربت، رتی رتی ہے

نعت۔

اوٹھ اے قلم! اس گھڑی نگر جائیں — ٹک نعت نگر کی سیر کر آئیں
ہے ناؤں احد، نشان احمد — سرمخفی سو احد ہے، پان احمد

منقبت۔

مولا کے محب نبی کے نائب — مانس نہیں، مظہر العجائب
ساگر ہیں پور معرفت کے — بل عین ہیں نور معرفت کے

بادشاہ کی مدح کرتے ہیں، مگر دیکھنا اُس میں کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ عالمگیر سے واقف اُسکی
تصویر سامنے کھڑی پائیں گے۔

اب بول توں مدح بادشاہ کا — ہور اُس کی کمالیت کلاہ کا
جس کی یو دو بال پن کی عادت — عالمگیری ہے، اور عبادت
یک ملک نہیں، جو آن لیا نہیں — یک نقل نہیں جو آن کیا نہیں

اس یک ملک میں اپنے ملک (دکھن) کی طرف بھی حسرتناک اشارہ ہے! ہمارا نقل سے

مراد بھیس، روپ، اور رنگ ہے، اور عالمگیر کا مختلف جامہ ا۔

پھر تعریف ہے:۔

ایسا نہ ہوا کسی شہاں میں — نا بلکہ کسی مشائخاں میں

جس ناؤ ا ہے ابوالمغازی — سلطان اورنگ زیب غازی!

عالمگیر کا کیرکٹر۔

دیندار، دلیر، ہور دانا — یک علم نہ، سب منے سیانا
ہیں

خود رائی و بے اعتباری۔

اب لگن تو کسی نہ رائے پوچھا — بن آپ نہ کسی پرائے پوچھا

جے فکر میں معنی اپنی آئے — بے فکر اُسے ظہور میں لیائے
(لائے)

(اپنی جی میں جوانی رہی گیا)
پیری میں جوانی کی امنگ!

اچہ عمر نوؤ برس کی، نوخیز — پاوک سے ترنگ پھیرتا تیز

اورنگ زیب پر نظر کرنے والا ایک بڑے سے بڑا مورخ بھی اس سے زیادہ کیا کہے گا۔ اُس کی خود رائیوں پر نعمت خاں بھی روئے ہیں، اور خافی خاں نے تو بادشاہ کے شکوک اور دنیا بھر پر بے اعتباری سے طرح طرح کے مضامین پیدا کئے ہیں! عالمگیر کا عروج و زوال دراصل اُس کی اسی خود رائی کی بدولت ہوا۔ شاباش قاضی محمود شاباش تم بادشاہ کے منہ پر اُس کی کل حقیقت بیان کر گئے! پروفیسر جادو ناتھ سرکار کو بحری کے یہ اشعار بھی پڑھ لینا چاہئیں!

من لگن کی تاریخ تصنیف۔

ہجری تو یہی کتک برس تھے؟ — بارا اُپر یک سو یک بیس تھے
۱۱۱۲ ہزار

احمد جنیدی؛ صاحب مثنوی ”ادوپیکر“ مشہور مثنوی ہے، اور وہ اسی کی بدولت دکھن میں چمکے۔ تذکروں میں خاص طور پر اس مثنوی کا تعریف کے ساتھ ذکر آتا ہے۔ اس کا ایک

بہت تحفہ نسخہ ٹیپو سلطان کے کتب خانہ میں تھا۔ امپیریل لائبریری کلکتہ میں بھی اس کا ایک نسخہ موجود ہے۔ یہ ۱۰۶۴ھ میں تصنیف ہوئی۔

الٰہی توں کر، یو نظم جگ اجال　　کہ ہووے تو جگ میں جوں محبوب شال
نبی کی سو ہجرت کا یو تھا قرار　　چہار سال تین بیس بھی یک ہزار

شاہ راجو حسینی۔ سلطان ابوالحسن تاناشاہ کے مرشد و مخلص۔ گولکنڈہ میں رہتے تھے۔ ان کے ایک مرید نے ۱۱۰۱ھ میں بہرام و گلدام نام ایک مثنوی لکھی اور برکت کے لئے شاہ صاحب کے نذر کردی۔ اس کا پہلا شعر یہ ہے۔

الٰہی! بچن کا مجھے تاب دے　　مری جیب کے تیغ کو آب دے

عاجز۔ سید محمد نام۔ عالمگیری سید ہیں۔ دنیا سے عاجز رہتے تھے، مگر اسی حال میں دو مثنویاں قصۂ فیروز شاہ اور قصۂ لال و گہر لکھ کر یادگار چھوڑ گئے!۔

فضلی؛ صاحب دہ مجلس۔ معرکہ کربلا میں یہ مشہور تصنیف ہے۔ میر صاحب (میر تقی میر) نے ان کو اپنے تذکرہ میں یاد کر کے سرفراز فرمایا ہے۔ ان کے ایک شعر سے ان کا رنگ کھل جائے گا!۔

رکھا ہوں نسیم جاں، جاناں! تصدق تجھ پہ کرنے کو
کیا سب تن کو میں درپن اچھوں درشن پیاسے ہوں

وجدی۔ شیخ وجیہ الدین نام، کرنول (ایک دکھنی صوبہ) کے رہنے والے مشہور بزرگ ہیں۔ شیخ صاحب نے خواجہ عطار (فرید الدین) کی منطق الطیر (مثنوی) کا خلاصہ اردو میں کیا، اور اس کا نام پنچھی نامہ رکھا۔ یہ تحفہ بہت مقبول ہوا۔ پنچھی نامہ چھپ بھی گیا ہے، عام طور پر (بمبئی میں) ملتا ہے۔

یہ مختصر ذکر تو اُن حضرات کا ہوا جنھوں نے ادب و شاعری کے ہر صنف میں اپنا کمال دکھایا، مگر دکھن میں بھی ہندوستان کی طرح ایسے متعدد شعرا گزرے ہیں جو زیادہ تر اپنی

غزلوں کی وجہ سے مشہور اور نام آور ہوئے۔ اُن کا شمار بھی آسان نہیں لیکن نمونہ از خروارے، چند وہ نام عرض کر دیے جاتے ہیں جو شہرت دوام پانے کا حق رکھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو ا

۱۔ احمدی: اپنے وقت کا مشہور غزل گو شاعر اور صاحب دیوان ہے۔

۲۔ آدمی۔ حیدرآباد کے پیرزادوں میں تھے۔ جوانی شعر و شاعری کے نذر ہوئی، اور بڑھاپا عبادت میں گزرا۔ اچھے گزر گئے۔ کلام میں تصوف کی بھی جھلک ہے۔ کہتے ہیں کہ

درپن ستی نگاہ کو مائل نکو کرو	یہ دو کھ اپس کے واسطے حاصل نکو کرو کہنی

۳۔ آزاد۔ فقیراللہ نام، حیدرآبادی۔ اکثر سیر و سیاحت میں رہتے تھے۔ فراقی د کے ساتھ دلی کی زیارت بھی کی۔ واقعی فقیر آزاد اور عاشق مزاج تھے، لیکن ناکام جب تو فرماتے ہیں۔

سب صنعتیں جہاں کی آزاد ہم کو آئیں
پر جس سے یار ملتا، ایسا ہنر نہ آیا

۴۔ احمد۔ گجراتی۔ فاضل تھے، اور سنسکرت و بھاشا کے پنڈت۔ اس زبان میں بھی تصنیفیں موجود تھیں۔ گو ولی کے ہمعصر ہیں مگر زبان صاف ہے۔

احمد بتا ئیں کیا کریں اب راہِ عشق میں
سر پر تو سا نجھ پڑ گئی اور پانو تھک گئے

۵۔ احمد۔ یہ دوسرے احمد ہیں جن کا اُسی زمانہ میں ظہور ہوا زبان کیسی پاکیزہ پائی تھی۔

ہوئے دیدار کے طالب، خودی سے خود گزر نکلے
نہ پائی راہ دانش میں خرد شناس بے خبر نکلے

۶۔ بیچارہ۔ ان بیچارہ کا پورا نام کسی نے نہیں لکھا اور حالات بھی نہیں مل سکے۔ اتنا معلوم ہوا کہ عالمگیر کے زمانہ میں دلّی کی طرف بھی آئے تھے۔ ان کے اشعار میں مزا اور بے تکلفی ہے

پی سے جدا ہونا نہ تھا، چاہا خدا یا یوں ہوا
جز صبر کچھ چارہ نہیں، بیچارہ ہو رہنا پڑا

تخلص کیا کھپا ہے۔

۷۔ خوشنود کہتے ہیں۔

سب رین جاگی سیج پر تو بھی سجن آیا نہیں
چھپ چھپ کے دیکھی باٹ تیں، درشن کو دکھلایا نہیں

افسوس!

۸۔ سراج۔ اورنگ آبادی ہیں، اور شاگرد سید حمزہ علی دکھنی۔ عالمگیر کے وقت میں جوان تھے۔ شعر ہے۔

اُس بن مجھ آنسوؤں کے شراروں کی کیا کمی
جس رات چاند نہیں ہے ستاروں کی کیا کمی

کیا شعر کہا ہے۔

مدت سے گم ہوا دل بیگانہ اے سراج
شاید کہ جا لگا ہے کسی آشنا کے ہاتھ

۹۔ شعور۔ ذہین و طباع تھے، اور شاعری کا شعور رکھتے تھے۔

برسات میں نہ دیکھا نظر بھر کر آفتاب
روشن یہ ہے کہ عاشق ہوا تجھ پر آفتاب

۱۰۔ شاہی۔ شاہ قلی خاں بھاگ نگری (حیدرآبادی) مرثیے بھی کہتے تھے۔ تانا شاہ کے ندیموں میں سے تھے۔ کلام اچھا تھا، اور دور دور پھیلا۔ ہندوستان بھی آیا۔

ملنا تمھن کا غیر سے کوئی جھوٹ کوئی سچ مچ کہے ‏ کس کس کا منہ موندوں سجن، کوئی کچھ کہے کوئی کچھ کہے

۱۱۔ صبائیؔ۔ احمد آبادی۔ اپنے وقت کے گویا نظیر اکبر آبادی تھے۔ حق کہا ہے۔

زر سے ہے آشنائی، زر سے ملے ہے بھائی

زر نہیں تو ہے جدائی، دنیا میں جو ہے زر ہے

۱۲۔ طالبؔ۔ مرزا طالب، برہنپوری (متصل اورنگ آباد) کے رہنے والے، عہد عالمگیر میں موجود تھے؛

ہُما کے خونِ چشم سے آلودہ کب کرے

وہ پگ جسے گرانی ہے رنگ حنا ستی

۱۳۔ عزیز اللہؔ اورنگ آبادی۔ اولیاء اللہ میں ان کا خود شمار تھا، مگر ایک غزل کی غزل اور ولیوں کے تذکرکے مقطع میں کہتے ہیں۔

مجھ ناتواں میں کیا سکت، جو بولوں ولیاں کی صفت

عاجز عزیز اللہ پہ دکھن کے سب پیراں مدد

۱۴۔ غوثیؔ۔ محمد غوث نام۔ خلف مولانا قطب الدین گجراتی۔ قاضی حیدر آباد صاحب حال وقال۔ اخیر میں حج وزیارت کے لئے گئے، اور وہیں کے ہو رہے۔

تیغ بھواں سے کن کہا گھائل نکو کرد

پلکاں کے خنجروں ستی بسمل نکو کرد

۱۵۔ غواصیؔ۔ ملّا غواصی، حیدر آبادی۔ جہانگیر کے وقت میں موجود تھے۔ پرانی دکھنی اور اُس طرف کی اکثر زبانوں سے آشنا تھے۔ کبت بھی کہے۔ کلام میں فارسی اور مرہٹی کا جوڑ ملا کر اتحاد کی صورت نکالتے تھے۔ طوطی نامہ ان کی معرکہ کی تصنیف ہے۔ شہزادہ سیف الملوک اور ملکہ بدیع الجمال کا حال مہینے بھر میں لکھا۔ کہتے ہیں۔

۱۰۲۷ برس ایک ہزار اور ستادیس میں

کیا ختم یہ نظم دن تیس میں

۱۶۔ فخری۔ معصر ولی، اور غالباً اسی ولی کے مرید بھی ہیں۔ کہتے ہیں :۔

جب دیکھوں میں تجھے تو چکا چوند لگ رہے
ہرگز کہیں دکھا ہے نظر بھر کر آفتاب

۱۷۔ فراقی۔ یہ وہی فراقی ہیں جن کے ساتھ فقیر اللہ آزاد دکھن سے ہندوستان آئے۔ زبان دلی کے اثر سے خالی نہیں۔ اس شعر کے مزے اور تیور کو دیکھنا!

فراقی! کشتہ ہوں اُس آن کا جیدم کہ وہ ظالم
کمر سے کھینچ کر خنجر چڑھاتا آستیں آوے

۱۸۔ قادر۔ میر عبد القادر حیدر آبادی۔ نہایت درویش مزاج اور اہل دل میں سے تھے ان کا تقدس مشہور ہے۔ اصل مرثیہ گو تھے، مگر اور صنف پر بھی قادر تھے۔ ان کی ایک رباعی سن لو، طبیعت کا حال معلوم ہو جائے گا۔

ہر چند ہمن سب سے اٹھایا ہے ہاتھ — اس پر بھی نہ آزاد کہایا ہیہات
عالم منے ہر ایک یہ کہتا ہوگا — دکھن میں ہے قادر اجھوں در قید حیات

۱۹۔ لطفی۔ لطفی دکھنی کے لقب سے مشہور ہوئے۔ لطف یہ کہ پورا نام کسی کو یاد نہ رہا! خیر شعر سنو، قافیوں پر نظر رکھنا!

تجھ عشق کی اگن میں شعلہ ہو جل اُٹھا جی — دل موم کے نمونے گل گل پگھل گیا ہے
بن عشق کی گلی میں گھائل پڑا ہوا ہوں — جوبن کا ماتا آکر مجھ کو کھندل گیا ہے

۲۰۔ مرزا۔ ابو القاسم۔ تانا شاہ کے مقرب اور جاں نثار تھے۔ بادشاہ قید اعدا میں پھنسا تو دل ٹوٹ گیا۔ امارت پر لات مار کر فقیری لے لی۔ محلہ عبد اللہ گنج حیدر آباد میں (مگر ہمارے منظر کا قدیم رسالہ عبد اللہ نہیں) پیر توڑ کر بیٹھے یاد اللہ کرتے رہے۔ وہیں ڈھیر بھی ہوئے۔

عارض نہیں کلف کا ترے گال سوں اچھا — سمجھیں ہمن کلف کو نہ تجھ خال سوں اچھا

مرزا! وہ نونہال کدھر مٹ گئے چمن
لگتا تھا جن کے ہاتھ پہ گل گال سوں اچھا

۲۱- محمود۔ محمود بیگ نام۔ بیجاپوری اور معاصر فخری ہیں۔
لوگاں کہیں پتھر سوں کچھ سخت نہیں ولیکن
جو کوئی پیا سوں بچھڑا وہ سخت ہے پتھر سے

۲۲- ملک۔ یہی نام اور یہی عرف و تخلص مزید ار شاعر تھے۔
تن من فدا کروں اُس ہشیار ساقی اوپر
یک قطرۂ مے چکھا کر جن بے خبر کیا ہے

۲۳- محق۔ واقعی تعریف کا مستحق ہے۔ زبان کی صفائی دیکھنا۔
تم ہر کسی سے وعدہ دیدار مت کرو
اپنی زبان سے جھوٹ کا اقرار مت کرو

۲۴- مہر علی۔ بڑے ظریف و خوش طبع تھے بزرگوں سے بھی مزاح کر بیٹھتے تھے۔
موتی دریا میں آپس کے تئیں کان لگ دھو دیں
کہ تمھن کان سے کے بناگوش کے ہمسر ہو دیں

۲۵- موزوں۔ خواجہ قلی خاں نام۔ بہادر شاہ کی طرف سے قلعۂ برہان پور کے قلعہ دار تھے قلعہ کی طرح زبان پر بھی قبضہ تھا بلا کا شعر موزوں کیا ہے۔
موزوں نے راہ عشق میں پھر اب قدم رکھا
ہے مصلحت سے دور نہ جانے کرے گا کیا

۲۶- نوری۔ سید شجاع الدین گجراتی ہیں، مگر حیدر آباد آئے اور سرفراز ہوئے تاناشاہ کے دربار تک پہنچے، مگر نہ چمکے۔ آخر سرہند چلے گئے، اور وہیں بجھے۔ معقول تصنیت کر گئے۔

نوری! اُپس کے دل کی کسی سے نہ کہہ تھا   حال بھلا اب اس سے دوانے، جو تھا سو تھا

۲۷- ولی- شاہ ولی اللہ- مشہور بہ بانیٔ ریختہ!

۲۸- ہاشم- اپنے ملک اور ہند دونوں کو یاد کرتے ہیں۔

دکھن اور ہند دو دلبر ہمن سوں بے حجاب اچھے
کہ کھڑی چاند سی، پر جن کے خط پیچ و تاب اچھے

یہ مختصر فہرست تو دکھن کے عام لوگوں کی پیش ہوئی، مگر وہاں کے شاہوں نے بھی اپنی زبان کو ہمیشہ سرفراز کیا، اور وہاں کے ادب کو امتیاز بخشا۔ قطب شاہی خانوادہ کے آخری چار بادشاہوں نے تو خصوصیت کے ساتھ اس جانب توجہ کی ہے۔ اس سلسلہ میں سلطان محمد قلی کا نام اول آتا ہے، معانی تخلص کرکے اپنی فصیح البیانی کا یوں دعویٰ کرتا ہے۔

زیبا ہیں دعوے شعر کے سب طبع اپنی سوں   بخشا فصیح شعر معانی کے تیں خدا

ایک اور مقام پر کہتا ہے۔

کھیلیاں ہیں کلیاں یوں ستی جوں نوبہار
مے پلا ساقی ہوا ہوں سر تہی بے اختیار!

سلطان محمد اس سلسلہ کی دوسری کڑی ہے، سلطنت کی طرح علم و ادب کا ذوق بھی اُس نے اپنے چچا (محمد قلی) سے ورثہ میں پایا تھا۔ میدانِ ادب میں اُس کے تیور ہی اور ہیں کہتا ہے۔

جگت حسن میں ہے ترا حسن محبوب
میں طالب ہوں تیرا، مرا توں ہے مطلوب

لیکن سلطان عبداللہ قطب شاہ (ہمعصر شاہ جہاں) کا رنگ کچھ اور ہے وہ تو ملک الشعرا ہونے کا بھی مستحق ہے۔ سلطان، صاحب دیوان اور سب طرح کی نظموں پر قادر ہے۔ اُس کا کلیات ٹیپو سلطان کے کتبخانہ میں محفوظ تھا اور اب اُس کا ایک نسخہ حیدرآباد کی سرکاری لائبریری میں موجود ہے۔ کلام الملک بھی ذرا سُن لو۔

معشوق وہی ہے جس کے منہ سنے
خورشید جمال دام لیتا

سلطان اپنی رعایا کے ساتھ بسنت مناتا اور کہتا ہے:-

رنگ بھریا گھر میں آج آیا بسنت
غیب سنے تازہ طرب لایا بسنت

اب اس سلسلہ[1] کے خاتم، سلطان ابوالحسن تانا شاہ کا نام لے کر اس بیان کو ختم کرتا ہوں بدنصیب تاناشاہ نے قید خانہ میں جو شعر کہا اُس سے اُس کی طبیعت کا اندازہ ہوسکتا ہے وہ کہتا ہے

کس در کہوں، جاؤں کہاں؟ مجھ دل پہ بھل بھراٹ ہے
اس بات کے ہوں گے سجن، یاں دل ہی باراباٹ ہے

بیکس بادشاہ کہتا ہے کہ اپنی حالت آخر کہوں تو کس سے اور کس کے در پر جاؤں؟ غم کی سل چھاتی پر ہے۔ ہاں سننے والے شاید ہوں مگر یہاں دل کے ٹکڑے ہو چکے۔

معلوم ہوا ہے کہ آل تیمور کے دانت دکھن پر مدت سے تھے۔ اکبر نے اُدھر مہم بھیجی

---

[1] نظام دکھن، قطب شاہی تخت و تاج کے مالک و وارث رہے ہیں۔ انھوں نے گزشتہ سلطنت کا ہمیشہ پاس کیا، اور زبان اردو کو فروغ بھی انھیں کی ذات سے ہوا۔ مرحوم محبوب دکھن اس زبان کے بھی عاشق و مالک تھے، اور موجودہ تاجدار دکھن اردو کے سرپرست و مربی اور اس زبان کے بے مثل شاعر و اُستاد ہیں۔ اعلیٰحضرت کی [illegible] شایع ہو کر اہل نظر کی آنکھوں کا نور بنے اور ابھی اور رشک دیدۂ شوق ہونے والے ہیں۔

دکھن کے امرا و وزرا نے بھی اس زبان کا ہمیشہ لحاظ رکھا۔ اردو کے ساتھ امرا پائیگاہ و پیشکاری کی دلچسپی مشہور ہے۔ اس سلسلہ میں (یادش بخیر) مہاراجہ سر یمین السلطنہ بہادر کا ذکر خیر فخر کے ساتھ کیا جاسکتا ہے کہ اپنے پیرومرشد محبوب دکھن کی توجہ سے انھوں نے اردو کے نام کو بلند کر کے بزم سخن کو شاد کر دیا!

اور پھر خود چڑھا، جہانگیر و شاہجہاں نے بھی آخر آخر تک دکھن کا پیچھا نہ چھوڑا، عالمگیر زمانہ شاہزادگی مدتوں اُس طرف رہا اور اُس زرخیز و ہُن ریز زمین کو ہمیشہ لالچ بھری نظروں سے دیکھا کیا اسکی شاہی کا وقت آیا تو ہند کو سمیٹ کر اور دلی کو بٹور کر ادھر لے گیا۔ مہینوں جنگ رہی، آخر بڑی حکمتوں سے قلعۂ گولکنڈہ سر ہوا۔ ابوالحسن (تاناشاہ) کو زوال آیا اور سلطنت گردی و ادب گردی، ساتھ ساتھ ہو گئی! دکھنی شعرا جن کی سلطنت کے دسترخوان پر جگہ تھی بھوکوں مرنے لگے، اور آخر تتر بتر ہو گئے! ان میں کے اکثر دلی پہنچے، کچھ عظیم آباد[1] (پٹنا) گئے اور بعضوں نے بنگالہ کی راہ لی اور مرشد آباد[2] میں مسند نظامت سے جا لگے اور فی الجملہ آسودہ ہو گئے!

اردو اپنے گھر میں۔ حق کہا ہے ابن مریم نے کہ پیغمبر ذلیل نہیں ہوتا مگر اپنے گھر میں! یہی حال اردو کا عرصہ تک دلی میں رہا۔ وہاں اور شمالی ہند بلکہ پورب[3] اور بہار کی شرقی سرحد تک گو زمانہ سے یہی زبان رائج اور ادھر کے لوگوں کا روزمرہ یہی تھی، مگر وقت پر وہ لاوارث بچہ کی طرح پرے ڈال دی جاتی اور عام طور پر خیالات و جذبات یا تو فارسی میں ادا کئے جاتے یا ٹھیٹھ بھاشا میں۔ اور جبکہ (ملک محمد) جائسی[4] اور عبد[5] الرحیم (خانخاناں) کے سے فاضل اس بدعت میں شریک ہوں اور ڈوڈنگر[6] مل اور

---

[1] جیسے بیاں آفریں دکھنی۔ [2] جیسے میر حیدر شاہ دکھنی اور مرزا ظہور علی خلیق۔ [3] پورب پرانے محاورہ میں دلی و آگرہ سے شرقی کو پورب کہتے تھے؛ یہاں تک کہ اودھ اور لکھنؤ بھی پورب ہی تھا لکھنؤ آکر میر نے کہا نہیں ہے؟؛ کیا بود و باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو۔ [4] جائسی نے ٹھیٹھ بھاشا میں پدماوت لکھی۔ [5] عبدالرحیم کے ہندی دہرے (دوہے) اتنے مشہور و مقبول ہوئے کہ انھیں مہاکوی (ملک الشعرا) کا خطاب ملا۔ [6] ڈوڈنگر مل بودیوں کے وقت کے اور پرانی وضع کے پنڈت ہیں گر فرماتے ہیں۔

دل خوں نشدے چشم تو خنجر نشدے گر　　رہ گم نشدے زلف تو ابتر نشدے گر

چندر بھان برہمن کے سے پنڈت تک اس کے محرم ہوں تو بدیگراں چہ رسد!
اس میں شک نہیں کہ بابر (بادشاہ) نے یہ مہر سکوت توڑی، اس زبان میں خود گویا ہوا اور اس کے گھر میں اردو کا چلن ہو گیا۔ ہمایوں غریب اپنی تاخت میں رہا ورنہ اس کا سا شاہ دل نہ معلوم اس میدان کو بھی کس طرح خرید تا۔ جیسا کہ قبل بیان[۲] ہو چکا ہے اکبر نے اس ملک کی رفاہ و ترقی کے لئے اور یہاں کا اتحاد بڑھانے کی خاطر جہاں اور تدبیریں کیں وہاں وہ اس زبان کی فلاح[۳] و اصلاح کی کوششیں بھی کرتا رہا۔ اس کے بعد شاہزادہ دانیال[۴] نے بھی اس زبان کے ساتھ بڑا اُنس و شغف دکھایا، اور پھر جہانگیر نے اپنے قلقل مینا کے ساتھ اس کی آواز نے سے بھی سرور حاصل کیا، اور پھر نور جہاں[۵] نے اپنی طبع موزوں سے اس میں جو کیف پیدا کر دیا زبان اُس کا مزا لیتی اور اس کے اس شعر سے لطف اٹھاتی ہے۔

دیں جگہ زخم جفا کو دل صد چاک ہیں ہم | دیکھیں گر کچھ بھی وفا اس بت سفاک میں ہم

پھر شاہجہاں نے جس طرح اس طفل (اردو) کی پرورش و نگہداشت کی وہ اُس کے شاہانہ خطاب اردوئے معلی سے ظاہر ہوتی ہے۔ بعد کو عالمگیر کے سے ہمہ گیر نے بزرگوں کے

---

[۱] چندر بھان (برہمن تخلص) یہ دہلی کا فر برہمن ہے جس کا یہ شعر ہے۔

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار | بکعبہ بردم و بازش برہمن آوردم

انھوں نے اردو کو بھی منہ لگایا مگر تعجب کہ اس میں زبان نہیں کھلتی۔ کہتے ہیں:۔

خدا نے کس شہر اندر ہمن کو لائے ڈالا ہے | نہ دلبر ہے نہ ساقی ہے، نہ شیشہ ہے نہ پیالا ہے

[۲]۔ داستان اردو کے حصۂ اول میں یہ قصہ دہرایا جا چکا ہے۔ [۳] کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ جہانگیر کی ایک عرضداشت پر اکبر نے یہ رباعی دستخط فرمائی۔

پوچھی جو گھڑی مجھ سے برائے عادت | تو وصل کی ساعت کی نہیں کچھ حاجت | ہو جاتی ہے ملنے سے مبارک ساعت | ساعت کا بہانہ نہیں خوش ہر ساعت

[۴] تذکروں نے دانیال کو فارسی شاعر ماننے کے ساتھ اردو کا شاعر بھی تسلیم کیا ہے [۵] تذکرۂ جلوۂ خضر

اس تحفہ کو بھی نگاہ رکھا، جس کی حکایت اُس کی چہیتی بیٹی زیب النسا، یوں سناتی ہے۔

آ کر ہماری لاش پہ کیا یار کر چلے خواب عدم سے فتنہ کو بیدار کر چلے

یہ حکایتیں گو خاندان مغلیہ میں اردو کے رواج بلکہ عروج کو ثابت کرتی ہیں؛ یہاں بحث خواص سے نہیں بلکہ عوام سے ہے جس کے متعلق کوئی شہادت موجود نہیں کہ عالمگیر تو عالمگیر، فرخ سیر و محمد شاہ کے عہد سے قبل کے جذبات بھی کثرت اور بے تکلفی سے اسی زبان میں نکلتے ہوں۔ بلکہ روایتیں اس کے برخلاف ہیں اور جیسا کہ قبل بیان ہوا، شمالی ہند میں اردو عرصہ تک "لاوارث" بنی رہی اور جب تک عالمگیر دکھن نہ گیا اور اُدھر سے اُس کا اردو نہ پلٹا، دلّی والے اپنے اس بچے سے غافل ہی رہے۔

دکھنی دربار اور دکھنی شعرا و مصنفین کا احوال ابھی سُن چکے ہو کہ اپنی زبان کے لئے انھوں نے کیا کیا۔ اُن کی کاوشوں سے دکھنی (اردو) اپنے عروج پر تھی کہ عالمگیر کا لشکر اُدھر پہنچا اور چھاؤنی چھا کر رہا۔ ادھر ولی (شمالی ہند) کے امرا و لشکری وہاں پہنچے تو اپنی زبان دکھنیوں کو سکھانے اور اُن کی خود سیکھنے لگے، اور جب عرصہ کے بعد گھر آئے تو سوغات میں وہ دکھنی تحفہ بھی ساتھ لائے جو اس طرف ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔

عالمگیر کے بعد اُس کے خلف بہادر شاہ نے دکھنی سلاطین اور شاہزادوں ہی کو نہیں بلکہ وہاں کے امرا کو بھی اپنی سلطنت میں جگہ دی، اور اُنھیں عزت کے ساتھ رکھا۔ ان سلاطین کے متوسلین بھی بہ کثرت اُن کے ساتھ ادھر آئے اور بہت جلد دلّی میں دکھنیوں کی ایک نوآبادی (کولونی) ہو گئی۔ ان دکھنیوں کے وجود سے دلّی پر خاص اثر پڑا، اور آخر

سلہ۔ فرخ سیر سے قبل اردو کی کوئی مستقل نظم و نثر مجھے اب تک نہیں ملی، اور غالباً ہے بھی نہیں۔

سلہ۔ بعد فتح دکھن، عالمگیر کو تو اپنی شرمندگی مٹانے کا کوئی موقع نہ ملا، مگر بہادر شاہ نے سلاطین و شاہزادگان دکھن کے ساتھ شاہانہ سلوک اور برتاؤ کئے۔ کہ اگلی کلفتیں ذرا دور ہو گئیں۔

آخر اُن کی بدولت اردو کے بخت ادھر بھی جاگنے لگے!۔

یہ دکھنی اپنی اور پونجی کے ساتھ اپنے ادب کا ہن بھی ہمراہ لائے تھے جو حاتمی کے ساتھ ادھر بھی بٹنے[۱] لگا۔ دلّی والے اپنے بچے (اردو) کو غیروں کی گود میں اس طرح دیکھ کر شرمائے اور پھر اُس کی طرف متوجہ ہوئے تو حق پدری ادا کرنے لگے نعمت خان عالی[۲] اور علامہ سید عبدالجلیل بلگرامی[۳] کے سے ادیبوں اور فارسی کے استادوں کا رنگ بھی اُسی وقت سے پلٹا اور آخر اُنھوں نے بھی اردو کو اپنا تکیہ کلام بنایا! پھر مرزا عبدالقادر بیدل[۴] اور میر جعفر زٹل کہ اعظم و معظم[۵] کے متوسلین میں سے تھے اور اُن کے ساتھ دکھن کی ہوا بھی کھا چکے تھے، پُرانی صف سے دو قدم آگے بڑھے اور اس طفل (اردو) سے بھی مخاطب ہوکر اسے چمکارنے اور اس کے سر پر شفقت کا ہاتھ پھیرنے لگے اُن کی اس توجہ اور اثر سے دلّی میں یہ بچہ پلنے اور بڑھنے لگا! لیکن اب تک جو کچھ ہوا وہ تفنن طبع سے زیادہ نہ تھا، اور یہ شرف محمد شاہی کے لئے اٹھا رکھا گیا تھا کہ یہ نونہال اُس کے زیر سایہ پلے اور شاہجہاں کی یادگاریوں پھولے پھلے!

---

[۱] اس طرح دکھنی لفظوں کے ساتھ وہ پرتگالی و ایطالوی لفظیں بھی ادھر کی سرمایہ ہوئیں، جو اُس ملک میں (بوجہ اختلاط پرتگیزی) مدت سے زبان زد تھیں، کمرا، میز، لیلام، ارگن وغیرہ ادھر ہی کا تحفہ ہیں

[۲] نعمت خان عالی کے حال کا اور اُن کے وقایع کا علم کسے نہیں۔ ہر پڑھا لکھا اُن کے کلام سے آشنا اور جانتا ہے کہ اپنی نظم و نثر میں وہ کس طرح اردو الفاظ کو سجاتے اور اپنے کلام کی زینت بڑھاتے تھے۔

[۳] علامہ عبدالجلیل۔ یہ سید جلیل بھی دکن میں عالمگیر کے وقایع نگار تھے۔ انہوں نے (راجہ اجیت سنگھ کی دختر کے ساتھ) فرخ سیر کی شادی کی تقریب و تہنیت میں ایک فارسی مثنوی لکھی، جس میں یہ صنعت رکھی کہ فارسی کے ساتھ اردو کے الفاظ بھی جواہر کی طرح جڑے، اور فارسی و ہندی (کہ بادشاہ مغل تھا اور رانی ہندی!) کا مناسبت کے ساتھ جوڑ ملا دیا۔ یہ بزرگوار مشہور سید آزاد بلگرامی (صاحب خزانہ عامرہ) کے نانا اور بڑے پایہ کے فضلا میں سے تھے [۴] مرزا عبدالقادر بیدل عظیم آبادی (پٹنہ) وہ صاحب کمال ہیں جن کی نظیر

غزل

از جناب مولوی مرزا محمد بہادر صاحب یاؔدر ڈسٹرکٹ جج و مجسٹریٹ ضلع بید

بیاں کس سے مصیبت کیجیے اے ہمنشیں اپنی
اُدھر ہے آسماں دشمن ادھر دشمن ہیں اپنی

جھکے جاتے ہو کیوں اتنا دبے جاتے ہو کیوں اتنا
جھکا دُ غیر کی چوکھٹ پہ آخر کیوں جبیں اپنی

گرے نظروں سے گر گرتے ہی جاؤ گے سنبھل جاؤ
گنوا دنیا نہ عزت ہاتھ سے اپنے کہیں اپنی

سنا ہے وہ نہیں سنتے سنائیں کس کو پھر جا کر
اگرچہ کان تک پہنچی بھی آواز حزیں اپنی

یقیں ہے راہ پر آجائیں گے جو دور ہیں یاؔدر
پہنچ جائے گی کانوں تک جو آواز حزیں اپنی

بقیہ حاشیہ صفحہ (۳۲)

دنیا میں آسانی کے ساتھ نہیں ملتی۔ یہ ترک وطن کر کے اخیر میں دلی جا رہے، اور وہاں شاہزادہ محمد اعظم کی سرکار سے توسل رکھتے تھے۔ اُس کے ساتھ مدتوں دکھن میں بھی رہے۔ اُس وقت تک کے امراء ان کا بیحد ادب و لحاظ کرتے اور اُن کی شاگردی کا دم بھرتے تھے۔ آخر عمر میں نظام الملک آصف جاہ (والیٔ دکھن) کے سے امیر نے باشتیاق و بہ کمال خلوص اُنھیں دکھن طلب کیا، مگر یہ شعر جواب میں عرض کر بھیجا اور گھر بیٹھے۔

دنیا اگر دہند نہ جنبم ز جائے خویش
من بستہ ام حنائے قناعت بپائے خویش!

امیر الامرا سید حسین علیخاں کے ساتھ ان کے ربط وضبط کی حکایتیں مشہور ہیں۔ ان کے کمال پر نظر کر کے نواب نے ایک مرتبہ تین لاکھ روپیہ ان کے گھر بھجوایا، لیکن قناعت کے گھر میں اس کی گنجایش نہ دیکھ کر مرزا صاحب نے بعد شکریہ واپس کر دیا! ایک دفعہ یہ کہیں سفر میں تھے کہ قافلہ کے ساتھ یہ بھی لُٹے۔ ایک دست امیرزادہ کو یہ شعر بھیجکر امیر ہو گئے۔ ؎

عینکے با پارہ سیماب باقی ماندہ است
چشم بیخواب و دل بیتاب باقی ماندہ است

جس کو دیکھو نیند کا متوالا۔ دنیا و ما فیہا سے خبرے ندارد۔ ہر ایک کی آنکھ میں حیرت کا سرمہ کھچا ہوا جس و حرکت آئینہ تمثال نقش قالیں بنا ہوا۔ ٹھنڈے ٹھنڈے ہوا کے جھونکے کھاتا ہوا خواب شیریں سے ہم بغل ہے یہ ایک عالم اور ہی ہے انسان تو انسان اپنی خبر تک نہیں کہ کہاں تھے اور کیا ہوئے۔ دنیا کیا چیز ہے اُس کے نقش و نگار جو نظر کے روبرو ہیں کس کے شیون ذات کی ایک خاص سبزی ہے۔ اُن پر بھی حجاب حائل ہو گیا گویا آئینہ پر غبار آگیا کہ نہ تو اپنی صورت ہی نظر آتی ہے نہ خود آئینہ کی آب و تاب محسوس ہوتی ہے پرند چرند حشرات الارض بھی اس سے چھوٹے نہیں۔ اپنے اپنے آشیانوں۔ گھروں۔ دروں۔ سوراخوں میں اُسی غفلت و بیخودی اور بیفکری کے ساتھ آرام پاتے ہیں جن کو دام و صیاد کا خوف نہ قفس و باغباں کا وہم و گماں۔ سیر گلشن کا خیال ہے نہ پر پرواز اُن کے قابو میں ہیں۔ نہ فصل بہاری کا ذوق و شوق۔ نہ خزاں کا رنج و غم۔ نہ کسی چمن آراء کے خیر مقدم کی خوشی میں زمزمہ سنج۔ نہ خوف دام صیاد سے مبتلائے رنج۔ بلکہ مرنجان مرنج ہیں۔ کاروبار جہاں میں گو خواب سب کے لئے خلل انداز ہوا مگر دلی خیالات نے پر پرواز پیدا کئے۔ ادراک کا دروازہ کھل گیا۔ اس قلمرو میں پہنچکر بسر کر رہے ہیں جہاں امن و اماں کی منادی پھیر دی گئی ہے کہ پتے پتے ورق ورق پر مہر صُمٌّ بُکمٌ ہے پانی نہروں میں موجود مگر شور نہیں۔ سمندر میں موجیں دست و گریباں ہیں مگر زور نہیں۔ سرو کی سرکشی ایسی نظر بند ہے کہ کسی کی نظر اُس پر پڑتی ہی نہیں۔ سینہ زوری کے بگولے اس صحرائے توری میں اٹھتے ہی نہیں۔

زلف سنبل کا رنگ سیاہ ہے مگر سیاہ کار نہیں۔ خم بدستور موجود مگر پیچدار نہیں۔ سر شمشاد پر طرہ ہے مگر طرار نہیں۔ نرگس کو شوخ چشمی سے سروکار نہیں۔ دھوپ اپنا رنگ پھیکا پڑتے دیکھ کر شرم سے ٹل جاتی ہے۔ نسیم آتی ہے مگر دبے پاؤں نکل جاتی ہے۔ صبح کا دہاں گزر کہاں اور یہ مجال اور یہ تاب کہاں کہ دم مار سکے۔ یا باد صبا اپنے

نازک پاؤں کی آہٹ سے غنچوں کو اُبھار سکے۔

پھول ہنستے ہیں مگر عقدہ راز وا نہیں ہوتا۔ غنچہ چٹختا ہے مگر شور بپا نہیں ہوتا۔ مرغ خوش الحان موجود مگر بے نغمہ وصوت گاتے ہیں۔

برگ سے برگ نہ کھڑکتا ہے اور نہ خار کی نوک سے کسی کا دامن اٹکتا ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ باغبانِ قدرت کے اس باغ عالم بیخودی کا تختہ دیکھنے کے قابل ہے۔ جہاں سوا امن وامان کے شوروشر کا نام نہیں۔ نہ در و درباں کی ضرورت ہے نہ کسی پاسباں کی حاجت۔ اس خواب امن کا لطف اُن کے دل سے کوئی پوچھے جن کے بخت جاگتے ہوں اور دل روشن ہوں ورنہ سب زندہ لیکن بشکلِ مردہ حقیقت [illegible] ہے

نیند اُس کی ہے دماغ اُس کا ہے راتیں اُس کی ہیں
تیری زلفیں جس کے بازو پر پریشاں ہو گئیں

فغانِ سرشار

از جناب صدرالدین صاحب سرشار (کسمنڈوی)

یہ تو غلط ہے عشق نے خوگر غم بنا دیا
مجھ کو مرے کریم نے دل الم آشنا دیا

آ کے مرے مزار پر شمع وہ خود جلا گئے
آج تو سوز عشق نے اپنا اثر دکھا دیا

میرا چراغِ آرزو میری امید و بیم نے
شام ہوئی جلا دیا، صبح ہوئی بجھا دیا

جلوہ فزا ہوا پھر آج محفل ناز میں کوئی
حوصلۂ نیاز نے پھر مجھے گدا دیا

دل میں ہے درد، چہرہ زرد، خشک ہیں لب، تو چشم تر
تم نے تو اک غریب کو پیکرِ غم بنا دیا

پوچھ نہ شرح بیکسی اُس الم آشنا سے تو
اپنا چراغ آرزو جس نے کہ خود بجھا دیا

شہید وفا (۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

جب سے انگشتری طلائی
اینک نے اس کو تھی پنہائی

پہلا موقعہ تھا یہ کہ اپنی
شوہر کے خلاف منہ سے بولی

لڑتی اس سے مجال کیا تھی
سو طرح سے لیکن التجا کی

لیتی تھی بلائیں رو کے ہر بار
کرتی تھی تر آنسوؤں سے رخسار

یہ دل میں سما گئی تھی اس کے
ہوگا نقصان اس سفر سے

کہتی تھی نہ میری آس توڑو
ننھے بچے ہیں گھر نہ چھوڑو

میرا نہ کرو خیال پیارے
کیا تم کو نہیں یہ لال پیارے

سر میں اس کے سمائی تھی اور
کہنے پہ کیا نہ اس کے کچھ غور

منظور جو ان کی بہتری تھی
اس واسطے سب یہ بے رخی تھی

اپنی کی نہ ایک بات مانی
دل سخت کیا جدائی ٹھانی

+ + +

یعنی کشتی کیا مہیا
اسباب تجارت اس نے سارا

کمرہ جو نشست کا تھا باہر
دروازہ جس کا تھا سڑک پہ

سارا اساماں واں جمایا
الماریوں سے اُسے سجایا

آری کبھی لی کبھی بسولا
دوکان کا یوں بنا ہیولا

اس کام سے روکتا وہ کیا ہاتھ
کام اپنی کا تھا جان کے ساتھ

منتی کہ جگہ وہ مختصر سی
آراستہ ہو گئی بخوبی

موزوں جس شے کا جو محل تھا — موقع سے اُسے وہیں پہ رکھا
باغ فطرت کا جیسے مالی — پھولوں سے سنوارے گل کی ڈالی
کھٹ پٹ جو یہ مچ رہی تھی گھر میں — ہوک اٹھتی تھی اینی کے جگر میں
اینی غم سے ہوئی تھی مبہوت — گویا بنتا تھا اُس کا تابوت
سب کاموں سے ہو چکی جو چھٹی — شب آئی وداع آخری کی
اینک از بس تھکا ہوا تھا — آرام سے نیند بھر کے سویا

+ + + + +

جب صبح بلا نے منہ دکھایا — رخصت کا وقت سر پہ آیا
بشاش رہا وہ صورت گل — مردوں کی طرح کیا تحمل
فرقت کا ملال جو تھا جی میں — وہ ٹال دیا ہنسی ہنسی میں
تھی اُسکو نہ اور کوئی بھی فکر — اینی کو ملال ہے یہ تھی فکر
لیکن اس پر بھی پیش غفار — مانند بہادران دیندار
شرط طاعت بجا وہ لایا — سر کو رہ عجز میں جھکایا
اس حد میں جب آگیا کہ ہوداں — انساں ہیں خدا خدا ہیں انساں
کی حق سے دعا کہا خدایا — جو چاہے ہو وہ حشر میرا
لیکن بچے یہ اور یہ بی بی — دیتا ہوں پناہ میں میں تیری
یارب انہیں بامرام رکھنا — رحمت کی نظر مدام رکھنا
فارغ جب ہو چکا دعا سے — بولا اُس صاحب حیا سے
اینی یہ سفر جو اُس نے چاہا — ہم سب کے لئے سعید ہوگا
دیکھو سب ٹھیک ٹھاک رکھنا — گھر کو صاف اور پاک رکھنا
پلٹونگا میں ایسے وقت پیاری — ہوگی نہ تمہیں خبر بھی جس کی

چھولے کی طرف یہ کہہ کے آیا — آہستہ سے بیٹے کو اٹھایا
بولا کیا داہنی پان ہے یہہ — کیسی ننھی سی جان ہے یہہ
لیکن اسی ضعف کے سبب سے — ہے مجھہ کو عزیز یہ سب سے
اللہ جو لائے اس کو پروان — پلٹوں گا سفر سے جب میں اس آن
آغوش میں بیٹھے گا یہہ آکے — میں حال سفر کہوں گا اس سے
ہر طرح سے خوش اسے کرونگا — ہر ملک کی داستاں کہونگا
فی الحال تمھیں ہی اور اسے بھی — دیتا ہوں امان میں خدا کی
پیاری یہ کہکے اٹھاؤ اپنا جی اب — رخصت کر دو ہنسی خوشی اب

✢ ✢ ✢ ✢ ✢

دونوں کی یہ گفتگو ہوا کی — چپکی وہ غمزدہ سنا کی
دل کو ہر طرح سے سنبھالا — امید پہ غم کو اس نے ٹالا
لیکن جب اور ذکر آیا — پلٹا کچھ گفتگو نے کھایا
اکثر کرنے لگا نصیحت — جیسی ہے سپاہیونکی عادت
اللہ کا آسرا بتایا — تسلیم و رضا کا ذکر لایا
خاموش رہی کہا نہیں کچھ — کچھ اس نے سنا سنا نہیں کچھ
جیسے کوئی گانوں کی اکیلی — بیٹھی ہوئی نہر پر اکیلی
رکھ کر خالی گھڑا تہ آب — خود بھی خیال میں ہو غرقاب
ہو بیش نظر وہ بار جانی — بھر کے اسے دیتا تھا جو پانی
حتیٰ کہ گھڑا بھرے چھلک جائے — لیکن یہ سنے بھی اور نہ سن پائے

✢ ✢ ✢ ✢ ✢

القصہ سنکے ساری گفتار — گویا ہوئی یوں وہ آخر کار

ہشیار ہو عقلمند ہو تم　　سب سچ ہے بجا ہے جو کہو تم
صاحب ہے مجھے مگر یہ کھٹکا　　دیکھوں گی نہ میں تمھیں دوبارا
اینک نے کہا اگر یوہیں ہے　　میں دیکھوں گا تم کو شک نہیں ہے
اپنی! پیاری! جہاز میرا　　اس روز کریگا یاں سے پھیرا
دیکھو تاریخ یہ نہ بھولو　　وسواس رہے نہ جیسی جی کو
ساحل پر آ کے دور ہی سے　　اُسدن مجھے دیکھنا کہیں سے

+ + + + +

وہ آخری وقت آخر آیا　　منہ جبکہ فراق نے دکھایا
اینک کہنے لگا کہ اپنی　　للّٰلہ سنبھالو دل کو پیاری
اپنے جی کو بحال رکھو　　بچوں کا بہت خیال رکھو
کیا کیجئے ہے ضرور جانا　　لیکن جب تک ہو میرا آنا
ہر چیز کو ٹھیک ٹھاک رکھنا　　گھر مثلِ جہاز پاک رکھنا
ہونا غمِ ہجر سے نہ مضطر　　ہر امر میں ہو نظر خدا پر
لطف و کرم خدائے اکرم　　ہے لنگر کشتیِ دو عالم
کیا اس کا گزر نہیں وہاں پر　　ہے جلوہ گہ سحر جہاں پر[۵]
جاؤں بالفرض میں وہاں تک　　اُس سے بھاگونگا پر کہاں تک
دریا ہے اُسی کا بحر اسی کا　　ان سب کو اُسی نے ہے بنایا

+ + + + +

یہہ کہہ کے وہ نیک مرد اٹھا　　پہلو سے مثالِ درد اٹھا
الفت سے گلے میں ہاتھ ڈالا　　گرتی ہوئی اپنی کو سنبھالا
دہشت زدہ بچوں کو کیا پیار　　لیکن سوتا تھا طفل بیمار

۵۔ ممالک مشرقی

ماں نے جو اُسے جگانا چاہا — اینک نے اس کو باز رکھا
یہ کہہ کے کیا اُسی طرح پیار — سونے دو اسے کرو نہ بیدار
بچہ ہے اگر ہوا بھی ہشیار — اس حال سے ہوگا کیا خبردار
تب ماں نے لٹ ایک اُسکی کاٹی — دی باپ کو بیٹے کی نشانی
لیکر یہ یادگار اینک — پاس اُس کے رہی جو مرتے دم تک
اُٹھا، دابا بغل میں بستر — رخصت ہوا الوداع کہکر

* * * * *

جو دن اینک نے تھا بتایا — وعدے کا وہ روز جبکہ آیا
اپنی خوشی ہو کے مانگ لائی — جھٹ پٹ اک دوربیں کسی کی
لیکن کیا جانے کیا ہوا پھیر — شاید تھا دوربین کا پھیر
یا اپنی نگاہ کی برابر — ٹھیک اُس کو نہ کرسکی وہ مضطر
یا آنکھوں میں دھندھ چھا گئی تھی — لغزش ہاتھوں میں آگئی تھی
تھا پیشِ نظر جہاز جب تک — کرتا رہا گو اشارے اینک
پر اس کی مراد نہ بر آئی — صورت اُس کی نظر نہ آئی

(باقیدارد)

غزل

از جناب مولوی عبداللہ خاں صاحب کامل

ہرکہ بانور خرد سرِّ معانی دانست — کار دنیائے دنی را ہمہ فانی دانست
میکنی جہد کہ واقف شوی از اسرار وجود — ایں معما بحقیقت نتوانی دانست
آنکہ شد شیفتۂ طرز کلامِ عثمان — گفتگوئے ز لبش سحر بیانی دانست
کاملا دیدۂ من ہیچ نیاموخت مگر — ہاں بہ تقلیدِ سحاب اشک فشانی دانست

نقش قدم

باب چوتھا

بیاٹریس

"مہربانی فرماکر ذرا ٹھہر جائیے۔"

"کس لئے؟"

مسٹر ٹریورز۔ آپ ایسا خیال نہ کیجئے کہ میرے ہر سوال میں کوئی گہرے معنی پوشیدہ ہیں۔ میں قسمت کو ٹٹول رہا ہوں۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ مجھے ایک جملہ سے ایسا پتا چل جاتا ہے جو کامیابی کی طرف دلالت کر سکے۔"

اس کے چہرہ سے تسکین ظاہر ہوئی۔

"جی، جناب میں سمجھ گیا۔"

میں چاہتا ہوں کہ نیچے سے اوپر تک اس مکان کا اور مکان والوں کا امتحان کروں۔ اور ہر شخص سے جو یہاں مقیم ہے۔ آپ سے لیکر پکانیوالی تک سب سے سوال کروں اور اسیوقت میں اپنی کوئی رائے قائم کر سکونگا۔"

بہت ٹھیک۔ میں ایسے گہرے معاملات کے سمجھنے کا عادی نہیں ہوں آپ دیکھتے ہیں کہ میں حواس باختہ ہو رہا ہوں۔ یہ بات بھی مجھے زیادہ غمگین کرتی ہے کہ میرے چچا میں اور مجھ میں آخری وقت یہ ناچاقی ہو گئی۔"

"گویا آپ کا مطلب کل رات سے ہے۔"

"جی ہاں۔"

انکی صاف گوئی مجھے بہت بہائی - یہہ محبت کی نشانی نہیں تھی - اسپر بھی اس بات کو بیگناہی کی یقینی شہادت قرار نہیں دیا جاسکتا تھا - شاید یہہ بھی بناوٹ ہو -

"آپ سے اون سے جو جھگڑا ہوا اوس کی نوعیت کیا تھی؟"

"ہمیشہ مس ہاتھورن درمیان میں ہوتی تھیں..."

"کیا اس کے علاوہ اور بھی کبھی ایسا اتفاق ہوا تھا؟"

"بارہا"

"اُس امر کے متعلق؟"

"اُسی امر کے متعلق"

"یہہ آخری جھگڑا کسطرح شروع ہوا؟"

"چچا نے مجھ سے پوچھا کہ کیا تمنے اس خاص امر کے متعلق اپنے دل میں مصمم ارادہ کرلیا ہے - میں نے جواب دیا کہ میرے ارادہ میں کوئی تغیر نہیں ہوا ہے - بیاٹریس کو میرے ساتھ عشق ہے - اور اُنھوں نے میرے ساتھ شادی کرنیکا وعدہ کرلیا ہے - میں اون سے کسیطرح سے بھی دست بردار نہیں ہوسکتا - آپ چاہیں تو مجھے اپنے مکان سے نکالدیں میں چلا جاؤنگا لیکن مس ہاتھورن کے منگیتر کی حیثیت سے"

"آپ نے بہت معقول جواب دیا - پھر آپ کے چچا نے کیا کہا"

"اُس پر ان کو بہت غصہ آیا - انھوں نے مجھے گھونسا بتلایا اور کہا کہ ایک لڑکے کیوجہ سے وہ ہرگز اپنے خیال سے باز نہ آئیں گے - کیونکہ اونھوں نے بیاٹریس کی بچپن سے پرورش اور حفاظت کی ہے - وہ ان کی ہے - اور وہ ہر شخص سے مقابلہ کرینگے جو اوس کو اون سے چھیننا چاہیگا - یہہ اور بہت سی ایسی باتیں ہیں جو ناگفتنی ہیں -

"باوجود اس کے آپ نے اون کی گالیوں کی بوچھار کو برداشت کیا؟"

"جب اونھوں نے اپنی گالیاں ختم کیں تو میں نے اون سے کہا کہ میرا خیال اونکی نسبت کیا ہے۔ اور ایسی حالت میں میں اون کے مکان میں ایک دن بھی رہنا پسند نہیں کرتا ہوں"

"جس وقت آپ یہاں تھے۔ تو کیا ان کی میز کا خانہ کھلا ہوا تھا۔ اور یہہ کاغذات اسیطرح سے بکھرے ہوے تھے؟"

"میز کا خانہ تو کھلا ہوا تھا۔ مگر کاغذات بکھرے ہوئے نہیں تھے"

"تو غالباً آپ کے جانیکے بعد انھوں کاغذات تلف کرنے شروع کئے ہونگے؟"

"شاید"

"غالباً یہ کاغذات وہ ہونگے جن میں آپ کو کچھ روپیہ دینے کے متعلق تحریر ہوگا"

"یہہ بات اون سے کچھ بعید نہیں تھی۔ میں نے اوس رشتہ کو جو اون میں اور مجھ میں مربوط تھا قطع کر دیا جبکہ میں نے اپنی سے دست بردار ہونے سے انکار کیا"

یہہ شخص کس سکون و وقار کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا! مجھے ایک ایسے شخص سے سابقہ پڑا تھا جو ایک معمّا نظر آتا تھا۔ ایک وقت تو میں اوسکا دلدادہ نظر آتا تھا۔ اور دوسرے لمحہ میں مجھے بدگمانی ہوتی تھی کہ شاید وہ کوئی گہری چال چل رہا ہے جس سے مجھے ہوشیار رہنا چاہئے۔

"اس مکان میں آپ کے اور مس ہاتھورن کے علاوہ اور کون ہے؟"

"ایک بوڑھی بی بی جو چچا ڈانیل کی پھوپی ہیں یہہ بالکل بہری ہیں۔ اور اکثر اپنے کمرے ہی میں رہتی ہیں۔ ان کے علاوہ میری نام ایک پکانیوالی۔ اور ایک اوپر کے کام کی ان دونوں کا کمرہ مکان کی سب سے اوپری منزل میں واقع ہے۔

"کیا سب اتنے ہی لوگ ہیں؟"

"جی ہاں"

"اب میں اوس لڑکی کو دیکھنے کے لئے تیار ہوں"

"تو میں ان کو بلائے لیتا ہوں"

"ذرا اور ٹھہر جائیے۔ یقیناً آپ ان کو یہاں نہیں لائینگے جہاں یہہ مردہ پڑا ہوا ہے!"

"میں نے اس کا مطلق خیال نہیں کیا" یہہ کہکر وہ تھرّا گیا۔

"یہہ تو کہئے کہ یہہ امر ظاہر کیسے ہوا؟"

"پہلے اسکا حال ہیری پر کھلا اوسکو یاد آیا کہ اوس نے رات مکان کا پہلا دروازہ مقفل نہیں کیا تھا رات کے تین بجے کے قریب وہ سیڑھیوں پر سے اوتر کر آئی کہ اوسے بند کرے۔ جاتے ہوئے اوس نے کتابخانہ میں روشنی دیکھی۔ اور استعجاب نے اوسے ابھارا کہ کتابخانہ کے اندر جھانک کر دیکھے اوس نے جج صاحب کو اسطرح کرسی پر پڑا ہوا دیکھکر فوراً محسوس کر لیا کہ وہ مر چکے ہیں۔ اسلیئے کہ وہ بہت دنوں تک ایک زمانہ میں ہسپتال میں ملازم تھی اور اسطرح کے سین دیکھ چکی ہے۔ اوس نے اوپر جا کر سب کو جگا یا۔ اس کے ایک گھنٹے کے بعد میں نے پولس کے صدر دفتر میں جا کر اس واقعہ کی اطلاع دی"

"کیا گھر کے سب لوگ جاگ اُٹھے؟"

"جی ہاں"

"اور کیا سب لوگ نیچے اوتر آئے تھے؟"

"جی ہاں سوا اُن بہری بی بی کے جو ابتک اس ہولناک واقعے سے بیخبر سو رہی تھیں"

"کیا سب لوگوں نے اس کمرہ میں آکر اس لاش کو دیکھ لیا ہے؟"

"جی ہاں"

"اُن پر اس کا کیا اثر ہوا؟"

"یکانیوالی نے تو ضبط کیا۔ مگر کسی نے ہات ملنے شروع کئے۔ اور اپنے سینہ پر ہاتھ رکھکر رونے لگی کہ ہم سب پر بلا نازل ہونیوالی ہے"

"اور مس ہاتھورن کی کیا حالت تھی؟"

"بیا ٹرس نہایت مضطرب تھی جب اوس نے اپنے دلی کو دیکھا کہ مرا پڑا ہے۔ میں ایسا سمجھا کہ وہ

گرا چاہتی ہے ۔ اور جب میں نے اوسکی طرف سنبھالنے کے لئے ہات بڑہائے تو اوسنے ایک خوفناک نظر سے میری طرف دیکھکر مجھے ڈھکیل دیا ۔ اس کے بعد لڑکھڑاتی ہوئی اوس سامنے کی کرسی تک پہنچی ۔ اور اپنے گھٹنے ٹیک کر چچا کے ہات کو بوسہ دیا جو کرسی کے دستہ پر تھا ۔"

"مجھے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ یہہ حرکات ایک مجرم کے نہیں ہوسکتے ۔ میں حیران ہوں کہ پہلے کسطرح کروں ۔ یہہ خیال تھا جو اسوقت میرے دل میں گزرا مگر میں نے احتیاط کی کہ اس خیال کو ظاہر نہونے دوں ۔ اس کے بعد میں نے باواز بلند کہا "اس کے بعد کیا ہوا ؟"

اُس کے بعد وہ منہہ پھیر کر کتا بخانے سے نکل کر اپنے کمرے میں چلی گئیں ۔ اور اسوقت سے ابتک میں نے اونہیں نہیں دیکھا ہے ۔"

"بیچاری لڑکی ۔ ان کو بہت صدمہ ہوا ہے ۔ آپ جانتے ہیں ۔ میں ناپسند کرتا ہوں کہ ان کو تکلیف دوں ۔ لیکن ضرور ہے کہ میں اون سے چند منٹ کے لئے گفتگو کروں ۔ مگر نہ اس جگہ ۔"

"اچھا تو آپ اس کمرہ میں آئیے ۔ میں بیاٹریس کو وہاں آنیکے لئے کہدیتا ہوں ۔"

"بہت اچھا ۔"

وہ مجھے چھوڑ کر اوپر چلے گئے اور میں ادہر ادہر ایک نظر ڈالکر ملاقات کے کمرہ میں داخل ہوا جو نہایت عمدگی سے سجایا گیا تھا ۔ سامان آرائش و فرنیچر ایسا تھا جیسا ہونا چاہیئے ۔ میں نے ترکی ، فرانسیسی ، روسی ، جرمنی ، اور امریکائی امیروں اور دولتمندوں کے مکانات دیکھے ہیں کسی سے اس مکان کی آرائش کم نہ تھی ۔ جبکہ میں بعض نادر اور قیمتی چیزوں کو دیکھ رہا تہا جو ہندوستان سے آئی ہوئی تھیں ۔ میں نے پاؤں کی آہٹ سنی ۔ اور مڑکر دیکھا تو یوجین واپس آگیا تھا ۔ میں نے اس کے چہرہ کو دیکھا تو اضطراب کے آثار ظاہر ہوتے تھے ۔

"بیاٹریس کی کچھ عجیب حالت ہے ۔ انھوں نے مجھے جواب نہیں دیا ۔ میں بالکل نہیں سمجھ سکتا ہوں کہ یہہ کیا راز ہے ۔ بالآخر اونہوں نے مجھ سے کہا کہ ان کے کمرہ تک آپ خود چلے جائیے اور وہیں اون سے ملاقات کیجیے ۔"

"مسٹر ٹریورز۔ یہہ صرف عورتوں کی ہٹ اور ضد ہے۔ اس کو یقین ماننے سوائے اس کے کچھ نہیں۔ میرا سن آپ سے زیادہ ہے۔ لیکن میں وثوق کے ساتھ کہتا ہوں کہ میں نے دنیا میں عورت کو سب سے زیادہ لاینحل معماً پایا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس شدید صدمہ نے اونہیں بے اختیار کر دیا ہے۔"

لیکن میرے دل میں جو خیالات گذر رہے تھے وہ ان الفاظ کے معنوں سے کہیں زیادہ تھے۔

"آئیے۔ مسٹر کرافرڈ میں آپ کو راستہ بتلاؤں۔"

"بہتر آپ آگے ہو لیجے۔"

سیڑھیوں پر ہم چڑھتے چلے گئے جہاں ہمارے قدم ایک قیمتی قالین میں دھنستے چلے جاتے تھے۔ اور آنکھیں ایسی چیزوں پر پڑتی تھیں جو زر کثیر کے صرفہ سے مہیا ہو سکتی ہیں۔

لیکن موت نے آج اس دولت کے مخزن میں قدم رکھا تھا اور اس ڈراونے فرشتے نے ایسی خوفناک شکل اختیار کی تھی جو غریبوں کے مکانوں میں داخل ہوتے وقت اختیار نہیں کرتا ہے۔ مالک مکان اپنے کتابخانہ میں مقتول پڑا ہوا تھا اور اوس کے قاتل کا کہیں پتہ نہ تھا۔

سیڑھیوں پر چڑھتے ہی ہم ایک کمرہ کے روبرو ٹھہر گئے اور میں نے نیچے کے کمرہ کے موقع کو بغور دیکھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہہ کمرہ بالکل کتابخانہ کے کمرہ کے اوپر ہی واقع ہے۔ اس امر نے میری توجہ کو فی الجملہ مصروف رکھا۔

یوجین نے دروازہ کھٹکھٹایا

"اندر آئیے" کہنے کی آواز آئی۔ اور ہم دونوں کمرہ میں داخل ہوئے۔

بیاٹرس ہاتھورن کھڑکی کے قریب بیٹھی ہوی تھی۔ اور ظاہر ہوتا تھا کہ وہ روئی تھی۔ اگرچہ اوس نے کوشش کی تھی کہ اپنی پشت کو روشنی کی طرف کرکے اپنے رونیکی ہر علامت کو پوشیدہ رکھے اوسکی حالت اور وضع سے مستقل مزاجی نظر آتی تھی۔ گویا اس نے اپنی پوری طاقت سے ضبط میں کام لیا تھا۔

میں نے شروع ہی سے اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا۔ میں اس امر میں مجبور تھا۔ باوجود اس کے کہ اس کی نسبت میرے دل میں بدگمانی بھی تھی۔

یہہ محض اوس کے کمال حسن کی وجہ سے نہیں تھا جس سے مجھہ میں یہہ احساس پیدا ہوا تھا بلکہ کوئی اور بات اس میں پوشیدہ تھی۔ شاید ایک قسم کی ناامیدی و یاس ہو۔ کیونکہ اس حالت کے بیان کرنے کے لئے مجھے کوئی اور الفاظ نہیں ملتے۔

وہ کوشش کرتی تھی کہ کسی بات کو مخفی رکھے۔ یا یوں کہو کہ کسی حقیقت کو چھپانا چاہتی تھی۔

جونہی میں آگے بڑہا۔ اوسنے مجھے غور سے گھور کر دیکھا جسکو میں نے دیکھنے سے زیادہ محسوس کیا۔ کیا وہ دریافت کرنا چاہتی تھی کہ میں اس واقعہ سے کہانتک واقف ہوا ہوں؟ میرے دل میں تو یہی خیال گذرا۔ مجھے یہہ بات کسی قدر عجیب نظر آئی۔ کیونکہ معمولی حالتوں میں تو یہہ چاہیے تھا کہ وہ اس راز کے حل کرنے میں میری ہر قسم کی کامیابی کی متمنی رہتی جو اوسکے ولی کی موت پر پردہ ڈالے ہوئے تھا۔

"بیاٹریس! یہہ مسٹر کرافرڈ ہیں۔ جنکو یہاں بھیجا گیا ہے کہ ڈانیل کے قاتل کا پتہ لگائیں"۔ یوجین نے اسطرح پر میرا تعارف کرایا۔ اوس نے میرے سوال کا جواب اپنا سر جھکا کے دیا۔

"میں بخوشی انکو اپنی محدود معلومات سے واقف کرونگی تشریف رکھیے مسٹر کرافرڈ"

میں نے یوجین کی طرف نظر کی۔ اور وہ میرا مطلب سمجھ کر کھنے لگے۔

"معاف فرمائیے۔ اب میں باہر جاتا ہوں جسوقت آپکو میری ضرورت ہو تو آپ نیچے چلے آئیے مسٹر کرافرڈ"۔ یہہ کھکر وہ مجھے بیاٹریس کے ساتھ گفتگو کرنے کو تنہا چھوڑ گئے۔

این سیہ کاری ما واعظ خضاب بیش نیست
شام عشرت جلوۂ رنگ شبابے بیش نیست

عافیت واری ہوس ازراہ بیرنگی بیا
عالم نیرنگ موج اضطرابے بیش نیست

عزم رفتن کردہ ... من کروم وداع جان نخست
او گمانش اینکہ۔ این ہم پاترابے بیش نیست

ضامن اینکہ ... آمد پیش ساقی گدیہ گر
ہے بگوئیش کاین مئے کوثر شرابے بیش نیست

ارتقائے حرّیت

(۲)

سیاسی آزادی کا پہلا دور

گذشتہ نمبر میں ہم آزادی واقتدار کی تعریف و ماہیت بتا چکے ہیں۔ اس مرتبہ حریت کی تدریجی نشو ونما سے بحث کرینگے۔ جہاں سے تاریخی سلسلہ قائم ہوتا ہے یا جو کچھ ازمنۂ قبل تاریخ کے حالات ہم تک پہونچے ہیں۔ اُن سے ظاہر ہے کہ مرکزی اقتدار جڑ پکڑ چکا تھا، تمدن کے اُن تباہ شدہ آثار میں بھی، جن کا حال ہم تک پہونچانے کا اور کوئی ذریعہ بجز میثالسیات (علم الاساطیر) کے باقی نہیں ہے، شامی یا فنیقی اور مصری سلطنتوں کے مماثل حکومتوں کی جھلک نظر آتی ہے، دریائے نیل اور دریائے فرات کے سواحل پر جو قومیں، موجودہ نسلوں سے ہزارہا سال پہلے، آباد تھیں ان کے تمدن کے صحیح زمانے کا تعین دشوار ہے، لیکن تین چار ہزار سال اوپر کے عہد عتیق پر بھی نگاہ دوڑائیے تو بادشاہ کے بعد بادشاہ، جانشین ہوتا ہوا ملیگا اور خاندان کے بعد خاندان حکمراں نظر آئیگا، جن کے تحت اقتدار عوام کالانعام مویشیوں کی طرح محنت کرتے ہوئے دکھائی دینگے، اور حکومت میں اُن کی کوئی آواز نہ ہوگی۔

اس سے گذر کر دوسری کل اقتدار کی وہ نظر آئیگی جس کے پرزے مذہبی پیشوا اور جنگجو عناصر ہونگے۔ یہ گروہ اگرچہ بظاہر دوسرے درجہ پر دکھائی دیگا، لیکن طاقت کے اعتبار سے یہی وہ لوگ ہونگے، جو بادشاہوں اور حکمراں خاندانوں کے اقتدار کے قیام واستحکام یا زوال واستیصال کا باعث ہوتے ہیں۔ اسکی وجہہ یہ تھی کہ کبھی ہمسایہ وحشی قومیں، حملے کر دیتیں اور بادشاہ کو ان کی مدافعت کے لئے جنگجو عنصر سے استمداد ناگزیر ہوتی؛ اور کبھی خود ہمسایہ اقوام کو تاخت وتاراج کرنے، اور ان کو اپنے زیر اثر لانے اور رعایا یا لونڈی غلام بنانے کی ہوس

اسطرح کی استبداد پر مجبور کرتی، اسی طرح مراسم کا تعین، انکی آدائی، اور قانون سازی کیلئے اہل علم اور مذہبی پیشواؤں کی مدد درکار ہوتی، عام لوگوں کی ہدایت کے لئے مذہبی اور معاشرتی قوانین بنائے اور فلزات کے پتروں یا پتھر کے ستونوں پر کندہ کئے جاتے جنکی پابندی عوام پر لازم ہوتی لیکن شہری ہونیکی حیثیت سے ان کو قانون بنانے یا ضابطے مقرر کرنے میں کوئی دخل نہوتا، اسیطرح غنیم کی مدافعت یا ملک غیر پر حملہ کرنے میں بھی ان کی کوئی آواز نہوتی، ان کا کام صرف اسی قدر تھا کہ حالت جنگ میں حکمرانوں کے لئے لڑیں اور حالت امن میں انکی غلامی کریں اور سختیاں جھیلیں۔

اہرام مصر کے تذکرے میں ابوالمورخین ہیرودوٹ لکھتا ہے کہ ان قبروں کی تعمیر نے رعایا کو انتہائی مصیبت سے دوچار کر دیا تھا، اسیطرح ارسطو ایک مقام پر لکھتا ہے خود مختار حکمران اپنی رعایا کی قوت مقاومت کے توڑنے کے لئے اسطرح کی مشقتوں پر ان کو لگاتے تھے۔ مگر ایسا خیال کرنیکی کوئی وجہ نہیں کہ مصر، بابل، اور نینوا کے حکمرانوں کا منشاء درحقیقت یہی ہو جیسا ارسطو نے گمان کیا ہے، البتہ یہہ کہا جا سکتا ہے کہ خود رعایا نے اپنے آپ کو اسدرجہ اطاعت پذیر بنا لیا تھا کہ سخت سے سخت احکام کی تعمیل میں بھی کوئی عذر نہ کرتی تھی، رعایا کی ایسی مسلسل و غیر متزلزل اطاعت پذیری تاریخ کی حیرت خیز واقعات میں سے ہے شاذونادر ہی کوئی ایسی مثال مل سکے گی کہ عوام نے بیرونی دباؤ کے خلاف آواز بلند کی ہو خواہ وہ بیرونی دباؤ، رسم و رواج کا ہو یا قانون (جو رسم و رواج کا مدون ضابطہ ہے) کا یا مذہب کا، یا بیجا زبردستیوں کا ہمیشہ انقلاب کے خطرے سزا کی وحشت، اور داروگیر کی چاٹ نے ان کے خیال کو اسطرف سے پھیرے رکھا کہ اُن کے ساتھ کیا ہو رہا ہے اور کیا ہونا چاہیئے۔

ایشیا اور شمالی افریقہ کی قدیم سلطنتوں کے باشندوں کے دماغ میں بظاہر کبھی آزادی کا خیال بھی نہیں گزرا، اور نہ کبھی اُنہوں نے استبداد و اقتدار کے پنجے سے نکلنے کی کوشش کی، چین اور ہندوستان پر بیرونی قومیں یکے بعد دیگرے مسلط ہوتی رہیں، مگر عوام نے کبھی اغیار کی حکومت کے جوے کو اپنے کاندھوں سے اُتار پھینکنے کا خیال تک نہ کیا، ان ممالک میں

غیر اقوام کی حکومت یا خارجی دباؤ کو اسطرح بہ طیب خاطر اور بلا جبر و اکراہ قبول کر لینے کے
دوہی وجوہ ہو سکتے ہیں؛ یا تو یہ کہ مشرقیوں میں مادیت کی بہ نسبت روحانیت زیادہ ہے، اور وہ
مادی دنیا کی قدر و قیمت جیسی سمجھنی چاہئے نہیں سمجھتے، بلکہ اسکو بے وقعتی اور حقارت کی نگاہ سے
دیکھتے ہیں؛ یا یہ کہ گرم ممالک میں اشیائے خورونوش آسانی اور افراط سے بہم پہونچ جاتی ہیں
جس سے طبائع میں ایک طرح کی قناعت آجاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر سیاسی بلاد آزادی کا
سراغ لگانا چاہو تو تمکو ایشیا کی تاریخ سے گذر کر یورپ کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ اس کے لئے
سب سے پہلے یونان پر نظر ڈالو، تم دیکھو گے کہ جہاں سے تاریخ کا پتہ چلتا ہے اسیوقت سے
آزادی بھی روبہ ترقی نظر آتی ہے۔ افلاطون اور ارسطو کی تصنیفات میں چھ طرح کی حکومتوں
کے نام نظر آتے ہیں:۔

(۱) حکومت شخصی (۲) حکومت مذہبی (۳) حکومت جمعی امرار (۴) حکومت جمعی مالکان جائداد
(۵) حکومت جور و استبداد (۶) حکومت جمہوری یا حکومت عوام۔ اسی سلسلے سے حکومت کے
ان اقسام کی مثالیں بھی وہاں کی تاریخ میں پائی جاتی ہیں۔ وہ جمہوری طرز حکومت جسکا ذکر
ہومر شاعر نے کیا ہے، جس میں بادشاہ عوام کا راعی سمجھا جاتا تھا، اور شیوخ یا بزرگان قوم
کی مجلس اور عوام کی رائے سے حکمرانی کرتا تھا، تقریباً تمام یونانی ریاستوں یا شہروں میں جاری
وساری تھا۔ ان ریاستوں کو شہر ہی کہنا زیادہ موزوں ہوگا اس لئے کہ اس عہد میں یہاں کے
خود مختار و قلعہ بند شہر، معہ اپنے ہم قبیلہ گروہوں کے جو اطراف و جوانب میں بستے تھے، اپنی
اپنی آزاد حکومت رکھتے تھے، جن کی حیثیت مشرق کی وسیع سلطنتوں سے بالکل مغائر تھی،
ان چھوٹی چھوٹی آزاد ریاستوں کے قیام کی ممد و محرک ملک کی جغرافی حالت تھی، یعنے
گھاٹیوں، خلیجوں، اور کوہستانی سلسلوں نے چھوٹے چھوٹے قطعات کو ایک دوسرے سے
جدا کر کے ان کی حد بندی کر دی تھی، جسکی وجہ سے بجائے خود ہر حصہ ملک کے باشندے
یا ہر قبیلہ آزاد و خود مختار تھا،

پھر جب سے کہ تاریخ کا مسلسل دور یونان میں شروع ہوا اُسوقت سے ہومر کے زمانے کی بادشاہیاں یا حکومتیں معدوم ہونے لگیں اور اگرچہ کہ اُن کے آثار بغفط شاہ کے لقب کے ساتھ کچھ مزید عرصے تک باقی رہے؛ لیکن رفتہ رفتہ یونان خاص کی اکثر ریاستیں یا شہر حکومت جمعی کے تحت آگئے، یعنے امیروں اور سربرآوردہ خاندانوں کی مشاورتی حکومت قائم ہوگئی۔ اگرچہ اسمیں کبھی کبھی کوئی زبردست امیر فوجی طاقت کے زور سے مخلل انداز ہوتا اور استبداد کا دور دورہ چند روز کے لئے قائم ہوجاتا لیکن آخر میں عوام ہی کی قوت غالب آتی اور ایسے سرکش یا تو بالکل برباد کر دیئے جاتے یا ان کی قوت ضعیف و کمزور ہو جاتی۔ اسپارٹا کی تنظیم حکومت کے بعد سے تاریخ میں خودمختار نمائندہ حکومت کا پتہ چلتا ہے جبکہ بادشاہ، مجلس مشاورت (کونسل)، اور شہریوں کے بجائے پانسو اشخاص کی مجلس منتظمہ قائم ہوئی، جسے ایفور کہتے تھے جس کے معنے نگران کے ہیں۔ اس جماعت یا کونسل کے اراکین شہریوں کے منتخب کردہ ہوتے تھے، اور ہر سال ان کا جدید انتخاب عمل میں آتا تھا اس حد تک کہا جاسکتا ہے کہ یہ خودمختار نمائندہ حکومت یا حکومت دستوری کی اولین شکل تھی؛ کیونکہ ایتھنز کی مجلس دستور اگرچہ حکمران جماعت سمجھی جاتی تھی لیکن اس کے اراکین مجلس عامہ کے زیر نگرانی کام کرتے تھے۔

ایتھنز کی دستوری حکومت کی بنیاد شاہی یا حکومت شخصی، حکومت جمعی امرا یا حکومت جمعی رؤسا یا مالکان جائداد، اور حکومت استبداد کے کھنڈروں پر قائم ہوتی تھی اسپارٹا کی طرح یہاں بھی قدیم طرز حکومت کے اصول باقی تھے حکومت کے اجزا کی ہیئت یہہ تھی کہ پہلے مجلس دستور یعنے بادشاہ کی قائم مقام مجلس اس کے بعد پانسو منتخب اراکین کی کونسل یا مجلس مشاورت اور پھر جماعت عوام جسمیں ہر بالغ و عاقل مرد جو صحیح النسل ایتھنی ہو شریک ہوسکتا تھا، اس جماعت کا اجلاس مہینے میں تین یا چار بار ہوا کرتا تھا۔ انتخاب کا کوئی طریقہ نہ تھا۔ اہل انجمن کو مقررین اپنی تقریر سے مخاطب کرتے اور مسائل کا فیصلہ ووٹ یا کثرت رائے

پر ہوا کرتا تھا - آبادی کا نصف حصہ عورتوں کا اور ان کے علاوہ غلام اور غیر ایتھنی یا مخلوط النسل اشخاص، جنکی تعداد ایک کے مقابلے میں پانچ تھی، سیاسی حقوق سے قطعاً محروم تھے - اگرچہ مجلس عامہ کی باگ سحر بیان مقرر کے ہاتھ میں ہوتی تھی کہ وہ جدہر چاہتا اُدہر پھیر دیتا پھر بھی بالکل صحیح معنوں میں یہہ کہا جاسکتا ہے کہ ایتھنز کی حکومت عوام کی حکومت تھی اور یہیں سے حریت کی تاریخ شروع ہوتی ہے - اور یہ روح حریت اسوقت اور بھی زیادہ توی ہوگئی جبکہ مٹھی بھر یونانیوں نے محض اپنے جوش حب الوطنی اور اتحاد قومی کے بل بوتے پر ایرانیوں کے زبردست حملوں کو رد کر دیا (۵۰۰ تا ۴۷۹ ق م) لیکن انچہ از حد بگذرد رسوا کند - ایک طرف تو یونان نے شوق آزادی کی پشت گرمی سے اپنی جان ایرانیوں سے بچا لی دوسری طرف خود اسکی محدود ریاستوں کو توسیع مملکت اور حصول اقتدار کا شوق چرآیا - ایتھنز کی ریاست جو فی الجملہ اپنی دوسری بہنوں سے زیادہ طاقتور تھی سرعت کے ساتھ اپنے مقبوضات و اقتدار کو بڑہانے لگی اور ۱۵-۴۱۳ قم میں جزیرہ سسلی (صقلیہ) پر حملہ آور ہوئی - اسیوقت سے اُسکی قوت حریت گھٹنے لگی اور رفتہ رفتہ ایتھنز سیاسی مرکز سے تجاوز کر کے تعلیمی مرکز بنگیا اور بجائے اسکے اسپارٹا، تھیبس، اور مقدونیہ نے حکومت کی باگ اپنے ہاتھوں میں لی سکندر اعظم کی قوت یہانتک بڑہی اور اُس کے ایشیائی فتوحات اسقدر وسیع ہونے کہ یونان کی چھوٹی چھوٹی ریاستیں ایک عظیم الشان سلطنت کے اجزا بنگئیں - اسمیں شک نہیں کہ سکندر کی تلوار نے چار دانگ عالم میں اپنا سکہ بٹھا دیا لیکن اسی تلوار نے یونان کی آزادی کا بھی قلع قمع کر دیا سکندر نے ۳۲۳ ق م میں وفات پائی لیکن شاہنشاہیت کا جو تخم وہ بو گیا تہا وہ اگا بڑھا پہولا پھلا یہانتک کہ ایک صدی گزرگئی اور آزادی و حریت کے پودے اسکی چھاؤں میں مرجھا کر فنا ہوگئے جسکا انجام یہ ہوا کہ بقول شاعر - اہل یونان جنہوں نے سب سے پہلے آزادی کی تلوار کو اپنے ہاتھ میں لیا تہا قلم کش ہو کر رہ گئے اور اپنے اوقات دل بھلانیوالے کاموں میں صرف کرنے لگے یہانتک کہ انکی قوم محض مصنفوں، شاعروں، اور صناعوں کی قوم بنکر رہ گئی (باقی دارد)

ضامن کنتوری -

خواجوی کرمانی

خواجہ کمال الدین ابوالعطا محمود علی بن محمود المرشدی

ولادت ۶۹۵ھ وفات ۷۵۳ھ

نوشتہ حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ایم آر اے ایس

ایران کا مشہور مورخ او جغرافیہ نویس حمد اللہ مستوفی سب سے پہلا مصنف ہے جس نے خواجو کا تذکرہ کیا ہے۔ اس نے اپنی تاریخ گزیدہ ۷۳۰ھ میں خواجو کی وفات سے تئیس سال پہلے تصنیف کی ہے۔ اور اُس کے اخیر باب میں مشاہیر شعرائے عجم کا تذکرہ کرتے ہوئے خواجو کا ذکر بھی کیا ہے۔ لیکن اوس میں زندگی کا کوئی واقعہ مذکور نہیں ہے۔ صرف نام لکھ کر چند اشعار نقل کر دیئے ہیں[1] تاہم اس سے یہ بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ خواجو نے اپنی زندگی ہی میں شہرت حاصل کر لی تھی اور ان کا کلام مقبول عام ہو گیا تھا۔

آٹھویں صدی کے بعد فارسی شعراء کے جسقدر تذکرے لکھے گئے ہیں۔ ان سب میں خواجو کے تھوڑے بہت حالات مذکور ہیں لیکن یہ تمام تذکرے ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں اور سبھوں نے چند واقعات کو باختلاف الفاظ نقل کر دیا ہے۔ ان میں سب سے قدیم اور قابل اعتماد تذکرہ دولت شاہ سمرقندی کا ہے جو ۸۸۵ھ کے حدود میں خواجو کی وفات سے ایکسو اکتیس (۱۳۱) سال بعد ہرات میں لکھا گیا ہے۔ اسمیں خواجو کا تذکرہ کسیقدر صراحت کیساتھ تحریر ہے۔ پھر بھی بہت سی باتیں محتاج صراحت باقی ہیں:۔

---

[1] تاریخ گزیدہ۔ طبع لیڈن صفحہ ۸۱۴

یورپ کے بعض مستشرقین نے بھی خواجو کے حالات اور تصنیفات کے متعلق خامہ فرسائی کی ہے۔ انمیں سب سے قدیم مضمون ڈاکٹر ایردیان کا ہے جسکے ابتدائی حصہ میں مختصر حالات تذکرہ دولت شاہ سے نقل کئے ہیں اسکے بعد خمسہ کی پانچ مثنویوں کا ذکر ہے اور ان کے مختلف مقامات سے خواجو کی زندگی کے بعض واقعات استنباط کئے ہیں۔ ایردیان کے بعد اسپرنگر شیفر۔ پرچ۔ فلوگل ریو وغیرہ نے بھی لکھا ہے لیکن انمیں ریو کی تحقیقات سب پر فوقیت رکھتی ہے۔ اور زمانہ مابعد کے مصنفین مثلاً برون وغیرہ نے اسی پر اپنی تحریرات کا سنگ بنیاد رکھا ہے [1]

---

[1] خواجو کے حالات مفصلہ ذیل کتابوں سے ماخوذ ہیں۔ اور ہر کتاب کے ساتھ وہ صفحات بھی لکھدئے ہیں جن میں خواجو کے حالات تحریر ہیں۔ ان کے علاوہ کہیں کہیں دوسرے ماخذات سے بھی حالات اضافہ کئے ہیں اور ایسے موقع پر حاشیہ میں اون کا حوالہ لکھدیا ہے۔

آتشکدہ	مرزا لطف علی آذر اموی ۱۹۱۱ء	طبع بمبئی ۱۲۹۹ء	صفحہ ۱۲۴
آثار عجم	مرزا محمد نصیر شیرازی	طبع بمبئی ۱۳۱۳ء	جلد دوم صفحہ ۴۸۲
بہارستان	مولانا عبدالرحمن جامی	طبع دہلی	صفحہ ۹۴
تاریخ گزیدہ	حمداللہ مستوفی	طبع یورپ	صفحہ ۸۱۸
تذکرہ حسینی	میر حسین دوست سنبھلی	طبع لکھنو	صفحہ
تذکرۃ الشعراء	دولت شاہ سمرقندی	طبع یورپ صفحہ ۲۴۹ طبع بمبئی	صفحہ ۱۰۸
حبیب السیر	خواجہ غیاث الدین خوندمیر	طبع بمبئی جلد سوم جزو دوم	صفحہ ۲۴
خزانہ عامرہ	میر غلام علی آزاد بلگرامی	طبع کانپور	صفحہ ۲۰۵
خلاصۃ الاشعار	میر تقی الدین کاشی	اسپرنگر صفحہ ۱۸	نمبر ۷۳
ریاض الشعراء	علی قلی خاں والہ داغستانی	قلمی	موجودہ کتب خانہ آصفیہ
کشف الظنون	حاجی خلیفہ چلپی	طبع یورپ جلد سوم	صفحہ ۷۵

تمام تذکرہ نویسوں نے بالاتفاق لکھا ہے کہ کرمان خواجو کا وطن ہے ۔ اور خود خواجو نے بھی ہمانے ہمایون میں اس کی تصریح کی ہے ۔ اور وطن سے نکلنے کے ایک عرصہ بعد بغداد پہونچکر جب اس مثنوی کو تمام کیا ہے تو اوس کے خاتمہ میں نہایت اشتیاق کے ساتھ اپنے وطن مالوف

لب التواریخ	امیر ناصر الدین یحیی ابن عبد اللطیف قزوینی	قلمی	موجودہ کتب خانہ آصفیہ
مجمع الفصحاء	رضا قلی خاں ہدایت	طبع ایران جلد دوم	صفحہ ۱۵
مراۃ الخیال	شیر خان لودھی	طبع بمبئی	صفحہ ۴۹
ہفت آسمان	آغا احمد علی	طبع کلکتہ	صفحہ ۷۶
ہفت اقلیم	امین احمد رازی	قلمی	مملوکہ راقم الحروف
ید بیضا	میر غلام علی آزاد بلگرامی	قلمی	موجودہ کتب خانہ آصفیہ

Flugel Die Arabischen Persischen U Turkischen Hondschriften D. K. K. Hofbiblisthek Zu Wien. Vol. I. pp. 544.

Portsch Verzeichniss D. Persischen Hondschriften D. Kgl Bibliothek Zu Berlin. pp 6 70

Rieu. Catalogue of the Persian Mss. in the British Museum. Vol. p. 620

Spiegel Chrestomathie Des Persan Vol. II. pp. 251

Sprenger. Catalogue of the Libraries of the King of Oudh pp. 471

ڈاکٹر ایرویمان کا مضمون حسب ذیل رسالہ میں شایع ہوا ہے ۔

Zeitschrift Der Deutschen Morgenland Gesellschaft Vol. II. pp 205-215

کو یاد کرتے ہیں۔

خوشا باد عنبر نسیم سحر — کہ بر خاک کرمانش افتد گزر

خوشا وقت آن مرغ دستان سرائے — کہ دارد دراں بومش آرام جائے

زمن تا چہ آید کہ مرغ بلند — ازاں آشیانم دریں جا فگند

بہ بغداد بہر چہ سازم وطن — کہ ناید بجز دجلہ در چشم من

امین رازی کی تصریحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ بم میں جو کرمان کا ایک شہر ہے خواجو کی ولادت ہوئی ہے۔ سن ولادت کسی تذکرہ نویس نے نہیں لکھا ہے۔ ایرویان نے گل و نوروز کے بعض ابیات سے اخذ کر کے ۵ شوال ۶۷۹ھ ولادت کی تاریخ بیان کی ہے لیکن ہماری نظر سے اس مثنوی کا جو نسخہ گذرا ہے اوسمیں اس مضمون کی کوئی بہت موجود نہیں ہے۔ اسپرنگر نے ۲۰ ذی الحجہ ۶۸۹ھ کو تولد ہونا بیان کیا ہے لیکن اسکی بھی کوئی سند نہیں ہے۔ عمر کی مدت لب التواریخ میں بہتر سال اور بیضا میں ستر سال تحریر ہے۔ ۷۵۳ھ میں انکی رحلت ہوئی ہے اس حساب سے ۶۸۱ھ یا ۶۸۳ھ ان کا سال ولادت قرار پاتا ہے لیکن ہماری رائے میں یہ سب تاریخیں مشتبہ اور ناقابل اعتماد ہیں۔ ہمائے ہمایون میں خود خواجو نے صراحت کی ہے کہ جب اس مثنوی کا آغاز ہوا تو ان کی عمر تیس سال کی تھی۔

کہ اکنوں ز دور سپہری کہ گشت — سہ دہ سال از عمر من در گذشت

سات سال کی مدت میں ۷۳۲ھ کو اسکا اختتام ہوا ہے۔ اسلئے ۶۹۵ھ میں ان کا پیدا ہونا ثابت ہوتا ہے۔

زمانۂ حال کے ایک مصنف مرزا محمد نصیر شیرازی نے اپنی کتاب آثار عجم میں لکھا ہے کہ خواجو ابتدائے عمر میں کچھ عرصہ تک خدمت استیفا کو انجام دیتے رہے۔ پھر کسی وجہ سے ملازمت چھوڑ کر وطن سے نکلے اور سیر و سیاحت میں مصروف ہوئے[1]

[1] آثار عجم طبع بمبئی جلد دوم صفحہ ۴۸۲ -

لیکن مصنف ممدوح نے اسکی کوئی سند بیان نہیں کی ہے۔ اور نہ یہ واقعہ کسی اور تذکرے میں مذکور ہے۔ امین رازی نے خواجو کی طویل سیاحت کا تذکرہ کیا ہے، اسکا بیان ہے کہ وطن سے نکلنے کے بعد ایران و عراق کے بڑے بڑے شہروں میں عرصہ تک سفر کرتے رہے۔ اور وہاں کے مشاہیر علماء فضلاء اور شعراء سے ملکر اکتساب کمال کیا۔ اسی اثنا میں سمنان میں آئے اور مشہور بزرگ علاء الدولہ سمنانی سے بیعت کی۔

علاء الدولہ سمنانی کا نام شیخ رکن الدین ابو المکارم احمد بن محمد البیابانکی ہے شیخ نورالدین عبدالرحمن گسرقی کے مرید تھے ۶۸۰ھ میں بغداد سے آکر خانقاہ سکاکیہ میں سولہ سال تک ریاضت و مجاہدہ میں مصروف رہے۔ ۲۲ رجب ۷۳۶ھ کو صوفی آباد میں انتقال فرمایا۔ اور قطب زمان شیخ علاء الدین عبدالوہاب کے خطیرہ میں مدفون ہوئے[۱] ۔ خواجو نے مرید ہونے کے بعد کئی سال صوفی آباد میں گذارے اور شیخ کی خانقاہ میں خلوت نشین ہو کر عبادت و ریاضت کرتے رہے۔

خواجو نے اپنی تصنیفات میں چار بادشاہوں کی مدح کی ہے۔ اور انکی آدھی عمر انکے درباروں میں بسر ہوئی ہے۔

(۱) سلطان علاء الدین ابو سعید بہادر خاں (۷۱۶ھ ۷۳۶ھ) جو ایران کی سلطنت مغلیہ کا اخیر فرمانروا ہے۔

(۲) سلطان وجیہ الدین مسعود بن فضل اللہ باشتینی (۷۳۰ھ ۷۴۴ھ) جو خاندان سربداران کا دوسرا فرمانروا ہے۔

(۳) سلطان مبارز الدین محمد بن مظفر (۷۱۳ھ ۷۵۹ھ) جو خاندان مظفریہ کا بانی ہے۔

(۴) سلطان شیخ ابو اسحٰق (۷۴۲ھ ۷۵۴ھ) جو فارس کا بادشاہ ہے۔

---

[۱] نفحات الانس طبع بمبئی صفحہ ۲۸۴۔ حبیب السیر جلد سوم جزو اول صفحہ ۱۲۵۔

خواجو کا جس زمانہ میں نشو ونما ہوا ہے ایران میں سلطان ابوسعید کی حکومت تھی۔ اور صاحب سعید خواجہ غیاث الدین محمد اس کا وزیر تھا۔ اسکا باپ خواجہ رشید الدین فضل اللہ سلطنت مغلیہ کا نامور وزیر گزرا ہے۔ اور غازان خاں اور اوس کے فرزند اولجائتو کے زمانہ میں عرصہ تک خدمت وزارت کو انجام دیا ہے۔ اس نے اقوام عالم کی ایک ضخیم تاریخ لکھی ہے جو عام طور پر تاریخ مبارک غازانی کہلاتی ہے لیکن اسکا اصلی نام جامع التواریخ ہے اور وہ مشرق کی بہترین تصنیفات میں شمار ہوتی ہے۔

خواجو نے پہلے پہل سلطان ابوسعید کے دربار میں رسائی پیدا کی۔ غیاث الدین نے انکے فضل وکمال کو دیکھا تو قدر دانی سے پیش آیا۔ اس زمانہ میں خواجو نے اپنی مثنوی ہماے ہمایون لکھی اور اوسکا دیباچہ بادشاہ اور وزیر دونوں کی مدح وستائش سے مزین کیا۔

۷۳۶ھ میں سلطان ابوسعید نے انتقال کیا جسکے باعث ایران میں طوائف الملوکی ہوگئی اور بڑے بڑے امراء نے قوت پیدا کرکے کئی ایک چھوٹی چھوٹی ریاستیں قایم کریں۔ انمیں خراسان کے سربدار اور جبل کے مظفریہ سب سے زیادہ ذی اثر اور صاحب ثروت خاندان تھے۔ خواجو دربار مغلیہ سے نکل کر سبزوار میں آئے اور امیر مسعود سربدار کی مدح میں کئی قصیدے لکھ کر پیش کئے لیکن حسب مراد کامیابی نہیں ہوئی۔ اسلئے یہاں سے بھی نکلے اور یزد میں آکر امیر محمد مظفر کے دربار میں رسوخ حاصل کیا۔ تاج الاماثل خواجہ تاج الدین احمد عراقی اسکا وزیر تھا۔ اس نے خواجو کے حق میں بیحد مراعات کئے اور اون سے ایک مثنوی گل ونوروز لکھوائی۔

۷۴۲ھ میں خواجو امیر محمد مظفر سے ناراض ہوگئے اور اوس کے دربار کو چھوڑ کر خواجہ شمس الدین محمد صاین کے یہاں چلے آئے۔

شمس الدین صاین ایک ذی اثر اور صاحب ثروت امیر گذرا ہے امیر پیر حسین چوپانی کیطرف سے سیرجان میں نائب تھا۔ جس نے منحرف ہوکر ۷۴۲ھ میں ملک اشرف سے توسل پیدا کیا۔ ملک اشرف نے ۷۴۵ھ میں مقید کرکے امیر محمد مظفر کے یہاں روانہ کر دیا۔ امیر محمد مظفر نے اوسے امرائے دربار میں

شامل کر لیا۔ اور ایلچی بناکر فارس کے بادشاہ امیر ابو اسحٰق کے یہاں بھیجا امیر ابو اسحٰق نے اسکے ساتھ بے حد مراعات کئے اور سید غیاث الدین علی یزدی کی شرکت میں اپنا وزیر بنالیا ۷۴۵ھ تک دونوں نے بالاتفاق وزارت کی پھر ان میں نفاق ہوگیا شمس الدین استخراج اموال کا بہانہ کرکے ولایت ہرموز کو چلا گیا اور وہاں سے سمندر کے کنارے کنارے لوٹ مار کرتا ہوا کرمان پہونچا۔ جہاں امیر محمد مظفر سے سخت لڑائی ہوئی اور اسمیں شمس الدین گرفتار ہوکر مارا گیا[1]۔ یہ واقعہ ۲۶ صفر ۷۴۶ھ کا ہے۔ خواجو نے اس کی تاریخ کہی ہے جو حافظ ابرو کی تاریخ میں منقول ہے۔

خواجو جس زمانہ میں شمس الدین کے یہاں آئے ہیں۔ وہ ملک اشرف کی طرف سے سیرجان میں نیابت کرتا تھا۔ خواجو نے کچھ عرصہ اسکی مصاحبت میں گزارا اسی زمانہ میں روضۃ الانوار لکھی۔ پھر شیراز چلے گئے اور وہاں امیر ابو اسحٰق انجو کے دربار میں توسل پیدا کیا۔ امیر ابو اسحٰق انجو ایک ذی علم فیاض اور قدردان بادشاہ ہوا ہے۔ خواجو نے اپنی زندگی کا اخیر زمانہ اسی کے دربار میں بسر کیا۔ اور اسکی مدح میں بہت سے قصائد لکھے جو دیوان میں موجود ہیں۔ صاحب لب التواریخ نے لکھا ہے کہ امیر ابو اسحٰق نے اپنے فرزند علی سہل کی رسم ختنہ ادا کی تو اسکی تہنیت میں خواجو نے ایک قصیدہ لکھا جسکے صلہ میں ایک طبق سکہ طلا سے بھرا ہوا بادشاہ نے عطا کیا اسکے دیکھتے ہی شادی مرگ ہوگئی اور فرط انبساط سے روح پرواز کرگئی[2]۔

خواجو نے شیراز میں انتقال کیا۔ اور وہیں تنگ اللہ اکبر میں مدفون ہوئے مزار اُنکا موجود ہے[3]۔ خواجو کا سنہ وفات تذکرہ نویسوں نے نہایت اختلاف کیساتھ بیان کیا ہے۔ زمانہ حال کے

---

[1] حبیب السیر جلد سوم جزو دوم صفحہ ۱۷ و ۱۸ و ۱۹۔

[2] اس واقعہ کو خزانہ عامرہ میں آزاد نے بھی لکھا ہے۔

[3] تنگ اللہ اکبر شیراز میں ایک پہاڑ ہے جس کے جانب مشرق آب رکن آباد کے کنارے ایک شکستہ عمارت کے آثار باقی ہیں۔ اس کے ایک گوشہ میں ایک قبر ہے جسکو اہل شہر خواجو کا مزار بیان کرتے ہیں۔ آثار عجم جلد دوم صفحہ ۴۸۲۔

ایک مشہور مصنف مرزا رضا قلی خاں ہدایت نے مجمع الفصحا میں لکھا ہے کہ سنہ ۸۳۰ھ میں خواجو نے رحلت کی ہے اور اسکے ساتھ یہ بھی صراحت کی ہے کہ وہ سلطان ابوسعید کے مداح و معاصر تھے لیکن یہ ایک صریح غلطی ہے۔ کیونکہ سلطان ابوسعید سنہ ۷۱۶ھ سے سنہ ۷۳۶ھ تک حکمراں رہا ہے۔ اور ان دونوں سنین کے مابین سو سال کا فاصلہ واقع ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے سنہ ۷۴۳ھ اور تقی کاشی نے سنہ ۷۴۵ھ بیان کیا ہے۔ تقی اوحدی نے دولت شاہ کی پیروی کی ہے۔ حقیقت میں یہ تاریخیں بالکل غلط ہیں۔ خمسہ کی مثنویوں سے سنہ ۷۴۶ھ تک خواجو کا بقید حیات رہنا ثابت ہے۔ اور سنہ ۷۴۲ھ سے سنہ ۷۴۶ھ تک چار سال کا جو زمانہ گذرا ہے اسمیں خواجو نے خمسہ کی تین مثنویاں روضۃ الانوار کمال نامہ اور گوہر نامہ تصنیف کی ہیں۔ ریاض الشعرا کے مختلف نسخوں میں مختلف تاریخیں درج ہیں۔ برٹش میوزیم کے نسخہ میں جسکو چارلس ریو نے استعمال کیا ہے سنہ ۷۴۲ھ تحریر ہے۔ نواب علی ابراہیم خان نے صحف ابراہیم میں ریاض الشعراء کے حوالے سے سنہ ۷۶۰ھ بیان کیا ہے لیکن ریاض الشعراء کے اکثر نسخوں میں سنہ ۸۴۲ھ ثبت ہے۔ اور گمان ہوتا ہے کہ سو سال کا یہ تفاوت محض سہو کتابت سے ہو گیا ہے۔

لب التواریخ جو ایک مستند کتاب ہے شاہ طہماسپ صفوی کے زمانہ میں سنہ ۹۴۶ھ اور سنہ ۹۴۸ھ کے مابین ابو الفتح بہرام مرزا کی فرمایش سے لکھی گئی ہے[1]۔ اسمیں خواجو کا سنہ رحلت سنہ ۷۵۳ھ تحریر ہے۔ مصنف نے اپنے بیان کی تائید میں ایک قطعہ تاریخ بھی نقل کیا ہے جو خواجو کے کسی معصر شاعر کا ہے۔ اور اسکی وجہ سے اس تاریخ کے صحیح ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ باقی نہیں رہتا ہے۔ قرون دہم و یازدہم کے اکثر تذکرہ نویسوں نے اسی تاریخ کو قابل اعتماد قرار دیا ہے۔ اور گیارہویں صدی میں ہندوستان میں جسقدر تذکرے لکھے گئے ہیں مثلاً ید بیضا خزانہ عامرہ نشتر عشق تذکرہ حسینی وغیرہ اون سب میں بھی یہی تاریخ مذکور ہے۔

---

[1] لب التواریخ کا ایک قدیم قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ میں فن تاریخ کے نمبر ۳، ۳ پر موجود ہے۔ جس کے صفحہ ۲۴۳ پر خواجو کے حالات تحریر ہیں۔ اس کے علاوہ کتب خانہ مذکور میں اسی کتاب کا ایک اور نسخہ بھی ہے لیکن وہ ناقص ہے اور اوس میں کاتب نے شعراء کے حالات قلم انداز کر دئے ہیں۔

ان کے مصنفین نے اگرچہ کہ اپنا کوئی ماخذ بیان نہیں کیا ہے۔ لیکن ان سب کا ماخذ تذکرہ صبح صادق ہے اور صبح صادق کے مصنف نے لب التواریخ سے استفادہ کیا ہے۔

صاحب مراۃ الخیال نے خواجو کو شیخ سعدی کا ہمعصر قرار دیا ہے لیکن یہ صریح غلطی ہے۔ کیونکہ شیخ سعدی نے ۶۹۱ھ میں انتقال کیا ہے[1] اور اس کے تقریباً چار سال بعد ۶۹۵ھ میں خواجو کی ولادت ہوئی ہے

ایرد یمان نے لکھا ہے کہ خواجو کو شروان شاہ اور قزل ارسلان کے دربار سے بھی تعلق رہا ہے۔ خواجو کے بعض قصائد میں ان بادشاہوں کے نام آئے ہیں جسکی وجہ سے ایردیان کو یہ دھوکا ہوا۔ حقیقت میں یہ امر خلاف واقعہ ہے۔ کیونکہ شروان شاہ جو خاقانی کا ممدوح ہے ۵۸۰ھ میں فوت ہوا ہے اور قزل ارسلان جسکی مدح میں ظہیر فاریابی کا یہ شعر مشہور ہے۔

نہ کرسی فلک نہد اندیشہ زیر پا　　تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

۵۸۲ھ سے ۵۸۷ھ تک حکمراں رہا ہے اور یہ دونوں بادشاہ خواجو کی ولادت سے کم و بیش سو سال پہلے راہی ملک عدم ہو گئے ہیں۔

خواجو نے جملہ اصناف نظم میں طبع آزمائی کی ہے۔ قصیدہ، غزل، رباعی، مثنوی وغیرہ سب ان کے مجموعہ کلام میں موجود ہیں۔ دولت شاہ نے لکھا ہے کہ ان کے کلیات میں بیس ہزار ابیات ہیں۔ امین رازی نے دس ہزار بیان کئے ہیں۔ لیکن میر غلام علی آزاد بلگرامی کی تحریر سے دولت شاہ کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ میں نے حضرت مغفرت مآب نواب آصف جاہ اول کے کتب خانہ میں خواجو کا کلیات دیکھا ہے جسمیں بیس ہزار کے قریب اشعار موجود ہیں۔

خواجہ نظامی گنجوی کی اتباع میں خواجو نے بھی ایک خمسہ لکھا ہے۔ اور اوسکی تفصیل یہ ہے۔

(۱) ہمائے ہمایون　بجواب　سکندرنامہ　(۲) گل و نوروز　بجواب　خسرو شیرین

(۳) روضۃ الانوار　بجواب　مخزن الاسرار　(۴) کمال نامہ　بجواب　ہفت پیکر

(۵) گوہرنامہ　بجواب　لیلےٰ مجنوں۔

امین رازی نے لکھا ہے کہ خمسہ دوران سفر میں تصنیف ہوا ہے۔ چنانچہ اسکی پہلی کتاب

[1] نفحات الانس طبع بمبئی صفحہ ۳۹۲۔

بغداد میں دوسری یزد میں اور چوتھی کازرون میں لکھی گئی ہے۔ حاجی خلیفہ اور خوندمیر کا بیان ہے کہ خواجو نے سنہ ۷۴۴ھ میں خمسہ کو تمام کیا اور اسکی تائید میں دونوں نے مندرجہ ذیل بیت نقل کی ہے

شد بتاریخ ہفتصد و چل و چار   کار این نقش آذری چو نگار

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ بیت کمال نامہ کی ہے جو خمسہ کی چوتھی مثنوی ہے اور اس کے بعد سنہ ۷۴۶ھ میں گوہرنامہ لکھا ہے جو پانچویں مثنوی ہے اور اسپر خمسہ کا اختتام ہوا ہے۔

ہمائے ہمایون عشقیہ فسانہ ہے۔ اور قاضی القضات ابوالفتح مجدالدین محمود کی فرمایش سے لکھا ہے۔ دیباچہ میں سلطان ابوسعید بہادر خاں اور اوسکے وزیر صاحب سعید خواجہ غیاث الدین محمد کی مدح وستایش کی ہے۔

یہ مثنوی سنہ ۷۳۲ھ میں تمام ہوئی ہے اور حسب ذیل بیت سے اسکی تاریخ نکلتی ہے۔

کنم بذل بر ہر کہ دارد ہوس   کہ تاریخ این نامہ "بذل" است و بس

گل و نوروز یہ بھی عشقیہ فسانہ ہے۔ اور خواجہ تاج الدین احمد عراقی کے نام پر سنہ ۷۴۲ھ میں تصنیف کیا ہے جو امیر محمد بن مظفر کے وزرائے سلطنت سے ہے اور خاتمہ میں تاریخ تصنیف اسطرح بیان کی ہے۔

بروز جیم دازمہ دال رفتہ   زہجرت بادمیم و ذال رفتہ
دوشش بر ہفتصد سی گشتہ افزون   بپایان آمد این نظم ہمایون

روضۃ الانوار صوفیانہ مثنوی ہے۔ اور مولانا شمس الدین محمد بن صاین کے نام پر سنہ ۷۴۳ھ کے حدود میں تصنیف ہوئی ہے۔ اور اسکی تاریخ تصنیف یہ ہے۔

جیم زیادت شدہ بر میم و ذال   وآمدہ چون عین مغل ہلال

کمال نامہ مذہبی اور اخلاقی مثنوی ہے۔ خواجو نے اسکا بہت بڑا حصہ شیخ ابو اسحق کازرونی کی درگاہ میں تصنیف کیا ہے اور خاتمہ میں فارس کے بادشاہ امیر ابو اسحق انجو کی مدح کی ہے۔

شیخ ابو اسحٰق ابراہیم بن شہریار فارس کے مشہور بزرگ ہیں۔ کازرون انکا وطن تھا۔ شیخ ابو علی حسین بن محمد فیروز آبادی کے مرید تھے سنہ ۴۲۶ھ میں انکا انتقال ہوا ہے[1]۔ کمال نامہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ خواجو کو ان کے ساتھہ بیحد عقیدت تھی۔ اور کازروں میں آکر انکی درگاہ میں عرصہ تک مقیم تھے۔ کمال نامہ سنہ ۷۴۴ھ میں ختم ہوا ہے۔ اور مندرجہ ذیل بیت سے اسکی تاریخ نکلتی ہے

شد بتاریخ ہفتصد و چل و چار کار این نقش آذری چو نگار

گوہر نامہ اسمیں خواجہ بہاء الدین اور اوسکی اولاد امجاد کے اوصاف و محاسن مذکور ہیں اور یہ مثنوی سنہ ۷۴۶ھ میں تمام ہوئی ہے۔ مادہ تاریخ اس کا یہ ہے۔

چو کردم گوہر افشاں نوک خامہ گہر نامہ نہادم نام نامہ
شب آدینہ بود و روز برجیس سعود آسماں ناظر تبسدیس
ز تیر و ز مہ یک نیم رفتہ ز ہجرت ذال و واؤ و میم رفتہ

وزیر بہاء الدین خواجہ نظام الملک طوسی کی اولاد سے ہے۔ نظام الملک سلطنت سلجوقیہ کا نامور وزیر ہے اور سلطان الپ ارسلان اور اوسکے فرزند ملکشاہ کے زمانہ میں عرصہ تک عہدۂ وزارت کو انجام دیا ہے۔

خواجو نے خمسہ کے علاوہ ایک اور ضخیم مثنوی لکھی ہے جسمیں تقریباً چار ہزار شعر ہیں اسکا نام مفاتیح القلوب و مصابیح الغیوب ہے اسمیں اٹھائیس باب ہیں اور ہر باب کے مختلف عنوان ہیں جنکے تحت میں تصوف کے لوازم اور اونکے اسرار و رموز کی تشریح بیان کی ہے۔

تمام اساتذہ نے خواجو کے کمال شاعری کا اعتراف کیا ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی انکو نہ صرف استاد فن تسلیم کرتے ہیں بلکہ اپنے آپکو اونکا پیرو مانتے ہیں۔

استاد غزل سعدی ست پیش ہمہ کس اما دارد سخن حافظ طرز سخن خواجو

مولانا عبدالرحمٰن جامی نے بہارستان میں انکے سخن بلیغ اور زور کلام کی بڑی تعریف کی ہے۔ اور "نخل بند شعراء" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

خواجو کے معاصرین میں کئی ایک باکمال شاعر گذرے ہیں لیکن وہ کسی ایک صنف کلام میں

[1] نفحات الانس طبع بمبئی صفحہ ۱۶۱۔

کمال رکھتے تھے ۔ سلمان قصیدہ گوئی میں اوستاد تھا ۔ خواجہ حافظ اور کمال خجند غزل کے مرد میدان تھے ۔ بخلاف ان کے خواجو نے نظم کے تمام اقسام میں طبع آزمائی کی ہے ۔ قصیدہ غزل مثنوی وغیرہ سب کچھ ان کے مجموعہ کلام میں موجود ہے اور اون میں حسن و عشق ۔ مدح و ثنا ۔ اور اخلاق و تصوف کے تمام مضامین ادا کئے ہیں ۔ حسن کلام کے تمام خصوصیات مثلاً الفاظ کی شان و شوکت بندش کی چستی ۔ خیالات کی بلندی ۔ مضامین کا زور اور اون کے ادا کرنیکی قدرت یہ سب چیزیں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں ۔

خواجو نے غزل اور مثنوی میں سعدی اور نظامی کی اتباع کی ہے ۔ قصائد میں حکیم سنائی ظہیر فاریابی اور کمال اسمٰعیل کا رنگ اختیار کیا ہے ۔ تاہم قصائد میں کوئی ندرت نہیں ہے ۔ اور ان کے مقابلہ میں غزل گوئی کا طرز زیادہ لطیف ہے ۔ اور اوس میں حسن و عشق کے مضامین سابقین سے زیادہ آب و رنگ دیکر بیان کئے ہیں ۔ اور اسی طرح مثنویوں میں انہوں نے تصوف کے اسرار و غوامض کو نہایت متانت و استواری کے ساتھہ ادا کیا ہے ۔

مولانا آزاد بلگرامی نے ہمائے ہمایون کی بڑی تعریف کی ہے ۔ حقیقت میں یہ ایک شاندار نظم ہے اور اس سے شاعر کی قادر الکلامی کا ثبوت ملتا ہے ۔ خواجو نے اسمیں سکندر نامہ کے انداز پر رزم و بزم دونوں بیان کئے ہیں ۔ لیکن رزم نہایت کمزور ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے محض فرمایش ٹالنے کے لئے قلم اوٹھایا ہے ۔

خواجو کا مجموعہ کلام کمیاب ہے ۔ حیدر آباد اسٹیٹ لائبریری میں اسکا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے ۔

فہرست مضامین

بزم لسان الملک

اعتذار۔ دو ماہ سے اگرچہ رسالہ اندرون ماہ شایع ہو رہا ہے مگر تاخیر کے ساتھ۔ ناظرین کرام سے اس سہل انگاری کی معافی مانگنا عذر بدتر از گناہ ہوگا خصوصاً جبکہ ہم خود اسکو ناگواری کے ساتھ محسوس کر رہے ہیں ہم بہت چاہتے ہیں کہ پرچہ وقت کی پابندی سے نکلے مگر مرگ بدست زندہ کا معاملہ! یہ شکایت اور طباعت و اشاعت کے متعلق ایسی تمام شکایتیں اسیوقت رفع ہو سکتی ہیں جب لسان الملک کا ذاتی مطبع ہو اور ذاتی مطبع کا ہونا ادب نواز پبلک کی حوصلہ افزائیوں پر منحصر ہے۔ ہم سے باہمہ بے بضاعتی، جہانتک ذہنی و مادی ایثار ممکن ہے، اس میں انشاء اللہ کمی کوتاہی نہ ہونے پائیگی۔ غالباً اس (۵) مہینے کی مدت میں یہ اندازہ ہو چکا ہوگا کہ ہم کس قسم کے لٹریچر سے اردو کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقتہً مفید و کار آمد یا محض نظر فریب و دل خوش کن؟ اس لئے اگر ہم بھی اپنے قدر دانوں سے اُسی طرح کے سلوک و اعانت کے متمنی ہوں، جو سیاسی لیڈر طلل و تنزیب کے مقابلے میں کھدر کے ساتھ چاہتے ہیں تو بیجا نہ ہوگا +

تبصرہ۔ جولیس سیزر۔ یہ انگلستان کے پیغمبر سخن شکسپیر کے مشہور و معروف ناٹک کا ترجمہ ہے۔ جو سر رشتہ تعلیمات سرکار عالی اخبار دکن پریس حیدر آباد سے چھپکر شایع ہوا ہے اس کے مترجم مولوی سید تفضل حسین صاحب ڈپٹی انسپکٹر (ناظر) مدارس ضلع کریمنگر ہیں قابل مترجم کا نام پبلک کے لئے نیا نہیں ہے الناظر کے صفحات اور تسخیر فرانس (ترجمہ ہنری دی ففتھ) آپ کے ادبی مساعی کے شاہد ہیں۔ جولیس سیزر کا ترجمہ جس قابلیت سے کیا گیا ہے وہ ہر اعتبار سے قابل داد ہے۔ قیمت (عہ/)

بزم اردو۔ نظم و نثر اردو کا انتخاب مولفہ احمد عارف صاحب حیدر آبادی۔ یہ اردو کے مشہور شعرا اور انشا پردازوں کے کلام کا منتخب مجموعہ ہے جسمیں طلبہ اور نوجوانوں کے مفید مطلب مضامین جمع کئے گئے ہیں تقطیع خرد کاغذ چکنا لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔

نگہ راز یں ورق بروشن سواد جاہ خوانی کن

لسان الملک

نمبر (۵)	ماہ نومبر ۱۹۲۳ء	جلد (۱)

غلاف کعبہ

از جناب مولوی سید علی شبیر صاحب مترجم ہائیکورٹ

ہمارے قدیم کرمفرما مولوی سید علی شبیر صاحب ادبی دنیا میں کافی شہرت حاصل کر چکے ہیں، اور اس سے کلیتہً بے نیاز ہیں کہ ہم از سر نو ان کی معرفی ناظرین کرام سے کریں۔ آپ کے تاریخی مضامین بالغ نظری اور تلاش ودرس کا عمدہ نمونہ ہوتے ہیں۔ مندرجۂ ذیل مضمون مولویصاحب نے خاص لسان الملک کے لئے نہایت محنت و تلاش سے مرتب فرما کے تاریخی تحقیقات کی داد دی ہے جس کی یہ پہلی قسط ہے اور ہم اس کے لئے مولوی صاحب کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اڈیٹر۔

کے ہیں وہ محمل مصری کا منظر دلفریب　　وہ غلافِ پاک کعبہ پر ہجوم عاشقاں

تمہید ہر مسلمان کا دل طائر قبلہ نما کی طرح مکہ معظمہ و کعبہ مطہرہ کی جانب فطری طور پر مائل ہے۔ وہاں کے شجر و حجر میں ایک ایسی مقناطیسی قوت موجود ہے جو ہمیشہ ہمارے قلوب کو جذب کرتی رہتی ہے مسلمانوں کو ہوش سنبھالتے ہی جب وہ نماز سیکھ لیتے ہیں

یا اس سے بھی قبل جب وہ اپنے بڑوں کو کعبے کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے دیکھتے ہیں۔ کعبے کے نام سے واقفیت اور کعبے سے ایک خاص محبت ہو جاتی ہے۔ اس گنہگار کے یہ اشعار جو کسی وقت غلبۂ شوق میں زبان سے نکلے ہیں مسلمان ان کو مبالغہ آمیز ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

سبزۂ غلطاں مرے پاؤں میں اب چبھنے لگا　　آ رہے ہیں یاد صحرائے عرب ریگ رواں
دامنِ دل کھینچتے ہیں دشتِ بطحا کے ببول　　پنجۂ خار مغیلاں میں پھنسا ہے دست جاں[۱]

حقیقت یہ ہے کہ مکہ ہمارا اصلی مرجع اور کعبہ ہمارا حقیقی مرکز ہے۔ وہاں کی بنجر زمین خشک پہاڑ اور بے آب و گیاہ گھاٹیوں میں ہم کو وہ دلکش منظر دکھائی دیتے ہیں جو دنیا کے خوشنما ترین ملک۔ زرخیز ترین خطے اور شاداب ترین مقام میں نظر نہیں آتے۔ مکے کے در و دیوار بلکہ وہاں کا ایک ایک پتھر ہماری مذہبی و قومی تاریخوں کے ایسے ورق ہمارے سامنے پیش کرتا ہے جن کے مطالعہ سے تصورات کا ایک دلکش مرقع اور تخیلات کا ایک گلزار پُر بہار پیش نظر ہو جاتا ہے۔ یہ وہ سرزمین ہے جس کی ایک مٹھی بھر خاک نے انگریزی کے مشہور شاعر لونگ فیلو[۲] کی قوت متخیلہ میں ایک لہر پیدا کر دی تھی اور شیشۂ ساعت یعنی ریت گھڑی کو دیکھ کر وہ کہنے لگا تھا "کیا عجب ہے کہ فرزندانِ یعقوبؑ جب وہ کنعان سے یوسفؑ کو بیچنے کے لئے مصر لے جا رہے تھے اس خاک پر سے گذرے ہوں؟ ممکن ہے کہ اس پر سے فرعون کی سنہری گاڑیاں موسیٰ کا تعاقب کرتے وقت دوڑی ہوں۔ شائد گروہ بنی اسرائیل کو

---

[۱] یہ اس درویش کے قصیدۂ اشتیاق حرمین کے اشعار ہیں جس کا مطلع یہ ہے:

آئے ہیں یثرب سے واپس حاجیوں کے کارواں　　رشک میرے دل میں کیا کیا لے رہا ہے چٹکیاں

[۲] ہنری لونگ فیلو ۱۸۰۷ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۸۲ء میں فوت ہوا۔ اس کی نظم "سینڈ ان اے آور گلاس" یعنی "ریگ شیشۂ ساعت" کے بعض اشعار کا خلاصہ اس مقام پر لکھا گیا ہے۔

لے کر حضرت موسیٰ اس پر سے چلے ہوں۔ کیا تعجب ہے کہ مکے کے مشتاق حاجیوں کے بیشمار قافلے اس ریت پر سے آئے گئے ہوں جب ایک عیسائی اس ارض مقدس کی خاک سے اس قدر متاثر ہو تو ہم مسلمانوں کے دلوں میں اُس کے ذرہ ذرہ سے خیالات کا کیا کیا تموج و تلاطم نہ ہوتا ہوگا؟ اور حضرت ابراہیم و اسمٰعیل کے مبارک عہد اور جناب سرور کائنات کے زمانہ خیر القرون سے لے کر اب تک کیا کیا واقعات اور کیا کیا داستانیں ہم پر آئینہ نہ ہوجاتی ہونگی۔ اللہ اکبر۔ ع

درو دیوار بطحا سے مجھے لاکھوں امیدیں ہیں　　مرے کام آئے گا ہر ذرہ واں حاجت روا ہوکر

ایسے دلکش مقام اور ایسی دلفریب زمین کے چپے چپے کے حالات اگر تحریر کئے جاتے اور خانہ کعبہ کی ایک ایک اینٹ کے سوانح و واقعات پر اگر کتابیں لکھی جاتیں تو غالباً مسلمانوں کے اشتیاق نامتناہی کی تسکین ہوتی مگر حیرت اور سخت حیرت ہے کہ سوائے ایک خلاصہ تواریخ مکہ[1] اور کوئی تاریخ مکہ معظمہ کی اردو میں نہیں لکھی گئی۔ فارسی میں بھی کوئی مستقل تاریخ خاص مکہ معظمہ کی نہیں ہے۔ البتہ عربی میں اس قسم کی کئی تاریخیں لکھی گئی ہیں جن میں اخبار مکہ[2] ملا ازرقی اور قطب الدین مکی کی تاریخ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام[3] نہایت مشہور ہیں مگر یہ دونوں کتابیں بھی تقریباً نایاب ہیں اور بجز خاص کتب خانوں کے ہندوستان کے کسی کتب فروش کے ہاں نہیں ملتیں۔ اگر یورپ والے ان کو طبع نہ کراتے تو شاید یہ بھی عنقا ہوجاتیں۔ کیا غضب ہے جس ملک میں آٹھ کروڑ مسلمان رہتے ہوں وہاں اُن کے مقدس ترین شہر کے تاریخی حالات کے

---

[1] یہ کتاب ۱۲۶۸ھ میں حسب فرمان سراج الدین محمد بہادر شاہ ظفر بادشاہ دہلی لکھی گئی تھی۔ اسکی عبارت لفظی ترجمہ کے طور پر ہے اور تاریخ قطب الدین وغیرہ کا ناکمل خلاصہ نہایت ہی اختصار کیسا تھ کیا گیا ہے اسکا حجم (۶۰) صفحے ہے اس کے مولف مولوی فخر الدین حسین دہلوی ہیں۔ [2] ابی الولید محمد بن عبد الکریم ازرقی کی کتاب اخبار مکہ سب سے پہلی تاریخ مکہ ہے اس میں ۲۲۴ھ تک کے حالات درج ہیں۔

[3] قطب الدین مکی کی تاریخ مکہ الاعلام باعلام بیت اللہ الحرام نہایت مستند کتاب ہے اس میں ۹۹۰ھ کے حالات تحریر ہیں۔

متعلق جامع ایک کتاب بھی نہیں ملتی۔ اگرچہ سفر حرمین الشریفین کے بہت سے سفرنامے اردو میں لکھے گئے ہیں مگر اُن سے مکہ معظمہ کے تاریخی حالات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔

اس درویش کو زمانۂ طفولیت سے مکہ معظمہ و بیت اللہ کے حالات معلوم کرنے کا ایک خاص شوق رہا ہے اور ایک نامعلوم کشش اس کے دل کو ہمیشہ کعبے کی طرف کھینچتی رہی ہے جس کا سبب علاوہ وجوہ متذکرہ کے شاید یہ بھی ہو کہ۔

ہے حجازی خاک سے شبیرؔ میری بھی سرشت ۔ دل کو کھینچے کیوں نہ بطحائے بگولوں کی ہوا[1]

میں نے اسی شوق تحقیقات کے دوران میں غلاف کعبہ کے متعلق تفصیلی حالات و واقعات گزشتہ و حالیہ معلوم کرنے چاہے مگر عربی۔ فارسی۔ اردو۔ انگریزی کی کوئی ایک کتاب بھی ایسی نظر سے نہ گذری جس سے میری سیری ہو جاتی البتہ مختلف ذرایع اور تواریخ و سفرنامجات اور دیگر علوم و فنون کی تخمیناً ایک سو کتابوں کی الٹ پلٹ کے بعد غلاف کعبہ کے متعلق مجھے اس قدر حالات معلوم ہو گئے کہ ان کو اگر ایک جگہ کر دیا جائے تو شائقان حریم کعبہ کے لئے باعث تفریح ہو سکتے ہیں چنانچہ اسی خیال سے ان کو مرتب کر دیا گیا۔ بظاہر یہ چھوٹی سی تالیف ایک معمولی مضمون کی حیثیت رکھتی ہے مگر اس کی تیاری میں مجھ کو محنت شاقہ اٹھانی پڑی۔ بعض اوقات پانسو صفحے کی کتابوں کے مطالعہ کے بعد کچھ بھی حاصل نہ ہوا یا کوئی ایک آدھ بات مفید مطلب ہاتھ آئی جو کوہ کندن و کاہ برآوردن کا مصداق تھی۔ سب سے زیادہ مایوسی مجھے ہندوستان کے

---

[1] - یہ اس درویش کی ایک غزل کا مقطع ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

ہے کہاں بطن عقیق اور وہ بولوں کی ہوا ۔ چلکے وال پنکھیں بڑہائیں کہاں جھولوں کی ہوا

بطن عقیق مدینہ منورہ سے دو کوس جنوب و مغرب کی طرف مکے کی سڑک پر واقع ہے یہ مقام بہت دلکش و پرفضا ہے۔ احادیث میں اس کی فضیلت بیان کی گئی ہے اور آنحضرت نے اس کو وادی مبارک فرمایا ہے آپ اکثر ہوا خوری کے لئے یہاں تشریف لیجایا کرتے تھے بعض شعرائے عرب نے اس وادی کی تعریف میں شعر لکھے ہیں

اُن نامور[۱] مسلمان سیاحوں کے سفرنامے دیکھ کر ہوئی جنھوں نے مصر کا سفر کیا مگر غلاف کعبہ کی تیاری وروانگی اور جلوس کسوۂ کعبہ وجلوس محمل مصری کے متعلق ایک لفظ بھی نہیں لکھا حالانکہ یہ دونوں جلوس مصر کے بہت بڑے میلے اور دینی ودنیوی تقاریب ہیں مجھے امید تھی کہ ان کتابوں سے میرے مفید مطلب بہت سے مضامین ہاتھ آجائیں گے مگر

تشنہ بودم زدم تیغ تو آبم دادند وزجواب لب لعل تو جوابم دادند

غلاف کعبہ کی گزشتہ تاریخ کے متعلق مجھے سب سے زیادہ مدد ازرقی کی تاریخ اخبار مکہ اور قطب الدین مکی کی تاریخ الاعلام سے ملی اور موجودہ حالات برکھارٹ[۲] اور برٹن[۳] کے انگریزی سفرناموں اور ولیم اڈورڈ لین[۴] کی انگریزی کتاب "موجودہ مصری" سے کسی قدر وضاحت کے ساتھ معلوم ہو سکے مسلمان سیاحان حجاز نے اپنے سفرناموں میں عموماً کوتہ قلمی کو کام فرما کر

---

[۱]۔ سفرنامہ مولوی شبلی نعمانی۔ سفرنامہ خواجہ غلام الثقلین مرحوم۔ سفرنامہ حافظ عبدالرحمٰن امرتسری۔ سفرنامہ مولوی حاجی عبدالرحیم بنگلوری وغیرہ وغیرہ۔

[۲]۔ ابراہیم ابن عبداللہ عرف جان لوئیس برکھارٹ جسے اہل یورپ عربی سیاحوں کا بادشاہ کہتے ہیں سوٹزرلینڈ کا باشندہ تھا۔ اس نے نوبہ وشام وحجاز کا سفر کیا ہے اور ہر جگہ کے حالات نہایت تفصیل سے لکھے ہیں ۱۸۱۴ء میں مسلمانوں کا بھیس بنا کر حجاز گیا اور یہاں کے حالات بہت ہی شرح وبسط سے درج کئے۔ اس کا سفرنامہ حجاز ۱۸۱۹ء میں دو جلدوں میں انگریزی میں شائع ہوا تھا جس کا اردو ترجمہ اس درویش نے کیا ہے مگر ہنوز اللہ تعالیٰ نے توفیق طبع نہیں دی۔ برکھارٹ کی تصنیفات میں کتاب بدویوں اور وہابیوں کے حالات بھی بہت مشہور ہیں۔

[۳]۔ کپتان سر فریڈرک رچارڈ برٹن جو عبداللہ خاں کے نام سے ۱۸۵۳ء میں حجاز گیا اس کا سفرنامہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے۔ اس نے حرمین الشریفین کے حالات بڑے تفصیل سے لکھے ہیں۔

[۴]۔ ولیم اڈورڈ لین نے کئی برس قاہرہ میں رہ کر اہل مصر کے رسم ورواج ومعاشرت پر ایک کتاب انگریزی میں موڈرن ایجپشنز (موجودہ مصری) کے عنوان سے ۱۸۳۵ء میں شائع کی ہے۔

کسوۂ کعبہ کے ضمن میں دو چار سطر یا صفحے دو صفحے پر اکتفا کی ہے۔ بعض نے کچھ بھی نہ لکھا۔ تاہم جن بزرگواروں کے سفرناموں سے میں نے کچھ اخذ کیا۔ اُن میں قابل ذکر سفرنامہ ناصر خسرو، سفرنامہ ابن بطوطہ، سفرنامہ ابن جبیر، خان بہادر حاجی عبدالرحیم صاحب عہدہ دار محکمۂ بندوبست بنگلور کا سفرنامہ سفر حرمین الشریفین اور ڈاکٹر حاجی نور حسین صاحب صابر کا سفر رفیق الحجاج اور حاجی نادر علی صاحب ساکن میرٹھ کا سفرنامہ مراۃ العرب ہے۔ میں نے اس مختصر مضمون میں حتی الامکان ہر ایک واقعہ نہایت تحقیق سے لکھا ہے پھر بھی اگر کوئی سہو یا غلطی ہو تو ناظرین کرام براہ مہربانی مجھے اس سے مطلع فرمائیں تاکہ آیندہ اس کی اصلاح کر دی جائے۔ صاحبان علم اور حاجیان بیت اللہ سے میری استدعا ہے کہ غلاف کعبہ کی نسبت اگر آپ کو کوئی ایسے حالات معلوم ہوں جو اس مضمون میں درج کرنے سے رہ گئے ہیں تو از راہ الطاف بزرگانہ اُن سے آگاہی بخشیں تاکہ بحوالۂ نام نامی آئندہ تحریر کر دیئے جائیں۔

نذر جس خلوص و عقیدت سے خدام حرم کعبے کو لباس پہناتے رہے ہیں اُسی تعظیم و احترام کے ساتھ میں بھی اس حقیر مضمون "غلاف کعبہ" کو بصد ادب کعبۂ مکرم و قبلۂ مطہر حضرت بیت اللہ پر نذر چڑھاتا ہوں۔

غلاف کعبہ کی ایجاد عبادت و معاشرت کے متعلق بہت سی رسمیں مختلف ممالک مختلف مذاہب میں باہم یک دگر اس قدر ملتی جلتی ہیں کہ اُن کے موجد کا پتہ چلانا سخت دشوار ہو گیا ہے۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ جس زمانہ میں حضرت آدم کا مختصر کنبہ کسی ایک ہی مقام پر بستا تھا اُسوقت جو رسمیں آپس میں رائج ہو گئیں وہ اُس کے منتشر و متفرق ہو جانے کے بعد بھی اولاد آدم کے ساتھ ساتھ ہزاروں کوس کے فاصلہ پر پہنچ گئی۔ مثلاً جانوروں کی قربانی کی رسم دنیا کے تمام سچے اور جھوٹے مذاہب اور مہذب و غیر مہذب اقوام سب میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح جسم کو گود کر پیلے نشان بنانے کا طریقہ افریقہ کے برہنہ وحشی باشندوں سے لگا کر یورپ کے شائستہ اقوام تک سب میں چلا آرہا ہے۔ قبروں پر غلاف

ڈالنے کا دستور بھی اسی قبیل سے ہے۔ مصر کے بت پرست اہرام مصری کو جو شاہان مصر کی قبریں ہیں سر سے پاؤں تک چمکتی جھلکتی بنتی، اطلس اڑھایا کرتے تھے۔ یہودیوں کی قبروں پر بھی غلاف ڈالنے کا دستور سالہائے دراز سے چلا آرہا ہے۔ مولانا روم کے اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

از بروں چوں گور کافر پُر حلل   وز دروں قہر خدائے عزوجل

کعبے پر غلاف ڈالنے کا رواج غالباً اُن یہودیوں کی ایجاد ہے جو مکہ معظمہ میں آباد تھے۔ مگر بات یہ ہے کہ یہودیوں کے علاوہ بت پرست، موحد اور دوسرے مذہب والے بھی آستانہ کعبہ پر جبین عقیدت رگڑتے تھے اسے اپنی عبادتگاہ سمجھتے تھے۔ منتیں مانتے تھے اور نذریں چڑھاتے تھے اس لئے اب اس بات کا پتہ لگانا دشوار ہے کہ غلاف کعبہ کی ایجاد کا سہرا یہودیوں کے سر ہے یا

لـه مصر کے یہ وہ قدیم مینار ہیں جن کی نسبت خیال ہے کہ پانچہزار سال قبل تعمیر ہوئے تھے۔ ان کا شمار دنیا کے عجائبات میں ہے۔ یہ مصر کے قدیم بادشاہوں کے مقبرے ہیں۔ جن کی لاشیں مصالحہ لگا کر ان میں محفوظ کی گئیں تھیں۔ بہت سے اہرام کھود کر اُن میں کی لاشیں لندن و پیرس و قسطنطنیہ کے عجائب خانوں میں پہنچادی گئیں۔ اب صرف (۷) اہرام رہ گئے ہیں۔ یہ مثلث نما مخروطی شکل میں تعمیر کئے گئے ہیں۔ سب سے بڑے اہرام کا ہر ضلع جڑ کے قریب (۷۴۶) فٹ ہے جو بتدریج اوپر کی جانب گھٹتا چلا گیا ہے۔ اس کی بلندی (۴۵۱) فٹ ہے اس کے (۲۰۶) منزلیں ہیں۔ لوگ اس کے اوپر تک پہنچ سکتے ہیں ان میناروں میں ہزار ہزار من کے پتھر ایسی صفائی سے جوڑے گئے ہیں کہ اُن کے جوڑ میں سوئی تک نہیں داخل ہو سکتی۔ ان کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ قدیم میں مصریوں کو فن تعمیر و جر ثقیل میں یدطولی حاصل تھا ان میناروں پر کچھ کتبے بھی ہیں اور بعض کے نیچے تہہ خانے ہیں جو مشعل کی مدد سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ یہ اہرام قاہرہ سے کوئی (۱۰) میل کے فاصلہ پر واقع ہیں اور بذریعۂ ٹریموے ان کو دیکھنے کے لئے سیکڑوں سیاح روزانہ آتے جاتے ہیں۔

اور مذہب والوں کے۔ مگر جہاں تک ہم کو پتہ چل سکا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس کا رواج یہودیوں ہی سے ہوا جیسا کہ آگے ذکر آئے گا۔

اسلام نے غلاف کعبہ کی رسم کو کیوں جائز رکھا

اس موقعہ پر یہ اعتراض ہو سکتا ہے کہ یہودیوں یا بت پرستوں کی اس رسم کو کیوں جائز رکھا؟ بات یہ ہے کہ اسلام سے پیشتر ہی دین ابراہیمی کے اصول کے لحاظ سے کعبے کی تعظیم وتکریم کی جاتی تھی مگر استداد زمانہ کے باعث مناسک حج کے ساتھ ساتھ کفر و شرک کی رسمیں بھی مل گئی تھیں۔ کعبے میں ایک طوفان بے تمیزی برپا ہونے لگا تھا اور ہزاروں طرح کی بیہودگیاں کی جاتی تھیں۔ جب آفتاب رسالت چمکا اور حسب فرمان خداوندی جاءَ الحق و زھق الباطل انّ الباطل کان زھوقا۔ یعنے سچ آگیا اور جھوٹ مٹ گیا اور حقیقت میں جھوٹ مٹنے ہی کے قابل تھا۔ کعبے کے بت ڈھا دیئے گئے۔ شیطان کے تھان توڑ ڈالے گئے اور در و دیوار سے لاالٰہ الاّ ھو سبحانہ عما یشرکون[۱] کی آوازیں سنائی دینے لگیں تو حضور سرور عالم نے کفر کی اُن تمام رسموں کا جو مخرب اخلاق تھیں یا جن سے ایمان میں خلل آتا تھا قلع و قمع کر دیا۔ اور صرف ایسی رسوم کو جن سے مذہب و اخلاق پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا تھا بدستور قایم رکھا چنانچہ غلاف کعبہ یا کسوت کعبہ بھی اُنھیں رسموں سے ہے جو جائز و مباح سمجھی گئیں

غلاف پہنانیکی غرض

کعبہ پر غلاف ڈالنے کی غرض و غایت بظاہر یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت انسان کی عادت ہے۔ جب کوئی نفیس چیز یا کوئی تبرک اس کے ہاتھ لگ جاتا ہے تو اُسے اس طرح سات پردوں میں چھپا کر رکھتے ہیں کہ ہوا نہ لگے یہی وجہ ہے کہ تبرکات اور خوشنما چیزوں کو گرد و غبار سے محفوظ رکھنے کے لئے

---

[۱] اُس ایک خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ شریک اور ساجھیوں سے پاک ہے۔

بیت اللہ اور مختلف اقوام کے نزدیک واجب التعظیم عبادت گاہ تھی غالباً خارجی اثرات ہوا خاک پانی۔ دھوپ وغیرہ سے بچانے کے لئے اور ظاہری زیب و زینت کے لئے غلاف یا لباس وکسوت پنہاتے تھے ورنہ جہاں تک ہم نے تحقیقات کی اس بات کا کوئی پتہ نہ لگا کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب کعبے کو مثل کسی بت یا کسی ایسی جاندار شے کے تصور کرتے ہوں جس کو انسان کی طرح لباس کی ضرورت ہوتی ہے چونکہ کعبۂ مکرمہ سب سے پہلا عبادت خانہ ہے[لہ] جو خدائے وحدہٗ لاشریک کی عبادت کے لئے زمین کے پردے پر بنایا گیا ہے اس لئے بانیٔ اسلام نے صرف کعبہ ہی پر غلاف ڈالنے کو جائز فرمایا نہ کا اور دوسری مسجدوں پر غلاف پنہانے سے نہ تو کعبے کی پرستش مقصود ہے اور نہ غلاف کی۔ علیٰ ہذا مسلمان جو غلاف کعبہ کو تبرک سمجھ کر آنکھوں سے لگاتے ہیں تو یہ اصل تعظیم رب کعبہ کی ہوتی ہے۔ غلاف کو اپنا حاجت روا نہیں خیال کیا جاتا۔ اور نہ اُس کے ریشم کی چمک اور سنہری کام کی دمک کی وجہ سے اُسکو چومنے کے قابل سمجھتے ہیں

جامۂ کعبہ را کہ می بوسند — او نہ از کرم پیلہ نامی شد
با عزیزے نشست روزی چند — لاجرم ہمچو او گرامی شد

کعبے کو سب سے پہلے کس نے غلاف پہنایا

مورخین مکہ[سلہ] لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے جس شخص نے کعبہ کو غلاف پہنایا اور اُس کے دروازے کے لئے کواڑ اور قفل کنجی بنائی وہ یمن کا بادشاہ تبع[سلہ] اسعد حمیری تھا۔ غلاف چڑھانے کی وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ اُس نے خواب میں دیکھا تھا کہ وہ کعبے کو لباس پہناتا ہے چنانچہ اس خواب کی تعبیر کے طور پر

لہ۔ قرآن شریف میں وارد ہے۔ انّ اول بیت وضع للنّاس للذی ببکۃ مبارکاً وھدی للعالمین۔

سلہ۔ ابی الولید محمد بن عبد الکریم ازرقی اور قطب الدین مکی۔

سلہ۔ تُبّع شاہان یمن کا لقب تھا حمیر یمن سے متصل علاقہ کا نام ہے۔ جو بادشاہ یمن و حمیر پر حکمراں ہوتا تھا اس کو تبّع کہتے تھے۔ تبع کے لغوی معنی اتباع کنندگاں کے ہیں اور یہ جمع تابع کی ہے۔

وہ غلاف لیکر مکے پہنچا مگر اہل مکہ جب اُس کے استقبال کے لئے نہ گئے اور اُس کی تعظیم وتکریم نہ کی تو اُس نے یہ خیال کر کے کہ مکے والوں کا سارا غرور اس کعبے کی وجہ سے ہے اسی کو مسمار کر دینا چاہیئے کعبہ کو ڈھا دینے کا ارادہ کیا لیکن اس اثناء میں وہ ایسا سخت بیمار ہو گیا کہ طبیب اُس کے علاج سے عاجز ہو گئے آخر کسی پیر جہاں دیدہ نے یا بقول ازرقی بعض اہل کتاب نے جو اُس کے ساتھ تھے اُسے آگاہ کیا کہ تیری بیماری کا اصلی سبب تیری وہ نیت ہے جو کعبے کو ڈھا دینے کے لئے تو نے کی ہے۔ پس اگر تو اس ارادہ سے باز آجائے تو تیری بیماری دفع ہو جائے گی۔ جب اسعد نے اپنے خیال سے توبہ کی وہ اچھا ہو گیا اور کعبے کو بیش قیمت لباس پہنایا۔ یہ واقعہ ہجرت سے ایک ہزار سال قبل کا ہے۔ ازرقی نے یہ ذکر کرتے ہوئے۔ تبع اسعد کے حسب ذیل اشعار لکھے ہیں۔

وکسونا البیت الذی حرّم — اللہ ملاءً معضّداً وبروداً
وَاقمنا بہ مِنَ الشّھرِ عشراً — وجعلنا لبابِہ اقلیداً
وَخرجنا منہ نؤمّ سہیلاً — وَرفعنا لوائَنا معقوداً

جن کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے اُس مکان کو چھینٹ کا لباس پہنایا اور اُس پر چادریں چڑھائیں جسکو اللہ تعالیٰ نے بزرگی دی ہے اور ہم وہاں دس روز مقیم رہے اور اُس کے دروازے کے لئے کنجی بنائی اور ہم سہیل ستارہ کو اپنا رہنما بنا کر یہاں سے روانہ ہوئے اور ہم نے اپنے جھنڈے کو لپٹا ہوا بلند کیا۔

ازرقی نے اسعد حمیری کے ہمراہیوں کو اہل کتاب لکھا ہے مگر اسعد کا مذہب بیان نہیں کیا۔ تاہم یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اہل کتاب کے مشورہ پر عمل کرتا تھا اور چونکہ اُسوقت اطراف یمن میں یہود رہا کرتے تھے اس لئے ممکن ہے کہ جو اہل کتاب اس کے ہمراہ تھے وہ یہودی ہوں۔ نیز ازرقی کہتا ہے کہ اسعد حمیری کو بُرا کہنے کی حدیث میں ممانعت آئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتا تھا جیسا کہ اُس کے پہلے شعر کے مضمون سے

بھی ثابت ہے یا کم سے کم وہ یہودی تھا اور آنحضرت صلعم نے کعبہ پر غلاف چڑہانے کی وجہ سے یا اور خوبیوں کے باعث اُس کو بُرا کہنے کی ممانعت فرمائی ہے۔ کتاب صناجتہ الطرب فی تقدمات العرب میں تبع اسعد حمیری کے مذہب اور اُس کے چڑہائے ہوئے غلاف کی یہ صراحت موجود ہے کہ اُس نے ریشمی چادر اور دھاریدار کپڑے کی چادریں کعبہ پر ڈالی تھیں اور یہی بادشاہ عرب میں پہلا شخص تھا جس نے یہودی مذہب اختیار کیا تھا۔ بیانات مذکورہ بالا سے ثابت ہے کہ کعبہ پر غلاف ڈالنے کا طریقہ یہودیوں اور بنی اسرائیل کی ایجاد ہے نہ کہ بت پرستوں کی۔

زمانہ جاہلیت میں کعبے کا غلاف

مقریزی کہتا ہے کہ ابتداً کعبہ کا لباس ٹاٹ اور چمڑے[۱] کا بنایا جاتا تھا۔ قطب الدین کی تاریخ مکہ میں ہے کہ قبل ظہور سرورِ عالم اطراف و جوانب کے اکثر امرا کعبے کو بردیمانی اور نمط کے جو ایک نفیس کپڑا ہوتا تھا غلاف پہنایا کرتے تھے اور مختلف قسم کے ہدیئے اور تحفے کعبے کو بھیجا کرتے تھے جن میں لباس کعبہ بھی ہوا کرتا تھا اکثر لوگ نذریں مانتے تھے اور وہ پوری ہونے پر غلاف چڑہاتے تھے ازرقی بروایت ابن ملیکہ کہتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں کعبے کو مختلف قسم کے کپڑوں کا لباس پہناتے تھے اور قربانی کے جانوروں پر کملوں چادروں اور یمن کے کپڑوں کی جھولیں ڈالتے تھے جو کعبے پر چڑھا دی جاتی تھیں اور ان کے علاوہ کعبے کو اور بھی مختلف قسم کے کپڑے اونی و ریشمی وغیرہ بطور ہدیہ دیتے تھے جو کعبے پر لٹکا دیئے جاتے تھے اور پہنا دیئے جاتے تھے

---

[۱] ابتدائی زمانہ میں آدمیوں کا لباس بھی اکثر چمڑے کا ہوتا تھا توریت میں ہے کہ حضرت آدم کو سب سے پہلا لباس انجیر کے پتوں کا دیا گیا تھا اس کے بعد چمڑے کا لباس عنایت ہوا اس زمانہ میں بھی اکثر سرد ملکوں کے رہنے والے جانوروں کی کھال اور چمڑے کا لباس پہنتے ہیں جس کو پوستین کہتے ہیں۔ عرب بھی اونٹ کے دباغت کئے ہوئے چمڑے اوڑہنے بچھونے کے طور پر کام میں لاتے تھے جس کو نطع کہتے تھے جس کی جمع انطاع ہے۔

اور اس کے بعد جو بچ رہتا تھا وہ خزانۂ کعبہ میں رکھ چھوڑتے تھے۔ جب لباس کعبہ میں سے کوئی چیز پرانی ہو جاتی تھی یا پھٹ جاتی تھی تو اُس کی جگہ دوسرے کپڑے کا پیوند لگا دیتے تھے مگر ان پھٹی پرانی چیزوں میں سے کوئی چیز علیحدہ نہیں کرتے تھے۔

ابوالفرج اصفہانی کتاب اغانی میں لکھتا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں قریش چندہ کر کے سال میں ایک بار کعبے کو پوشش پنہاتے تھے اور یہ طریقہ قصی[۱] کے زمانہ سے چلا آرہا تھا یہاں تک کہ بحیر بن ابو ربیعہ جس نے تجارت سے بہت دولت پیدا کرلی تھی باختلاف روایات سال کے سال یا ایک سال قریش اور ایک سال بحیر کعبے کو لباس پنہانے لگا اسی وجہ سے قریش اس کو العدل کہنے لگے تھے یعنے وہ تنہا ایک شخص کعبے کو غلاف پنہانے میں تمام قریش کی برابری کرتا تھا۔ آنحضرت صلعم نے اس شخص کا نام اُس کی صفات کی مناسبت سے عبداللہ رکھا تھا۔ ازرقی کہتا ہے کہ اس کی اولاد بنو العدل کہلانے لگی تھی۔

زمانہ جاہلیت میں قربانی کی جھولیں بھی بطور غلاف کعبے پر ڈال دیجاتی ہیں

زمانۂ جاہلیت بلکہ ابتدائے اسلام میں بھی کعبے کو پورا لباس پہنانے کے علاوہ اکثر اشخاص نذریں مان کر قربانی کے جانوروں کی جھولیں بھی کعبے پر ڈالا کرتے تھے اور چمڑو نکے

---

[۱] قصی بن کلاب مکہ کا بادشاہ اور کعبہ کا متولی تھا حضرت ابراہیم کی تعمیر کے بعد تیسری مرتبہ خانہ کعبہ کی جو تعمیر ہوئی وہ اسی نے کی تھی اسکا اصلی نام زید تھا قصی کے معنی وطن سے بچھڑے ہوئے کے ہیں۔ یہ بچپن میں گھر سے نکل گیا تھا اسو جہ سے اس کا یہ نام پڑگیا۔ جب اپنے بلوغت کے بعد وہ مکہ میں آیا تو اس کی قوم نے اس کو پہچان کر بڑی عزت کی۔ اُس زمانہ میں حلیل بن حبشیہ الخزاعی مکہ و کعبہ کا حاکم تھا۔ اُس نے اپنی لڑکی حبیٰ کی شادی اس کے ساتھ کردی اور مرتے وقت خانہ کعبہ کی کنجی اپنی لڑکی کے سپرد کی چونکہ یہ عورت خدمت کعبہ انجام نہیں دے سکتی تھی اسلئے اُسنے اپنے قبیلے کے ایک شخص کو جسکا نام ابی غبشان تھا کعبہ کا داروغہ مقرر کیا۔ یہ بڑا شرابی تھا ایک مشکیزہ شراب کے بدلے میں اسنے کعبے کی کنجی قصی کے ہاتھ فروخت کردی اسپر بنی خزاعہ نے لڑائی کی مگر قصی غالب آیا اور اس نے اُن کو مکہ سے نکال دیا۔ اور قصی کی قوم نے اُس کو (قصی کو) اپنا بادشاہ اور مکہ کا مالک و کعبہ کا متولی بنالیا۔

لباس یعنے پوستین اور تکیوں وغیرہ سے بھی کعبے کو آراستہ کرتے تھے جیسا کہ تاریخ ازرقی میں عمر بن الحکم السلمی سے مروی ہے وہ کہتا ہے۔ میری ماں نے نذر مانی تھی کہ وہ بیت اللہ کے نزدیک ایک اونٹ کی قربانی کرے گی اور اُس کو بھیڑ کے بال کے کپڑے اور اونٹ کے بال کے کپڑے کے دو ٹکڑوں سے سجائے گی۔ پس اُس نے اونٹ ذبح کیا اور کپڑے کے دونوں ٹکڑے کعبے پر ڈال دیئے گئے اور اُس روز آنحضرت صلعم کے ہی ہیں تشریف فرما تھے ہجرت نہیں فرمائی تھی میں نے اُسی روز کعبے کو دیکھا کہ اُس پر مختلف قسم کے کپڑوں کے ٹکڑے اور چڑمیں بچھو نے ساونی لباس اور تکیے بھی موجود تھے اور یہ سب چیزیں میں نے آنکھ سے دیکھیں۔

آغاز اسلام میں قربانی کی جھولوں کا استعمال

زمانۂ اسلام کی بھی ایک روایت تاریخ ازرقی میں ابن عمر کے حوالہ سے موجود ہے۔ ابن عمرؓ کہتے ہیں کہ عرفہ کے دن لوگ جب احرام باندھتے تو قربانی کے جانوروں پر خیاطی اور دوسری قسم کے کپڑے ڈالتے اور قربانی کے دن وہ کپڑا علحدہ کر کے شیبہ[۱] بن عثمان کے پاس کعبے پر ڈالنے کے لئے بھیجدیا کرتے تھے۔ ابن عمر کہتے ہیں کہ وہ اپنی قربانی کے جانور کو نمط کی جو ایک عمدہ کپڑا ہوتا تھا جھول پنہایا کرتے تھے اور ذبح کے بعد وہ جھول کعبے کے دربانوں کے پاس بھیجدیتے تھے اور وہ لوگ کعبے کو غلاف پنہانے سے قبل یہ جھول کعبے پر ڈال دیا کرتے تھے۔

زمانۂ جاہلیت کے کہنہ غلاف کعبہ

زمانۂ جاہلیت میں عرب کعبے کے غلافوں کو اتارتے بھی نہ تھے پھٹی پرانی کسوتیں بھی نئی کسوتوں کے ساتھ لٹکی رہا کرتی تھیں مگر ہم کو اس

[۱] آنحضرت نے کعبے کی کنجی عثمان بن طلحہ کے تفویض فرمائی تھی ان کے فرزند شیبہ بن عثمان تھے جو زمانہ امیر معاویہ میں کلید بردار کعبہ تھے۔ اب کلید کعبہ نسلاً بعد نسل انہیں کی اولاد میں چلی آرہی ہے اور یہ لوگ بنی شیبہ کہلاتے ہیں بعض مختصراً ان کو شیبی بھی کہتے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ شیبہ بن عثمان کو امیر معاویہ نے کعبے میں کچھ تغیر و تبدل کرنے کیلئے بھیجا تھا اُنکی اولاد بنی شیبہ ہے۔

بات کا پتہ نہ لگا کہ آخر ان پرانے غلافوں کا کیا حشر ہوا کرتا تھا ممکن ہے کہ یہ دھجیاں ہوا میں اڑتی اور مینہ کے پانی میں بہتی پھرتی ہوں یا مفلس و قلاش عرب ان کو بھی اپنی تن پوشی کے کام میں لے آتے ہوں کھلم کھلا نہ سہی چھپا چوری ہی سے سہی، عالم اسلام میں ایک مثال غلاف کو لوٹنے کی بھی ہے یعنی ۲۶۶ھ میں خلیفہ معتمد علی اللہ کے زمانہ میں اعراب نے غلاف کعبہ لوٹا تھا

غلاف کعبہ آنحضرت کے زمانہ میں

۸ھ میں جب مکہ فتح ہو گیا اور خانۂ کعبہ بلا شرکت غیرے خالص مسلمانوں کا معبد رہ گیا تو آنحضرت صلعم نے یمن کے باریک کپڑے کا غلاف پہنایا اور اس کی قیمت بیت المال سے ادا فرمائی۔

خلفائے راشدین کے زمانہ میں غلاف کعبہ

حضرت ابو بکرؓ نے بھی بیت المال سے غلاف چڑھایا۔ حضرت عمرؓ نے مصر کے سن کے بُنے ہوئے کپڑے کو جسے قباطی کہتے ہیں غلاف کے لئے انتخاب کیا۔ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں کعبے کو سال میں دو بار غلاف پہناتے تھے ایک مرتبہ گرمی میں اور ایک مرتبہ جاڑوں میں۔ گرمیوں میں عمدہ سن کے کپڑے کا جوڑا چڑھایا جاتا تھا اور جاڑوں میں دیبا کی قمیص مع ایک ازار اور برقعہ کے پہنائی جاتی تھی۔ غلاف کا کپڑا یمن سے تیار کرا کے منگایا جاتا تھا۔ غلاف کا وہ حصہ جو دیواروں پر چھت کے قریب رہتا ہے وہ قمیص کہلاتی ہے اور جو زمین کے نزدیک رہتا ہے اُس کو ازار کہتے ہیں۔ کعبے کے دروازے کا پردہ برقع کہلاتا ہے۔

ابتدائے زمانہ اسلام میں بھی پرانی کسوتیں کعبہ پر ہی رہتی تھیں۔ قطب الدین کا بیان ہے کہ حضرت عمرؓ ہر سال نیا غلاف ڈال کر پرانا غلاف حاجیوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ ازرقی کہتا ہے کہ زمانۂ اسلام میں پرانی کسوتیں تھوڑی تھوڑی کر کے علحدہ کی جانے لگیں اور سب سے پہلے شخص جنھوں نے کعبے پر صرف دو پرانی کسوتیں باقی رکھیں وہ حضرت عثمانؓ تھے تاہم باقاعدہ طور پر بالالتزام پرانے غلافوں کو اتارا نہ جاتا تھا۔ چنانچہ یہی مورخ کہتا ہے کہ سنہ ۲۰۰ھ سے ۲۴۲ھ تک چوالیس برس میں جو غلاف چڑھے تھے

ان کی تعداد (۱۷۰) تھی۔ غالباً یہ تعداد سالم غلافوں کی نہ ہوگی بلکہ اس میں وہ پارچے جو کعبے پر نذر چڑہائے جاتے تھے اور قربانی کی جھولیں بھی شامل ہیں۔

جاہلیت اسلام میں غلاف ڈالنے کی تاریخ۔

ازرقی میں سعید بن سالم ابن جریج سے روایت ہے کہ زمانہ گذشتہ میں کعبے کو عاشورے کے دن غلاف پہنایا کرتے تھے۔ یعنے مکہ معظمہ سے حاجیوں کے چلے جانے کے بعد تاکہ حاجی نئے غلاف کو چھو کر اور چوم کر خراب نہ کریں مگر بنی ہاشم یوم ترویہ یعنے ۸ ذی الحجہ کو کعبے پر دیبا کی قمیص لٹکانے لگے تاکہ لوگوں کو خانہ کعبہ کی رونق اور خوبی نظر آئے اور عاشورے کے دن ازار پہنانے لگے۔ ازرقی نے ایک حدیث بھی نقل کی ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ آنحضرت صلعم نے فرمایا۔ "یہ روز عاشورہ ہے یہ وہ دن ہے کہ اس روز سال پورا ہوتا ہے اور کعبے کو لباس پہنایا جاتا ہے اور اعمال بلند کئے جاتے ہیں۔ اگرچہ آج کا روزہ فرض نہیں ہے۔ لیکن ہم روزہ سے ہیں اور تم میں سے جو شخص روزہ رکھنا چاہے وہ رکھے"۔ پچھلی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم کے زمانہ میں بھی عاشور کے دن کعبے پر غلاف ڈالا کرتے تھے اس کے بعد سال میں کبھی دو بار جیسا کہ حضرت عثمان و امیر معاویہ کے زمانہ میں ہوا اور کبھی سال میں تین بار اور کبھی ہر دوسرے مہینے کعبے کی پوشش بدلنے لگی اور سلاطین وقت نے جو تاریخ غلاف ڈالنے کے لئے مناسب سمجھی مقرر کر دی کبھی عاشور اور کبھی اور کوئی تاریخ اور تقریباً چار سو برس سے اب تک عموماً اسی تاریخ کعبے کو نیا غلاف پنہایا جاتا ہے۔

امیر معاویہ کے زمانہ میں غلاف کعبہ

امیر معاویہ نے اولاً کئی سال تک قباطی اور مصری کسن کے کپڑے کا غلاف بھیجا اور بعد میں بردیبانی کا۔ ان کے زمانہ میں عموماً سال میں دو غلاف چڑھائے جاتے تھے ایک عاشور کے دن قباطی کا دوسرا آخر رمضان میں دیبا کا۔ مورخین مکہ کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ امیر معاویہ نے نیا غلاف بھیجکر شیبہ بن عثمان کو حکم دیا کہ کعبے کا پرانا غلاف اتار کر اس کی دیواروں کو خلوق وغیرہ سے

معطر کرے۔ اور پھر نیا غلاف پہنائے۔ شیبہ کا ارادہ پرانے غلاف کو دفن کر دینے کا تھا تاکہ
پاک و ناپاک ہر قسم کے لوگ اُس کو نہ چھو سکیں مگر اس پر عبد اللہ ابن عباس کو اعتراض ہوا
آخر شیبہ نے ام المومنین حضرت عایشہ سے اس بارہ میں مشورہ لیا۔ انھوں نے ارشاد فرمایا کہ
غلاف فروخت کر کے اُس کی قیمت غریبوں کو بانٹ دی جائے چنانچہ اسی پر عمل کیا گیا۔ اہل مکہ
ام المومنین کے حکم کے پہلے جزو کی اب بھی تعمیل کرتے ہیں مگر دوسرے جزو کو بھول گئے۔ اور
وہ شیبہ جنھوں نے غلاف دفن کر دینے کا خیال کیا تھا۔ اور بالآخر فروخت کر کے اُس کی قیمت
غریبوں میں تقسیم کر دی تھی اب اُن کی اولاد (بنی شیبہ) غلاف کی ایک ایک دھجی کے پیچھے
جان دیتی ہے۔ ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا۔

رفتہ رفتہ اثر صدق و صفا کچھ نہ رہا آخری دور میں تلچھٹ کے سوا کچھ نہ رہا

ازرقی کا بیان ہے کہ سب سے پہلے جس نے دیبا کا غلاف کعبہ پر ڈالا وہ یزید پلید ہے مگر اکثر
مورخ اس پر متفق ہیں کہ عبد اللہ ابن زبیر[۱] نے سب سے پہلے دیبا کا غلاف کعبے پر ڈالا۔
بعض عبد الملک[۲] ابن مروان کا نام بھی بتاتے ہیں۔

۱۔ اس کا نام عبد اللہ اور کنیت ابو بکر ہے۔ اس کے والد حضرت زبیر ان دس صحابیوں میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت آنحضرت صلعم نے دی ہے (بزدیکے احادیث اہل سنت عشرہ مبشرہ یعنی اُن صحابیوں میں سے ہیں جن کے جنتی ہونے کی بشارت آنحضرت صلعم نے دی ہے)۔ یہ حضرت ابو بکر کے نواسے ہیں ان کی والدہ اسما بنت ابو بکر اور ان کی خالہ حضرت عایشہ تھیں۔ یزید ابن معاویہ کی بیعت سے انکار کر کے یہ مکہ معظمہ چلے گئے وہاں اہل حجاز یمن و عراق وغیرہ نے ان کی اطاعت کی ۶۳ھ میں یزید نے ایک لشکر بسر کردگی حصین بن نمیر ان کو مطیع کرنے کے لئے مکہ بھیجا مگر اس اثناء میں یزید مر گیا اور اُس کی فوج واپس ہو گئی۔ پھر ۷۳ھ میں عبد الملک بن مروان خلیفہ خاندان بنی امیہ نے دمشق سے ایک فوج حجاج کی ماتحتی میں بھیجی اور کعبہ کا محاصرہ کیا اور سخت لڑائی کے بعد عبد اللہ ابن زبیر بہتر برس کی عمر میں نو برس کی پر آشوب خلافت کے بعد میدان جنگ میں بڑی شجاعت کے ساتھ مارے گئے۔

۲۔ عبد الملک بن مروان خاندان بنی امیہ کا پانچواں خلیفہ جو ۶۶ھ سے ۸۶ھ تک حکمراں رہا۔

عبداللہ ابن زبیر کا غلاف کعبہ

لیکن زیادہ صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ ابن زبیر نے سب سے پہلے کعبہ پر دیبا کا غلاف ڈالا تھا جس کی تفصیل یہ ہے کہ ۶۳ھ میں جب یزید پلید نے مکہ فتح کرنے اور عبداللہ ابن زبیر کو مطیع کرنے کے لئے حصین بن نمیر کو بھیجا۔ عبداللہ ابن زبیر بیت اللہ میں پناہ گزین ہوئے۔ حصین بن نمیر نے کوہ ابو قبیس پر منجنیق نصب کے جس سے کچھ تپھر اور جلتی ہوئی رال کعبے تک پہنچی اور کعبے کی لکڑیاں اور غلاف جل گیا۔ یزید کے مرنے کی خبر سنکر جب حصین بھاگ گیا تو عبداللہ ابن زبیر نے بنیاد ابراہیم علیہ السلام پر کعبہ تعمیر کیا اور جب یہ عمارت بن کر تیار ہوگئی تو ۲۷ رجب ۶۴ھ مشک و عنبر سے اندر باہر ہوکر اُس پر دیبا کا غلاف ڈالا۔

خلافت بنی امیہ میں غلاف کعبہ

خلافت بنی امیہ کے عہد میں ہر برس دیبا کا غلاف ڈالا جاتا تھا اور ترویہ کے دن یعنے ۸ ذیحجہ کو اسی خیال سے کہ سب لوگ عرفات چلے جاتے ہیں غلاف کو کوئی پھاڑ نہ لے اصل غلاف نکال کر سفید کپڑے کا سادہ غلاف ڈال دیا جاتا تھا۔ پھر دسویں ذیحجہ کو اصل غلاف اڑہا دیتے تھے اس کے بعد غلاف کے اوپر کا حصہ جسے قمیص کہتے ہیں اور نیچے کا حصہ جو ازار کہلاتا ہے دونوں سی دیئے جاتے تھے۔ یہ دیبا کا غلاف آخر رمضان تک رہتا تھا پھر عید کے دن دوسرا غلاف جو قباطی کا ہوتا تھا ڈالتے تھے۔ زمانہ خلافت بنی امیہ میں خلیفہ وقت کے علاوہ کبھی کبھی اور لوگ بھی کعبے کو نذر کے طور پر غلاف چڑہایا کرتے تھے۔ مثلاً عبداللہ ابن مروان اکثر غلاف چڑہاتا رہتا تھا مصعب ابن زبیر بھی ہر سال عاشورہ کے دن نیا غلاف ڈالتے تھے۔

خلافت عباسیہ میں غلاف کعبہ

خلافت عباسیہ میں بھی کبھی سال میں ایک بار اور کبھی کئی بار غلاف اڑہایا جاتا تھا اور ابھی تک پرانے غلافوں کو پابندی کے ساتھ اتار دینے کا طریقہ نہ تھا۔ چنانچہ ۱۶۰ھ میں ابو عبداللہ مہدی خلیفہ بغداد کو

کلید برداروں نے اطلاع دی یا وہ خود حج کو آیا تو اُس نے یہ حالت دیکھی کہ کعبے پر غلافوں کی اتنی تہیں چڑھ گئی ہیں کہ سے دیواروں کے گرنے کا خوف ہے۔ غرضکہ اُس نے پرانے غلافوں کو آتار دینے کا حکم دیا اس کی تعمیل ہوئی اور کعبے کی دیواریں مشک و عنبر و گلاب کے مرکب سے لیپی گئیں اور خوشبودار عرقوں کے شیشے دیواروں پر چھڑکے گئے پھر تین غلاف ایک مصری کپڑے کا دوسرا حریر کا تیسرا دیبا کا کعبے پر ڈالے گئے۔

خلیفہ مامون الرشید کے زمانے میں جو ۱۹۸ھ سے ۲۰۸ھ تک ہے سال میں تین مرتبہ غلاف پڑنے لگا۔ ایک آٹھویں ذیحجہ کو دیبائے سرخ کا۔ دوسرا یکم رجب کو مصری کپڑے کا تیسرا عید الفطر کو دیبائے سفید کا۔ جب مامون الرشید کو اس امر کی اطلاع ہوئی کہ باوجود سال میں تین دفعہ بدلنے کے غلاف پھٹ جاتا ہے تو اولاً اُس نے ایک کسوت زیادہ کی پھر دو ازاریں اور بڑھا دیں۔

اس زمانہ تک اس امر کا پتہ چلتا ہے کہ بعض دوسرے امرا و روسا بھی کعبے کو غلاف پہنا دیا کرتے تھے اور پرانے غلافوں کے انبار حسب سابق کعبے پر رہتے تھے چنانچہ ازرقی لکھتا ہے کہ جب کعبے پر کثرت سے غلاف چڑھ گئے تو ایک شخص مسمی حسین بن حسن الطالبی نے (جو غالباً کسی امیر ابو السرایا الاصفر بن الاصغر کا ملازم تھا) یکم محرم روز شنبہ ۲۰۰ھ کو تمام غلاف اتار دیئے یہاں تک کہ اُس پر کوئی چیز باقی نہ رہی اور کعبے کا دروازہ بھی نظر آنے لگا جو ابن زبیر نے کعبے کی پیچھے کی جانب تعمیر کیا تھا اور جسکو عبد الملک کے حکم سے حجاج نے اینٹوں سے چن دیا تھا پس حسین بن حسن نے اُس پر اون اور ریشم ملے ہوئے باریک کپڑے کی زرد و سفید دو کسوتیں ڈالیں اور ان دونوں کے درمیان حسب ذیل عبارت لکھی:-

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ وَصَلَّى اللّٰهُ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَعَلٰى اٰلِ بَيْتِهِ الطَّاهِرِيْنَ الْاَخْيَارِ۔ اُمَرَ اَبُو السَّرَايَا الْاَصْفَرُ الْاَصْغَرُ دَاعِياً اِلٰى الْمُحَمَّدِ بِعَمَلِ هٰذِهِ الْكِسْوَةِ

لبیت اللہ الحرام[۱]

خلیفہ جعفر المتوکل علی اللہ[۲] جس کا زمانہ ۲۳۲ھ سے ۲۴۷ھ تک ہے۔ ہلال رجب سے قبل سُرخ دیبا کی ازار ڈالتا تھا جب اُس کو یہ معلوم ہوا کہ حاجیوں کے چھونے سے وہ خراب ہو جاتی ہے تو ازار اول کے علاوہ دو ازاریں اور بڑھا دیں اور ۲۴۲ھ میں قباطی کی قمیص پر سُرخ دیبا کا حاشیہ لگا کر اُس کو فرش تک لمبا کر دیا اور آخر کار ۲۴۳ھ میں ہر دوسرے مہینے دو غلاف بھیجے گئے۔ جب خدام کعبہ نے دیکھا کہ ازار ثانی کی ضرورت نہیں ہے تو انہوں نے اس کو کعبے کے صندوق میں رکھ دیا اور خلیفہ کو لکھا کہ صرف ایک ازار مع حاشیہ و قمیص کے کافی ہے۔ اس کے بعد سے ایک ازار آنے لگی اور تیسرے مہینے کعبے پر ڈالی جانے لگی۔

خلافت عباسیہ کے زمانہ میں غلاف کعبہ روانہ کرنے کی وجہ سے حجاز پر خلفائے بغداد کا بڑا اثر و رسوخ قایم ہو گیا تھا کیونکہ کعبے کو غلاف پہنانا حجاز پر حکومت کی دلیل سمجھا جاتا تھا جب خلافت عباسیہ کو ضعف ہوا تو پابندی کے ساتھ بغداد سے غلاف روانہ ہونے لگا اور

---

۱ بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ درود خدا کا محمدؐ پر اور اُن کے طیب و طاہر و نیک اہل بیت پر۔ حسب الحکم ابو السرایا اصفر الاصغر کے بیت اللہ الحرام پر غلاف ڈال کر لوگوں کو دین محمدؐ کی جانب دعوت دیجاتی ہے۔

۲ یہ وہی متوکل علی اللہ خلیفۂ بغداد ہے جس نے بزعم خود انسداد قبر پرستی کے لئے ۲۳۶ھ میں حکم دیا کہ قبر امام حسین علیہ السلام مع دوسری قبروں کے ڈھا کر وہاں کھیت کریں اور کوئی زیارت کو نہ آئے۔ چنانچہ اُسی زمانہ میں کربلا ویران اور جنگل ہو گئی تھی لوگ اسے ناصبی کہنے تھے بغداد کی دیواروں پر اور شہر کی مسجدوں پر لوگوں نے اسکو گالیاں لکھیں اور شاعروں نے ہجویں لکھیں۔ متوکل کے مرنے کے بعد اُس کے لڑکے منتصر باللہ نے پھر روضۂ حسینؑ اور دوسری قبور پر علامات و آثار بنائے ۱۸۰۲ء میں وہابیوں نے بھی قبر حسینؑ کے ساتھ یہی بے ادبی کی تھی مگر

چراغے را کہ ایزد برفروزد   ہر آں کو تف زند ریشش بسوزد

اینٹ پتھر کی قبر کو مٹانے سے حسین مظلوم کا نام نہیں مٹ سکتا اس شہید کی قبر ہر مسلمان کے دل میں موجود ہے۔

اُسوقت کبھی سلاطین مصر اور کبھی سلاطین یمن جن کا اثر جس وقت مکہ پر ہوتا تھا وہ غلاف بھیجدیتے تھے۔ چنانچہ حکیم ناصر خسرو جو ۴۴۲ھ میں مصر سے مکہ گیا ہے اُس کے سفرنامے سے ظاہر ہے کہ اوسوقت مصر سے غلاف کعبہ بھیجا جاتا تھا وہ لکھتا ہے "سلطان جامۂ کعبہ می فرستاد بہ قرار معہود کہ ہر سال دو نوبت جامۂ کعبہ می فرستادے و ایں سال چوں جامہ براہ قلزم گسیل کردند من با ایشاں رفتم" اور پھر ایک دوسری جگہ لکھتا ہے "ایں سال نیز حاج رفتند و وظیفۂ سلطان را کہ ہر سال بہ حجاز فرستادے البتہ قصور و احتباس نہ بودے، و آں جامۂ کعبہ و از آں خدم و حاشیۂ امرائے مکہ و مدینہ و صلۂ امیر مکہ و مشاہرہ او ہر ماہ سہ ہزار دینار و اسپ و خلعت بدو وقت فرستادے"۔

ناصر خسرو کے زمانے میں سلطان مصر مستنصر باللہ ابو تمیم بن طاہر تھا جس نے ۴۲۷ھ سے ۴۸۵ھ تک سلطنت کی اور جیسا کہ عبارت مندرجہ بالا سے ظاہر ہے یہ سلطان سال میں دو مرتبہ غلاف کعبہ اور امرائے حجاز کی تنخواہیں وغیرہ بھیجا کرتا تھا اور اُس وقت حجاز سلاطین مصر کے زیر اثر تھا۔ برخلاف اس کے ابو عبداللہ محمد الشریف ادریسی مشہور عالم جغرافیہ جس کی وفات تقریباً ۵۶۰ھ میں ہوئی اپنی کتاب نزہتہ المشتاق میں کہتا ہے کہ اُس کے زمانے میں سیاہ ریشمی کپڑے کا غلاف ڈالا جاتا تھا اور ہر سال خلیفۂ بغداد اُس کی تجدید کیا کرتا تھا۔ ادریسی کا معاصر خلیفۂ بغداد الناصر لدین اللہ تھا جس کا زمانۂ خلافت ۵۷۵ھ سے ۵۹۲ھ تک رہا ہے۔ اور تذکرۃ الاکرام تاریخ خلفائے عرب والاسلام میں لکھا ہے کہ یہ خلیفہ اولاً سبز غلاف بھیجا کرتا تھا۔ پھر سیاہ بھیجنے لگا۔ پس معلوم ہوا کہ چھٹی صدی ہجری کے آخر میں بغداد سے غلاف آتا تھا۔ اور ادریسی نے الناصر لدین اللہ کے سیاہ غلاف بھیجنے کا ذکر کیا ہے۔

ابن جبیر جنھوں نے ۵۷۸ھ میں حج کیا اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں کہ اُس وقت غلاف کعبہ سبز کپڑے کا تھا جس پر سرخ ریشم سے حروف بنے ہوئے تھے

ابن جبیر کے وقت بھی خلیفۂ بغداد ناصرالدین اللہ تھا جو پہلے سبز غلاف بھیجتا تھا اور بعد میں سیاہ بھیجنے لگا تھا۔

فارسی کا مشہور شاعر ملک الشعرا افضل الدین خاقانی جس کی وفات ۵۹۰ھ یا ۵۹۶ھ میں ہوئی ہے اور جس نے پانچ چھ خلفائے بغداد کا زمانہ دیکھا ہے جب وہ مقتفی لامر اللہ کے عہد میں (جو ۵۳۲ھ سے ۵۵۵ھ تک ہے) حج کو گیا تو اس نے کعبہ کا غلاف سرخ دیکھا جیسا کہ وہ اپنی مثنوی تحفۃ العراقین میں کعبے کو مخاطب کر کے کہتا ہے۔

دارندۂ ہاشمی شعاری پس جامۂ سد میاں چہ داری[1]

سلاطین مصر کے زمانہ میں غلاف کعبہ

اس کل بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ چوتھی صدی ہجری کے بعد سے جو خلافت بغداد کے ضعف کا زمانہ ہے غلاف کعبہ کی روانگی میں کوئی پابندی نہ رہی تھی اور حسب بیان مورخین کبھی بغداد سے اور کبھی مصر سے غلاف آتا تھا مگر زیادہ تر مصر سے۔ غرضکہ دو ڈھائی سو برس تک اسی طرح کسوت کعبہ مصر سے آتی رہی۔ یہاں تک کہ ۶۵۶ھ میں جب خلافت بغداد کا خاتمہ ہو گیا اور اس کو بھی کئی سال گزر گئے تو ملک منصور ابوالمعالی قلاؤون صالحی سلطان مصر نے جس کی سلطنت ۶۷۸ھ سے ۶۸۹ھ تک رہی غلاف بھیجنا اپنے ذمے واجب ٹھہرا لیا اور تعلقہ قلیوبیہ ضلع قاہرہ کے دو گاؤں بیسوس اور سندبیس غلاف کی تیاری کے لئے وقف کر دیئے۔ بعض مورخین کہتے ہیں کہ سلطان قلاؤون نے غلاف کعبہ کے لئے سبز کسوت کا رواج دیا تھا جس پر آیات قرآنی۔ کلمہ طیبہ اور صحابۂ کرام کے نام بنے رہتے تھے

---

[1] خلفائے عباسیہ کا بانا سیاہ تھا اور رومیوں کا سرخ۔

[2] برکہارٹ سیاح جو مصر میں برسوں رہا ہے اس موضع کا نام سندبیر لکھتا ہے اور برٹن سیاح حجاز جو مصر کے حالات سے خوب واقف ہے اس کا نام سندبوس بتاتا ہے مگر علامہ قطب الدین مکی نے سندبیس تحریر فرمایا ہے۔

سابقہ سلاطین کے غلاف کے کتبوں کے متعلق مورخین لکھتے ہیں کہ ان پر بڑے بڑے حروف کے کتبوں کے اندر باریک باریک حروف کے کتبے بھی ہوتے تھے۔ اور حاشیہ پر مناسب آیات قرآنی یا صحابۂ رسول اللہ کے نام لکھتے تھے کبھی غلاف بالکل سادہ بھی رکھتے تھے۔

غلاف کعبہ سلاطین عثمانیہ کے زمانہ میں

۹۲۳ھ میں جب ارض مقدس حجاز قلمرو عثمانیہ میں داخل ہوئی تو غلاف کی تیاری رواج قدیم کے مطابق مصر سے جاری رہی مگر سلطان قلاؤن نے جو دو گاؤں اس کے لئے وقف کئے تھے اُن کی آمدنی کافی نہ ہوتی تھی اور ہر سال غلاف روانہ نہ ہو سکتا تھا اس لئے سلطان سلیمان اعظم نے جس کا زمانۂ سلطنت ۹۲۶ھ سے ۹۷۴ھ تک ہے یہ طے کر دیا کہ ہر سال غلاف مصر سے روانہ کیا جایا کرے اور دیہات وقف کی آمدنی اگر کافی نہ ہو تو خزانۂ مصر سے اخراجات پورے کئے جائیں۔

غلاف کے مصارف

زمانۂ قدیم کے غلافوں کی قیمت کا پتہ کچھ نہیں چلتا۔ البتہ صاحب رفیق الحجاج نے ڈیڑھ لاکھ روپیہ تحریر کیا ہے اور صاحب سفر حرمین الشریفین چار لاکھ لکھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ صرف غلاف کی تیاری سفر مصارف ڈیڑھ لاکھ ہوتے ہوں گے۔ اور غلاف کی روانگی اور محمل مصری کے کل اخراجات سفر چار لاکھ ہوں گے جس میں تخمیناً ڈیڑھ لاکھ روپیہ سالانہ تو شریف مکہ ہی کو دیئے جاتے ہیں دوسرے لوگوں کی رقوم اس کے علاوہ ہیں۔ سلطان سلیمان موصوف نے یہ بھی حکم دیا تھا کہ کعبہ پر ہمیشہ سیاہ غلاف ڈالا جائے چنانچہ ۱۲۱۷ھ تک اسکی پابندی رہی اور سیاہ غلاف کعبہ ہمیشہ مصر[1]

---

[1] حیدرآباد کے ایک اول تعلقدار صاحب جنھوں نے ۱۳۱۹ف میں حج کیا تھا اپنے سفرنامے میں اس غلاف کی نسبت لکھتے ہیں کہ غلاف کعبہ ہمیشہ قسطنطنیہ سے آتا ہے اور وہاں کنواری لڑکیاں تیار کرتی ہیں۔ تعلقدار صاحب کو دھوکا ہوا۔ کعبے کا اندرونی غلاف حریر سلطان کی تخت نشینی کے وقت قسطنطنیہ سے تیار کر کے بھیجا جاتا ہے

آثار رہا البتہ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں جبکہ سلطنت عثمانیہ اپنی خانگی اصلاحات اور اور کفار روس کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی تو اسوقت وہابیوں[1] نے حجاز پر قبضہ کر کے ۱۲۱۸ھ میں

[1] وہابی مذہب کا بانی محمد بن عبد الوہاب ۱۶۹۱ھ میں نجد میں پیدا ہوا۔ اس نے مذہبی تعلیم اپنے باپ عبد الوہاب سے حنبلی طریقہ پر پائی اور کتب حدیث اہل سنت کا بغور مطالعہ کیا۔ وہ تعظیم قبور اور اولیاء اللہ سے مدد طلب کرنے کو شرک، قبر پرستی و پیر پرستی سے تعبیر کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سی باتیں مسلمانوں میں اس کو ایسی نظر آتی تھیں جنکو وہ خلاف شرع و بدعت سمجھتا تھا۔ اس نے ان رسوم کا قلع و قمع کرنا چاہا۔ بہت سے لوگ اس کے ہمخیال ہو گئے اور اس کے باپ عبد الوہاب کے نام کی وجہ سے اس کے پیرو وہابی کے نام سے موسوم ہو گئے۔ محمد کے بعد اس کے بیٹے اور پوتے نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس تحریک کے پھیلانے میں کوشاں رہے اور آخر اپنے مذہب کی اشاعت میں انہوں نے تلوار سے کام لیا۔ سلطنت ترک کی کمزوری نے اسوقت ان کے ارادوں کی تکمیل میں اور مدد کی۔ یہاں تک کہ ۲۷ اپریل ۱۸۰۳ء م ۴ محرم ۱۲۱۸ھ کو سعود وہابی نے اپنا جھنڈا کعبے میں جا بلند کیا اور مکے کو لوٹ کر وہاں کے تمام مزاروں کے گنبد ڈھا دیئے۔ اردو کے مشہور شاعر انشا نے جن کے زمانہ کا یہ واقعہ ہے اپنے ایک شعر میں نہایت خوبصورتی سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ؎

دل ستم زدہ بیتابیوں نے لوٹ لیا ۔ ہمارے کعبے کو وہابیوں نے لوٹ لیا۔

سعود کے مقلدوں نے ادھر ۱۸۰۱ء میں قبر امام حسین علیہ السلام پر کربلائے معلی میں کمال بیجائی اور مدینہ منورہ فتح کر کے گنبد خضرا پر بھی اسی قسم کی بے ادبی کی۔ وہابیوں کے پے در پے فتوحات سے تمام عرب میں ان کا ڈنکا بجنے لگا تھا۔ سلطنت ترکی جو اسوقت اپنی اندرونی اصلاحات اور کفار فرنگ کے نرغے میں پھنسی ہوئی تھی اس طرف متوجہ نہ ہو سکی آخر ۱۸۱۰ء میں وہابیوں کے خلاف مہم بھیجنے کی تیاری کی گئی۔ اور ۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا جو باب عالی کی طرف سے اسوقت مصر کا والی تھا ایک فوج لیکر سوئز کی راہ سے مکے کیطرف بڑھا اور جہازوں کا ایک بیڑہ ینبوع پہنچا اور ترکی فوج نے مدینہ منورہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر مختلف لڑائیوں کے بعد ترکوں نے وہابیوں سے مکہ فتح کر لیا۔ سب سے بڑی خوں ریز لڑائی طائف کے نزدیک مقام بسیل پر ہوئی تھی جہاں محمد علی پاشا فتح و موت کی قسم کھا کر بیٹھا تھا اور وہابیوں کو سخت شکست دی تھی اسی جنگ میں وہابی کے ایک ایک سر کے لئے پندرہ پندرہ روپیے انعام مقرر کیا گیا تھا اور شام ہونے سے قبل پانچہزار وہابیوں کے سر پاشا کے سامنے جمع ہو گئے تھے۔ مقتول وہابیوں کے سروں کا ایک مینار مدینہ منورہ میں بھی بنایا گیا ہے

جو قبۃ الرؤس کے نام سے مشہور ہے۔ کئی سال کی متواتر کوششوں کے بعد ۱۸۱۶ء میں عرب کی فتوحات پاشا نے مکمل ص ۴۰

کعبے کو سرخ غلاف پہنایا تھا۔ یہ شہر صا کے اُس کپڑے کا تھا جس کی عربی عبائیں ہوتی ہیں۔

وہابیوں کا مکے پر قبضہ اور ان کا غلاف کعبہ

وہابیوں کے سردار سعد نے ۴ محرم ۱۲۱۸ھ کو کعبے پر قبضہ کر کے سلطان ٹرکی سلیم کو حسب ذیل خط لکھا۔ اور محمل مصری کا داخلہ جسمیں غلاف کعبہ آیا کرتا تھا مکے میں ممنوع قرار دیا اس سے سعد کی بڑی غرض یہ تھی کہ وہابیوں کے مخالفین محمل کی آڑ میں مکے میں داخل نہو نے پائیں۔

"منجانب سعد بخدمت سلیم میں ۴ محرم ۱۲۱۸ھ کو مکے میں داخل ہوا۔ یہاں کے باشندوں کو امان دی۔ میں نے ان تمام چیزوں کو بتوں کی طرح جن کی پرستش کیجاتی تھی برباد کر دیا میں نے سوائے اُن محصولوں کے جو شرعاً جائز ہیں باقی سب محصول معاف کر دیئے۔ میں نے اُس قاضی کو جسے آپنے حسب شرع محمدی مقرر فرمایا ہے اُس کے عہدے پر بحال رہنے دیا ہے۔ میری خواہش ہے کہ آپ دمشق و قاہرہ کے والیوں کو ہدایت کر دیں کہ وہ آیندہ باجوں کے ساتھ مکہ معظمہ کیطرف محمل روانہ نکریں۔ مذہب کو ایسی باتوں سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا خدا کا فضل آپ کے شامل حال رہے"۔

غلاف کعبہ کی مصر سے دوبارہ آمد

اگرچہ وہابیوں کا بالکلیہ استیصال ۱۸۱۶ء میں ہوا مگر ترکوں نے بسرکردگی محمد علی[۱] پاشا والی مصر وہابیوں سے ۱۸۱۳ء میں مکہ معظمہ

---

[۱] موجودہ خاندان خدیویہ مصر کا بانی محمد علی پاشا ۱۷۶۹ء میں قصبہ نوالا واقع رومیلیا علاقہ ٹرکی میں پیدا ہوا تھا ابتدا میں ترکی فوج میں بھرتی ہوا پھر ۱۷۹۹ء میں فرانسیسیوں کے مقابلہ میں اپنے سپاہیوں کا دستہ اکٹھا کر کے مصر میں سلطان ترکی کی طرف سے لڑکر داد شجاعت دی اور پھر بڑھتے بڑھتے مصر کا گورنر ہو گیا۔ یہ بڑا بہادر و مدبر تھا۔ مملوک سلاطین مصر کے پسماندہ امراء و رؤساء جو ہمیشہ ترکی سلطنت کو دق کیا کرتے تھے اور انواع و اقسام کی سازشیں کر کے سلطنت کے الٹ دینے کی فکر میں لگے رہتے تھے اُن کو اس نے دھوکے سے قلعۂ قاہرہ میں بلا کر سب کا قتل عام کر دیا تخمیناً چار سو مملوکوں میں سے صرف ایک شخص امین بے اپنے گھوڑے کو قلعہ کی عظیم الشان

بقیہ حاشیہ بر صفحہ (۲۷)

واپس لے لیا تھا اور محمل مصری جو دس سال تک مکہ معظمہ میں داخل نہ ہو سکا غلاف کعبہ لے کر مصر سے بدستور آنے لگا تھا۔ چنانچہ برکھارٹ سیاح جس نے ۱۸۱۴ء میں سفر حجاز کیا ہے۔ اُس کے سامنے غلاف مصر ہی سے آیا تھا اور اُس زمانے میں طائف کے اطراف میں وہابیوں سے لڑائی بھی ہو رہی تھی۔

زمانہ موجودہ میں مصر وحجاز کا تنازعہ۔ غلاف کعبہ کی واپسی

۱۳۴۱ھ میں ایک نیا جھگڑا پیش آیا وہ یہ کہ سلطان حسین شاہ حجاز نے جس کو علمائے اسلام نصاریٰ کا ساختہ و پرداختہ اور دین فروش وملت فروش سمجھتے ہیں محمل مصری کو جو غلاف کعبہ لے کر مصر سے جدہ پہنچ چکا تھا واپس کر دیا۔ اس کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ زمانۂ قدیم سے یہ دستور چلا آرہا تھا۔ کہ محمل مصری کے ساتھ حاجیوں کا بڑا قافلہ آیا کرتا تھا اور ان کی دوا درمن کے لئے دو طبیب بھی سرکاری طور پر رہا کرتے تھے۔ یہ طبیب وڈاکٹر عموماً وہ لوگ ہوتے تھے جو ادائے فریضۂ حج کے لئے مصر سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) دیواروں پر سے کود کر گولیوں کی بوچھار میں سے نکل کر بھاگنے میں کامیاب ہوا۔ وہابی جنہوں نے ۱۸۰۳ء میں مکہ فتح کر لیا گیا اور چھ سات سال سے تمام حجاز میں کوس لمن الملکی بجا رہے تھے۔ محمد علی پاشا نے ۱۸۱۱ء میں اُن پر چڑھائی کی اور مختلف مقامات پر اُن کو شکست دیکر ۱۸۱۶ء میں عرب کی فتوحات ختم کیں۔ محمد علی پاشا کی زندگی کا سب سے زیادہ اہم واقعہ شام کا حملہ تھا جو ترکوں سے اَن بَن کر کے ۱۸۳۱ء میں اس کے فرزند ابراہیم پاشا نے کیا تھا اور ترکوں کو شکست دیکر شام کا ملک فتح کر لیا تھا اس کے بعد بعض شرائط کی بناء پر سلطان سے صلح کر کے مصر کی حکومت ہمیشہ کے لئے اپنے خاندان کے واسطے مخصوص کرالی۔ چنانچہ موجودہ خدیو مصر بھی اسی خاندان کے ایک رکن ہیں ۱۸۴۸ء میں محمد علی پاشا نے بوجہ ضعف و ناتوانی عزلت اختیار کر کے اپنے لڑکے ابراہیم پاشا کو خدیو مقرر کیا اور ۲ اگسٹ ۱۸۴۹ء کو انتقال کیا۔

روانہ ہوتے تھے اور راستہ بھر دوسرے حاجیوں کا علاج ومعالجہ کرتے چلتے تھے اور
حجاز میں بھی بطیب خاطر اس خدمت کو بخیال ثواب انجام دیتے تھے۔ اس سال اتفاق
سے چار طبیب حج کے ارادہ سے قافلۂ مصری یعنے محمل کے ساتھ روانہ مکۂ معظمہ ہوئے
دیوانہ راہوئے بس است۔ شاہ حجاز نے اس پر اعتراض کیا اور اس کو اپنی خودمختاری
کے منافی خیال کر کے اعلان کر دیا کہ حجاز میں ان لوگوں کو داخلہ کی اجازت نہیں
دی جائے گی۔ حکومت مصر نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ مصری ابنائے وطن کو جو حج کے لئے
ارض مقدس کے عازم ہوں کسی طبی معاونت واحتیاطی تدابیر کے بغیر ایک دور ودراز
اور ایسے غیر منتظم ملک میں جیسا کہ آجکل حجاز ہے بیماریوں کا شکار ہونے کے لئے
چھوڑ دے "تاکہ شاہ حجاز کے مقرر کئے ہوئے ڈاکٹر اُن کے پرپرزے نوچیں اور اطمینان
کے ساتھ اُن کا خون چوسیں" غرضکہ حکومت مصر نے اصرار کیا اور مصر و حجاز کے دوستانہ
ومخلصانہ دیرینہ تعلقات والیٔ حجاز کو یاد دلائے مگر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا آخر علمائے
مصر نے شاہ حجاز کے متعلق موزوں ومناسب الفاظ میں جس کا وہ مستحق تھا فتویٰ صادر
کیا اور محمل مصری معہ غلاف کعبہ کے واپس طلب کر لیا گیا۔ حجاج مصر جو بڑے اشتیاق
وتمنا کے ساتھ گھر سے نکلے تھے ع ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم۔ کہتے ہوئے مصر
واپس ہوگئے۔ محمل شریف کی سالانہ روانگی" و واپسی مصر میں ایک عظیم الشان تقریب کی
نوعیت رکھتی ہے۔ اور اہل مصر اس کو کمال عزت واحترام کے ساتھ رخصت کرتے ہیں
اور واپسی کے وقت بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس کی زیارت کے لئے جاتے ہیں
جیسا کہ آئندہ اوراق میں ان جلوسوں کے تفصیلی حالات سے واضح ہوگا۔ اس موقعہ پر
جب مصری حجاج بغیر حج کے واپس ہوئے ہوں گے اور غلاف کعبہ واپس لایا گیا ہوگا
تو اہل مصر کو جو کچھ صدمہ پہنچا ہوگا اُس کا اندازہ مشکل ہے۔

اگرچہ شاہ حجاز نے تکمیل رسم کے لئے کسی ولایتی کارخانہ سے غلاف تیار کروا کے

کعبے پر ڈالا مگر حاجیوں کو اُس کے چومنے چھونے اور آنکھوں سے لگانے میں تامل رہا اور یہ بات سخت ناگوار گزری۔ کہ جو غلاف بڑے اہتمام کے ساتھ کامل ادب و تعظیم و طہارت محفوظ رکھ کر کسی مسلمان بھیوں کے ہاتھ سے تیار کرایا گیا تھا وہ واپس کر دیا گیا۔ اور اُس کی جگہ کافروں کے ہاتھ کا بنا ہوا کپڑا ڈال کر کعبے کو نجس کیا گیا۔

شاہ حجاز کی اس حرکت سے جسے مسلمان کسی عیسائی سلطنت کی ترغیب و تحریص کا نتیجہ قرار دیتے ہیں نہ صرف اہل مصر کو بلکہ تمام عالم اسلام کو سخت رنج پہنچا حکومت مصر نے شاہ مذکور کی سالانہ تنخواہ تخمیناً ڈیڑھ لاکھ روپے جو خزانہ مصر سے اُس کو ملتی تھی موقوف کردی۔ مصر و حجاز کے دوستانہ تعلقات جو سینکڑوں برس سے قایم تھے وہ منقطع ہو گئے اور افسوس صد افسوس کہ قاہرہ جو باب المکہ کہلاتا ہے وہاں کے حاجیوں کے لئے مکے میں داخل ہونے کے دروازے بند کر دیے گئے۔

یا اللہ! مسلمانوں کو حمیت دینی عنایت فرما اور اُن کے الجھے ہوئے کام کو سلجھا دے۔

بود آیا کہ رہ صدق و صفا بکشاید — گرہ از کار فروبستۂ ما بکشاید
اگر از بہر سیاست رہ حج را بستند — دل قوی دار کہ از بہر خدا بکشاید

(باقی آیندہ)

گلشن نہ ہمصفیر نہ وہ آشیاں رہا — ہم یوں مٹے کہ کچھ بھی نہ باقی نشاں رہا
خود کام دوستوں کی لگاوٹ میں لگ تھی — میں سادہ دل تھا غافل سود و زیاں رہا
کشتی رہی ہے سیل حوادث کے دوش پہ — چرخ ستم شعار مرا بادباں رہا
غیروں پہ کر کے آہ نثار اپنی زندگی — امیدوار زندگی جاوداں رہا

(بیاض شیفتہ)

باتیں کرتے کرتے آنکھیں بند کیں چپ ہو گئے — لوریوں سے موت کی نیند آگئی تھی سو گئے

بیاض اشہر۔ دولھا صاحب عروج

غزل

از جناب مولوی مرزا کاظم حسین صاحب محشر لکھنوی۔

جذب روحانی یہ کیسا خنجر قاتل میں تھا
آگیا کھچ کر رگ جان تک لہو جو دل میں تھا

کیوں نہ صدقے جاؤں چشم امتیاز حسن پر
میرے بدلے شب کو پروانہ کسی محفل میں تھا

مر گئے دونوں مگر کوئی نہ آگے بڑھ سکا
جس جگہ میں تھا مرا دل بھی اسی منزل میں تھا

خوف ناکامی سے پیش دوست چپ سی لگ گئی
کیا کہوں کچھ کہہ نہیں سکتا ہوں کیا کیا دل میں تھا

خون بنکر خنجر قاتل پہ صدقے ہوگیا
روح کا جتنا کہ سرمایہ تن بسمل میں تھا

دیکھ لی قدرت تری اے جذبۂ وصل حبیب
آ نہ سکتا تھا فرشتہ بھی یہیں جس منزل میں تھا

بے کہے تیری ادا پہ خود بخود صدقے ہوگیا
بس یہی تھا کہ کچھ اس کے سوا بھی دل میں تھا

عاشق وارفتگی وہ تھا میں شیدائے فنا
فرق کوسوں کا مری اور قیس کی منزل میں تھا

شوق باطن لے رہا تھا کیا ہی روحانی مزے
محشر اپنا جبکہ مسکن کوچۂ قاتل میں تھا

غزل

ضامن کنتوری

دل یہ مستی میں بھی اتنا تامل پیشہ ہے
راوق معنی گداز جوہر اندیشہ ہے

جلوۂ اعراض عکس شوخیٔ اندیشہ ہے
ورنہ گلزار تحیر بے رگ و بے ریشہ ہے

سنگ راہ حریت ہے کام جوئی کی ہوس
پائے ہمت کے لئے عرض تمنا تیشہ ہے

دور ہیں تیرے غضب ہے اے سپہر حیلہ گر
گھر ہو رہا ہوں کا وہ جو ضیغموں کا بیشہ ہے

امتحاں گاہ وفا سے ہٹ نہیں سکتے قدم
جان جائے۔ جان جائے اگر اندیشہ ہے

کامیابی کا ثمر دے کیوں نہ شاخ اعتبار
ریشۂ حسن عمل اس نخل کا ہر ریشہ ہے

ضامن اک آزاد رو ہے قاضی و مفتی نہیں
مشرب و ملت سے رندی عشقبازی پیشہ ہے

باغ فرح بخش

از جناب مولوی ظفریاب خاں صاحب سابق اڈیٹر رسالہ ادیب حیدرآباد

کچھہ دنوں اُسطرف میرا قیام چند گھنٹوں کے لئے احمد نگر[1] میں ہوا۔ تانگہ والے کی رہنمائی سے چھاونی کے ایک مسافر بنگلہ میں ٹھہرنا پڑا۔ تھوڑی دیر سستانے کے بعد شاہان نظام شاہیہ کے اس تاریخی اور شہرۂ آفاق پایہ تخت کو دیکھنے کا شوق گدگدایا۔ چونکہ وقت بالکل تنگ اور فرصت قلیل تھی اور مجھے تین چار گھنٹوں کے بعد منزل مقصود کی طرف روانہ ہونا ضروری تھا۔ اسلئے میں نے تانگہ کی امداد سے تمام شہر کو سرسری طور پر دیکھا جس کا بڑا حصہ اصلی حالت پر نہیں رہا ہے اور اب ایک فوجی کیمپ بنا ہوا ہے۔ باقیات الصالحات میں اب کوئی ایسی عمارت شہر میں باقی نہیں جو جاذب نظر ہو۔ سرسری دریافت سے معلوم ہوا کہ شاہان نظام شاہیہ کی یادگار رہے دو مشہور عمارتیں "چاند بی بی کا محل" اور "باغ فرح بخش" قابل دید ہیں جو زبان حال سے اپنے بانیوں کی اولوالعزمی اور شان و شکوہ کی داستان سنا رہی ہیں۔ اول الذکر عمارت مسافت بعیدہ

---

[1] شہر احمد نگر کا بانی جس پر شاہان نظام شاہیہ کی حکومت تقریباً (۱۳۰) سال تک رہی احمد نظام شاہ بحری بانی دولت نظام شاہی ہے۔ یہہ شہر رود سینا کے کنارے واقع ہے اس کا اصلی نام قصبہ نیکار ہے اسکی تعمیر سیاسی مصالح کی غرض سے عمل میں آئی تھی۔ ابتداءً احمد نظام شاہ بحری کا پایہ تخت شہر جنیر تھا۔ احمد نظام شاہ نے تسخیر دولت آباد کی غرض سے اسپر حملہ کیا اور عرصہ دراز تک محاصرہ کئے پڑا رہا اور بالآخر محاصرہ سے تنگ آکر دارالسلطنت کیطرف مراجعت کی تو قصبہ نیکار کو جو دولت آباد سے قریب تھا اسلئے منتخب کیا کہ وہاں دارالسلطنت قائم کرکے ہر سال فصل ربیع و خریف کے موقع پر تاخت و تاراج کے لئے فوج روانہ کرکے محافظان قلعہ کو قوت لایموت سے اسقدر محتاج اور تنگ کرے کہ وہ مجبوراً قلعہ حوالہ کردیں۔ چنانچہ دو تین سال میں یہہ آباد اور پُر رونق شہر ہوگیا اور انتزاع سلطنت تک شاہان نظام شاہیہ کا دارالحکومت رہا۔ ۱۲

پڑھی اور "باغ فرح بخش" کی تعریف میں نے بعض کتب تواریخ میں دیکھی بھی جو امتداد زمانہ کے باعث عوام میں اب "فرح باغ" کے نام سے موسوم ہے۔ اسلئے تنگی وقت کا لحاظ کر کے میں صرف آخر الذکر عمارت کو دیکھہ لینا ہی غنیمت سمجھا جو شہر سے دو ڈہائی میل کے فاصلہ پر جنوب مغربی گوشہ میں واقع ہے روانہ ہونے کے پندرہ بیس منٹ بعد جب یہہ معلوم ہوا کہ منزل مقصود قریب ہے تو میری مشتاق آنکھیں اُس باغ کو ہر طرف تلاش کرنے لگیں جسکو ایک مشہور ایرانی شاعر ملا ملک قمی ملک الشعراء نے "بہشت بریں" سے مخاطب کر کے اسکی تعریف میں ایک پر زور قصیدہ لکہا تھا جو صفحات تاریخ پر محفوظ ہے۔ جب آنکھیں ناکام رہیں تو میں نے تانگہ ہانکنے والے رہنما سے پوچھا کہ باغ کہاں ہے اور دکھائی کیوں نہیں دیتا؟ اُس نے مقابل کی سر بفلک کشیدہ عمارت کیطرف جو خود رو درختوں میں گھری ہوئی تھی اشارہ کر کے کہا کہ یہی "فرح باغ" ہے مجھے اس نشاندہی سے مایوسی ہوی اور جو خوشنما سماں عالم خیال میں اس باغ کا بندھا تہا وہ یکایک غائب ہو گیا اور بے تحاشہ میری زبان سے نکلا "ہمیشہ رہے نام اللہ کا"

قریب جا کر دیکھنے سے معلوم ہوا کہ سنسان میدان میں ایک دیوہیکل اور وسیع بلند محل یکہ و تنہا کھڑا ہوا اونچا اور اہل دنیا کے لئے سامان عبرت و بصیرت فراہم کر رہا اور زبان حال سے گویا ہے۔

"دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو"

محل وقوع اور آثار سے پایا جاتا ہے کہ اپنے زمانۂ عروج میں "باغ فرح بخش" اسم بامسمیٰ ہوگا اب نہ باغ ہے اور نہ اوسکے آثار۔ قدیم داستان سنانے اور اپنے اولوالعزم بانیوں کی عظمت و شان یاد دلانے کے لئے یہی ایک شاندار محل باقی رہگیا ہے جسپر کس مپرسی کے باعث آثار کہنگی و شکستگی عیاں ہیں اور اُس کے گرداگرد ایک مدور حوض ہے جو بالکل خشک تھا اسکی اندرونی سطح گچ سے بنی ہوی ہے جس کے بڑے حصہ پر مٹی کی سطح قائم ہوگئی ہے اور ببول کے درخت اُگ آئے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس حوض سے جو خاصہ وسیع اور عمیق بھی ہے کشتیوں کے ذریعہ لطف تفریح حاصل کیا جاتا ہوگا۔ محل کی عمارت ہشت پہل اور دو منزلہ ہے

جسمیں پتھر اور گچ سے کام لیا گیا ہے۔ گو اسکی تعمیر میں اعلیٰ صناعی صرف نہیں کیگئی ہے اور بالکل سیدھی سادی عمارت ہے لیکن اسقدر پختہ ہے کہ ساڑھے تین سو سال گزرنے پر بھی زمانہ بے درد ہاتھ اسکو قابل لحاظ نقصان نہ پہنچا سکے حالانکہ سالہاسال سے یہہ اپنے حال پر چھوڑ دیا گیا ہے اسمیں تلے اوپر متعدد کمرے اور سیر گاہیں ہیں اور درمیانی حصہ میں ایک وسیع ہال ہے۔ بالائی سیر گاہوں سے شہر کا اندازہ بہ آسانی ہوتا ہے اور اطراف کے سبزہ زار سے دور دور تک آنکھیں ٹھنڈی کی جا سکتی ہیں۔ عمارت اسقدر بلند ہے کہ نیچے سے بالائی حصہ پر نگاہ ڈالتے وقت دستار سنبھالنی پڑتی ہے۔ یہہ عمارت متعدد تاریخی روایات کی حامل ہے۔ اسکی ابتدائی تعمیر مرتضیٰ نظام شاہ کے حکم اور نعمت خان سمنانی کے اہتمام سے ۹۷۱ھ میں اتمام کو پہنچی۔ جب بادشاہ نے اسکا ملاحظہ فرمایا اور ناپسند ٹھہری تو شاہ احمد مرتضیٰ خاں نے نعمت خان سمنانی کے لئے اس باغ و عمارت کی طیاری کے صلہ میں ایک عجیب رباعی میں جو فن تاریخگوئی کا عمدہ نمونہ ہے بادشاہ کو مخاطب کرکے ذیل کا انعام تجویز کرنے کی رائے دی ہے:۔

ارباب نشاط را خبر کن شاہا	بر "باغ فرح بخش" گزر کن شاہا
نعمت خان را ز بہر تاریخ بنا	از "باغ فرح بخش" بدر کن شاہا

الغرض بادشاہ نے پہلی عمارت کے مسمار کرنیکا حکم دیا اور اسی جگہ موجودہ عمارت کی بنیاد پڑی جسکی تکمیل ۹۹۱ھ میں ہوئی تکمیل باغ و عمارت کی خوشی میں شاندار جشن مسرت ترتیب دیا گیا جسمیں اعیان دولت اور علماء و شعرائے سلطنت مدعو کئے گئے۔ اس مسرت اندوز تقریب کے موقع پر ملا ملک قمی ملک الشعراء نے ذیل کا پر زور اور فصیح و بلیغ قصیدہ باغ و عمارت کی تعریف میں لکھکر پیش کیا:۔

"اے تو بہشت برین این چہ نکوہست نشان	بیش نگہت نفسش بار نگہت نفس شان
بزم ترا ہشت خلد شقہ از پیش گاہ	بام ترا نہ فلک پایۂ از نرد بان

سے بعض حضرات "نعمت خان" کے نام کی مناسبت سے دھوکا کہاتے ہیں "نعمت خان سمنانی" کو نعمت خان عالی سمجھتے ہیں اور اس اعتبار سے "باغ فرح بخش" کا بانی شہنشاہ اورنگ زیب کو قرار دیتے ہیں جو صحیح نہیں ہے اس خیال کی صحت اعداد تاریخ سے ہو سکتی ہے۔ ۱۲

گوش تحکم بزن ہیں کہ درختان سرد — صف زدہ از چار سوئے بر صفت چاکراں

ہم یم فیض ازل با گہرت ہم نشیں — ہم گل روئے صفا با اثرت توأماں

سقف تو بر باد و ادر فعت خرگاہ چرخ — کاخ تو بر خاک ریخت آب رخ کہکشاں

سنبل بستاں تو صید طرب را کمند — خار گلستاں تو چشم حسد را سناں

چرخ زگردوہت دوختہ بر تن حریر — مشتری از فتنہ ات ماندہ سر طیلساں

یافتہ دست قضا از گل سقفت سریر — ساختہ ترک قدر زابروئے طاقت کماں

از گہر فیض تو ابر بدست صبا — تحفہ فرستد بہ بحر ہدیہ فرستد بہ کاں

لطف تو گر در خیال بگذر و اندیشہ را — چہرۂ مافی الضمیر دیدہ بہ بیند عیاں

گر کند ابرو بلند شاہد تصویر تو — خامۂ بہزاد را تاب دہد ریسماں

غنچۂ تصویرت ار بشگفد از ابر کلک — عقد کند خندہ ات در گلوئے زعفراں

بسکہ زمیں نقش بست وصف ترا در ضمیر — مید مد از جیب خاک سبزہ بشکل زباں

گر بعناصر دہد لطف تو سرمایۂ — خاک دہد مردہ را زندگی جاوداں

فیض ہوایت اگر مایہ دہد باد را — نقل جبلی برد از تن کوہ گراں

سدۂ تو کعبہ وار مامن فتح و ظفر — طاق تو محراب وار قبلۂ پیشانیاں

خاک سبک روحت ار سرمہ دہد باد را
بر نظر خاکیاں آب شود استخواں

میں دیر تک اور ہر طرف شاہان نظام شاہیہ کی اس اجڑی ہوئی مگر پُر شوکت و شان یادگار کو نہایت عبرت و حسرت کی نگاہوں سے دیکھتا رہا اور بالآخر بادل پُر درد و آہ سرد رخصت ہوا۔

ہنسی

از جناب مولوی عظمت اللہ خاں صاحب بی۔ اے

ہنسی بھی بسورنے کی طرح ایک متعدی سی کیفیت ہے لیکن یہ بات ضرور ہے کہ ہر مزاج میں ہنسی کی بجلی قبول کرنے کی صلاحیت یکساں نہیں ہوتی۔ بعض طبیعتیں تو ہنسی سے اس درجہ لبریز ہوتی ہیں کہ اُن کے لئے ذرا سی چھیڑ پھوٹ پڑنے کو کافی ہوتی ہے آپ سامنے کھڑے ہو کر جھوٹ موٹ ہنستے جائیے اور وہ ہیں کہ لوٹے جاتے ہیں پیٹ میں بل پڑے جاتے ہیں اور پیٹ پکڑے جاتے ہیں۔ چند مزاج ایسے بھی ہوتے ہیں کہ ٹھوس ہنسی ناقبول، تیوری پر بل، روکھے۔ اگر موچھوں والے ہوں تو مزاجدار اور اگر چوٹی والے ہوں تو ناک چوٹی میں گرفتار۔ کہ وہ فطرتاً ہنسی سے مامون اور مصئون ہوتے ہیں اگر ہنسی محفل میں چلے آئیں تو محض ان کی تیوری کے بل سے ہنسی کا دم گھٹ جائے۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان جلدی یا دیر سے ہنسی کی بجلی سے چمک اُٹھنے والے مزاجوں کے مدارج جھلملانے ستاروں کی طرح اَن گنت ہیں، اور بڑے بڑے ماہرین ریاضیات کے لئے بھی جو ہر چیز کے پیچھے گنتی اور ناپ تول کا لٹھ لئے پھرتے ہیں انکا شمار کرنا ہنسی دلگی نہیں۔ خیر ہنسوڑ یا نا ہنسوڑ مزاجوں کا حساب کتاب اس مضمون میں منظور نہیں۔ یہ مضمون ہنسی پر ہے اور مدعا یہ ہے کہ نفسیاتی تشریح کا نشتر تیز کر کے اس ذہنی گدگداہٹ کو جسے ہنسی کہتے ہیں۔ چیر پھاڑ کر چشم باطن کے سامنے لایا جائے یہ عمل جراحی صرف اسی حد تک نہ رہے بلکہ اگر ممکن ہو تو اس گدگداہٹ کے اُن تاروں کو بھی اس نشتر کی نوک سے ابھار کر نکالا جائے جن کے چہرے سے تبسم کی خاموش جھلک ہونٹوں پر کھیل جاتی ہے۔ یا قہقہہ کا گرجتا شعلہ چہرہ پر کوندجاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ہنسی کیا ہے یعنے اگر کوئی ہنستا ہے تو کیوں ہنستا ہے؟ ایک نئی روشنی کے نوجوان شام کے وقت سائیکل پر سوار ٹنس کا بلّا سنبھالے جا رہے تھے۔ برسات کا موسم تھا، ابر اسی وقت دھواں دھار برس کر کھلا تھا۔ سڑک پر کیچڑ تھی گاڑھی گاڑھی چکنی چکنی سائیکل کا پہیا پھسلا اور بیچارے ٹنس کے کھلاڑی اٹھکر جیسا گرنے والے آدمیوں کا فطری خاصہ ہے فلالین کی پتلون جھاڑنے لگے۔ چند بازاری لڑکے کیچڑ میں کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بیساختہ فرمائشی قہقہہ لگایا۔ اور لوگ بھی ہنس پڑے جو بہت زیادہ متعلیق تھے وہ صرف مسکرانے لگے۔ نوجوان نے سپاہیانہ تبسم کے ساتھ آنکھیں نیچے کئے اپنے پاس جو لڑکا کھڑا تھا اسکو چانٹا لگایا اور فرمانے لگے "ابے ابے ہنسی کی کیا بات ہے"۔ لونڈا اتنا چلتا ہوا بولا "واہ خواہ مخواہ لے کے چانٹا مار دیا جیسے اپنا ہی سر تھا۔ کسی کو ہنسی آئے تو نہ ہنسے بھلا آپ کیوں گر پڑے"۔

تو اس میں شک نہیں کہ ہنسنے کے لئے یہ جاننے کی ضرورت نہیں کہ ہنسی کیوں آتی ہے؟ ہم ہنستے ہیں اس لئے کہ ہنسی آتی ہے ہم کھانا کھاتے ہیں اس لئے کہ کھانے کو جی چاہتا ہے۔ مگر مزیدار بات تو یہ ہے کہ ایسے جواب سے انسان کی تشفی نہیں ہوتی۔ انسان پہ جاننے کی مصیبت ایسی پڑی ہے کہ اس کے لئے یہ کافی نہیں کہ ہنسی آئے تو ہنس لے اور بھوک لگے تو کھالے۔ نہیں۔ اسے یہ فکر دامنگیر ہو جاتی ہے کہ ہر بات کی تہ کو پہنچے ہر چیز کی لم کو جانے۔ خواہ کسی بات کی تہ ہو یا نہ ہو لم کو وہ پہنچ سکے۔ یا نہ پہنچ سکے لطیفہ تو یہ ہے کہ اس جاننے کے روگ اس لم کو پہنچنے کی بیماری کو ہی انسان دانشمندی سمجھتا ہے۔ ذی علم، صاحب دماغ، اور بڑے لوگ وہی سمجھے جاتے ہیں جو اس مرض میں اوروں سے زیادہ مبتلا، اس بِپتا میں دن رات گرفتار رہتے ہیں۔ اسی فطری رجحان کا نتیجہ ہے کہ بڑے بڑے دماغ بڑی بڑی کتابیں لکھتے ہیں اور ہر چیز کی بال کی کھال نکالتے ہیں تعلیم کی انتہا اب تحقیق (ریسرچ) قرار دی گئی ہے۔ لوگ زمین کا گز بنجاتے ہیں

قطبین کے برف پوش میدانوں میں دوڑتے پھرتے ہیں۔ ہوا پر اڑتے ہیں۔ زمین میں اترتے ہیں قدیم مقبروں میں گھس جاتے ہیں اور گڑے مردے اکھیڑتے ہیں جب لوگ اس فطری آنکس کے ٹہو کے سے بے چین اس دنیا کے بے گنتی پہلوؤں میں سے ہر پہلو کی تہہ تک پہنچنے کی کامیاب یا ناکام کوششوں میں سرگرداں ہیں تو بیچاری ہنسی نے ایسا کوئی گناہ نہیں کیا کہ اس کی لِم نہ دریافت کی جائے۔ چنانچہ اس صدی میں یوں تو اور بہت سے آدمیوں نے اس موضوع پر خیال آرائی کی ہوگی۔ لیکن دو آدمی خصوصیت کے ساتھ ایسے ہیں جنھوں نے ہنسی پر فلسفیانہ روشنی ڈالی ہے جارج مرڈوتھ نے اپنی کتاب میں حسب عادت نہایت گہری نظر اور نہایت ادق طرز بیان سے کام لیا ہے۔ اس کی اس کتاب کا پڑھنا ایک طرح سے لوہے کے چنے چبانا ہے دوسرا شخص ہنری برگسون ہے۔ اس نے اپنی کتاب "ہنسی" میں اپنے مشہور نظریہ ارتقائے تخلیقی کے نقطۂ نظر سے اور اپنے دلچسپ رنگ میں ہنسی کی لِم سمجھانے کی کوشش کی ہے۔

اس مضمون میں ان دونوں مصنفوں کے نظریوں کو بیان کرنا مقصود نہیں ایک طرف تو مرڈوتھ کے معموں کو بوجھنا آسان نہیں دوسری طرف برگسوں کے مطالب واضح نہیں ہو سکتے۔ جب تک ارتقائے تخلیقی کے مفہوم کو پانی نہ کر دیا جائے اور یہ کام بچوں کا کھیل اور مذاق نہیں۔ ان دونوں کا ذکر اس لئے یہاں کر دیا گیا ہے کہ برگسوں کی کتاب کے نام سے اس مضمون کی سرخی لی گئی ہے اور اس کا اقرار کر لینا ادبی ایمانداری کی نشانی ہے۔ دوسرے یہ کہ ہنسی کے متعلق مزید تحقیقات کا شوق اگر کسی صاحب کو پیدا ہو تو ان دونوں زبردست مصنفوں کا مطالعہ بہت بڑی مدد دیگا۔

قوت استدلال یعنے عقل کے بغیر کسی چیز کا سمجھنا یا یوں کہیے سمجھ میں آنا علمی طور پر ممکن نہیں کسی چیز کو سمجھنے کے لئے عقل کا وطیرہ یہ ہے کہ اس چیز کا تجزیہ کیا جائے

یعنے اس چیز کے مفہوم کا ذہنی طور پر جوڑ الگ دیا جائے۔ یہ عمل جب نفس کی کیفیتوں پر کیا جاتا ہے تو یہ لطیف بات پیدا ہوتی ہے کہ وہ نفسی کیفیت جس کا تجزیہ ہم کرنا چاہتے ہیں اور پیچیدہ سی ہوجاتی ہے اور آنکھوں ہی آنکھوں میں اس طرح روپ بدل لیتی ہے جس طرح ہتیلی پر برف کی ڈلی دیکھتے ہی دیکھتے گھل گھلا کر پانی ہوجاتی ہے۔ اس وقت جی کھسیانا سا ہوتا ہے۔ غصہ آتا ہے اور ساتھ ہی ہنسی بھی آتی ہے کہ نفس کا بھی عجب گورکھ دھندا ہے کہ نہ جانو تو مشکل اور جو جاننا چاہو تو مشکل۔

عموماً انسان کے تلووں، پسلیوں، بغل یا گردن میں گدگدیاں ہوتی ہیں ننھے بچوں کو گدگدیاں کر کے کھلکھلا دیتے ہیں۔ آپس میں دوست احباب بے تکلفی میں ٹہوکا دیکر ہنسا دیتے ہیں صنف نازک کی اداؤں اور نقرئی ہنسی کے قدرداں ہی خوب جانتے ہیں کہ گدگدی کیسی دلفریب ہنسی اور کن کن دلکش اداؤں کی کنجی ہے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ بعض انسان گدگدی کے ساتھ ہی گالی دے بیٹھتے ہیں راقم کے تجربے میں صنف نازک کی ایک دو مثالیں ایسی ہیں کہ اگر خواہ مخواہ گالی گلوج سننے کو جی چاہے تو انگلی کا ذرا سا ہوکا کافی ہے نہیں کہ وہ ناراض ہو کر بگڑ کر گالیاں دیں لطف تو یہ ہے کہ بے ساختہ گالی منہ سے نکل جاتی ہے اور پھر ہنسی کی ہنسی بھی ہے۔ غرض انسان کی نفسی کیفیتیں جہاں تک عقلاً سمجھنے سے تعلق ہے لائق اعتبار نہیں۔ انسان کے نہ ہنسنے میں بھدر کے رونے نہیں؛ انسان ایسے موقعوں پر ہنس دیتا ہے جہاں ہنسنا نہ چاہیے ایسی جگہ رو پڑتا ہے جہاں رونا نامناسب ہو۔ یہی حال غصہ کا ہے مثل مشہور ہی ہنسی میں کھنسی ہوجاتی ہے اور اچھے خاصے بھلے مانس بعض اوقات ہنسی ہنسی میں بگڑ بیٹھتے اور لڑ پڑتے ہیں۔ بعض لوگ ابھی تو غصہ میں لال پیلے ہو رہے تھے کہ ابھی ہنس پڑے بچے عموماً اور جوانی کی راتوں مرادوں کے دنوں میں قدم رکھنے والیاں بعض موقعوں پر سونی صورت لمبے لمبے آنسوؤں کے تار کے ساتھ خاص لطیف پیرایہ میں اس طرح ہنس پڑتی ہیں گویا گھٹا چھائی ہوئی ہے مینہ برس رہا ہے اور اس سے بجلی کوند کوند جاتی ہے

ہنسی کیوں آتی ہے اس کا ذکر آگے آئے گا۔ ہنسی کے وجود میں آنے کی نفسیاتی وجہ
خواہ کچھ ہی ہو، ہنسی اگر پیدا ہو سکتی ہے تو وہیں جہاں سماج (سوسائٹی) کی بنیاد پڑ چکی ہو
دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ بغیر سماج کے ہنسی کا وجود بے سود اور بے معنی سا
ہوتا۔ ایک ایسے جنگل میں جہاں سنیاسی اور تارک دنیا بکھرے ہوئے ہوں وہاں کسی
کی آنکھ مسکراتا چہرہ نہیں دیکھ سکتی، نہ رات کا کان ہنسی کی آواز سن سکتا ہے اگر کسی
بن باسی کو ہنسی بھی آئے تو اسی صورت میں کہ اس کا تخیل کوئی سماج کی سی کیفیت یا
حافظہ کا خزانہ اس کے ان دنوں کا کوئی سماجی واقعہ اور تجربہ پیش کر دے جبکہ وہ انسانی
بستی میں بسر کرتا تھا۔ بہرحال جہاں تک سوچئے نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ جس طرح دو ہستیوں
کے بغیر سماج کا وجود ممکن نہیں اسی طرح ہنسی کے لئے بھی دو کا ہونا لازمی ہے۔ اکیلا
نہ روتا بھلا نہ ہنستا بھلا، اسی صداقت کی طرف اشارہ ہے۔

اچھا اب ذرا سماج کی ارتقا پہ نظر ڈالئے ارتقا کا انجن چلانے والی بھاپ سماج
کے لئے بھی بقائے ذات کی خواہش ہے۔ اور اپنی بقا کے لئے سماج نے جو سب سے زبردست
ہتھیار بنایا ہے وہ سماج کی اندرونی تنظیم ہے جیسے سیاسی اصطلاح میں دولت ( )
کہتے ہیں۔ اس دولت کا بڑا فرض یہ ہے کہ سماج یعنے خود اپنی بقا کے لئے جو ضروری
امور ہیں ان کو دستور اور قانون کی صورت میں لائے اور حکومت اور سررشتہ جات کے
ذریعے اُن پر عمل پیرا ہو۔ لیکن زندگی کے پہلو اس قدر بے شمار ہیں کہ ان کا قانون کی
صورت میں احاطہ کرنا ایسی سماج کے لئے جو ترقی پذیر ہو ناممکن ہے اس لئے سماج نے دستور اور
قانون کا چھاپہ انہیں امور پہ مارا جو سماج کی زیست کے لئے ایسے ضروری ہیں کہ بے انکے
سماج کی تنظیم باقی نہیں رہ سکتی اب رہے وہ امور اور حرکات و سکنات جو اس قدر اہم نہیں
ہیں کہ قانون کی صورت میں ان کو جکڑ بند کیا جائے ان کے متعلق سماج نے عجیب و
لطیف ہتھیار تیار کیا اور وہ ہتھیار ہنسی ہے۔ ایسی انفرادی یا مجموعی حرکات و سکنات کے لئے

سماج کے لئے کوئی سزا مقرر نہیں کی بجز اس کے کہ ایسی حرکتوں پر ہنسی کا چابک برسایا جائے
ایک مثال سے مفہوم ذہن نشین ہو جائے گا۔

ایک شخص کو شطرنج کا مرض ہو گیا ہے اور وہ بساط شطرنج کے بچھنے کے بعد اس قدر اپنے آپ سے بے خبر ہو جاتا ہے کہ اسے کسی بات کا ہوش نہیں رہتا اس کی محویت کا یہ عالم ہو جاتا ہے کہ بجائے صراحی کے اگالدان گلاس میں انڈیلنے لگتا ہے۔ ایسی محویت اور حرکات پر لوگ ہنستے ہیں اور سماج ایسے شخص کے لئے ابتداً ہنسی کے کوڑے کو کافی سمجھتی ہے اب فرض کیجئے یہ انہماک اس شخص میں راسخ ہو جاتا ہے اور وہ ہر خیال میں اسی طرح عادتاً ڈوبنے لگتا ہے اور عالم استغراق میں بیٹھا ہوا ڈاڑھی اور مونچھ کے بال نوچ نوچ کے دانتوں سے کترا کرتا ہے۔ اب بھی سماج اس شخص کے لئے ہنسی کی پھٹکار کافی سمجھے گی۔ اب اتنا اور فرض کیجئے کہ اس شخص کی بے خبری اتنی اور ارتقا پاتی ہے کہ راہ چلتے چلتے کسی شخص کے مکان کو محویت میں اپنا تصور کر لیتا ہے اور دھڑادھڑ گھس جاتا ہے۔ اب سماج نری ہنسی پر نہیں ٹالے گی۔ بلکہ قانونی سزا کی جانب مائل ہونے لگے گی۔ اور اگر خدانخواستہ یہ بے خودی اس نوبت کو پہنچ جائے کہ نہ صرف اوروں کے مکان میں صاحب خانہ بے تکلف مداخلت بیجا کے مرتکب ہوں بلکہ اوروں کی بہو بیٹی کو اپنی بیوی تصور کرنے لگیں تو ظاہر ہے کہ پھر ان کی سزا پاگل خانے کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

الغرض ہنسی ایک سماجی سزا ہے اور اس کی ابتدا غصہ ہے سماج کو جب کسی حرکت پر کم غصہ آتا ہے یعنے بالفاظ دیگر سماج جب کسی حرکت کو نامناسب سمجھتی ہے لیکن قانونی سزا کا مستوجب نہیں گردانتی تو ایسی صورت میں ہنسی پر ٹال دیتی ہے۔

ہنسی کی ہلکی والا کوڑا معمولی سزا نہیں ہے یوں کہنے کو تو ہنسی ہے لیکن اس چابک سے سماج کے بڑے بڑے صاحب اثر افراد بھی تھرا اٹھتے ہیں جس سماج میں عضو بندی اور یکجہتی زیادہ ہو جاتی ہے۔ وہاں بہت سی

حرکتیں محض اس کوڑے کے ڈر سے رُک جاتی ہیں۔ اسی لئے مرڈیتھ نے اپنی نظم "ظرافت کی دیوی" میں ظرافت کو یوں خطاب کیا ہے۔ "اے فہم عامہ کی تلوار"۔

اس تمام استدلال سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہنسی کی ابتدا در اصل غصہ ہے۔ کیونکہ ہنسی کا وجود سماج سے باہر خواب میں بھی ممکن نہیں اور سماج کے دائرے میں ہنسی ایک تعذیری آلہ ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ غصہ ایک خاص اُبلنے کے نقطہ تک رہے تو اس میں یہ صلاحیت ہوتی ہے کہ ہنسی کی صورت اختیار کرلے اس لئے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ ہم اس لئے ہنستے ہیں کہ ہمیں غصہ آتا ہے۔

اس عالم تغیر میں کوئی شے ارتقا کے ہمہ گیر اثر سے بچ نہیں سکتی۔ ہنسی کو بھی ارتقا نے دودھ پلانا شروع کیا۔ سماج کو سوجھی کہ ہنسی سزا کا ایک لطیف اور کارگر آلہ ہے لیکن اس کے تعذیری ڈنک کو اگر نکال دیا جائے تو یہی ہنسی سماج کے افراد کے میل جول اور عام مسرت کے بڑھانے میں مدد دے گی۔ رفتہ رفتہ ہنسی کے ڈنک کو تمدن کی کشاکش نے ایک طرف نشتر کی طرح تیز کیا تو دوسری طرف جس طرح مرغ باز مرغوں کے خار کو کپڑے کی گدیاں باندھ کر بے اثر کر دیتے ہیں سماج کی پالیوں کے لئے اس ظرافت کے نیش کو دبیز مخمل کا غلاف پہنا دیا گیا۔

چنانچہ جہاں جہاں تمدن نے اعلیٰ ارتقا پائی وہاں ظرافت کی صلاحیت بھی زیادہ ہوتی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی ہوا کہ روزانہ سماجی میل جول میں ہنسی مسرت کی کان بن گئی اور ظاہرا یہ معلوم ہونے لگا کہ گویا یہ فہم عامہ کی تلوار ایک معصوم سی شے ہے۔ غصہ اس ارتقا کے گھسنے میں اپنی ماہیت سے اس قدر دور پڑ گیا کہ اس کی نوک اور دھار معدوم سی ہو گئی۔ لیکن ارتقا کی بھٹی اور گھن پر اتنی آنچیں اور چوٹیں کھانے کے بعد بھی ذرا سے تامل سے یہ بات روشن ہو جاتی ہے کہ اب بھی "ہنسی" کی تعذیری دھاریں کی نوں ہی نہیں ہے۔ بلکہ تیز تر ہو گئی ہے۔ بڑی بڑی موچھوں والے بھی

خلاف مذہب و عقل رسوم کو سماج کے انگشت نما تبسم کے ڈر سے کر جاتے ہیں۔ چوٹی والی دنیا تو جگ ہنسائی کے سامنے ایک بار مرجانا قبول کرلے۔ لوگ آپس میں ہنسی کرتے ہیں لیکن فطری طور پر اس کو نہیں بھلا سکتے کہ ہنسی میں کھنسی بھی ہو جاتی ہے۔ یعنے ہنسی ابتدائے غصہ ہی ہے لہذا اُس خاص نقطۂ حرارت سے جہاں وہ ہنسی رہ سکتا ہے، اگر ایک آدھ درجہ زیادہ ہو جائے تو محفل مرغوں کی پالی بن جائے گی۔

ایک محفل میں ایک صاحب نہایت بھاری بھرکم توند لئے بیٹھے تھے۔ توند اس قدر حد سے تجاوز کر گئی اور گستاخ ہو گئی تھی کہ دیکھنے والوں کی نظروں کو پہلے اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔ بے قابو اور بن کہنے اس حد تک ہو گئی تھی کہ بیچارے اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے مگر توند کے مزاج کو دیکھ کر کبھی بے قابو ہو جاتی تو بیچارے ہانپ کانپ کے اپنا گلگلا سامنہ اور ٹھنڈی سانس لے کر جہاں کے تہاں رہجاتے محفل میں شاعری کا تذکرہ تھا اور ایک طرف یہ استدلال تھا کہ شاعری خدا کی ایک دین ہے اور دوسری طرف یہ خیال تھا کہ یہ بھی ایک اکتسابی شے ہے۔ بحث ہوتی رہی۔ منطق کی پالی میں صغرا اور کبرا پھڑک رہے تھے کہ اتنے میں ظرافت کی دیوی نے ایک دماغ کو چھیڑا اور ان صاحب نے فرمایا:۔

"آپ کا استدلال تو اس قدر عام ہے کہ پھر ایک توند کو بھی خدائی دین ماننا پڑے گا۔"

"تو اس میں کس کو کلام ہے؟ آپ لاکھ کوشش کر دیکھئے بڑھ جائیے تو ہم عجب جانیں۔"

"جی میں اپنی حد تک تو یہ کہتا ہوں کہ اگر یہ خدائی دین ہے تو اور اکتسابی شے ہے تو دونوں صورتوں میں میرا تو دور ہی سے سلام ہے۔"

"جناب من۔ فطرت کا کوئی عطیہ مسرت سے خالی نہیں۔ توند کے مزے وہی

جانے جس کو یہ 'دین' ملی ہو"۔

"جی۔ توند کے مزے تو خیر وہ جانیں جو ایسے صاحب نصیب ہوں میں تو یہ جانتا ہوں کہ یہ 'دین' مسرت کے راستہ میں روڑا ہی نہیں بلکہ ٹیلا ہے"۔

"بغیر تجربہ کے آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں"۔

"تجربہ کو یہاں کیا دخل۔ تجربہ کی نوبت بھی آنے پائے۔ بدیہیات میں تجربہ عبث ہے"۔

"تو آپ کا خیال ہے کہ توند کا علیہ مسرت سے محروم کر دیتا ہے"۔

"یہ تو کسی توند والے ہی سے پوچھیے"۔

اب تک تو بیچارے توند کی 'دین' والے توند کے پیچھے سے مڑ مڑ سنتے رہے لیکن آخری فقرہ سنکر نہیں رہا گیا۔ فرماتے ہیں۔

"کیا آپ کا روئے سخن میری طرف ہے"۔

"جی نہیں۔ آپ کی توند کی طرف"۔

فرمایشی قہقہہ پڑا اور اب باوجود بلغمی مزاج اور توند کے اپنے پیروں پر کھڑے ہو گئے :

"لاحول ولا قوۃ الا باللہ یہ بھی کوئی ہنسی ہے"۔

ہنسی ایک تو متعدی کیفیت ہے دوسرے یہ کہ ہنسی کی بات سوجھ جاتی ہے تو پھر انسان کے پیٹ میں نہیں سما سکتی۔ ایک صاحب جو ذرا ان سے بے تکلف تھے بول اٹھے۔

"دیکھو بھئی۔ بے تحاشا کھڑے ہو گئے ہو ذرا اکر تھامے رہنا"۔

اب کیا تھا بگڑ گئے۔ بکھر گئے۔

غرض ہنسی اگرچہ کہ سماجی مسرت کا ایک پر لطف آہنگی ہے لیکن بے احتیاطی سے

اپنی اصلیت پر عود کر آتی ہے۔

دنیا کے زبردست ظرافت نگار ہنسی کے راز سے واقف تھے اور انھوں نے سماجی برائیوں کی بیخ کنی میں اس کو اپنا ہتیار بنایا ہے۔

سروانٹیز (Cervantes) کے ڈان کگزوٹ (Don Quixote) اور تھیکرے (Thackeray) کی "بک آف اسنابس" (Book of Snobs) نے سماج کے رجحانات کو بدل دیا۔ مولیئر (Moliere) کے لطیف اور بے نظیر ظریفانہ کھیلوں نے فطرت انسان کی صحانت کی گہرائیوں کو گھنگھول ڈالا۔ مولیئر ظرافت کی دیوی کا خاص فرزند ہے اور دور حاضرہ کا تنہا ظرافت نگار۔ جس کو اس رنگ میں شکسپیر بھی نہیں پہنچ سکتا۔

انسان دکھ درد سے اس قدر گھبراتا ہے ایسا بے اوسان ہو جاتا ہے عقل سلیم اور فہم عامہ کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے کہ کوئی جھوٹ موٹ بھی دکھ سے نجات کی صورت بتلائے تو یہ اس کا گرویدہ ہو جاتا ہے۔ سب سے زیادہ انسان اس وقت بو کھلا جاتا ہے جب اس کے جسم میں کسی بیماری کا اثر ہو اس وقت اگر کوئی چلتا ہوا آدمی ہو تو دن دہاڑے محض باتیں بنا کر اس کو لوٹ لے۔ یہی وجہ ہے کہ نوع انسانی نے اپنے آپ کو طبیبوں کا شکار بنا رکھا ہے۔ اس روشن زمانہ میں بھی انسان طبیب کے آگے اس طرح موم ہو جاتا ہے اور بڑی بڑی فیسیں چپکے سے نذر کر دیتا ہے گویا طبیب تندرستی کا دیوتا ہے مولیئر نے اس کمزوری کی ہنسی اپنے مشہور کھیل "مریض وہم" میں اڑائی ہے اور اس لطیف کھیل کا ایک ایک لفظ آج بھی صداقت میں ڈوبا ہوا ہے اس جگہ ذیل کا مکالمہ بطور نمونہ دیا جاتا ہے۔

موسو ارگان جو "مریض وہم" ہے اور اس کا بھائی بیارآلڈ میں گفتگو ہو رہی ہے واقعہ یہ ہے کہ موسو ارگان اپنے ایک چاہتے ڈاکٹر کے لڑکے کو اپنی لڑکی دینی چاہتے ہیں

حالانکہ لڑکی ایک اور نوجوان سے شادی کرنا چاہتی ہے۔
بے رالد۔ "آخر معلوم تو ہو کہ تم کیوں ڈاکٹر کے ہی لڑکے کو اپنی لڑکی دینے پر اڑے ہوئے ہو؟"
ارگان۔ "بھائی میرا خیال ہے کہ ایسا داماد مجھے ملے جو کار آمد ہو"۔
بے۔ "لیکن تمھاری بیٹی یہ نہیں چاہتی اس کا میلان اور طرف ہے"۔
آر۔ "ہاں ہوگا۔ لیکن میرے لئے تو دوسرا ہی موزوں ہے"۔
بے۔ "مگر بھائی وہ دولھا اپنے لئے کر رہی ہے۔ یا تمھارے لئے"۔
آر۔ "دولھا دونوں کے لئے ہونا چاہیئے اس کے لئے بھی اور میرے لئے بھی میں چاہتا ہوں کہ میرے خاندان میں ایسے ہی لوگ شامل ہوں جو وقت پر میرے بھی کام آسکیں"۔
بے۔ "اس حساب سے تو جب چھوٹی لڑکی بیاہنے کے لائق ہوگی تو تم اس کا عقد کسی عطار (دواساز) سے کردو گے"۔
آر۔ "ایسا کیوں نہ کیا جائے؟"
بے۔ "کیا یہ ممکن ہے کہ تم ہمیشہ اسی طرح ڈاکٹروں کے پیچھے دیوانے رہو گے؟ اور کیا ہمیشہ تمہیں اپنے آپ کو مریض تصور کرنے پر اصرار رہے گا۔ خواہ ساری دنیا اور خود فطرت تمھیں بیمار نہ قرار دے"۔
آر۔ "بھائی تمھارا مطلب کیا ہے؟"
بے۔ "میرا مطلب یہی ہے کہ میں تمھیں بھلا چنگا دیکھتا ہوں۔ شاید ہی کوئی اتنا تندرست ہو۔ کاٹھی تمھاری ایسی ہے کہ مجھے خود رشک ہوتا ہے۔ بڑا ثبوت اس بات کا کہ تم بھلے چنگے ہو اور تمھاری صحت بالکل اچھی ہے یہ ہے کہ تم نے اپنی صحت اور کاٹھی کی خرابی کے پیچھے کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا اور پھر بھی تم ان کو بگاڑ نہ سکے۔ تم نے پیٹ کو

دواخانہ بنا دیا۔ پھر بھی تمہارا معدہ تک نہیں بگڑا۔

آر۔ کیا خوب۔ ارے بھائی انہیں دواؤں نے تو مجھے زندہ رکھا ہے۔ ڈاکٹر پرگوں کہا کرتے ہیں کہ اگر تین دن وہ میری خبر نہ لیں تو پھر میرا کام تمام ہے۔"

بے۔ اگر تمہاری آنکھوں پر اسی طرح پٹی بندھی رہی تو ڈاکٹر صاحب آپ کی ایسی خبر لیں گے کہ عالم بالا ہی کی سیر کرو۔"

آر۔ بھائی عقل کی باتیں کرو۔ اچھا تو تمہیں فن طب پر اعتقاد نہیں ہے؟"

بے۔ مطلق نہیں۔ اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میری نجات عقبیٰ کے لئے اس اعتقاد کی ضرورت ہے۔"

آر۔ خوب۔ ساری دنیا جس فن کی صداقت کی گواہ ہے اور ہر زمانے کے لوگ جسے مانتے چلے آئے ہیں آپ سچا نہیں مانتے؟"

بے۔ سچا ماننا تو بڑی دور کی بات ہے تم پوچھتے ہو تو میری رائے میں فن طب نوع انسان کی سب سے بڑی حماقت ہے۔ فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھتا ہوں تو اس سے زیادہ کوئی اور فعل عبث اور قابل تمسخر بات مجھے نظر نہیں آتی کہ ایک انسان اپنے آپ کو دوسرے کے حوالے کر کے علاج کا متمنی ہو؟

آر۔ آخر اس کی بھی آپ کے پاس کوئی وجہ ہے۔ کہ کیوں ایک شخص دوسرے کے زیر علاج نہ ہو۔"

بے۔ بھائی اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہمارے جسم کے کل پرزے اب تک ایک اسرار ہیں۔ اور ان کو کوئی انسان نہیں سمجھ سکتا۔ فطرت نے ہماری آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے جس سے ہمیں کچھ نہیں سجھائی دیتا۔"

آر۔ تو پھر آپ کی رائے میں ڈاکٹر کچھ نہیں جانتے؟"

بے۔ بھائی آپ میرا مطلب ٹھیک سمجھے۔ ان میں سے اکثر لاطینی اور یونانی

زبانیں جانتے ہیں۔ لاطینی میں بات چیت کر سکتے ہیں۔ ہر بیماری کے یونانی نام جانتے ہیں۔ بیماری کی منطقی تعریف کر لیتے ہیں۔ ایک بیماری سے دوسری بیماری کا فرق جانتے ہیں اور بس۔ رہا بیماریوں کو اچھا کرنا یہ نہ اُن کے بس کی بات ہے اور نہ وہ اس بارے میں کچھ جانتے ہیں۔"

آر۔ "بھائی اتنا تو تم کو بھی ماننا پڑے گا کہ ان باتوں کو ڈاکٹر اوروں سے زیادہ جانتے ہیں۔"

بے۔ "ہاں بس اُسی حد تک جیسا میں نے ابھی بیان کیا ہے لیکن ان کے معلومات کو اچھا کرنے سے کیا تعلق۔ فن طب میں موٹے موٹے ثقیل الفاظ مغالطہ آمیز استدلال جس میں بس نرے الفاظ ہی الفاظ ہوتے ہیں معنے نہیں ہوتے اور بڑے بڑے معرکے کے علاجوں کے وعدہ وعید کے سوا اور کیا دھرا ہے اور ان باتوں میں یہ فن ادب سب فنون کو مات کرتا ہے۔"

آر۔ "بھائی یہ کیا بات ہے کہ تمھاری طرح کے فہیم اور زیرک آدمی بھی جب بیمار پڑتے ہیں تو ڈاکٹروں سے رجوع کرتے ہیں۔"

بے۔ "یہ ایک انسانی کمزوری کی علامت ہے۔ اس سے فن طب کی سچائی ثابت نہیں ہوتی۔"

آر۔ "بھئی۔ کچھ بھی کہو ڈاکٹر فن طب کو سچا ہی مانتے ہیں اور اسی لئے خود اپنے لئے بھی اُس سے کام لیتے ہیں۔"

بے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ خود ڈاکٹروں میں بعض ایسے بھی ہیں جو اس عام مغالطہ میں مبتلا ہیں اور اس سے اپنی جیب بھی گرم کرتے ہیں۔ لیکن اور ڈاکٹر جیب بھی گرم کرتے ہیں اور اس مغالطہ میں نہیں پڑتے مثلاً آپ کے ڈاکٹر پرگون کو ریاکاری نہیں آتی یہ بیچارے سر سے پیر تک نرے ڈاکٹر ہیں ان کو طب کے قاعدے اور قانون پر اتنا اعتقاد ہے کہ

کسی ریاضی داں کو ریاضی کے مسلمات پر نہیں)۔ ڈاکٹر پرگون طبی اصول میں شک لانیکو جرم قرار دیں۔ مختصر یہ کہ وہ طب کو ایسا فن تصور کرتے ہیں جس میں شک کی گنجایش نہیں۔ جس میں کسی قسم کی مشکلات حائل نہیں۔ جس میں کہیں ابہام نہیں۔ اس اعتقاد کا نتیجہ یہ ہے کہ ڈاکٹر پرگون پر طب کا بھوت سوار ہے اور طب پر ان کو اس قدر پکا اعتماد ہے کہ وہ عقل سلیم اور فہم عامہ کو بے تکلف کچل کچل ڈالتے ہیں اور بے سوچے سمجھے اور بے تحاشا مسہلوں اور فصدوں کا فرمان جاری کردیتے ہیں وہ آپ کے ساتھ چاہے کچھ بھی عمل کریں یہ یاد رہے کہ ان کی نیت صاف ہے وہ آپ کا نہایت اطمینان قائدگی اور اعتماد کے ساتھ کام تمام کردیں گے اور جس طرح وہ آپ کا خاتمہ کریں گے اسی طرح ان کو اپنی بیوی بچوں کے ساتھ سلوک کرلے میں تامل نہ ہوگا۔ اور اگر موقع ہو تو اپنے بھی اُن کا برتاؤ بعینہ یہی ہوگا۔"

آر۔" بھائی پرگون بیچارے سے تم کو ہمیشہ کچھ بیر سا رہا ہے۔ لیکن اصل نقطے کو نہ چھوڑیے مجھے یہ بتلایئے کہ جب انسان بیمار ہو تو کیا کرے۔"

بے۔" کچھ نہ کرے۔"

آر۔" کچھ نہ کرے؟"

بے۔" جی ہاں کچھ نہ کرے۔ بیماری کے معنے یہ ہیں کہ ہمیں آرام کی ضرورت ہے۔ اگر ہم طبیعت کو اس کے حال پر چھوڑ دیں تو ہمارے جسم میں جو الٹ پلٹ ہوگئی ہے اس کو طبیعت اپنے آپ ٹھیک ٹھاک کرلے گی۔ ہماری بے چینی بے صبری ساری خرابی کا باعث ہے یہ تقریباً ایک کلیہ ہے کہ لوگوں کو دوائیں مارتی ہیں امراض سے نہیں مرتے۔"

اب ایک چھوٹی سی مثال مولیئر کے ایک اور کھیل "علمدوست خواتین" کی ملاحظہ ہو۔ ہمارے ہاں بھی تعلیم نسوان شروع ہوچلی ہے اور ایسی خواتین آگے چل کر

پیدا ہوں گی اور کوئی عجب نہیں کہ اکا دکا اب بھی کہیں پردے میں چھپلی چھپالی نکل آئیں۔ بلبیس ایک علم دوست خاتون ہے اور وہ جس نوجوان کی جانب ذہناً مائل ہے وہ ایک اور لڑکی پر شیدا ہے اور یہ لڑکی خود بلبیس کی بھتیجی ہے بلبیس کی بھاوج بھی ایک علم دوست خاتون ہے وہ اپنی لڑکی ایک عالم فاضل شاعر کو دینا چاہتی ہے لڑکی انکار کرتی ہے اور لڑکی کا عاشق بلبیس سے شادی کرنے سے انکار کرتا ہے تو بلبیس فرماتی ہیں۔

ہم اگر چاہیں تو ایسی تجاویز بھی پیش کر سکتے ہیں جو دنیوی پہلو سے بھی دل خوش کن ہوں لیکن ہماری یہ عین آرزو ہے کہ محبت کا ایک ایسا نمونہ پیش کریں جو صبح کے ستارہ کی طرح خالص اور پاک ہو جس میں ہستی انسان کا روحانی پہلو تو پورا پورا حصہ لے لیکن لیکن جس میں الیا ثلاثہ کی کھینچ تان میں مبتلا مادہ کو دخل نہ ہو۔"

مولیئر نے یہ ظرافت میں ڈوبے کھیل اسی لئے لکھے کہ اُسے انسانی حماقت پر غصہ آتا تھا۔ لیکن اُس کو صرف اتنا ہی غصہ آتا تھا کہ وہ ہنسی کی صورت اختیار کر سکے اور ہنسی کا کوڑا آدمیوں کو چونکا دے۔ قارئین کرام اس نظریہ کو پیش نظر رکھ کر اور ان مثالوں کی روشنی میں اب ہنسی کے ادبیات والے اور محفل والے نمونوں کا تجزیہ خود فرما سکتے ہیں اور یہی گویا اس مضمون کا مقصد تھا کہ اگر آپ ہنسیں تو سوچ سمجھ کر ہنسیں۔ بے تحاشا منہ پھاڑ کر ہنسنا بھی موقع پر مناسب ہوتا ہے لیکن یہ ہنسی کی خالی خولی گرج ہے وہ ہنسی جس سے سبق ملے جس سے فطرت انسان کا مطالعہ بھی ہو جو دیر پا ہو اور ساتھ ہی دور رس عموماً ڈوبتے سورج کی آخری کرنوں سے ملتے جلتے تبسم میں ظاہر ہوتی ہے +

+

(علیمہ ...)

چشم نرگس خون روئی ہم کو گریاں دیکھ کر	لالہ شرمایا ہمارا داغ حرماں دیکھ کر
کیا مرے زخم جگر کا گھاؤ بھر سکتا نہیں	سچ بتا اے چارہ گر کیوں ہے پریشاں دیکھ کر
غم کی میرے دل پہ چھائی تھی سحر ہی سے گھٹا	آنکھ میں آنسو بھر آئے شام ہجراں دیکھ کر
چھوڑ دو ملک دکن اطہر چلو ہندوستاں	ملنے والے بھی نہیں ملتے پریشاں دیکھ کر

نقشِ قدم

باب پانچواں

"مس ہاتھورن! یہ ایک نہایت غم انگیز معاملہ ہے۔ لیکن میں یہاں آپ کے تسلی و تعزیت کے لئے نہیں آیا ہوں۔ آپ کے ولی اور محافظ کو قتل کرنے والا ہاتھ کسی بدمعاش اور بزدل کا ہاتھ تھا۔ میں آپ کے چہرے سے اندازہ کر سکتا ہوں کہ آپ کو میری رائے سے اتفاق ہے کہ مجرم کو سزا ملنی چاہیئے۔

میں نے اس نہج پر جو گفتگو شروع کی گو اسمیں میری ایک خاص غرض تھی اور میں چاہتا تھا کہ اس کے دلی احساسات کو ابھاروں جس سے مجھے اپنے مقصد میں مدد مل سکے مجھے اطمینان تھا کہ اگر وہ چاہے تو مجھے بہت سے حالات اس سے معلوم ہو سکیں گے

"کیا ضروری ہے کہ کسی کو سزا دی جائے؟ کیا دو خطاؤں سے ایک امر حق واقع ہو سکتا ہے؟ کیا میرے ولی کسی کی قربانی سے دوبارہ زندہ ہو سکتے ہیں"؟۔

میں ایسے مصنوعی عذروں کے سننے کا عادی تھا۔ اس لئے میں نے کہا۔

"انصاف یہ چاہتا ہے کہ ایسے شخص کو ضرور سزا دی جائے میں یہاں اسی لئے بھیجا گیا ہوں کہ اس بدمعاش کا پتہ لگاؤں اور مس ہاتھورن۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے مدد دے سکتی ہیں"۔

"میں؟" یہ کہہ کر وہ جھجکی اور حیرت سے میری طرف دیکھا۔

"جی ہاں" میں نے نرمی سے کہا تاکہ وہ زیادہ پریشان نہ ہو۔ کیونکہ میں عورتوں کے غش کرنے سے بہت ڈرتا ہوں۔ "جی ہاں۔ بشرطیکہ میرے سوالات کا جواب آپ

بلا تصنع دیں۔"

"آپ مجھ سے کیا دریافت کیا چاہتے ہیں؟"

"بہت سی چیزیں۔ پہلے تو یہ کہ یوجین نے مجھ سے بیان کیا ہے کہ آپ تینوں میں کس طرح کے تعلقات تھے۔ معاف کیجئے میں کسی قدر بے لحاظ ہو رہا ہوں۔ یہ وقت لحاظ کا نہیں ہے آپ نے ان سے شادی کرنے کا وعدہ کیا تھا اور آپ کے دلی کو بھی آپ سے تعشق تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان دونوں میں آپ کی طرف سے رقابت تھی۔"

"بالکل صحیح ہے"۔ اوس نے درد آمیز لہجے میں کہا۔

"مس ہاتھورن! یہ تو کہیئے وہ ابتدا میں آپ کے دلی کس طرح قرار پائے؟"

"وہ میرے والد کے بڑے عزیز دوست تھے۔"

اس جواب سے ظاہر تھا کہ وہ جواب سے گریز کرتی ہے اور میں اس راہ سے آگے بڑھ نہیں سکتا ہوں۔

"آپ ان کی بہت عزت کرتی تھیں اور یہ بھی مجھ سے کہا گیا ہے کہ بعض اوقات اُن سے ڈرتی بھی تھیں۔ کیا یہ اُن کی گرم مزاجی کی وجہ سے تھا؟"

"ایک حد تک یہ صحیح ہے"۔

میں نے فوراً گفتگو کا رُخ بدل دیا۔

"میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ یہ کمرہ بالکل اُس کتابخانے کے اوپر واقع ہے"۔

"جی ہاں"۔

"کیا آپ طوفان کے وقت سو رہی تھیں؟"

"جب طوفان کی شدت ہوئی اُسوقت میں بیدار ہوگئی تھی"۔

"تو آپ غالباً گہری نیند سوتی ہیں"۔

"جی نہیں۔ میں اکثر ہشیار نیند سوتی ہوں۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ غفلت کی

نیند سو جاؤں ایسے مواقع پر ایسا معلوم ہوتا ہے گویا میں نیند میں کوسوں چلی ہوں۔ اور میں نے عجیب و غریب سفر کئے ہیں۔ کیونکہ جس وقت مجھے جگایا جاتا ہے تو میں بیحد تھکی ہوئی ہوتی ہوں"۔

"اچھا تو کیا آپ حقیقت میں سوتے میں چلتی ہیں؟"۔

وہ یہ سنکر مسکرائی۔

"میرا خیال ہے کہ بچپن میں میں اس کی عادی تھی۔ لیکن مجھے علم نہیں کہ چند سالوں سے میں نے ایسا کیا ہو"۔

"کیا آپنے اس وقت کوئی شبہہ ناک آواز تو نہیں سنی؟"۔

"نہیں۔ کیونکہ یہ غیر ممکن بھی تھا بادل کی گرج۔ بارش کی آواز۔ درختوں کی کھڑکھڑاہٹ مکان کے اندر ہر قسم کی آواز کو دبا دینے کے لئے کافی تھا"۔

"بہت صحیح۔ آپ کبتک جاگتی رہیں؟"

"کوئی آدھ گھنٹے تک۔ اور پھر میں اپنی کرسی پر لیٹے لیٹے سو گئی"۔

"کرسی؟ تو کیا آپ بیٹھی ہوئی تھیں"؟

سر کے اشارے سے اقبال کیا۔

"تو آپ سونے نہیں گئیں"؟

"نہیں جناب"۔

"یہ آپ کی معمولی عادت تو نہیں"؟

وہ پھر مسکرائی "مجھے یاد نہیں کہ میں نے آگے کبھی ایسا کیا ہو۔ لیکن مجھے ان دونوں کے جھگڑے سے کچھ ایسی پریشانی ہوئی۔ کہ میں اپنی کرسی پر روتی روتی سو گئی"۔

"ایسے ہی لباس پہنے ہوئے جیسے آپ اب ہیں"؟ وہ ایک سیاہ گون پہنے ہوئی تھی جس پر بہت سے پھول اور پھندنے ٹکے ہوئے تھے جیسا کہ اس زمانے کا فیشن تھا۔

"میں نے کوئی چیز اوڑھی تک نہیں"۔

اس سے ایک اور تشنجی جھٹکا میرے دل پر لگا اور میری نظر بے اختیار ادھر اُدھر لباس کے پھٹے ہوئے حصے کو ڈھونڈنے لگی۔ کیونکہ اُس کے لباس کا کپڑا مجھے بالکل اُسی قماش کا نظر آنے لگا جس کا ایک ٹکڑا میرے جیب میں محفوظ تھا۔

"آپ سینے میں مصروف تھیں"۔ میں نے پوچھا اور ساتھ ہی سینے پرونے کے صندوق پر اپنا ہاتھ ۔ کھا جو میز پر دھرا تھا۔

"جی ہاں ۔ پیوند لگانے میں مشغول تھی کیونکہ میرا لباس پھٹ گیا تھا۔ شاید کہیں کسی کیلے سے الجھ کر پھٹ گیا ہوگا۔ مگر مجھے کچھ یاد نہیں کہ کہاں پھٹا تھا"۔

یہ سُن کر میں شل برف کی طرح سرد ہوگیا اور دوسرے لحظے میں میرا تن بدن جلنے لگا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں اب حقیقت کے قریب پہنچ گیا ہوں بلکہ شاید اُس کے سایہ تلے آگیا ہوں۔

"آپ نے ابھی ایک جھگڑے کا ذکر کیا جس سے آپ کے دل کو شدید صدمہ پہنچا تھا۔ تو کیا آپ کی مراد اُس جھگڑے سے ہے جو یوجین اور اُن کے چچا کے درمیان اوّل شب واقع ہوا تھا۔ یعنے قریب دس بجے کے؟"۔

"تو کیا یوجین نے اس کا آپ سے ذکر کیا ہے"؟۔

"جی ہاں۔ اُنھوں نے مجھ سے بیان کیا"۔

"جی ہاں ۔ میرا مطلب اُسی جھگڑے سے تھا"

"کیا آپ نے خود سُنا تھا؟"

"میں معلوم نہ کرسکی کہ کیا گفتگو ہورہی ہے۔ مگر اس کے آخر میں اور اُس وقت میں نے جج صاحب کو اپنے بھتیجے کو سخت سُست کہتے ہوئے سُنا اور یہ بھی کہتے ہوئے سُنا کہ "جب تم اس مکان سے چلے جاؤ گے تو یقین مانو کہ پھر اس کے دروازے کو تاریک نہ کر دگے

تم سانپ ہو"۔

"بیشک ایسی گفتگو کا اثر آپ کے دل پر ہوا ہوگا اور آپ کو فطرۃً رنج ہوا ہوگا کہ جس شخص سے آپ نے اس کی بی بی بننے کا وعدہ کیا ہو اُس کو کتے کی طرح ذلیل کیا جائے اور آپ سونے کے لئے چلی گئیں۔ جبکہ یہ خیالات آپ کے دل پر قبضہ کئے ہوئے تھے۔ ایسا ہی ہے نا؟"

"جی آپ صحیح فرماتے ہیں"۔

"کیا آپ اپنے کمرے کا دروازہ ہمیشہ بند رکھتی ہیں؟"

"جی ہاں صاحب"۔

"کیا آپ کو یاد ہے کہ کل رات بھی بند کیا تھا؟"

"بخوبی"۔

"کیا آپ نے صبح کو اُسے بند پایا؟"

وہ کچھ پس و پیش کرنے لگی۔

"جی نہیں۔ یعنے مجھے یقین نہیں۔ شاید میں نے بیخیالی کی حالت میں کھولدیا ہو جبکہ میں بسی کے چلانے سے بیدار ہوئی"۔

بیچاری لڑکی۔ مجھے اب سارا حال معلوم ہوگیا۔ اس غریب کو نیند میں چلنے کا عارضہ تھا شاید نیند میں وہ اتر کر نیچے گئی ہو جبکہ اُس کے دل میں جج ٹریورز کی طرف سے غصہ بھرا ہوا تھا۔

اُس نے وہ خوفناک کام کس طرح کیا یہ میں اب تک دریافت نہ کرسکا لیکن مجھے یقین تھا کہ اگر اس کے ہاتھ سے وہ کام ہوا تھا تو اس کو مطلق اس کی خبر ہی نہ تھی۔ یہ ایک نیند میں چلنے والے کا کام تھا۔

بیشک یہ میرا مقصد نہیں تھا کہ اُس کو اس بات کا خیال پیدا ہو کہ میں

اس امر سے بدگمان ہوں۔ میں جانتا تھا کہ اسے اس خوفناک واقعہ کا شان وگمان بھی نہ تھا
بلکہ اس کے افعال وکردار سے ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنے عاشق کی طرف سے
بدگمانی تھی۔

اس کے دل میں یہ بات متمکن ہوگئی تھی کہ یوجین طوفان کے وقت کتابخانہ میں
گیا ہوگا اور وہ تلخ مباحثہ شروع ہوا ہوگا۔ پھر غیظ وغضب کی حالت میں وہ اس
امر خطیر کا مرتکب ہوا ہوگا۔

وہ کوشش کر رہی تھی کہ یوجین کو بچائے یہ راز اور بھی گہرا ہوتا جاتا تھا
ہر ایک ان دونوں میں سے اسی فکر میں تھا کہ دوسرے کو بچائے۔ یعنے جہاں تک
ظاہری علامتوں سے معلوم ہوتا تھا بہرحال شاید مقدمہ کی حالت وہی ہوگی۔ یا وہی
تھی جس کا خاکہ میں نے اپنے دل میں کھینچ رکھا تھا۔ اصل یہ ہے میں نے اپنے دل میں
اس مقدمہ کی پوری تصویر اتار لی تھی۔ گویا کہ یہ سارا واقعہ میرے روبرو واقع ہوا تھا۔

بیچاری لڑکی۔ اس کے دل کو کس قدر شدید صدمہ پہنچے گا جب اوسکو حقیقت حال
سے اطلاع ہوگی۔ شاید اس کا دماغ متاثر ہوجائے جب اسے معلوم ہو کہ ادس کے ہاتھ
سے یہ سنگین جرم واقع ہوا ہے۔

اس حسین لڑکی کے لئے جس کے روبرو میں اس وقت بیٹھا ہوا تھا۔ شاید بہت شدید
صدمہ در خفا میں تھا۔

اگرچہ مقدمہ کے متعلق میں نے بعض خیالات اپنے دل میں جما لئے تھے لیکن بعض
دوسری ضمنی باتیں بھی قابل التفات تھیں۔

میں نے آہستگی سے گفتگو شروع کی تا کہ اسے مضطرب نہ کروں اور اس طور پہ
بہت سی باتیں دریافت کرلیں منجملہ ان کے یہ بھی تھی کہ یوجین کا کمرہ اسی طبقے پر دیوانخانے
کے آخری سرے پر مکان کے سامنے کی طرف تھا اور لڑکی کا کمرہ کتابخانہ کے اوپر جیسا کہ

میں نے آگے بیان کیا ہے۔

اس کے بعد میں اُس سے رخصت ہوا تا حد امکان نہایت ہوشیاری کے ساتھ میں نے اُسے سمجھنے کا موقعہ دیا کہ بعض اوقات ایسے تھے جن سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی چور گزشتہ شب میں مکان کے اندر آیا تھا اور جب ہم اُس بدمعاش کا پتہ لگا لیں گے تو اس سانحہ کا سارا راز مکشوف ہو جائے گا۔

اس بات کے تصور سے اُسے بیحد خوشی ہوئی لیکن میرے ضمیر نے مجھے اس قسم سے دھوکا دینے پر ملامت کی۔ بہرحال میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا کہ جو کچھ میں نے کیا ہے ایک عمدہ نتیجہ بر آمد کرنے کے خیال سے کیا ہے اور یہی وجہ تھی کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے دوستانہ حالت میں رخصت ہوئے۔

پہلے تو اُس نے نہایت سرد مہری سے ملاقات کی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ میرا آنا اُسے ناگوار تھا لیکن میں نے اس کے دل کی حالت کو خوب جانچ لیا تھا اور اس چالاکی سے اُس کے دل پر قابو پالیا کہ اُس نے مجھے اپنا دوست خیال کیا اور بدگمان نہیں ہوئی۔

جب میں نے باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر لیا تو دیوانخانہ کے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ ایک متنفس بھی وہاں نہ تھا۔

یہی موقع تھا کہ میں چاروں طرف پھر کر دیکھ سکوں میں نے یوجین سے کہدیا تھا کہ میرا ارادہ ہے کہ جانے کے قبل سارے مکان کو دیکھ لوں تو اس سے بہتر موقع نہیں مل سکتا تھا۔

اب میں ایک کمرے میں داخل ہوا اور اُس سے فارغ ہو لیا تو دوسرے میں داخل ہوا اُس کی دہلیز میں قدم رکھتے ہی مجھے یہ بات معلوم ہوگئی کہ یہ کمرہ یوجین کا ہے اس کے دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ شکار کا شوقین ہے بندوقیں اور مچھلی کے شکار کی چھڑیاں دیوار سے لٹکی ہوئی تھیں۔ علاوہ ان کے اُس کے شکار کے نمونے بھی موجود تھے

جیسے بارا سنگھے کی کھوپری اور سینگیں وغیرہ اور ایک الماری میں بط اور اناف (چیہے) اور دوسری الماری میں جنگلی مرغی۔ بٹیر۔ اور تیتر خشک کئے ہوئے رکھے تھے

میری رگوں میں بھی کسی قدر شکاریوں کا خون دوڑتا ہے اگرچہ مجھے اس کا موقع کم ملا ہے بہرحال جب مجھے معلوم ہوا کہ یوجین کا میلان طبع اس طرف ہے تو میرے دل میں اس کی محبت زیادہ ہوئی بلا پس وپیش میں اسکے کمرے میں داخل ہوا وہ مثل ایک عجائب خانے کے تھا اور ایک مرد مجرد کا گوشہ تنہائی تھا تمبا کو پینے کے پائپ ہر قسم کے نمونے ایک دیوار پر لگے ہوئے تھے۔ یعنے آیرلینڈ کی سیاہ لکڑی کے پائپ سے لے کر ترکوں کے قلیان تک مع اون کے شیشوں کے۔

جب میں نے ایک بہت چھوٹا کمرہ کھولا تو اسمیں شکاریوں کا ہر قسم کا لباس مجھے نظر آیا۔ ربر کے اونچے بوٹ ایک بینچ سے لٹکے ہوئے تھے اور شکاری کپڑے کی پتلونیں۔ کرٹ۔ پائتابے۔ کنوس کی ٹوپی۔ کارتوسوں کی حمائل اور چند دوسری چیزیں جو عمدہ طرح سے مستعمل ہوئی تھیں فقط دکھاوے کی نہیں تھیں۔

جب میں ان کے دیکھنے میں مصروف تھا تو مجھے کھانسنے کی آواز دالان سے سنائی دی معلوم ہوتا تھا کہ کوئی شخص آرہا ہے شاید مرد ہو۔

وہ ضرور یوجین ہی ہوگا۔ کیونکہ اس مکان میں سوائے اس کے کوئی دوسرا مرد موجود نہ تھا۔ مجھے یہ بات اچھی نہ معلوم ہوئی کہ اس کے کمرے میں اس کی چیزوں کو دیکھتا ہوا پا جاؤں اور کوئی موقع نہ تھا کہ میں اس کے کمرے کے اندر آنے کے قبل دالان میں نکل جاؤں۔

پہلے تو مجھے یہ خیال آیا کہ کمرے کے بیچ میں جا کر کھڑا رہجاؤں اور ان کا انتظار کروں لیکن میں نے فوراً اپنا ارادہ بدل دیا۔ اور ہاتھ بڑھا کر اس چھوٹے کمرے کا دروازہ بند کرلیا اور انتظار کرنے لگا۔

اُس جگہ سے میں بلا دغدغہ سب کچھ دیکھ سکتا تھا اور جب یوجین کمرے میں داخل ہوا تو میں اُس کے چہرے کو بخوبی دیکھ سکتا تھا گویا کہ وہ میرے نزدیک کھڑے ہوئے ہیں۔ ان کا چہرہ غمگین نظر آتا تھا جس سے ظاہر ہوا کہ اُن کی بشاشت جب وہ میرے ساتھ تھے بالکل مصنوعی تھی تا کہ اپنے دل کی حالت کو مجھ سے چھپائیں۔ (باقی دارد)

رُباعیات

از جناب مولانا سید محمد عسکری صاحب عدیل کنتوری

رکھ ایک طرف ساغر و مینا ساقی — تو آج لنڈھا دے خم صہبا ساقی
رکتا نہیں ایک دم بھی دور ہستی — سب ہیچ ہے پیمانہ جو چھلکا ساقی

ولہ

ذکر مے و معشوق ہے گو جان سخن — اب اس کے خلاف میں ہیں اعیان سخن
دیکھیں وہ ذرا کلام حافظ کو عدیل — ہے ساغر و پیمانے سے پیمان سخن

ولہ

ہیں واعظوں کی چرب زبانیں کیا کیا — ناصح کہتے ہیں داستانیں کیا کیا
دو گوش سماع ایک دل بہر قبول — کس کس کی سنیں عدیل مانیں کیا کیا

ولہ

دیتا ہے یہی حکم حکیم تقدیر — تدبیر کو تم سمجھو ندیم تقدیر
کر دیتی ہے شاداب اُسے دم بھر میں — جس باغ میں چلتی ہے نسیم تقدیر

شہید وفا (۵)

جبتک کہ جہاز سامنے تھا	پھیرا اپنی نے منہ نہ صلا
آخر ہوئی رہ نورد منزل	وہ لیلیٰ آرزو کی محمل
پھر مایوس ہو کے پلٹی	اپنی قسمت کو رو کے پلٹی
ہر چند اُسے بہت الم تھا	شوہر کا فراق اک ستم تھا
رہتی تھی گو اداس ہر دم	تھا حکم کا اُس کے پاس ہر دم
قسمت میں جو دکھ تھا بھرتی تھی وہ	جو اُس نے کہا تھا کرتی تھی وہ
پھر بھی نہ چلی دکانداری	اُس کو نہ پھلی دکانداری
اس کام سے آشنا نہ تھی وہ	آخر زن روستا نہ تھی وہ
وہ بنیو چال سے تھی عاری	تھی اُس میں کہاں یہ ہوشیاری
آتے تھے نہ بھاؤ تاؤ کے طور	جو کہتی کچھ اور لیتی کچھ اور
مجبور جو کرتی تھی ضرورت	رکھتی تھی نہ کچھ خیال قیمت
لاگت سے بھی کم پہ مال دیتی	اونے پونے تھی ٹال دیتی
نقصان پہ ہو رہا تھا نقصان	چلتی نظر آتی تھی نہ دوکان
کھٹکا یہی ہر گھڑی لگا تھا	اینک آیا تو کیا کہے گا
ہر چند نوید وصل دلدار	پہنچی کبھی کان تک نہ زنہار
موہوم امید یہ تھی جس پہ	جیتی تھی وہ غم کی ماری مضطر
سود اور زیاں سے کچھ نہ تھا کام	پیاروں کا ڈھونڈھتی تھی آرام
لیکن قسمت سے کیا ہے چارا	چھوٹا بیٹا مریض جو تھا

ہر طرح کیا علاج اُس کا　　سنبھلا نہ مگر مزاج اُس کا
ہر چند کہ چارہ سازماں تھی　　حد بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھی
ہر سانس پہ اس کے دیتی تھی دم　　ہٹتی تھی نہ پاس سے کسی دم
الا گاہک جب آتا کوئی　　یا حاجت ہوتی ڈاکٹر کی
تقدیر مگر اسی طرح تھی　　ضایع ہو یہ دوڑ دھوپ ساری
آخر مرغ قفس کی صورت　　جسمِ خاکی سے ہو کے رخصت
ننھی معصوم رُوح اُسکی　　گلزار بہشت کو سدھاری

+ + + +

گزرا تھا ابھی نہ ایک ہفتہ　　داغ دلبر تھا دل پہ تازہ
عشق صادق نے گُل کھلایا　　اینی کا فلپ کو دھیان آیا
ہر چند گیا تھا جب سے اینک　　دیکھا تھا اُدھر نہ مڑ کے اب تک
سوچا کہ چلو ذرا خبر لیں　　ڈھارس اُس بیقرار کو دیں
آیا داخل ہوا مکاں میں　　ٹھہرا کچھ دیر سائباں میں
پھرتا در اندرونی آکر　　دستک دی در کو کھٹکھٹا کر
پایا نہ جواب کچھ تو آخر　　کھولا دروازہ آیا اندر
لیکن اپنی دُکھوں کی ماری　　کھائے ہوئے دل پہ زخم کاری
لختِ دل خاک میں چھپا کے　　بیٹھی تھی جہاں سے منہ پھرا کے
خوش کیا ہوتی کہ کون آیا　　دیکھا جو فلپ کو دل بھر آیا
رونے لگی ہو کے رُخ بدیوار　　تر ہو گئے آنسوؤں سے رخسار
یہ دیکھ کے کی فلپ نے منت　　کہنے لگا از رہِ سماجت
آیا ہوں میں آج لے کے آنی　　تم سے اُمید مہربانی

بولی وہ "کرے گی مہربانی" کیا، خود ہے جو تنگ زندگانی
سُنکر یہ جھیپ سا گیا وہ لیکن مجبور دل سے تھا وہ
تھی گرچہ خرد خجالت آہنگ شرم اور کرم میں چھڑ گئی جنگ
ناخواستہ آ کے پاس بیٹھا ناخواندہ کیا در سُخن وا
گویا ہوا اس طرح کہ "اپنی دو باتیں ہیں صرف مجھ کو کرنی"
تم سے یہی التجا ہے میری اینک کی جو عین آرزو تھی
(موقوف نہیں کچھ آج ہی پر) تم سے میں نے کہا ہے اکثر
ہم دونوں میں بہترین تھا جو تم نے کیا انتخاب اُسکو
جس امر پہ اُس نے دل لگایا ہاتھ اُس کا وہیں مدد کو آیا
چاہا کرنا جہاں کوئی کام پہنچا دیا اُس کو تا بہ انجام
کیا باعث تھی اب گیا جو گھر سے جھجکا نہ مصائبِ سفر سے
کیا بات تھی چھوڑ کے جو گھر بار پردیس کی لی ہے راہِ دشوار
منظور نہ تھا کچھ اُس کو حاشا دنیا کا دیکھنا تماشا
زحمت اُس نے جو کی گوارا منشا اُس کا یہی تھا سارا
بچوں میں کوئی کسر نہ رہ جائے اچھی تعلیم ان کو دلوائے
سوچو تو کہ گھر جب آئیگا وہ اس حال میں ان کو پائیگا وہ
ایسی آوارگی کی حالت یہ خودسری اور یہ شرارت
یہ صبح امید عہد طفلی دیکھے گا رائگاں جب انکی
دل میں اپنے وہ کیا کہے گا کیا کچھ نہ ملال و غم سہے گا
ازبسکہ ہے میرا دوست اینک لایا مجھے یہ خیال یاں تک
انکار ہے کیا تمہیں کچھ اس سے کیا ہم نہیں دوست بچپنے کے

بس میری یہ التجا ہے تم سے ۔۔۔ بچوں کو کرو مرے حوالے
مکتب میں ان کو بھیجدوں گا ۔۔۔ ممنون بہت تمھارا ہوں گا
تم کو ہے قسم انہیں کے سر کی ۔۔۔ کچھ عذر کرو نہ اسمیں اپنی
ہے تم کو اگر خیال کچھ اور ۔۔۔ ہے اس کے لئے بھی اک جدا طور
تعلیم میں ان کی خرچ جو ہو ۔۔۔ قرض حسنہ تم اس کو سمجھو
اینک واپس جب آئے گھر کو ۔۔۔ نکلے جو حساب سے وہ دیدو

* * * *

یہ سن کے ہوئی خجل وہ ناچار ۔۔۔ بولی منہ کر کے سوئے دیوار
کیونکر کردں تم سے چار آنکھیں ۔۔۔ اُٹھتی نہیں شرمسار آنکھیں
ملتی نہیں میرے دل کی کچھ تھاہ ۔۔۔ میں کیسی ہوں بدنصیب اللہ
داخل ہوئے تم جو گھر کے اندر ۔۔۔ میں گڑ گئی بار غم سے یکسر
اور اب یہ کلام مہربانی ۔۔۔ مجھ کو کرتے ہیں پانی پانی
لیکن زندہ ابھی ہے اینک ۔۔۔ اسمیں نہیں دل کو میرے کچھ شک
کردے گا وہ قرض کی ادائی ۔۔۔ دے دیگا تمہاری پائی پائی
البتہ یہ بار لطف واحساں ۔۔۔ اترے سر سے نہیں یہ امکاں

* * * * *

یہ سُنکے ہوا وہ شاد و مسرور ۔۔۔ بولا کیا ہے تمہیں یہ منظور؟
خاموش وہ بخت کی ستائی ۔۔۔ اٹھی اُس کے قریب آئی
آنسو آنکھوں میں ڈبڈبائے ۔۔۔ اُس کے رُخ پر نظر جمائے
تکتی رہی تھوڑی دیر صورت ۔۔۔ پھر دے کے دعائے خیر و برکت
اور ہاتھ میں اُسکا ہاتھ لے کر ۔۔۔ آہستہ سے لکان دے کر

چھوٹا سا جو گھر میں اک چمن تھا | لے آئی فلپ کو ساتھ اُس جا
طے ہو چکے سارے جب مراتب | پلٹا خوش خوش وہ گھر کی جانب

* * * * * *

آخر بھائی بہن کو لے کے | بھیجا اسکول ہیں فلپ نے
درکار کتابیں جس قدر تھیں | اُن کی خاطر وہ سب منگا دیں
سمجھا ہر ایک امر میں وہ | فرزندوں کی مثال اُن کو
فرض اپنا سمجھ کے ان کا ہر کام | دل سے کرتا رہا سرانجام
پھر بھی اندیشۂ شماتت | دیتا تھا نہ اس کو یہ اجازت
گھر کو اُنکی کے روز خود جائے | جو آرزوئے دلی تھی بر آئے
اپنی کا خیال دوستداری | تھا باعثِ ضبطِ بیقراری
بدنامی کا جو اُس کی ڈر تھا | اُس راہ سے بھی تھا کم گزرتا
ہاں لڑکوں کے ہاتھ سے ہمیشہ | تھا بھیجتا اک نہ ایک تحفہ
سبزی ترکاری اور میوے | پیدا اُس کے یہاں جو ہوتے
کر کے کبھی عمدگی کا حیلہ | خیرات کا جس میں ہو نہ شبہہ
اپنی گرنی سے بھیجتا تھا | اعلیٰ درجے کا صاف آٹا

(باقیدارد)

ترانۂ عشرت

از جناب خواجہ عبد الرؤف صاحب عشرت لکھنوی

رنگ دیکھے ساقیٔ گلفام کے | مستحق کیا ہم نہ تھے اک جام کے
اک لہو کی بوند تک دل میں نہیں | ہیں یہ جوہر تیغ خوں آشام کے

صورت حرف غلط ہے کائنات　　خاک کے پتلے ہیں گویا نام کے
صبح سے گو وا در میخانہ ہے　　منتظر ہم ہیں صلائے عام کے
دشمن جمعیت دل ہے جہاں　　ڈھونڈیے پہلو کوئی آرام کے
ناتواں یہ ہوں لگائی مہر جب　　حرف تک اٹھے نہ میرے نام کے
اور اب مہمان ہوں کچھ دیر کا　　تم بھی آ بیٹھو کلیجہ تھام کے
روح رخصت ہو گی اکدن جسم سے　　ٹوٹنے والے ہیں پھندے دام کے
رات بھر اب تو پلک لگتی نہیں　　یا ہمیں تھے سونے والے شام کے
توڑ کر توبہ جو پی زاہد نے مے　　ٹکڑے رندوں میں بٹے اس جام کے
ان کے آتے ہی قیامت ہو گئی　　دل کہاں قابو میں خاص و عام کے
واقعات دل نہ ہو نگے بے نقاب　　ہم بھی اے عشرت ہیں اپنے نام کے

غزل

از جناب سید غلام محی الدین صاحب شمشاد بی۔ اے۔ ایل ایل بی۔

بات اس نے رکھ ہی لی عدو کی　　الجھی ہوئی مجھ سے گفتگو کی
اس بت کا کہیں پتہ نہ پایا　　گو دیر و حرم میں جستجو کی
بدبختی کی ہے انتہا کچھ؟　　پوری نہ ہوئی جو آرزو کی
لائی نہ صبا مشام جاں تک　　نکہت تری زلف مشکبو کی
ساقی کی نگاہ مست بس ہے　　حاجت نہیں ساغر و سبو کی
افسوس وہی ہوا نہ اپنا　　جس کے لئے خاک آبرو کی
خنجر بکف آئیں بھی کہیں وہ　　مشکل آسان ہو گلو کی
شمشاد کے رو کنے سے رک گئی　　کچھ کھیل تھی چوٹ روبرو کی

فہرست مضامین

جلد (۱) — بابتہ ماہ دسمبر ۱۹۲۳ء — نمبر (۶)

بزمِ لسانُ الملک

گیتانجلی۔ یہ بنگالہ کے مشہور اور ہندوستان کے مایۂ فخر شاعر سر رابندرا ناتھ ٹیگور کی اس نام کی نظم کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ٹیگور کی وہ معرکتہ الآرا نظم ہے جن پر اُن کو یورپ کا سب سے بڑا ادبی انعام نوبل پرائز ملا تھا۔ اصل نظم بنگالی زبان میں ہے جس کا ترجمہ خود مصنف نے انگریزی میں کیا ہے اور اُس کو ہمارے قدیم کرمفرما رائے بجیا ناتھ صاحب ایم اے ایل ایل بی نے اردو کا لباس پہنایا ہے۔ ٹیگور کی شاعری ہماری تعریف سے مستغنی ہے۔ ترجمہ کی نسبت اس قدر کہنا کافی ہے کہ اُس کی زبان نہایت سلیس و بامحاورہ ہے اور اس کے پڑھنے سے یہ پایا جاتا ہے کہ مترجم نے شاعر کے خیالات کو بجنسہٖ ادا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے؛

رُوحانی تنبیہ۔ یہ مختصر رسالہ مولوی سید مظہر الحسن صاحب بلگرامی کی تصنیف سے ہے جس میں اصلاح نفس اور پابندی نماز کی ہدایت کی گئی ہے ضرورت ہے کہ اس طرح کے چھوٹے چھوٹے رسالے جن سے مذہب واخلاق کی تعلیم حاصل ہوتی ہو مسلمان بچوں اور نوجوانوں کے لئے تصنیف کئے جائیں ہم مصنف کو اُن کی کامیاب کوشش پر مبارکباد دیتے ہیں

الشہید۔ یہ ماہوار اردو رسالہ آگرہ سے زیر ادارت مولوی سید حسن عباس صاحب موسوی الکنتوری تقریباً ۲۲×۱۸ کی تقطیع پر زیر سرپرستی مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ شایع ہوتا ہے شروع میں مولانا مدظلہ کے فتاویٰ ہوتے ہیں باقی مضامین بھی خالص مذہبی ہیں قیمت سالانہ (مے) لکھائی چھپائی دیدہ زیب۔

نگہ را زیں ورق روشن سواد جلوہ خوانی کن

لسان الملک

نمبر (۶)	بابتہ ماہ ڈسمبر ۱۹۲۳ء	جلد (۱)

شیخ فریدالدین عطار

ابی حامد محمد بن ابراہیم بن مصطفے بن شعبان النیشاپوری

نوشتہ جناب حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ایم۔ آر۔ اے۔ ایس

عطار روح بود سنائی دو چشم او
ما از پس سنائی و عطار آمدیم

شیخ فریدالدین عطار فارسی کے نامی گرامی شاعر اور مشہور و معروف عارف گزرے ہیں ان کا تذکرہ ابھی تک کسی ایسی کتاب میں نہیں ملا جو لباب الالباب سے قدیم ہے لیکن افسوس ہے کہ محمد عوفی نے اس کتاب میں شیخ کا جو ترجمہ لکھا ہے اس سے کچھ بھی مفید معلومات حاصل نہیں ہوتے ہیں اس نے صرف چند سطر لکھے ہیں جن میں تکلف و تصنع پر اکتفا کیا ہے اس کے بعد چند اشعار نقل کر دیئے ہیں[1] تاہم عوفی نے شیخ کا

[1] لباب الالباب طبع لیڈن جلد (۲) صفحہ (۳۳۷)

ترجمہ بارہویں باب میں لکھا ہے اس باب میں اُن شعرا کے حالات ہیں جو عہد سنجری کے بعد گذرے ہیں اس بنا پر معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عطار نے سلطان سنجر[۱] کی وفات کے بعد شہرت حاصل کی ہے۔ اس کی تائید اس امر سے بھی ہوتی ہے کہ شیخ نے اپنی مثنویات اکثر مقامات پر سنجر کا ذکر کیا ہے اور اس کو اس طرح تعبیر کرتے ہیں جس طرح کہ متوفی اشخاص تعبیر کیے جاتے ہیں۔ عوفی کے سیاق تعبیر سے استنباط ہوتا ہے کہ شیخ عطار لباب الالباب کی تالیف کے وقت زندہ تھے۔ کتاب مذکور ۶۱۷ھ کے حدود میں تالیف ہوئی ہے[۲]۔ جس کی وجہ سے یقین ہوتا ہے کہ شیخ نے ۶۱۷ھ کے بعد وفات پائی ہے۔

لباب الالباب کے بعد سب سے قدیم کتاب جس میں شیخ عطار کا ذکر آیا ہے۔

---

[۱] ابوالحرث معزالدین سنجر۔ خاندان سلاجقہ کا آٹھواں فرمانروا ہے۔ ۵۱۱ھ سے ۵۵۲ھ تک تقریباً اکتالیس سال ایران میں برسر حکومت رہا۔ بڑا فیاض اور علم دوست بادشاہ گزرا ہے اس کے دور میں فارسی شاعری معراج شباب پر پہنچ گئی تھی۔ اس عہد کے بڑے بڑے شاعر حکیم انوری، حکیم سوزنی۔ عبدالواسع جبلی۔ ادیب صابر۔ رشید وطواط۔ فرید کاتب۔ وغیرہ اسکے دربار میں جمع ہو گئے تھے امیر معزی کو اس نے ملک الشعرا کا خطاب دے رکھا تھا۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں اس کے علمی مشاغل کا مفصل حال لکھا ہے

[۲] لباب الالباب میں مصنف نے تاریخ تالیف کا ذکر نہیں کیا ہے لیکن بہت سے قرائن ایسے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب ۶۱۸ھ کے حدود میں تالیف ہوئی ہے چنانچہ اس کتاب کی پہلی جلد کے صفحہ ۴۴ میں جس کو پروفیسر ایڈورڈ براؤن نے لیڈن میں چھپوایا ہے۔ علاءالدین محمد خوارزم شاہ کے نام کے ساتھ "اعلی اللہ شانہ" لکھا ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف کتاب کے وقت محمد خوارزم شاہ زندہ تھا محمد خوارزم شاہ نے ۶۱۷ھ میں انتقال کیا ہے (حبیب السیر جلد دوم جزو چہارم صفحہ ۱۷۷۔ تاریخ ابوالفدا طبع قسطنطنیہ جلد سوم صفحہ ۱۲۷) اسی جلد کے صفحہ ۱۵ میں مصنف نے دو جگہ ۶۱۷ھ کا ذکر کیا ہے

پس یہ تاریخ اس بات کی بین دلیل ہے کہ یہ کتاب وفات محمد خوارزم شاہ سے کچھ عرصہ پہلے ۶۱۸ھ میں تالیف ہوئی ہے

حمد اللہ مستوفی کی تاریخ گزیدہ ہے۔ یہ کتاب ۷۳۰ھ میں لباب الالباب کے قریباً ایک سو سال بعد تالیف ہوئی ہے اور اسمیں شیخ کا ترجمہ حسب ذیل الفاظ میں لکھا ہے۔

عطار و ہو فرید الدین محمد نیشا پوری سخنان شور انگیز دارد۔ اشعار او بسیار است۔ تذکرۃ الاولیا و منطق الطیر از سخنان اوست وغیرہ۔

تاریخ گزیدہ کے بعد مولانا عبد الرحمٰن جامی نے نفحات الانس میں شیخ کے ترجمے کو کسی قدر تفصیل سے لکھا ہے۔ اور اُس میں بعض افسانہ آمیز حکایات بھی درج کی ہیں[۱] نفحات کے بعد تراجم میں جس قدر کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ مثلاً تذکرہ دولت شاہ۔ ہفت اقلیم۔ امین احمد رازی، مجالس المومنین۔ قاضی نور اللہ شوستری۔ سفینۃ الاولیا۔ داراشکوہ۔ تذکرہ تقی الدین کاشی۔ ریاض العارفین۔ رضا قلی خاں وغیرہ۔ ان میں سے اکثر کتابوں میں شیخ کا ترجمہ حرف بحرف نفحات سے منقول ہے۔ بعض دوسری کتابوں میں چند حالات نفحات سے زیادہ ملتے ہیں لیکن وہ بھی قصص و حکایات کی قبیل سے ہیں جس کی وجہ سے اُن پر کسی قسم کا اعتماد نہیں ہو سکتا ہے اور اسی لئے ان کا اعادہ کرنا بے فائدہ ہے۔ اگر ناظرین اُنہیں دیکھنا چاہیں تو اصل کتابوں کی طرف رجوع ہوں۔

شیخ نے اپنے بعض حالات خود اپنی تصنیفات میں بیان کئے ہیں گو کہ وہ نہایت مختصر اور تھوڑے سے ہیں لیکن سب سے بہتر اور قابل وثوق ہیں اور انہیں پر ہم نے اپنے مضمون کی بنیاد قائم کی ہے۔

۲

دولت شاہ نے لکھا ہے کہ نیشا پور کے قریب ایک قریہ کدگن نامی

---

[۱] ۔ نفحات الانس طبع کلکتہ صفحہ ۶۹۷ ۔ طبع بمبئی صفحہ ۲۹۱۔

واقع ہے[1]۔ اس جگہ ۲۰ شعبان ۵۱۳ھ کو شیخ عطار پیدا ہوئے ہیں۔ لیکن خود شیخ کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہر نیشاپور میں ان کی ولادت ہوئی۔ چنانچہ خود لسان الغیب میں کہتے ہیں:

شہر شاپورم تولدگاہ بود ۔۔۔ در حرم گاہ رضا امام راہ بود

دولت شاہ کا بیان ہے کہ شیخ شادیاخ میں انتیس (۲۹) سال اور نیشاپور میں پچاسی[85] سال مقیم رہے ہیں۔ لیکن شیخ کی تصنیفات سے صرف اس قدر ثابت ہوتا ہے کہ زمانۂ طفلی میں تیرہ سال تک امام علی موسیٰ رضا علیہ السلام کے مشہد مقدس میں ان کی سکونت رہی۔ مظہر العجائب میں کہتے ہیں۔

شہ من در خراساں چوں دفیں شد ۔۔۔ ہمہ ملک خراساں انگبیں شد

بوقت کودکی من سیزدہ سال ۔۔۔ بمشہد بودہ ام خوش وقت و خوشحال

شیخ عطار طبابت کیا کرتے تھے ان کا دواخانہ بہت بڑا تھا جس میں ہر قسم کی ادویہ بنائی جاتی تھیں اور جمیع امراض کا معالجہ کیا جاتا تھا۔ علاج کی غرض سے روزانہ پانسو آدمی تک آیا کرتے تھے۔ شیخ عطار مشہور ہونے کی بظاہر یہی

---

[1]۔ حاجی خلیفہ نے کشف الظنون میں ہر جگہ شیخ کو ہمدانی لکھا ہے لیکن اُن کی غلطی ہے۔ ریو اور ایتھے نے اپنے فہرستوں میں شادیاخ کو شیخ کا مقام تولد بتایا ہے۔ لیکن یہ بھی اونکی غلطی ہے کیونکہ شیخ ولادت کی مدت دراز میں بعد ۶۰۵ھ میں شادیاخ آباد ہوا ہے۔ حمد اللہ مستوفی جس نے اپنی کتاب نزہۃ القلوب ۷۴۰ھ میں لکھی ہے نیشاپور کا حال لکھتے ہوئے بیان کرتا ہے کہ "در سنہ خمس وستمائۃ ۶۰۵ھ آں شہر بزلزلہ خراب شد۔ ہم دراں حوالی شہری دیگر ساختند وشادیاخ خواندند۔ و دور بارش ششں ہزار و نہصد گام بود در ۶۷۹ھ تسع وسبعین وستمائۃ آں نیز بزلزلہ خراب شد۔ بگوشہ دیگر شہری دیگر ساختند کہ اکنوں ام البلاد خراسان است۔ نزہۃ القلوب طبع لیڈن صفحہ ۱۴۸۔ طبع بمبئی صفحہ ۱۸۵۔

وجہ معلوم ہوتی ہے موجودہ زمانے میں دواساز یا دوافروش کو عطار کہتے ہیں۔
لیکن پہلے زمانے میں دواسازی اور دوافروشی کے ساتھ عطاروں کو علاج
معالجہ بھی کرنا پڑتا تھا جیسا کہ آجکل بلاد یورپ میں "فارمسی" کے ساتھ طبابت بھی
لازمی قرار دی گئی ہے اور وہاں کے دوافروش معالجۂ امراض بھی کیا کرتے ہیں
خسرو نامہ میں اپنے ایک دوست کی زبانی لکھتے ہیں کہ۔

بمن گفت ای معنی عالم افروز	چنیں مشغول طب گشتی شب و روز
طب از بہر تن ہر ناتوان است	ولیکن شعر و حکمت قوت جان است
سہ سال است این زبان تا لب ببستی	بزہد خشک در کنجی نشستی
اگرچہ طب بہ قانون است امّا	اشارات است در شعر معما

اسرار نامہ میں لکھتے ہیں:۔

بہ شہر ما بخیلے گشت بیمار	کہ نقدش بود صد رہ زر دینار
ز من آزاد مردی کرد درخواست	کہ باید کرد او را شربتے راست

رضا قلی خاں نے ریاض العارفین میں لکھا ہے کہ شیخ عطار اپنے آباؤ اجداد
کی طرح بڑے مالدار اور صاحب ثروت آدمی سمجھے جاتے تھے نیشاپور کے
تمام دواخانوں پر ان کی نگرانی رہا کرتی تھی۔ شیخ مجدالدین بغدادی سے انہوں
نے علم طب حاصل کیا تھا۔ لیکن صاحب ریاض العارفین نے ان واقعات کی
کوئی سند نہیں بیان کی ہے اور نہ شیخ کی تصنیفات سے ان کا استنباط ہوتا ہے
اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ شیخ عطار ایک روز دواخانے میں بیٹھے
ہوئے تھے کہ ایک فقیر نے آکر دواخانہ کے ساز و سامان کو دیکھنا شروع کیا
شیخ کو یہ بات ناگوار گزری اور انہوں نے فقیر سے کہا کہ کیوں بے فائدہ
وقت ضایع کرتے ہو اپنا راستہ لو۔ فقیر نے کشکول سر کے نیچے رکھ لیا اور

وہیں زمین پر لیٹ گیا۔ شیخ نے اٹھ کر دیکھا تو کام تمام ہو چکا تھا اس واقعہ سے سخت متاثر ہوئے۔ اور اسی وقت دواخانے کو لٹوا دیا اور اپنے پیشہ کو چھوڑ کر فقیر ہو گئے اور شیخ رکن الدین آکاف کے پاس جا کر اُن کے ہاتھ پر توبہ کی۔

لیکن افسوس ہے کہ ان تذکرہ نویسوں نے تصنیفات کو نہیں پڑھا۔ ورنہ اُنہیں ثابت ہوتا کہ شیخ عطار زہد و سلوک میں مشغول ہونے کے بعد بھی اپنے پیشہ کو انجام دیا کرتے تھے اور اسی حالت میں اسرار و عرفان کے حقایق پر متعدد کتابیں لکھی ہیں مصیبت نامہ اور الٰہی نامہ جو اُن کی قابل قدر تصنیفات ہیں اسی زمانے میں لکھی گئی ہیں۔ چنانچہ خسرو نامے میں لکھتے ہیں۔

مصیبت نامہ کاندوہ جہان است | الٰہی نامہ کا سرار عیان است
بدارو خانہ کردم ہر دو آغاز | چگویم زود رستم زین و آں باز

شیخ عطار کی طبیعت بچپن سے زہد و سلوک کی طرف راغب تھی ان کے والد مشہور مجذوب قطب الدین حیدر[۱] کے مرید تھے۔ شیخ نے ابتدا میں انہیں سے فیض حاصل کیا تھا اور ایک کتاب حیدر نامہ ان کے نام پر تصنیف کی تھی[۲]۔ اس کے بعد امام مجد الدین بغدادی[۳] کے مرید ہوئے[۴]۔ شیخ عطار نے تذکرۃ الاولیا کے

---

[۱] قطب الدین حیدر امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں خراسان کے شہر تون میں پیدا ہوئے۔ تبریز میں رہا کرتے تھے مشہور فرقہ حیدریہ انہیں سے منسوب ہے ۶۱۸ھ میں ان کا انتقال ہوا۔ آثار العجم صفحہ ۳۰۔ [۲] ہفت اقلیم۔

[۳] امام مجد الدین شرف بن المؤید بن ابی الفتح البغدادی مرید شیخ نجم الدین کبریٰ ان کے آبا و اجداد بغداد کے رہنے والے تھے خوارزم شاہ نے ایک مرتبہ خلیفہ بغداد سے طبیب کی خواہش کی تو خلیفہ نے انکے والد کو بغداد سے خوارزم میں روانہ کیا شیخ مجد الدین نے خوارزم میں نشو و نما پائی ہے اسی وجہ سے مجد الدین خوارزمی بھی کہلاتے ہیں۔ شیخ مجد الدین طبابت کیا کرتے تھے جس کی وجہ سے محمد خوارزم شاہ کے دربار میں اُن کو خوب تقرب حاصل تھا سلطان محمد کی والدہ ترکان خاتون شیخ مجد الدین کی معتقد تھی اور اُن کے مجالس وعظ و تذکیر میں اکثر اوقات آیا کرتی تھی سلطان محمد ایک دفعہ نشہ کی بدمست ہو گیا تھا بعض لوگوں نے کہا کہ ترکان خاتون نے شیخ مجد الدین سے نکاح کر لیا ہے اسکے سنتے ہی سلطان محمد کو غصہ آگیا ہوا اور اسی وقت شیخ کو دریائے جیحون میں غرق کرا دیا۔ نفحات الانس صفحہ ۲۷۰۔ [۴] دولت شاہ صفحہ ۸۵۔

مقدمے میں امام مجدالدین کا ذکر کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کو ان کے ساتھ خاص ارادت تھی۔ اور اکثر اوقات ان کے یہاں آکر فیض حاصل کیا کرتے تھے۔

لسان الغیب سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ عطار عرصہ دراز تک مشائخین اور اولیاء کرام کی تلاش و تجسس میں مصروف رہے۔ اور خاص اسی غرض کے لئے رے، کوفہ، مصر، دمشق، مکہ، ہندوستان، خراسان وغیرہ کی سیاحت کی۔ اخیر میں واپس آکر نیشاپور میں سکونت پذیر ہوئے ؎

چار اقلیم جہان گردیدہ ام ۔۔۔ دامن ملت اگر بوسیدہ ام
مرقد اثنا عشر رفتم بچشم ۔۔۔ میزنم بر دشمنان سنگ یشم
اولیا را ظاہر و باطن ہمہ ۔۔۔ دیدہ چو موسیٰ بیان این ہمہ
درحرم گہ چند گشتم معتکف ۔۔۔ تا یقینم گشت سرّ من عرف
سر برآوردہ بہ محبوبی عشق ۔۔۔ سیر کردہ مکہ و مصر و دمشق
کوفہ و رے تا خراسان گشتہ ام ۔۔۔ سیحون و جیحون را بہ بریدہ ام
ملک ہندوستان و ترکستان زمیں ۔۔۔ رفتہ چوں اہل ختا از سوی چیں
عاقبت کردم بہ نیشاپور جائے ۔۔۔ او فتا داز من بعالم ایں صدائے
در نشاپورم بہ کنج خلوتے ۔۔۔ با خدای خویش کردہ وحدتے

شیخ عطار نے اشتر نامہ میں تحریر کیا ہے کہ ایک مرتبہ انھوں نے حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دیکھا کہ آپ نے اپنا آب دہن شیخ کے دہن میں ڈال دیا جس کے اثر سے شیخ زہد و سلوک کے معراج کمال پر پہنچ گئے ؎

یک شبے در خواب دیدم روئے او ۔۔۔ عاشق و بیدل دویدم سوئے او

دستِ من بگرفت آں شاہ جہاں　　　　در دہانِ من فگند آبِ دہاں

گفت اے عطار بر اسرارِ من　　　　لائق دزد دیدنِ انوارِ من

انچہ حق در جسم وجانت دادہ است　　　　گنج مخفی در دولت بنہادہ است

ما عیاں کردیم ایں گنجِ ترا　　　　دست بروی دادم ایں رنج ترا

ایں بگفت وروئی خود پنہاں نمود　　　　لب ازاں روئی دلم باجاں نمود

ایں ہمہ من زاں محمدؐ یافتم　　　　زاں کہ سوئی قرب رو بشتافتم

شیخ کا دل اخیر عمر میں دنیا سے اچاٹ ہو گیا تھا اور انھوں نے علایق دنیوی کو ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی تھی چنانچہ ایک غزل میں کہتے ہیں کہ

مرا گویند کو عزلت گرفتہ است　　　　دریں عزلت خدارا باد دارم

سرکس می ندارم چوں کنم من　　　　مگر من طبع تو بیمار دارم

۳

شیخ عطار کی تاریخ وفات میں سخت اختلاف ہے ۔ مورخین نے جو تاریخیں تحریر کی ہیں انھیں ہم ذیل میں درج کرتے ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی تاریخ قابل اعتماد نہیں ۔

سنہ ۵۸۹ھ ۔ دولت شاہ ۔ قاضی نور اللہ شوشتری

سنہ ۶۱۹ھ ۔ دولت شاہ ۔ حاجی خلیفہ ۔ تقی کاشی ۔ امین رازی ۔

سنہ ۶۲۷ھ ۔ مولانا جامی در نفحات ۔ دولت شاہ ۔ حاجی خلیفہ ۔ امین رازی قاضی نور اللہ ۔ محمد داراشکوہ در سفینۃ الاولیاء ۔ تقی کاشی ۔ رضا قلی خاں در ریاض العارفین

پہلی دونوں تاریخیں یقیناً غلط ہیں ۔ کیونکہ شیخ کی تصنیفات سے جو زمانہ تعین ہوتا ہے وہ اس کے سراسر خلاف ہے ۔ شیخ نے مظہر العجائب میں شیخ نجم الدین کبریٰ کا ذکر کیا ہے ۔ انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ تالیف کتاب کے وقت

شیخ نجم الدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ کتاب مذکور کے ابیات یہ ہیں۔

این چنیں گفتہ است نجم الدّین ما　　　آنکہ بودہ در جہاں از اولیاء

آں ولیّ عصر و سلطان جہاں　　　منبع احسان و نور عارفاں

یہ امر بدیہی ہے کہ شیخ نجم الدین اگر زندہ ہوتے تو شیخ عطار اُنہیں لفظ (بودہ) سے تعبیر نہیں کرتے۔ تمام مورخین کا اتفاق ہے کہ ۶۱۸ھ میں شیخ نجم الدین کا انتقال ہوا ہے[1] اس اعتبار سے یقین ہوتا ہے کہ شیخ عطار ۶۱۸ھ کے بعد بھی زندہ تھے۔

تمام تذکروں میں تحریر ہے کہ شیخ عطار نے چنگیز خاں کے عہد میں شہادت پائی ہے لشکر مغول نے جب نیشاپور میں غارتگری شروع کی تو ایک سپاہی نے شیخ کو گرفتار کر لیا۔ اور قتل عام میں قتل کر ڈالا۔ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ ۱۲ صفر ۶۱۸ھ سے مغلوں نے نیشاپور میں غارتگری شروع ۱۵ صفر کو شنبہ کے روز قتل عام کیا۔[2] اس بنا پر ۱۵ صفر ۶۱۸ھ شیخ کی تاریخ شہادت قرار پاتی ہے لیکن کئی وجوہات سے نیشاپور کے قتل عام میں شیخ کا شہید ہونا مشکوک و مشتبہ معلوم ہوتا ہے۔

۱۰ جمادی الاوّل ۶۱۸ھ شیخ نجم الدین کبریٰ کی تاریخ انتقال ہے[3] اس

[3] سفینۃ الاولیاء صفحہ (۱۰۴) بعض تذکروں میں جمادی الاول کی بجائے شعبان، رمضان وغیرہ لکھا ہے لیکن تمام تذکرہ نویس اس پر متفق ہیں کہ تاتاریوں نے جب خوارزم کو تاخت و تاراج کیا تو اسی ہنگامے میں شیخ نجم الدین کبریٰ شہید ہوئے ہیں۔ خوارزم کا ہنگامہ کس تاریخ واقع ہوا اس کا تعین کرنا مشکل ہے تاہم وزیر علاء الدین جوینی نے تاریخ جہانکشائی میں چنگیز خانی فتوحات کے جو حالات لکھتے ہیں اُن سے ثابت ہے کہ ہنگامۂ نیشاپور کے بعد اس کا وقوع ہوا ہے چنگیز خاں نے ربیع الاول ۶۱۸ھ کو سمرقند فتح کیا (تاریخ جہانکشائی

[1] امام یا… قلمی کتبخ… فن تاریخ… جلد دوم… نفحات… طبع بمبئی… حبیب… دوم جزو…
[2] جہانکشا… جوینی… جلد اول… حبیب… ج… جزو… صفحہ…

حساب سے واقعہ نیشاپور کے تقریباً تین ماہ بعد شیخ نجم الدین نے وفات پائی ہے اور یہ امر ثابت ہوگیا ہے کہ شیخ عطار شیخ نجم الدین کی وفات کے بعد زندہ موجود تھے اس لئے واقعۂ نیشاپور میں ان کا شہید ہونا کسی طرح سے صحیح نہیں ہو سکتا اس امر کی تائید تاریخ گزیدہ سے بھی ہوتا ہے۔ کتاب مذکور میں شیخ کا ترجمہ مندرج ہے لیکن اُس میں ان کے شہید ہونے کا کوئی اشارہ نہیں ہے۔

تمام تذکرہ نویس اس قول کو ترجیح دیتے ہیں کہ شیخ عطار نے ۶۲۷ھ میں انتقال کیا ہے حقیقت یہ کہ یہ تاریخ تمام تذکروں میں نفحات الانس سے نقل کی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مولانا جامی نے تاریخ وفات کے لکھنے میں نہایت احتیاط سے کام لیا ہے اور اسی سبب سے یہ تاریخ قابل اعتماد معلوم ہوتی ہے۔ لیکن یقین نہیں کیا جا سکتا ہے کہ حقیقت میں اسی سال شیخ نے وفات پائی ہے ہاں یہ بات نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ شیخ عطار ۶۱۸ھ کے بعد عرصہ تک زندہ رہے۔ اس کی تائید خود شیخ کی تصریحات سے ہوتی ہے شیخ نے

طبع لیڈن جلد (۱) صفحہ (۹۶) اس کے بعد چغتائی قاآں اور اوکتائی خاں کو مہم خوارزم پر روانہ کیا صفحہ (۹۷) اور خود نخشب ترمذ اور بلخ کی جانب متوجہ ہوا لشکر تاتار جب خوارزم میں پہنچا تو جلال الدین خوارزم شاہ نے ہزیمت اٹھائی اور بھاگ کر آب سند کی جانب روانہ ہوا۔ چنگیز خاں نے بلخ سے نکل کر اس کا تعاقب کیا اسی اثنا میں اوکتائی قاآں اور چغتائی قاآں بھی تسخیر خوارزم سے فارغ ہوکر چنگیز خاں کے پاس چلے آئے۔ یہ تمام واقعات ماہ رجب ۶۱۸ھ سے پہلے کے ہیں صفحہ (۱۰۶ و ۱۰۷) میں ان واقعات سے بخوبی استنباط ہوتا ہے کہ واقعہ خوارزم جس میں شیخ نجم الدین کبریٰ شہید ہوئے ہیں ۶۱۸ھ میں ربیع الاول کے بعد اور رجب سے پہلے واقع ہوا ہے۔ اس لئے جو تاریخ سفینۃ الاولیاء میں درج ہے وہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

مظہر العجائب کے بعد خسرو نامہ لکھا۔ پھر حج بیت اللہ کے لئے مکہ چلے گئے اور وہاں لسان الغیب لکھی۔[۵۱]

این لسان از پیش احمد گفتہ ام　　در مقام مکہ اش بنوشتہ ام

تین ضخیم ضخیم کتابوں کی تصنیف مکہ جیسے اور دور دراز مقام کا سفر معمولی بات نہیں ہے یقین ہوتا ہے کہ یہ واقعات کئی سال میں سرزد ہوئے ہوں گے۔

مولانا جامی نے لکھا ہے کہ شیخ عطار کی عمر ایک سو چودہ سال کی تھی۔ محمد داراشکوہ کا بیان ہے کہ آپ ایک سو اکیس سال زندہ[۵۲] تھے لیکن یہ امر یقینی ہے کہ شیخ نے (۷۰) سال سے زیادہ عمر پائی ہے چنانچہ دیوان میں خود کہتے ہیں

مرگ در آوردہ پیش دادی صد سالہ راہ　　عمر تو افگندہ شد بر سر ہفتاد و اند

شادیاخ کے باہر ایک محلہ میں جس کا نام بازرگاں ہے سلطان الپ ارسلان سلجوقی نے

۵۱۔ شیخ عطار نے شیخ نجم الدین کبریٰ کی وفات ۶۱۸ھ کے بعد مظہر العجائب لکھی ہے خسرو نامہ اور لسان الغیب میں مظہر العجائب کا ذکر آیا ہے جس کے سبب سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتابیں مظہر العجائب کے بعد تصنیف ہوئی ہیں۔

۵۲۔ یہ تعجب خیز امر ہے کہ اکثر مرتاض و عارفین نے بڑی بڑی اور طولانی عمریں پائی تھیں۔ جو عادات جاریہ سے خارج ہو جاتی ہیں۔ مثلاً ابو محمد جریری اور شیخ عبداللہ ہیتی کی عمر سو سال سے زیادہ تھی۔ ابوالحسین قرافی ایک سو دس سال۔ ابوالحسین علی بن زرین مردی۔ ابوبکر رقی۔ شیخ علی بن ہیتی۔ ہر ایک ایک سو بیس سال۔ ابو عبداللہ مغربی ایک سو بائیس سال ابوالحسین سیروانی ایک سو چوبیس سال قطب الدین حیدر اور حکیم ناصر خسرو ہر ایک ایک سو چالیس سال۔ اور رتن ہندی ایک ہزار چار سو سال زندہ تھے۔

ایک زاویہ تعمیر کرایا تھا۔ اُس میں شیخ عطار کا مزار ہے۔ امتداد زمانہ سے زاویہ اور احاطہ خراب وخستہ ہو گیا۔ تو امیر علی شیر وزیر نے اس عمارت کی مرمت کرادی اور مزار پر ایک خوشنما گنبد بنوایا۔[۱]

۴

شیخ عطار اوتنالیس سال تصنیف و تالیف میں مصروف رہے ہیں۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے اشعار کو ترتیب دیا اور صوفیائے کرام کے اقوال و اعمال جمع کیے چنانچہ لسان الغیب میں کہتے ہیں۔

دریغا سی و نہ سال تمامت　　　بکردم در معابندہ سلامت
ہمہ اوقات من در پیش مردان　　　برفت از دست گوہر وصفادان
ولیکن شکر گویم صد ہزارت　　　کہ دارم ملک اسرارم مدارت
زبہر عارفاں دارم کتب ہا　　　کہ گویندم دعا در صبح اعلےٰ
زبہر علم دارم صد کتب من　　　در او بنہادہ ام اسرار لب من

شیخ عطار نے تمام عمر کسی امیر یا بادشاہ کی مدح میں زباں آلودہ نہیں کی نہ ان کی تصنیفات میں کسی کی مدح وستائش پائی جاتی۔ خود شیخ نے لسان الغیب میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔

بعمر خویش مدح کس نہ گفتم　　　دُرے از بہر دنیا من نسفتم

شیخ عطار اپنی زندگی میں کثیر التصنیف اور پُر گو شاعر مشہور ہو گئے تھے چنانچہ خسرو نامے میں کہتے ہیں۔

کسی گو چو منی را عیب جوی است　　　ہمیں گوید کہ او بسیار گوی است

---

[۱] دولت شاہ صفحہ (۱۸۹) گنج دانش صفحہ (۵۲۲)

ولیکن چوں بسے دارم معانی　　بسے گویم تو مشنومی تو دانی

اکثر تذکرہ نویسوں نے لکھا ہے کہ شیخ کے ایک لاکھ اشعار ہیں۔ لیکن خود شیخ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دو لاکھ سے زیادہ اشعار اپنی یادگار چھوڑے ہیں۔ چنانچہ خسرونامہ میں اپنی تصنیفات کا ذکر کرکے اُن اشعار کی تعداد (۲۰۲۰۶۰) بتلائی ہے۔ شیخ نے خسرونامے کے بعد متعدد کتابیں تصنیف کی ہیں جن کے ابیات مذکورۂ بالا شمار میں شامل نہیں ہیں اس اعتبار سے شیخ کے اشعار کم و بیش تین لاکھ ہیں۔ خسرونامے کے ابیات یہ ہیں۔

شمار بیت بیت این ہا بگویم　　بہ من در کشت معانی تخم ردیم
دو بیت و دو ہزار و شصت بیت است　　زیادہ تا یکے سیدان کہ قید است

۵

تذکرہ نویسوں نے شیخ کے تصنیفات کی تعداد بیان کرنے میں اختلاف کیا ہے لیکن زیادہ مشہور یہ ہے کہ شیخ کے رسائل نظم و نثر سورہائے قرآں کے برابر ایکسو چودہ ہیں۔ چنانچہ قاضی نور اللہ شوستری نے مجالس المومنین میں لکھا ہے۔

جہاں خریطہ کش داروی شفا عطار　　کہ نظم اوست شفا بخش عاشقاں حزیں
بقابل عدد سورۂ کلام نوشت　　سفینہائے عزیز و کتاب ہای حزیں

شیخ نے بعض مثنویات میں اپنی پہلی تصنیفات کا بھی ذکر کیا ہے۔ چنانچہ لسان الغیب میں بیس کتابوں کی تفصیل لکھی ہے۔ خسرونامے میں چالیس کتابیں مذکور ہیں۔

بداں خود را کہ سی و دہ کتب را　　نہادم بر طریق علم اسماء

غالباً اسی بنیاد پر امین رازی نے ہفت اقلیم میں لکھا ہے کہ
آوردہ اند کہ وے را چہل رسالہ نظم است از مثنوی وغیرہ۔

خسرو نامے میں ایک مقام پر تیرہ کتابوں کے نام لکھے ہیں۔ جن کی تفصیل یہ ہے۔ جواہر الذات۔ مظہر العجائب۔ وصیت نامہ۔ اسرار نامہ۔ الٰہی نامہ۔ مصیبت نامہ۔ اشتر نامہ۔ تذکرۃ الاولیاء۔ معراج نامہ۔ مختار نامہ۔ جواہر نامہ۔ شرح القلب۔ بہر حال جو کتابیں چھپ گئی ہیں یا مشرق و مغرب کے بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں۔ اُن کی تفصیل یہ ہے

۱ الٰہی نامہ	۲ اسرار نامہ	۳ اشتر نامہ	۴ بلبل نامہ
۵ بیسر نامہ	۶ پند نامہ	۷ تذکرۃ الاولیاء	۸ جواہر الذات
۹ حیدر نامہ	۱۰ خسرو نامہ	۱۱ خیاط نامہ	۱۲ دیوان
۱۳ شرح القلب	۱۴ کنز الحقایق	۱۵ لسان الغیب	۱۶ مصیبت نامہ
۱۷ منطق الطیر	۱۸ مختار نامہ	۱۹ مظہر العجائب	۲۰ منصور نامہ
۲۱ وصلت نامہ	۲۲ وصیت نامہ	۲۳ ہفت وادی	۲۴ ہیلاج نامہ

دولت شاہ کا بیان ہے کہ شیخ عطار نے تذکرۃ الاولیا کے علاوہ چند اور رسائل بھی نثر میں لکھے ہیں اور ان میں اخوان الصفا بہت مشہور ہے۔ امین رازی نے بھی ہفت اقلیم میں اس رسالہ کا ذکر کیا ہے اور اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رسالہ امین رازی کے زمانے میں موجود و متداول تھا چنانچہ ہفت اقلیم کی عبارت یہ ہے۔

از منثور آتش تذکرۃ الاولیاء و اخوان الصفا امروز متداول است۔

عمر خیام۔ مولانا روم۔ حافظ شیراز وغیرہ کی طرح غیروں کا بہت سا کلام شیخ عطار سے منسوب ہو گیا ہے اگر سچ پوچھیے تو اس بارے میں شیخ کی حالت عمر خیام اور مولانا روم وغیرہ سے کہیں زیادہ قابل افسوس ہے کیونکہ ان لوگوں سے چند رباعیات یا متفرق اشعار منسوب ہیں۔ برخلاف اس کے ایسی کئی کتابیں

شیخ کی تصنیفات سے بتائی جاتی ہیں جن کا شیخ کی تصنیف سے ہونا کسی طرح ثابت نہیں ہوتا ہے مثلاً مفتاح الفتوح۔ کنز الاسرار۔ یہ دو کتابیں کلیات شیخ کے اکثر نسخوں میں شامل ہیں۔ اور اسی بنیاد پر اسٹوارٹ۔ اسپرنگر۔ اور ایتھے نے اپنی فہرستوں میں ان کتابوں کو شیخ کی تصنیفات میں شمار کیا ہے۔ لیکن حقیقت میں یہ اُن کی غلطی ہے کیونکہ مفتاح الفتوح کی تاریخ تصنیف یہ ہے:-

بسال ششصد و ہشتاد و دو چار (۶۸۶) — شہور سال را بُد آخر کار
زذو الحجہ گذشتہ بُد دہ و پنج — کہ مدفوں کردم اندر دفتر این گنج

کنز الاسرار کے خاتمہ میں یہ تاریخ درج ہے۔

رساند نفع را بر خاص و عام ایں — کہ در ششصد و نود و نہ (۶۹۹) شد تمام ایں

تصنیفات شیخ کے ضمن میں کسی تذکرہ نویس نے ان کتابوں کا ذکر نہیں کیا ہے۔ سوا اس کے دونوں تاریخیں بھی اس بات کی قوی دلیل ہیں کہ یہ کتابیں شیخ کی تصنیفات سے نہیں ہیں۔ بلکہ ان کی وفات کے قریباً نصف صدی بعد تصنیف ہوئی ہیں۔ کنز الاسرار کے مصنف کا پتہ نہیں چلتا۔ لیکن مفتاح الفتوح کے متعلق تحقیق ہو گیا ہے۔ کہ وہ زنجانی کی لکھی ہوئی ہے اور مصنف مذکور نے دیباچے میں یہ بھی لکھا ہے۔

کہ من در عموم تالیفے جزایں نکردہ ام۔

۶

شیخ کے حالات حسب ذیل کتابوں میں مذکور ہیں۔

۱ **نفحات الانس**۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی — طبع بمبئی ۱۲۸۹ھ — صفحہ ۲۹۲۔
۲ **مجالس العشاق**۔ سلطان حسین بایقرا — " لکھنو — " ۹۹۔

۳۔ تذکرۃ الشعرا۔ دولت شاہ سمرقندی۔ طبع لیڈن۔ صفحہ ۱۸۷۔

۴۔ ہفت اقلیم۔ ابن احمد رازی۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ ورق ۲:۲۔

۵۔ مجالس المومنین۔ قاضی نور اللہ شوستری۔ طبع طہران۔ صفحہ ۲۹۶۔

۶۔ مراۃ الخیال۔ شیر خاں لودھی۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔ ورق ۲۲۔

۷۔ سفینۃ الاولیا۔ شہزادہ محمد دارا شکوہ۔ طبع لکھنو۔ سنہ ۱۹۰۰ء صفحہ ۱۷۸

۸۔ ریاض الاولیاء۔ بختاور خاں عالمگیری۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ ورق ۵۹

۹۔ ریاض الشعرا۔ علی قلی خاں والہ داغستانی۔ قلمی نسخہ کتب خانہ نواب عماد الملک بہادر جلد ۲ ورق ۲۲

۱۰۔ بہارستان سخن۔ صمصام الدولہ صاحب ماثر الامرا۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔ ورق ۲۶۔

۱۱۔ آتشکدہ۔ مرزا لطف علیخاں آذر۔ طبع بمبئی۔ سنہ ۱۲۹۹ھ صفحہ ۱۴۲

۱۲۔ تذکرہ حسینی۔ میر حسین علی دوست طبع لکھنو۔ سنہ ۱۸۷۵ء صفحہ ۹۷۔

۱۳۔ مفتاح التواریخ۔ طامس ولیم بیل۔ " " سنہ ۱۲۸۴ھ جلد ۲ صفحہ ۲۶۲

۱۴۔ خزینۃ ال‌صفیا۔ غلام سرور لاہوری۔ " " سنہ ۱۸۷۴ء صفحہ ۷۶

۱۵۔ آثار عجم۔ مرزا محمد نصیر فرصت طبع بمبئی سنہ ۱۳۱۲ھ " ۷۱

۱۶۔ اویماق مغول۔ مرزا عبدالقادر بہردی۔ " امرتسر سنہ ۱۹۰۲ء " ۱۴۴

۱۷۔ گنج دانش۔ حکیم محمد تقی طہرانی " طہران۔ سنہ ۱۳۰۵ھ " ۵۲۲

۱۸۔ شعر العجم۔ مولانا شبلی نعمانی۔ " علیگڈھ سنہ ۱۹۱۱ء جلد ۲ صفحہ ۸

۱۹۔ بیوگرافیکل نوٹس آف پرشین پوئیٹس۔ سر گور سلے طبع لندن صفحہ ۲۳۶

۲۰۔ لٹریری ہسٹری آف پرشیا۔ پروفیسر ایڈورڈ براؤن۔ طبع کیمبرج۔ جلد ۲ صفحہ ۵۸۱

۲۱۔ گشغختی دی پرشین لٹریچر۔ پروفیسر پال ہارن۔ طبع لیپزک صفحہ ۱۵۸

۲۲۔ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام۔ ڈاکٹر ہوٹسما طبع لیڈن۔ جلد ۱ صفحہ ۵۱۴

ضمیمۂ اول
تصنیفاتِ شیخ عطّار

رموز اختصارات

اسپرنگر۔ فہرست کتب خانہ شاہان اودھ۔ کتب مشرقیہ۔
اے تھے۔ فہرست کتب خانہ انڈیا آفس لندن۔ کتب فارسی۔
برون۔ فہرست کتب خانہ کیمبرج یونیورسٹی " "
بوڈلین۔ فہرست کتب خانہ بوڈلین واقع اکسفورڈ یونیورسٹی کتب فارسی
حاجی خلیفہ کشف الظنون عن اسامی الکتب والفنون۔
ڈوزی۔ فہرست کتب خانہ للڈ ونوٹباویہ۔ کتب مشرقیہ
ریو۔ فہرست کتب خانہ برٹش میوزیم لندن۔ کتب فارسی۔
فلوگل۔ فہرست کتب خانہ سلطنت آسٹریا۔ کتب مشرقیہ

(۱) اسرار نامہ

آغاز　بنام آنکہ جاں را نور دیں داد　خرد را در خدا دانی یقیں وارد

اس میں ۲۵ مقالات ہیں ۱۲۹۸ھ میں بمقام طہران چھپا ہے۔
حاجی خلیفہ جلد ا صفحہ ۲۸۲ - نمبر ۶۲۷ - اسپرنگر صفحہ ۳۵۸ - ریو جلد ا صفحہ ۵۷۶ - بوڈلین نمبر ۶۲۲/۱۸ اے تھے نمبر ۱۰۳۱/۱۲

(۲) اشتر نامہ

آغاز　ابتداء بر نام حیٔ لایزال۔　صانع اشیاء و ابداع جلال

مندرجہ ذیل بیت میں اس کا نام مذکور ہے۔

مرا گر راز تنگ و نام عامہ را ۔۔۔ گوشش کن تو رمز اشتر نامہ را

اسپرنگر صفحہ ۲۵۲۔ ریو جلد ۱ صفحہ ۵۷۸۔ بودلین نمبر ۶۲۲/۱۵ ایتھے نمبر ۱۰۳۱۔

(۳) الٰہی نامہ

آغاز الٰہی نامہ را آغاز کردم ۔۔۔ بنامت نامہ را باز کردم

اس میں ۲۲ مقالات ہیں اور سنہ ۱۸۷۲ء میں بمقام لکھنؤ چھپا ہے۔ حاجی خلیفہ جلد ۱ صفحہ ۴۴۶۔ نمبر ۱۱۰۷۰۔ اسپرنگر صفحہ ۳۵۷۔ ریو جلد (۱) صفحہ (۵۷۶) بودلین نمبر ۶۲۲/۱۱

(۴) بلبل نامہ

آغاز قلم بردار راز دل عیاں کن ۔۔۔ سر آغازش بنام غیب داں کن

آتشکدہ میں اس کا نام گل و بلبل لکھا ہے صفحہ (۴۴) حاجی خلیفہ جلد ۲۔ صفحہ ۶۳۔ نمبر ۱۹۰۱۔ اسپرنگر صفحہ ۳۵۵۔ بودلین نمبر ۶۲۲/۸ ایتھے نمبر ۱۰۳۱/۳

(۵) بیسر نامہ

آغاز من بغیر تو نہ بینم در جہاں ۔۔۔ قادرا پاوردگارا در جہاں

اس کا نام مندرجہ ذیل بیت میں مذکور ہے۔

سر بیسر نامہ را پیدا کنم ۔۔۔ عاشقاں را در جہاں پیدا کنم

اسپرنگر صفحہ ۳۴۹۔ بودلین نمبر ۶۲۲/۱۷ ایتھے نمبر ۱۰۳۱/۷

(۶) پند نامہ

آغاز حمد بیحد مر خدائے پاک را ۔۔۔ آنکہ ایماں داد مشت خاک را

لکھنؤ۔ دہلی۔ لاہور۔ کلکتہ۔ بولاق اور قسطنطنیہ میں کئی بار چھپا ہے پروفیسر ہینڈلی نے سنہ ۱۹۰۸ء میں بمقام لندن چھپوایا ہے۔ حاجی خلیفہ جلد ۲ صفحہ ۶۸ نمبر ۱۹۴۔ اسپرنگر صفحہ ۳۵۵۔ فلوگل جلد (۱) صفحہ (۵۱۱) بودلین ۶۲۲/۱۰

مولانا شمعی المتوفی سنہ ۱۰۰۱ھ نے ترکی میں منظوم ترجمہ کیا ہے جس کا نام سعادت نامہ ہے اور وہ قازان میں چھپا ہے۔ مولانا اسمٰعیل حقی المتوفی سنہ ۱۱۲۷ھ نے ترکی میں شرح لکھی ہے جو سنہ ۱۲۶۷ھ و سنہ ۱۲۸۷ھ میں دو بار قسطنطنیہ میں چھپی ہے۔ فہرست کتب خانہ خدیویہ کتب ترکی صفحہ (۲۹) شیخ احمد بن راشد الانصاری الخلوتی المصری نے عربی میں ترجمہ کیا جو فارسی متن کے ساتھ سنہ ۱۲۹۱ھ میں بولاق میں چھپا ہے۔ فہرست کتب خانہ خدیویہ کتب فارسی جلد دوم صفحہ ۴۱۴۔ مولوی عبدالغفور خاں نساخ نے اردو میں منظوم ترجمہ کیا ہے جس کا نام چشمۂ فیض ہے اور وہ سنہ ۱۸۷۴ء میں لکھنؤ میں چھپا ہے۔ پروفیسر ڈی ساسی نے فرنچ میں اور پروفیسر نسلیمان نے جرمن میں ترجمے کئے ہیں۔ فرنچ ترجمہ سنہ ۱۸۱۹ء میں بمقام پیرس اور جرمن سنہ ۱۸۱۴ء میں بمقام لیپزگ چھپا ہے۔

(۷) جواہر الذات

یہ کتاب جواہر نامے کے نام سے بھی مشہور ہے اس کے تین دفتر ہیں جنکی ابتداء مندرجہ ذیل ابیات سے ہوتی ہے۔

دفتر اول بنام آنکہ جان جسم و جان است — خدائے آشکارا و نہان است

دفتر دوم تعالی اللہ ازیں دیدار پُر نور — کہ در ذاتِ عالم گشت مشہور

دفتر سوم بنام کردگار خرد بے چون — کہ مارا از عدم آورد بیرون

دفتر سوم کا نام ہیلاج نامہ ہے۔ صاحب برہان قاطع نے لکھا ہے کہ ہیلاج یونانی زبان کا لفظ ہے اور اس کے معنی ہیں چشمۂ زندگانی ہیلاج نامہ میں شیخ عطار نے مشہور و معروف عارف منصور حلاج کے حالات و اقوال منظوم کئے ہیں اور اس میں منصور کو ہر جگہ ہیلاج کے نام سے مخاطب کیا ہے۔

مرا شد منکشف اسرار حلاج | نمودم نام او در عشق ہیلاج
جواہم داد من منصور حلاج | مرا نام است در آفاق ہیلاج

جواہر الذات ۱۸۷۲ء میں بمقام لکھنو چھپا ہے اس میں ہیلاج نامہ جواہر الذات کے دو دفتروں سے علٰحدہ صفحہ ۶۸۶ سے صفحہ ۷۷۰ تک ہے۔ اسپرنگر صفحہ ۲۵۱ فلوگل جلد (۱) صفحہ (۵۱۳) بودلین نمبر ۶۲۲۔ انیتھے نمبر ۱۰۳۱ و نمبر ۱۰۴۶۔ ریو جلد (۲) صفحہ (۵۷۶)

(۸) خسرو نامہ

آغاز بنام آنکہ گنج جسم و جاں ساخت | طلسم گنج جاں ہر دو جہاں ساخت

خسرو گل کے نام سے بھی مشہور ہے۔ دولت شاہ سمرقندی نے اس کا نام گل و ہرمز لکھا ہے۔ لکھنو میں ۱۸۷۲ء اور ۱۸۷۹ء میں دو بار چھپا ہے۔ حاجی خلیفہ جلد ۳ صفحہ ۱۳۸ نمبر ۱۴۷۔ ریو جلد (۲) صفحہ (۵۷۶) بودلین نمبر (۶۲۵) انیتھے نمبر ۱۰۳۱/۲

(۹) خیاط نامہ

آغاز بنام آنکہ ہستی زو نشاں یافت | نفوس ناطقہ زو نور جاں یافت

اس میں ۔ امقالات ہیں حسب ذیل بیت میں اس کا نام مذکور ہے۔

چو بر کاغذ نہادم نوک خامہ | نوشتم نام ایں خیاط نامہ

اسپرنگر صفحہ ۳۵۶۔ بودلین نمبر ۶۲۴/۱۴۔ انیتھے نمبر ۱۰۳۳/۱۱

(۱۰) کنز الحقایق

آغاز بنام آنکہ اول کرد و آخر | بنام آنکہ باطن کرد ظاہر

برٹش میوزیم کے کتب خانہ میں اس کا جو نسخہ محفوظ ہے اُس کی ابتدا حسب ذیل شعر سے ہوئی ہے۔

بنام آنکہ جاں را نور دیں داد | خرد را در خدا دانی یقیں داد

حسب ذیل بیت میں اس کا نام مذکور ہے۔

چو گفتم اندرو چندین دقایق — نہادم نام او کنز الحقایق

اسپرنگر صفحہ ۳۵۶۔ بودلین نمبر ۶۲۲/۱۸ اتیھے نمبر ۱۰۳۱/۱۲ ریو ضمیمہ نمبر ۲۳۵/۵

(۱۱) لسان الغیب

آغاز اسم توحید ابتدای نام اوست — مرغ روح جملگی از نام اوست

بودلین نمبر ۶۲۲۔ اتیھے نمبر ۱۰۳۱۔

(۱۲) مختار نامہ

آغاز ای پاک تو منزہ از ہر پاکی — قدوسی تو مقدس از ادراکی

سنہ ۱۸۷۲ء میں بمقام لکھنو چھپا ہے۔ ریو جلد (۲) صفحہ (۵) بودلین نمبر ۶۲۳/۲۱
اتیھے نمبر ۱۰۳۲/۱۲۔

(۱۳) مصیبت نامہ

آغاز حمد پاک از جان پاک آں پاک را — کو خلافت داد مشت خاک را

یہ کتاب نزہت نامہ کے نام سے بھی مشہور ہے۔ حاجی خلیفہ جلد (۵) صفحہ ۵۸۹ نمبر ۱۲۲۰۷ اسپرنگر صفحہ ۳۴۹۔ فلوگل جلد (۱) صفحہ ۵۱۰۔ ریو جلد (۲) صفحہ (۵۷۶)
بودلین نمبر (۶۲۲)

(۱۴) مظہر العجائب

آغاز آفرین جان آفرین بر جانہا — زانکہ ہست او آشکار او نہاں

شیخ نے یہ کتاب حضرت علی علیہ السلام کے نام پر لکھی چنانچہ دیباچے میں فرماتے ہیں۔

مظہر کل عجائب حیدر است — در میان سالکان او رہبر است
ختم کردم ایں کتب بر نام او — زانکہ دارم شکرہا از جام او

حضرت علی کا لقب چونکہ مظہر العجائب ہے اسی مناسبت سے شیخ نے اسکا

نام مظہر العجائب رکھا ہے۔

این کتابم از غرائب آمدہ است   مظہر سر عجائب آمدہ است

امین رازی نے ہفت اقلیم میں اس کا نام مظہر الآثار لکھا ہے۔ حاجی خلیفہ جلد ۵ صفحہ ۶۰۷۔ نمبر ۱۳۳۸۲۔ اسپرنگر صفحہ (۳۵۳) ریو جلد (۲) صفحہ (۵۷۹) بودلین نمبر ۶۲۲ ایتھے نمبر ۱۱۳۱۔

(۱۵) منطق الطیر

آغاز آفرین جان آفرین پاک را   آنکہ جان بخشید و ایمان خاک را

یہ کتاب ۵۷۳ھ میں ختم ہوئی ہے اور حسب ذیل ابیات سے اس کی تاریخ نکلتی ہے۔

روز سہ شنبہ بوقت استوا   بستم روزی شد از نام خدا

پانصد و ہفتاد و سہ بگذشت سال   ہم ز تاریخ رسول ذوالجلال

منطق الطیر ۱۲۸۰ھ میں بمقام لکھنو اور ۱۲۸۰ھ میں بمقام بمبئی چھپی ہے۔ پروفیسر گارٹن دی ٹاسی نے ۱۸۵۷ء میں پیرس میں چھپوایا ہے۔ الشیخ سید علی الہمدانی نے فارسی میں اس کے مضامین انتخاب کئے ہیں۔ ابو عبد اللہ ومرداس نے عربی میں اس کی شرح لکھی ہے۔ مولانا شمعی المتوفی ۱۰۰۹ھ نے حسن آغا المعروف بطرنیچی آقا کی فرمایش سے ۱۰۰۵ھ میں ترکی میں منظوم ترجمہ کیا۔ وجیہ الدین جدی نے ۱۲۴۴ھ میں اردو میں ترجمہ کیا ہے۔ یہ ترجمہ نظم میں ہے اس کا نام پنچھی نامہ ہے اور ۱۲۸۰ھ میں بمبئی میں چھپا ہے۔ پروفیسر کارسن دی تاسی نے اس پنچھی نامے کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا ہے جو ۱۸۶۳ء میں پیرس میں چھپا ہے۔ حاجی خلیفہ جلد (۶) صفحہ (۱۸۹) نمبر (۱۲۱۸۳) اسپرنگر صفحہ ۳۵۴۔ ریو جلد (۲) صفحہ (۵۷۶) فلوگل جلد (۲) صفحہ ۵۰۹ بودلین نمبر (۶۲۲) بردن (۳۱۲) ڈوڈزی جلد (۲) صفحہ (۱۱۵)

(۱۶) منصور نامہ

آغاز بود منصورا ے عجب شوریدہ حال در رہ تحقیق او را صد کمال

ہیلاج نامہ کے علاوہ ہے۔ بودلین نمبر ۶۲۳۔ انیتھے نمبر ۱۰۳۳۔

(۱۷) وصلت نامہ

آغاز ابتدا کردن بنام کردگار خالق ہفت و شش و پنج و چہار

اس کا نام حسب ذیل بیت میں مذکور ہے۔

نام ایں کردہ بوصلت نامہ من زانکہ وصلت دیدہ ام با خویشتن

حاجی خلیفہ جلد (۶) صفحہ (۴۴۶) نمبر (۱۴۲۷۴) ریو جلد (۲) صفحہ (۵۷۹) بودلین نمبر ۶۲۲/۷

انیتھے نمبر ۱۰۳۱/۱۰۔

(۱۸) ہفت وادی

آغاز حمد پاک از جان پاک آں پاک را کو خلافت داد مشت خاک را

اسپرنگر صفحہ (۳۵۷) بودلین نمبر ۶۲۲/۱ انیتھے نمبر ۱۰۳۱/۶

(۱۹) ہیلاج نامہ

جواہر الذات کا تکملہ ہے اور جواہر الذات کے اکثر نسخوں میں مرسوم کے عنوان سے شامل ہے اس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔

(۲۰) دیوان

اس میں قصاید غزلیات اور رباعیات شامل ہیں۔ قصاید کا پہلا شعر یہ ہے۔

سبحان خالقی کہ صفاتش ز کبریا بر خاک عجز می فگند عقل انبیا،

غزلیات کا پہلا شعر یہ ہے؛

گفتم آں سر محنت و زاری مرا چوں نمی بینی نیز بگذاری مرا

رباعیات کی ابتدا اس رباعی سے ہوئی ہے۔

از عشق تو کام دل ناکامی است آرام گرفتم ز بے آرامی است
اے زاہد نیک نام مبیں با من برخیز کہ سرمایہ من بدنامی است

گستاؤ فلوگل نے مجموعۂ قصاید کا نام لجتہ الابرار لکھا ہے۔

شیخ کے قصاید پر بڑے بڑے اکابرین نے شرح و حواشی لکھی ہیں۔ ان میں سید عزیز الدین آملی کی شرحیں بہت مشہور ہیں۔ آملی نے ایک شرح نثر میں دس قصیدوں کی لکھی ہے دوسری شرح نظم میں ہے اور اس میں صرف ایک قصیدہ کے مطالب کو حل کیا جس کا مطلع ذیل میں درج ہے اور اس میں توحید و عرفا کے تمام حقایق و دقایق باسلوب نفیس بیان کئے ہیں۔

سبحان خالقی کہ صفاتش ز کبریا برخاک عجز می فگند عقل انبیا

دولت شاہ صفحہ (۱۸۶) نفحات صفحہ (۱۹۳) اسپرنگر صفحہ (۳۴۸) فلوگل جلد (۳) صفحہ (۴۴۷)

بودلین نمبر ۶۲۶ ایتھے نمبر ۱۰۳۱

(۲۱) تذکرۃ الاولیاء

فارسی لٹریچر کی ایک قیمتی اور تاریخی اہمیت رکھنے والی کتاب ہے جس زمانے میں یہ کتاب لکھی گئی ہے اُس وقت تک نثر فارسی میں بہت کم کتابیں تصنیف ہوئی تھیں بڑے بڑے کتب خانوں میں دیکھا جائے اور قدیم وجدید فہرستوں کی جہاں بین کی جائے تو ایسی کتابیں مشکل سے پانچ چھ نکلیں گی جو تذکرۃ الاولیا سے پہلے نثر فارسی میں تحریر ہوئی ہیں۔

تراجم اولیا اور مناقب صوفیہ کے متعلق تذکرۃ الاولیا سے پیشتر عربی میں بہت سی کتابیں تصنیف ہوئی ہیں۔ مثلاً عبدالرحمن محمد بن حسین السلمی المتوفی ۴۱۲ھ کی طبقات الصوفیہ ابی نعیم احمد بن عبداللہ الاصفہانی المتوفی ۴۳۰ھ کی حلیۃ الاولیاء امام عبدالکریم ابوالقاسم قیشری المتوفی ۴۶۵ھ کا رسالہ

مجد الدین بن ابی عبد اللہ الحسین بن نصر المعروف بابن خمیس الکعبی المتوفی ۵۵۲ھ کی مناقب الابرار و محاسن الاخیار جمال الدین ابو الفرج عبد الرحمٰن بن علے بن الجوزی البغدادی المتوفی ۵۹۷ھ کی کتاب صفوۃ الصفوۃ وغیرہ۔ لیکن فارسی میں صرف دو کتابیں اس سے پہلے لکھی گئی ہیں۔ ابو الحسن علی بن عثمان الجلالی الہجویری المتوفی ۴۶۵ھ کی کشف المحجوب۔ لارباب القلوب عبد الرحمٰن محمد بن حسین السلمی کی طبقات الصوفیہ کا ترجمہ شیخ الاسلام ابو اسمٰعیل عبد اللہ بن محمد الانصاری الخزرجی الہروی المتوفی ۴۸۱ھ نے اپنی مجالس وعظ و تذکیر میں بیان فرمایا تھا یہ کتاب قدیم ہروی زبان میں تھی۔ مولانا عبد الرحمٰن الجامی المتوفی ۸۹۸ھ نے اس کو خلاصہ کر کے روزمرہ کی فارسی میں لکھا اور اُس کا نام نفحات الانس من حضرات القدس رکھا۔ ممکن ہے کہ ان دو کتابوں کے علاوہ اور تذکرے بھی لکھے گئے ہوں گے۔ مگر ابھی تک دیکھنے میں نہیں آئے۔

تذکرۃ الاولیا ہندوستان کے بڑے شہروں میں کئی بار چھپا ہے پروفیسر نکلس نے غیر معمولی اہتمام کے ساتھ لیڈن میں چھپوایا ہے جسے دیکھنے سے آنکھیں روشن ہو جاتی ہیں۔

مولانا شمعی المتوفی ۱۰۰۰ھ نے ترکی میں ترجمہ کیا ہے جو کئی مرتبہ قسطنطنیہ میں طبع ہوا ہے۔ اردو میں دو ترجمے ہوئے ہیں۔ ایک مولوی برکت علی فرنگی محل کا ہے اس کا نام انوار الاتقیا ہے اور مطبع قیومی کانپور میں چھپا ہے دوسرا ترجمہ مولوی مرزا جان دہلوی کا ہے اسکا نام انوار الاذکیا ہے اور اسے مطبع رزاقی نے چھاپ کر شایع کیا ہے۔ حاجی خلیفہ جلد (۲) صفحہ (۲۵۸)۔ ریو جلد (۱) صفحہ (۳۴۴) بودلین نمبر ۶۲۲/۱ اینھے نمبر (۱۰۵۱)

تذکرۃ الاولیاء میں حسب ذیل اولیاء اللہ کے مناقب و تراجم

مذکور ہیں۔

حضرت امام جعفر صادقؑ حضرت اویس قرنی حضرت حسن بصری حضرت مالک دینار
حضرت محمد واسع۔ حضرت حبیب عجمی۔ حضرت ابو حازم مکی۔ حضرت عتبہ بن الغلام
حضرت رابعہ العدویہ حضرت فضل بن عیاض حضرت ابراہیم ادہم۔ حضرت بشر حافی
حضرت ذوالنون مصری حضرت بایزید بسطامی حضرت عبداللہ مبارک۔ حضرت سفیان ثوری
حضرت شفیق بلخی حضرت ابو حنیفہ کوفی۔ حضرت محمد ادریس شافعی حضرت احمد بن حنبل
حضرت داود طائی حضرت حارث محاسبی حضرت سلیمان دارانی۔ حضرت محمد سماک
حضرت محمد اسلم حضرت احمد حرب حضرت حاتم اصم حضرت سہل بن عبداللہ تستری
حضرت معروف کرخی حضرت سری سقطی حضرت فتح موصلی حضرت احمد حواری
حضرت احمد خضرویہ۔ حضرت ابو تراب نخشبی حضرت یحییٰ معاذ رازی۔ حضرت شاہ شجاع کرمانی
حضرت یوسف بن الحسین حضرت ابو حفص حداد حضرت حمدون قصار۔ حضرت منصور عمار۔
حضرت احمد العاصم الانطاکی حضرت عبداللہ بن خبیق حضرت جنید بغدادی حضرت عمرو عثمان مکی
حضرت ابو سعید خراز حضرت ابو الحسین نوری۔ حضرت ابو عثمان حیری حضرت عبداللہ بن الجلا
حضرت ابو محمد رویم حضرت ابن عطا حضرت ابراہیم رقی حضرت یوسف اسباط
حضرت ابو یعقوب نہرجوری حضرت سمنون محب حضرت ابو محمد مرتعش حضرت محمد بن فضل
حضرت ابو الحسین بوشنجی حضرت محمد علی حکیم ترمذی حضرت ابو الخیر اقطع حضرت عبداللہ روعدی
حضرت ابو بکر وراق حضرت عبداللہ منازل حضرت علی سہل اصفہانی حضرت خیر نساج
حضرت ابو حمزہ خراسانی حضرت احمد مسروق حضرت عبداللہ احمد مغربی حضرت ابو علی جرجانی
حضرت ابو بکر کتانی حضرت عبداللہ محمد خفیف حضرت ابو محمد حریری
حضرت حسین منصور حلاج۔

(۶) شہید وفا

بسلسلہ گزشتہ

اک دن کا ہے ذکر اسطرح پر | اپنی کا طفل اور دختر
کرنے لگے ضد یہ اپنی ماں سے | جنگل کو آج سب ہیں جانے
گر آپ چلیں تو جائیں اماں | ہم بھی پھل چن کے لائیں اماں
پاس خاطر سے ان کے ناچار | چلنے کو جو ہوگئی وہ تیار
پھر مچلے کہ یوں نہ جائینگے ہم | بابا کو بھی ساتھ لائیں گے ہم
آخر مادر سے اذن پا کے | دوڑے ہوئے گھر فلپ کے آئے
آکر چاروں طرف جو ڈھونڈھا | اس حال سے مل میں اسکو پایا
جس طرح سے کارکن ہو کوئی | آلودہ ہو گرد گل میں کوئی
مقصد سے کیا یہ کہکے آگاہ | "بابا فلپ آؤ تم بھی ہمراہ"
پہلے اُس نے کیا جو انکار | دامن سے لپٹ گئے وہ دلدار
مچلے کبھی گہ خوشامدیں کہیں | قسمیں کبھی دیں کبھی ضدیں کیں
اس بچپنے پر بہت ہنسا وہ | راضی چلنے پہ ہو گیا وہ
اپنی تھی جو ساتھ جانے والی | بچوں کی نہ اُس نے بات ٹالی
آخر جنگل کا عزم ٹھانا | سب مل کے ہوئے اُدھر روانہ

\+ + + + + +

جب وہ ہمت شکن پہاڑی | طے ہوگئی اور آئی جھاڑی
گنجان جو ہو کے مثل مژگاں | کرلیتی تھی چشم غار پنہاں

اپنی میں رہی نہ تاب رفتار طاقت نے دیا جواب اکبار
بولی ایک آہ سرد بھر کر اب میں دم لوں گی اسجگہہ پر
صحبت وہ زبسکہ مغتنم تھی یہ سُن کے ٹھہر گیا فلپ بھی
بچوں نے بڑوں کا چھوڑ کے ساتھ (لی صورت خضر راہ ظلمات)
قلقاریاں مارتے کلکتے چہلیں کرتے ہوئے اُچھلتے
جھاڑی میں ہو گئے وہ غائب اک چشم زدن میں تھے نہاں سب
گہرائی میں کنڈ کی اُتر کے ہیزل کے پھلوں پہ چھاپے مارے
پھل کیا پتہ کہیں نہ چھوڑا شاخوں کو جھکا جھکا کے توڑا
لوٹا جی بھر کے ہر شجر کو چھوڑا نہ کہیں کسی ثمر کو
کھائے پھینکے چُنے سمیٹے اک دھوم مچائی سب نے مل کے

* * * * * *

اب سُنیئے حال کچھ اُدھر کا پہلو میں فلپ جو اس کے بیٹھا
سُدھ بُدھ نہ رہی اسے کسی کی موجودگی اپنی کی بھی بھولی
وہ روز سیاہ یاد آیا قسمت نے یہیں تھا جو دکھایا
تازہ ہوا دل کا زخم کاری حالت ہوئی کچھ عجیب طاری
کچھ دیر کے بعد ہوش آیا پیشانی صاف کو اٹھایا
کہنے لگا سنتی ہو کہ نیچے کیا دھوم مچا رہے ہیں بچے
پایا نہ مگر جواب کوئی پوچھا کیا تھک گئی ہو اینی
لیکن ہاتھوں کو رکھ کے سر پر تھی غرق محیط غم وہ مضطر
آخر لہجے میں سرزنش کے اس طرح کیا خطاب اس نے
"اینی وہ جہاز ہو گیا غرق بی بی! وہ جہاز ہو گیا غرق"

دل سے یہ خیال اب بھلا دو
غم کو دل میں نہ اپنے جا دو
کیا چاہتی ہو کہ جان دے دو
پورا ہی یتیم کر دو ان کو
بولی وہ غمزدہ۔ "نہیں تو
تھا اس کا گمان بھی نہ مجھ کو"
"لیکن کیا جانے بات کیا ہے
جی آپ ہی آپ اُچاٹ سا ہے"
بچوں کی صدائے عشرت آہنگ
کرتی ہے آج مجھ کو دلتنگ

+ + + + +

یہ سُن کے قریب تر وہ آیا
آہستہ سخن یہ لب پہ لایا
اپنی اک مدعا ہے میرا
کانٹا سا جو دل میں ہے کھٹکتا
"مدت سے یوہیں چھپا ہے یہ خار
گو خود نہیں اس سے میں خبردار"
"پہنچا یہ میرے دل میں کیسے
کب اور کیونکر کیا گھر اس نے"
"البتہ جانتا ہوں اتنا
اک روز نکل کے یہ رہے گا"
"اس کی نہیں اب امید کوئی
امید تو کیا نہیں گماں بھی"
"یعنے کہ پاٹ کے پھر وہ آئے
دس سال ہوئے ہیں جسکو جاکے"
"جیتا ہوتا تو کب کا آتا
کیا اتنے دنوں نہ منہ دکھاتا"
"دیکھو اسمجھو اسے جب یہ صورت
کچھ کہنے کی دو مجھے اجازت"
"اس حال میں تم کو پا کے واللہ
صدمہ ہوتا ہے مجھ کو جانکاہ"
"لیکن جیسی میں چاہتا ہوں
امداد وہ کس طرح تمھیں دوں"
"ہاں ایک ہے شکل تم جو چاہو
سمجھیں مرے مدعائے دل کو"
"خواہش ہے یہی یہی تمنا
ہو عقد نکاح تم سے میرا"
"گو مجھ کو نہیں ہے اسکا دعویٰ
حق پدری ادا کروں گا"
"پھر بھی جیسا تمھارے بچے
دونوں مجھے چاہتے ہیں جی سے"

"ہے مجھ کو بھی ایسی ہی محبت　　فرزندوں سے کم نہیں ہے الفت"

"پھر اس غم جانگداز کے بعد　　فرقت کے شب دراز کے بعد"

"تم ہوگی جو میری زوجیت میں　　ممکن ہے کہ پھر خوشی بھی دیکھیں"

"گھیرے ہیں مصیبتیں جو ٹل جائیں　　راحت سے کلفتیں بدل جائیں"

"اللہ کو بھی ہوا جو منظور　　ہر طرح رہیں گے شاد و مسرور"

"خوشحال ہوں کچھ کمی نہیں ہے　　آگے پیچھے کوئی نہیں ہے"

"گر فکر ہے کچھ تو اک تمھاری　　یا یہ کہ تمھارے لاڈلوں کی"

"ہم دونوں ہیں بچپنے سے ہمراہ　　اک دوسرے سے ہم ہیں آگاہ"

"الفت بھی تمھاری میرے دل میں　　دل ہیں کیسی کہ آب و گل میں"

"اسوقت سے جاگزیں ہے جسکی　　تم کو نہیں مطلقاً خبر بھی"

٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭ ٭

"اپنی اس گفتگو کو سن کے　　کہنے لگی یوں ملائمت سے"

"جسدن جس صبح گھڑی سے آیا　　میرے گھر میں قدم تمھارا"

"معلوم ہوا ہے مجھ کو ایسا　　رحمت کا فرشتہ حق نے بھیجا"

"رویاں رویاں نہ کیوں دعا دے　　بدلا اس کا تمھیں خدا دے"

"مجھ سے بہتر صلہ کوئی پاؤ　　جسمیں شادی کا لطف بھی پاؤ"

"کیسا یہ خیال کرتے ہو تم　　کیوں میرا سوال کرتے ہو تم"

"دو مرتبہ ایک دل کا آنا　　ممکن ہے قلب تمھیں بتانا"

"بولا وہ اس کا غم نہیں کچھ　　کم چاہو بھی تم تو کم نہیں کچھ"

"مثل اپنے اگر نہ سمجھو　　دل میں مجھے اسکے بعد جا دو"

"اس طرح کی اس نے کی جو تقریر　　کر ہی گیا جذب عشق تاثیر"

"آخر بیتاب ہو کے بولی — او پیارے فلپ کرو نہ جلدی"

"ٹھہرو ابھی اور کچھ دنوں تک — ہر چند اب آئے گا نہ اینک"

"تاہم ابھی ایک سال ٹھہرو — سال ایک بہت نہیں ہے دیکھو"

"تھوڑا ضبط اور۔ کیا عجب گر — آجائے اس اک برس کے اندر"

"کچھ بن نہیں پڑتی کیا کروں اُف — لازم ہے تمہیں ابھی توقف"

"حسرت سے کہا فلپ نے "اینی — اچھا یوں ہی سہی جو مرضی"

"گزری ہے تمام عمر جیسے — تھوڑے سے یہ دن بھی کاٹ دینگے"

"بولی وہ "نہیں بُرا نہ مانو — اپنا پابند مجھ کو جانو"

"میں تم کو زبان دے چکی ہوں — بس اک برس اور چاہتی ہوں"

"ہیں کاٹنے مجھ کو جیسے یہ دن — کاٹو یوہیں تم۔ نہیں یہ ممکن؟"

"اُس نے کہا "خیر دیکھ لیں گے — اور ایک برس گزار دیں گے"

"یاں آکے ہوئی جو ختم تقریر — چپ ہوگئے دونو مثل تصویر

"کچھ دیر کے بعد جب فلپ نے — دیکھا اوپر کو سر اٹھا کے

"سایہ قبروں سے ڈھل چکا تھا — چلنے کا وقت ٹل چکا تھا"

"ٹھنڈک سے بنی تھی چاندنی دھوپ — کجلائی ہوئی تھی شام کی دھوپ

"گھبرایا کہ رات ہو نہ جائے — اپنی سردی کہیں نہ کھائے

"اٹھا جلدی سے اور صدا دی — تھے جھاڑی میں جو انہیں ندا دی

"بشاش وہ طفل اوپر آئے — جنگل کی لوٹ بھر کے لائے

"اترے۔ چلے۔ گاؤں جاکے پہنچے — اینی کے در پہ آکے پہنچے

"رخصت کے لئے ملائے جب ہات — اُسوقت کہی فلپ نے یہ بات

"اینی جب ہیں نے گفتگو کی — حالت کچھ اور تھی تمہاری

"میں نے بیجا کہا۔ کہا جو — آزاد ہو تم کرو جو چاہو"
"لیکن جبتک ہے جسم میں جان — پابند تمہارا ہوں میں ہر آن"
گویا ہوئی آہ بھر کے اپنی — "پابند میں ہو چکی تمہاری"

(باقی ندارد)

غزل

از جناب مولوی سید علی نواز صاحب تصور رضوی امانت خانی

سبکروی میں تم آگے کہیں صبا کے چلو — نفس کی طرح تن عاشقاں میں آکے چلو
کہاں کا کعبہ کہیں جھونکیں آگ میں نہ خلیل — چراغ دیر ہی سے اپنی لو لگا کے چلو
ستم کے واسطے ڈھونڈا کرو نئی چالیں — زمیں پہ نقش قدم ہی سے گل کھلا کے چلو
فنا کا رنگ بھرو آرزو کے خاکوں میں — نگار خانۂ ہستی کو یوں سجا کے چلو
کسی کی بات نہ پوچھیں گے بت ہیں پتھر کے — قیامت آنے تو دو سامنے خدا کے چلو
تخیلات جو نیکوں کے ہوں سعادت ہے — تصورات سے سایہ میں تم ہما کے چلو
یہ دور آج کا کل کیا رہے کہاں یہ مزے — بچی ہے شیشے میں جو کچھ پیو پلا کے چلو
تلاش رزق میں گردش ہے عین دانائی — نچنت کیوں رہو چکر پہ آسیا کے چلو
ہو راہ سوز محبت میں بیکسی کا ساتھ — چراغ صبح کے مانند جھلملا کے چلو
سر غرور کو ٹکر آسماں کی لگے — ہیں گھر بلند تو کیا گردن جھکا کے چلو
بکھر کے موتیوں کی طرح سے سنور جاؤ — بگڑ کے نام خدا شان کچھ بنا کے چلو

چلے ہو گھر سے تصور کہاں خدا کے لئے
خضر کا ساتھ بھی گر ہو تو آزما کے چلو

حدیقہ عثمانی

لسان الملک کے اس نمبر میں نواب مرزا یار جنگ بہادر کے حالات شایع کیے جاتے ہیں۔ امید ہے کہ ہم ان میں معتدبہ اضافہ کر کے عنقریب کتابی صورت میں جداگانہ شایع کر سکیں گے ۔ مشتہر

مرزا یار جنگ بہادر (آنریبل نواب ..... مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب) خلف مرزا منصب بیگ صاحب ۱۸۷۵ء میں آپ کی ولادت بمقام قصبۂ امیٹھی ضلع لکھنؤ وقوع پذیر ہوئی۔ ابتدائی تعلیم جس کا تعلق زیادہ تر انشا و ادب سے تھا آپ نے والدین کے زیر نگرانی گھر ہی پر پائی، اور اسی زمانے میں والدہ ماجدہ کے اشفاق کا نقش اس قدر عمیق آپ کے قلب پر بیٹھا کہ آپ اُس کو اب بھی محسوس فرماتے ہیں۔ آپ کی والدہ محترمہ حافظۂ قرآن اور بہت بڑی عابدہ تھیں اور بچوں کے معالجے کا خاص شوق و ملکہ رکھتی تھیں، اس لحاظ سے بلا تفریق مذہب و ملت ہندو مسلمان بیبیاں اُن معظمہ سے فیض حاصل کرنے کے لئے روزانہ آیا کرتی تھیں۔

جب آپ دس گیارہ سال کی عمر کو پہنچے تو آپ کے چچازاد بھائی ڈاکٹر مرزا اصغر بیگ صاحب مرحوم، جن سے آپ کی ہمشیر منسوب تھیں اور جن کے کوئی اولاد نہ تھی، آپ کو اپنے ہمراہ لے گئے اور مثل اپنی اولاد کے تعلیم دینا شروع کیا۔ خود ڈاکٹر صاحب مرحوم نے مرزا صاحب کے والد ماجد کے زیر نگرانی تعلیم پائی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ مدرسہ کی انگریزی تعلیم زیادہ تر گورنمنٹ اسکول بانس بریلی میں ہوئی، جہاں ڈاکٹر صاحب مامور تھے، اور وہیں سے ۱۸۹۰ء میں انٹرنس کے امتحان میں آپ نے کامیابی حاصل فرمائی۔ ہستوں کی صحبت کا انسان کی طبیعت پر بڑا اثر پڑتا ہے، جس سے مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب بھی

مستثنیٰ نہ تھے۔ حسن اتفاق سے بریلی میں آپ کو بعض ایسے اچھے ہم جماعت مل گئے تھے کہ اُن کی سبق آموز زندگی مشترکہ طور سے سب پر اثر انداز ہوئی ان میں کچھ تو ایسے تھے جو اب کاروبار دنیاوی کی مختلف شاخوں میں جدوجہد کی زندگی بسر کر رہے ہیں، اور بعض ایسے بھی تھے جو آگے چل کر اپنے ایثار اور اپنے جوش حب الوطنی کے باعث اس زمانے میں قومی و ملکی زندگی کی انتہا پر نظر آتے ہیں۔ آپ کے ان ہم جماعتوں میں ہندو دوستوں کی تعداد مسلمانوں سے کچھ کم نہ تھی، اور جیسا کہ عام قاعدہ تھا ایک ہی بنچ پر دہنے بائیں کبھی کوئی ہندو لڑکا ہوتا اور کبھی مسلمان۔ بلکہ آپ فرماتے ہیں کہ لڑکپن میں آپ کا ایک گہرا دوست ہندو لڑکا ہی تھا۔ اس نشو و نما کا نتیجہ یہ تھا کہ آپ ہندو مسلمان میں کوئی امتیاز نہ کر سکتے تھے۔ کوئی کلام نہیں کہ قدیم دور کے بے ریا اتحاد کی مثالیں آپ کو اپنے بزرگوں اور اُن کے مختلف المذاہب دوستوں میں کثرت کے ساتھ نظر آئی تھیں، اسی وجہ سے جو اتحاد دوران طالب علمی میں آپ لوگوں کے درمیان قایم ہوا اُس نے آیندہ زندگی کے لئے گویا سنگ بنیاد کا کام دیا۔

غرض سنہ ۱۸۹۰ء میں انٹرنس پاس کر کے مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب لکھنؤ آئے۔ اور وہاں کرسچین کالج میں ایف اے کی جماعت میں داخل ہوئے۔ یہ اتفاق تھا کہ ایک امریکن پادری ریونڈ مینل آپ کے پروفیسر ہوئے، جو آدھ گھنٹہ تک مذہبی مسائل پر بھی گفتگو کیا کرتے تھے۔ مرزا صاحب کی طبیعت قدرتاً مذہب پسند واقع ہوئی ہے، اس لئے آپ اُن مواعظ (لکچروں) میں دلچسپی لینے اور بعض اوقات اعتراضات سے واعظ صاحب کی تواضع کرنے لگے۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ پادری صاحب کے اخلاق کا آپ پر اچھا اثر پڑا

اور آپ اُن کے احسانات کبھی بھول نہیں سکتے۔ یہ دوسرا اتفاق تھا کہ اس کالج میں مرزا صاحب کے گہرے دوست ایک کشمیری پنڈت کے صاحبزادے تھے۔

بالآخر ۱۸۹۲ء میں ایف اے پاس کر کے آپ نے کیننگ کالج میں شرکت فرمائی، جہاں مشہور مسٹر وہائٹ پرنسپل کی صحبت نصیب ہوئی۔ مسٹر وہائٹ نیک مزاج خاموشی پسند، اور فلسفیانہ طبیعت کے آدمی تھے، لیکن اُن کے کالج میں آپ کو اپنے اتفاق و اتحاد کے خیالات میں ترقی کرنے کا وسیع میدان مل گیا، اور یہ آپ کی خوش نصیبی تھی کہ بابو شیو سہائے آنجہانی جیسے زبردست سیرت کے سینیر طالبعلم کا ساتھ ہوا۔ اس زمانے میں بابو صاحب اور دوسرے طلبہ نے ایک کلب قایم کیا تھا جس میں ہر رکن کے لئے شرکت اور تقریر کرنی ضروری قرار دی گئی تھی۔ مسٹر سمیع اللہ بیگ بھی اپنے دوستوں کے اصرار سے کلب میں شریک ہوئے، اور اپنے قلبی دوست مسٹر شیو سہائے کی فرمایش پر آپ نے بھی زبان کھولنا شروع کی۔

جولائی ۱۸۹۴ء میں آپ نے بی اے کے امتحان میں کامیابی حاصل فرمائی تھی۔ اور اس درجے کے نصاب کے ساتھ ساتھ قانونی لکچر بھی سُن چکے تھے آپ کی تقریریں بھی اس زمانے میں سامعین پر اس قدر اثر انداز ہونے لگی تھیں کہ کہ خود بابو صاحب بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہتے تھے۔ چنانچہ آپ کے اس انداز خوش بیانی سے اثر پذیر ہو کر بابو شیو سُہائے صاحب نے، جو اُس وقت ایل ایل بی کامیاب ہونے کے بعد بعض خانگی اسباب کی بنا پر حسین آباد ہائی اسکول کی سکنڈ ماسٹری قبول کر چکے تھے، اگلے امتحان ایل ایل بی میں شرکت کرنے کی آپ سے فرمایش کی۔ اور ساتھ ہی اپنی قانونی کتابوں کا ذخیرہ بھی آپ کے نذر کر دیا۔ یہ امتحان آئندہ نومبر میں ہونیوالا تھا، اس لئے آپ نے عذر کیا

لیکن بابو صاحب کے اصرار کے مقابلے میں ایک بھی پیش نہ گئی ایک جانب تو کیننگ کالج کے ایم۔ اے کلاس میں شریک ہوئے دوسری طرف بابو صاحب سے قانون کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی۔ بابو شیو سہائے شام کو آپ سے قانونی نکات پر بحث کرتے تھے، قانونی کتابوں کے خلاصے بتاتے تھے، اور ہر طرح کی مدد دیتے تھے۔ چنانچہ ہالینڈ جورس پروڈنس کا خلاصہ اُنھوں نے اُسی زمانے میں تیار کیا تھا، جو بعد کو طبع کرا دیا گیا اور آج تک ایل ایل بی کے طلبہ میں نہایت مقبول ہے۔ یہ کام کچھ ایسے اچھے وقت پر شروع کیا گیا تھا کہ وقت پر پوری تیاری کر کے آپ نے امتحان میں شرکت کی، اور آیندہ جنوری میں نتیجہ شایع ہوا تو معلوم ہوا کہ آپ فرسٹ ڈویژن میں یعنی بدرجۂ اعلیٰ کامیاب ہوئے، اور تمام یونیورسٹی کے کامیاب امیدواروں میں دوسرا یا تیسرا نمبر تھا۔ کیننگ کالج کے پرنسپل صاحب نے اس مسرت انگیز خبر کو قبل از قبل اپنے کالج کے طلبہ تک پہنچا کر خوشی منائی۔ اس طرح آپ نے ۱۸۹۴ء ہی میں تمام امتحانات سے فراغت حاصل فرما لی۔ لیکن چونکہ ایم اے کی تعلیم جاری تھی اس لئے اپریل ۱۸۹۵ء تک کیننگ کالج میں پڑھتے رہے۔

جب مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب نے ایل ایل بی کے امتحان میں کامیابی حاصل فرمائی تو بابو شیو سہائے صاحب نے یہ بھی اصرار شروع کیا کہ جلد سے جلد پیشۂ وکالت میں شرکت کی جائے۔ اس زمانے میں میر محمد تقی صاحب مرحوم نصیر آبادی کو رائے بریلی میں اپنے کار وکالت میں کسی ہوشیار معاون کی ضرورت پیش آئی۔ مرزا صاحب نے اس موقعہ سے فائدہ حاصل کیا اور رائے بریلی پہنچ کر میر صاحب کے رفیق کار بن گئے۔ تقریباً ڈیڑھ سال تک میر صاحب کا ساتھ رہا، اس عرصے میں مرحوم نے آپ کو اس پیشہ کے

تمام رموز و نکات سے آگاہ فرما دیا۔ نیز دوسرے کہنہ مشق وکلا کی صحبت کے سوا آپ کو شہزادہ مرزا ہمایوں قدر جیسے نکتہ شناس حاکم کی سرپرستی حاصل ہو گئی۔ جس سے تھوڑی مدت میں ہر طرح کا تجربہ حاصل فرما لیا۔ میر صاحب کی توجہ اور شہزادہ صاحب کی وضعداری کا ذکر اب بھی مرزا صاحب فرمایا کرتے ہیں۔ ایسے باوضع لوگ اب دکھائی نہیں دیتے۔

میر محمد تقی صاحب نے جلد رحلت فرمائی، اور بعض دوسرے ایسے ہی اسباب پیش آ گئے کہ آپ نے باوجود کشیر آمدنی کے رائے بریلی کے قیام پر لکھنؤ میں رہنے کو ترجیح دی۔ لکھنؤ میں آپ ۱۸۹۷ء میں آئے، اور وہاں کی مختلف عدالتوں میں کام شروع کر دیا۔ رائے بریلی میں آپ کی معاملہ فہمی، محنت اور دیانت کی اس قدر شہرت ہو چکی تھی کہ وہاں کے تمام وکلا اور آپ کے تمام موکل جوڈیشل کے مقدمات آپ کے پاس بھیجنے لگے۔ اس امداد میں آپ کے مسلمان ہم پیشہ میر فدا حسین صاحب، میر محمد عابد صاحب، میر واجد علی صاحب، اور شیخ شہاب الدین صاحب اسی طرح شامل تھے جیسے کہ ہندو وکالت پیشہ احباب مثل بابو جانکی پرشاد صاحب، بابو لکھپت رائے صاحب اور بابو گلاب رائے صاحب وغیرہ تھے۔

ابھی چھ مہینے بھی گزرنے نہ پائے تھے کہ آپ نے ماتحت عدالتوں سے قطع نظر کر کے صرف جوڈیشل کے مقدمات پر جن کا مرجوعہ کافی تھا قناعت فرمائی۔ یہاں آپ نے اپنے اخلاق سے بہت جلد اپنے ہم پیشہ وکیلوں کے دلوں کو مسخر فرما لیا۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ قابل اظہار ہے کہ جب وہ لوگ اپنی ضرورتوں سے باہر جاتے تو آپ اُن کے مقدمات میں بغیر کسی معاوضے کے پیروی فرماتے تھے۔ آپ کا یہ حسن عمل ایسا پسندیدہ تھا کہ بار کے تمام چھوٹے بڑے اس سے اثر پذیر ہوئے، اور سب کے دلوں میں آپ کی وقعت جاں گزیں ہو گئی۔

میں اے انشہری! جان دیتا ہوں اُس پر کرے کام آساں جو مشکل کسی کا

اُس وقت لکھنو کے پیشۂ وکالت میں بابو سداسولال صاحب ایڈووکیٹ اور مسٹر محمد نسیم ایڈووکیٹ کا طوطی بول رہا تھا۔ ان سینیر وکلا نے جو شفقانہ و مربیانہ برتاؤ مرزا صاحب کے ساتھ فرمایا اُس کو آپ کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ اس کے بعد آپ اپنے پیشہ میں روز افزوں ترقی کرتے رہے، حتیٰ کہ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۱۵ء کو جوڈیشل کمشنر صاحب اودھ نے آپ کو بار کا ایڈووکیٹ مقرر فرما دیا۔ آپ نے ۳۱ اگست سنہ ۱۹۱۸ء تک وکالت کو جاری رکھا۔

مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب کو ملک کے مسئلہ تعلیم سے ہمیشہ دلچسپی رہی ہے باوجود اس کے آپ کسی مختص القوم درسگاہ کے قیام کے موید نہیں ہیں۔ چنانچہ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب ہز ہائنس سر آغا خاں نے مسلم یونیورسٹی علیگڈھ کی پارینہ تحریک میں جان ڈالی، اور کچھ زمانہ بعد پنڈت مدن موہن صاحب مالوی نے ایک ہندو یونیورسٹی کے لئے سعی کرنی شروع کی تو آپ کو یہ خیال پیدا ہوا کہ ان یونیورسٹیوں کے قیام سے اتفاق و اتحاد کے وہ فوائد حاصل نہ ہو سکیں گے جو دونوں قوموں کے طلبہ کے یکجا جمع ہونے سے متصور ہو سکتے ہیں۔ لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ وہ زمانہ ابھی بہت دور ہے جب ملک کی یہ دونوں قومیں صرف ہندوستان کے نام سے اتنے بڑے کام کرنے کے لئے اس قدر جلد تیار ہو جائیں گی۔ اس لحاظ سے کہ ہندو مسلمان دونوں کو میدانِ تعلیم میں ساتھ ساتھ گامزن ہونا چاہیئے تاکہ ہمارے نصب العین کا راستہ آسان ہو جائے، آپ نے مسلم یونیورسٹی کی تحریک میں حصہ لینا شروع کیا اور صوبہ اودھ میں اس غرض سے جو کمیٹی قائم کی گئی تھی اُس کے آپ سکرٹری قرار پائے، اور اپنے صوبہ سے ایک کثیر رقم یونیورسٹی مذکور کے لئے وصول فرمالی۔

آخر کار جب مسلم یونیورسٹی بل کے گورنمنٹ میں پیش ہونے کی نوبت آئی تو مسلمانوں میں اختلاف رائے واقع ہو گیا، اور وہ گورنمنٹ کے شرائط پر یونیورسٹی لینے کے لئے تیار نہ پائے گئے۔ اُس وقت آپ نے یہ رائے دی کہ معاملہ کو معرض التوا میں ڈالنا قرین مصلحت نہیں، فی الحال گورنمنٹ کے شرائط پر یونیورسٹی منظور کر کے بعد کو مزید حقوق حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ آپ نے اپنی اس رائے کی تائید میں مضامین بھی لکھے۔ ہندوؤں نے یونیورسٹی لے لی اور مسلمان روٹھے رہے۔ سه ضامن کنتوری۔

ایک ساتھ آئے تھے حسن و عشق باغ دہر میں پھنس گیا کانٹوں میں یہ وہ گل بداماں بڑھ گیا

تقریباً ۱۹۱۵ء میں آنریبل سر راجہ صاحب محمود آباد کی فیاضانہ امداد اور چند معززین شہر لکھنؤ کے چندہ سے لکھنؤ میں اسلامیہ ہائی اسکول قایم کیا گیا اور مرزا صاحب اس کے منیجر بنائے گئے۔ ابتدا ہی سے اس اسکول کے طلبہ میں ہندو مسلمان کا کوئی فرق نہیں قایم کیا گیا، اور دونوں اس سے یکساں مستفید ہوئے اُس وقت سے حیدر آباد تشریف لانے کے وقت تک اسکول کے لئے اقامت خانہ قایم کرنے، سرکاری امداد حاصل کرنے اور گورنمنٹ سے اُس کے تعلیمی نصاب کو مسلم و منظور کرانے میں آپ ہمہ تن مصروف رہے۔ اسی طرح جب مسلمانوں کا زنانہ مدرسہ جو مولوی سید کرامت حسین صاحب مرحوم کے ایثار اور وقف اور جناب راجہ صاحب محمود آباد کی امداد سے لکھنؤ میں کھولا گیا آپ اُس کی کمیٹیوں میں بھی وقت دیتے رہے۔

۱۹۱۴ء میں الہ آباد یونیورسٹی کے گریجوئیٹوں کی جانب سے سینیٹ یعنی مجلس رفقا کے انتخابات کا وقت آ گیا، تو آپ کے مقابلے میں یونیورسٹی مذکور کے بہت سے ہندو گریجوایٹس تھے، تاہم اُن کے مقابلے میں خود

ہندو گریجویٹس نے آپ کا انتخاب کیا۔ اس انتخاب میں سب سے زیادہ ہمدردی آپ کے دوست پنڈت منوہر لال زتشی صاحب نے ظاہر فرمائی۔ جو اُس وقت جوبلی ہائی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ جب آپ یونیورسٹی کے فیلو ہو گئے تو آپ کی بڑی کوشش یہ رہی کہ الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کی طرح اردو زبان بھی لازمی قرار دی جائے، کیونکہ آپ کی رائے میں صوبہ متحدہ کے لئے اردو زبان ہی موزوں ہے لیکن گورنمنٹ کے انگریز عہدہ داروں نے اس تحریک کی سخت مخالفت کی۔ اسی طرح ہندوستانی نقطۂ نظر سے جو اصلاحات یونیورسٹی کے لئے ضروری تھیں اُن کی بھی جماعت مذکور کی جانب سے مخالفت کی گئی اُن میں کمپارٹمنٹ سسٹم خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔

بابو شیو سہائے کا حال مختصر بیان کیا جا چکا ہے وہ کانگریس کے حامی تھے اور یہ غیر ممکن تھا کہ اُن کے خیالات کا اثر ابتدائی عمر میں مرزا صاحب پر نہ پڑتا۔ مرزا صاحب نے ایام طالب علمی ہی سے کانگریس کی موافقت میں اپنی آواز بلند کی، جس کا اظہار پہلے کلب کے لکچروں سے شروع ہوا۔ جب پیشۂ وکالت میں داخل ہو کر کانگریس سے اپنی ہمدردی ظاہر کی تو شہر لکھنو اور زاں بعد صوبۂ اودھ کی پبلک نے آپ کے خیالات کو حیرت سے دیکھنا شروع کیا۔ ایک مرتبہ لکھنو اسٹیشن کے ویٹنگ روم میں مسلمانوں کے ایک بہت بڑے معزز لیڈر نے اُس وقت اس پیرایہ میں مذاق کرنا شروع کیا کہ گویا کانگریس میں مرزا صاحب کی شرکت مسلمانوں کے لئے باعث ننگ ہے۔ آج وہی حضرت ایک منصب جلیلہ پر ممتاز اور اُس سے علاحدہ ہو کر کانگریس کا جامہ پہن لینے کے لئے تیار ہیں۔

سنہ ۱۸۹۷ء میں آپ بغرض وکالت لکھنو آ چکے تھے۔ اگلے سال (سنہ ۱۸۹۸ء میں)

جب بمقام لکھنؤ کانگریس کا اجلاس منعقد ہوا تو استقبالی کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے آپ نے اس میں شرکت فرمائی، اور جہاں تک ہو سکا اس کے کامیاب بنانے کی کوشش کی۔ اس پہلی شرکت کے بعد مختلف سیشن میں مختلف مقامات پر آپ بحیثیت ڈیلی گیٹ یا نمایندہ کانگریس میں شریک ہوتے رہے۔

تقریباً ۱۹۰۵ء میں جناب نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین مرحوم نے مسلمانوں کی ایک سیاسی انجمن مسلم لیگ کے نام سے قائم کرنی چاہی تو مرزا صاحب نے اس تحریک میں بھی عملی حصہ لینے کو اس لحاظ سے ضروری خیال فرمایا کہ مسلمانوں کی یہ انجمن آیندہ ملک کے دو محترم قوموں کے درمیان گفت و شنید کا ایک مفید ذریعہ ثابت ہوگی۔ اپنی اس رائے کے اتباع میں مارلے منٹو اسکیم کے عملی جامے میں آنے سے پہلے آپ نے مسلمانوں کی عام رائے کی ترجمانی کرتے ہوئے قابل قدر مضامین تحریر فرمائے جن کا مطالعہ ہندو مسلمان دونوں نے دلچسپی کے ساتھ کیا۔ اسی طرح جب مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم بروئے عمل آنے کو تھی تب بھی آپ نے باشندگان ملک کے طلب حقوق میں بڑی عرق ریزی سے کام لیا، اور اس موقعہ پر ہندو مسلمانوں کے درمیان جسقدر تصفیہ طلب اہم مسائل تھے ان کی معلومات حاصل کرنے کی غرض سے دونوں کے مشاہیر سے جداگانہ ملاقات کی۔ اور ان کے جذبات و خیالات سے واقفیت حاصل فرما کر حل مسائل کے باب میں کسی نتیجہ پر پہنچے۔

اس تگ و دو کا نتیجہ یہ ہوا کہ ۱۹۱۶ء میں جب لکھنؤ میں کانگریس کا مشہور اجلاس منعقد ہوا (جس کی استقبالی کمیٹی کے آپ بھی سکرٹری تھے) تو جن ہندو مسلمان اصحاب کی سعی سے دونوں قوموں کے درمیان قرار داد منظور ہوئی ان میں سے ایک آپ بھی تھے۔ یہ شاندار موقعہ کانگریس کی تاریخ میں ہمیشہ یادگار

یادگار رہے گا کہ اس ملک کی سیاسی زندگی میں وسیع مملکت ہند کی دو باوقار قوموں نے ٹھنڈے دل سے ایک دوسرے کی بات سُنی اور برادرانہ رواداری سے کام لیکر اُس راستے کو اختیار کیا جو دونوں کے لئے یکساں مفید تھا تصفیہ کے آخری روز ایک وقت ایسا بھی آگیا تھا کہ گویا سب محنت بیکار گئی، اور کانگریس و مسلم لیگ میں، اپنے اپنے دعاوی میں اَن بن ہو جائے گی۔ اسوقت پیام بروں کے قلب کی عجیب حالت تھی۔ مرزا صاحب فرماتے ہیں کہ وہ واقعات آپ کو کبھی نہ بھولیں گے، جب اس سلسلہ میں آپ کو ایک ہندو لیڈر کے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونے کی نوبت آگئی تاکہ وہ مسلمانوں کی ایک استدعا کو منظور کرلیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ صاحب اس قدر متاثر ہوئے کہ خاموشی اختیار کرلی ہے۔

مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب کو اپنے وطن کے وقار کی موجودہ حالت کو دیکھکر سخت ملال ہوتا ہے، اور آپ بیان فرماتے ہیں کہ اگر آپ کو ملک کی سیاسی زندگی میں کام کرنے کا موقعہ ملا تو اپنی تمام قوت اتحاد کے قایم کرنے میں صرف کریں گے۔ آپ کا بیان ہے کہ ۱۹۱۲ء میں جب آپ نے ولایت کا سفر کیا تو آپ کو پہلی مرتبہ یہ محسوس ہوا کہ کسی ملک کے باشندوں کا خود مختار یا غلام ہونا کس قدر اُن کی عزت یا ذلت کا باعث ہوسکتا ہے۔ ہندوستان کے باہر ہندو مسلمان کا سوال نہیں ہوتا، تمام ہندوستانیوں کو ایک ہی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ یورپ میں تو لوگ اسی قدر معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ کوئی شخص کس ملک کا باشندہ ہے، اور اس کے بعد خود اس کے وقار کا اندازہ کرلیتے ہیں۔ اس زمانے میں جب کہ وسائل حمل و نقل میں آسانیاں پیدا ہوگئی ہیں اہل ہند کو اس امر کی بڑی ضرورت ہے کہ وطن سے باہر اپنے ملکی وقار کو قایم رکھیں، مگر

یہ کوشش اُس وقت تک کوئی نتیجہ پیدا نہ کرے گی۔ جب تک ہندو مسلمان میں حقیقی اتفاق قایم نہ ہو جائے گا۔

صوبہ جات متحدہ کی کونسل میں بذریعۂ انتخاب داخل ہونے کی مرزا صاحب نے کبھی کوشش نہیں کی، ۱۹۱۶ء میں سر جان میسٹن نے جو اب لارڈ میسٹن ہیں سرکاری حیثیت سے آپ کے کونسل میں داخل ہونے کی ضرورت کو محسوس فرمایا، اور آپ نے اس کو قبول بھی فرما لیا۔ لیکن جب تک آپ کونسل میں رہے آپ نے اپنے وطنی فرائض کو کبھی ہاتھ سے جانے نہ دیا، اور صوبہ کے عام مفاد کے جو مسائل پیش ہوتے رہے اُن میں آپ نے ہمیشہ اپنے غیر سرکاری ہم چشموں کی ہمنوائی فرمائی۔ حیدر آباد آنے سے پہلے آپ کو کونسل کی خدمت کرنے کا موقعہ صرف ڈیڑھ سال ملا۔ سب سے پہلی تجویز جو آپ نے وہاں پیش کی وہ کانشنس کلاز کے متعلق تھی، اور اس ذریعہ سے آپ کسی خاص مذہب کی تعلیم کو کسی امدادی درسگاہ کے عام طلبہ میں لازمی ہونے سے باز رکھنا چاہتے تھے۔ آپ نے مثال میں مسیحی مدارس کو پیش فرمایا جہاں عیسائی مذہب کی تعلیم باوجود سرکاری معاونت حاصل کرنے کے تمام غیر عیسائی طلبہ کے لئے لازمی ہے۔ لیکن اس کے منظور کرانے میں مرزا صاحب کو کامیابی نہیں ہوئی۔ مسلمانوں کے جداگانہ انتخاب کے اصول پر جو حملے اُس وقت کونسل میں ہوتے تھے اُن کے لئے آپ نے ہمیشہ سپر کا کام اس وجہ سے دیا کہ مسلمانوں کے جذبات و خیالات کا لحاظ رکھنا ہندوستان کی آیندہ بہتری کے لئے لازمی ہے۔

مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم منظور ہوئی تو پالےٹکس نے ایک جدید صورت اختیار کی اور پارٹیاں قایم ہو گئیں۔ ان جماعتوں میں سے ایک نے مسٹر گاندھی کی پیروی میں ترک موالات کو اپنے لئے ضروری قرار دیا اور دوسری نے اس اصول کو

پسند کیا کہ جو میدان فتح کر لیا ہے اُس پر علم نصب کر کے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ مرزا صاحب نے آخری جماعت میں شرکت فرمائی۔ اس امر کا اظہار ہمارے لیے دلچسپی سے خالی نہیں کہ جب اسکیم مذکور شائع ہوئی تو غالباً اخبار لیڈر الہ آباد میں اس کے متعلق پہلا مضمون مرزا صاحب کا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ حضور پرنور نے ذریعۂ تار آپ کو میر مجلس عدالت العالیہ کے منصب جلیلہ کے لئے طلب فرمانا چاہا تھا۔

جب مرزا صاحب حیدرآباد تشریف لے آئے تو آپ کو ہند برطانیہ کے پالٹکس سے قطع تعلق کرنا پڑا۔ البتہ دو تین مواقع پر آپ سے زبان کھولے بغیر نہ رہا گیا منجملہ ان کے ایک وہ تھا جب مانٹیگو چیمسفورڈ اسکیم کا پہلا ثمرہ حکومت کی جانب سے قوم کے سامنے پیش کیا گیا، اور یہ اعلان ہوا کہ تنظیم جدید کے مطابق سنہ ۱۹۲۱ء سے عمل ہوگا۔ اسی طرح ایک دوسرے موقع پر جب صوبۂ اودھ میں کاشت کاروں کو نئے حقوق دیئے جانے کا بل سرہار کورٹ بٹلر گورنر کی گورنمنٹ نے سنہ ۱۹۲۱ء میں پیش کیا۔ اگرچہ آپ خود بھی تھوڑی بہت زمینداری رکھتے ہیں لیکن آپ نے ذریعہ اخبار پانیر کاشتکاروں کے حقوق کی تائید فرمائی۔ تیسرا موقع وہ تھا جب صوبۂ متحدہ کی گورنمنٹ کی توجہ زراعت کی تعلیم کی جانب دلائی گئی اور اُس پر اصرار کیا گیا کہ زراعتی اسکول کو کانپور کالج کے درجہ پر پہنچا دیا جائے اور اُس کا الحاق الہ آباد یونیورسٹی سے کر دیا جائے۔

غرہ ستمبر سنہ ۱۹۱۸ء کو مرزا سمیع اللہ بیگ صاحب نے میر مجلسی کا جائزہ حاصل فرمایا۔ چھ مہینے تک تو آپ حیدرآباد کی عدالتی تنظیم پر غور فرماتے رہے، اور سنہ ۱۹۱۹ء میں اپنی پہلی جوڈیشل رپورٹ سرکار عالی میں پیش کی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے دل میں یہاں کے محکمۂ عدالت کو مکمل بنانے کا کسقدر

جوش ہے۔ اپنی اس پہلی رپورٹ میں آپ نے یہ دکھلایا ہے کہ اپنے عہد میر مجلسی میں آپ کن اصلاحات کو پیش نظر رکھیں گے اس کے بعد چار سال تک حیدرآباد میں محکمۂ جوڈیشل کی اصلاح کرنے کی کوشش اسی اصول پر کرتے رہے۔ اس عرصے میں محکمۂ عدالت کے بہت سے شعبوں پر نظر اصلاح ڈالی جا چکی ہے، اور ہمیں اس میں سب سے پہلی بات جو نظر آتی ہے وہ یہ کہ جوڈیشل رپورٹ کے تحریر کرنے کا طریقہ بدل دیا گیا ہے۔ اسی طرح ہم دیکھتے ہیں کہ فوجداری و دیوانی مقدمات کا دوران بہ نسبت سابق کے بہت کچھ کم ہوگیا ہے۔ ممالک محروسہ کے قریب قریب تمام اضلاع میں دورہ کرکے منصفوں اور ناظموں کو برسر موقعہ اُن کے نقائص پر توجہ دلائی جا چکی ہے۔

استفسار کرنے پر آپنے فرمایا کہ

"میں نے اپنے (۱۲۶) دوروں میں میر مجلسی کی حیثیت سے قطع نظر"
"کرکے زیادہ تر ایک واعظ کی حیثیت سے کام لیا۔ رجسٹروں اور"
"نمونوں میں ضروری تبدیلیاں کی گئیں عملہ و عہدہ داروں کی تنخواہوں"
"میں اضافہ کی کوشش کی گئی، تاکہ لائق حکام مہیا ہوسکیں منصف"
"جو پہلے (۷۵) کی تنخواہ سے ابتدا کرکے (۱۵۰) پر زندگی ختم کردیتا"
"تھا، آج (۱۵۰) سے ابتدا اور (۳۰۰) پر ختم کرتا ہے اسی طرح درجہ"
"بدرجہ چپراسی سے لےکر عدالت العالیہ کے ارکان تک اضافۂ تنخواہ کی"
"اسکیم سے مستفید ہوئے ہیں۔ تہذیب و ترتیب امثلہ کی کوشش"
"کی گئی ہے۔"

لیکن سب سے بڑی اصلاح جس کا مرزا صاحب کو فخر ہے تفریق اختیارات عاملانہ و عدالتی کی اسکیم ہے۔ آپ فرماتے ہیں:۔

" وقت نفاذ اسکیم مذکور اس کی کامیابی اور اس کی خوبی کی نسبت "
" لوگوں کے دلوں میں بہت کچھ شبہے تھے، اور یہ بیان کیا جاتا "
" تھا کہ یہ اسکیم چل نہ سکے گی۔ کل ریاست سے چند ایسے مقدمات کا "
" حوالہ دیا گیا تھا جو ایک آنے والے طوفان کا مقدمہ سمجھے جاتے "
" تھے، اور اطلاعی سگنل بھی دیدیا گیا تھا۔ سرکار نے اس مسئلہ کی تحقیقات "
" کے لئے ایک چھوٹا سا کمیشن مقرر فرمایا، لیکن جوں ہی کہ ان مقدمات "
" کی احتیاط کے ساتھ جانچ کی گئی تو وہ سگنل صحیح ثابت نہ ہوا جسکو "
" طوفان خیال کیا تھا وہ ہوا کا ایک جھونکا نکلا، جس کو مقامی حالات "
" و شخصی مزاج سے تعلق تھا نہ کہ اسکیم سے۔"

" اسکیم کے نافذ ہوتے ہی خود میں نے اور بعض ارکین ہائیکورٹ "
" نے ممالک محروسہ میں وسیع دورے کئے، اور اپنے ماتحت "
" عہدہ داروں کو نئی صورتیں سمجھائیں، اور ان کو بتلایا کہ بلحاظ وقت "
" و موقع عمل کریں۔ اعلیٰ عہدہ داران مال کی مدد و اتحاد اور ہمارے "
" عہدہ داران عدالت کی خوش سلیقگی دونوں کا یہ مجموعی نتیجہ ہے "
" کہ میں آج وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتا ہوں کہ اسکیم میرے توقعات "
" سے بھی زیادہ کامیاب ثابت ہوئی اب یہ اسکیم ایک معتد بہ زمانہ "
" تک عمل میں آچکی ہے۔ اور اس کی کامیابی کی امیدیں دن بدن "
" بڑھتی جارہی ہیں۔ میں نے اپنے دوروں کے موقعوں پر پبلک "
" کے دلوں کو بھی ٹٹولا۔ میری دانست میں عوام الناس اس "
" اسکیم سے بہت خوش ہیں اور گورنمنٹ کی جانب سے پبلک کے "
" دل میں اس اعتبار میں اضافہ ہوگیا جس کی قیمت کا کوئی اندازہ "

نہیں کیا جا سکتا۔ اُس بچے کے نشوونما کو جس کے پالنے میں میں نے کچھ حصہ لیا ہے اپنے وطن میں سیکڑوں میل کے فاصلے پر بہت خوشی و فخر کے ساتھ دیکھتا رہوں گا۔"

کوئی کلام نہیں کہ جو بات ہند برطانیہ میں کمیٹیوں اور تجویزوں کی نوبت پر ہے وہ اعلیٰحضرت سلطان العلوم خلد اللہ ملکہٗ کی ایک گردش قلم سے حیدرآباد کو چشم زدن میں حاصل ہوگئی، اور مرزا صاحب نے قلمرو آصفیہ کے صیغۂ عدالت کی ترقی و اصلاح کے باب میں جو کوشش کی یا اب کر رہے ہیں اُس کے صلے میں سالگرہ مبارک واقع ۱۳۴۱ھ کے موقع پر پیشگاہ جہاں پناہی سے مرزا یار جنگ کے خطاب کی صورت میں قدر افزائی کا اظہار ہوا، اور دو سال کی مزید توسیع بھی عطا فرمائی گئی جس کی مدت اوائل ستمبر ۱۹۲۵ء میں ختم ہو گی۔

سید منظر علی اشہر۔ قدیم رسالہ عبداللہ حیدرآباد دکن

غزل

از جناب مولوی مرزا تصدق حسین صاحب صدق لکھنوی

کئے آنسو تو ضبط اُٹھنے لگا لیکن دُھواں دل سے
نسیم صبح نے آکر کہا کیا شمع محفل سے

خدا کو بات رکھنی تھی کہ ظالم نے بھی ترس کھایا
کسی کو ورنہ یہ امید کب تھی جذبۂ دل سے

زمانہ تابع فرماں سہی سچ سچ مگر کہنا
کوئی اُس دل سے بھی ملتا ہے جو ملتا ہو جس دل سے

سفینہ ہائے کس ناشاد کا دریا میں ڈوبا ہے
کہ موجیں رات دن سر اپنا ٹکراتی ہیں ساحل سے

ہجوم غم کا احساں ہے کہ کردی کشمکش پیدا
نکل جائیگی اب کوئی نہ کوئی آرزو دل سے

وہیں مجنوں کے عقل و ہوش پر بجلی گرانی تھی
نکالا تھا جہاں منہ اے فلک لیلیٰ نے محمل سے

گلستان دکن میں صدق ہے گرم غزلخوانی
کہو پھولوں سے کیا سنتے ہیں اب نغمے عنادل سے

تجدید محبت

از جناب مولوی سید معز حسین صاحب لکھنوی

عین اسوقت جبکہ میری محبت کا عالم شباب تھا۔ اُس وقت جبکہ ثمر محبت پختہ ہو چکا تھا اُس وقت جبکہ میری امیدیں احاطہ دل سے باہر نکلنے کے لئے ضدیں کر رہی تھیں اُسوقت جبکہ میرا جام تمنا لبریز ہو کر چھلکنے کا موقع تلاش کر رہا تھا' ناخوش آیند حادثات کا میری ہستی مایوس سے تصادم ہوا۔ دلخراش سانحات میرے وجود غیر مطلق پر ہجوم اور ہونے لگے۔ یا خدا! جب میرا مطمئن دماغ اُن گذشتہ واقعات کے صحیفہ کا مطالعہ کرنے کا خیال بھی کرتا ہے تو میں کانپنے لگتا ہوں اور میری روح تحلیل ہونے لگتی ہے۔ برشگال کی مہیب راتیں حسرتناک گھنگھور گھٹا دل کو میرے مطلع دل پر گھیر گھیر کر لاتی ہیں۔ نظر تو کمبخت اختر شماری کی دلدادہ ہے اور سودائے فرقت کی نظر فریب سیاہی پردۂ دیجور کی آڑ میں شکار کھیلنے کی جویا و متلاشی۔ دل کی پژمردگی کا انفعال گواہ ہے' بے دست و پائی کی طرز روش شاہد ہے میں نے رات رات بھر ہاتھ پر ہاتھ دھرے آنکھیں بند کئے گزار دی ہے گھنٹوں کے وہ طمانیت بخش آواز' جو میرے ہمسایہ کے گھڑیالچی کے زبردست ہاتھوں سے تھوڑے تھوڑے فصل سے بجائے جاتے تھے' مجھے ایک وقت موعودہ کی یاد تازہ کراتی تھی۔ اُسی ایک امید پر میری جملہ مسرتوں کا دارو مدار تھا صبح صادق میں جب طیور ہوائے تفریح میں مشغول پرواز ہو کر شادمانی کے ترانے گاتے تو میرے تہیج وحشت کو ایک لذت بخش وقفۂ سکون ہو جاتا۔ سبزہ زار میں شبنم کے قطرے جو جا بجا بکھرے ہوتے اُس پر آفتاب کی کرنوں کا

عکس اگرچہ رہ رہ کر میری آنکھوں میں کھٹکتا مگر میری فریب خوردہ نظر اُس پاک
دام زمردیں سے ہٹنا نہیں چاہتی تھی اُسوقت میرا جوش گرویدگی ایسے نظارے
سے علیحدگی اختیار کرنے کو ایک کٹھن بات خیال کرتا تھا۔ صبح کی زرد زرد دھوپ
جب کرختگی کا رنگ اختیار کر کے اپنی تمازت کو بڑھا دیتی تو میرا سلسلہ انہماک
ٹوٹ جاتا اور سارا بنا بنایا نقشہ ملیامیٹ ہوجاتا تھا۔ آفتاب خط استوا پر آکر مجھ پر
بیخودی کے دوسرے دور کا دام ڈالتا۔ عشق میں جنوں کی کارفرمائی ازسرِنو
سلسلہ جنبانی کرتی اور آمادہ صحرانوردی ہوجاتی۔ یہ جی چاہتا کہ اپنے آپ کو کسی
بہتے ہوئے آبشار کے بہاؤ میں ڈال دوں۔ کبھی یہ خیال طبیعت کو وجہ خلش
ہوتا تھا کہ کہیں پیروں کے آبلوں سے خارہائے دشت کی کمر ہمت ٹوٹ
نہ جائے اور میری یہ حرکت مخلوق آزاری کے جرم کی حد تک نہ پہنچے۔ یہ سب
کچھ تھا مگر اس بڑھتے ہوئے جنوں کو روکنے کی کوئی زبردست قوت میرے
اسلحہ خانہ ارادی میں نہ تھی جس کی بدولت میں فراق کی دست درازیوں سے
کشاکش میں مبتلا ہوگیا تھا۔ ہائے وہ دن کبھی نہ بھولیں گے جب میرے قلب و
دماغ پر جنوں کی کارفرمائی ہوچکی تھی۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی دلدوز صدا
مجھے چونکا دیتی تھی اور اس صدا سے میرے قدم زمین میں گڑ جاتے تھے کوئل
کا دل برما جوالی آواز اور پپیہے کا ترانہ میری رہگزر سماعت سے ہوتا ہوا دل تک
اور دل سے آنکھوں تک آکر گداز جگر کی صورت میں میرے دامن پر شبنم افشانی
کرتا تھا۔ حالات و واقعات ایسے تھے کہ اُس عالم میں میں اُن سُروں کو الاپتا جو
کسی گل صنعت متین اور سرو قد کی بیوفائیوں پر دال ہیں۔ گاتے گاتے جب میری
دردناک آواز گلوگیر ہوجاتی تو مایوس ہوکر زبانِ حال سے اپنی وارداتوں کا اسکو
شہید قرار دیتا اور بیساختہ فرش زمین پر تھرتھرا کر گر جاتا۔ ہائے وہ سماں اب تک

میرے پیش نظر ہے جبکہ میرے ان بیتابانہ اندازوں پر غنچہ ہائے ناشگفتہ زہر خند کرکے اپنے ہم جنسوں کی کارگزاریوں کی داد دیتے تھے مگر یہ اُن کی اشتعال انگیز حرکت اُسوقت ضرور لائق سرزنش ہوتی اگر یہ شگفتہ ہوتے اور دنیا کے نشیب و فراز کا نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر تجربہ حاصل کرچکتے۔ موجیں موج میں آکر اپنے خالق کی حمد و ثنا میں تر زبان ہوتی تھیں مگر میں اپنی دُھن اور اپنی زبان میں اُنکا ہمنوا ہوکر اُسکو پکارتا تھا جو عرصے تک میرے ویران خانۂ دل میں متمکن رہا ہے غرض ہر آواز کے ساتھ خواہ وہ ماتم خیز ہو یا طرب انگیز میں بھی اپنے پُر درد نغمے کو شامل کرکے کسی کے دربار حُسن میں استغاثہ کرتا تھا اس لئے کہ رونا پٹینا اور اظہار درد کرنا کسی قید یا قاعدے کا محتاج نہیں سچ کہا ہے۔ ؎

فریاد کی کوئی لَے نہیں ہے　　نالہ پابند نَے نہیں ہے

اسی طرح رات دن فریاد و فغاں کرتے میں نے کئی ناخوشگوار برس کاٹے۔ مجھے کیا خبر تھی کسی ظلمات شب یک بیک جوئے شیر نمودار ہوگی۔ سوختہ سامانی میں تجلی برق کی ایک جھلک نظر آئے گی۔ فلک حُسن کی رعنائیوں اور برکتوں والے ستارے کا میرے گھر پر نزول ہوگا۔ بخت برگشتہ چشم زدن میں پلٹا کھاکر خضر رہِ محبت بن جائیگا اور مجھے کھینچتا ہوا سرچشمۂ حیات پر پہنچا کر اور آب تلطف سے سیراب کرکے زندہ جاوید کردیگا۔ میرا تاریک اور اوداس مسکن بقعۂ نور ہوجائے گا اور میری امیدوں کو روز روشن میں منزلت معراج نصیب ہوجائیگی ٹھیک اُسوقت جبکہ میں اپنی مردہ آرزوؤں کو روتا پٹیتا ہوا اپنے جھونپڑے کے ایک گوشہ میں اپنا سر زانوؤں میں ڈالے بجس و حرکت بیٹھا ہوا تھا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز میرے کانوں میں آئی پھر آئی اور پھر آئی میرا استغراق ٹوٹا اور میں نے خیال کیا کہ وہی دوست نما دشمن ہوں گے جو کبھی

کبھی میرے زخمِ جگر پر نصیحت کی نمک پاشی کے لئے آتے اور میری انہماک میں مخل ہوتے ہیں۔ میں اٹھا۔ لڑکھڑاتا ہوا چلا۔ دروازہ کھولا۔ دروازے کا کھولنا تھا کہ مجھ پر حیرت کا عالم طاری ہوگیا۔ اب میں کونین سے بیخبر ہوں، میری قوت امتیازی اپنا فرض ادا کرنے سے عاری ہوگئی ہے۔ میں نے آنکھوں کو بار بار ملا، حواس درست کئے، دیکھتا کیا ہوں کہ حسن و عشق کا ایک نورانی مجسمہ میرے روبرو کھڑا ہے۔ ہائے ایسے الفاظ کہاں سے لاؤں جن سے اسوقت کا میرا دلی جذبہ بہ حوالۂ قلم ہوسکے اور اُن غیر مترقبہ فرحتوں کا اندازہ کیا جا سکے جنہوں نے ایک عالم از خود رفتگی کو مجھ پر محیط کر دیا تھا۔ اُن برق آمیز دزدیدہ نگاہوں کا زمین دوز ہونا اور اُس نازک کلائی کا آہستہ آہستہ متحرک ہوکر جبین ناز تک پہنچنا تھا کہ میرے مسلوبہ حواس عود کر آئے اور وفور مسرت سے گریۂ خوشی مجھ پر طاری ہوا۔ میں آنسو کی طرح لرز کر اُس کے قدموں پر گرا اور مجھ پر غشی طاری ہوگئی۔ کچھ دیر بعد افاقہ ہوا۔ آنکھیں کھلیں تو اور ہی سماں نظر آیا اب میرا سر اُس کے زانو پر ہے اور میرا رُواں رُواں عالم وجد میں اس شعر کو بار بار دہرا رہا ہے۔ شعر

زانو پہ ہو اُس کے سر اور جان نکل جائے ۔ آنا تو مسلّم ہے ارمان نکل جائے

کچھ درد بھی ہے دلمیں کچھ ذوق مسرت بھی ۔ کچھ ہجر کی آفت ہے کچھ وصل کی حسرت بھی
کچھ اور ارادہ ہے اس شوخ ستمگر کا ۔ ہے ہاتھ میں خنجر بھی برہم ہے طبیعت بھی
اللہ مری کیونکر تربت میں بسر ہوگی ۔ بیتابی دل بھی ہے اور قبر کی وحشت بھی
اک جان ہے دو صدمے اللہ ہی حافظ ہے ۔ نقصان دل و دیں بھی سوز غم فرقت بھی
سو ظلم سہے اُسکے اف تک نہ زباں سے کی ۔ ہے ایک ہی لاکھوں میں اطہر کی طبیعت بھی

سید محبوب علی اطہر

نقش قدم

از جناب مولوی مرزا مہدی خاں صاحب کوکب

چھٹا باب

کھلا ہوا دروازہ

یوجین اوپر کس لئے آیا؟ کیا میرے انتظار میں نیچے بیٹھے بیٹھے اُکتا گیا تھا اور اس لئے اوپر چلا آیا کہ دیکھے میں نے اپنی گفتگو بیاٹریس کے ساتھ ختم کر لی یا نہیں؟۔

شاید ایسا نہیں تھا۔ کیونکہ ایسی صورت میں وہ مس ہاتھورن کے کمرے کے دروازے پر ٹھہر جاتا۔ نہ یہ کہ اُس غلام گردش کا سارا طول طے کر کے اپنے کمرے تک آتا۔

اُسے وضعداری اور عزت کا اسقدر پاس اور لحاظ ضرور تھا کہ وہ ہرگز دروازے کے پاس ٹھہر کر سننے کا ارادہ نکرتا۔ بلکہ اُسکو معلوم ہو جاتا کہ ہماری گفتگو ختم ہو چکی ہے کیونکہ کوئی بات اُسے سُنائی نہ دیتی۔

میں نے ایسا خیال کیا کہ میں شاید سب کچھ سمجھ گیا ہوں۔ مگر یوجین کو اُس سے بہت زیادہ معلوم تھا جس قدر اُس نے مجھ سے کہا تھا مجھے پورا یقین تھا کہ اُس نے اپنی حسین محبوبہ کو رات کے وقت زینہ سے نیچے اترتے دیکھا ہوگا اور کیا عجب ہے کہ اُسکو اس فعل کا ارتکاب کرتے ہوئے بھی دیکھا ہو۔ اگر فی الحقیقت یہی بات تھی تو اس کی یہ عجیب حرکت بیوجہ نہ تھی۔ شاید اسکو

بیاٹریس کارتون کو نیند میں چلنا معلوم تھا اور شاید اس کو اس بات کا بھی یقین ہو گیا تھا کہ بیاٹریس نے یہ کام اس لئے کیا کہ جج ٹریورز اُس کے کسی گہرے راز سے واقف تھا جس کی وجہ سے اُس کو اس پر پورا قابو حاصل تھا مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ ان میں سے کون سی وجہ تھی۔ لیکن وہ بیشک ایک خوفناک حالت میں گرفتار تھا۔

مجھے اُس کی حالت پر افسوس ہوا اور اُس کے چہرے پر پریشانی کے آثار نظر آئے۔ میں تیار تھا کہ اُس کو اپنا پورا رازدار بنالوں اور اپنا حال اُس پر ظاہر کردوں لیکن نہ ابھی سے بسبب اُس جھگڑے کے جو شب گزشتہ اُس میں اور اُس کے چچا میں واقع ہوا تھا اور نیز اس وجہ سے کہ اُس کے چچا کے دفعتہً مرجانے سے اُس کو کوئی نفع پہنچنے والا تھا۔ اس لئے بالفعل اُس کو حالت بیم ورجا میں رکھنا ہی مناسب تھا۔

"اُس پر لازم ہے کہ اپنی صفائی پیش کرے" میں نے اپنے دل میں یہ سوچکر اُس کو غور سے دیکھنا شروع کیا۔ جبکہ وہ اپنے ہاتھوں کو پیچھے رکھے ہوئے کمرے میں اِدھر اُدھر ٹہل رہا تھا اور اُس کے بڑبڑانے کو بھی میں اچھی طرح سُن سکتا تھا اس کے بعد وہ چلتے چلتے ایکدم ٹھہر گیا اور اپنا ہاتھ پیشانی پر رکھا گویا کہ سخت کرب میں مبتلا ہے اور کہنے لگا "مجھے خوف ہے کہ میں دیوانہ ہوجاؤں گا اگر وہ یہاں تلاش کرکے اُس چیز کو ڈھونڈھ نکالے تو کیا انجام ہوگا مگر ایسا نہ ہونا چاہیئے۔

اس نے کسی بات کا مصمم ارادہ کرلیا اس کے بعد دروازے تک گیا اور اُس کو بند کرکے مقفل کردیا کہ کوئی اندر آنہ سکے۔ پھر الماری کی طرف بڑھا اور اوپر کے خانہ کو کھول اُس میں سے کوئی چیز نکالی اور اُسے غور سے

دیکھنے لگا۔

میں اُس چیز کو دیکھ سکتا تھا کیونکہ اُس کی پیٹھ میری طرف تھی لیکن اُس کا عکس سامنے کے آئینہ میں نظر آتا تھا۔

اگر میں کہوں کہ مجھے حیرت ہوئی تو شاید صحیح نہ ہو لیکن یقیناً ذرا تعجب ہوا جب میری آنکھیں اُس چیز پر پڑیں جس کو اُس نے الماری کے خانے میں سے نکالا تھا۔

وہ ایک بستہ نوٹوں کا تھا جو دونوں طرف سے نیلے فیتے سے بندھا ہوا تھا۔

جج کے میز کے خانے کے خالی ہونے کا راز تو اب حل ہو گیا۔ کیونکہ وہ بستہ یوجین کے پاس تھا۔ اور اسی نے اُسے نکال لیا تھا۔

اس نے اُسے کچھ خوشی سے ہاتھ نہ لگایا۔ بلکہ بظاہر تنفر کے ساتھ اُسکو چھوا۔ میں نے اُسے چاقو نکالتے ہوئے دیکھا جس سے اُس نے فیتے کو کاٹ ڈالا اور دیا سلائی روشن کر کے اس کو جلایا اور بالکل جل جانے تک اُس کو دیکھتا رہا۔

جب وہ فیتا بالکل جل گیا تو وہ دوبارہ الماری کے پاس گیا اور چند نوٹ نکال کر اپنی جیب میں رکھ لئے اور پکار کر کہنے لگا "خدا میرا گناہ بخشے"

اُس تابدان کی طرف اس نے آنے کا ایک وقت بھی ارادہ نہیں کیا جہاں میں چھپا ہوا تھا اور یہ میرے لئے بڑی خوش قسمتی کی بات تھی۔

جب اُس نے بقیہ نوٹوں کو الماری کے خانے میں رکھ کر اُس کو مقفل کر دیا تو کمرہ سے باہر جا کر آئینہ سے نیچے اترا۔

میرے کمرے سے نکل جانے کا یہی موقع تھا جس سے میں نے فائدہ

اٹھایا اُس بستے کو یوجین کے ہاتھ میں دیکھ کر میں ہکا بکا ہوگیا۔
کیا اُس نے اُس بستے کو اپنے چچا کے میز کے خانے میں سے اُس کے قتل کے آگے نکال لیا تھا یا بعد قتل کے؟
ان دونوں صورتوں میں بہت بڑا فرق ہے کیونکہ اگر اُس نے بعد نکالا ہے تو شاید وہ کوشش کر رہا تھا کہ بیاٹریس کو بچائے۔ اور ایسا ظاہر ہونے دے کہ کوئی چور مکان میں آیا ہے اور اُس خطر سے بالکل بے پروا نظر آتا تھا جو خود اس کی نسبت عائد ہوتا تھا۔
اور وہ رقم جج کے مرنے کے قبل نکال لی تھی تو اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اس نے ایک جزم کے چھپانے کے لئے دوسرے جزم کا ارتکاب کیا تھا۔
اگر میں تحقیق اس مقدمہ کے واقعات سے واقف ہوتا تو یقیناً سب الجھاوے بالکل صاف ہوجاتے ہیں سیڑھیوں سے اتر کر نیچے گیا۔ یوجین ملاقات کے کمرے میں کوچ پر لیٹا ہوا تھا۔ میرے داخل ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ "اہا۔ آپ فارغ ہوگئے۔ مسٹر کرافرڈ؟"
"جی ہاں۔ اُس طرف سے تو فارغ ہوچکا ہوں"۔
"آپ نے کچھ دریافت کیا؟"۔
"میں نے بعض چھوٹی چھوٹی باتیں ذہن نشین کرلی ہیں جو شاید بکار آمد ہونگی مس ہاتھورن بہت محتاط تھیں۔ ان کے جوابات تو بعض ایسے تھے کہ کسی وکیل کو بھی حیرت میں ڈال دیں گے"۔
اُس نے فوراً میری طرف نگاہ کی۔ "آپ جانتے ہیں کہ وہ جرحی سوالات کی عادی نہیں ہیں۔ اسی لئے وہ خاموش رہی ہوں گی"۔
"بہت ٹھیک۔ اب اگر زحمت نہ ہو تو پکانے والی کو میرے پاس بھیج دیجئے"۔

وہ باہر چلے گیا اور پانچ منٹ میں ایک عورت کمرے میں داخل ہوئی۔ یہ پکانے والی تھی جو کسی قدر عمر رسیدہ تھی۔

مجھے اُس کے اخلاق پسند نہیں آئے کیونکہ اُس نے میرے ساتھ کسی قدر بے اعتنائی برتی تھی اور اپنی بڑائی جتانی چاہتی تھی۔ لیکن ساتھ ہی میں نے دیکھا کہ وہ قابل قدر عورت ہے اور وفادار نوکر۔

"شاید تم ہی میری ہو؟"

"جی ہاں۔ جناب"۔

"میری۔ مہربانی کر کے دروازہ بند کرلو اور یہاں میرے روبرو بیٹھ جاؤ۔ میں چند سوالات تم سے کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ ان کے جوابات صاف صاف دو گی۔ کیونکہ میری غرض یہ ہے کہ اُس بدمعاش کا پتہ لگاؤں جس نے تمھارے آقا کو قتل کیا"۔

"کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ میں نے قتل کیا ہے؟"

"میرے دل میں ہرگز ایسا خیال نہیں لیکن تم اُسوقت مکان میں تھیں اور کچھ آوازیں تم نے سنی ہوں گی۔ یا شاید کوئی اور چیز دیکھی ہو گی جس سے پتہ چل سکے"۔

"اُس کے چہرے پر تسکین کے آثار ظاہر ہوئے پھر میں نے شروع کیا"۔

"تم کتنی مدت سے اس مکان میں ہو؟"

"تقریباً سترہ برس ہونے آئے ہیں"۔

"بیشک۔ یہ ایک وفادار ملازم کی علامت ہے یقین ہے کہ جج صاحب تم کو قدر کی نگاہوں سے دیکھتے ہوں گے"۔

"مجھے یقین ہے"۔

"اس کے قبل تم کہاں تھیں"۔

"میں نے چند سال ہسپتال میں نرس کا کام کیا تھا لیکن وہ کام مجھے ناپسند تھا اس لئے چھوڑ دیا"۔

"یوجین نے اس کا ذکر مجھ سے کیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ تم مردے کے ساتھ تنہا رہنے سے نہیں ڈرتی ہو جیسی بستی ڈرتی ہے"۔

"خدا آپ کا بھلا کرے صاحب۔ اس کی مجھے کچھ پروا نہیں"۔

"اچھا تو اب کل رات کے متعلق میری تم کس وقت سونے کے لئے اپنے کمرے میں چلی گئیں"۔

"ساڑھے دس بجے"۔

"سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے تم کتابخانہ کے کمرے کے پاس سے گذری ہوں گی؟"۔

"جی ہاں۔ صاحب"۔

"کیا اُسوقت مسٹر یوجین کتابخانے میں اپنے چچا کے پاس تھے"؟

"مجھے یقین ہے"۔

"کیا تم نے ان کو دیکھا"؟

"نہیں صاحب"۔

"تو تمھیں کیونکر معلوم ہوا"؟

"میں نے ان کو باتیں کرتے ہوئے سُنا۔ دروازہ بھڑا ہوا تھا"۔

"مجھے معلوم ہوا ہے کہ یوجین اور اُن کے چچا میں سخت جھگڑا ہوا تھا"۔

"مجھے معلوم ہے کہ یوجین اپنے چچا کے الزامات سے اپنے آپ کو بچاتا ہے"۔

کیا وہ غصہ میں تھے؟"

"یوجین؟ ہرگز نہیں۔ بلکہ وہ مردانہ طور پر گفتگو کرتے تھے جس سے اُن کے چچا کو غصہ آ گیا تھا۔"

"میں بہت خوش ہوا کہ یوجین خفا نہیں ہوئے۔ اب یہ بیان کرو کہ تم کس وقت بیدار ہوئیں اور تم نے پیچھے کا دروازہ بند نہیں کیا تھا۔"

"پھر آپ سے کس نے کہا؟"

"یوجین نے مجھ سے کہا کہ تم کس طرح سے ایسے سویرے نیچے اتر کر آئی تھیں جبکہ صبح بھی نہیں ہوئی تھی۔"

"لیکن طوفان ختم ہو چکا تھا جب یہ خیال دفعتہً میرے دل میں آیا میں نے ہر چند کوشش کی کہ پھر سو جاؤں مگر ممکن نہ ہوا۔ کوئی چیز مجھے ابھار رہی تھی کہ میں کپڑے پہن کر نیچے جاؤں اور اُس دروازے کو بند کر دوں۔ کیونکہ دیکھیے جناب۔ میں سالہا سال سے اُس کو بند کر دیا کرتی تھی اور مجھے ایسا گمان ہوا کہ شاید کوئی خوفناک سانحہ واقع ہوگا۔ بہرحال دروازہ بند کرنے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو رات کے تین بجکر پانچ منٹ ہوئے تھے جب میں سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔"

"ذرا ٹھہر جاؤ۔ تم نے دروازہ بند کرنے کا ذکر کیا تو کیا دروازہ کھلا ہوا تھا؟"

"بالکل کھلا ہوا تھا اور ہوا ایسی تیز چل رہی تھی کہ میرے ہاتھ میں جو شمع تھی اُس کے بجھ جانے میں کوئی شبہ نہیں تھا۔"

"کیا تم نے اُسے کھلا ہوا چھوڑ دیا تھا جب تم سونے گئیں؟"

"نہیں۔ صاحب۔"

"کیا وہ کبھی آپ ہی کھل جاتا تھا؟ کیا اُسکا قفل مضبوط ہے یا بودا ہے"؟
"کبھی ایسا نہیں ہوا تھا"۔
"تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی نے کھولا ہوگا"۔
"جی ہاں"۔
"یہ کیونکر معلوم ہوا"؟
"باورچیخانے کے فرش پر آج صبح کو تمام مٹی لگی ہوئی تھی اور غلام گردش اور سیڑھیوں پر بھی مٹی تھی اور یہ مٹی کل وہاں نہ تھی"۔
میں نے ان باتوں کو ذہن نشین کرلیا اور سوچنے لگا کہ یکایک والی یوجین کو بچانے کی غرض سے کہیں اپنی طرف سے تو کچھ اضافہ نہیں کر رہی ہے۔ کیونکہ ایسا ظاہر ہوتا تھا کہ اُس کے خیال میں یوجین کی طرف گمان کا احتمال تھا۔ اُسوقت میں نے ایسا خیال کیا کہ شاید واقعات اب سب میرے قبضے میں آگئے ہیں اور باہر کے معاملات کو گہری نظر سے دیکھنے سے میں بالکل بے پروا ہو رہا تھا۔
"تو تم اوپر چلی گئیں"؟
"جی ہاں۔ اور کتابخانے کے دروازے سے گذرتے ہوئے۔ کیونکہ نوکروں کے اوپر جانے کے لئے پیچھے کی طرف کوئی دوسرا زینہ نہیں ہے لیکن میں نے اُس کمرے میں روشنی دیکھی۔ کسی چیز نے مجھے ابھارا کہ اُس کے اندر جھانک کر دیکھوں۔ کیونکہ ہوا جو کھلی ہوئی کھڑکی میں سے آتی تھی اُس سے گیاس کا شعلہ بیحد جھلملا رہا تھا اور چونکہ جج صاحب کو کمرے میں میں کرسی پر دیکھ سکتی تھی۔ مجھے خوف ہوا کہ شاید وہ سو گئے ہوں اور شاید اُن کے ہوا لگ کر زکام ہو جائے۔ لیکن جو نہی میری نظر ان کے چہرے پر پڑی مجھے

یقین ہو گیا کہ وہ مر گئے ہیں اور مر کر سرد پڑ گئے ہیں میرا قدیم تجربہ اس وقت میرے کام آیا اور میں ڈری نہیں۔ اُسوقت مجھے خیال آیا کہ وہ شاید طبیعی موت سے مرے ہوں گے پس میں نے کھڑکی بند کی اور شمع کو اُن کے نزدیک لیجاکر دیکھا تو ان کے دل پر مجھے وہ زخم نظر آیا۔ اور وہ پیلے اور سیاہ داغ اُن کے گلے پر مجھے دکھائی دیئے۔ اس کے بعد میں نے سارے مکان کو جگایا۔ پس میں اتنا ہی جانتی ہوں"۔

"شکریہ۔ بیبی۔ فی الوقت مجھے تم سے کوئی اور بات دریافت کرنی نہیں۔ شاید بعد میں باورچیخانے میں آکر اُن مٹی کے نشانوں کو دیکھوں"۔

"بہت اچھا۔ صاحب"!

وہ سلام کرکے باہر چلی گئی اور وعدہ کیا کہ بسی کو میرے پاس بھیج دیگی ہیں اُسوقت سامنے کی کھڑکی کی طرف گیا اور باہر کی طرف دیکھنے لگا۔

جس وقت میں اُس مکان میں تھا تو شہر نیویارک بیدار ہو چکا تھا چھکڑے اِدھر اُدھر جارہے تھے اور پیادہ چلنے والے لوہے کی بجوں کے پھاٹک میں گذر رہے تھے ہمایوں کو کیا خبر تھی کہ بوڑھے ٹریورز کے مکان میں کیا سانحہ حادث ہوا ہے۔ تھوڑی دیر میں سارا نیویارک اس خبر سے گونج اٹھے گا لیکن فی الوقت تو مجھے فرصت ملی تھی کہ تحقیق میں مصروف رہوں

آئینہ

از جناب مولوی سید محمد عسکری صاحب عدیل لکھنوی

آئینہ میں نے آج جو دیکھا دم سحر　　چہرے پہ خط و خال جو تھے آئے سب نظر
موئے سفید اور بڑھاپے کی جھریاں　　آئیں نظر تو دل پہ ہوا اور ہی اثر

فہرست مضامین

جلد (۲) بابتہ ماہ جنوری و فبروری ۱۹۲۴ء عیسوی نمبر (۱و۲)

نقل جریدہ غیر معمولی

فرمان واجب الاذعان مشتہرہ ۱۷ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ روز شنبہ

فرمان

چونکہ ماہ رجب المرجب کی ۲۹ تاریخ یوم پنجشنبہ خلوت میں ایک تاریخی واقعہ کی یادگار میں (یعنے اعلان ہمارے سجادہ اولی مرحوم و مغفور ... دو صد سالہ حکومت خودمختاری در سلطنت دکن) مقلائی ڈنر ہونیوالا ہے اور غرہ شعبان روز شنبہ کو اسی سلسلہ میں ... صد اشخاص کا انگریزی ڈنر باغ عامہ میں منعقد ہونیوالا ہے لہذا ایکدن کی عام تعطیل یوم پنجشنبہ ۲۹ رجب المرجب تمام ممالک محروسہ سرکار عالی میں قرار دیجائے اور نہ صرف اس سال تعطیل بلکہ ہر سال اسی تاریخ میں تعطیل ہوا کرے گی۔

دربار و ڈنر میں وہی لوگ مدعو ہونگے جن کے نام دعوتی کارڈ تقسیم ہونگے اور دربار میں جو لوگ شریک ہونگے وہ بعد ختم ... اپنی نذریں پیش کریں گے۔

نیز آئندہ ماہ رجب میں حسب عادت میری سالگرہ سے متعلق غرہ کو مقلائی ڈنر کنگ کوٹھی میں ہوگا جس میں وہی اشخاص نذریں پیش کریں گے جو کہ مدعو ہوں گے اس کے سوا دارالسلطنت کے باشندگان و اضلاع سے متعلق میں نے سالگرہ گذشتہ اپنے فرمان مورخہ ۴ شعبان سنہ ۱۳۴۲ھ میں (جو کہ جریدہ غیر معمولی میں شائع ہو چکا ہے) صراحت سے جو ضابطہ قرار دیا ہے اور جس کے اعادہ کی اس جگہ ضرورت نہیں ہے اس کی پوری پابندی ہونی چاہیے۔

نوٹ۔ غرہ رجب کو میں باغ عامہ میں صنعتی نمائش کی افتتاح کرنیوالا ہوں جو مثل سالگذشتہ ماہ رمضان تک کھلی رہے گی اور غرہ رمضان المبارک کو برخاست ہوجائے گی۔ فقط

یہ حکم عوام کی اطلاع کی غرض سے جریدہ غیر معمولی میں طبع کردیا جائے۔

اعلیحضرت بندگان عالی متعالی مدظلہ العالی۔

شرح دستخط مبارک

فہرست مضامین

بزمِ لسان الملک

عرضِ حال خیال تھا کہ جنوری و فروری کی متحدہ اشاعت کے بعد رسالہ ٹھیک وقت پر نکلنے لگے گا۔ مگر ما درچہ خیالیم و فلک درچہ خیال۔ ہم یہ سطور معذرت نامہ کی طور پر نہیں لکھ رہے بلکہ مقصود عرضِ حال ہے۔ معذرت اظہارِ کمزوری کا نام ہے اور کمزوری معذوری کی مترادف جب معذوری ہوئی تو معذوری کس بات کی! البتہ اظہارِ واقعات ضروری ہے۔ مارچ کا پرچہ مارچ میں شایع نہ ہو سکا اور خدا جانے اس التوائے اشاعت سے ہمارے معاونین و ناظرین کے دل میں کیا کیا خیالات گذرے ہوں گے۔ مگر ہم معذور تھے اور معذوری ہر حال میں قابلِ عفو ہے! پہلے تو ہمارے کاتب صاحب پر ایسے واقعات و حادثات [illegible] ناغہ ہونا لازمی تھا۔ نوبتِ ثانی میں خود ہم اور ہمارا گھر بھر علالت کا شکار رہا یہاں تک کہ ۲۰ شعبان پنجشنبہ کے دن ہمارے قلب میں اپنی پوری شکست کیا تھا ظاہر ہو گیا یعنی اسی دن حضرت عم محترم مولانا عبد الغفور اعلی اللہ مقامہ کی دائمی جدائی کی صورت دیکھنی پڑی۔ ہم پر جو گزرنی تھی گذری مگر ساتھ ہی لسان الملک کا بھی ایک قوی بازو ٹوٹ گیا۔ آپ باانہمہ پیرانی محض اسی دھن میں وطن سے حیدرآباد تشریف لائے تھے کہ زبان و ادب کی خدمت گذاری میں ہمارا ہاتھ بٹائیں اور آپ کی وسیع معلومات اور بے نظیر جادو نگاری سے ہمکو علمی امداد کی بہت کچھ توقعات تھیں۔ افسوس روئے گل سیر ندیدیم و بہار آخر شد۔ لسان الملک کی قسمت میں اتنی عزت ضرور لکھی تھی کہ چند ماہ آپ کا نام نامی اس کے سرورق کا طغرائے امتیاز رہے مگر آج ناظرین اسے اپنی جگہ پر نہ پائیں گے۔ ع چہ نقش و دلکش و زیبا کہ از نظر گذرد۔ ہمیکہ چوں مژہ برہم زنیم درگذرد۔ توقع ہے کہ ہمارے احباب مرحوم کے لئے مغفرت کی اور ہمارے لئے توفیق صبر و سکون کی دعا فرمائیں گے تاکہ ہم استقلال و بامرادی کے ساتھ اپنے فرض کو فرض سمجھکر انجام دینے کے قابل رہیں ؛

ایڈیٹر

فہرست مضامین

بزمِ لسان الملک

شکر ہے کہ اس نمبر کے ساتھ لسان الملک اپنی عمر کا پہلا سال اور دوسری جلد ختم کر رہا ہے اگرچہ اس چھماہی میں ایسے اتفاقات پیش آتے رہے کہ رسالہ بروقت نہ نکل سکا جس سے خریداروں کو شکایت اور ہمکو ندامت حاصل ہوئی مگر بریں ہمہ اس قلیل مدت میں جو ناچیز خدمت زبان وادب کی ہم سے ممکن تھی اُسمیں حتی المقدور سعی کیگئی۔ اب اس سعی کے مشکور و نامشکور ہونیکا فیصلہ ارباب ذوق سلیم کے ہاتھ میں ہے۔

اسی سلسلے میں اگر ہم ناقدری زمانہ کا شکوہ بھی کرگزریں تو اسکو شاعرانہ شکوہ و شکایت نہ سمجھنا چاہیئے ہم نے لسان الملک کے شروع اجرا کے وقت یہ ظاہر کردیا کہ لسان الملک کوئی تجارتی پرچہ نہیں ہے اور نہ اُس سے کسی طرح کی جلب منفعت مقصود ہے لیکن اتنی آرزو تو ضرور تھی کہ کم از کم رسالہ کی آمد و خرچ تو برابر ہوجائیں لیکن افسوس ہے کہ یہ آرزو بھی پوری نہو سکی رہے ہمارا وقت اور دماغ وہ ہمیشہ سے زبان اردو کی خدمت تھے اور انشاء اللہ وقف رہیں گے۔

تاج

نہایت مسرت اور فخر کے ساتھ رسالہ تاج حیدرآباد دکن کا استقبال کرتے ہیں جس کے دو نمبر اسوقت تک شائع ہوچکے ہیں۔ تاج کوئی جدید پرچہ نہیں ہے بلکہ کچھ سال پہلے بھی عام ناقدردانی کا شکار ہوچکا تھا مولوی غلام محمد صاحب انصاری وفا کی ہمت مردانہ قابل داد ہے کہ ایک مرتبہ کثیر نقصان اٹھانے کے بعد پھر اب سے اپنے ملک و قوم کی خدمت کا بیڑا پہلے سے زیادہ سرگرمی کے ساتھ اٹھایا ہے خدا برومند کرے اور اہل ملک کو خادمان ملک کی حوصلہ افزائی کی توفیق دے رسالہ کے مضامین دوسرے معاصر رسالوں کے مضامین سے ہر طرح مقابلہ کرتے ہیں۔ لکھنے والے زیادہ تر مقامی اہل قلم ہیں مگر توقع ہے کہ آئندہ باہر سے بھی مضامین آنے لگیں گے۔ حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری اور علامہ مختار احمد صاحب کے محققانہ مضامین خصوصیت سے قابل ذکر ہیں رسالہ کی لکھائی چھپائی کی نسبت اتنا لکھنا غالباً کافی ہوگا کہ مطبع تاج کی چھپائی حیدرآباد کے مطابع میں بہترین سمجھی جاتی ہے۔ کاغذ بھی ولایتی چکنا استعمال کیاجاتا ہے البتہ ٹائیٹل وغیرہ کے گل بوٹے سادگی پسند نگاہوں کو بھلے نہیں معلوم ہوتے مگر ذوق نظر ہے رسالہ کی سالانہ قیمت ان تمام خوبیوں کے ساتھ صرف للعہ ہے اور تاج پریس چھتہ بازار حیدرآباد دکن سے شائع ہوتا ہے۔

علیگڈھ میگزین

اس مرتبہ پرانے قالب میں نئی روح کیساتھ وصول ہوا ہے۔ جناب بیخود نے اپنے دور ادارت کو زیادہ کارآمد و مفید بنانے کا جو وعدہ اپنے تمہیدی مضمون "ماضی و مستقبل" میں فرمایا ہے وہ بہلو سے امید افزا ہے اس سے بہتر کیا بات ہوسکتی ہے کہ میگزین جو طلبائے کالج آرگن ہے اُسمیں زیادہ انہیں طلبہ کا ہے بیخود صاحب اردو زبان ٹیگوری ادبیت کے بار کا متحمل نہیں سمجھتے اور انکا ایسا سمجھنا بالکل بجا ہے کاش آجکل کے نوجوان انشاء پرداز اس نکتے کو سمجھیں کہ خود سمجھے اور دوسروں کے سمجھائے بھی انشا پردازی ہے۔

اطلاع۔ جن خریداروں کا چندہ ماہ جولائی میں ختم ہوجاتا ہے انکی خدمت میں جولائی کا پرچہ بذریعہ وی پی گذرانا جائیگا امید ہے کہ

حضرت اقدس و اعلیٰ نظام الملک آصفجاہ سابع خلد اللہ ملکہٗ

لسان الملک

جلد (۲)	ماہ جنوری و فبروری سنہ ۱۹۲۴ء	نمبر ۱ و ۲

نغمۂ طرب

در تہنیت سالگرہ مبارک

یا خدا دیدہ بہ دیدار کہ حیراں کردم — ساحت جاں زگل حسن گلستاں کردم

حیرت آموز سکندر شدم از کثرت شوق — دل صد پارہ فراچیدم و دکّاں کردم

عشق کردم بہ بتے سادہ رخے خوش نظرے — شدم از کار روے کار لبساماں کردم

نسخہ وحشت من رشتہ شیرازہ نداشت — ساز جمعیت ازاں زلف پریشاں کردم

معنی وصل نہ دانستم و ہجراں گفتم — شوخی عشوہ نہ فہمیدم و حرماں کردم

روستائے املم تخم شرر کاشتہ بود — لاجرم حاصل صد شعلہ بداماں کردم

گے زدم زخمہ بہ ہنجار بہ تار رگ نطق — شکوہ از خویشتنم بود وز جاناں کردم

ہیں چہ پرسی ز طرب جوشی شوقم آنم — کہ بہ تہ جرعۂ خود دعوت رضواں کردم

نہ بذوق مے کوثر نہ پے حور و قصور — ہرچہ کردم بہ رضا جوئی یزداں کردم

لوح پیشانی من نقش اطیعوا میداشت — سجدہ بر در گہ عثماں علی خاں کردم

عشرت آہنگی جاں چوں خم می جوش زدہ — گر آہنگ ثنا خوانی سلطاں کردم

دستہ دستہ گل صد برگ ثنا آوردم — زیں نوا بلبلکاں را بہ نوا آوردم

بند دوم

ہے کجائی بت گلچہرۂ نسریں اندام
بادہ ہموارہ بہار گل و نسرینت بکام

ہلہ برخیز بہ آرایش بزم عشرت
گل بہر گوشہ بیفشاں چو بہاراں بخرام

امر کن امر کہ گرد آورد ست خادم خاص
مطرب و ساقی و صہبا و بط و بربط و جام

حکم دہ عود بیفروزد و عنبر ساید
تا معطر شودت بزم و مزامست مشام

چوں ز حد بگزرد م سرخوشی و مستی ذوق
نبود وسوسۂ شحنہ نہ نہیب نمام

ہے پیاپے بزنم بوسہ براں عارض و زلف
ہے دمادم بزنم تا بسحر بادہ ز شام

بادہ آں جوہر جاں کاں دہدم جوش شباب
بادہ آں قوت رواں کاں برد از دل آلام

بادہ آں نیش کہ نشتر برگ عقل زند
بادہ آں نوش کہ بر زاہد خشک است حرام

بادہ آں روح معطر کہ چکد از انگور
بادہ آں عیش مجسم کہ دہد عشرت تام

بادہ آں برق جہندہ کہ دواند بدماغ
جائے خوں موج حرارت کہ کند پختہ زخام

پختگی ہا بہ سخن مایۂ ناز است ولے
پختہ آں کس کہ کند پیشہ خود مدح نظام

حضرت غیث زمیں غوث زماں ظل اللہ
میر عثماں علی شاہ دکن آصف جاہ

بند سوم

مرحبا اے مہ مسعود کہ نامت رجب است
چہ قدر در جلوت شادی و عیش و طرب است

حیدرآباد شد از مقدم تو خلد بریں
روز و شب بارش باران عنایات رب است

حیرت آئینہ چہ شد ز صفائے در و بام
شہر بلدیست کہ مرکز صنع حلب است

نغمہ شوق طراوش کند از موج نسیم
زمزمہ مضراب ہوا و اشد دل را سبب است

آب نوشیں اثر بادۂ خلد دارد
دانۂ گندم خشکے بطراوت عنب است

طفلک غنچۂ گل ساغر صہبا خواہد
عطش آتش شور تقاضا و نشید طلب است

طفل برنا شود از فیض ہوا نیست عجیب — پیر فرتوت جوانی کن و ساغر بلب است

فاتح باب طرب بود کلید مہ تو — چرخ اکنوں بہواداری مہمان شب است

غرۂ ماہ رجب بسملہ باب نشاط — روز میلاد سلیمان آصف لقب است

میر عثمان علی آں کہ ز شیرینی نطق — ہمسر او بسخن نے عجم و نے عرب است

خسرو علم نواز و شہ دانش پرور — کہ تر و تازہ از و مزرع علم و ادب است

شاد زہی شاد کہ در نشر ہنر میکوشی — بادت آں بادہ گوارا کہ ازیں خم نوشی

بند چہارم

داد را شاہ جہاں بودہ ازیں پیش بسے — من و یزداں کہ چنیں شاہ ندید است کسے

بازلے پاک و لے باکرمے ذی حشمے — عادلے خوش سیرے دادگرے داد رسے

بہر گلزار ہنر دور تو دوران بہار — عہد تو بودہ پے جہل دم باز پسے

از سیاست کہ تواند بہ زند پیش تو دم — راہزن کردہ بہ اقبال تو کار عسسے

حبذا رفعت ایوان عدالت کہ سزد — اگر از پنجۂ خورشید کنندش کلسے

ای زہی سادگی وضع بدیں حشمت و جاہ — کہ رباید زرہ طرز عمل خار و خسے

خورد آوازۂ اکرام تو وقتیکہ بگوش — ز دل بوالہوساں کاست زنگ ہوسے

کار شاعر نہ بود کار تو انشا کردن — کیست ضامن کہ دریں عرصہ جہاں فرسے

چشم بر چشم عطائے تو ہنوزم باز است — گوش گم کردہ رہاں چوں بصدائے جرسے

خود تو انصاف بدہ چپقلش مجلس من — کے بود مرغ چمن لایق کنج قفسے

ہست بس اینقدرم آرزوی دل شاہا — بدعائے تو برآید چو برآید نفسے

خسروا رحمت حق در دو جہاں یار تو باد
بمرادت رود ایں عالم و در کار تو باد

حیدرآباد برغم تبریز

از جناب مولانا عبد اللہ العمادی صاحب

ایران کی ساتویں اور دکن کی چودھویں صدی

فضل و کمال کا معاوضہ حسن و جمال

خواب دیدیم کہ آئینہ معارض بتو شد   میکند صورت این واقعہ حیران ما را

(۱)

ساتویں صدی ہجری کے آخری ایام ہیں، بغداد کا تمدن سیلاب تاتار کی نذر ہو چکا ہے، ہلاکو کا جانشین اباقا سریر آرائے سطوت ہے۔ تبریز جو زبیدہ خاتون کی یادگار تھا آج اس میں تاتاری لشکر کی چھاؤنی ہے، روم و عراق و ایران و توران و ماوراء النہر جتنے اسلامی ممالک تھے سبکے سب کفر کے نرغے میں آچکے ہیں، مصر و شام کی ایک بچی بچائی اسلامی سلطنت رہ گئی ہے جہاں جاکر خلافت نے پناہ لی ہے مگر اب اُس پر بھی چڑھائی کے سامان ہو رہے ہیں، اسی ضرورت سے خود اباقا تبریز میں لشکر زن ہے اور صاحب دیوان (وزیر اعظم) خواجہ شمس الدین محمد پر تاکید ہو رہی ہے کہ مغولستان (مغولیا۔ منگولیا) سے لے کر ایران تک کی تمام فوجیں یک جا کر لی جائیں کہ پوری قوت کیساتھ جامع فسطاط

سکے مناروں پر حملہ ہو سکے

ادھر تو یہ طیاریاں ہو رہی ہیں، اُدھر محقق طوسی کے شاگرد رشید خواجہ ہمام تبریزی کو اطلاع ملتی ہے کہ بغداد کا دوسرا ہارون آج تبریز میں جلوہ گر ہے، صاحب دیوان کے چشم و چراغ (خواجہ ہارون) کی وجاہت کے چرچے کہاں نہ تھے، بڑی آرزوؤں سے وہ اُن کی دعوت کرتے ہیں، جشن شاہانہ کے سامان ہیں، ہارون کے قدوم نے ایک عجیب شان پیدا کر رکھی ہے، اس حالت میں خواجہ ہمام اُٹھتے ہیں وہ اپنی تازہ غزل پیش کرتے ہیں:۔

خانہ امروز بہشت است کہ رضواں اینجاست
وقت پروردن جان است کہ جاناں اینجاست

بر سر کوہ عجب بار گہے می بینم
کوہ طور است مگر موسی عمراں اینجاست

مست اگر نقل طلب کرد بہ بازار مرو
مغز بادام تر و پستۂ خنداں اینجاست

کلبۂ تیرۂ ایں رند گدا، شاہ نشیں
شدہ امروز کہ با مرتبہ سلطاں اینجاست

شکر از مصر بہ تبریز میارید مگر
بحدیث لب شیریں شکرستاں اینجاست

بعد ازیں غم مخور از گردش ایام ہمام
ہر چہ آں آرزوے دل بود آں اینجاست

چہ غم از محتسب و شحنہ و غوغا کامروز
خواجہ ہاروں پسر صاحب دیواں اینجاست

یہ تو ساتویں صدی کا ایک نظارہ تھا، اب چودھویں صدی کا ایک بدیع المثال تاریخی منظر بھی ملاحظہ ہو جو ابھی ابھی نظر افروز ہو چکا ہے،

حیدرآباد عباسیوں کے جلال و جبروت، فاطمیوں کے علم و فضل، غزنویوں کی معارف پروری، اور مغلوں کی عظمت و جاہ کا آج ایک اکیلا علمبردار تہذیب اسلامی ہے، اس وقت یہاں ایک عجیب چہل پہل ہے علم کو ناز ہے کہ

اُس کے تاجدار نے اکلیل سلطنت پر دستار فضیلت کا طرہ لگایا ہے، اسلام کو فخر ہے کہ پادشاہ اسلام نے اُس کی نذر عرفان و حکمت قبول فرمائی ہے، جامعہ عثمانیہ جو نظامیہ بغداد کا وارث ہے آج اعلیٰ حضرت شہریار دکن کی علم پرور بارگاہ میں "سلطان العلوم" کی ڈگری پیش کرنے والا ہے جس کو حضور پر نور سے شرف قبول حاصل ہونے کو ہے، اس بابرکت تقریب کے آثار و مآثر نے شریعت کے خانہ زاد اور حامی شریعت (حضور آصف جاہ سابع) کے ازلی نمک پروردعمادی کے قلب افسردہ کو بھی گرما دیا ہے اور وہ بھی عتبۂ علیہ پر یہ چند خزف ریزے نثار کرنے کو ہے:۔

دکن امروز مدینہ است کہ ایماں اینجاست　　وقت احیائے عظام است، مگر جاں اینجاست
ذرہ ہا دعوے ہمچشمی خورشید کنند　　اثر تربیت مہر درخشاں اینجاست
شکر از نوش لب یار مجوئید دگر　　کہ بشیرینی ایماں شکرستاں اینجاست

شیر در بادیہ، گور و بھکے باش کہ ایں　　حیدرآباد بود حیدر یزداں اینجاست
شرع صولوں اگر اینجا نبود با کے نیست　　مُشْرِعِ شرع نبیؐ حضرت قرآں اینجاست
بہر غرقابی فرعون و نجات اسلام　　رود موسیٰ است مگر موسیٰ عمراں اینجاست

خاتم شرع کجا اہرمن شرک کجا　　دست بردار کہ انگشت سلیماں اینجاست
غرہ بر حیلہ و تلبیس چہ باشد عفریت　　کا مم اعظم سپر آصف دوراں اینجاست

مژدہ دادند کہ از کفر نہ ترسد زنہار　　بعد ازیں دولت اسلام کہ سلطاں اینجاست
چہ غم از فتنہ ایام جہاں را کامروز　　شہ جم مرتبہ عثماں علیخاں اینجاست

مطلع میں "مدینہ" کی ہائے مختفی اپنے مابعد کے ساتھ اتصال ہونے کے باعث گر گئی ہے، کمیت اپنے قصیدہ میں فخریہ کہتا ہے:-

"الا حییت عنا یا مدینا"

سعدی نے کہا ہے:-

"زندہ است نام فرخ نوشیرواں بعدل"

(۳)

یہ نظم عقیدت و نذر اخلاص اگرچہ تمام تر حسب معمول اسلامیات سے متعلق تھی، مگر اعلیٰ حضرت اقدس و اشرف شہریاری خلد اللہ ملکہ و سلطانہ کے پاس ناموس شریعت نے اس کو پسند نہ فرمایا، حضور کی ذات پاک اسوقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی نائب مناب ہے، حق پرستی اس باطل آرائی کو کیونکر گوارا کر سکتی تھی کہ مرجع مدح خود آنحضرت علیہ الصلاۃ والسلام نہ ہوں۔

اب حضور پرنور اید اللہ بنصرہ العزیز کا اعجاز سخن ملاحظہ ہو، کہ تاریکی دروغ کے بعد ہی آفتاب حقیقت کا فروغ دیکھنے کے قابل ہوتا ہے

در مدینہ تو بیا مسکن ایماں اینجاست　رحمت ہر دو جہاں، مظہر رحماں اینجاست

دیدۂ دل بکشا، نور ازل را بنگر　کاز فروغ نبوی جلوۂ یزداں اینجاست

مسند آرائے دنیٰ، صدر نشین طٰہٰ　مہبط روح امیں، حامل قرآں اینجاست

گوید ایں گنبد خضرا کہ، بطور سینا　آنچہ تو می طلبی موسی عمراں اینجاست

تیرگی گر شدہ کافور چہ جائے عجب است　کہ ضیا بخش جہاں، مہر درخشاں اینجاست

تو کہ اے ختم رسل مُہر نبوت داری　ہیچ صد خاتم انگشت سلیماں اینجاست

بدہ اے باد صبا تشنہ لباں را مژدہ　جام توحید بکف ساقی دوراں اینجاست

رفعت روضۂ پر نور چہ پرسی از من برافق کنگرہ اش نیر رخشاں اینجاست
ہمچو جبرئیل امیں خادم و جاروب کشے
بر در پاک تو عثمان علی خاں اینجاست

ان معجزات، ان آیات بینات کو دیکھیے، اور پھر انصاف کیجیے کہ عادی تو کیا چیز ہے، ہمام کی خواجگی بھی اس شان شہریاری کے سامنے کس قدر بے مایہ و بے حقیقت نظر آتی ہے۔ اس واقعہ نے پہلی صدی ہجری کی اُس تاریخ کا اعادہ کیا ہے جو حضور ہی کے گھرانے سے تعلق رکھتی ہے، کہ ایک موقع پر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا اپنے والد کو خطاب کرتی ہیں کہ :-

وَاَبْيَضُ يُسْتَسْقَى الْغَمَامُ بِوَجْهِهٖ

(وہ روشن و تابناک ہستی کہ ابر اُسکے چہرہ سے فیض حاصل کرتا ہے)

ثِمَالُ الْيَتَامٰى عِصْمَةٌ لِلْاَرَامِلِ

(یتیموں کا ملجا و ماوا، بیواؤں کی عصمت کا نگہباں)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ یہ سن کے نہایت ناراض ہوتے ہیں، فرط غضب سے چہرہ برافروختہ ہو جاتا ہے، اور فرماتے ہیں :- ذَالِكَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صلی اللہ عَلَيْهِ وَاٰلِهٖ وَسَلَّمْ (یہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی شان تھی ان صفات کے مستحق صرف آنحضرت صلوات اللہ علیہ تھے)

اللھم اید الاسلام والمسلمین بدوام دولۃ السلطان بن السلطان، الخاقان بن الخاقان، جلالۃ السلطان میر عثمان علیخان وارفع بنشاوالایمان، وبدوبہ الکفر ومزق بہ الطغیان آمین، آمین، اللھم آمین ؛

سلک گہر

از جناب مولانا مولوی سید محمد عسکری صاحب عدیل کنتوری

اُٹھا جو بستر راحت سے آج وقت سحر — ہوئی مناظر قدرت سے فیضیاب نظر

تمام رات جو طے کی ہے منزل مقصود — تعب سے اک ورق نقرہ ہے جبین قمر

ہر ایک نجم زرافشاں کو کرتا ہے تحلیل — چھڑک چھڑک کے تباشیر زرگر خاور

طیور صبح ہیں حمد خدا میں زمزمہ سنج — دلوں پہ ہوتا ہے تا حد فہم اس کا اثر

ترانہ ہے کوئی دلکش کوئی صدا مرغوب — ہر اک صفیر میں ہے رنگ معرفت مضمر

ہیں خوشنما ورق گل پہ قطرۂ شبنم — کف حسیں پہ پرکھنے کو یا رکھے ہیں گہر

روش پہ لالہ و خیری ہیں دار گل کی طرح — زمیں پہ سبزہ بچھائے ہے مخملی چادر

تمام صحن گلستاں ہے اطلس رومی — گئی ہے پھول اڑاتی ہوئی نسیم سحر

نگار خانۂ چینی گرانگاہوں سے — زمین باغ ہے سرمایۂ فریب نظر

صبا جو لائی ہے جھولی میں بھر کے مشک ختن — تو نافہ بن گئی ہے چشم نرگس عبہر

ہر ایک حلقۂ سنبل بھی جعد مشکیں ہے — سواد تبت و تاتار ہے چمن یکسر

ہوا کے ساتھ گئی اڑ کے صحن باغ سے دور — کھلے جو غنچے تو خوشبو کو لگ گئے شہپر

لب گل کاغذ مختوم ہے جو نافرماں — یقین ہے کہ یہ فصل خزاں کا ہو محضر

شگوفہ ریزی منقار عندلیب چمن — صدائے تار کو دیتی ہے گوشمال اثر

صدا نکلتی ہے شاخوں سے یوں دم جنبش — کہ جیسے ساز طرب کو بلائے خنیاگر

عروس بنکے جو آئی چمن میں فصل بہار — نثار کردیا غنچوں نے مٹھیوں سے زر

نہ کس طرح سے چمن ہو بہار کا مشکور — ہر ایک شاخ کو پہنادیا نیا زیور

دورویہ صحن چمن میں کھڑے ہیں تازہ نہال — کہ جیسے آمد سلطاں میں با ادب لشکر

بنے ہیں صفحہ مینو تمام دشت و جبال　　ہر ایک جادۂ صحرا ہے یا خط مسطر

مطلع

جہاں میں کیوں نہو ارزاں متاع علم و ہنر　　عروس فکر نے پہنا ہے آج پھر زیور
ہوا ہے عالم معنی مجمل سراپا سے　　بنا ہے نقش تصور جمال سر تا سر
جمال وہ جو ہو آئینہ صفات جمیل　　جمیل وہ جسے سمجھیں بدیع اہل نظر
کہیں فریب نظر ہے نظر فریب کہیں　　یہ ایک شے کہیں منظور ہے کہیں منظر
کسی نگاہ میں لیلیٰ کسی جگہ مجنوں　　کسی خیال میں صورت کسی میں صنع زرگر
کبھی ہے کاہش جاں اور کہیں ہے خواہش دل　　عرض کہیں ہے کسی جا ہے عقل کا جوہر
کہیں ہے عقدۂ لاحل کہیں بساط نشاط　　کہیں ہے رہزن ہوش و خرد کہیں رہبر
مواد عسرت و سرمایہ دار عشرت ہے　　کہیں ہے یاس کا مصدر کہیں امید کا گھر
اسی چراغ کا پرتو ہے لحن داؤدی　　اسی ضیا کی زبان کلیم تھی مظہر
لب مسیح یہ جاں بخش خلق تھا تو یہ تھا　　زبان احمد مرسل یہ تھا یہی رہبر
یہی ہے امر مجسم برائے ہر آمر　　یہی ہے ناظم مدح نظام گردوں فر
خدایگان زمیں خسرو خلیل نوال　　وسیلہ کرم و لطف حضرت داور
حضور آصف سابع نظام ابن نظام　　بفر ہمال فریدوں بہ بخت اسکندر
نہ کیوں ہو وجہ جلالت یہ شان عثمانی　　ہے میرے شاہ یہ مہر کنندہ خیبر
چلیگی اب نہ تری سفلہ پروری اے چرخ　　یہ دور حسن عمل کا دکھا رہا ہے ثمر
زمانہ دیتا ہے ملک دکن کا اسکو نشاں　　جو پوچھتا ہے کوئی امن و عافیت کا مقر
کسی بشر کو نہیں شر سے اب تعلق کچھ　　کہ عہد شاہ میں راحت سے ہو رہی ہے بسر
شرور و شور جہاں کے سرور سور بنے　　یہ خلق خلق یہ صلح و صلاح کا ہے اثر
تری مثال نہیں عالم مثال میں بھی　　گیا خیال کئی مرتبہ ادھر سے اُدھر

ہے جشن سالگرہ پھر مرے حضور کا آج / لگا ہے نخل مراد جہاں میں تازہ ثمر
یہ دن وہ ہے کہ تمنا میں جسکی مردم چشم / سب بنے رہے ہمہ تن انتظار شام و سحر
یہی وہ روز مبارک ہے جسکے آنے کی / دعائیں کرتے ہیں بعد فریضہ سارے بشر
یہی وہ روز ہمایوں ہے جسکے جلوہ سے / ہوئی ہے ڈھونڈھ کے اک سال مستفید نظر
ہر ایک شہ کے نمکخوار کے لیے یہ دن / ہے میمنت میں کہیں عید فطر سے بہتر
سناؤں باعث ترجیح سامعین کو میں / نہیں بیان حقیقت میں حق نیوش کو ڈر
خوشی ہے عید میں روزوں کے بعد روزی کی / زکواۃ جسم ہے روزہ بحکم پیغمبر
مگر ہے سالگرہ میں یہ موجب عشرت / کہ با جلالت و اقبال و جاہ و کر و فر
ہزار شکر ہمارے ولی نعمت نے / کیا ہے سال بصد فرح و انبساط بسر
بھری ہے دلمیں خوشی صورتیں ہیں سب بشاش / تمام ملک میں شادی رچی ہے پھر گھر گھر
بڑے تپاک سے کرتے ہیں دعوتیں احباب / نیاز و نذر میں ہوتا ہے صرف مال و زر
کہیں ڈنر ہے کہیں پارٹی کہیں اٹ ہوم / ہے دیدنی یہ نئی روشنی کا بھی منظر

مطلع ثالث

میں ان یکاد پڑھونگا برائے دفع نظر / فلک پہ دیدۂ حیرت ہیں یا مہ و اختر
جو انتظام کیے ہیں نظام سابع نے / بچشم غور انھیں دیکھتے ہیں اہل نظر
جو لوٹتے تھے پڑے جہل کے اندھیرے میں / اب آج علم کی مشعل انھیں کی ہے رہبر
عمارتوں سے بنا شہر قرطبہ کی نظیر / ہر ایک کوچہ ہے جنات عدن کا ہمسر
وہ حوض بنگئے کہتے تھے سب جنھیں تالاب / بنا جو حضرت عثماں کے نام سے ساگر
مکان مجلس عالیہ از رہ انصاف / تمام ہند میں یکتا ہے ہر طریقے پر
علاوہ اس کے دواخانے اور دار العلم / ہر ایک اپنی جگہ پر ہے ایک سے بہتر
تمام شہر میں محراب و در منازل کے / ہیں فرط حسن سی ابروے لعبتان تتر

خراب و خستہ مکانات بن گئے گلزار
زمین کو تکتا ہے حیرت سے گنبد اخضر

اگرچہ جنگ میں یورپ کی بھی حضور نے کی
بہت فراخدلی سے اعانت قیصر

مگر یہ کام جو جاری تھے سب رہے جاری
نہ بل پڑا کبھی والا ہمم کے ابرو پر

علاوہ اس کے جو آئی بلائے قحط و پلیگ
پڑا خزانۂ شاہی پہ آ کے اس کا اثر

لیا کبھی نہ رعایا سے ایک پول سیاہ
کسی کا اور بھی دنیا میں ہے یہ قلب و جگر

منائیں خیر نہ کس طرح ایسے آقا کی
فریضہ جانتے ہیں ہمتو اسکو شام و سحر

تمام ساکن گیتی عبید احساں ہیں
زبان سے نہ کہیں پر قلوب پر ہے اثر

یہ مختصر سا قصیدہ ہے مشتے از خروار
جو شاہنامہ لکھوں میں تو ہوں کئی دفتر

عدیلؔ شاہ سخن سنج خود مبصر ہیں
زباں سے کچھ نہ کہو پیش کر دو سلک گہر

دعائے حسنؔ

از نواب محمد حسن الدین خاں بہادر

یارب! دل مسلم کو پھر پہلی سی طاقت دے
وہ جوش دے پہلا سا، پہلی سی وہ ہمت دے

اس قوم کو پھر اس کی کھوئی ہوئی عزت دے
پہلی سی وہ شوکت دے، پہلی سی وہ رفعت دے

بگڑے ہوئے پھر ان کے سب کام بنا دے تو
دنیا کی نگاہوں میں پھر ان کو بھی وقعت دے

توحید کے ساغر سے پھر کر دے انہیں سرخوش
پھر جوش حمیت دے، پھر دین کی غیرت دے

بیدار انھیں کر دے، پھر خواب سے غفلت کے
ظاہر کی بصارت دے، باطن کی بصیرت دے

گزری ہوئی شوکت بھی پھر یاد انھیں آئے
اسلاف کے شیوہ سے، پھر انکو محبت دے

سینہ کو حسنؔ کے بھی، پر جوش بنا یارب!
اسکو بھی مرے مولا! قومی کوئی خدمت دے

تجلیات

از منظر علی اشہر

ازچیست کہ منزلگہ عشرت دل و جانست ازچیست کہ ہر دیدہ بہ گردوں نگرانست

ازچیست خلایق بہ تمنائے سر نو این ماہ رجب ہست کہ ماہ رمضانست

رجب کا چاند سقف آسمان پر ابروے نگار کی طرح ایماے شادی وعشرت کر رہا ہے۔ خلقت کے دل میں مسرت کا دریا موجیں مار رہا ہے والی ملک اور ولی نعمت کی مبارک سالگرہ کا زمانہ آگیا۔ رعایا برایا کے دل باغ باغ ہیں شہر کے ہر گلی کوچہ میں تزئین و آرائش ہو رہی ہے۔ ہر نمکخوار دولت اپنے آقا کی خوشی میں حصہ لینے کے لیے بیتاب ہو رہا ہے ایسے موقع پر ہمارا جوش نمکخواری بھی اسکا مقتضی تھا کہ لسان الملک کے اس نمبر کو حضرت اقدس و اعلی کے عہد میمنت مہد کے برکات کے تذکرے سے بارونق بنائیں۔

یوں تو بادشاہ ہمارے عقیدہ میں یونہی ظل اللہ ہے اور اُسکی اطاعت رعایا کے ہر فرد بشر کا فرض عینی ہے لیکن خوش نصیب اُس ملک و قوم کے جہاں راعی و رعایا کے تعلقات خوشگوار ہوں جہاں بادشاہ رعایا کی فلاح و بہبود کا خواستگار اور رعایا اپنے مالک و آقا کی جاں نثار ہو اس اعتبار سے ہمارا ملک دکن جسقدر اپنی خوش قسمتی پر ناز کرے وہ کم ہے اُس مالک الملک حقیقی کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے ہمارے سروں پر ایسے بیندل معدلت گستر اور رعایا پرور بادشاہ کا سایہ ڈالا جو شب و روز اپنے ملک اور اہل ملک کی بہتری کا جویاں اور اُنکی ذہنی و مادی ترقی کا دل سے خواہاں ہے حضرت اقدس و اعلی کے

روشن کارنامے ایسے نہیں کہ انکا احصا چند صفحوں میں کیا جا سکے۔ اسکے لیے تو دفتر کے دفتر درکار ہیں ان صفحات میں لطور خراج عقیدت عہد ہمایوں کے مختصر حالات ناظرین کی دلچسپی و مسرت اندوزی کے لیئے درج کیے جاتے ہیں۔

اعلیحضرت ۴ ماہ مبارک رمضان ۱۳۲۹ھ کو سریر آرائے سلطنت ہوئے اور ۱۷ ماہ مذکور کو تخت نشینی کا دربار منعقد ہوا۔ حضور پر نور کی سریر آرائی پر تمام مملکت ہند بلکہ تمام قلمرو برطانیہ میں مسرت کا اظہار کیا گیا۔

شاہی زندگی اس عنوان کو دیکھکر ہمارے ناظرین کے دماغ میں یہ خیال آیا ہوگا کہ ہم حضور پر نور کے آرام و آسائش کا ذکر کریں گے مگر ایسا نہیں ہے۔ جس نفس کو خداوند عالم نے اپنے سوا کرور مخلوق کی خدمتگزاری کے لیئے مقرر فرمایا ہو اسے اسکے سوا اور کس امر میں آرام مل سکتا ہے کہ شب و روز خدمت خلق میں مصروف رہے، اور یہ امر واقعہ ہے کہ حضور کو اسی میں آرام ملتا ہے کہ رعایا کی فلاح کے لیے اپنے وقت عزیز کو صرف فرماتے رہیں۔ حضور کی زندگی ابتدا سے ابتک سادہ رہی ہے۔

کسی سلطنت کی رعایا کے گوناگوں تعلقات جس طرح ہمیشہ اپنے حکمران کو اپنی جانب متوجہ رکھتے ہیں، یہی حال ہمارے حضور کی رعایا نوازی کا ہے، کہ ہمیشہ رعایا کی سود و بہبود کے مسائل بندگان عالی کے پیش نظر رہتے ہیں۔ رعایا کے جن مقدمات و معاملات کو حضور کی دست بوسی کا شرف حاصل ہوتا ہے، اُن پر غور کامل کے بعد حضور حکم ثبت فرماتے ہیں حضور کے احکام نہ صرف اس وجہ سے محکم ہوتے ہیں کہ بادشاہ کے احکام ہیں بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ حسب موقع انصاف پر مبنی ہوتے ہیں، ہمارے نزدیک قابل عزت ہیں۔

اصولاً امرا سلطنت کی زینت اور حکومت کی قوت ہوتے ہیں اور حضور پر نور

کے نامور سلسلہ اجداد میں اس طبقہ کی اصلاح و فلاح سے ہمیشہ دلچسپی کا اظہار کیا گیا ہے۔ خود حضور اپنے امرا سے اتنے قریب کے اور ایسے شگفتہ تعلقات رکھتے ہیں کہ مملکت آصفیہ کا طبقۂ امرا حضور کا ثنا خوان پایا گیا ہے۔ حضور پرنور اپنے امرا کو حسب ضرورت یاد فرماتے اور کبھی بہ نفس نفیس اُن کے یہاں تشریف لے جا کر اُن کی عزت افزائی فرماتے رہتے ہیں۔ امرائے دولت و اعیان سلطنت کو وقتاً فوقتاً سرافرازیوں کا افتخار بھی حاصل ہوتا رہتا ہے۔

حضور کی یہ خصوصیت صرف امرا کے ساتھ مخصوص نہیں ہے، بلکہ علما و صوفیہ کے مکانوں اور اُن کی مجلسوں میں بھی تشریف لے جا کر، وعظ و پند سماعت، فرماتے ہیں۔ اور یہ اس امر کی بیّن دلیل ہے کہ حضور کے دل میں ایک اہل علم اور ایک صاحب کیف کی کتنی قدر ہے۔ حضرات صوفیہ سے حضور کو خاص عقیدت ہے۔ صاحبان فضل و کمال کی قدردانی حضور کے لوازم سلطنت میں سے ہے، اور جب کسی فن کے ماہر کے ساتھ صلۂ سلوک کا موقع آتا ہے تو بے حد مسرت کے ساتھ دست کرم بلند فرماتے ہیں۔ حضور کی اس معارف نوازی کے باعث نہ صرف پائے تخت میں بلکہ مختلف حصص ہند و دکن میں علمی فیض کے چشمے جاری ہیں، اور حضور کا دست کرم نہ صرف ان ممالک کے مستحقین کی جانب بلند ہوا ہے بلکہ دور و دراز ممالک کے باشندے بھی حضور کے فیض و عطا سے محروم نہیں رہے ہیں۔

حضور پرنور جس روز سے تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوئے ہیں بہ نفس نفیس انتظام مملکت میں حصہ لے کر اپنی رعایا کی صلاح و فلاح کو

اپنے اوپر لازم قرار دے لیا ہے۔ ذاتی طور پر مہمات سلطنت کی بجاآوری سے جو وسعت نظر حصول کو حاصل ہوئی ہے اُس کا لازمی نتیجہ یہی ہو سکتا ہے کہ حکومت کے ہر شعبے میں مناسب اصلاح کر کے اس کو اس مرتبہ پر پہنچا دیا جائے کہ ایک جانب باشندگان ملک کی ضرورتیں کما حقہ پوری ہو سکیں، اور دوسری طرف قلمرو آصفیہ ہر حالت میں ممالک متمدنہ کیساتھ دوش بدوش چلنے کے قابل ہو جائے۔ یہ حضور کی توجہات شاہانہ اور فکر عالی کا نتیجہ ہے کہ ملک کی اکثر اخلاقی، تعلیمی، اور معاشی تحریکات کو سرسبزی نصیب ہوئی ہے۔

کئی سال تک قلمرو آصفیہ کو عالمگیر جنگ، موسمی امراض، اور قحط سے مسلسل سابقہ پڑتا رہا ہے۔ لیکن حضور کے شاہانہ عزم و استقلال میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے پایا، اور مہمات سلطنت خسروانہ تدبر کیساتھ حسب معمول انجام پذیر ہوتے رہے۔ تعلیم، حفظان صحت و طبابت، فلاحت، صنعت و حرفت، ریلوے، اور تعمیرات و آبپاشی ملک کے ایسے مفید اور زندگی بخش شعبے ہیں جن کی جانب خصوصیت کے ساتھ توجہات شاہانہ مبذول رہے ہیں۔ بلدہ اور مضافات کے میونسپلٹی کے طرز کار کو وسعت دے کر اور لوکلفنڈ میں ضروری اصلاح فرما کر حضور نے اہل ملک کے اس شعبۂ زندگی کو بہت بلند فرما دیا ہے۔ اختیارات عاملانہ و عدالتی کی تفریق دوسرے حصص ہند میں ابھی کمیٹیوں اور تجویزوں کے حدود میں ہے۔ لیکن حیدرآباد میں حضور کی ایک گردش قلم سے چشم زدن میں بروئے عمل آگئی۔ باب حکومت کو قائم فرما کر حضور نے اہل ملک کو ترقی کی جانب

قدم بڑھانے کا خاص موقع عطا فرمایا ہے۔

تعلیم

لیکن اعلیٰ حضرت کو اہل ملک کی تعلیم سے جس قدر دلچسپی ہے اُس کا اظہار چند سطروں میں نہیں کیا جاسکتا۔ اس باب میں حضور کے فیوض و برکات کے نشانات قلمرو ہند کے گوشہ گوشہ میں پائے جاتے ہیں۔ ہم اس موقع پر صرف اس امر کو دکھانا چاہتے ہیں کہ خود حیدرآباد کو حضور کے اس چشمہ سے کس قدر فیوض حاصل کرنے کا موقع ملا۔ تعلیم کے باب میں سب سے پہلی بات تو ہمیں یہ بیان کرنی ہے کہ ۱۳۱۵ف میں سرکار آصفیہ کے جملہ اخراجات (۳۶۶٫۶۱) لاکھ روپے کے منجملہ تعلیم پر صرف (۶٫۵۸۱) لاکھ کی رقم صرف ہوتی تھی۔ لیکن حضور پرنور نے اس ضرورت کو محسوس فرمایا اور اپنے عہد میں تعلیمی اخراجات کو ترقی دے کر اب سال رواں (۱۳۳۳ف) کے لیے منجملہ دیگر اخراجات سلطنت (۶۹۵٫۶۴) لاکھ روپے کے (۶۸۵٫۰۵) لاکھ تک پہنچا دیا ہے۔

تقریباً پانچ سال ہوئے جب جامع عثمانیہ کے قیام کے متعلق فرمان خسروی شرف صدور لایا تھا، اور اُسی زمانے میں سرکار کی علمی مجلس دارالترجمہ نے اپنا کام شروع کرکے ملک کے انشا و ادب میں ایک انقلاب عظیم پیدا کردینے کی ابتدا کردی تھی جو ہنوز جاری ہے اس عرصے میں جس قدر تعلیمی تجربات کیے گئے ہیں اُن سے اُن خیالات باطلہ کی کافی تردید ہوچکی ہے جو اُس وقت معاندین تعلیم نے قائم کیے تھے۔ اس جامعہ کے فنون (آرٹ) و حکمت (سائنس)

کے شعبہ جات میں طب و قانون کے دو کالجوں کا اضافہ ہو چکا ہے۔ اس طرح علم تعمیر اور صنعت و پیشہ وری کی درس گاہوں کی تجاویز ہنوز زیر غور ہیں۔ جامع عثمانیہ کی عظیم الشان عمارات پر صرف کرنے کی غرض سے ستر لاکھ روپے کی منظوری پیشگاہ خسروی سے عطا فرمائی جا چکی ہے۔ اس جامعہ کے اسٹاف میں بڑے بڑے علما و فضلا اس وقت چشمہ علم سے طلاب کو فیضیاب فرما رہے ہیں۔ ان میں یورپ کے تعلیم یافتہ بھی ہیں اور مصر و عرب کے فاضل بھی، اور ایک پروفیسر صاحب۔ تو جاپان کا عملی تجربہ بھی رکھتے ہیں۔

جامعہ عثمانیہ کی بڑی غرض یہ ہے کہ شہر علم کا دروازہ ہر کس و ناکس پر کشادہ ہو جائے اور کوئی بھلا آدمی جہالت کی تاریکی میں نہ رہنے پائے۔ تعداد کے اعتبار سے بھی طلبہ میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے اور وقتاً فوقتاً نئی ضرورتوں کے لیے مکانات کرایہ پر لیے جا رہے ہیں۔ کئی مدارس فوقانیہ کے منجملہ دو میں کالج کے پہلے سال کا نصاب جاری کر کے اُن کو انٹرمیڈیٹ کالج کا اعلے درجہ عطا فرمایا جا چکا ہے تاکہ شہر و مضافات کے طلبہ کی تعلیم میں بھی آسانیاں پیدا ہوں۔ چونکہ جامعۂ عثمانیہ کی غرض عام باشندگان ملک کو چشمۂ علم سے سیراب کرنا ہے، اس لیے اُس میں انگریزی ادب، سنسکرت شاعری، ہندو ویدانت، عربی تاریخ، اور جرمن حکمت کو کشادہ پیشانی کے ساتھ جگہ دی گئی ہے۔ بلاتفریق مذہب و ملت ان سب کو ہر شخص حاصل کر سکتا ہے۔

فوقانی و تحتانی تعلیم کے مسائل پر نظر ثانی کی جا چکی ہے، اور اب اُس کو بھی صراط مستقیم پر لانے کی کوشش جاری ہے۔ ہر قسم کی ابتدائی تعلیم کم و بیش آزاد ہے، اور قلمرو عثمانیہ میں اس قسم کے مدارس کی تعداد (۴۳۶۵) ہے۔ مدارس یونیورسٹی کے تحت نو انگریزی ہائی اسکول اور نظام کالج اُن شوقین طلبہ کے لیے قائم ہیں جو انگریزی زبان کو سلسلۂ تعلیم قرار دیتے اور اس امر کے خواہاں ہیں کہ دوسرے حصص ہند کے طرز تعلیم سے فائدہ حاصل کریں۔ دو لاکھ دس ہزار سات سو لڑکے مدارس میں زیر تعلیم ہیں، اور یہ طلبہ قابل تعلیم مردانہ آبادی میں (۳۰ء۱) فی صدی کی نسبت رکھتے ہیں۔

تقریباً پچاس حیدرآبادی طلبہ مختلف مضامین کی تعلیم یورپ اور امریکہ میں حاصل کر رہے ہیں، اور یہ تعداد اُن کثیر التعداد نوجوانوں کے علاوہ ہے جو ایشیائی وظائف حاصل کر کے ہندوستان اور ایشیا کے مختلف حصوں میں تعلیم پا رہے ہیں۔ بحالت موجودہ حیدرآباد میں کالج کے طلبہ پر فی کس چھ سو پینتیس روپے بارہ آنے نو پائی صرف ہوتے ہیں، لیکن ہائی اسکول کے طلبہ پر فی کس ایک سو چار روپے سات آنے دس پائی سے زیادہ اخراجات نہیں ہوتے۔ مڈل اسکول کے طلبہ کے مصارف تو اور بھی کم ہیں، اور تریسٹھ روپے ساڑھے گیارہ آنے سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح ابتدائی تعلیم پر تقریباً اس کے نصف یعنے چھبیس روپے گیارہ آنے سات پائی مصارف فی طالب علم پڑتے ہیں۔ زنانہ تعلیم کو بھی عالی حوصلگی کے ساتھ وسعت

دی جا رہی ہے، اور محبوبیہ زنانہ گرل اسکول قلعہ و آصفیہ کے دوسرے حصص کی اسی قسم کی درس گاہوں کے لیئے بطور نمونہ کے وجود ہیں۔

عثمانیہ سنٹرل ٹیکنکل انسٹی ٹیوٹ کے کشادہ ہو جانے سے یہ امید قوی ہے کہ یہ دارالصنعت عظیم الشان صنعتی کالج ہو کر رہے گا، اور یہاں ہر قسم کی صنعتی تعلیم جاری ہو جائے گی۔ حال ہی میں صنعتی مدارس کی تجدید و توسیع کی کوشش بروئے عمل آئی ہے، اور ایک مبصر کو اس غرض کے لیے مقرر کیا گیا ہے کہ صنعتی مدارس کی توسیع کے باب میں تجاویز مناسب پیش کرے۔ دیہاتی مدارس کے نصاب میں زرعی مضامین کی تعلیم پر سرکار عالی میں غور کیا جا رہا ہے، اور یہی حال دستکاریوں سے متعلق مضامین کا ہے، تاکہ صناعوں کی بستیاں اُن سے فائدہ حاصل کر سکیں۔

طب و حفظان صحت عثمانیہ جنرل ہسپتال، وکٹوریہ زنانہ ہسپتال، اور طبی کالج نہ صرف پیشۂ طبابت کی بلندی مرتبہ کی کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، بلکہ یہ امر طمانیت بخش ہے کہ اس وسیع مملکت میں طبی و صحتی امداد مشرقی و مغربی دونوں طرز پر سال بسال فراخ حوصلگی کے ساتھ جاری کی جا رہی ہے۔ محکمہ جات طب و حفظان صحت میں ایک درجن سے زیادہ یورپ کے تعلیم یافتہ طبیب و ڈاکٹر تو ایسے ہیں جن کو اپنی وسعت نظر کے باعث تمام ہندوستان میں شہرت عام حاصل ہے۔ مغربی طور پر جن ہسپتالوں میں مطب جاری ہے، تازہ ترین معلومات کے لحاظ سے ان میں مریضوں کی تعداد (۲۵ و ۱۱)

لاکھ تھی، اور یونانی طرز کے سرکاری مطبوں میں (۱۴۸۲۷۵) لاکھ۔ پائے تخت میں اطبا کی ایک مجلس بھی دار التشخیص کے نام سے قائم ہے، جس میں ملک کے باوقار اطبا جمع ہوکر دل سوزی کے ساتھ مسائل طب پر مباحث کرتے رہتے ہیں، اور اس ذریعہ سے ان کی معلومات تازہ کی بدولت علم طب میں مفید اضافہ ہوتا رہتا ہے۔

قحط سالی کے زمانہ میں آب رسانی کا مسئلہ اکثر حصص ملک کے لیے تکلیف دہ ثابت ہوا تھا، لیکن حضور پرنور نے لاکھوں روپے کے مصارف سے آب نوشیدنی کے عوض اور کنویں تیار فرماکر اس عام ضرورت کو پورا فرمادیا۔ بحالت موجودہ عثمان ساگر اس مملکت میں آب رسانی کا سب سے بڑا ذخیرہ ہے، اور اسی کے شفاف پانی سے ہندوستان کے چوتھے شہر کے تمام باشندوں کی پیاس سال کے بارہ مہینے بجھاکرتی ہے۔

طاعون، ہیضہ، فصلی بخار، اور دوسرے متعدی امراض کے متعلق ملک کی مختلف زبانوں میں پراز معلومات رسائل شائع کیے جاتے ہیں، اور ان سے قریہ قریہ کے لوگ معلومات اور فوائد حاصل کرتے ہیں۔ متاثرہ مقامات کے حوالی میں منجانب سرکار کیمپ قائم ہوتے ہیں اور دوسرے مقامات پر امراض کے اثر سے بچانے کے لیے لوگوں کی شد آمد پر وانۂ راہداری کے ذریعہ ہوا کرتی ہے۔ دار الحفظان کی نسبت واقف کار لوگ کہتے ہیں کہ اس کا انتظام خوب ہے چیچک برارون کی ایک بڑی فوج چیچک کے متعدی مرض سے بچوں کو بچانے کیلیے ملک کے گوشہ گوشہ میں دورہ کرتی ہے۔

زراعت

حقیقت حال یہ ہے کہ زراعت کے باب میں قلمرو آصفیہ کے وسائل نہایت ہی عظیم الشان ہیں، روئی، تلہن، جوار، چاول، گیہوں حیدر آباد کی خاص پیداوار ہیں، اور گل مہوہ اور دوسرے تخمیر پانے والے پھول قدرتی پیداوار کی طرح اس سرزمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ اراضی مزروعہ کے منجملہ (۲۲۱۴۲۲۹) ایکر زمین پر روئی، (۱۳۰۸۲۲۹) ایکر زمین پر تلہن، (۵۴۳۳۷۹۵) ایکر زمین پر جوار، (۶۳۶۱۳۲) ایکر زمین پر دھان، اور (۱۶۷۶۵۱) ایکر زمین پر گیہوں کی کاشت کی جاتی ہے۔ ملک میں انسان کے زرعی و صنعتی کاروبار میں کام آنے والے مویشی کی تعداد تازہ بہائم شماری کی رو سے (۱۸۷۹۸۵۳۵) ہے۔

محکمۂ زراعت کی جانب سے تقریباً تین لاکھ روپے منتخب تخم خرید کرنے کی غرض سے مزارعین کو تقاوی پر دئے جاتے ہیں۔ بڑے پیمانہ پر نیشکر کی کاشت کا تجربہ اگرچہ کاماریڈی میں کیا جارہا ہے، لیکن بڑے ٹینٹھ کی روئی کی کاشت کے لیے تو ہر جگہ مزارعین کی عملی ہمت افزائی عام طور پر کی جاتی ہے۔ محکمۂ تعلیمات کی جانب سے ایک زرعی کالج قائم کیے جانے کی تجاویز زیر کارروائی ہیں۔ یہ امر ملحوظ رکھنے کے قابل ہے کہ ترقیات عامہ کی تجاویز میں مال گزاری اراضی کی دوامی شرح فی ایکر چار روپے قرار پائی ہے، اور یہ تو ممالک محروسہ سرکار آصفیہ کے خصوصیات خاص میں داخل ہے کہ یہاں کی شرح مال گزاری دوسرے اقطاع ہند سے نسبتاً کم ہے۔ یہ اس امر کی علامت ہے کہ حیدر آباد کے مزارعین کے ساتھ منجانب سرکار رعایات خاص سے کام لیا جاتا ہے۔ قحط کی

فصلوں اور بے آب مقاموں میں کاشتکاروں کے ساتھ معافی کی رعایت ہمیشہ سرکار کے ملحوظ خاطر رہتی ہے۔

حیدرآباد میں جنگلات کا رقبہ (۹۲۸۷) مربع میل ہے، اور صحرائی درختوں کی روئیدگی اور محکمۂ جنگلات کے انتظام میں زیادہ دقت کا سامنا نہیں ہوتا۔

صنعت و تجارت وغیرہ

صیغۂ صنعت و تجارت کی عمر ابھی چار سال سے زیادہ نہیں ہے، اور پھر بھی اس کے کام کی مقدار نہایت حوصلہ افزا ہے۔ اس صیغہ کے تحت صنعت و تجارت زراعت، معدنیات، اور انجمن ہائے اتحادی کو اس وجہ سے یک جا کیا گیا ہے کہ یہ محکمہ جات مل جل کر امن و اطمینان کے ساتھ اپنے فرائض انجام دیں۔

دکن ہر زمانے میں اپنی مصنوعات کے لیے مشہور رہا ہے۔ اگرچہ دیسی مصنوعات جاں بلب ہیں لیکن اب بھی ورنگل کے قالین گلبرگہ کے خیمے اور دریاں، اورنگ آباد کی مشروع، ہمرو، اور چاندی کے ظروف، کریم نگر کا چاندی کا کام، اور بیدر اور نظام آباد کی صناعیاں اس قابل ہیں جنھیں مقابلہ کرنے کی غرض سے حرکات ہند کی بڑی سی بڑی نمائش میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

جدید مصنوعات نے جن کا مدار آگ یا بجلی کی طاقت پر ہے ہم دیکھتے ہیں کہ حضور پرنور کی سرپرستی میں قدم بڑھانا شروع کر دیا ہے، اور وہ دن دور نہیں جب ریلوں کی ترقی، سڑکوں کی وسعت اور پیداوار کی کثرت کے ساتھ ساتھ ملکی مصنوعات میں مزید ترقی ہو۔

ہمارے ملک میں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کے تین کارخانے عرصہ سے چلے آتے تھے، لیکن حضور پر نور کی توجہ سے اب ان میں اضافہ ہوا ہے، اور وہ دن دور نہیں کہ تھوڑے ہی عرصہ میں ہمارے اس قسم کے کارخانوں کی تعداد (۹) ہو جائے گی۔ قلمرو آصفیہ میں روئی کے (۲۱۱) اور دوسری قسم کے (۱۴۶) کارخانے ہیں۔ ان میں برف سازی، سوڈا سازی، کھپریل سازی، استخواں شکنی، آہن سازی، اور آسیا گردانی کے سوا ایسے کارخانے بھی ہیں جن میں پمپوں کے ذریعہ سے پانی چڑھانے کا کام بھی لیا جاتا ہے۔ ملک ریشم کے کارخانے سے بھی خالی نہیں، اگرچہ اس کی جانب ملک کو توجہ کرنے کی بڑی ضرورت ہے۔

جب ہم اس امر پر غور کرتے ہیں کہ تلہن کی پیداوار کے لحاظ سے حیدرآباد دنیا کے بڑے اقطاع میں شمار کیا جاتا ہے، تو یہ امید بھی ہمارے قلب میں جاگزیں ہوتی ہے کہ یہاں بھی تیل اور تیل سے بننے والی اشیاء کے کارخانے افراط کے ساتھ کھولے جائیں گے۔ کرورگیری (سائر) کے نرخ نامہ پر حال ہی میں نظر ثانی کی گئی ہے، تاکہ ملکی اشیاء کی ترقی میں آسانیاں پیدا ہوں۔ ۲۰-۱۹۱۹ء میں گیارہ کرور روپے کی روئی ملک سے برآمد ہوئی تھی، اور ۲۱-۱۹۲۰ء میں جو روئی کے قحط کا سال خیال کیا جاتا تھا پانچ کرور سے کم کی روئی برآمد نہیں ہوئی۔

حضور پر نور کے توجہات شاہانہ سے سرکار عالی کے صیغۂ صنعت و تجارت کی پالسی میں ہمدردی اور روشن خیالی موجود ہے۔ دکن پینٹ و آئل ملس کمپنی، شاہ آباد سمیٹ ورکس، سنگاریتی کولریز جہاں

سے نولاکھ ٹن کوئلے کی سالانہ برآمد ہوتی ہے، اور عثمان شاہی کاٹن ملس وغیرہ کو اُن کے ضروریات کے مناسب حال شاہانہ امداد دی گئی ہے تجربات یا منظر عام پر لانے کی خاطر، نیز اس غرض سے کہ عامۃ الناس کو اپنے سرمایہ کے محفوظ کرنے میں اعتبار اور سہولت ہو، سرکار عالی نے کپڑا بننے کے مرکزی کارخانے کے علاوہ صنعتی دار العمل، صنعتی نمائش، برقی ڈائنامو، اور کارخانجات کشید کے انتظام کو اپنے ہاتھ میں رکھا ہے آخر الذکر کارخانوں کے سلسلہ میں الکحل کی تیاری کا اہتمام بھی کیا گیا ہے، تاکہ داخلی و خارجی ضرورتوں کو یہاں سے پورا کیا جاسکے۔

حضور پر نور کی توجہ صرف بڑی صنعتوں کی جانب مائل نہیں ہے۔ جیساکہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں حیدرآباد کو عرصۂ دراز سے اپنی دستکاریوں کی بدولت شہرت و قبول عام حاصل ہے۔ ان کے منجملہ روئی اور دوسری قسم کے تار (دھاگے) ہیں۔ چنانچہ ممالک محروسہ میں اس امر کی کوشش بھی جاری ہے کہ سوت کاتنے اور دستی کپڑا بننے کو دوسری دستکاریوں کے ساتھ ساتھ ترقی دی جائے۔ بحالت موجودہ قلمرو آصفیہ میں پارچہ بافوں کی تعداد (۶۰۹۳۲) ہے، اور تقریباً ڈھائی ہزار مزارع اپنے فالتو وقت کو پارچہ بافی کے کام پر صرف کرتے ہیں۔ بڑی خوشی کی بات یہ ہے کہ لوگ زنانہ و مردانہ ضروریات کے ہر قسم کے کپڑے تیار کرتے ہیں۔ جدید طرز کی کارگاہیں اچھی کثرت کے ساتھ جاری ہو رہی ہیں اور اُن کی اشاعت کے لیئے پارچہ بافی کے مرکزی کارخانے میں جوانان ملک کو کام سکھانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ پارچہ بافان مملکت کو موقع دیا جاتا ہے کہ صنعتی نمائش گاہ میں مقابلہ

کریں۔ ابھی بہت زمانہ نہیں گزرا کہ نمائشی گاہ پٹنہ میں حیدرآباد نے اپنے پارچہ بافی کے نازک کام کی بدولت طلائی تمغا حاصل کیا تھا۔

یہاں یہ کہنا خلاف موقع نہ ہوگا کہ ہمارے ملک میں دو طریقوں پر مصنوعات کو ترقی دی جاسکتی ہے:۔ ایک تو یہ کہ ہم مال برآمد پر غور کریں، دوسرے یہ کہ جن خام اشیار کی ہم ممالک غیر کو برآمد کرتے ہیں اُن کے کارخانوں کو خود اپنے ملک میں ترقی دیں۔ زرعی مصنوعات کی ترقی کسی ملک کی حقیقی ترقی ہے، اور ہمارے ملک کو اس کی بدرجۂ غایت ضرورت ہے۔ دستکاریوں کے باب میں بھی ہم اس دستور العمل کو اختیار کرسکتے ہیں کہ جو مفید دستکاریاں ہمارے ملک میں اب باقی ہیں یا زندہ ہوسکتی ہیں ان کی فراخ حوصلگی کے ساتھ امداد کرتے رہیں اور جو دستکاریاں دوسرے حصص عالم میں ہیں اُن کو اپنے یہاں رائج کرنے کی کوشش میں مشغول رہیں۔

انجمن ہائے اتحاد باہمی کی تحریک ملک میں استقلال کے ساتھ اپنے قدم جمارہی ہے۔ (۱۳) مرکزی اور (۱۴۷۲) ابتدائی انجمنیں جن کے ارکان کی تعداد (۳۷۱۷۴) تک پہنچ چکی ہے، ملک کے گوشے گوشے میں اپنا کام کررہی ہیں۔ اکثر انجمنیں تو نفع حاصل کرنے کا کام کرتی ہیں، لیکن بعض ایسی بھی ہیں جن میں ذاتی منافع کو پیش نظر نہیں رکھا گیا ہے۔ پارچہ بافی، بڑھئی گری، کاغذ و پیتیل سازی، اور ذخیرہ فراہم کرنے کے کام کو جہاں ترقی دیجاتی ہے

وہاں نفع کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ پارچہ بافی اور ریشم کی صنعت کو اس محکمے کی جانب سے بڑی امداد مل رہی ہے۔ بہ حالت موجودہ انجمن ہائے اتحادی کا سرمایہ تقریباً (۹۱) لاکھ روپے ہے۔

حیدرآباد میں ٹپہ خانہ (ڈاک خانہ) کا انتظام سرکار عالی ہی کا ہے، اور باوجود اس کے کہ یہ محکمہ خسارے کے ساتھ چلایا جا رہا ہے پھر بھی بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ محاصل ڈاک میں اضافہ کر کے پبلک کو غیر ضروری طور پر پریشان نہیں کیا گیا ہے۔ سال گزشتہ میں محکمے کی حالت بہت کچھ اصلاح پذیر ہو گئی ہے، اور اس محکمے کی آمدنی میں بھی اضافہ ہوا ہے۔ سیونگ بنک کا طریقہ اگرچہ ہمارے ڈاک خانہ جات کے لیے نیا ہے لیکن پھر بھی اس میں حیرت انگیز ترقی ہوئی ہے۔

تعمیرات و آب پاشی

شوق تعمیر کے لحاظ سے ہمارے حضور کو شاہجہان ثانی کہنا چاہیئے۔ اسی لحاظ سے حیدرآباد کے سیغہ تعمیرات عامہ کی دو شاخیں: عام و آب پاشی دو مختلف معتمدین کے تحت اپنا اپنا کام کر رہی ہیں۔ شاخ عام کے ہاتھ میں سرکاری عمارتوں اور سڑکوں کا ایک زبردست پروگرام موجود ہے۔ باب حکومت، عدالت العالیہ عثمانیہ، عثمانیہ سٹی کالج، عثمانیہ جنرل ہسپتال اور جامع عثمانیہ کی وسیع و رفیع عمارتیں اسی محکمے کی یادگار ہیں اور رہیں گی۔ شاخ آب پاشی کے پیش نظر آب پاشی و آب رسانی کا کام ہے۔ عثمان ساگر، حمایت ساگر، اور نظام ساگر، نیز اسی قسم کے بہت سے بڑے بڑے تالاب

مع اپنی وسیع نہروں کے شاخ آب پاشی کی مفید یادگار رہیں گی۔ ان کے سوا تقریباً چالیس کرور روپے لاگت کی تجاویز ابھی سرکار عالی کے زیر غور ہیں جن سے ایک جانب آب پاشی میں آسانیاں پیدا ہوں گی اور دوسری طرف برقی قوت حاصل کی جائے گی۔ وہ زمانہ دور نہیں جب خانگی اور صنعتی اغراض کے لیئے ارزاں نرخ پر برقی قوت حاصل ہوسکے۔

آرائش و تزئین بلدہ کے ذریعے سے پایۂ تخت آصفی کی رونق میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے، اور یہ کوئی تعجب کی بات نہ ہوگی اگر تھوڑی عرصے میں بلدہ جنت کا ٹکڑا بن جائے گا۔

چمنستان دکن

از جناب مولوی سید علی نواز صاحب تصور رضوی امانت خانی

اللہ اللہ ہے کیا منزلت شان دکن
کونسی سرخی سے لکھا گیا عنوان دکن

لمعۂ نور سے معمور ہے حیدرآباد
شعلۂ طور بنا شمع شبستان دکن

ذرہ کو مہر جہانتاب بنا دیتا ہے
جب نکل آتا ہے خورشید درخشان دکن

صاف یہ منہ پہ سکندر کے کوئی کہہ آئے
حیرت آئینہ ہے طینت پاکان دکن

موج ہر قطرے میں ہر موج میں دریا دیکھا
کہتے ہیں فیض رواں جسکو ہے باران دکن

مستیاں دھو رہی ہیں خودنشناسی کا زنگ
صاف کرتی ہے دلوں کو مئ عرفان دکن

اللہ اللہ فلک پر ہے زمین کی تنویر
تارے کہتے ہیں جسے ہیں وہ چراغان دکن

ابروئے شاہد مقصود کے دو مصرعوں سے / بڑھی موزونیت مطلع دیوان دکن

کیوں نہ شیرینیوں کا شور زبانوں پہ رہے / شکرستان حلاوت ہے نمکدان دکن

باغباں چاندنی راتوں میں نظر آتا ہے / عکس مہتاب گل یاسمنستان دکن

قطرۂ خون دل سنگ کو رتبہ یہ ملا / لعل اُگلنے لگی ہر کان بدخشان دکن

چمن نرگس شہلا میں بہار آتی ہے / رنگ میں اپنے جو آتے ہیں حسینان دکن

اے فلک ہیں یہ شعاعیں کہ ہر سو نکلی کرن / پنجۂ مہر ہے یا دست زرافشان دکن

خط قسمت نہ بنے کیوں خط طغرائے بہار / ورق گل پہ لکھا جاتا ہے فرمان دکن

خندۂ صبح، بہار ابدی، جلوۂ گل / چند اسباب ہیں منجملہ سامان دکن

کچھ بھی میدان تصور کی حقیقت نہ رہی / ایسی وسعت پہ ہے گستردگی خوان دکن

کون پابند نہیں سلسلۂ منت کا / کون ہے جو کہ نہیں بستۂ احسان دکن

آصف سابع جم جاہ رعایا پرور / ہیں سلیمان کے مانند سلیمان دکن

حیدرآباد ہے صورتکدۂ چین و چگل / میر عثمان علیخاں ہیں جو خاقان دکن

میر عثمان علیخاں کا مبارک ہے یہ عہد / میر عثمان علیخاں ہی ہیں سلطان دکن

دوسرا مطلع روشن میں کروں عرض ایسا / جو بنے مطلع خورشید درخشان دکن

مطلع

یہی سلطاں ہیں بہار چمنستان دکن / یہی سلطان ہیں تازہ گل دامان دکن

یہی سلطان ہیں عثمان غنی کے ہمنام / یہی سلطان ہیں عثمان علی خان دکن

یہی سلطان ہیں دارا سے سوا حشمت میں / یہی سلطان ہیں آفاق میں کیوان دکن

یہی سلطان ہیں عالم، متشرع، زاہد / یہی سلطان ہیں اسلام میں ایمان دکن

یہی سلطان ہیں انصاف میں کسرئ زماں / یہی سلطان ہیں اک حاتم دوران دکن

یہی سلطان ہیں رکھتے نہیں جو اپنا نظیر / یہی سلطان ہیں کہ ہے جنسے خوش آوان دکن

یہی سلطان ہیں عالم میں عزیز دل خلق — یہی سلطان ہیں کہتے ہیں جنھیں جان دکن
غربا عہد ہمایوں میں نہیں خستہ حال — شرفا خوش ہیں تہ سایۂ سلطان دکن
علما و صلحا و کہہ و مہہ شیخ و شاب — حق یہ ہے کون نہیں زلہ کش خوان دکن
جمع ہیں جامعہ میں دین کے دنیا کے علوم — دیکھے مامون کتب خانۂ ایوان دکن
کیا ہی آرائش بلدہ سے بہار آئی ہے — باغ فردوس کا ہے عکس گلستان دکن
نہریں تالاب بنے خوب زراعت کیلیے — اور ہے صنعت و حرفت سے کچھ اب شان دکن
عہد عثمانی کی کیا ہونگی بیاں سب برکات — منہ ہے چھوٹا کرے کیا وصف ثناخوان دکن
اے تصور بصد اقبال و جلال و حشمت — صد و سی سال سلامت رہیں خاقان دکن
آل و اولاد سے خورسند رہیں شاد رہیں — میر عثمان علیخاں شہ ذیشان دکن
شاہ کو سالگرہ ہو یہ مبارک یارب — رہے ہر سال خوشی کا یہی عنوان دکن

میرا خواب

از جناب مولوی سید معجز حسین صاحب لکھنوی

میرا گزشتہ حزن و اندوہ بلاشبہہ ایک طرفہ سرور پرور تھا اور کس قدر تعجب ہوتا ہے مجھے اُس وقت کی حالت پر کہ میرے جنون کا دور تسلسل مجھے ہر لحظہ سو سو طرح کے مزے دیے جاتا تھا مجھے اپنی ذات پر رشک آتا تھا کہ میرے رنج و اندوہ کے مرحلوں کا آغاز وصل نصیب عشاق کی غیر مترقبہ کامرانیوں کے انجام سے کہیں بلند و بالا ہے۔ ہاں میرا وہ قیمتی انہماک وہ پرکیف استغراق میری جگمگاتی ہوئی حیات کی مکمل تاریخ ہے جس کو میں اب تک

تھوڑا تھوڑا کر کے پڑھتا ہوں آہ میرا وہ عہد معصوم مجھکو ابتک یاد ہے کہ اسطرح کے
سیکڑوں صدمے ہزاروں بلا نصیبیاں کوئی میری قسمت میں لکھدے اور
میری آزادی کو مجھسے رفتہ رفتہ چھینتا جائے حتیٰ کہ ضمیر کی آزادی بھی گھسیٹ لے
میرا وہ ویران غمخانہ ساری دنیا کے شادی خانوں سے زیادہ حلاوت بخش تھا
موسم بہار آتا تو صحرا نوردی کیلیے بیسیوں جنگل مجھے گھر ہی میں ملجاتے تھے جو وقت یکے
مژگان دراز کے تصور میں کٹتا اسمیں دلکے چھالے کانٹوں کی کھٹک سے بے نیاز ہوجاتے
تھے۔ روح کو کیا غرض جو میرے جسم سے متحد ہو کر رہتی وہ تو کیسکے گل عارض میں بوئے دلاویز ہو کر
رہنا پسند کرتی تھی۔ لبو پر مہر سکوت اور دلمیں کسیکے مصحف رخسار کی تلاوت کرنیکا مجھے مشغلہ
رہتا تھا۔ حواس خمسہ سے مجھے سروکار نتھا جب خود روح کسیکے خیال میں کٹ پتلی کیطرح ناچتی
رہتی تھی تو مملکت جسم دلکی بادشاہت پر کس منھ سے ناز کرسکتی ہے غرض یہ تھی ساری روئداد اور
اسوقت کی صاف تمہید جب دنیا ہی میں مجھے جنت کے مزے آتے تھے اور دوری نصیب رہنے
پر بھی رگ گردن سے زیادہ میں اپنے کو اپنے دل آزار سے قریب سمجھتا تھا۔ اسکے بعد ایک دوسرا
زمانہ آیا فرحتوں کا دوسرا دور شروع ہوا وہ کسی نئے اچانک خیال کی کارفرمائی تھی ہاں وہ خیال
یکایک آیا اور اسطرح آیا جیسے الہام ربانی دلمیں آتا ہے مجھے ٹھیک تو یاد نہیں کہ ہوا نے [illegible]
اور کہیں سے اُن آراستہ پھولوں کے گلدستوں کی خوشبو اڑا کر میرے نیم خوابیدہ قوت شامہ کو چھیڑا یا
جو کسیکی درازی عمر کی تقریب میں بنائے گئے تھے یا کسیکی بزم طرب سے مبارک سلامت کے
نغموں کو بہکا کر لائے اور میرے آلہائے سماعت میں جگہ دیگئی غرض دماغ کی چاردیواری میں وجد آور
ترانے اور خوشبو کی لپٹیں کھچا کھچ ہوگئیں۔ درودیوار پر جو اداسی کا غازہ ملا ہوا تھا سنہرے نقش
نمودار ہوتے میں دیکھتا گیا اور مزے لیتا گیا۔ مزے مل رہے تھے لیکن مبہم اور غیر معروف۔ میں دل ہی
دلمیں کہہ رہا تھا۔ اللہ اس کامیاب تصور سے بھی بڑھکر دنیا میں کوئی اور شے ہے۔ یہ جملہ جواب طلب
تھا۔ جواب ملتا لیکن دینے والا کون تھا وہی دیرینہ ذائقہ آمود انہماک وہی مزید ارتریب لے دیکر

یہی دو چیزیں تھیں جو اسوجہ سے جواب نہ دیتی تھیں کہ کہیں مجھے تلاش کی فکر نہ پیدا ہو۔ بہر حال
اب کسی جانب سے جواب کا نہ ملنا میرے لیے قرار شکن ہوتا گیا۔ تلوے کھجلانے لگے آخر کار
مجھے گھر سے نکلنا ہی پڑا باہر آکر میں نے نئے پل کی راہ لی راستہ بھر دیکھتا گیا لوگ جنت کی آرائش
و زیبائش کا تذکرہ کرتے ہیں مجھے یہ معلوم ہونے لگا کہ اللہ میاں نے حیدرآباد کے کوچہ و بازار کیلیے
جنت کی آرائش و زیبائش عیش و عشرت چند روز کیلیے مستعار دی ہے۔ ہاں اگر جنت نورانیات
ہی نورانیات ہے اور اس خاکدان عالم میں اسکا چند روز کیلیے دیا جانا غیر ممکن ہے تو یقیناً اس کی
زیب و زینت کا صحیح چربہ تو دیا جا سکتا ہے۔ غرض نئے پل سے نکلکر میں نے سڑک اعظم جاہی کی راہ
لی اور موسی ندی کے کنارہ کنارہ چلا گیا۔ ایک قدرتی شفاف منظر میری آنکھوں کے سامنے تھا
ندی کے کناروں پختہ سڑکوں۔ دو رویہ چمنوں اور خوبصورت عمارتوں وغیرہ کا اک دلفریب اور
مسحور کرنیوالا عالم تھا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا غیر مرئی دیو کیطرح سائیں سائیں چل رہی تھی۔ یکایک
میری بیداری اسی عالم تصور کیطرف واپس گئی جہاں سے اکتا کر بدقت تمام میں نکلا تھا۔
اور مجھپر خواب کا عالم طاری ہو گیا۔ جائے پناہ بھی اتفاق سے اچھی ملگئی تھی آنکھ بند ہوتے
ہی ایک عجیب و غریب خواب نظر آنے لگا۔ خواب کی حالت میں بھی مجھے یہ فکر لگی ہوئی تھی
کہ کسی ایسی ہستی سے اس معمہ کو حل کراؤں جو زبان حال سے آجکی بارونق چہل پہل کا اظہار
کرے اور جھوٹ کا شائبہ نہو۔ اس اثنا میں جس سر بفلک کشیدہ عمارت کے قدموں میں
لیٹا ہوا تھا اور جسکی چوٹیاں آسمان سے سرگوشیاں کر رہی تھیں میں نے دیکھا کہ دفعۃً ساکنان
ملاء اعلیٰ کا ایک زبردست گروہ آجکی مبارک و مسعود تقریب میں شریک ہونے کے لیے
اسکے مغرور سر پر اپنے قدم رکھتا ہوا نہایت آسانی کے ساتھ اس رشک فردوس حیدرآباد
کی سرزمین میں اتر آیا۔ ہاں ان لوگوں کی مشتاق روحیں بھی اسمیں نظر آتی تھیں جنھوں نے
اپنی حیات کی آخری گھڑی تک ان حسرتوں کو پالا تھا کہ حیدرآباد کی آرائش و
زیبائش اپنی آنکھوں دیکھ لیں اور ظل سبحانی اعلیحضرت نواب میر عثمان علی خاں

بادشاہ دکن کے جدت طراز تخیل کی ٹھنڈے دل سے داد دے لیں۔ غالباً خدا کو اُن کی حسرتوں کی داد دینی منظور تھی کہ اُن روحوں کو جو عہد حضرت غفران مکان ہی میں اپنے اجسام کو چھوڑ کر فضا کے ہمرکاب ہو گئی تھیں۔ عارضی مراجعت نصیب ہوئی اور اتنی اجازت دی گئی کہ وہ اپنے اجسام سمیت آکر حیدرآباد کی موجودہ ترمیمی و تعمیری شان اک نظر دیکھ جائیں۔ غرض وہ آئے اور اچھی طرح ہر ایک چیز کو دیکھ کر بھی نہ پہچان سکے کہ یہ وہی حیدرآباد ہے جو کچھ سال پہلے اُن کی قید حیات میں تھا۔ ہر طرف جو نئی نئی خوبصورت سڑکیں کاٹ کر بنائی گئی ہیں بھول بھلیاں کی طرح اُن پر دشوار گزار ہو گئیں اور وہ ان راستوں میں اس طرح الجھ کر رہ گئے جیسے کسی وارفتہ مزاج کے دل و دماغ پر عشق کی جنوں آمیز مہربانیاں اندھیر مچا دیتی ہیں تو عمر بھر وہ منزل مقصود کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ وہ لوگوں سے چھیڑ چھیڑ کر پوچھتے پھر رہے تھے کہ یہ رود موسیٰ کی پختہ فصیل۔ سہانی سڑک۔ اور اوس پر قرینہ سے یہ سر کشیدہ عمارت کس نے تعمیر کرائی وہ دورویہ چمنستان سدابہار تو ہم نے کبھی دیکھا ہی نہ تھا یہاں کس طرح آ گئے۔ ارے لوگو یہ سامنے والی عالیشان عمارت کیا افضلگنج ہاسپٹل کے لئے بنائی گئی ہے۔ آخر یہ چوندھیانیوالی والی روشنی کیسی اور یہ جگمگاتا ہوا ماجرا کیا ہے اس قدر جلد شہر کو کس نے سنوارا ہے اور ہر طرف مبارک سلامت کا شور کیسا ہے۔ عطریات کے دل بادل یہاں کی فضا میں کس لئے پھیلائے گئے ہیں۔ ہائے ابھی تو ہم جنت میں نہیں گئے۔ کاش وہاں جانے تک جی بھر کے ہمیں یہیں رہنے دیا جاتا۔ بلکہ اُس کے عوض ہماری مستقل زندگی پھیر دی جاتی۔ غرض اُن روحوں پر ایک تحیر کا عالم طاری تھا کہ اتفاقاً ایک ایسے شخص سے اُن کی ملاقات ہوئی جو اُن کو تسلی بخش جوابات دینے پر تیار ہو گیا اُس نے جواب دینا شروع کیا۔ کہ آج حیدرآباد جو عروس البلاد بنا ہوا ہے اُس کا سبب

تعجب افزا نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ دن شہریار دکن اعلیحضرت نواب میر عثمان علیخان بہادر کی سالگرہ کا ہے۔ اُن کی جاں نثار رعیت ایسے فیاض بادشاہ کی سالگرہ ایسے جوش مسرت کے ساتھ مناتی ہے کہ ساکنان ملا اعلیٰ بھی تڑپ تڑپ کر یہاں نکل ہی آتے ہیں رعایا کی یہ جانثاری اور یہ اطاعت اپنے بادشاہ سے کیوں نہ ہو جو ہر طرح اپنی رعایا کے ساتھ سچا درد اور حقیقی احساس رکھتا ہو۔ دیکھتے نہیں ہو حیدرآباد کی تعمیری وضع قطع پر کیسی انوکھی شان و شوکت برس رہی ہے کہ تاریخ کے صفحات بھی اس کے تذکرے سے ہمیشہ جگمگاتے رہیں گے۔ عثمان ساگر اور حمایت ساگر جس کی تعمیر میں کروروں روپیہ صرف ہو چکا ہے اس مبارک عہد عثمانی کی دائمی زرین یادگاریں ہیں حال ہی میں نظام ساگر کی تعمیر کے لئے تین کرور پچیس لاکھ کی منظوری بارگاہ ظل سبحانی سے ہو چکی ہے۔ جس سے آبپاشی کے ذرایع اسقدر وسیع ہو جائیں گے کہ ہماری آئندہ نسلیں ہمیشہ سرسبز رہیں گی۔ عثمانیہ عدالت العالیہ سٹی کالج۔ افضلگنج ہاسپٹل۔ سرائیں۔ مسجدیں۔ پل اور اس طرح سے بیسوں عمارتیں جو اس زمانے میں تیار ہوئی ہیں۔ آپ اپنی نظیر ہیں۔ اضلاع میں بھی ایسے کاموں کا سلسلہ جاری ہے۔ کہیں پل بن رہے ہیں۔ کہیں سڑکیں نکل رہی ہیں۔ کہیں ریل ڈالی جارہی ہے۔ محکمۂ آرایش بلدہ اور صنعت و حرفت سے ملک کو دیرپا رونق و ترقی و یکجہتی ہے۔ الغرض محض رعایا کے آرام و آسایش کے کاموں میں کرور ہا روپیہ پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔ یہ عہد عثمانی کے برکات ہیں کہ جامعہ ملیہ عثمانیہ اور دارالترجمہ میں سارے ہندوستان سے چیدہ اور لائق فرد میں جمع کی گئی ہیں۔ دنیا میں جامعہ ملیہ عثمانیہ اردو زبان کی پہلی یونیورسٹی ہے۔ امید بندھتی ہے کہ تھوڑے عرصے میں عثمانیہ یونیورسٹی بیروت اور مصر کی

یونیورسٹیوں کے ہم پلہ ہوکر دکھائی دے گی۔ تم کو افسوس ہوگا کہ ہم ایسے نور پاش زمانے میں نہ ہوئے۔ لیکن ہاں جس طرح گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں اسی طرح تم بھی واپس نہیں آسکتے البتہ تمھاری نسلیں تو جیتی جاگتی موجود ہیں اور ان برکتوں کو اپنے دامن میں جمع کر رہی ہیں۔ جس کے دست کرم کی ضیا باری جہالت کی تاریکی کو دور کرتی جا رہی ہے۔ علوم و فنون کی نہریں دوڑا دی گئی ہیں جس سے ملک اور بیرون ملک کے باشندے بلا امتیاز قوم و ملت آآکر اپنی پیاس بجھا رہے ہیں۔ یہ وہی مبارک ہستی ہے جس کا دست کرم اقلیم ہند کی متعدد درسگاہوں پر علوم و فنون کا مینہ برسا رہا ہے۔ دور عثمانی میں اردو لٹریچر کی جو ترقی ہوئی ہے اور علوم جدیدہ کو جو اردو کا جامہ پہنایا گیا ہے اس کے بار سے اردو زبان اور اس کے جاننے والے بلکہ سارا ہندوستان کسی طرح سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ ہند کے غالب حصوں میں یہی زبان مروج اور عام پسند ہے۔

رباعی

عالم کہ بعلم خود بدوراں نازد می زیبد اگر نازد و چنداں نازد
اکنوں شدہ منسوب بہ سلطان دکن وقت است کہ خود علم بہ عثماں نازد

کہاں تک ان اصلاحات کو گنوایا جائے جو عثمانی دور میں ہوئی ہیں لیکن اگر کسی اصلاح کی کمی ہے تو وہ منشیات ہے۔ اگر منشیات کو کسی دوسرے رنگ میں ڈھال دیا جائے تو یہ زرین کارنامہ تاریخ دکن میں ہمیشہ یادگار رہکر دور عثمانی کی یاد کو تازہ کرتا رہے گا اور اس کا دوسرے رنگ میں ڈھل جانا درحقیقت معجزہ سے کم نہیں۔ مذہبی احساس رکھنے والی اور غیر اسلامی پبلک کی اسطرف آنکھیں اس امید پر لگی ہوئی ہیں کہ اس برکت پاش دور میں ضرور اس کا بھی استیصال ہوکر رہے گا۔ یہاں تک کہہ کر کہنے والے نے اپنی راہ لی اور اس

نورانی گروہ کا بھی میں اپنے نظروں سے اوجھل ہونا دیکھتا رہا۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے حیرت انگیز کشفی خواب سے بیدار ہو کر اپنے گھر کو ڈھونڈتا ہوا نکلا میرا رواں رواں خوشیوں کے مارے مست ہو ہو کر جھوم رہا تھا۔ اس راز سربستہ کے انکشاف سے جس کے بار گراں نے مجھے اپنے گھر سے ڈھکیلا تھا میں ایسا بیک اور مسرور ہو چکا تھا کہ راستے بھر اپنے شاہ جمجاہ آصف سابع نواب میر عثمان علیخان بہادر خلد اللہ ملکہ کی صحت و سلامتی و شاہزادگان بلند اقبال و شاہزادیان فرخندہ فال کی عمر و دولت و اقبال کی زیادتی کے لئے لحظہ لحظہ پل پل دعائیں مانگتا ہوا چلا۔ الٰہی حوادث زمانہ کو برباد کرنیوالی ایسی تیز و تند ہوا چلے کہ سرزمین دکن پر آنیوالی ساری بلائیں بالا بالا اڑ جائیں اور کانٹے بن بنکر شہ عثمان کے دشمن کی آنکھوں میں کھٹکتی رہیں۔ اُس کے عمر و دولت و اقبال میں حیرت انگیز زیادتی ہو اُس کا نیّر اقبال اوج فلک پر جائے اور مہر منیر بنکر ساری دنیا میں چمکتا رہے اور اُس کی خیرہ کر دینے والی روشنی دشمن کی بصارت کو زائل کر دے وہ اندھا ہو کر سارے جہان کی خاک چھانتا پھرے۔ کوئی دیوار۔ کوئی درخت اور کوئی مکان اُسکو اپنا سایہ اور پناہ نہ دے اور حیدرآباد دکن کی ساری نعمتیں تا قیامت اُس پر حرام ہوں

لاحول ولاقوۃ الا باللہ

از جناب مولوی سید نظیر حسن صاحب سخا دہلوی

دنیا میں کبھی جن سے نہ تھی رسم و راہ
کیا خوب وہی فرشتے واں ہونگے گواہ
اللہ اور اسپہ فیصلہ فرمادے
لاحول ولاقوۃ الا باللہ

ولہ

ہے ریش سفید جن کی اور قلب سیاہ
جنت میں بھی آدھمکے تو اللہ کی پناہ
کوثر پہ بھی جی بھر کے نہ پینے دیں گے
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

122
261

شہید وفا

(۲)

ترجمۂ اینک آرڈن

بسلسلۂ گزشتہ

یہ وعدۂ جاں فزا سُنا کے / قسمت کا لکھا زباں پہ لا کے

یہ لگ گیا کار بار بس یاں / کٹنے لگی انتظار میں واں

آخر وقت سریع رفتار / طے دورۂ شمس کر کے یکبار

پھر لایا نوید فصل گل کی / موسم بدلا بہار آئی

یوں وعدہ کی صبح اچانک آئی / سُن گُن بھی کچھ اپنی نے نہ پائی

اٹھا جو ہیں بیخودی کا پردا / دیکھا تو فلپ کھڑا ہوا تھا

واں قلزم آرزو کو تھا جوش / غرق حیرت یہ خود فراموش

آخر ہوا باب گفتگو وا / وعدے کا ذکر لب تک آیا

خالی الذہن بسکہ تھی وہ / اس یاد دہی پہ چونک اٹھی وہ

پوچھا "کیا ختم ہو گیا سال" / وہ بولا "ہے فصل شاہد حال"

"گدّ یاں ہیزل کی پک رہی ہیں / چلتی ہو تو چل کے دیکھ آئیں"

لیکن اس نے پھر اب کی ٹالا / کرنے لگی حیلہ و حوالہ

بولی کہ "زباں ہوں میں ہاری / پابند ہوں ہر طرح تمہاری

"پر ہے یہ انقلاب ایسا / بدلے گا جو زندگی کا نقشہ"

"فرصت دو ایک ماہ کی اور / کٹ جائیں گے یہ بھی دن بہر طور

حجت نہ پھر اب کروں گی تم سے / مہلت نہ طلب کروں گی تم سے"

یہ سنتے ہی ہو گیا فلپ سُم | آنکھیں ہوئیں ضبطِ آہ سے نم
شوقِ پنہاں نے جوش مارا | حسرت نے ذوق کو اُبھارا
آخر وہ صدائی مرتعش سے | مے نوش کا ہاتھ جیسے کانپے
بولا "اینی تمہاری مرضی | مجھ کو نہیں تم سے عذر کوئی"
مُہلت لو جس قدر ہو درکار | جو تم چاہو کرو ہو مختار"
سُنکر یہ کلام حسرت آگیں | بھر آیا دل۔ آنکھیں ڈبڈبائیں
پھر بھی ٹالا ہی اُسنے یکچند | رکھا عدوں پر اُسکو خرسند
کچھ اس کی وفا کو آزمایا | کچھ صبر و رضا کو آزمایا
کاٹے لیت و لعل میں چھ ماہ | گزرے یوہیں آجکل میں چھ ماہ

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

یہ ڈھنگ کچھ اور رنگ لایا | یاروں کو شگوفہ ہاتھ آیا
دیکھا یہ گانوں والوں نے جب | سمجھے تھے جو ہم غلط تھا وہ سب
بدگوئیوں پر کھلیں زبانیں | منہ جتنے تھے اتنی تھیں زبانیں
دیتا تھا کوئی فلپ کو الزام | رکھتا تھا کوئی اینی کو نام
وہ کہتا تھا اینی کی ہے یہ چال | پھیلا رکھا ہے مکر کا جال
یہ کہتا فلپ کی سب خطا ہے | کج دار و مریز بات کیا ہے
بعضے دونوں ہی پر تھے ہنستے | کہتے تھے ہیں بیوقوف کیسے
قابو نہیں اپنے دل پہ جنکو | بدنامی کا ڈر نہیں کچھ اِن کو
اینی کا پسر تھا مُہر بر لب | کھلتا تھا نہ اُس کے دلکا مطلب
بیٹی کو مگر بہت تھا اصرار | ماں سے یہی کہتی تھی وہ ہر بار
آخر جینے کی کچھ تو ہو آس | گھر کا کہیں دور ہو یہ افلاس

تم کرلو فلپ سے عقد ثانی — ہم سب کا ہے وہ محبّ جانی
باتیں تھیں ادہر کو اسطرح کی — اور حالت اُدھر فلپ کی یہ تھی
فرقت کا روگ جانگزا تھا — امید پہ صرف جی رہا تھا
رشک گل تر تھے وہ جو رخسار — ہوتے جاتے تھے زعفران زار
اس طرح کے تھے غرض جو حالات — تلخ اپنی کی ہو رہی تھی اوقات
غرق حیرت تھی وہ دل افگار — بن پڑتی تھی اس سے کچھ نہ زنہار

* * * * *

آخر رنگ آسماں یہ لایا — لکھا قسمت کا آگے آیا
اپنی کو نہ آئی ایک شب نیند — آتی ہے ہجوم غم میں کب نیند
کی حق سے دعا یہ ہاتھ اٹھا کے — دے تو ہی نجات اس خلش سے
اینک کا پتہ ملے کہاں سے — جیتا ہے کہ اُٹھ گیا جہاں سے
پیدا ہوا یہ خیال جبدم — گھٹنے لگا اور سینے میں دم
کاٹے کھاتے تھے بام و در سب — پُر ہول ہوئی سیاہی شب
اس دیو سیہ نے جب ڈرایا — چقماق سے شمع کو جلایا
انجیل اٹھائی ڈرتے ڈرتے — کھولا ادب پھر ایکدم سے
حیرت زدہ آنکھ بند کر لی — اُس پاک سخن پہ انگلی رکھی
نکلا "تحت النخیل" آیہ — مطلب مگر اس سے بر نہ آیا
کی بند کتاب پھیر لی آنکھ — بستر پہ گری تو لگ گئی آنکھ
جھپکی جو پلک تو خواب دیکھا — اینک اونچی جگہ ہے بیٹھا
سر پر خورشید ہے چمکتا — ہیں چتر لگائے نخل خرما
سمجھی کہ وہ اٹھگیا جہاں سے — خوش ہے اپنے نئے مکان سے

اور یہ ہے وہی تجمل جنت　　ملتی ابدی جہاں ہے راحت

ہے نغمہ سرائے حمد خلاق　　تابندہ ہے سر پہ مہر اشفاق

تعبیر یہ ذہن میں جو آئی　　گھبرائی ہوئی سی جھٹ وہ اٹھی

تھے مضطربانہ دل کے سب طور　　بلوا بھیجا فلپ کو فی الفور

آیا تو لگی یہ کرنے تقریر　　اب تو نہیں کوئی وجہ تاخیر

مانع نہیں عقد سے کوئی بات　　پھر کیوں فرقت میں کاٹیں اوقات

یہ سنتے ہی جی اٹھا وہ گویا　　کہنے لگا شکر ہے خدایا

چاہو تمہیں جب نہوں میں ناکام　　کیوں اٹھ رہے کل پہ آج کا کام

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

آخر پس انتظار بسیار　　لایا امید کا شجر بار

گرجا میں خوشی خوشی جرس نے　　شادی کے بجائے شادیانے

شادی ہوئی ہو گیا گھر آباد　　ناشاد یہ پر ہوئی نہ دلشاد

ملتا تھا نہ چین اسکو اک دم　　کھٹکا سا لگا ہوا تھا پیہم

جس سمت کو جسطرف تھی جاتی　　آہٹ سے قدم کی تھی کچھ آتی

کان اٹھتے بیٹھتے تھے بجتے　　نفریں کوئی کر رہا ہو جیسے

بات آتی تھی ذہن میں کوئی　　آہٹ کیسی صدا ہے کسکی

اک خوف مگر تھا دل پہ طاری　　بیچاری کو زندگی تھی بھاری

جا سکتی نہ تھی اکیلی باہر　　تنہا نہ تھی رہتی گھر کے اندر

باہر سے جب پلٹ کے آتی　　پہروں کنڈی نہ کھولتی تھی

تھے حمل کے چونکہ طور بھی کچھ　　تھا دھیان فلپ کو ادھر ہی کچھ

یعنے یہ جو دل میں وسوسا ہے　　اسکی حالت کا مقتضا ہے

آخر جب ہو چکی ولادت | بیٹے کی دکھائی حق نے صورت
اس تازہ خوشی کے ساتھ یکبار | اس کے بھی بدل گئے وہ اطوار
مدت میں جو نور عین پایا | قلب مضطر نے چین پایا
اب وہم نہ وسوسہ تھا کوئی | دنیا تھی فلپ تھا اور وہ تھی

(باقی دارد) (ضامن کنتوری)

غزل

از جناب نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز

بادۂ وحدت سے پُر دل کا مرے پیمانہ ہے | نعرۂ اللہ اکبر نغمۂ مستانہ ہے
گرد کلفت سے معرّا شست و شو سے بے نیاز | میری عریانی بھی گویا خلعت شاہانہ ہے
ساقی پیماں شکن پر مکیشوں کا زور کیا | گردش تقدیر گویا گردش پیمانہ ہے
یاالٰہی ہو نہ جائے حشر کا دن مختصر | سرگزشت عمر کا میری بڑا افسانہ ہے
وصل کے اقرار پر وہ ہنس کے کچھ کہتے تو تھے | میں نے جانا یہ بھی اک انداز معشوقانہ ہے
برق کا بھی خوف مجھ کو باد صرصر کا بھی ڈر | آڑے بدھے چار تنکے نام کا کاشانہ ہے
غور سے تصویر میری اس نے دیکھی اور پھر | مسکرا کر کہدیا مطلب کا یہ دیوانہ ہے
تنکدہ میں مجھ سے اک آزاد کا دل کیا لگے | جس طرف رخ کیجئے ویرانہ ہی ویرانہ ہے
چلتے چلتے کس لئے گردن پہ میری رک گیا | کیا ترے خنجر میں بھی انداز معشوقانہ ہے
تیغ تولے وہ کھڑے ہیں امتحاں کیواسطے | وقت یہ امداد کا اے ہمت مردانہ ہے

منتظر ہیں بادہ کش باران رحمت کے عزیزؔ
سامنے شیشہ دھرا ہے ہاتھ میں پیمانہ ہے

ذاتی اصلاح

از جناب مولوی عبدالکریم خانصاحب

بسلسلہ گزشتہ

(۱) ہمیں صرف اسی امر کا احساس نہ کرنا چاہیئے کہ ہماری زندگی روزانہ ضایع جارہی ہے۔ ہر لمحہ گھٹتی اور خسارہ ساتھ ساتھ لاتی ہے، بلکہ ایک اور بات بھی پیش نظر رکھنی چاہیئے۔ انسان کو خواہ کیسی ہی طول عمری نصیب کیوں نہو۔ یہ بالکل ہی غیر یقینی ہے کہ ہماری عقل بھی آخر تک اشیا کے صحیح تصور اور الہامی و انسانی علوم کے اکتساب کے لئے ہمیشہ ہمارا ساتھ دے گی۔ اگر اس پر جمود کی حالت طاری ہوگئی۔ سانس پوری کرنے کے لئے نیک و بد ہر صورت میں وقت گزاری ہی پر قانع ہوگیا۔ یا صرف خورد و نوش سے کام رکھا۔ بہت ہمت کی تو خیال آفرینی میں مگن رہا۔ یعنے بندہ ہوا و ہوس ہوگیا، ایسا شخص کبھی فلاح نہیں پائے گا۔ پس اپنی اصلاح کی توفیق، اور فرض کی ہمت، صورت پرستی سے جدائی، ہر لحظہ موت کی تیاری کے لئے تربیت یافتہ عقل کی ضرورت ہے۔ ہر طرح کی قوت زائل ہمت مضمحل ہوتی جاتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے ہمیں اپنی اصلاح کی فکر میں بہت جلدی کرنی چاہیئے۔ نہ صرف اس لئے کہ روزمرہ بلکہ ہر لمحہ ہم موت سے ہم کنار ہونے کے لئے قریب تر ہوتے جاتے ہیں، بلکہ اس وجہ سے بھی کہ سب سے اول قوت مدرکہ پر زوال آتا ہے اور جب عقل و خرد ہی پر ضعف طاری ہوگیا باقی قوت عملی کا راست روی پر قایم رہنا دشوار ہے۔

(۲) عہد طفلی کی خوبصورتی اور جوانی کی رعنائی کو کون نہیں جانتا لیکن

جس شخص نے نیکی اور پارسائی میں ضعیف العمری کے زبانی عطیہ کا انعام حاصل کیا ہو وہ بھی متقدس ضعیفی کے نور میں اپنے اندر ایک دلربا خصوصیت رکھتا ہے مگر کبر سنی کی نورانی روشنی کو وہی اہل بصیرت پہچان سکتے ہیں جو نیکی سے رغبت اور صانع قدرت سے حقیقی محبت رکھتے ہیں۔

بُقراط نے اکثر کامیابی سے علاج کرنے میں لازوال نیک نامی کا شہرہ حاصل کیا مگر خود بستر مرگ سے جاں بر نہ ہو سکا۔ بعض مشہور کاہنوں نے بہت سے آدمیوں کے مرنے کی پیش گوئیاں کیں مگر پنجۂ اجل سے وہ بھی نہ بچے۔ اسکندر اعظم، نپولین، ہلاکو خاں، تیمور صاحب قران، اکثر شہروں اور ملکوں کو تاخت و تاراج و ویران و برباد کرنے اور ہزارہا اشخاص کو میدان جنگ میں موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد، خود بھی موت کا شکار ہو گئے۔

ایک سپاہی نے ڈیمو کریٹس کو ہلاک کیا، دوسرے نے سقراط جیسے نامی گرامی حکیم کا کام تمام کیا۔ اس تمام داستان کا کیا مطلب ہے؟ تیسری کشتی روانہ ہو چکی، روانہ کیا معنی۔ تیری زندگی کی کشتی بحر فنا کے ساحل پر لنگر انداز ہوا چاہتی ہے۔ تیرا سفر قریب الختم ہے (علاوہ اس کے یوں بھی زندگی کا گارڈ جسم کی ٹرین کو جس اسٹیشن پر چاہے ناگہاں روک سکتا ہے۔ اترنے کی فکر کر۔ اگر ہماری موت دوسری زندگی کے لئے ہے تو پھر اگر موت کے بعد صرف بیہوشی کی خاموشی ہے تب تو دکھ سکھ سے چھوٹ جائے گا اور اس کشتی کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا جو ایسی ہی ذلیل ہے جس قدر کہ اس کا راکب جلیل ہے۔ ایک طرف (عاقبت میں) حکمت و الوہیت ہے۔ دوسری جانب دنیا اور تاریک یاس انگیز بحر فنا۔

اپنی بے بہا زندگی کو اب تک رائیگاں کھویا سو کھویا! البقیہ حصّے کو تو

دوسروں کے متعلق فضول (جھگڑوں بیفائدہ) الجھنوں میں ہرگز ضایع نہ کرو، بالخصوص جبکہ تمہارے خیالات و حرکات کا آخری منشا بھی رفاہیت عامہ نہیں ہے اگر تو بے معنی خیالات رکھتا ہے تو اپنے عمل کے اوقات کو ضایع کرتا ہے۔ یہ شخص کررہا ہے؟ کیا کہہ رہا ہے؟ کیوں؟ کس خیال میں ہے؟ کس سوچ بچار میں گرفتار ہے؟ اس قسم کے خیالات کا انہماک ہمیں اپنے نفس امارہ کے مشاہدہ سے گمراہ کرتا ہے۔ پس ہمیں تمام ایسے لایعنی خیالات کے سلسلہ سے اجتناب کرنا چاہیئے جس کا کوئی مدعا نہیں، نیز تمام لاحاصل بے ثمر شر انگیز امور سے بھی کنارہ کشی لازم ہے۔ انسان کو صرف انہی چیزوں پر غور کرنا چاہیئے جو اس کے ضروری فرائض میں داخل ہیں۔ اگر کوئی ناگہانی طور پر جیسا رگی سوال کر بیٹھے اس وقت میرے خیال میں کیا ہے؟ تو پوری صفائی سے جواب دے سکے، صاف و صریح الفاظ سے یہ واضح ہو جائے کہ تیرے طریق عمل میں ایسی سادگی اور فیاضی ہے جو مہذب مخلاق کے شایاں ہو۔ مہذب انسان نفسانی لذت حیوانی مسرت کا مطلق خیال نہیں کرتا، نہ شبہ گمان حسد اور کینے کو خیال میں لاتا ہے غرض ان تمام باتوں سے بچتا ہے جو حقیر و ذلیل کرنے والی اور باعث ندامت ہوں۔ جو انسان حیوانیت محض کے دائرہ سے نکل جاتا ہے وہ فرشتوں کا بھی مرشد و مقتدا ہو جاتا ہے وہ ربانی روشنی میں چلتا ہے۔ سرکش نفس امارہ کا مقابلہ کرتا ہے، مصیبت سے بے چین نہیں ہوتا، نیکی کی راہ میں کسی خوف و ملامت سے نہیں ڈرتا نہ کسی کی برائی کرنے سے طیش میں آتا ہے شریف ترین رزم میں نبرد آزما رہتا ہے۔ کسی ذلیل جذبہ سے مغلوب نہیں ہو سکتا، عقل کو غالب رکھتا۔ انصاف کے رنگ میں رنگ جاتا ہے اس کی مطمئن روح اپنے وہی حصہ کو خوشی اور شکر گزاری سے قبول کرتی ہے۔

بغیر سخت ضرورت اور رفاہیت عامہ کے نقطہ النظر سے مجبور ہونے کے وہ دوسروں کے خیال اقوال افعال کی مطلق پروا نہیں کرتا۔ وہ جانتا ہے کہ انسان صرف اپنی ہی سعی اور کوشش سے میدان عمل کو اپنی ہمت کا جولانگاہ بنا سکتا ہے وہ ہمیشہ اپنے وسائل پر قانع ہوتا، اپنے فرائض کو عمدگی سے بجالاتا اور ہر حالت میں خود کو خوش نصیب سمجھتا ہے۔

جو کچھ ہر انسان کو بخشا گیا ہے (اس کا ثمرہ) ہر وقت اس کے ساتھ رہتا اور وہ اپنے ساتھ لے جاتا ہے وہ یہ بھی یاد رکھتا ہے کہ ہر ذی عقل اس سے کبھی نہ ٹوٹنے والا تعلق رکھتی ہے، تمام بنی نوع کا خیال رکھنا انسانی طبیعت کا مقتضا ہے لیکن انسان کو ہر کس و ناکس کی رائے تسلیم نہیں کرنی چاہیئے۔ بجز ان کے جو مسلمہ طور پر (عقل سے بہرہ ور) اور قانون قدرت کے موافق زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو اس راہ پر ہیں چلتے وہ ہمیشہ ایسے شخصوں کو اپنی نظر میں رکھتا ہے کہ وہ سفر و حضر میں روشنی و تاریکی میں کس قسم کی زندگی بسر کرتے ہیں اور کس قسم کے رذیل آدمیوں کے ساتھ گندگی کی زندگی میں رہتے ہیں۔ پس وہ ایسے عوام کالانعام انسان نما حیوانوں کی مدح و ستایش کو کچھ بھی خاطر میں نہیں لاتا (نہ اس سے بالکل متاثر ہوتا ہے) کیونکہ ایسے اشخاص خود ہی اطمینان قلب کی نعمت سے محروم اور تردد و اضطراب کے گرداب میں غرقاب ہیں۔

بے دلی دوسروں کے فوائد سے بے پروائی اور پریشانی کی حالت میں بغیر تامل اندیشی کے محنت مت کرو۔ تیرے نیک خیالات پر رسمی معلومات غالب نہ ہونے پائے۔

نور ایمان تیرا رہنما ہو، تجھ میں ایسی دلیری و مستعدی ہو جیسا کہ مستعد سپاہی اشارے کا منتظر رہتا ہے۔ ہر وقت جانے کے لئے تیار رہو۔ حلف یا

یا شہادت کی ضرورت نہ ہو مطمئن رہو۔ بیرونی مدد اور عارضی تسلی کا بھروسہ۔ نہ دیکھو دوسروں کا سہارا دیکھنا مردانگی کے خلاف ہے اور نہ خارجی مدد سے کامیابی ممکن ممکن ہے۔

اگر انسانی زندگی میں راستی، انصاف، اعتدال، اطمینان قصہ مختصر عقل سلیم کے موافق صراط مستقیم پر چلنے اور اپنی غیر اختیاری موجودہ حالت کو بطمانیت قبول کرنے سے بڑھکر کوئی دوسری چیز سر ہائی جا سکتی ہے؟ میں کہتا ہوں اگر کچھ ان سے بہتر و برتر ہے دل و جاں سے اس پر متوجہ اور جو تجھ کو بہترین نظر آئے حتی الوسع اس سے حظ اٹھاؤ۔ لیکن اگر نور الوہیت سے معمور۔ روشن قلب سے بہتر کوئی اور شے نہیں ہے۔ نفسانی ترغیبات سے محفوظ، تمام خواہشات پر قابو رکھنا، اور تمام خیالات کی بغور تنقیح کر سکتا ہے۔ بقول حکیم سقراط "نفس کی شرارتوں سے آزاد ہے۔ خود کو خدا کی مرضی کے تابع کر دیا ہے۔ تمام بنی نوع کا فکر دامنگیر رکھتا ہے" اگر اس کے علاوہ ہر شے تیری تحقیق میں مقابلتہً ہیچ و حقیر ہے کسی چیز کو اپنے دلمیں جگہ ندے، ورنہ اگر ایک مرتبہ بھی تیری رغبت کسی طرف مائل ہو گی۔ نیکی کی ترجیح میں تجھے اذیت ہو گی۔ حالانکہ نیک سیرتی ہی انسان کا واحد اور خاص مقبوضہ ہے۔ یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ کسی اور سے شہرت طاقت، لذت، دولت و سطوت کو عقلی اور تمدنی خوبی کے مقابلے میں کوئی عزت و وقعت دی جائے مگر مذکورہ بالا تمنائیں نفس کو مرغوب نظر آتی اور ہمارے دل پر غالب آکر اسکو اپنا غلام بنا لیتی ہیں۔ یقین جان میں راستی اور آزادی سے کہتا ہوں تو بہتر راستہ اختیار کر اور اس پر قائم ہو جا لیکن بہتر وہی ہے جو مفید تر ہے۔ جبر ذی مخلوق ہونیکی حیثیت سے جو تیرے لئے مفید ہے اسکو اختیار کر لے لیکن اگر وہ صرف حیوانی جہت سے بکار آمد ہو احتیاط رکھ تیرا نفس سرکشی نہ کرنے پائے تیرا فیصلہ سنجیدگی پر مبنی ہو، انتہائی اور یقینی تحقیق کے بغیر ایک قدم نہ اٹھایا جائے +

G. S. H. C.

ساز خوشی

از جناب ابوالحسنات سید شاہ علیخاں صاحب اُمید

اس نئے ڈھب سے سنوارے آج ایوانِ دکن | بنگیا رشکِ جناں صحنِ گلستانِ دکن

دم قدم سے آصفِ سابع کے ہی پھر اوج پر | زینت و رونقِ دکن کی عزت و شانِ دکن

فیض و بخشش کی وہ سرگرمی ہی دستِ فیض میں | ابرِ نیساں بنگیا ہے بڑھ کے دامانِ دکن

جلوہ گر آفتابِ ذرہ پرور تخت پر | اُڑ رہا ہے رایتِ اقبالِ **عثمان** دکن

حامیِ اسلام بھی ہادیِ راہِ فیض بھی | علم کے سلطان بھی ہیں شاہ سلطانِ دکن

ہے مزاجِ بندہ پرور میں یہ بندہ پروری | عام ہے سارے جہاں پر لطف و احسانِ دکن

پھر سجا دربار پھر سالِ گرہ ہی شاہ کا | جمع پھر یکبار ہوئے اک جا ہمہ دانِ دکن

شاہ کا دستِ سخا ہے دستِ حاتم سے سوا | ایسے پیارے ہاتھ میں ہی آج فیضانِ دکن

دی ترقی شعبۂ علم و ہنر کو اس قدر | کرتے ہیں قسمت پہ ناز اپنی عزیزانِ دکن

ہو گیا آرائشِ بلدہ کا ایسا غلغلہ | ہر گلی کوچہ دکن کا ہے خیابانِ دکن

اکطرف گلگاریوں کی ہیں لئے دلچسپیاں | اکطرف ہے سبزۂ مالیدہ ارمانِ دکن

اکطرف غنچے چٹک کر دیتے ہیں شہ کو دعا | اکطرف بادِ بہاری ہے ثنا خوانِ دکن

اکطرف گل فرطِ شادی کے سبب ہیں خندہ زن | خم ہے ہر ڈالی پئے تسلیمِ خاقانِ دکن

اکطرف ہیں مغبچے جام و سبو لے کر کھڑے | اکطرف موجود ہیں رشکِ غزالانِ دکن

حاضرِ دربار ہے **امید** عاجز بہرِ نذر | دست بستہ با ادب پیشِ سلیمانِ دکن

ہے دعا لب پر خدا آباد رکھے شاہ کو | پائیں عمرِ خضر **عثمان علیخان** دکن

شہ سلامت خوش رہیں شہزادگانِ ذی وقار | ہے انہیں کے دم قدم سے زیبِ بستانِ دکن

سایۂ دامانِ شاہی میں سبھی پھولیں پھلیں | بار پائیں بحفظ سب نونہالانِ دکن

یونہی ہر اک سال ہو۔ سال گرہ کا جشنِ عیش ✤ یونہی گلریزی دکھائے ہر سخندانِ دکن

ارمغان سالگرہ

جناب مولوی محمد عباس صاحب اقدس حیدرآبادی

وہ نوید آج نسیم سحری لائی ہے — جس کے سننے کا ہر اک شخص تماشائی ہے
جلوہ گر عیش ہے ہر آنکھ کو ہے رخصت دید — ہے مسرت کے سبب آج کا دن ہمسر عید
انقلاب ایسا خوشی سے ہوا ہوگا کہیں — جوش میں سینے سے جاتا ہے نکل قلب حزیں
آج ہر ایک کے لب پر ہے مبارکبادی — آج پھر زمزمہ پرداز ہے ساز شادی
آج فرصت ملی گردونکو دل آزاری سے — آج ہی باز وہ آیا ہے جفا کاری سے
ہے جو بدلا ہوا کچھ رنگ نظام عالم — دل جو مدت سے جدا تھے وہ ہوئے ہیں باہم
اے خوشی آکہ اجیرن تری فرقت ہے مجھے — شوق دیدار ترے جلوے کا اتنا ہے تجھے
تری آمد کی مچی دھوم ہے دنیا بھر میں — چاندنی پھیلی ہے آمد سے تری گھر گھر میں
سال بھر سے تری ہم راہ تکا کرتے تھے — تیری آمد کی تہہ دل سے دعا کرتے تھے
اب جو آئی ہے تو دل شاد ہوا جاتا ہے — یک بیک غنچہ خاطر بھی کھلا جاتا ہے
کسقدر ہوش ربا ہے یہ تری جلوہ گری — دیکھ سکتی نہیں جسکو نگہہ شوق مری
اب یہ حالت ہے کہ ہر لمحہ خوشی رہتی ہے — صبح تا شام مرے لب پہ ہنسی رہتی ہے
میر عثمان علیخاں شہ عالی گوہر — جس کے اقبال کا تابندہ ہے دایم اختر
یعنی ہے سالگرہ اس شہ فرخ فر کی — زینت روئے فلک خاک ہے جسکے در کی
آب اخلاص سے کر پہلے وضو اے اقدس — پھر دعا کر ادب و عجز سے تو اے اقدس
جب تک افلاک پہ تارے رہیں روشن — لہلہاتے رہیں جبتک کہ زمیں پر گلشن
شہ کے اقبال کی تابش میں کمی آنے نہ پائے — اس کے تفریح کی مجلس میں غمی آنے نہ پائے

سراج اورنگ آبادی

نمبر (۱)

از جناب مولوی ظفر یاب خاں صاحب اورنگ آبادی

جس طرح فی زمانناً دہلی اور لکھنو خصوصیت کے ساتھ اردو شاعری کے مرکز بنے ہوئے ہیں اور وہاں کی زبان ٹکسالی مانی جاتی ہے یہی خصوصیت اردو زبان کے ابتدائی اور دہلی دور میں ڈیڑھ دو صدی تک دکن کے بعض شہروں بیجاپور، حیدرآباد، اورنگ آباد وغیرہم کو بھی حاصل تھی۔ یہیں کی خاک پاک سے سعدی[۱]، وجدی[۲]۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ[۳]۔ سلطان محمد قطب شاہ[۴]۔ سلطان عبداللہ قطب شاہ[۵]۔ مختار[۶]۔ ملا نصرتی[۷]۔ ملا نوری[۸]۔ ولی[۹]۔ صارم[۱۰]۔ عاجز[۱۱]۔ عزیز[۱۲]۔ فخر[۱۳]۔ فضلی[۱۴]۔ فتوت[۱۵]۔ قدر[۱۶]۔ مہر[۱۷]۔ مضطر[۱۸]۔ محرم[۱۹]۔ ہمدمی[۲۰]۔ نثار[۲۱]۔ مقدس[۲۲]۔ یار[۲۳]۔ شفیق[۲۴]۔ اور سراج وغیرہم اٹھے اور اپنے اعلیٰ کمال سے زمین ریختہ میں ایسے گل کھلائے کہ اس کو فلک ہفتم پر پہنچا دیا۔

محمد ولی ملقب بہ شمس الدین اور متخلص بہ ولی کو صاحب "آب حیات" نے "شمس ولی اللہ" کا لقب دیکر اس کو ریختہ کا آدم قرار دیا ہے حالانکہ ولی سے ڈیڑھ دو صدی قبل دکھنی شعراء میں سلطان محمد قلی قطب شاہ، سلطان محمد قطب شاہ اور سلطان عبداللہ قطب شاہ والیان گولکنڈہ و حیدرآباد کے تین مکمل دیوان ریختہ میں مرتب ہو چکے تھے۔ ملا وجدی نے ۱۱۵۰ھ میں "تحفہ عاشقاں" کے نام سے حضرت شیخ فریدالدین عطار علیہ الرحمہ کی ضخیم مثنوی "خسرو نامہ" یا "ہرمز و گلرخ" کا ترجمہ فارسی سے نہایت شستہ دکھنی زبان یعنے اردو میں کیا جسمیں ساڑھے چار ہزار سے

ـــــــــــــــــــــ

ے۔ جن جن ناموں پر نمبرات دیے گئے ہیں ختم مضمون پر بطور ضمیمہ ان پر نوٹ دیا گیا ہے۔

زاید ابیات ہیں۔ "تحفۂ عاشقاں" تاریخی نام ہے جس سے سنہ تالیف (۱۰۱۵) ظاہر ہوتا ہے۔ پنچھی نامہ بھی اسی وجدی کی تصنیف یا شیخ فریدالدین عطار رح کی "منطق الطیر" کا ترجمہ کہا جاتا ہے۔ آخرالذکر مثنوی شاید بمبئی میں چھپ چکی ہے اس کے بعد مختار نے جو عہد قطب شاہیہ کا شاعر ہے ۱۰۶۲ھ میں ایک مثنوی موسومہ بہ "مواج نامہ" اردو میں لکھی۔ مختار کے بعد "ملا نصرتی" بیجاپوری نے "علی نامہ" اور "گلشن عشق" کے نام سے دو ضخیم مثنویاں نظم کیں ایسی صورت میں ولی کو زبان اُردو یا اُردو شاعری کا آدم کہنا بالکل خلاف واقعہ ہے۔ البتہ شمالی ہند کے لئے ولی "آدم ریختہ" ہوسکتا ہے کیونکہ جب بارہویں صدی کے اوائل میں ولی کے دیوان نے دہلی پہنچکر شہرت حاصل کی تو وہاں کے باکمال فارسی شعرا میں بھی ریختہ گوئی کا شوق و مذاق پیدا ہوا اور انھوں نے ولی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی اور اتفاقات سے کچھ مدت کے بعد شمالی ہند میں دہلی اور بعد ازاں لکھنو اردو شاعری کے مرکز قرار پائے اور دکن کی زبان اور شاعری میں کس مپرسی کی وجہ سے بتدریج انحطاط شروع ہوا۔ نوبت باینجا رسید کہ جن ممالک میں دکن کی شاعری مسلم الثبوت تھی اور اس کا ایک فرد "آدم ریختہ" مانا جاتا تھا اور اب تک مانا جاتا ہے اُس کے سپوت آج شاعری اور زباندانی کے اعتبار سے پسماندہ خیال کیے جاتے ہیں اور اُن کی زبان پر مضحکہ اُڑایا جاتا ہے۔

"ببیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا"

چنانچہ میرزا سودا کے شاگرد "قایم" چاندپوری نے جو تیرہویں صدی کے شاعر ہیں اپنے ایک شعر میں بوجہ ناواقفیت یہ تعلی کی ہے۔

قایم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ　　　اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

اگر قایم کی نظر سے دکن کے باکمال شعرا کی زمزمہ سنجی علی الخصوص "سراج" اورنگ آبادی کا

کلام گزرتا تو وہ دکن کی زبان اور شاعری پر اس طرح منہ نہ آتا اور نہ اُس کو لچر سمجھتا۔

شہر اورنگ آباد[عہ] جو بارہویں صدی ہجری کے اخیر تک باکمال شعرائے اردو و فارسی اور مختلف علوم و فنون کے علماء و فضلا کا مرکز تھا اور جس پر غفلت و بےحسی کے باعث آج جہالت و نااہلی کی تاریک گھٹا چھائی ہوئی ہے اس کی خاک پاک سے بارہویں صدی کے اوائل میں ایک نہایت باکمال ریختہ گو صوفی شاعر عالم وجود میں آیا جس کو دنیائے شاعری میں "سراج دکنی" کے نام سے لازوال شہرت حاصل ہے اور اگرچہ کہ وہ بقول اہل ہند "ابو الشعرائے اردو" ولی اورنگ آبادی کا ہموطن اور تقریباً ہمعصر[عہ] تھا لیکن اپنے متانہ تغزل، نغز گوئی، سلاست بیان، صفائی بیان اور شستگی الفاظ کے باعث اپنے معاصرین سے گوئے سبقت لے گیا تھا اور جس کے پایہ کا اُس وقت نہ ہند میں کوئی ریختہ گو شاعر موجود تھا اور نہ دکن میں۔ مگر اب حالت یہ ہے کہ سراج کے

عہ۔ زمانۂ قدیم میں یہ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ ملک عنبر نے ۱۰۱۹ھ میں موجودہ شہر بسایا۔ عہد اورنگ زیب غازی علیہ الرحمہ تک یہ شہر کھڑکی کے نام سے موسوم رہا۔ کھڑک مرہٹی زبان میں زمین سنگلاخ کو کہتے ہیں۔ شہنشاہ عالمگیر نے اپنے عہد حکومت میں اس کو " اورنگ آباد " سے موسوم کرکے بہت کچھ ترقی دی۔ جس کے بعد یہ ۲۵ سال تک تمام ہندوستان کا دارالسلطنت تھا۔

عہ۔ سراج اور ولی کے زمانے میں اتنا ہی فرق ہے کہ اول الذکر جوان اور آخر الذکر بڈھا تھا۔ ایک نے ۱۱۰۰ھ میں اورنگ آباد میں اور دوسرے نے ۱۱۵۵ھ میں احمد آباد میں وفات پائی۔

خاص جنم بھوم میں اُس کے کمالات سے بہت کم اہل وطن واقف ہیں اور ان میں سے اکثر کو اس کی خبر نہیں کہ دو اڑھائی صدی پہلے ان کی مقدس اور مردم خیز سرزمین نے ایسا بے بہا لعل اُگلا تھا۔ اگرچہ بعض نایاب فارسی تذکروں میں سراج کے حالات جستہ جستہ موجود ہیں لیکن تمام اردو تذکرے اس کے حالات اور ذکر سے خالی ہیں لہذا ہم بلحاظ مناسبت وقت "لسان الملک" اس قدیم دکنی ملک الشعرا کا مختصر حال معہ نمونہ کلام قلمبند کر کے ذیل میں پیش کرتے ہیں۔

نام و نسب سید سراج الدین نام "سراج تخلص" معروف بہ "شاہ سراج" ہیں۔ نسباً آپ کا تعلق سادات حسینی خاندان مشائخ سے ہے۔

ولادت کسی تذکرہ سے سنہ ولادت معلوم نہ ہو سکا مگر قیاس یہ چاہتا ہے کہ آپ کی ولادت بمقام اورنگ آباد سنہ ۱۱۲۷ھ میں واقع ہوئی ہوگی۔ کیونکہ سنہ ۱۱۵۱ھ میں جبکہ آپ کے دیوان ریختہ کی ترتیب عمل میں آئی آپ کی عمر صرف چوبیس سال کی تھی چنانچہ خاتمۂ دیوان پر جو غزل لکھی ہے اس کے آخری دو شعر میں اپنی عمر اور سنہ ترتیب کو ظاہر کیا ہے اور وہ یہ ہیں:-

"جب کیا جزو پریشان سخن شیرازہ بند	تھے برس چوبیس میری عمر بے بنیاد کے
سال ہجری تھے ہزار و یکصد و پنجاہ و یک	واقف علم لدنی صاحب ارشاد کے"

جذب و استغراق "سراج" نے عمر کی صرف بارہ منزلیں ہی طے کی تھیں اور ابھی پوری طرح ہوش بھی نہیں سنبھالا تھا کہ اُن پر جذب و استغراق کا عالم طاری ہو گیا اور سات برس تک مطلق دنیا و مافیہا کا ہوش نہ رہا

عالم بیخودی اور حالت عریانی میں خلد آباد میں حضرت شاہ برہان الدین غریب علیہ الرحمہ کے روضہ کے گرد گھوما کرتے تھے۔ اسی حالت مستی و مدہوشی میں اکثر فارسی اشعار فی البدیہہ زبان سے نکل جاتے تھے اگر اس وقت کوئی باذاق شخص حاضر رہتا تو قلمبند کر لیا کرتا تھا ورنہ یونہیں تلف ہو جایا کرتے تھے۔ اگر یہ کل اشعار وقتاً فوقتاً ضبط تحریر میں آتے تو شاعر کی کمسنی اور مضامین عالی کے لحاظ سے "الہامی اشعار" سمجھے جاتے۔ عمر کے بیسویں سال حالتِ جذب سے عالم سلوک میں آئے اور خواجہ سید شاہ عبد الرحمن چشتی اورنگ آبادی (سنہ وفات ۱۱۶۱ھ) کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ لیکن ان واقعات کے خلاف میں صاحب "تحفۃ الشعرا" میرزا افضل بیگ قاقشال اورنگ آبادی جو سراج کے ہمعصر تھے اور جنھوں نے اپنا تذکرہ سراج کی زندگی میں سنہ ۱۱۶۵ھ میں تصنیف کیا۔ سراج کی نسبت ان کل واقعات کے خلاف یوں خامہ فرسائی کرتے ہیں۔ "ازابتدا در سلک سپاہیاں نوکری می کرد الحال ترک روزگار کرد از چند سال لباس درویشی پوشیدہ است"۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ "میرزا قاقشال" کو جو "عارف الدین خاں عاجز" کے ثنا خوانوں میں سے تھے سراج کے ساتھ حسن عقیدت نہیں تھی اور نہ تذکرہ لکھتے وقت انھوں نے سراج کے حالات میں تحقیق سے کام لیا اور نہ ایک سپاہی سے یہ توقع ہرگز نہیں ہو سکتی کہ چوبیس برس کی نوجوانی میں اپنے پیشہ کی انجام دہی کے بعد وہ ایسا لاجواب اور پُر از معرفت و تصوف دیوان ترتیب دے سکتے۔ میرزا قاقشال کے مذکورہ بالا بیان کی تکذیب اس سے بھی ہو سکتی ہے کہ لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی نے جو مشہور تذکرہ نویس اور حسان الہند آزاد بلگرامی کے شاگرد رشید ہیں اور جن کو سراج کے ساتھ بھی سالہا سال تک یکجائی کا اتفاق ہوا ہے۔ اپنے

اپنے کسی تذکرے میں سراج کے سپاہی پیشہ ہونے کی نسبت ایک لفظ بھی نہیں لکھا ہے۔ میرزا قاقشال کے بیان کی تردید اور اپنے بیان کی صحت میں ہم لچھمی نارائن شفیق کے قلمی تذکرہ "گل رعنا" سے جس کا سنہ تالیف (۱۱۹۵ھ) ہے اس حصہ کو نقل کرتے ہیں جس کو شفیق نے "منتخب دیوانہا" (سنہ تالیف ۱۱۶۹ھ) مولفۂ سراج کے دیباچہ سے ان کے خود نوشت حالات حسب ذیل نقل کئے ہیں:۔

"ایں فقیر از سن دوازدہ سالگی بہ غلبۂ شوق بے جہت ہفت سال جامہ عریانی در برداشت و در تکلیف نشۂ بیخودی اکثر در سواد روضۂ متبرکہ حضرت شاہ برہان الدین غریب قدس سرہٗ شبہا بروز می آورد و از جوش مستی اشعار شور انگیز و ابیات درد آمیز بزبان فارسی از کمین جاں بعرصہ زباں می آمد و بہ اقتضائے حال خامۂ بتحریر آں آشنائی ساخت احیاناً اگر شوقمندی حاضر می بود بجہت حلاوت ذائقہ طبع خود کاغذ را سیاہ می نمود اگر آں اشعار بہ تحریر می آمد دیوانے ضخیم ترتیب می یافت چوں تقاضائے عمر قابل اہتمام سخن سنجیہا نبود بہ استماع آں موزونات عالی در ورطۂ تعجب می افتاد و از جملہ الہامات تصور می آید۔"

شاعری و ترتیب دیوان

"شاہ سراج" حالت جذب و استغراق سے بیسویں سال جب ہوش میں آئے تو ریختہ گوئی کی طرف توجہ مصروف کی اور چوبیسویں سال پانچہزار اشعار کا ایک ضخیم دیوان ترتیب دیا جس میں ردیف وار غزلیں۔ مثنویاں، مخمس، ترجیع بند، مستزاد اور رباعیات وغیرہ موجود ہیں۔ یہ جس قدر بھی سرمایہ ہے گویا ان کی چار سالہ محنت یا توجہ کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے۔ مضامین کی شگفتگی خیالات کی بلندی و پختگی اور عاشقانہ سوز و گداز کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ تھوڑے سے وقت اور نوجوانی کے عالم میں ایسا لاجواب

وبمثل دیوان وہ کس طرح ترتیب دے سکے جس کی نظیر سے اکثر تذکرے خالی ہیں موجودہ دیوان کی ترتیب[۱] سراج کے برادر طریقت "عبدالرسول خاں" نے دی ہے

کلام فارسی

اردو کے علاوہ "سراج" نے فارسی میں بھی طبع آزمائی کی ہے غالباً کوئی دیوان ترتیب نہ پاسکا اکثر متفرق اور منتخب اشعار تذکروں میں پائے جاتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ سراج کو فارسی میں بھی قادر الکلامی حاصل تھی۔

شاگردی

گو میر تقی میر "نکات الشعرا" میں "سراج" کی نسبت فرماتے ہیں "از شاگردان سید حمزہ است" اور میر حسن "تذکرۃ الشعرا" میں کہتے ہیں "از شاگردان سید حمزہ علی دکنی"۔ لیکن ان کے ہمعصر و ہموطن مولفین کے کسی تذکرہ سے اس بیان کی تائید ہوتی ہے اور نہ ان کے کلام سے۔ بلکہ عرب کے مشہور مقولہ "الشعراء تلامذۃ الرحمٰن" کی طرح وہ فطرۃً شاعر پیدا ہوئے تھے اور بارہ برس کے سن سے جبکہ ان پر جذب و استغراق طاری تھا فارسی اشعار فی البدیہہ کہا کرتے تھے اور عالم سلوک میں واپس آنے کے چار سال بعد ہی اردو کا ضخیم دیوان ترتیب پایا۔ اس کے علاوہ اورنگ آباد میں "سید حمزہ" یا "سید حمزہ علی" نامی کوئی شاعر نہیں گزرا ہے جس کو "سراج" جیسے باکمال عارف و صوفی شاعر کی استادی کا شرف حاصل ہوتا معلوم نہیں میر صاحب اور میر حسن نے کس بنا پر ایسا لکھ مارا۔

ع۵۔ گل رعنا قلمی بحوالہ "منتخب دیوانہا" صفحہ (۱۶۰)

ع۵۔ صاحب طبقات الشعراء نے بھی سراج کی نسبت یہی خیال ظاہر کیا ہے جس کا ماخذ غالباً تذکرہ "نکات الشعرا" ہوگا۔

صاحب گلشن بیخار کی غلط فہمی

اردو شعرائے ہند کے مشہور تذکرہ "گلشن بیخار" میں جس کے مصنف نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ مرحوم ہیں "سراج" تخلص کے دو شعرا کا جداگانہ تذکرہ لکھا گیا ہے۔ ایک سراج کا نام "سراج الدین علی" بتایا گیا ہے لیکن اس کی سکونت وغیرہ پر روشنی نہیں ڈالی گئی ہے۔ اور دوسرے کی نسبت فرماتے ہیں کہ "نامش معلوم نشد از اورنگ آباد است معاصر آبرو" اور دو شعر دیے گئے ہیں جو انھیں سراج کے ہیں۔ سابق الذکر سراج کا عجیب و غریب حال درج ہے اور بیان کیا گیا ہے کہ وہ کسی ہندو کی دختر پر عاشق ہوا اور اُس کے باپ کے پاس پیام نکاح بھیجا۔ باپ نے کچھ تذبذب کے بعد منظور کر لیا۔ نکاح کے بعد سراج نے پروانہ وار اُس کے شمع جمال کے گرد چکر لگا کر جان دی۔ اس کی وفات پر بدنصیب معشوقہ نے بھی حسرت کے ساتھ جان دیدی۔ اس واقعہ نگاری کے بعد ذیل کا شعر اس سراج کی جانب منسوب کیا ہے:۔

چلی وشت عشق میں وہ ہوا کہ چمن سرور کا جل گیا۔
مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہیں سو ہری رہی

حالانکہ بہ تغیر الفاظ یہ شعر سراج اورنگ آبادی کی نہایت مشہور و مقبول اور پُر از معرفت غزل کا ہے جو اکثر مجالس سماع میں گائی جاتی اور اُس پر وجد و حال ظاہر کیا جاتا ہے اور جس کا مطلع یہ ہے:۔

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی　نہ تو تو رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بیخبری رہی

ترک شاعری

ترتیب دیوان کے بعد سراج نے اپنے پیر و مرشد حضرت شاہ عبدالرحمٰن چشتیؒ کے ایماء و ارشاد کی بناء پر شاعری ترک کردی[عـــہ]

عـــہ۔ گل رعنا بحوالہ منتخب دیوانہا صـــ۶۱۔

گویا وہ چوبیس سال کی عمر اور ۱۱۵۱ھ کے بعد سے اس حکم پر عمل پیرا ہے۔ لیکن معلوم ایسا ہوتا ہے کہ ترتیب دیوان اور پیر و مرشد کے ارشاد کے بعد بھی اہل مذاق کے تقاضے اور مجبوری سے کبھی کبھی اس "شجر ممنوعہ" کی طرف جا نکلتے تھے چنانچہ ۱۱۷۳ھ میں ایک مثنوی مسمی "بہ بوستان خیال" لکھی اسکے علاوہ ان کے دیوان مرتبہ (۱۱۵۱ھ) میں ذیل کی پرسوز و گداز اور معرفت و تصوف میں ڈوبی ہوئی غزلیں موجود نہیں ہیں بلکہ "کلیات" میں پائی جاتی ہیں جنکو ہم سلسلہ وار ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:—

(۱)

خبر تحیر عشق سن نہ جنوں رہا نہ پری رہی — نہ تو توں رہا نہ تو میں رہا جو رہی سو بےخبری رہی

شہ بیخودی نے عطا کیا مجھے اب لباس برہنگی — نہ خرد کی بخیہ گری رہی نہ جنوں کی پردہ دری رہی

چلی سمت غیب سیں کیا ہوا کہ چمن ظہور[عـه] کا جل گیا — مگر ایک شاخ نہال غم جسے دل کہو[عـه] سو ہری رہی

نظر تغافل یار کا گلہ کس زباں سیں بیاں کروں — کہ شراب صد قدح آرزو خم دل میں تھی سو بھری رہی

وہ عجب گھڑی تھی کہ جس گھڑی لیا درس نسخۂ عشق کا — کہ کتاب عقل کی طاق پر جیوں دھری تھی تیوں ہی دھری رہی

ترے جوش حیرت حسن کا اثر اسقدر سیں عیاں ہوا — کہ نہ آئینہ میں جلا رہی نہ پری کو جلوہ گری رہی

کیا خاک آتش عشق نے دل بینوائے سراج کوں — نہ خطر رہا نہ حذر رہا مگر ایک بیخطری رہی

(۲)

مخمور چشموں کی بتر بد کرنے کو شبنم ہے سرد آبشوروں کی مانند

روپے کی تھالی سفیدی ہے نرگس کی زردی ہے زر کے کٹوروں کی مانند

عـه۔ بعض نسخوں میں "ظہور" کی جگہہ "سرور" لکھا ہے۔

عـه۔ بعض نسخوں میں "کہو" کی جگہہ "کہیں" دیکھا گیا ہے۔

داغ فی سرخ ان جامہ زیبوں نے عاشق کے لوہو سیں رنگیں کئے ہیں
بجو د ہو کہتا ہوں کیا خوب لگتی ہے میری کلیجہ فوروں کی مانند

اے دست مشاطہ توں جب سیں پہنچا ہے اس زلف مشکیں کی شانہ کشی کو
عاشق کی آہوں کی ان صاف رشتوں میں کڑیاں ہیں انگلی کی پورونکی مانند

تنگی اُنوں کی دہن کی نہ پاویگا اپنے گریباں میں سر کوں نواتوں
اے غنچہ باغی ہو مہتاب رویوں سیں مت خندہ پن کر حکپورونکی مانند

دل کے خزانے سیں شاید لیجاویگا جی کی جواہر کو عیاریوں سیں
ہر دم خیال ان کا آنکھوں کے روزن سیں آتا ہے چھپ چھپ کے چورونکی مانند

غم کے پہاڑوں کو سر پہ اٹھائے ہیں وحشت کے پنجوں سیں آہو نے مہری
دل کے اکھاڑے میں اب کون ہمسر ہے ان پہلوانوں کے زورونکی مانند

پروانہ رنگوں کے عرس جدائی میں سیر چراغاں ہے جان سراج اب
روشن فتیلے ہیں آہوں کے شعلوں کے سینے میں کورے سکورونکی مانند

(۳)

دل میں خیالات رنگیں گزرتے ہیں جیوں باس پھولونکے رنگوں میں رہیے
وحشت کے جنگل میں کب لگ پریشاں ہو غم کے پہاڑونکے سنگوں میں رہیے

جو کوئی کہ ہے دشت وحشت کا ساکن اُسے ہوش کے شہروں سیں ہے نفرت
دیوانگی کا نپٹ خوب عالم ہے زنجیر کے جا النگوں میں رہیے

جدا ہو ہتی سیں وہمی خیالوں نے کثرت کی تہمت لگائی ہے ناحق
مگر اہل ہیں جوش طوفاں وحدت سے جیوں موج دریا امنگوں میں رہیے

اس سرو قامت کے جوش محبت میں از بسکہ آزاد سیں ہوئے تم
مانند قمری بدن کو لگا راکھ یا ہو کا دم بھر ملنگوں میں رہیے

ناحق سراج آہ حسرت کی آتش ہیں سو بار ہر دم میں جلنا سبب کیا
یکبار شعلے پہ گرنے کی طرحوں کو معلوم کرنے پتنگوں میں رہیئے

مشہور تذکرہ نویسوں کی رائے

ہر تذکرہ نویس نے سراج کی شاعری اور ان کے کلام پر عمدہ ریمارکس کئے ہیں۔ بعض مشہور تذکرہ نویسوں کی رائے کا اقتباس درج ذیل ہے:۔

لچھمی نارائن شفیق اورنگ آبادی مشہور تذکرہ نویس "گل رعنا" میں یہ رائے ظاہر کرتے ہیں:۔

"سید سراج الدین اورنگ آبادی سراج محفل سخندانی است و چراغ انجمن روشن بیانی بعد ولی اورنگ آبادی بازار ریختہ در دکن بہیں انفاس او گرم گردیدہ و آوازۂ سخنش از بس اشتہار بطارم اخضر رسیدہ"۔

میرزا قاقشال صاحب تحفۃ الشعراء کہتے ہیں:۔
"در فکر ریختہ طبع موزونے دارد"۔

صاحب نکات الشعراء میر تقی میر فرماتے ہیں:۔
"سخن او خالی از مزہ نیست"۔

میر حسن دہلوی صاحب تذکرۃ الشعرا لکھتے ہیں:۔
"در وقت عالمگیر[a] اول بود ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ روشن طبع معلوم میشود خدایش بیامرزد"

اصناف سخن

سراج نہایت قادر الکلام شاعر تھے۔ شاعری کے ہر صنف مثنوی، غزل، قصیدہ، رباعی، مستزاد، مخمس اور واسوخت وغیرہ ہیں

ع - یہ صحیح نہیں ہے۔ سراج شاہ عالم اول ابن عالمگیر کے زمانہ سلطنت میں پیدا ہوئے اور احمد شاہ کے عہد سلطنت میں وفات پائی۔

طبع آزمائی کی ہے۔

انداز کلام

سراج کا کلام بالکل صاف اور سادہ ہے یہام و تعقید اور دیگر عیوب شعری سے پاک و صاف ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ بارہویں صدی کے نصف اول میں جبکہ اردو شاعری عالم طفولیت میں تھی دنیائے شاعری میں ایسا نغز گو اور زبردست شاعر کس طرح پیدا ہوا جس نے نہ کسی اُستاد کے آگے زانوئے شاگردی تہ کیا اور نہ قلعۂ معلیٰ کی آب و ہوا میں تعلیم و تربیت پائی اور ۲۴ سالہ عمر میں جو بالکل نوجوانی کا عالم ہوتا ہے ایک لاجواب دیوان کے ذریعہ اپنی قادر الکلامی و نغز گوئی کا سکہ ابنائے روزگار کے دلوں پر بٹھا دیا۔ کل دیوان پڑھ جائیے کہیں بھی حشو و زوائد یا آورد کا نشان نہ پائیے گا۔ ہر غزل بلکہ ہر شعر میں بلا کی روانی اور حلاوت پائی جائے گی۔

دکن میں اُن کا نظیر نہیں

دکن میں جب سے اردو نے جنم لیا ہے اگرچہ بڑے بڑے باکمال ریختہ گو شاعر گزرے لیکن سراج کے رتبہ اور پایہ کا ایک شاعر بھی پیدا نہیں ہوا۔ ہندوستانی شعرا میں ان کو خواجہ میر درد علیہ الرحمۃ اور میر تقی میر سے خیالات و جذبات میں بہت کچھ مناسبت ہے۔

شہرت کلام

سراج کے کلام اور شاعری کی شہرت ان کی زندگی ہی میں کافی طور پر ہو گئی تھی ریختہ گوئی میں ہر شخص ان کو ولی کا سچا جانشین سمجھتا تھا۔ کوئی مجلس سماع ایسی نہیں ہوتی جس میں سراج کا کلام حاضرین کے لئے غذائے روحانی بہم نہ پہنچاتا ہو اگر ایک طرف باکمال شعرا کلام سنکر سر دھنتے تھے تو دوسری طرف صوفیا اور اہل اللہ لوگوں پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہوتی تھی۔

تصنیف و تالیف

سراج کی تصانیف و تالیفات میں دیوان، کلیات، فارسی

کلام کا بیشتر حصہ۔ ایک مثنوی مسمیٰ "بہ بوستانِ خیال" اور "منتخب دیوانہا" پائے جاتے ہیں ان کے علاوہ اور کسی تصنیف یا تالیف کا حال معلوم نہو سکا۔

انصاف پسندی

ایک دن سراج نے لچھی نارائن شفیق سے حسان الہند حضرت آزاد بلگرامی کا یہ شعر سنکر:۔

صدر نگ وحشت است پری راز آئینہ دلہا چرا ارادۂ تسخیر می کند

"رم کردن پری از آئینہ" کی سند طلب کی۔ شفیق نے "خلاق المعانی خاقانی" کا یہ شعر سنداً پیش کیا۔

ساقی بزم چوں پری جام بکف چو آئینہ او بزد زجام اگر ز آئینہ می رمد پری

سراج نے سنکر اعتراف فرمایا اور کہا کہ آج ہمیں یہ فائدہ ہوا۔ باوجودیکہ شفیق اس وقت ایک کمسن نوجوان تھے اور سراج سن رسیدہ ہونے کے علاوہ اردو اور فارسی کے زبردست شاعر تھے لیکن پہلو میں شریف اور انصاف پسند دل رکھتے تھے۔ ان کی زبان سے وہی الفاظ نکلے جو ایک صاف باطن اور پاک طینت بزرگ سے توقع کیجا سکتی ہے ورنہ عام طور پر تو "الحق مر" مشہور رہے۔

مرشد سے عقیدتمندی

"شاہ سراج" کو اپنے پیرومرشد حضرت سید شاہ عبدالرحمٰن چشتی سے بیحد عقیدت و ارادت تھی۔ غزلوں میں کثرت سے اظہار عقیدت ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ "شاہ" صاحب نے "فنا فی الشیخ" کا مرتبہ حاصل کیا تھا بعض اشعار نمونتہً درج ذیل ہیں۔

اے سراج اپنی خودی کوں بیخودی میں محو کر شغل جاری رکھ ہر یک دم میں "ہوالرحمٰن" کا

یار کا دیدار پا کر اے سراج شکر "رحماں" کر کہ تو واصل ہوا

عــہ۔ گل رعنا صفحہ (۶۱۰)

شمع سوز جگر ہے ہر غزل میری سراج	شمع دل روشن ہے فیض "شاہ رحمان" کی طفیل
مرشد کے نور حسن کا قربان ہے سراج	ہے ذات پاک "حضرت رحمان" کی قسم
کیا روشن چراغ دل کوں میرے	سراج اب فضل "رحمانی" ہی سے ہے
گنج مخفی سیں آشنا ہے (کو) سراج	جب ہوئی ہے نگاہ "رحمانی"

فخر و تعلی جس طرح کہ شعرا کی عادت میں داخل ہے "سراج" کے اشعار بھی فخر و تعلی سے خالی نہیں ہوتے ہیں اور یہ فخر و تعلی شاہ صاحب کی بلند پایہ شاعری کے لحاظ سے کچھ بیجا بھی نہیں ہے اس قسم کے چند اشعار یہ ہیں:-

نہیں رہا سخن آبدار کا موتی	سراج طبع کے سب جوہر انکو رول چکا
بوجھتا ہے وہ قدر شعر سراج	جو ادا فہم اور سخنداں ہے
شعر سراج ہر یک ہے گلشن معانی	بو اس سخن کی پاوے جو خوش دماغ ہووے
تجھ بنا اے سراج بعد ولی	کوئی صاحب سخن نہیں دیکھا
اے سراج آرزوئی قند نہیں	شعر تیرا ہے جوں نبات لذیذ
شاید کہ بعد مرگ کریں یاد خاص و عام	مشہور نہیں سراج سا شیریں سخن ہنوز
سراج از بس نزاکت ہے ترے اشعار رنگیں میں	مثال گل (دستۂ گل) ہر یک طبع کو مرغوب ہوتا ہے
اے سراج اس منتخب دیوان کے سب ریختے	خامۂ مژگان خوبان سیں ہیں لایق صاد کے

وفات بمصداق "کل من علیہا فان" زندگی کی تخمیناً پچاس منزلیں طے کرنے کے بعد یہ بزرگ صوفی اور دکن کا مایۂ ناز ریختہ گو شاعر ۴ شوال یوم جمعہ ۱۱۷۷ھ کو رہگرائے عالم باقی ہوا۔ گو اس بزرگ کو وفات پائے ہوئے کچھ کم دو صدی زمانہ اس طرف آگیا ہے۔ لیکن عوام کا بڑا حصہ اس کو صاحب کرامت صوفی سمجھتا اور "شاہ چراغ" کے نام سے جانتا اور دکن کے

خواص کا طبقہ اس کو ایک بڑے ریختہ گو صوفی شاعر کی حیثیت سے پہچانتا ہے۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو ایسا کچھ کرکے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

تدفین تجہیز و تکفین اور ادائے نماز جنازہ کے بعد نعش انھیں کے تکیہ میں سپرد خاک کیگئی۔ ہمعصر شعرا نے کثرت سے تواریخ رحلت لکھیں جن میں بعض حسب ذیل ہیں:—

(از مولانا آزاد بلگرامی رح)

شمع شعر اسراج خوش فکر در ماتم او سخن سیہ پوش"
تاریخ وفات او خرد گفت ہے ہے مصباح ہند خاموش"
۱۱۷۷ھ

(ذکار بلگرامی)

چراغ دودۂ آل عبا سراج الدین کہ بود روشن ازو محفل سخندانی
نمود چارم شوال روز آدینہ بشمع انجمن عمر دامن افشانی
ز تیرہ بزم جہاں فنا بہ دار بقا فروغ ناصیۂ خویش کرد ارزانی
کشید شعلۂ تاریخ سر ز طبع ذکار سراج بزم ارم را نمود نورانی

(شفیق اورنگ آبادی)

سید حق پرست و معنی سنج کہ ازو یافت شعر حسن رواج
سال فوتش شفیق کرد رقم رو بہ رضواں نہاد شاہ سراج

تعمیر مقبرہ رحلت کے کچھ دنوں بعد شاہ صاحب کے مرید و خلیفہ "شاہ ضیاء الدین پروانہ" نے ان کی مزار پر انوار پر مختصر مقبرہ تیار تعمیر کیا۔ اور تکیہ کے اس مکان کو بھی پختہ تعمیر کیا جس میں شاہ صاحب کی

عـ۵۔ گل رعنا قلمی صفحہ (۶۱۱)

سکونت تھی دست برد زمانہ سے اب مکان کے کھنڈر باقی رہ گئے ہیں اور مزار و گنبد بھی بوسیدہ ہو گیا ہے اگر اس کی مرمت کی طرف سے چندے اور غفلت برتی گئی تو عجب نہیں کہ خاک کے برابر ہو جائے اور دکن کے سب سے بڑے ریختہ گو قدیم صوفی شاعر کے مزار کا پتہ تلاش کرنے پر بھی نہ ملے۔ محکمۂ آثار قدیمہ یا سراج کے قدر دانوں کو چاہیئے کہ اس کے تحفظ کی فکر کریں میری دانست میں ضروری مرمت کے لئے تین چار سو روپیے کافی ہو سکتے ہیں۔ اگر مرمت کے ساتھ حضرت آزاد بلگرامی کی تاریخ کا کتبہ بھی بالین مزار پہ نصب ہو جائے تو اس کے معلوم کرنے میں عوام کو سہولت ہو گی مگر اس کے لئے تھوڑی سی زندہ دلی اور ہمت و قدر دانی درکار ہے جو اورنگ آبادیوں میں مفقود ہے اسی فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ شہر اورنگ آباد کے بعض پڑھے لکھے لوگ بھی اس سے واقف نہیں کہ ان کے ہموطن "شاہ سراج" بلند پایہ صوفی ہونے کے علاوہ ریختہ کے زبردست شاعر بھی تھے۔ عوام نے ان کو "شاہ سراج" سے "شاہ چراغ" بنا دیا ہے دیکھیئے آگے کیا ہو۔ یہ مقبرہ محلہ روہیلگی گلی کے شمال میں نالہ کے مرتفع حصہ پر واقع ہے جس کے شرقی و غربی جانب دو قدیم سڑکیں جو قلعۂ ارک پر واقع ہوتی ہیں۔ مزار کے چاروں جانب معتقدین اور عوام کی قبریں ہیں۔ وقت ہے کہ ملک کا کوئی زندہ دل اٹھے اور اس یگانہ آفاق شاعر کے بوسیدہ مزار و مقبرہ کی درستی میں حصہ لیکر خود بھی نیکنامی حاصل کرے۔

نام نیک رفتگاں ضایع مکن   تا بماند نام نیکت بر قرار

کلام فارسی اگرچہ ہمیں سراج کی اردو شاعری کا نمونہ دکھانا مقصود ہے لیکن چونکہ شاہ صاحب کی فارسی شاعری کا بھی ضمناً ذکر آگیا ہے

دو چار شعر فارسی کلام کے بھی ہدیۂ ناظرین کیے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکے گا کہ شاہ صاحب نہ صرف ریختہ ہی میں طبع بلند رکھتے ہیں بلکہ فارسی کے بھی خوش فکر اور قادر الکلام شاعر ہیں۔

از ابروئے کج تو دلم کے رہا شود — نشنیدہ ام کہ گوشت ز ناخن جدا شود
نور ایماں نیست شیخ معرفت اظہار را — قشقۂ کفر است داغ سجدہ بر پیشانیش
چوں چراغ سحر از جاں شدہ ام سیر سراج — دامن افشاندن او عین کرم می دانم
سینہ صافاں در تلاش خودنمائی نیستند — بے غرض در خانۂ آئینہ می آئیم ما
دل چو وصف دہن تنگ تو می کرد رقم — زیر مشق از ورق دیدۂ عنقا میکرد
نماز عشق ادا کرد نسبت عاشق را — خوشم کہ دست ز جاں شستم و وضو کردم

سراج کے حالات زندگی بخیال طوالت یہیں پر ختم کئے جاتے ہیں انشاءاللہ تعالیٰ آئندہ فرصت میں ان کی ہمثیل اردو شاعری اور خصوصیات کلام پر تفصیلی نظر ڈالی جائیگی اور معاصرین کے کلام کے ساتھ ان کے کلام کا موازنہ کر کے اخیر حصۂ مضمون میں انتخاب دیوان پیش کیا جائے گا۔

ضمیمہ

سلہ سعدی تخلص۔ اس کے نام اور زمانہ پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ مگر زبان اور روزمرہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ قدیم ترین دکنی شعرا سے ہوگا۔ برہان پور کے قرب و جوار میں اس کا مرقد بیان کیا جاتا ہے۔ جس قدر تذکروں میں اس کے حالات درج ہیں ان سب میں اس کی ایک ہی مشہور غزل لکھی گئی ہے۔ جس کا مقطع یہہ ہے۔

سعدی غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ — در ریختہ دُر ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

اس کے سوائے اور کوئی کلام نہیں ملتا ہے اور نہ مزید حالات ۔ میرزا رفیع السودا
نے اپنے تذکرۂ شعرا میں اس شعر کو سعدی شیرازی کی طرف منسوب کیا ہے مگر یہ
اصلیت سے بعید ہے۔

۳۵۔ وجدی تخلص ہے نام کی تحقیق نہ ہوسکی۔ بعض حضرات سے ان کا نام
"وجیہہ الدین" اور وطن "قمرنگر کرنول" سنا گیا۔ قدیم دکنی شاعر ہے حضرت شیخ فریدالدین
عطار رحمۃ اللہ علیہ کے خسرو نامہ یا قصۂ "ہرمز و گلرخ" کا ترجمہ فارسی سے اردو نظم
میں کیا اور اس کا تاریخی نام "تحفۂ عاشقاں" رکھا جس سے ۱۱۵۱ھ نکلتا ہے
اس کے علاوہ منطق الطیر کا ترجمہ "پنچھی نامہ" کے نام سے کیا ہے۔ یہ دونوں
قدیم ترین مثنویاں ہیں جو اردو زبان میں ترجمہ یا تالیف کی گئی ہیں۔ اس کے قبل
کی کوئی مثنوی نظر سے نہیں گزری۔ "تحفۂ عاشقاں" راقم کے پاس موجود ہے اس میں
حمد و نعت کے بعد مدح خلفائے راشدینؓ و حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہ
کی گئی ہے جس سے وجدی کے سنت والجماعت اور طریقۂ قادریہ پر عامل ہونیکا
پتہ چلتا ہے۔ یہ ایک ضخیم مثنوی ہے جس میں ساڑھے چار ہزار ابیات ہیں۔ حمد کی
چند ابیات ہدیۂ ناظرین ہیں۔

کروں پاک دل ہور زبان پاک سوں[1] ثنا پاک اس عاشق پاک کوں[2]
کہ جس سے ہوا ہے اوگ[3] عشق کا اجوں[4] لگ اُبلتا ہے خم عشق کا
پڑیا[5] عکس اس نور کا جیں رخن[6] جھلکنے لگا آرسی کے نمن[7]
سو اس آرسی میں کیا جیوں[8] نظر ہوا عاشق اپنا اپس[9] دیکھ کر
اپس[10] کچھ پرتو کوں معشوق جان لیا مبتلا ہو کے عاشق کی شان
نکل کنج مخفی سے خلوت کے بھار[11] کیا جلوہ گر کثرت بے شمار

۳۶۔ سلطان محمد قلی قطب شاہ، ابراہیم قطب شاہ کا فرزند اور والیٔ گولکنڈہ

۱۔ سے ۔ ۲۔ کو ۔ ۳۔ اوگ ۔ ۴۔ آجتک ۔ ۵۔ پڑا ۔ ۶۔ رخپر ۔ ۷۔ مانند ۔ ۸۔ جب ۔ ۹۔ اپنےکو ۔ ۱۰۔ اپنے ہی ۔ ۱۱۔ باہر

وبانئ شہر حیدرآباد ہے اس کا تخلص قطب شہ اور معانی ہے۔ سنہ ۱۰۲۰ھ میں فوت ہوا۔ قدیم ترین ریختہ گو شعرا میں سے ہے۔ صاحب دیوان ہے۔ دو تین شعر ہدیۂ ناظرین ہیں۔

ساقی پوا گرم معانی کی نہیں نرنج | اس کیا ہی اختیار گناہ شراب تھا
رقیباں کی دکھوں سیتی قطب شہ توں نکر غم | خدا سارے رقیباں کی گلی دام دویگا
نج عاشقاں میں ہوتا جنگ و جدل سو سب دن | ہے شرع احمدی نج انصاف کر خدارا
پیا ہوں میں حضرت کے ہت آب کوثر | تو شاہاں اوپر مجھ کلس کر بنایا
میرا قطب تارا ہے تاروں میں نچل | تو مجھ پر فلک رنگ کا چتر چھایا
خدایا معانی کی امید بر لیا | کہ جیوں سانت کی سیونتی جگ اکھایا

سنہ محمد قطب شاہ نام، ظل اللہ اور قطب تخلص ہے۔ ابراہیم قطب شاہ کا پوتا، محمد قلی قطب شاہ کا بھتیجا اور داماد ہے۔ سنہ ۱۰۲۰ھ میں اپنے چچا کی وفات پر مالک تاج و تخت ہوا اور سنہ ۱۰۳۵ھ میں وفات پائی۔ مشہور مکہ مسجد کا بانی ہے۔ فارسی کے علاوہ زبان ریختہ میں صاحب دیوان ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پیا نور بنتا ہے نج دل سے جگ میں | کہ جس نور سے ہے سورج آشکارا
نبی صدقے قطبا کا من نج سون لاگیا | کہ آپ جیو میں تیرا کینا ہے ٹھارا
پیا سانولا من ہمارا بھولایا | نزاکت عجب سبز رنگ میں دکھایا
ہنسی اس کنول مکھ تھی جھڑتے ہیرے نت | تو اس شاب موتی سوں جگ جگ جگایا
چندر ہیں عیدی بشارت دکھایا | بھواں سیتی ساقی اشارت دکھایا
محمد نبی فیض تھی عید آکر | محمد قطب کوں صدارت دکھایا
صباحی او مکھ دیکھ پینا شراب | فرح بخش ساعت میں لینا شراب
نبی حسن تھی واں دی شاہ کوں | او مکھ کی عرق تھی سو پینا شراب

جگت حسن میں ہے ترا حسن محبوب		میں طالب تیرا ہوں میرا توں ہے مطلوب
تیرا حسن یوسف سوں کرتا ہے لاف		تیری آرزو میں ہیں عاشق جوں یعقوب

۵۵- عبداللہ قطب شاہ نام " عبداللہ " تخلص ہے۔ محمد قطب شاہ کا فرزند اور محمد قلی قطب شاہ کا نواسہ ہے۔ ۱۰۳۵ھ میں باپ کی جگہ تخت سلطنت پر متمکن ہوا۔ ولادت ۱۰۲۲ھ اور سال وفات ۱۰۸۳ھ ہے ریختہ میں صاحب دیوان ہے۔ نمونہ کے اشعار درج ذیل ہیں۔

بسنت آیا پہلا یا پھول لایا		سکھی لیا اب پیالی ہور اور پیالا
تیری پیشانی پر ٹیکا جھمکتا		تماشا ہے اُجالے میں اُجالا
تیرا صاف مکھ جام جیوں جگمگایا		جم اس جام کا ہو کے میں ذوق پایا
گفتم کہ ای پری توں ہے فتنہ زمانا		گفتا کہ راست گفتی اے گن بھری سیانا
گفتم کہ در جہاں یا لیلی ہو آئی ہے توں		گفتا کہ من چو مجنوں پائی ہوں سچ دوانا
گفتم کہ حال دل افت کیا ہے سو بول مجکوں		گفتا کہ زلف داست ہور خال ہے سودانا
گفتم کہ در ہوایت پھرتا ہوں ذرہ ہو میں		گفتا کہ در دل توں کی ہوں ازل تے خانا
گفتم کہ خانہ تو کاں ہے نشان سے منج		گفتا کہ ذرہ پرور سورج ہوں میں توں آنا
گفتم کہ در دہانت امرت کا ہے چشمہ		گفتا کہ خضر ہو توں اس چشمے پاس دہانا
گفتم کہ کیست اینجا تیرا ان پیارا		گفتا کہ شاہ عبداللہ ہے میرا پرانا

۵۶- مختار تخلص ہے نام معلوم نہ ہوسکا۔ ملا نصرتی کا ہمعصر اور دکنی شاعر ہے ۱۰۶۲ھ میں اردو میں ایک مثنوی تصنیف کی جس کا نام معراج نامہ ہے۔ سنہ ولادت اور وفات پر بھی پردہ پڑا ہوا ہے۔

۵۷- ملا نصرت نام " نصرتی " تخلص ہے اسکا شمار قدیم شعرائے دکن میں ہوتا ہے سال ولادت معلوم نہ ہوسکا۔ اسکا مولد و منشاء سرزمین دکن ہے عمر کے

آخری حصے میں بیجاپور گیا جہاں بادشاہ وقت علی عادل شاہ نے اس کی بڑی آؤ بھگت کی۔ قدر و منزلت کے ہاتھوں لیا اور خطاب ملک الشعرائی عطا فرمایا۔ نصرتی نے علی عادل شاہ کے حالات نظم میں قلمبند کر کے اس کو "علی نامہ" سے موسوم کیا۔ نصرتی علی عادل شاہ کی مدح میں کہتا ہے:۔

قلم آج جو مجھ جہانگیر ہے — صفت شہ کی لکھنے کی تاثیر ہے

زہے شاہ عادل سہی ولی — علی ابن سلطاں محمد بلی

ہر اک دیپ تجھ دیپ نا صرور — کہ سب ملک اندھارا دکن پر ہو نور

ترا چتر خورشید کا سائباں — منگے تجھ علم کا پناہ آسماں

علی نامہ کا سنہ تصنیف (۱۰۷۶) اس کے علاوہ نصرتی نے ایک مثنوی موسوم بہ "عشق نامہ" بھی لکھی ہے۔

۵۸۔ نوری تخلص نام معلوم نہ ہو سکا۔ دکن کے باشندے ہیں کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم اور دور اول کے شعرا سے ہوں گے۔ ان کا ایک شعر مشہور ہے۔

کید ہر دیکھوں کہاں جاؤں میں مجھ دل کے تئیں بچھراٹ ہے
یک باٹ کئی ہوں سگے صنم یاں دل ہی باراباٹ ہے

۵۹۔ محمد ولی نام شمس الدین لقب اور ولی تخلص ہے۔ ۱۰۸۰ھ میں یہ آفتاب شاعری افق اورنگ آباد پر طلوع ہوا اور وہیں نشو و نما پائی۔ اوائل عمر میں تکمیل علم کا شوق ان کو اورنگ آباد سے گجرات لے گیا۔ تحصیل علم کے بعد ریختہ گوئی کی طرف توجہ کی اور اس میں ایسا کمال پیدا کیا کہ شعرائے ہند اس کو اردو شاعری کا "آدم" ماننے لگے۔ دہلی میں سب سے پہلے ولی کے دیوان نے شہرت پائی اور اسی دیوان کو دیکھ کر ہند کے باکمالوں نے ریختہ گوئی کی جانب توجہ کی۔ اس کا دیوان سات سمندر پار پہنچا اور جرمنی و لندن تک چھپا۔ ہو علم سے

فراغت حاصل کرکے دلّی احمد آباد سے اورنگ آباد آیا اور یہاں سے دہلی گیا ایک زمانہ تک وہاں مقیم رہا اخیر عمر میں احمد آباد گجرات واپس آیا اور ایسا گوشہ نشین ہوا کہ اپنی جگہ سے مر کے اٹھا۔ سنہ وفات (۱۱۵۵ھ) ہے ان کا بھی ایک شعر اظہار کمال شاعری کے لئے کافی ہے۔

اک دل نہیں آرزو سے خالی ہر جا ہے محال اگر خلا ہے

۱۰۔ صارم تخلص میر عبدالحی خاں نام اور صمصام الملک خطاب ہے صمصام الدولہ شہنواز خاں مصنف "مآثر الامراء" و"بہارستان سخن" کے فرزند ارجمند ہیں سنہ ۱۱۴۲ھ میں بمقام اورنگ آباد پیدا ہوئے۔ بیس بائیس سال کی عمر میں علوم مروجہ عربی و فارسی اور دیگر فنون میں فراغت حاصل کی۔ اس کے بعد سلطنت کی متعدد اہم اور شاندار خدمات انجام دیں۔ سنہ ۱۱۷۱ھ میں فرانسیسیوں نے ایک الزام میں آپ کے والد صمصام الدولہ کو شہید اور آپ کو محبوس کرکے حیدرآباد بھیج دیا۔ سنہ ۱۱۷۲ھ میں نواب آصف جاہ ثانی کے حکم سے قید سے رہائی نصیب ہوئی اور خدمت جلیلہ وزارت عظمیٰ سے مفتخر و ممتاز ہوئے۔ سنہ ۱۱۹۶ھ میں وفات پائی دکن کے بہترین اور مدبر وزراء میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ صمصام الملک فارسی اور ریختہ کے باکمال شعراء میں تھے۔ ریختہ کے دو چار شعر درج ذیل ہیں:۔

مجھے گر جاں کنی کا حکم وہ شیریں دہاں کرتا کہا اس کا خدا کی سوں ارے یار و بجاں کرتا
فلک گر تا زمیں پھٹتی چمن سے رنگ اُڑ جاتا اگر میں اپنے دل کا حال اے ظالم بیاں کرتا

سجن تجھ زلف میں ململ رہا ہے ہمارے ہاتھ میں کب دل رہا ہے
نہیں کھلتا بہار و باغ سوں دل یہی عقدہ مجھے مشکل رہا ہے

۱۱۔ عارف الدین نام عاجز تخلص ہے۔ اوائل عمر میں شمالی ہند سے اورنگ آباد آئے اور وہیں تعلیم و تربیت پائی۔ سراج کے ہمعصر تھے۔ اردو فارسی کے ممتاز شاعر میں

۱۱۸۰ھ میں بمقام ناندیڑ وفات پائی۔ عاجز نے اپنے نام و تخلص یعنی "عارف الدین خاں عاجز" سے خود ہی اپنے وفات کی تاریخ نکالی۔ ان کو تاریخ گوئی میں خاص ملکہ تھا۔ اردو میں صاحب دیوان ہیں۔ کتب خانہ آصفیہ میں ان کے دیوان کا قلمی نسخہ موجود ہے "لعل و گوہر" نام کی ایک مختصر مثنوی بھی اردو میں لکھی ہے جو دلچسپی سے پڑھی جاتی ہے اور عاشقانہ سوز و گداز سے معمور ہے ان کو سنگلاخ زمینوں میں غزل کہنے کا شوق تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پھبرت پاکی کو خط پر حسن اب بس ہو چکا ... کیوں عبث گھستا ہے منہ لوہے سی پارس ہو چکا
عاجز ہوں شاہ ملک جنوں میرے واسطے ... سورج کلاہ و چتر فلک ہے زمین ہے تخت
چمن میں چل کے صنم بے حجاب چادر کھینچ ... بہار رنگ گلستاں کے سر سے چادر کھینچ
نو بہار آنے سے گل آیا ہے اے صیاد با ... اب کریگا کیوں اسیروں کا دل ناشاد شاد
گردن اپنی کر کے خم آیا ہوں اے قاتل شتاب ... سر اٹھا کر آج بار خنجر فولاد لاد
عرق جب اس پری کے چہرہ پر نور سے ٹپکے ... خجل ہو گل سے شبنم جیوں لہو ناسور سے ٹپکے

مثنوی "لعل و گوہر" میں ایک مقام پر لکھتے ہیں:۔

رہی تھی رات چوتھائی سے کچھ کم ... گہر ریزاں تھا گلزاروں میں شبنم
ملی جب رات گھٹ گھٹ کر عدم میں ... کھلے غنچے نسیم صبحدم سیں
جگی گوہر سو تھی بے یار و مونس ... اٹھی انکھیانکوں کھولی مثل نرگس
حکایت رات کی کر یاد روئی ... کہی میں نیند پا کر لعل کھوئی

۱۱۱۔ شاہ عزیز اللہ نام عزیز تخلص ہے۔ قدیم دکنی شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ بارہویں صدی میں وفات پائی۔

۱۱۲۔ میر فخر الدین ترمذی نام "فخر" تخلص ہے۔ حاجی سید عبداللہ جنید ثانی کے پوتے اور سید محمد حیات کے داماد تھے۔ اورنگ آبادی بزرگوں میں انکا

شمار ہوتا ہے۔ ابتدائے سپاہی تھے بعد میں طریقت میں قدم رکھ کر اپنے خسر سید محمد حیات سے خرقہ خلافت حاصل کیا تھا۔ وفات کے وقت حضرت شیخ صاحب نے بھی اپنا خرقۂ خلافت آپ کو عطا فرمایا تھا۔ بارہویں صدی کی اخیر میں اورنگ آباد میں وفات پائی اور بارہ پلہ کے قریب دفن ہوئے۔ مقبرہ زیارت گاہ خاص و عام ہے فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے۔ فرماتے ہیں:-

بے نشاں عین نشان تھا مجھے معلوم نہ تھا | یار ہر شان عیاں تھا مجھے معلوم نہ تھا
عشق نے فارغ کیا تجھ عقل کی تدبیر سوں | محو دیں اب یار پر قربان کر لو ننگ و نام

۱۳۔ شاہ فضل اللہ نام فضلی تخلص ہے۔ اورنگ آباد کے رہنے والے اور سید عطاء اللہ کے فرزند تھے۔ صوفی مشرب اور نقشبندی طریق پر عامل۔ اکابر و اعیان سلطنت ان کے معتقد تھے علم سلوک میں رسالہ "زاد آزاد" قصۂ "بڑہ ہیوکا" اور قصۂ "پریم لوکا" ان کی تصانیف سے ہیں۔ فارسی اور ریختہ میں طبع آزمائی کرتے تھے۔ ۱۱۸۴ھ میں وفات پائی۔ اور اورنگ آباد میں دفن ہوئے۔ نمونہ کلام یہ ہے۔

دو گھڑی رات دن میں آئی کیوں | دو بہواں دیکھ کر کہا میں یوں
اب تو کچھ باقی رہا نہیں ہے مگر بیچوں خدا | جب تلک تھی جنس گھر میں بیچ کھاتا تھا فقیر
کہا تجھ پر بھلا ہے سورۂ یوسف کا دم کرنا | طبیب عشق سے پوچھا زلیخا نے علاج اپنا

۱۵۔ فتوت تخلص شاہ عنایت اللہ نام ہے۔ نواب لشکر جنگ کے فرزند اور خواجہ ابوالبرکات خاں عشرت کے بھائی ہیں۔ شاعری میں سراج اورنگ آبادی سے تلمذ تھا۔ بارہویں صدی کے اخیر میں فوت ہوئے۔ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ کلام یہ ہے:-

دمبدم نالہ مرے دل سے ہم آغوش اٹھے | یہاں تلک مجھ سے ہے فریاد کو ربط قلبی

خاک پر جوں نقش پا ہیں خانہ بردوش نہیں ہم یہ بسکروحی تجھے معلوم ہے باد صبا

۶۱ؔ۔ خواجہ عبدالغنی نام، منعم خاں خطاب، قدر تخلص ہے۔ ان کے بزرگ ہمدانی تھے ان کے والد خواجہ عبداللطیف کابل سے دہلی آئے اور دہلی سے وارد اورنگ آباد ہوئے۔ قدر دفتر دیوانی میں مدۃ العمر اعلیٰ خدمت پر مامور رہکر سنہ ۱۲۰۱ھ میں فوت ہوئے۔ اردو کے خوش فکر شعرا میں ان کا شمار ہوتا ہے نمونہ کلام یہ ہے:۔

بلبل کو فصل گل میں اسیری ہوئی نصیب رکھتا ہے کس قفس میں یہ صیاد دیکھنا

بلبل ہوئی ہے دام میں صیاد کے اسیر غنچوں کے کان کھولنے باد صبا چلی

۶۲ؔ۔ مہر علی نام۔ مہر تخلص ہے اورنگ آباد کے باشندے تھے سنہ ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی۔ سراج کے ہمعصر اور اچھے شاعر تھے نمونہ کے دو چار شعر درج ذیل ہیں۔

خاک ہونا کیمیائے عشق کی تدبیر ہے پارہ بیتابئ دل مارنا اکسیر ہے

آبروپائی شجاعت نے عطائے فقر سے موج نقش بوریائے جوہر شمشیر ہے

پڑھ نماز یار تو ہر وقت رندوں کو نہ چھیڑ تجھ کو اے زاہد پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ

اس شعر کے بعد شیخ ابراہیم ذوق دہلوی کا یہ مشہور شعر پڑھو۔

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو

۶۳ؔ۔ شیخ احمد نام "مضطر" تخلص ہے۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور سنہ ۱۱۹۴ھ میں وفات پائی۔ کہتے ہیں۔

جو عرض حال کرتا ہوں جواب تلخ ہے جب تب نہیں یار و کہیں اس بات کا کچھ انت پاتا ہے

۶۴ؔ۔ محمد ماہ محرم تخلص ہے۔ نواب شجاعت خاں صوبہ دار برار کے فرزند تھے سنہ ۱۱۶۲ھ میں فوت ہوئے اردو کے اچھے شاعر تھے ان کا ایک شعر ہے:۔

شاخ کی مینا کو کس شوخی سے لاتی ہے بہا گل پہ شبنم نہیں ہے اسکو گل پلاتی ہے بہار

۲۰۔ مرتضی نام "مہدی" تخلص ہے۔ اورنگ آباد میں پیدا ہوئے اور حیدرآباد میں نشو ونما پائی۔ یہ سراج کے ہمعصر اور اردو کے نامور شعرا میں تھے۔ ۱۱۷۴ھ میں جنگ مرہٹہ میں شہید ہوئے دو تین شعر ہدیہ ناظرین ہیں۔

نان داغ دل ہمارا آب آنکھوں کا سرشک عشق کی دولت سے ہمنے خوب کچھ کھایا پیا

چار دن بچھڑا صنم ہم پر قیامت آگئی مہدی حیرت ہے کہ تنہا خضر اتنی کیوں جیا

ہے کسی مکھ کا تاب دیدہ ہوا یوں جو آئینہ آب دیدہ ہوا

۲۱۔ میرزا محمد جان نام اور نثار تخلص ہے۔ وزارت خاں خطاب شہر اورنگ آباد میں پیدا ہوئے۔ تیرھویں صدی ہجری کے آغاز میں وفات پائی۔ شاہ سراج کے ارشد تلامذہ سے تھے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

نہوتے شور ونالہ سے مرے آنسو اگر جاری نہ صحرا سبز ہوجاتا نہ دریا جوش میں آتا

بہار آنے سے گلشن میں کیا مچی ہے دھوم کہا ہے قمری و بلبل نے سروگل پہ ہجوم

گھٹا غم ہے بجلی ہے ہر آہ میری برستا ہے آنکھوں سے یہ ابر نیساں

دل ہے کہیں اور پھیرتے ہیں دانہ تسبیح کو ہے خلل ان زاہدوں کے سر بسر ایمان میں

شب تاریک میں گر عزم ہووے سیر کا تم کو تعجب نہیں ہے لیکر چاند مشعل ہاتھ میں آوے

تری زلفوں کے سایہ نے دوانا کر دیا سب کو گریباں چاک کرتا ہاتھ میں ہر شانہ آتا ہے

موسم ہجر میں یہ تازہ بہار آئی ہے دل مرا داغ گلستاں کا تماشائی ہے

بسکہ روتا ہوں تری یاد میں اے گوہر حسن مردم چشم مرا مردم دریائی ہے

۲۲۔ محمد جان نام "مقدس" تخلص ہے خلدآباد کے باشندے تھے بارھویں صدی کے اخیر میں فوت ہوئے۔ کہتے ہیں:۔

دل سے عزلت میں مے وحدت کو پیدا کیجئے خم میں رکھ یہ دانہ انگور صہبا کیجئے

۲۲۳۔ احمد یار خاں نام "یار" منور الدولہ ممتاز جنگ خطاب ہے۔ شجاع الدولہ بہادر دل خاں ناظم حیدر آباد کے فرزند ہیں۔ حیدر آباد میں پیدا ہوئے اور یہیں نشو و نما پایا۔ ۱۱۸۵ھ میں فوت ہوئے اردو کے باکمال شعرا میں تھے۔ چند شعر ہدیۂ ناظرین ہیں۔

گریباں چاک مطعون جہاں بدنام عالم ہوں | پڑے خاک اس طرح کے ہائے رسوائیکے جینے میں
ہمارے دل کو ناحق خوبرو ہر دم جلاتے ہیں | کہیں بت بتکدے کے بھی برہمن کو ستاتے ہیں
موسم ہولی میں ہوتے ہیں شہید | آج وہ قاتل بسنتی پوش ہے

۲۲۴۔ لچھمی نارائن نام اردو میں صاحب اور فارسی میں شفیق تخلص ہے۔ ان کا مولد و منشا اورنگ آباد ہے۔ فارسی اور اردو کے اچھے شاعر تھے اورنگ آباد سے بضمن ملازمت بلدہ حیدر آباد آگئے تھے۔ مولانا غلام علی آزاد بلگرامی ان کے حال پر خاص نظر رکھتے تھے۔ شفیق نے مولانائے ممدوح سے ہر قسم کی تعلیم و تربیت پائی اور شاعری میں ید طولی حاصل کیا۔ استاد کی طرح ان کو بھی تاریخ و سیر سے خاص دلچسپی و انہماک تھا اور تذکرہ نویسی میں مخصوص مذاق کے آدمی تھے گل رعنا۔ شام غریباں اور چمنستان شعرا" ان کے مصنفہ نایاب تذکرے ہیں جنمیں فارسی اور ریختہ گو شعرا کے حالات نہایت صحت کے ساتھ قلمبند کئے ہیں شفیق عمر طبعی کو پہنچکر اوائل تیرھویں صدی میں بلدہ حیدر آباد میں فوت ہوئے ٭

رباعی ضامن کنتوری

آنکھیں کھلی ہیں حسن فطرت دیکھو | ہر رنگ میں نیرنگی قدرت دیکھو
حیرت کا اشارا ہے ادھر تو آؤ | لو آئینہ میں ہول اپنی صورت دیکھو

دیکھیں مرا دل دیکھنے والے

از جناب مرزا تصدق حسین صاحب صدق جائسی

تجھے یوں دیکھ کر خود رقص بسمل دیکھنے والے ۔ دکھائیں کیا تجھے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

ہوا سے قیس اگر بنجا غبار پردۂ لیلیٰ ۔ بگولے کی طرح اٹھ اٹھ کے محمل دیکھنے والے

ہنسی سمجھے تھے قلب مضطرب پر ہاتھ کا رکھنا ۔ تڑپ کر رو دیے بیتابیٔ دل دیکھنے والے

کمان غمزہ میں تیر نگہہ زہ کر چکا کوئی ۔ نوید اے جنبش مژگاں قاتل دیکھنے والے

نہ چھپ جائے کہیں رنگ حنا دست حنائی سے ۔ کف افسوس مل کر خوں بھرا دل دیکھنے والے

سوال [illegible] کا بس جواب اتنا ہی کافی ہے ۔ ادا سے مسکرا دے رد سائل دیکھنے والے

جو ٹکڑا اس جگہ کا ہو وہیں کہہ دے تو بہتر ہے ۔ مرا حسرت زدہ ٹوٹا ہوا دل دیکھنے والے

نظر آتا نہیں پردہ میں تو جا کر دیکھ لے جلوہ ۔ تصور شرط ہے لیلیٰ کا محمل دیکھنے والے

نگاہ ناز کو آخر ادھر سے کیوں تغافل ہے ۔ جگر کی بھی خبر لے او مرا دل دیکھنے والے

تہ شمشیر قاتل دیکھ اس حسرت سے اے بسمل ۔ نگاہ یاس کے ہو جائیں قائل دیکھنے والے

خدا شاہد ہے تیری بیکسی سے ہے قابل عبرت ۔ فلک کو یاس سے منزل بمنزل دیکھنے والے

بتان شوخ کو دل دیکھنے کا صدق دعویٰ ہے ۔ مرے اشعار تو دیکھیں مرا دل دیکھنے والے

قطعہ

از جناب مولانا مولوی سید محمد عسکری صاحب عادل کنتوری

ہے مکاں اپنے لئے کنج قفس ۔ آپ فرماتے ہیں تم آزاد ہو

گر ہے آزادی یہی حبس دوام ۔ قید کی تعریف کچھ ارشاد ہو

غلاف کعبہ

گزشتہ سے پیوستہ

از جناب مولوی سید علی شبیر صاحب مترجم ہائیکورٹ

غلاف کعبہ کی تیاری اور اسکا جلوس۔

اڈورڈ ولیم لین لکھتا ہے کہ آجکل (سنہ ۱۸۳۵ء میں) کسوت کعبہ قلعۂ قاہرہ[1] میں سرکاری طور پر تیار کرائی جاتی ہے برٹن جب نے سنہ ۱۸۵۳ء میں سفر حجاز کیا لکھتا ہے کہ ان دونوں غلاف کعبہ شہر قاہرہ میں محلہ باب الشعاریہ کے متصل روئی کے ایک کارخانہ میں جس کا نام الخرنفش ہے تیار کرایا جاتا ہے اور قبیلۂ بنی سعدی والے جن کو بیت السعدی کہتے ہیں۔ ورثتہً اپنے آبا و اجداد کے زمانہ سے غلاف تیار کرتے چلے آرہے ہیں۔ بعض اخبارات میں دیکھا گیا اور بعض معتبر حاجیوں کی زبانی بھی سنا گیا ہے کہ غلاف کعبہ کمسن ناکتخدا لڑکیوں سے تیار کرایا جاتا ہے مولوی آغا شیخ محمد صاحب مرحوم و مغفور اول تعلقدار حیدر آباد نے بھی جنھوں نے

---

[1] یہ قلعہ کوہ مقطم کی چوٹی پر شہر قاہرہ کی سطح سے کوئی (۲۵۰) فٹ کی بلندی پر بنا ہوا ہے باوجود اس بلندی کے قلعہ کے اندر جانے کا راستہ ایسا بنایا گیا ہے کہ لدے ہوئے اونٹ بآسانی چڑھ جاتے ہیں۔ یہ قلعہ سلطان صلاح الدین نے سنہ ۱۱۷۶ء میں تعمیر کرایا تھا قلعہ کے اندر محمد علی پاشا بانئ خاندان خدیویہ کا عالیشان محل سنگ مرمر کی ایک خوشنما مسجد اور توپیں ڈھالنے کا ایک کارخانہ ہے۔

سنہ ۱۳۱۹ھ میں حج کیا تھا اپنے سفر نامے میں اس روایت کا ذکر کیا ہے۔ جب کسوت یا غلاف تیار ہو جاتا ہے تو اُس کو عید الفطر کے دو تین دن بعد سینے اور تہہ کرنے کے لئے مسجد حسین میں[1] بڑی دھوم دھام سے لیجاتے ہیں اور پھر محمل میں رکھکر نہایت تزک و احتشام کے ساتھ مکہ معظمہ روانہ کیا جاتا ہے۔ غلاف کے جلوس کی کیفیت ہم ولین کی کتاب سے ترجمہ و اقتباس کر کے لکھتے ہیں:۔

غلاف کا جلوس دیکھنے کے لئے ۲؍ شوال سنہ ۱۲۴۹ھ کو سورج نکلنے سے قبل میں دروازہ خان خلیل[2] کے محاذی ایک کتب فروش کی دکان پہ

---

[1] قاہرہ میں ایک مسجد ہے جسے مسجد حسین یا جامع سیدنا حسین کہتے ہیں۔ اسکی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مصر کے فاطمی خلیفہ المعز لدین اللہ کا سنہ ۳۶۱ھ میں جب مصر پر تسلط ہوا تو وہ حضرت امام حسین علیہ السلام کا سر مبارک جو بنی امیہ کے خزانہ میں محفوظ تھا شام سے قاہرہ لے گیا اور ایک عظیم الشان مقبرہ تیار کر کے اُس میں دفن کیا اور اس مقبرے کے ساتھ ایک مسجد بھی بنوائی جو مسجد سیدنا حسین کے نام سے مشہور ہے۔ اس مسجد کا انتظام نہایت عمدہ ہے اور فرش و فروش وغیرہ سے خوب آراستہ ہے ہر سال یہاں ربیع الثانی کے مہینے میں مولود حسینؑ ہوتا ہے جس میں ختم قرآن وغیرہ کیا جاتا ہے سارا شہر اس مقبرے کی زیارت کے لئے جاتا ہے۔ زہاد و عباد و مسجد میں شغل و درود وظائف میں مصروف رہتے ہیں اور شہر میں کوئی پندرہ روز تک بڑا میلا رہتا ہے۔

حضرت امام حسین علیہ السلام کے سر مبارک کی جائے دفن کے متعلق اور بھی کئی روایتیں ہیں مثلاً یہ کہ وہ مدینہ منورہ کے مشہور قبرستان جنت البقیع میں قبہ اہل بیت کے اندر دفن ہے۔ دمشق میں بھی مسجد امویہ کے متصل ایک مسجد ہے جسے مسجد راس سیدنا الحسین کہتے ہیں یہاں ایک خوشنما گنبد ہے جس میں سر مبارک دفن ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ ایک روایت ہے کہ کربلائے معلی میں جسم اطہر کے ساتھ سر بھی دفن کیا گیا۔

[2] خان مسافر خانے کو کہتے ہیں۔

جا بیٹھا۔ یہاں آدمیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ لگے ہوئے تھے اور یہ دکان اور اس بازار کی تمام دکانیں تماشائیوں سے کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ غلاف کا جلوس دیکھنے کے لئے ہر عمر کا آدمی گھر سے نکل بھاگا تھا۔ سورج نکلنے کے دو گھنٹے بعد چار ٹکڑے جن سے غلاف کا ایک طرف کا رُخ بنتا ہے ہمارے سامنے سے گزرے۔ ہر ٹکڑا ایک ایک جگہ پہ رکھا ہوا تھا۔ ان ٹکڑوں کے ساتھ ان کے باندھنے کی رسّیاں بھی رکھی ہوئی تھیں۔ گدھے کچھ آراستہ نہ تھے اور معمولی فلاح[1] نیلی رنگ کی قمیص پہنے ہوئے ان کو ہانک رہے تھے اس کے بعد کوئی پون گھنٹے تک سناٹا رہا۔ اور کوئی قابل دید چیز ہمارے سامنے سے نہ گزری۔ البتہ چند درویش اور دو مسخرے دکھائی دیئے۔ یہ جس دکان پہ لوگوں کو اچھے کپڑے پہنے ہوئے دیکھتے وہاں ٹھہر جاتے اور جنگ زرگری میں مصروف ہو کر ایک دوسرے کو خوب بے نقط سناتے اور منہ پہ بڑے زور زور سے طمانچے لگاتے تھے ان کے بعد بیس آدمی مزدوروں کی سی شکل کے پھٹے پرانے کپڑے پہنے نکلے ان کے کندھوں پہ لکڑی کا ایک کارچوبی چوکھٹا تھا جس پہ حزام[2] کا ایک حصہ لٹکا ہوا تھا حزام کے چار ٹکڑے ہوتے ہیں جن کو کسوت میں جب سجا دیتے ہیں تو مسلسل ایک پٹی بنجاتی ہے جو پورے طور پہ خانہ کعبہ کے گرداگرد کوئی بیس فٹ بلندی پہ چاروں طرف آجاتی ہے۔ یہ بھی اُسی سیاہ

[1] ۔ فلاح کے معنی کسان کے ہیں۔ مصر میں گدھے والوں اور گنواروں کے لئے یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے۔

[2] ۔ حزام کے معنی پٹی یا بند کے ہیں اس کی ضروری تفصیل آگے بھی درج کیگئی ہے۔

کپڑے کی ہوتی ہے جس کا غلاف ہوتا ہے لیکن اس پر کتنے بڑے
خوشنما ہوتے ہیں جو بڑے بڑے خوبصورت سنہری حروف میں
کاڑھے جاتے ہیں۔ حزام کے کناروں پر سنہری گوٹ ہوتی ہے
اور ہر بہرے پر جہاں اوپر اور نیچے کے کنارے ملتے ہیں نہایت
اچھی طرح سرخ و سبز ریشم سے لیکر سنہری کلابتوں سے کام کردیتے
ہیں۔ حزام کوئی دو فٹ چوڑی ہوتی ہے۔ اس کے حمالوں میں سے
کبھی کبھی کوئی نہ کوئی حمال اس کارچوب کو چھوڑ کر چلا جاتا تھا اور کسی
معزز تماشائی سے انعام مانگ کر پھر اس چوکھٹے کو اٹھانے لگتا تھا
اس کے بعد کوئی پاؤ گھنٹہ اور گزر گیا پھر غلاف کے باقی کے تین
حصے بھی ایک کے بعد ایک نکلے آدھ گھنٹہ بعد کئی بڑے اونچے
اونچے اونٹ آئے ان کو تھوڑا تھوڑا مہندی سے رنگ دیا تھا
اور اُن پر بہت ہی جھلا جھل کے اونچے اونچے کجاوے رکھے تھے
ان میں سے بعض پر ایک ایک دو دو لڑکے لڑکیاں اور بعض پر
بلیاں بیٹھی تھیں۔ ان کے پیچھے فوجی باجہ اور فوج باقاعدہ نکلی
پھر برقع[۱] یعنے کعبے کے دروازے کا پردہ آیا۔ یہ ایک بہت بڑے
چوکھٹے پر منڈھا ہوا تھا اور ایک سجے ہوئے اونٹ پر رکھا تھا
یہ بھی مثل حزام کے سیاہ کپڑے کا تھا اور اس پر بھی سنہری حروف کے
کتبے تھے اس کا کام نہایت اعلیٰ درجے کا اور بہت لمبوان تھا
اس کا استر سبز ریشمی کپڑے کا تھا۔ برقع کے ساتھ ساتھ کئی حلقے

---

[۱] برقع کی تفصیل غلاف کے اجزا کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

درویشوں کے تھے جو اپنے ہاتھوں میں جھنڈے اور جھنڈیاں لئے ہوئے تھے اور کسی پر کلمہ۔ کسی پر آیات قرآنی۔ خدا و رسول کے نام اور اُن کے فرقے کے بانیوں کے نام لکھے تھے۔ بعض قادری درویش مختلف رنگ کے جال لئے ہوئے تھے جو حلقوں پر پھیلے تھے اور ہر حلقہ ایک ایک لکڑی پر باندھ دیا گیا تھا۔ بعض درویش معمولی طریق پر ذکر کرتے جاتے تھے اور ورد اسمائے الٰہی اور حمد و ثنا میں مصروف تھے ان کے پیچھے دو آدمی ڈھال تلوار لئے سیف کے ہاتھ نکالتے جا رہے تھے۔ ان کے بعد ایک شخص بھیڑ کی کھال کی پوستین پہنے کھال کی ایک اونچی ٹوپی سر پر۔ اُن کی ڈوریوں اور سُتلیوں کی تل چانولی ڈاڑھی لگائے اور مونچھوں کی جگہ لمبے لمبے دو سفید پر اڑتے ہوئے گھوڑے پر سوار چلا جا رہا تھا۔ جگہ جگہ یہ ٹھہرتا جاتا تھا۔ تماشائی اُس کو کاغذ کے پرچے دیتے تھے وہ اُن پر فتوے اور مقدموں کے فیصلے لکھتا تھا۔ ایک لکڑی اُس کے ہاتھ میں تھی جس سے وہ قلم کا کام لیتا تھا اور دم پر دم گھوڑے کی کوکھ میں مارتا جاتا تھا۔

سب سے زیادہ قابل ذکر رفاعی[1] فرقے کے چند درویش تھے ان کے ہاتھوں میں ایک ایک فٹ لمبے لوہے کے گرز تھے جنکے ایک طرف لوہے کے ایک بڑی گیند سی لگی ہوئی تھی اور اُس میں

[1] اس قسم کے فقیر ہندوستان کے ہر شہر میں بھی پائے جاتے ہیں ان کو یہاں مرچھڑے کہتے ہیں۔ یہ علاوہ گرز مارنے کے چاقو سے اپنے جسم کو زخمی بھی کرتے ہیں۔

چھوٹی چھوٹی بہت سی زنجیریں لٹک رہی تھیں اور دوسری طرف نکیلی ڈنڈی تھی۔ وقتاً فوقتاً یہ درویش بڑے زور زور سے اپنی آنکھوں میں نوک کی طرف سے گرز مارتے تھے اور اُس کی ڈنڈی ایک ایک انچہ آنکھ کے اندر گھستی ہوئی معلوم ہوتی تھی مگر آنکھ کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا تھا۔ یہ کرتب بہت ہی صفائی سے کیا جارہا تھا اور اسی کرامات کے صلہ میں یہ لوگ دو ایک پیسے یا ایک سلفہ تمباکو لے کر خوش ہوجاتے تھے۔ میرے پاس جو تماشائی کھڑے تھے اُن کو اس کرتب کی نسبت دھوکے یا نظربندی کا کوئی شبہ نہ تھا بلکہ وہ اسکو تصرفات درویشانہ سمجھ رہے تھے میں نے جب کہا کہ اس کھیل میں اعلیٰ درجے کی ہاتھ کی صفائی اور مٹھی کی چالاکی ہے تو تماشائیوں میں سے ایک صاحب جو وسیع معلومات کے آدمی معلوم ہوتے تھے اور میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے تھے مجھ پر لعن طعن کرنے لگے اس جلوس کے ساتھ زیادہ تر رفاعی فقیر تھے اور اُن کے گھوڑے پر اُن کے پیچھے پیچھے آرہے تھے اس کے بعد محمل آیا۔ اس وقت کسوت کے جلوس کے ساتھ محمل کو رونق بڑھانے کے لئے کر دیتے ہیں ورنہ محمل کا اصل جلوس قافلۂ حجاج کی روانگی کے وقت کسوت کے جلوس کے دو تین ہفتے بعد علحدہ نکلتا ہے جس کا ذکر آگے آئے گا۔ محمل کے پیچھے ایک دوسرا استطیل غلاف جس پہ زرین کام ہوتا ہے۔ اور جو مقام ابراہیم[1] پر ڈالا جاتا ہے آیا۔ اس کے بعد ایک

---

[1] کعبہ کے دروازے کے قریب ایک جالی دار گنبد ہے جسے مقام ابراہیم کہتے ہیں (بقیہ صفحہ دیگر)

ترکی فوجی افسر جو ایک کارچوبی کام کے رومال میں سبز ریشمی تھیلی لئے ہوئے تھا نکلا۔ اس پر بھی زردوزی کا کام تھا۔ یہ تھیلی خانہ کعبہ کے کنجی کے لئے تھی۔ اس کے پیچھے جلوس کا سب سے آخری شخص یعنے ایک نصف برہنہ شخص نکلا۔ یہ بزرگ ہمیشہ محمل کے ساتھ ساتھ اونٹ پر سوار رہتا ہے قافلے کے ہمراہ مکے جاتا ہے اور ساتھ ہی وہاں سے واپس آتا ہے اس کی عادت ہے کہ ہر وقت سر ہلاتا رہتا ہے۔ جلوس کسوت دیکھنے کے چند روز بعد میں مسجد حسینؓ میں کسوت وغیرہ دیکھنے کیلئے گیا وہاں مجھ کو باطمینان تمام کسوت دیکھ لینے دی اور اجازت کے صلہ میں اور غلاف کے ایک بالشت بھر ٹکڑے کے معاوضے میں جو کسوت سے زاید ہو کر بچ رہا تھا میں نے تھوڑا سا نذرانہ دیا۔"

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اسمیں وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم نے کھڑے ہو کر کعبہ تعمیر کیا تھا اس پتھر پر جو دو قدموں کے نشان ہیں وہ حضرت ابراہیم کے بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ پتھر کسی قدر بلندی پر ایک آئینہ دار چوکھٹے میں رکھا ہوا ہے اور اُس پر سیاہ زردوزی کا غلاف پڑا رہتا ہے جو محمل مصری کے ساتھ آتا ہے۔

۵۲ کلید کعبہ کی تھیلی مقام ابراہیم کے غلاف کے مثل سبز سرخ اور سیاہ رنگ کے کپڑے کی ہوتی ہے جس پر سُنہری حروف میں بسم اللہ، سلطان وقت کا نام اور یہ الفاظ کہ "یہ کعبہ شریف کی کنجی ہے" اور سورہ آل عمران کی ایک آیت بنی رہتی ہے۔ یہ تھیلی بھی کارخانہ خرنفش واقع قاہرہ میں تیار ہوتی ہے۔ خانہ کعبہ کی کنجی پُرانی وضع کی لمبی ہے اور ایسا ہی قفل ہے ان پر کلمہ کندہ ہے یہ مشہور ہے کہ جو بچہ بولتا نہو یا گونگا ہو اُس کے منہ میں کعبے کی کنجی پھرانے سے بولنے لگتا ہے۔

محمل

قبل اس کے کہ ہم غلاف کعبہ کی مصر سے روانگی اور محمل کے جلوس کا ذکر کریں۔ مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ محمل کی مختصر کیفیت لکھدیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ دراصل محمل کیا چیز ہے۔ یہ امر ملحوظ رہے کہ حاجیوں کی اصطلاح میں محمل سے مراد قافلۂ حجاج بھی ہوتا ہے مثلاً محمل مصری یا محمل[1] شامی کہیں تو

---

[1] آجکل مکۂ معظمہ میں دو محمل آتے ہیں ایک محمل مصری جس میں غلاف کعبہ آتا ہے اور اس کے ساتھ مصری حجاج اور فوج وغیرہ رہتی ہے جس کی تفصیل جلوس محمل مصری میں کی گئی ہے۔ دوسرا محمل شامی۔ حاجیوں کے یہ دو بڑے قافلے ہیں جن کے ساتھ محمل رہتا ہے۔ محمل شامی کے ساتھ مکۂ معظمہ و مدینۂ منورہ کے سالانہ اخراجات اور خدام و باشندگان حرمین کی تنخواہوں کی رقم ہوتی ہے۔ نیز موم بتیاں اور روغن زیتون جو سال بھر میں خرچ ہوتا ہے وہ اس محمل کے ساتھ آتا ہے۔ علاوہ ازیں نئے سلطان ترکی کی تخت نشینی کے وقت روضہ رسول اللہ کے واسطے ریشمی غلاف اور کعبے کا اندرونی غلاف بھی محمل شامی کے ساتھ بھیجا جاتا ہے محمل شامی یا شامی قافلۂ حجاج قسطنطنیہ سے روانہ ہوتا ہے۔ سابق میں خشکی کی راہ سے اناطولیہ و شام سے گزرتا ہوا اور شمالی ایشیا کے حاجیوں کو اکھٹا کرتا ہوا دمشق پہنچتا تھا۔ اب جہاز پر (جسے جھنڈیوں وغیرہ سے آراستہ کرتے ہیں) روانہ ہوکر بیروت آجاتا ہے یہاں بڑے جوش وخروش کے ساتھ اس کا استقبال کیا جاتا ہے۔ پھر دمشق سے (۴۲) منزلیں طے کرکے ایک مہینے میں مکہ معظمہ پہنچتا ہے اس قافلہ میں کم وبیش چار پانچ ہزار آدمی اور دس پندرہ ہزار اونٹ ہوتے ہیں فوج اور توپخانہ بھی رہتا ہے تجارتی مال بھی اس قافلہ کے ساتھ بکثرت آتا ہے اور ہر قسم کی دکانیں اس کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں جہاں قافلہ ٹھہرتا ہے ایک بازار لگ جاتا ہے بہت سے لوگ اس سفر میں حاجیوں کے خورد و نوش اور سواری کا ٹھیکہ (تعہد) (بقیہ برصفحۂ دیگر)

اُس سے مصری یا شامی قافلہ حجاج خیال کر سکتے ہیں۔ نیز محمل مصری کے ساتھ چونکہ غلاف کعبہ مصر سے آتا ہے اس لئے مجازاً محمل مصری سے غلاف کعبہ بھی مراد لیجاتی ہے اور اس اعتبار سے اس کو محمل شریف بھی کہتے ہیں۔

محمل لکڑی کا ایک چوکھونٹا مخروطی شکل کا کھوکھلا ڈھانچ ہوتا ہے جس کی چوٹی اہرام نما یا تعزیہ نما ہوتی ہے اس پر سیاہ عمدہ ریشمی کپڑا منڈھ کر سُنہری کلابتوں سے نہایت عمدہ و خوشنما کتبے کاڑھ دیتے ہیں۔ کہیں کہیں ان کتبوں کی زمین سرخ و سبز ریشم کی رکھتے ہیں۔ کناروں پر ریشمی جھالر ٹانکتے ہیں اور چاندی کے ٹوپن دار پھندنے لٹکاتے ہیں۔ محمل کے نقش و نگار ہمیشہ ایک ہی وضع کے نہیں ہوتے البتہ بیت اللہ کا نقشہ اور سلطان وقت کا نام و خطاب بالالتزام ہر سال محمل پر بنایا جاتا ہے۔ مولوی محمد محی الدین حسین صاحب صدر مدرس مدرسۂ لطیفیہ ویلور جنھوں نے ۱۳۲۲ھ میں حج کیا ہے اپنے سفرنامے میں تحریر فرماتے ہیں کہ "محمل مصری کے کلس چاندی کے ہیں۔ چاروں ڈنڈوں پر چار اور بیچ کے قبہ پر ایک۔ مصری فوج کا علم سرخ اور عثمانی ہلال اُس پر مرسوم ہے برٹش حمایت کی علامت ایک طرف صلیبی شکل بھی ہے۔ مسلمان اس صلیبی شکل کو کمال افسوس سے دیکھتے ہیں"۔

خان بہادر حاجی عبدالرحیم صاحب سفر حرمین الشریفین میں سنہری کلس لکھتے ہیں۔ ولیم اڈورڈ لین نے لکھا ہے کہ کلس اور اُن کے ہلال پر چاندیکا

(بقیہ مضمون حاشیہ گزشتہ) لے لیتے ہیں ان کو مقدم کہتے ہیں ان کو تعہد دینے سے بہت سہولت ہوجاتی ہے۔ سرکاری طور پر بھی محمل شامی کی ہمراہی فوج کی سربراہی ہر شہر اور ہر قریہ میں ہوتی ہے اور ہر جگہ کے مسلمان اس کا خیر مقدم نہایت مسرت اور جوش سے کرتے ہیں۔

ملمع ہوتا ہے۔ محمل کے اندر ایک حمائل اور معمولی تقطیع کا قرآن چھت میں لٹکا دیتے ہیں اور محمل کے اندر غلاف کعبہ کئی صندوقوں میں بند کر کے رکھ دیتے ہیں۔ جس اونٹ پر یہ محمل باندھا جاتا ہے اُس کی مدد کے لئے تین اونٹ اور رکھے جاتے ہیں تاکہ اگر وہ تھک جائے تو یہ اُس کی جگہ کام دیں۔ جس اونٹ پر غلاف کعبہ بار کیا جاتا ہے اُس سے عمر بھر کوئی اور کام نہیں لیا جاتا۔

مقریزی کہتا ہے کہ اُن خلفا اور سلاطین میں جنھوں نے بذات خود حج کیا ملک الظاہر رکن الدین بیبارس سلطان مصر پہلا شخص ہے جس نے سب سے پہلے ۶۷۰ھ میں حاجیوں کے قافلہ کے ساتھ محمل روانہ کیا تھا اس کے بعد سے تمام سلطانوں نے جنھوں نے اپنا کاروان مکے بھیجا یہ بھی ضروری سمجھا کہ اپنی شاہانہ عظمت ظاہر کرنے کے لئے اس کے ساتھ ایک محمل بھی روانہ کیا کریں محمل کی ایجاد کے متعلق ایک یہ روایت بھی مشہور ہے کہ ملک ظاہر رکن الدین کی تخت نشینی سے چند سال قبل سلطان الصالح نجم الدین[1] کی بیوی ملکہ شجرۃ الدر[2] نے

---

[1] مصر میں ملک صالح نجم الدین کا شمار اولیاء اللہ اور صاحبان خرقہ میں کیا جاتا ہے وہ اپنے ہاتھ سے کھجور کے پتوں کی ٹوکریاں بنا کر اپنی گزر اوقات کیا کرتا تھا اور شاہی خزانہ سے ایک پیسہ نہ لیتا تھا۔ اس کا زمانہ سلطنت ۶۳۷ھ سے ۶۴۷ھ تک ہے قاہرہ کے محلہ نحاسین (کسیرا ٹھیرا) میں اس کا مزار ہے اور یہاں اس کا مولود جو ایک قسم کا عرس ہے۔ ربیع الثانی کے مہینے میں بڑی دھوم دھام سے کیا جاتا ہے۔

[2] ملکہ شجرۃ الدر (موتیوں کا درخت) نہایت نجیر و فیاض ملکہ تھی۔ اسکا اصل نام فاطمہ تھا اہل مصر اس کو بسبب اُس کی خوبیوں کے سیدتنا فاطمہ کے لقب سے خطاب کرتے ہیں سلطان صالح اور اُس کے فرزند کی وفات کے بعد ۶۴۸ھ میں چند مہینے تک فرمانروا ئے (بقیہ بر صفحہ دیگر)

جب حج کیا تھا تو وہ ایک نہایت خوشنما آراستہ ہودج میں بیٹھ کر گئی تھی اور پھر کئی سال تک سلطنت کی طرف سے اُس کے نام کا خالی محمل مصری قافلے کے ساتھ روانہ کیا جاتا رہا۔

اس کے بعد جو سلطان مصر ہوا وہ ہر سال قافلہ حجاج کے ساتھ ایک قسم کا ہودج جس کا نام آخر میں محمل پڑ گیا۔ شاہانہ جاہ وجلال کے اظہار کے لئے بھیجتا رہا۔ سلاطین مصر کی دیکھا دیکھی دوسرے ممالک کے بادشاہوں نے بھی یہی طریقہ اختیار کر لیا۔ چنانچہ ۹۶۰ھ میں یمن سے سب سے پہلا محمل آیا اور ۱۰۴۹ھ میں المویدباللہ بادشاہ امام یمن نے جس نے طریقہ زیدیہ اختیار کر لیا تھا۔ ایک محمل کے ساتھ حج کیا۔ اسی طرح بغداد و دمشق کے کاروانوں کے ساتھ بھی محمل رہا کیا ہے ۷۳۰ھ میں بغداد کا قافلہ ہاتھی پر محمل لایا تھا چونکہ محمل کو مناسک حج سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس لئے وہابی اس کو محض فضول اور نمایش سمجھتے ہیں بلکہ مذہب اسلام کے خلاف اور بدعت خیال کرتے ہیں اور اسی وجہ سے اُنھوں نے اپنے دور دورہ میں محمل والے قافلوں کو مکے میں داخل ہونے سے بھی روک دیا تھا اگرچہ اس میں اُن کی یہ بھی مصلحت تھی کہ وہابیانہ عقاید کے خلاف عقیدہ رکھنے والے مکے میں زیادہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) مصر بھی رہی تھی اس نے ۶۵۵ھ میں وفات پائی۔ اس کی قبر قاہرہ کے محلہ نحاسین میں ہے اور عام لوگ اسکو قبر سیدتنا فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا سمجھتے ہیں۔ رمضان ۱۳۴۱ھ میں جب بمبئی میرا جانا ہوا تھا اور وہاں شاہجہاں ہوٹل میں مقیم تھا تو یہاں پنجاب کے رہنے والے ایک صاحب مولوی فضل الٰہی بھی ٹھہرے ہوئے تھے یہ مصر میں ملازم تھے اور رخصت پر اپنے وطن جارہے تھے دوران گفتگو میں انھوں نے مجھ سے کہا کہ حضرت فاطمہ کی قبر قاہرہ میں ہے جب میں نے اُنکو اس قبر کی اصلیت بتائی تو انہوں نے تسلیم کیا۔ مجھے حیرت ہوئی کہ پڑھے لکھے آدمی بھی ایسی غلطی میں ہیں

جمع نہ ہونے پائیں۔ تاہم بظاہر ایک آڑ پیروی سنت اور اصلاح بدعت کی بھی تھی۔ اُن کا یہ بیان تھا کہ نہ آنحضرت نے ایسا محمل بنایا نہ خلفائے راشدین نے اور نہ بنی امیہ و بنی عباس کے زمانے میں کبھی محمل لایا گیا۔

برکھارٹ اپنی کتاب "بدوی و وہابی" میں لکھتا ہے کہ محمل کی رسم بدویوں کے علم جنگ سے نکلی ہے جسے مرکب یا عطف کہتے ہیں وہ بھی محمل سے مشابہ ہوتا ہے یعنے وہ لکڑی کا ایک بہت بڑا ڈھانچ ہوتا ہے جسے اونٹوں پر رکھدیتے ہیں۔

رائل سکس رجمنٹ کا کپتان لیچ میں جس نے ۱۹۱۰ء میں عراق عرب کا سفر کیا ہے قبیلۂ رولہ و قبیلۂ شمر کی لڑائی کا ذکر کرتے ہوئے اپنے ایک لکچر میں جو اُس نے رائل جیوگرفیکل سوسائٹی لندن میں دیا تھا کہتا ہے:۔

"سب سے آگے سوار تھے اُن کے عقب میں سانڈنی سوار اُن کے پیچھے چیدہ سواروں کی ایک جماعت تھی جس میں قبیلہ رولہ کا ایک محمل نظر آیا جو شتر مرغ کے پروں سے ڈھکا ہوا تھا۔ اس میں اُن کے شیخ کی ایک ناکتخدا لڑکی بیٹھی ہوئی میدان جنگ میں رزمیہ اشعار بڑے پُر درد لہجے سے سنا کر لڑنے والوں کے حوصلے بڑھا رہی تھی بدویوں کی لڑائی میں اکثر اس قسم کا محمل ساتھ رہا کرتا تھا مگر آجکل سوائے قبیلۂ رولہ کے اور کسی قبیلہ میں یہ رواج نہیں ہے"۔

اس زمانے میں محمل راستے میں قافلے کے مقدس علم کا کام دیتا ہے اور اس لحاظ سے بھی اس کو محمل شریف کہتے ہیں:۔

محمل کا جلوس مصر میں اور اُس کی مکے کو روانگی۔

اس محمل میں جس کی تشریح بقدر ضرورت اوپر کی گئی غلاف کعبہ رکھ کر مصر کے دار الخلافۂ قاہرہ سے نہایت تزک و احتشام کے ساتھ ایک خاص ترتیب و انتظام سے ہر سال مکۂ معظمہ

روانہ کیا جاتا ہے۔ اگلے زمانے میں جب مصر میں چرکسی[1] خاندان کی سلطنت تھی تو محمل زیادہ تزک و احتشام کے ساتھ نکلا کرتا تھا وہ سلاطین خود بھی بہترین لباس پہنے محمل کے ساتھ رہا کرتے تھے اور اپنے اسلحہ اور دوسرے پر تکلف سامان سے اپنی شان و شوکت ظاہر کیا کرتے تھے اور اس موقعہ پہ جاہ وحشم میں ایک دوسرے سے بڑھجانے کی کوشش کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں سعدیہ[2] فرقہ کے درویش محمل کے ساتھ زندہ سانپ کھاتے ہوئے نکلا کرتے تھے سنہ ۱۸۳۶ء کے جلوس محمل کی کیفیت ہم اڈورڈ لین کی کتاب ماڈرن ایجپشنز (موجودہ مصری) سے ترجمہ اقتباس کر کے درج ذیل کرتے ہیں:۔

[1] سلطان صلاح الدین فاتح بیت المقدس کے آخری جانشین ملک صالح ایوب نجم الدین نے سنہ ۶۳۷ھ میں نومسلم فرنگی غلاموں کا ایک رسالہ مرتب کیا تھا اس کی وفات کے بعد سنہ ۶۴۸ھ میں اس رسالہ کا افسر ملک معز عزالدین ایبک مصر کا سلطان ہو گیا اس کے بعد اس کا لڑکا تخت نشین ہوا اور اسی طرح ڈھائی سو برس سے زاید عرصہ تک مصر میں ان کی بادشاہت رہی۔ چونکہ یہ لوگ سرکیشیا یا چرکیسیا کے رہنے والے تھے اس لئے ان کو چرکسی کہتے ہیں۔ نیز فرنگی غلام ہونے کی وجہ سے یہ مملوک بھی کہلاتے ہیں سنہ ۹۲۳ھ میں ان سلاطین کا خاتمہ ہو گیا اور ملک مصر سلطان ترکی کے تصرف میں آگیا رہا ہے ملوکوں کا خاتمہ سنہ ۱۸۱۱ء میں محمد علی پاشا نے قتل عام کر کے کر دیا۔

[2] یہ درویش مصر میں موجود ہیں۔ اس فرقہ کے بانی کا نام مصر تھا۔ قاہرہ میں میلاد النبی و شب معراج کے موقعوں پہ یہ لوگ ذکر کرتے ہوئے غول بنا کر چلتے ہیں اور مختلف قسم کی کرامتیں دکھاتے ہیں۔ اب ان کے مرشد نے سانپ کھانا حرام قرار دیا ہے۔ ورنہ خاص خاص تقاریب میں یہ لوگ زندہ سانپ کا پھن کچا چبا جانے تھے۔ میلاد النبی کے جشن میں ان کے مرشد کی سواری گھوڑے پر نکلتی ہے یہ لوگ سڑک پہ اوندھے برابر برابر لیٹ جاتے ہیں اور مرشد گھوڑے پر سوار معہ دو خادموں کے جو لگام پکڑے رہتے ہیں ان کی پیٹھ پر سے گھوڑا گزر جاتا ہے وہ اٹھ کر آگے لیٹ جاتے ہیں اور اسطرح مرشد رستے بھر مریدوں پر سے گزرتا ہوا گزر جاتا ہے

"شوال کے آخری ہفتے میں[1] اگرچہ کوئی خاص تاریخ مقرر نہیں ہے لیکن عموماً ۲۳ ءتاریخ کو بڑے بڑے عہدہ دار اور حاجیوں کے قافلہ کے ساتھ جانے والی فوج قلعہ قاہرہ سے شہر میں ہو کر محمل کیساتھ ساتھ بڑی دھوم دھام سے گزرتی ہے اس جلوس کا نام "محمل کا جلوس" ہے۔ مختلف لوگ جو اسی جلوس کے ساتھ رہتے ہیں اُن میں سے اکثر مصری قافلے کے ہمراہ مکے جانے کے لئے قلعہ کے نیچے قرامیدان اور زمیلہ کے میدان میں جمع ہو جاتے ہیں اور وہاں مقررہ صف بندی اور ترتیب کے ساتھ قافلے میں اپنی اپنی جگہ اختیار کر لیتے ہیں۔ آپ اس جلوس کی کیفیت ملاحظہ ہو"۔

"جن جن سڑکوں پر ہو کر یہ جلوس نکلا وہ تماشائیوں سے بھر گئی تھیں۔ دکانیں سب بند تھیں بہت سے آدمی دکانوں کے چبوتروں پر بیٹھے تھے اور بہت سے نیچے کھڑے تھے۔ میں اُس خاص سڑک پر جہاں سے محمل باب النصر کو جانیوالا تھا ایک دکان پر اچھی جگہ حاصل کر لی۔

نو بجے صبح کے جلوس نکلنا شروع ہوا سب سے پہلے ایک توپ نکلی۔ راستے میں اسے داغ کر قافلہ کے کوچ و مقام کی اطلاع دیتے ہیں اس کے بعد ترکی بیقاعدہ فوج کے پانسو جوان نکلے۔ ان کی وردی بھی بہت ہی خراب تھی اور قیدی سے معلوم

---

[1] پیشتر جب پیدل کے راستہ سے محمل جاتا تھا تو شوال کے مہینے میں روانگی ہوتی تھی اب دریائی راہ سے جاتے ہیں جو اس کا راستہ ہے اس لئے ذیقعدہ میں محمل واپس ہوتا ہے۔

ہوتے تھے۔[۱] آدھ گھنٹے بعد چند سانڈنی سوار آئے۔ ہر اونٹ پر ایک ایک نقارہ کی جوڑی بندھی ہوئی تھی اور سوار اُسے بجا رہے تھے بعض اونٹوں پر اونچی اونچی گدیاں بھی بندھی تھیں مگر اُن پر کوئی بیٹھا نہ تھا۔ یہ اونٹ مہندی سے رنگے ہوئے تھے اور بعض کے زینوں پر کھجور کی ہری ہری شاخیں جھنڈیوں کی طرح لگا دی گئی تھیں۔ اسی طرح بعض پر چھوٹی چھوٹی جھنڈیاں بھی لگی ہوئی تھیں بعض اونٹوں کے دائیں بائیں بڑی بڑی گھنٹیاں لٹک رہی تھیں بعض پر مشکیزے بندھے تھے۔ ایک اونٹ پر جو کھوٹا صندوقچہ تھا جس پر سرخ غلاف چڑھا تھا اس میں حج کے اخراجات کے لئے سرکاری خزانہ رکھا تھا۔ اس کے بعد امیر الحاج کا سامان و اسباب خوراک وغیرہ اونٹوں پر آیا۔ تھوڑی دیر بعد کچھ درویش آئے جو اوپر اوپر اپنا سر ہلا کر اللہ! اللہ! پکار رہے تھے ان کے ساتھ بہت سے ساربان۔ بہشتی۔ خاکروب۔ اور دوسرے خدمتی نکلے جو عرفات یا اللہ!" "اللہ اللہ بالسلامہ" کے نعرے لگا رہے تھے یعنے اللہ ہم کو سلامتی کے ساتھ عرفات[۲] پہنچا دے۔ پھر چند اونٹ آئے جن پر کھجور کی

---

[۱] اب ترکی فوج کی ایسی حالت نہیں ہے اُن کی وردی و اسلحہ یورپین افواج سے کسیطرح کم نہیں۔

[۲] جبل عرفات مکہ معظمہ سے نو کوس ہے اس کی وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد آدم و حوا نے یہاں ایک دوسرے کو پہچانا تھا یہاں ایک بڑا میدان اور ایک پہاڑی ہے جسے جبل عرفات یا جبل رحمت کہتے ہیں۔ نویں ذیحجہ کو تمام حاجی یہاں جمع ہوتے ہیں پہاڑی پر ایک مسجد بنی ہوئی ہے جسے مسجد ابراہیمی کہتے ہیں یہاں امام منبر کے پاس کھڑا ہو کر خطبہ پڑھتا ہے جو ۲ بجے شروع ہو کر (بقیہ برصفحہ دیگر)

شناخیں تھیں اور بعض پر بڑی بڑی گھنٹیاں۔ ان کے پیچھے امیر الحاج کا تخت رواں[1] نکلا اس کے اونٹ خوب سجے ہوئے تھے پھر کچھ عرب اور دلیل الحاج یعنے رہنمائے قافلہ آئے اور کچھ اونٹ اور درویش نکلے ان کے بعد شاہی خاندان کے کوئی پچاس آدمی نہایت زرق برق لباس پہنے آئے ان کے پیچھے چند چوبدار چاندی کی موٹھ کی لکڑیاں اور بندوقیں لئے ہوئے نکلے پھر شاہی خاندان کے کچھ اور لوگ ان کے پیچھے مختلف دفتروں کے عہدہ دار کمخواب کے کوٹ پہنے آئے۔ ان کے بعد دو تلوار یئے نکلے یہ کمر تک برہنہ تھے ان کے پاس ڈھال تلوار تھی یہ جا بجا ٹھہرتے جاتے تھے اور صفائی کے ہاتھ نکال کر تماشائیوں سے انعام مانگتے تھے ان کے پیچھے ایک ٹکڑی درویشوں ساربانوں اور دوسرے لوگوں کی "اللہ اللہ اعرفات اللہ اللہ بالسلامہ" کہتی ہوئی نکلی تھوڑی دیر گزری تھی کہ ڈھول اور بانسریوں کی آواز سنائی دی اور فوج باقاعدہ کا ایک بڑا دستہ نکلا۔ ان کے پیچھے والی شہر یعنے ناظم کوتوالی آیا جسکی اردلی میں کئی افسر تھے پھر امیر الحاج کے ملازم اور ان کے بعد خود امیر الحاج آیا۔ پھر کاتب مغربی سواروں کا رسالہ اور تین مبلغ آئے یہ لوگ خطیب کو وہ عرفات کے بعض الفاظ خطبہ کو دہراتے ہیں۔ یہ

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) سر مغرب ختم ہوتا ہے وقوف عرفات حج کا سب سے بڑا رکن ہے زوال کے بعد سے مغرب تک قیام عرفات کے بعد ہر شخص حاجی کے لقب پکارا جانے لگتا ہے۔

[1] تخت رواں ایک پالکی نما سواری ہوتی ہے جو دو اونٹوں پر باندھ دی جاتی ہے ایک اونٹ آگے رہتا ہے ایک پیچھے سیڑھی لگا کر اسمیں سوار ہوتے ہیں۔ حجاز کے سفر کیلئے یہ سب سے زیادہ آرام دہ سواری ہے

سفید عبائیں پہنے ہوئے تھے جن پر طلائی کام تھا ان کے پیچھے
طریقہ سنت والجماعت کے چاروں فرقوں کے امام گھوڑوں پر سوار
آئے پھر مختلف طریقہ کے درویشوں کے کئی گروہ ہاتھوں میں جھنڈے
لئے ہوئے نکلے۔ قادریہ طریق کے درویش اپنے ہاتھوں میں جال
بھی لئے ہوئے تھے اور ان کے پاس لمبی لمبی کھجور کی شاخیں
گویا مچھلی پکڑنے کی چھڑیاں تھیں۔ ہر گروہ کے آگے آگے نقارے
اور دوسری قسم کے باجے بجتے جاتے تھے۔ ان کے بعد مختلف
پیشہ ور لوگ آئے۔ ہر طبقہ کا شیخ اُن کے ساتھ تھا۔ پھر کچھ اونٹ
اور نکلے اور پھر محمل آیا۔ اب چاروں طرف سے تماشائی محمل کیطرف
جھپٹے۔ آدمی پہ آدمی ٹوٹا پڑتا تھا۔ ہر شخص دھکا پیلی کر کے یہ چاہتا
تھا کہ محمل کو اپنے ہاتھوں سے چھو کر ہاتھوں کو چومے۔ بہت سی
عورتوں نے جو جھلملی دار کھڑکیوں میں بیٹھی تھیں محمل سے چھو جانے
کے لئے اپنی شالیں۔ برقعے۔ اور دوپٹے کھڑکیوں میں سے لٹکا دیئے
تھے۔ محمل کے پیچھے وہ نصف برہنہ شیخ جس کا ذکر جلوس کسوت کے
ضمن میں کیا جا چکا ہے ایک اونٹ پر بیٹھا سر ہلا رہا تھا۔"

محمل کے جلوس کی کیفیت جو اوپر بیان کی گئی وہ اب سے کوئی نو دس برس قبل کی ہے
مناسب یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ میں جس طریقہ سے محمل مصر سے روانہ
ہوتا ہے اُس کی بھی مختصر توضیح کر دی جائے چنانچہ ہم ماہ نومبر ۱۹۰۶ء کے بعض
انگریزی اخبارات و رسائل سے روانگی محمل کی کیفیت اقتباس کر کے درج
کرتے ہیں :۔

"۲۲ شوال ۱۳۱۵ھ روز دوشنبہ کو محمل کی روانگی ہوئی۔ چند روز پہلے سرکاری

طور پر اس کا اعلان کر دیا گیا تھا اور ضروری انتظامات کے لئے احکام
جاری کر دیے گئے تھے۔ تمام سرکاری دفاتر میں تعطیل تھی۔ معززین
عہدہ دار۔ اور علماء و روسا وغیرہ کو حاضری کے لئے ٹکٹ بھیجدیے
گئے تھے۔ صبح سے شہر کے تمام لوگ میدان محمد علی کے اطراف جہاں
سے محمل روانہ ہوتا ہے۔ جمع ہونے لگے۔ دعوتی اشخاص یونیفارم پہنے
اور تمغے لگائے ہوئے آنے لگے۔ ۱۰ بجے سے پہلے تقدس مآب
قاضی اکبر ہز ہائنس احمد مختار پاشا نز کی رزیڈنٹ آئے۔ دس بجے کے
بعد ہز ہائنس خدیو (عباس حلمی پاشا) فل ڈریس میں پورے جلوس کے
ساتھ چوکڑی میں رونق افروز ہوئے۔ آپ کے ساتھ بگھی میں وزیر
تعمیرات عامہ۔ وزیر مال اور وزیر خارجہ بھی موجود تھے۔ آپ کی رونق افروزی
پر توپیں سر ہوئیں اور بینڈ نے خدیوی گیت بجانا شروع کیا۔ گارڈ
آف آنز نے سلامی اتاری۔ پھر ہال میں تشریف لائے۔ آپ کے جانب
راست قاضی اکبر اور دوسرے علما و مشائخ کی نشست تھی اور بائیں جانب
احمد مختار پاشا اور دوسرے وزرا تھے۔ کچھ دیر کے بعد محمل کا جلوس نکلا
توپیں سر ہونے لگیں اور بینڈ بجنے لگا اونٹ جس پر محمل تھی غلاف
کعبہ تھا۔ محمد علی پاشا کے محل کے گرد س مرتبہ گشت کرنے کے بعد
ٹھہر گیا۔ گشت کرنے کی غرض یہ تھی کہ حاضرین اچھی طرح آپ کا
نظارہ کر لیں۔ خدیو محمل کے اونٹ کے پاس گئے اور اس کی مہار کو
بوسہ دیا پھر علمائے کبار و وزراء نے اُس کو بوسہ دیا پھر خدیو نے
اُس کو باقر پاشا کے حوالے کیا جو اس سال امیر الحاج مقرر ہوئے
تھے جب اونٹ آگے بڑھا تو اسسٹنٹ کمشنر پولیس نے روپیے

نچھاور کئے جو فقرا نے لوٹ لیئے۔ اس کے بعد مقام ابراہیم کا غلاف اور دوسری چیزیں آگے بڑھیں۔ پھر عبد اللہ فایق بک جن کے ذمہ غلاف کی تیاری کا کام ہے حریر کی زرین تھیلی جس میں خانہ کعبہ کی کنجیاں رکھی جاتی ہیں لیکر آئے۔ خدیو نے اس کو بھی بوسہ دیا۔ ایک بزرگ عالم نے فضائل حج کا خطبہ پڑھا اور سلامتی دولت کی دعا مانگی۔ ان تبرکات کی روانگی کے بعد ایک رسالہ کا بینڈ ایک رسالہ ایک توپخانہ اور چند پلٹنوں کا جلوس آگے بڑھا۔ خاتمہ پر خدیو یہ مراسم مذکورہ واپس ہوئے۔ اور اس کے بعد دوسرے لوگ رخصت ہوگئے"۔

شہر سے محمل اور امیر الحاج کا سامان وغیرہ روانہ ہونے کے بعد میدان حصوہ میں جو قاہرہ سے شمال کی جانب تھوڑے فاصلہ پر ہے دو تین دن تک ٹھہرا رہتا ہے تاکہ حج کو جانے والے یہاں آکر محمل کے ساتھ ہو جائیں پھر محمل برکتہ الحاج کو روانہ ہو جاتا ہے یہ مقام شہر سے گیارہ میل ہے۔ یہاں دو دن تک پڑاؤ رہتا ہے۔ یہ مقام تمام حاجیوں کے جمع ہو جانے کا ہے یہاں ایک برکہ یعنے حوض بنا ہوا ہے۔ یہاں سے قافلہ بالعموم ۲۷ شوال کو روانہ ہوتا ہے۔ سابق میں جب خشکی کی راہ سے محمل جاتا تھا تو مکے تک پہنچنے میں سینتیس دن لگتے تھے وہ راستہ نہایت پتھریلے چٹانوں اور ریگستانوں میں سے ہو کر گزرتا تھا راہ میں بہت ہی کم شاداب مقام ملتے تھے۔ رستے کی صعوبت کم کرنے کے لئے قافلہ بہت آہستہ آہستہ چلتا تھا اور خصوصاً علی الصباح سورج نکلنے سے دو گھنٹے قبل قافلہ روانہ ہو جایا کرتا تھا۔ اور سورج نکلنے کے ذرا دیر پڑاؤ ڈال دیتا تھا۔ قاہرہ سے مکے تک کل اکتیس منزلیں تھیں۔ جن کے نام سفرنامہ برکھارٹ سے نقل کئے جاتے ہیں:۔

قاہرہ سے مکہ معظمہ تک غلاف کعبہ کی منزلیں۔

قاہرہ سے تھوڑے فاصلہ پر باغوں کے متصل ایک مقام ہے جسے سوہ کہتے ہیں۔ وہاں حاجیوں کا قافلہ جمع ہوتا تھا۔ یہاں سے برکتہ الحاج کو جو چار گھنٹے کے راستے پر ہے روانہ ہوتا تھا۔ دو روز یہاں قیام رہتا تھا اور اطراف و جوانب کے تمام حاجی یہاں اکٹھے ہو جاتے تھے۔ قاہرہ سے یہ پہلی منزل تھی اور مکے تک کل (۴۱) منزلیں پڑتی تھیں (۳۷) روز کا سفر ہوتا تھا۔ (۳۱) رات چلتے تھے اور (۷) دن قیام ہوتا تھا۔ منزلوں کے نام باترتیب حسب ذیل ہیں۔ ان میں سے اکثر مقامات پر تھوڑی بہت آبادی ہے جہاں قافلے میں شریک ہونے یا محمل شریف یعنے غلاف کعبہ کی زیارت کے لئے آس پاس کے دیہاتی بھی جمع ہوجایا کرتے تھے۔

نشان سلسلہ	نام منزل	کیفیت
(۱)	برکتہ الحاج	یہاں ایک حوض ہے جو حاجیوں کی آسائش کیلئے بنایا گیا
(۲)	دار الحمرہ	ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔
(۳)	عجرود	یہاں کا پانی بہت ناقص ہے۔
(۴)	رؤس النواطیر	پہاڑی میدان ہے پانی نہیں ملتا تھا چند گھنٹے قافلہ ٹھہرتا تھا۔
(۵)	وادی تیہہ	پانی نہیں ملتا تھا چند گھنٹے قیام رہتا تھا۔
(۶)	قلعہ نخل	دن بھر قیام رہتا تھا۔ پانی لیکر روانگی ہوتی تھی۔
(۷)	العلیا	ایک گھنٹے قیام رہتا تھا۔ پانی ندارد۔
(۸)	سطح عقبہ	چند گھنٹے قیام ہوتا تھا۔
(۹)	عقبہ	ایک چھوٹا سا گاؤں ہے سڑک پہاڑ کے اوپر سے دشوار گزار تھی

نشان سلسلہ	نام منزل	کیفیت
(۱۰)	ظہیر الحمار	یہاں کی زمین پتھریلی تھی پانی خراب ملتا تھا۔ کھجور کے درخت بکثرت تھے۔
(۱۱)	شرفہ	معمولی پڑاؤ تھا۔
(۱۲)	مغایر شعیب	معمولی منزل تھی۔
(۱۳)	عیون القصب	پانی ملتا تھا۔
(۱۴)	الویلح	یہاں عمدہ چراگاہ تھی پانی اچھا تھا۔ ایک رات دن قافلہ ٹھہرتا تھا
(۱۵)	سلمی	معمولی منزل تھی۔
(۱۶)	قلعہ اظلم	چھوٹا سا قصبہ تھا۔
(۱۷)	اصطبل عنتر	یہاں ریگ میں گڑھے کر کے پانی حاصل کیا جاتا تھا۔
(۱۸)	قلعۃ الوجہہ	پانی عمدہ ملتا تھا رات کو پڑاؤ ہوتا تھا۔
(۱۹)	عکرہ	بڑی کڑی منزل تھی۔ بہت بدبودار پانی ملتا تھا صرف ایک گھنٹے قیام رہتا تھا۔
(۲۰)	حورا	پانی خراب ہے۔ درخت بکثرت ہیں۔ ببول کے درخت بھی بہت ہوتے ہیں۔
(۲۱)	نبط	معمولی منزل تھی۔
(۲۲)	خضیرہ	صرف ایک گھنٹے صبح کو قیام ہوتا تھا۔
(۲۳)	ینبوع النخل	مدینہ منورہ کے بندرگاہ کے علاوہ یہ دوسرا ینبوع ہے۔
(۲۴)	بدر	دو روز قیام رہتا تھا۔ یہ مقام بہت مشہور ہے۔ آنحضرت صلعم کے زمانے میں ۲ ہجری میں یہاں بڑی جنگ ہوئی تھی۔
(۲۵)	رابغ	ایک قصبہ ہے۔ کئی کنوے ہیں۔ پانی خراب ہے۔

نشان سلسلہ	نام منزل	کیفیت
(۲۶)	جرنیات	معمولی منزل ہے۔
(۲۷)	عقبۃ السکر	" "
(۲۸)	خلیص	یہاں بڑا بازار ہے۔ شہد و روغن لمباں اچھا ملتا ہے ایک روز قیام رہتا تھا۔
(۲۹)	عسفان	کنواں ہے۔ پانی ملتا ہے۔
(۳۰)	وادی فاطمہ	یہ بہت زرخیز وادی ہے۔ ترکاریاں خوب ہوتی ہیں یہاں کی مہندی مشہور ہے یہاں قافلہ ایک روز قیام کرتا تھا۔
(۳۱)	مکہ معظمہ	منزل مقصود۔

زمانہ حال میں غلاف کعبہ کا سفر

اس زمانے میں محمل غلاف کعبہ سوئز کی راہ سے بحر احمر کا جہازی سفر طے کرتے ہوئے رقصیر۔ شرم۔ ینبوع۔ رابغ اور جدّے سے ہوکر مکہ معظمہ داخل ہوتا ہے جس جہاز پہ یہ محمل چلتا ہے اسکو جھنڈیوں وغیرہ سے آراستہ کردیتے ہیں۔ رستے میں جس جس بندرگاہ سے محمل گزرتا ہے وہاں خاص طور پہ استقبال کیا جاتا ہے اور اس کی زیارت کے لئے لوگ آتے ہیں دوران سفر میں محمل کے اوپر کے کارچوبی پردے خراب ہوجانے کے خیال سے اُتار دیے جاتے ہیں محمل کے ہمراہ آجکل بہت ہی مختصر مصری فوج رہتی ہے اور کوئی (۵۰) خیمے پچاس ساٹھ گھوڑے (۲۰) خچر کچھ اونٹ اور دو توپیں اس کے ساتھ آتی ہیں جس وقت جدے پہنچتا ہے تو وہاں اس کی تعظیم میں توپیں چلتی ہیں۔ جدّے میں چند روز قیام کرنے کے بعد محمل مکہ معظمہ روانہ ہوجاتا ہے۔ فقط

باقی دارد۔

دستۂ گل

انتخاب غزلیات مشاعرہ منعقدہ ۱۱ جمادی الثانی ۱۳۴۲ھ

اختر۔ جناب سید حسن صاحب

دیکھے دل زحمت اندوہ وفا لیتے ہیں　　بیوفا دیکھ تو کیا دیتے ہیں کیا لیتے ہیں
ہر قدم شوخیٔ رفتار قیامت زا ہے　　آپ سوتے ہوئے فتنوں کو جگا لیتے ہیں
صرف مژگاں جو ہوئے جاتے ہیں دل کے ٹکڑے　　لذت کاوش پیکان جفا لیتے ہیں
دل کی قیمت ہے فقط ایک نگاہ جاں بخش　　وہ بھی کب حوصلہ مند ان وفا لیتے ہیں
پھر رُخ یار پہ زلفوں کو پریشاں کر دے　　ہم بلائیں تری اے موج ہوا لیتے ہیں
دیکھنا سادگی شوق کے انداز کہ ہم　　اُس جفا کیش سے پیمان وفا لیتے ہیں
اختر اس زندگیٔ شوق پہ سو جانیں فدا　　جان دینے ہی میں جینے کا مزا لیتے ہیں

جناب اصغر صاحب

اپنے بگڑے ہوئے یوں کام بنا لیتے ہیں　　وہ بگڑتے ہیں تو ہم رو کے منا لیتے ہیں
اُن کے جانے سے جو ہو جاتا ہے ویران گھر　　اُن کے ارمانوں کو ہم دل میں بسا لیتے ہیں
دامن صبر کو کیوں ہاتھ سے چھوڑیں اصغر　　جو مقدر کا ہے بیٹھے ہوئے پا لیتے ہیں

الم۔ جناب ڈاکٹر میر مہدی حسین صاحب

عجب انداز سے منہ اپنا چھپا لیتے ہیں　　اس جفا پر وہ مرے دل سے دعا لیتے ہیں

قعرِ غم میں مجھے گرتا ہوا تم دیکھتے ہو — ہے یہ دستور کہ گرتے کو بچا لیتے ہیں
ہے عجب لطف کسی شوخ پہ مر مٹنے میں — یوں تو مرنے کے لئے زہر بھی کھا لیتے ہیں
راہِ مقصد نہ ملی چھان چکے خاکِ جہاں — بس قدم ہم ترے اے راہنما لیتے ہیں
ایک تم ہو کہ نہیں قدرِ وفا کی تم کو — ایک ہم ہیں کہ جفا میں بھی مزا لیتے ہیں
شکر کا ہے یہ مقام اے المؔ خوش گفتار — اہلِ فن تیرے سخن میں بھی مزا لیتے ہیں

باغؔ ۔ جناب سید کاظم علی صاحب

دے کے دل مول محبت کی بلا لیتے ہیں — قدر فرمائیے کیا دیتے ہیں کیا لیتے ہیں
دیکھیں کیا دیتے ہیں وہ صانعِ مطلق کو جواب — جو ترے عشق میں ہستی کو مٹا لیتے ہیں
روٹھنے ہو تو ہمیں یہ بھی بتا دو تدبیر — روٹھنے والوں کو کس طرح منا لیتے ہیں
مدعا یہ ہے کہ اظہارِ تمنا نہ کروں — جب میں جاتا ہوں تو باتوں میں لگا لیتے ہیں
تجھ پہ جو مٹتے ہیں پاتے ہیں حیاتِ ابدی — موت کے ہاتھ سے وہ آبِ بقا لیتے ہیں
باغؔ نامہ کا مرے دیتے ہیں یوں مجھکو جواب — اپنا لکھا ہوا غیروں کو دکھا لیتے ہیں

تقیؔ ۔ ابوالمکارم میرزا محمد تقی صاحب

مہربانی سے ہمیں آپ بلا لیتے ہیں — اس عنایت کے ہیں قربان بلا لیتے ہیں
چشمِ مخمور کے مدہوش ہیں کیسے ہشیار — ہاتھ بہ ساغر و صہبا سے اٹھا لیتے ہیں
طور پر حضرتِ موسیٰ کو میسر نہ ہوا — لطفِ دیدار جو مشتاقِ فنا لیتے ہیں
کہہ چکے قاتلِ سفاک سے ہم ہیں جب سے — زندگانی کا مزا لطفِ فنا لیتے ہیں
سخنِ آصفِ سابع پہ سخندانی ہے — یہ سخن فہم ہیں اس فن کا مزا لیتے ہیں
ہے تقیؔ راہنما اپنے ادیب الدولہ — مشورہ شعر میں ہم سے ادبا لیتے ہیں

حیرت ۔ جناب سید شاہ حسن صاحب بدایونی

دل کو دکھ جان کو اک روگ لگا لیتے ہیں ۔ اپنے سر جو ترے گیسو کی بلا لیتے ہیں

غم ایام تری تیغ عدو کی دشنام ۔ وقت پر ہمکو جو ملجاتا ہے کھا لیتے ہیں

بادہ خوار ہی سے بھلا کیف کسے ہے منظور ۔ چار بوندوں سے لگی دل کی بجھا لیتے ہیں

تجھ کو اللہ یہ کسطرح گوارا ہے کہ بت ۔ اپنا بندہ ترے بندوں کو بنا لیتے ہیں

منتشر باد خزاں نے جو کئے ہیں گل و برگ ۔ ان ہی اوراق سے ہم درس فنا لیتے ہیں

نہ طلب میں مجھے کچھ عار نہ بخشش میں تمہیں ۔ شاہ دیتے ہیں گداؤں کو گدا لیتے ہیں

سر کو نقش قدم یار پہ رکھ کے حیرت ۔ اپنی تقدیر میں آئینے لگا لیتے ہیں

زیرک ۔ جناب سید علی احمد صاحب

گلے ہم چارہ گر عشق سے کیا لیتے ہیں ۔ چوٹ افتاد محبت کی دکھا لیتے ہیں

رازداری کی حقیقت سے جو ہیں بے بہرہ ۔ غیر کو محرم اسرار بنا لیتے ہیں

دیکھ سکتے نہیں ساغر کا چھلکنا میخوار ۔ بوند گرتی ہے تو آنکھوں سے اٹھا لیتے ہیں

اُن کے انداز ستم دیکھو دلیری دیکھو ۔ دل بھی لیتے ہیں تو ہو ہو کے خفا لیتے ہیں

ہم لڑاتے نہیں اُس بت سے بھری بزم میں آنکھ ۔ امتحان نگہ ہوشربا لیتے ہیں

روتی صورت نہیں احباب جو اپنی زیرک ۔ دو گھڑی بیٹھ کے ہنستے ہیں ہنسا لیتے ہیں

ضامن کنتوری

جب کبھی زخم جگر اُن کو دکھا لیتے ہیں ۔ نمک شور تبسم کا مزا لیتے ہیں

حق یہ ہے انہیں بھی ہے ترا کرم شامل حال ۔ ناتواں بار مصیبت جو اٹھا لیتے ہیں

نحوست مے و نخوت کہ سر افراز ازل
جھک کے چلتے ہیں غریبوں کی دعا لیتے ہیں
نالہ کیسا؟ ہے رگ جاں میں بھرا نغمۂ شوق
دم الجھتا ہے تو یہ ساز بجا لیتے ہیں
دینے والا تو بہت دیگا مگر ظرف بھی ہو
لوگ کیا جان کے ہمت سے سوا لیتے ہیں
وہ سلامت رہیں ہستی مری مٹتی ہے مٹے
روز نقش ایسے ہزاروں ہی بنا لیتے ہیں
جان کر خوگر آزار وہ کرتے ہیں جفا
ضامن اس پردے میں ہم داد وفا لیتے ہیں

حضرت عدیل کنتوری

سائلوں سے کہیں یوں آنکھ چرا لیتے ہیں
اے شہ حسن فقیروں کی دعا لیتے ہیں
جو کرم پر ترے خرسند ہیں اب رب کریم
سوکھی روٹی میں وہ نعمت کا مزا لیتے ہیں
ذائقہ لذت فانی کا بدل دیں اے خضر
کلیاں کرنیکو ہم آب بقا لیتے ہیں
اشک خوں چشم تمنا سے بہانے والے
دل بیرحم پہ رنگ اپنا جما لیتے ہیں
چشم مقتول میں ہے خنجر بیداد کا عکس
رخم دل دامن قاتل کی ہوا لیتے ہیں
معرفت بڑھتی ہے آئینہ کی حیرانی سے
خشک چشمہ سے بھی ہم آب بقا لیتے ہیں
عہد پیری ہے رہے قبر کی بھی فکر عدیل
پہنچے منزل پہ مسافر تو سرا لیتے ہیں

یٰسین جناب غلام یٰسین خاں صاحب

قیمت حسن حسیں حد سے سوا لیتے ہیں
دل جدا لیتے ہیں یہ جان جدا لیتے ہیں
جادۂ عشق میں ہوتے ہیں فنا کب عاشق
درحقیقت وہ رہ دار بقا لیتے ہیں
سالکان رہ الفت کے طریقے ہیں کچھ اور
راستے دونوں جہاں سے یہ جدا لیتے ہیں
لطف ساقی سے بندھا رہتا ہے دور صہبا
دبتے جاتے ہیں تہی جام بھرا لیتے ہیں
سر کو ٹکرا کے در یار سے ہم اے یٰسیں
اپنی بگڑی ہو تقدیر بنا لیتے ہیں

نگہ رازیں ورق روشن سواد جلوہ خوانی کن

لسان الملک

جلد ۲   ماہ مارچ و اپریل سنہ ۱۹۲۴ عیسوی   نمبر ۳ و ۴

صدائے مست

رشحات کلک حضرت شاد صوفی مدظلہ

در دل بے اختیار عشق تو کردہ قرار

جاں زغمت سوگوار   درد تو شد سازگار   دل چو برآرد شرار   سینہ شود داغدار   رحم بکن اے نگار

در دل بے اختیار عشق تو کردہ قرار

(۲)

عشق تو تا دل گزید جاں زغم او تپید

چوں تو بتے کس ندید   عشق ترا آفرید   شیخ حرم شد مرید   برہمن آسا دوید   ہوش و حواسش رمید

عشق تو تا دل گزید جاں زغم او تپید

(۳)

عاشق شیدائے تست مست می و در خروش

خمکدہ آمد بجوش   لطف کند میفروش   کرد اشارت بنوش   بادہ ربودست ہوش   گفت سروشم بگوش

عاشق شیدائے تست مست می و در خروش

(۴)

شیوۂ زاہد گزار جلوۂ دلدار بیں

پیش تو آں نازنیں ہست چو نازآفریں پس گل حسنش بچیں بوسہ بزن برجبیں جز رخ زیبا مبیں

شیوۂ زاہد گزار جلوۂ دلدار بیں

(۵)

چشم نظارا کشا صنعت قدرت نگر

ہست صنم جلوہ گر کن بجمالش نظر در برت آید اگر بوسۂ از لعل تر گیر چو شہد و شکر

چشم نظارا کشا صنعت قدرت نگر

(۶)

چشم کشا و ببیں چیست دریں کائنات

ہجر بود چوں ممات وصل نگارم حیات جلوۂ اسم وصفات ہست ز انوار ذات دہر ندارد ثبات

چشم کشا و ببیں چیست دریں کائنات

رُباعیات

از جناب مولنٰنا سید محمد عسکری صاحب عدیلؔ کنتوری

طوفان الم صبح و مسا رہتا ہے
دل رنج و مصیبت سے بھرا رہتا ہے
کیا ہوگا نہیں خوف قیامت کا عدیلؔ
یاں روز نیا حشر بپا رہتا ہے

ولہٗ

ہنگام سحر ہے کچھ شب تار نہیں
اچھی ہو بظاہر کوئی آزار نہیں
رکھتے ہو سنبھل سنبھل کے کیوں پاؤں عدیلؔ
اب یاد جوانی کی وہ رفتار نہیں

ولہٗ

گذری وہ بہار اور وہ معمول گئے
یک لخت جوانی کی روش بھول گئے
چلنے میں بڑھاپے کے ہیں آثار عدیلؔ
اسطرح تھکے کہ پاؤں بھی پھول گئے

ارتقائے حُریت

گزشتہ سے پیوستہ

یونانیوں کا دورِ حریت ختم ہونے کے بعد اُن کی جگہ رومیوں نے لی۔ اور روم نے بھی تاریخ حریت میں کچھ کم حصہ نہیں لیا. لیکن یہ دور ملکی اور مذہبی آزادی کے لئے جتنا موافق تھا اور حریت کے ان شعبوں میں جتنی ترقی اس دور میں ہوئی، اتنی سیاسی، قومی اور دماغی آزادی میں نہیں ہوئی. رُومی قانون نے جو اسوقت تقریباً اکثر ممالک متمدنہ کے قوانین کا سنگ بنیاد ہے رعایا کے حقوق مساوات کو اس طرح وسیع کیا کہ ہر شہری بلا امتیاز شہریت کی ایک سطح پر آگیا بقول لاک کے رومی قانون نے ہر شہری کے لئے ایک اصول زندگی معین کر دیا اور صرف یہی نہیں کیا کہ کوئی شخص دوسروں کے ساتھ کوئی ناکردنی امر نہ کرے بلکہ یہ بھی طے کر دیا کہ دوسرا بھی خواہ کسی درجے اور حیثیت کا ہو اس کے ساتھ کوئی ویسا ہی فعل نہ کرنے پائے۔

مذہبی معاملات میں بھی رومیوں نے بہت رواداری سے کام لیا، اور کبھی ہمسایہ اقوام سے اپنے قومی معبودوں کی پرستش کے آرزومند نہوئے، بلکہ یونانیوں اور دوسرے مشرقی اقوام کے دیوتاؤں کو بھی اپنے دائرۂ پرستش میں داخل کر لیا، رومیوں کی ایسی مذہبی رواداری کا نتیجہ تھا کہ جب حدود رومہ میں جدید مذہب عیسوی نے قدم رکھا تو نہایت سرعت کے ساتھ وہاں کے باشندے اس کے حلقۂ عقیدت میں داخل ہونے لگے اور بانی مذہب کی وفات سے تین صدی کے اندر اندر عیسویت رومہ کا سرکاری مذہب قرار پاگئی۔

رومہ کی سیاسی حُریت کی تاریخ اول اول انہیں صفحات پر لکھی جانے لگی جن پر یونان کی تاریخ حریت ثبت ہو کر محو ہو چکی تھی. یونانی ریاستوں خصوصاً ایتھنز کی طرح یہاں بھی شہری حکومتوں کی بنیاد پڑی، اور جمہوریت کی صورتیں نمودار ہوئیں حکمران ہیئت بادشاہ مجلس اعیان اور جماعت عوام سے متشکل ہوئی اور شاہی اقتدار سلب ہو کر بادشاہی کا لقب محض اقتدارات مذہبی کا حامل رہگیا ایک زمانہ تو امرا، پیشوایان مذہب اور عوام کی باہمی کشاکش میں گزرا. لیکن اجتماعی قوت کے مقابلے میں شخصی دھینگامشتی کیا کام آسکتی تھی آخر کار فتح عوام ہی کو ہوئی اور انھیں کا اقتدار حکومت میں قایم ہوا. سنہ ۳۹۰ ق م میں قوم کیلٹ کے حملوں سے رُومیوں کو بھی وہی

منقسم کر دیا، اور پھر اُس کے انتقال (۸۱۴ء) کے بعد اُس کے جانشین اگلی قوت وجبروت کو کھو بیٹھے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ پیشوایان مذہب بازی لے گئے۔ ان کے اقتدار و قوت سے شاہنشاہی قوت و اقتدار دبنے اور کلیسا کا قدم سلطنت سے آگے بڑھنے لگا۔ اس تعلیم نے کہ خدا کے دربار میں شاہ و گدا کے حقوق ایک ہیں، مساوات حقوق انسان کا فطری اور پیدائشی حق ہے، اور قانون آدمیوں کے لئے بنایا گیا ہے نہ آدمی قانون کے لئے، عوام میں ایک نئی روح پھونک دی، خلق اللہ کی آنکھوں کے سامنے نئی صبح نمودار ہوئی آفتاب آزادی کی شعاعیں نور پاشی کرنے لگیں، خیالات کھلے ہوئے اعلیٰ فضاؤں میں مایل پرواز ہوئے اور لوگوں میں انتظامی عنصر کے اعمال و افعال پر نکتہ چینی کی جرأت اور خود داری کا مادہ روز بروز بڑھنے لگا، مشرق و مغرب نقل پائے تخت کی وجہ سے الگ تو ہو ہی چکے تھے، ہمسایہ غیر عیسوی اقوام نے بھی خدائی سلطنت (روما) کے حدود میں دست درازی شروع کر دی، اور اپنی گلو خلاصی کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگے۔ ڈنمارک۔ نارویے ہنگری۔ فرانس۔ برطانیہ۔ جرمنی وغیرہ ممالک کو یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اغیار کی سیادت و اقتدار کا جوا اتار کے آزادی کی ہوا کھائیں، سب سے پہلے سلطنت رومۃ الکبریٰ کی عظیم الجثہ ہیکل سے برطانوی عضو کا انقطاع ہوا (۱۱۴۶ء) اس کے بعد تو گلی گلی امپرر (شاہنشاہ) نظر آنے لگے اور یہ لقب جو قیاصرۂ روم کے لئے آسمان سے اترا تھا عام ہو گیا اور خود سلطنت روما کا جو حشر اس کشمکش میں ہوا اس کے لئے ناظرین کو تاریخ کی جانب رجوع کرنا چاہیئے۔ قصہ مختصر یہ کہ آزادی کی جدوجہد نے شاہنشاہیت و امرئیت کو نئی شکل وصورت میں ظاہر کیا۔

اگرچہ روما کا اقتدار و عظمت زوال کی منحوس صورت دیکھ چکے تھے اور فرانسیسی سیکسنی اور دوسری جرمنی قومیں قدیم حدود میں اپنے قدم جما چکی تھی تاہم رومۃ الکبریٰ کے عالمگیر آسمانی سلطنت ہونیکا عقیدہ دلوں سے ابتک بالکل محو نہیں ہوا تھا اسی کا اثر تھا کہ مغربی فرنگی جرمن بادشاہ شارلمین اور مشرقی فرنگی جرمن بادشاہ آٹو نے اس کی آرزو کی کہ وہ بھی قیاصرۂ رومہ کی سی مذہبی عظمت حاصل کریں۔ چارلس اعظم کو پاپائے روم نے ۸۰۰ء میں اپنے پاک ہاتھوں سے تاج پہنایا اور آٹو کو ۹۶۲ء میں جیسا کہ تاریخ سے ظاہر ہے مقدس سلطنت رُومہ کی پرچھائیاں انیسویں صدی کے اوائل تک یورپ کی فضا میں نظر آتی رہیں اور بسمارک کے زمانہ تک اسٹریا کا شاہی خاندان قیصری حقوق تقدس آبی کا دعویدار رہا۔ امپرر (قائد اعظم) کا لقب چونکہ آسمانی اور منجانب اللہ متصور ہوتا تھا اس لئے سلطنت کی ہیئت کذائی اسطرح متشکل ہوئی

کہ خدائے جل وعلا کے تحت امپرر تمام خلقت کا سرتاج اور راعی سمجھا جاتا تھا، امپرر کے تحت سلاطین یا بادشاہ، اور بادشاہوں کے تحت مختلف درجوں کے امرا، امرا کے تحت زمیندار اور زمینداروں کے تحت عام رعایا اور کاشت کار۔ غرضکہ اس طور پر نظام تمدن کے سلسلے کی کڑیاں ایک دوسرے سے پیوستہ ہوتی تھیں۔ یہی دور یورپ کا دور امرائیت یا فیوڈلزم تھا۔ لیکن چونکہ اس طرح کی عدم مساوات انسانی یقیناً جبری اور غیر فطری تھی اس لئے راعی و رعایا کے تعلقات کی ناخوشگواری اسکا لازمی نتیجہ تھا۔ اس ناخوشگواری کو دور کرنے اور جبر و استبداد کے پنجہ سے رہائی حاصل کرنے کے لئے یورپ نے جیسی جیسی قربانیاں آزادی کی قربان گاہ پر چڑہائیں وہ آسیکا حق تھا۔ اس باب میں بالخصوص انگلستان سب سے زیادہ مستحق تعریف ہے جس کا قدم آزادی کی جولانگاہ میں سب سے آگے نظر آتا ہے۔ (باقی دارد) ضامن کنتوری۔

غزل

از جناب مولوی حسین یاور خاں صاحب خسرو

بے وفا بھی ہے دل آزار بھی ہے — مہرباں بھی ہے طرحدار بھی ہے
بل جبیں پہ ہے تبسم لب پر — مجھ سے انکار بھی اقرار بھی ہے
اُن کے تیور یہ کہے دیتے ہیں — پاس خنجر بھی ہے تلوار بھی ہے
پوچھ لو خوش ہے نہ پوچھو غمگیں — دل تو اچھا بھی ہے بیمار بھی ہے
میں نے مانا کہ مسیحا تُم ہو — کچھ دوائے دل بیمار بھی ہے
کیا کہوں دل کی حقیقت کیا ہے — پارسا بھی ہے گنہگار بھی ہے
تو یہ پھر توڑ دے میری ساقی — ابر رحمت بھی ہے گلزار بھی ہے
آپ کے ساتھ محبت کس کو — ذکر اس کا مرے سرکار بھی ہے
کس کے گھر سے وہ چلے آتے ہیں — لڑکھڑائی ہوئی رفتار بھی ہے

چشم ساقی ہے نرالی خسرو
مست بھی رہتی ہے ہشیار بھی ہے

بادل

(نتیجہ فکر شیلی شاعر انگلستان)

از جناب مولوی سید تفضل حسین صاحب ناشر

میں تشنہ لب پھولوں کے لئے دریاؤں اور جھیلوں سے پانی بھر کر لاتا ہوں اور جب اُنکی پنکھڑیاں دوپہر کی تیز دھوپ سے کملا جاتی ہیں تو اُن پر اپنے دامن کا ہلکا سا سائبان تان دیتا ہوں میرے پروں سے اس کی ننھی ننھی بوندیاں ٹپکتی ہیں تو نازک کلیوں کی آنکھ کھل جاتی ہے، جبکہ وہ اپنی مادر مہربان کے آغوش میں محو خواب ہوتی ہیں اور وہ اُن کو گود میں لئے سورج کے گرد پھرتی ہے۔ میں اپنے گوپن کو گھماتا ہوں اور ساتھ ہی نیچے کے سبز سبز میدانوں پہ اولوں کا سفید فرش ہو جاتا ہے وہ دیکھتے دیکھتے پانی بنکر بہ جاتے ہیں اور میں قہقہے مارتا ہوا اپنی راہ لیتا ہوں۔

میں کوہستانوں پر جابجا برف کی روئی دھنکتا پھرتا ہوں، شمشاد و صنوبر ہاں ہاں کرتے رہجاتے ہیں۔ رات بھر میں اپنے سفید ملایم تکیے کو سر کے نیچے دھرے ہوا کے تخت رواں پر خراٹے بھرتا رہتا ہوں۔ میرے رفیع الشان آسمانی برجوں پہ میرا بدرقہ صاعقہ پہرہ دیتا ہے نیچے ایک کھوہ میں رعد باندھا جکڑا پڑا رہتا ہے، جو کبھی کبھی ہڑبڑا کر ہاتھ پاؤں مارنے اور گڑگڑانے لگتا ہے خشکی ہو یا تری یہ بدرقہ میانہ روی سے ہر جگہ میری رہبری کرتا ہے اور میں اُن کارکنان قدرت کی کشش میں جو اس زنگاری سمندر کی گہرائیوں کے اندر شناوری کرتے رہتے ہیں، کہیں سے کہیں نکل جاتا ہوں۔ چشموں پر، چٹانوں پر، جھیلوں پر، میدانوں پر، غرض جہاں کہیں بھی اس کے قدم پہنچتے ہیں وہ اس روح الارواح کو موجود پاتا ہے، جسکا وہ وابستہ الفت ہے۔ ادھر میں نیلگوں صحن فضا میں پڑا دھوپ کھاتا ہوں اور اُدھر وہ لال جھنڈی دکھا کر زمین پہ مینہ کا تار باندھ دیتا ہے۔

جس طرح ایک عقاب اپنے سنہرے بازوؤں کا پر تو ڈالتا ہوا کسی چٹان کی سل پر دم بھر کے لئے آ بیٹھتا ہے اور وہ لرزنے اور ڈگمگانے لگتی ہے، یونہیں طلوع آفتاب شہابی آنکھیں کھولے اور اپنے شعلہ گوں پر پھیلائے میرے رواں دواں بجرے کی گود میں آ اترتا ہے۔

اور ستارۂ سحری جھلملا کر رہ جاتا ہے اور جب غروب آفتاب زریں سمندر کے گوشے سے محبت و استراحت کے پیام بھیجتا ہے اور آسمان زمین کو شفق کا قرمزی خلعت پہنا دیتا ہے، تو میں بازو سمیٹ کر اپنے ہوائی نشیمن پر یوں چپ چاپ بسیرا لیتا ہوں گویا قمری انڈوں پر بیٹھی ہوئی ہے۔

گول چہرہ دوشیزۂ فلک جس کو فانی انسان چاند کے نام سے پکارتے ہیں، نور کا سفید براق نقاب منھ پر ڈالے میرے پوستین جیسے نرم فرش پر جس میں آدھی رات کی ہوائیں اپنی آنکھ مچولیوں سے جا بجا شکنیں ڈال دیتی ہیں، عجب ناز سے محو خرام ہوتی ہے اور جہاں کہیں اس کے نادیدہ پاؤں الجھنے سے جس کی چاپ صرف فرشتے ہی سن سکتے ہیں میرے مہین تنبیرے میں شگاف پڑ جاتا ہے تو تارے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس میں سے جھانکنے اور گھورنے لگتے ہیں۔ میں ان کو چک پھیریاں لگاتے اور سنہری تتلیوں کی طرح ایک دوسرے کا تیزی سے پیچھا کرتے ہوئے دیکھ کر خوشی سے جامہ میں پھولا نہیں سماتا۔ میں اپنے حباب آسا خیمے کے اس چاک کو پھر اور کشادہ کر دیتا ہوں، یہاں تک کہ دریاؤں اور جھیلوں اور سمندروں کے آئینے چاند اور تاروں کی چھوٹ سے جگمگ جگمگ کرنے لگتے ہیں۔

کبھی میں تخت گاہِ آفتاب کے گرد ایک آتشیں حلقہ کھینچتا ہوں تو کبھی چاند کی کمر میں موتیوں کا جڑاؤ پٹہ باندھ دیتا ہوں۔ جب میرا ابیت ظفر پیکر کھلتا ہے تو مہر کانپ اٹھتا ہے بگولے چکر کھانے لگتے ہیں اور جوالا مکھی کا رنگ فق ہو جاتا ہے۔ میں بحر ذخار کے اوپر ساحل کے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ تک پل کی طرح چھا جاتا ہوں۔ آفتاب کی کرنیں تیروں کی طرح میرے سینے پر برستی ہیں اور ٹھنڈی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ کہیں پہاڑوں کی چوٹیاں سنون تو ان پر رنگ برنگی قوس قزح عالیشان محراب بن جاتی ہے، جس میں سے طوفان اور برق اور رعد کو رکاب میں لئے اور آندھی زلزلے کو زنجیروں میں جکڑے فاتحانہ شان سے نکل جاتا ہوں۔

میں زمین کا لخت جگر اور آسمان کا نور نظر ہوں۔ میں سمندر اور ساحلوں کے مسامات میں نفوذ کر کے نکلا ہوں سے غائب ہو جاتا ہوں مگر مرتا نہیں، کیونکہ بارش کے بعد جب آسمان کا دامن دھل دھل کر صاف ہو جاتا ہے اور تام کو بھی کوئی دھبہ دکھائی

نہیں دنیا اور ہوا کی لہریں اور سورج کی شعاعیں میری یادگار ہیں اپنی مسند پر ضیاء سے دنیا پر ایک قبۂ سبز تیار کر لیتی ہیں تو میں دل ہی دل میں اپنے اس فرضی مقبرے کو دیکھ کر ہنستا ہوں۔ اور جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے یا روح کالبد سے ایکبارگی نکل پڑتی ہے اسی طرح میں بھی نیساں کی کمیں گاہوں سے برآمد ہو کر اس طلسمی گنبد کو آناً فاناً میں خود پامال کر دیتا ہوں ؛

حوصلے دل کے

از جناب مولوی امیر حسن صاحب حسن لکھنوی

ناز دیکھے جو تیغ قاتل کے
حوصلے اور بڑھ گئے دل کے

ساربان آہ گرم مجنوں سے
جلے جاتے ہیں پردے محمل کے

ناخن تیغ تیز قاتل سے
زخم ناسور ہو گئے چھل کے

سخت جانی کو دیکھ کر میری
اڑ گئے ہوش تیغ قاتل کے

جب سے دیکھا ہے زلف جاناں کو
پاؤں مشتاق ہیں سلاسل کے

میں یہ سمجھا بھرے جو زخم جگر
پھول پژمردہ ہو گئے کھل کے

پھر گئے آتے آتے وہ شب وصل
دل میں ارمان رہ گئے دل کے

آئینہ دیکھکر وہ کہتے ہیں
اک نہیں ہو مرے مقابل کے

گلے لپٹا کے وہ لگے کہنے
آج ارماں نکال لو دل کے

ساربان روک لے ذرا ناقہ
دیکھ پیچھے ہے کون محمل کے

کٹ گئی چھیڑ چھاڑ میں شب وصل
کچھ بھی نکلے نہ حوصلے دل کے

دیکھ کر اُن کو وقت نزع حسن
حسرتیں رہ گئیں مجھ سے مل مل کے

یادِ رفتگان

یاد آیا مے کہ جاں مشتاق و دل مدہوش بود
ہر مژہ وا کرد نی تہیہ صد آغوش بود

اللہ اللہ! کیا دن تھے، کیا زمانہ تھا، کیا لوگ تھے، کیا صحبتیں تھیں۔ ؎

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں۔

آہ! اب کس کو روئیں، کس کس کا خیال کریں، کس کس کی یاد کو دل میں جگہ دیں، اور کس کس کو بھلائیں! زمانہ تو اتنی مہلت بھی نہیں دیتا کہ اپنے ہی آج کے واقعات کل تک یاد رکھیں یا کل کے معاملات پر آج غور کریں ؎

زیں مزرعہ نے برگ و نہ بر می درودم		خود را از پائے تا بہ سر می درودم
از کاشتن آگاہ نیم لیک چو شمع		یک خوشہ ز شام تا سحر می درودم

بہر حال اتنا تو معلوم ہے کہ دنیا گزراں ہے، یہاں سے اچھے بھی آ کر گزر جاتے ہیں اور برے بھی ؎ نیست در گلشن اسباب جہاں رنگ ثبات ؛ ہمہ از دیدۂ ما ہمچو نظر می گذرد۔ لیکن یہ چلتی پھرتی تصویریں جب لوحِ خاطر پر گہرا نقش ڈال جاتی ہیں تو وہ ذرا مشکل ہی سے مٹتا ہے ؎ ز نہاں گشتن شخص آئینہ می بارد رنگ ؛ بحر گر خشک شود آب گہر میگردد۔ تا آنکہ نقش پر نقش بیٹھے اور غبار پر غبار جما، جس سے چشمِ تصور دوسری جانب متوجہ ہو گئی اور دامنِ دل دوسرے گلشنوں کی گلچینی کی ہوس میں دراز رہا، مگر اتنا تو اب بھی ہے کہ ؎

ز خواب ناز ہستی غافلم لیک اینقدر دانم		کہ ہر کس می برد نام تو من بیدار میگردم

تکلف برطرف اور طولِ کلام مختصر، آج پرانے کاغذات کی الٹ پلٹ میں ایک پرچہ ہاتھ آیا۔ یہ دو سطروں کی تحریر ہے۔ یہ ایک مختصر رقعہ ہے مولانا ابو القاسم فضل رب مرحوم عرشی تاجپوری کا حضرت قبلہ گاہی صبیب کنتوری اعلی اللہ مقامہ کے نام۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ حضرات جن کو ان دونوں جنت مقام بزرگوں سے کوئی شخصی یا روحی تعلق کبھی نہ تھا اور نہ اب ہے، اس کی نسبت کیا خیال فرمائیں گے۔ لیکن اس دولت غیر مترقبہ اور اس گوہر در خلاب افتادہ کے دستیاب ہونے سے میرے جذبات [illegible]

جو ہیجان پیدا ہوا اُس کا احصا الفاظ میں ناممکن ہے؛ بالجملہ ؎

دمساز حسرتیم کہ از دل نشاں دہد
از نالہ بلبل رہگزار خودیم ما

میری نگاہیں تو اس نامہ مودت شمامہ کو اُسی نظر سے دیکھتی ہیں جس نظر سے میری نگاہوں کو دیکھنا چاہیے! میرا باپ تو میرا باپ ہی تھا لیکن اس کا عزیز دوست بھی جو کچھ میرے دل میں رکھتا تھا اُسے میں ہی خوب جانتا ہوں!

عرشی۔ وہ عرشی جو ہندوستان کے فارسی شعرا کی فہرست کا مقطع، اور آفتاب شرف و کمال کا مطلع تھا۔ آج ہم اسکی یادگار ڈھونڈھتے ہیں اور نہیں پاتے۔ آج ہم اُس کی نشانیاں تلاش کرتے ہیں مگر کہیں نظر نہیں آتیں! آہ! وہ عرشی جو جہان سخن میں کوس لمن الملکی بجاتا تھا آج تہ خاک ہے؛ اور اُس کے پسماندوں، اُس کے تلامذہ، اُس کے احباب میں خدا جانے کوئی ایسا بھی ہے یا نہیں جو اُس کی یاد کو زندہ کرے۔ کہنے والے نے سچ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے:۔

چشم بر وضع جہاں وا کردہ ہشیار باش
کایں ہمہ ہنگامۂ عشرت بہ غم خواہد کشید

حسن رنگیں خواہ اگر نندل ز نیرنگی نقاب
ندامت رعنا بہ بینی ہا علم خواہد کشید

میرسد آخر صف برگشتۂ مژگاں بخاک
واں درازیہای گیسو تا قدم خواہد کشید

ابروی پُر خم کہ ناخن بر جگرہا می زند
عاقبت با ناخن پا سر بہم خواہد کشید

بر نقوش اعتبار آنے کہ دارد ناز من
مرگ از یک جنبش مژگاں قلم خواہد کشید

چشم وا کردی زمانے گوش می باید شدن
شوخی ایں جلوہ تا افسانہ ہم خواہد کشید

حیرت شبنم دریں گلزار دارد چشمکے
کایں ہمہ الفت نگاہی ہم بہ رم خواہد کشید

عبرت آباد ست اینجا عاقبت وارستگی است
ہر کہ دل با این و آں بندد الم خواہد کشید

میں اس تحریر کو زیادہ طول دینا نہیں چاہتا۔ میرا مقصد صرف اسی قدر ہے کہ دو صاحبان کمال کے تعلقات یکجہتی کی جو یادگار حسن اتفاق سے ہمدست ہوئی ہے اُس کو اہل ذوق کی نظر فریبی کے لئے اُن اوراق کے صفحۂ عارض کا گلگونہ بناؤں اور بس ؎

دلدار رفت و بیخودیم در کنار ماند
تمثال جست و آئینہ حیرت شکار ماند

زاں دامنے کہ برمن بیدست و پا فشاند
در عرصۂ خیال رمے از غبار ماند

وہوہذا

ما بی بودا و سیر یالث اشے دجر بردا بیت مں لسکم

مام احرام دیدار آن حرنسید احشام برمیندم وبندازیاپ ریگ آمدہ

سرسید لیرم وبابار دیرینہ بر مجوزم السلام والاکرام عدیٔے سہام –

(اڈیٹر)

غزل

از جناب مولوی عبداللہ خاں صاحب کامل

هفت اقلیم پئے سیر تہ پا دارم ۔ دامن دیدۂ خود پُر ز تماشا دارم

غم آمرزش عصیاں مخور و ساکت باش ۔ نفس خویش ز الواث مُبرّا دارم

پردہ از عارض پُر نور خدا را بردار ۔ بقدم بوسی تو بسکہ تمنّا دارم

آہ سرد و دل پُر درد و رُخ زرد مدام ۔ بعنت جملہ علامات مہیّا دارم

زلف گلدام نہاد است پئے صید دلم ۔ ایہم از چشم فسوں ساز تو ایما دارم

از من زار چہ پرسی تو حدیث مجنوں ۔ یاد از دفتر عشاق قصصہا دارم

مثل نسیاں قلم چوں گہر افشاں نشود ۔ دستبند ہم از عقد ثریا دارم

کاملا بہر ریا داری ابنائے جہاں
دلق و عمامہ و تسبیح و مُصلّا دارم

محبّت

از جناب مولوی سید معجز حسین صاحب لکھنوی

ساون کی موسلادھار بارش کے زمانہ میں جبکہ سبزہ زاروں کی قدرتی رونق اور دلچسپیوں میں دن دونی رات چوگنی ترقی نظر آتی ہے جنگل کا سبزہ اپنی کیفیت کا اسطرح نقشہ کھینچتا ہے کہ گویا دور دور تک فرش زمردیں یا پتّے کا فرش ہے بجلیاں بار بار کوندتی ہیں پپیہا پی کہاں پی کہاں کی پے در پے صدائیں لگاتا ہے۔ کوئل کوکتی ہے۔ جنگل کی تیز اور سائیں سائیں چلنے والی ہوائیں ملار گاتی ہیں عجیب پُر لطف اور سرور انگیز زمانہ ہے کہ جسمیں ہر عشق و محبت رکھنے والا اپنے محبوب کیساتھ ہمکناری کا شایق اور متمنی ہوکر اپنی آرزوں اپنے ارادوں اور اپنے ولولوں کو نکالنا چاہتا ہے۔ بلبل شاخ گل پر بیٹھکر اپنی محبت کا دکھڑا اپنے سچے اور پر اضطراب لہجے میں گل کو سناتا ہے درد دل کا افسانہ سنانے کے بعد اپنے محبوب سے کسی قسم کا جواب نہ ملنے سے چیخ چیخ کر رونے لگتا ہے ہائے کیا محبت ہے کیا الفت۔ جب چاہے ہنسا دیتی ہے جب چاہے رُلا دیتی ہے اگر نظر غور سے دیکھا جائے تو کیا سبزہ کیا شجر۔ کیا حجر۔ ہر چیز محبت کی ایک سچی کہانی ہے جو انسانی حیطۂ خیال سے باہر اور بالکل باہر ہے۔ مقناطیس لوہے کو۔ کہربا گھانس کو اپنی طرف کھینچتا ہی کیا ان چیزوں میں مادہ کشش ہے یا ہوگا۔ لیکن ہم تو اس کو محبت سمجھتے ہیں۔ پتھر میں بھی محبت کی چنگاری نہاں ہے جو لوہے کے تصادم سے عیاں ہوجاتی ہے۔ دریا کی لہریں آپس میں ہر وقت گلے ملا کرتی ہیں اور اس طرح ملتی ہیں کہ دو ایک ہوجاتی ہیں۔ نقاش ازل جس نے لکھو کھا خاکے کھینچے اور چاک کرڈالے صدہا نقشے بنائے اور بگاڑ ڈالے اُس کے ہاتھ کا کھینچا ہوا وہ دائرہ جو فلکی کاغذ پر متجلی نظر آتا ہے اُس کی کرنوں کو دیکھو کہ کس طرح ایک دوسرے سے ملی ہوئی ہیں اگر ذرا ادنیٰ سی چیزوں اور معمولی سی معمولی باتوں پر نظر غائر ڈالی جائے تو اس حقیقت کا انکشاف ہوسکتا ہے کہ قدرت نے محبت کی نیرنگیوں سے کسی چیز کو خالی نہیں چھوڑا ہے دور کیوں جاتے ہو درختوں کی پتیوں کو دیکھو۔ ٹہنیوں کو دیکھو۔ نسیم خوشگوار کے جھونکے ٹہنیوں کو ٹہنیوں سے پتیوں کو پتیوں سے ملا دیتے ہیں۔

ہر شخص اپنے جداگانہ خیالات کے موافق ان باتوں کو جو جی چاہے سمجھ لے۔ ع۔ فکر ہر کس بقدر ہمت اوست۔ لیکن ہم تو اس کو محبت ہی کہیں گے۔ پروانہ شمع پر گرتا ہے جاں نثاری کرتا ہے بلبل گل کی قربت چاہتا ہے چکور چاند کے ارد گرد پھرتا ہے۔ ہمیں کوئی بتائے کہ یہ کیا ہے۔ محبت کی ہوا روز الست ہی چلی تھی اور اب بھی چل رہی ہے۔ دریا میں جوار بھاٹا ہوا پانی بلیوں اچھلا ایک دوسرے سے گلے ملا دریا کی روانی میں ایک ہو گیا۔ غبار کو دیکھو ہولے اڑی اور غائب ہو گئی۔ اس سے یہ بات عیاں ہے کہ محبت کا فطری تقاضہ یہ ہے کہ دو ایک ہو جائیں فطرت انسانی بھی اس جذبہ اور ان تخیلات سے خالی نہیں بلکہ اسمیں بدرجہ اتم موجود ہے۔ میں بھی کسی کو چاہتا ہوں میں بھی کسی کا دم بھرتا ہوں۔ میرے بھی دن اور راتیں اسی میں بسر ہوتی ہیں محبت کی داستان باعث صد عیش و کامرانی ہے میں مفتوح ہوں لیکن اپنے تئیں فاتح سمجھتا ہوں میرے فتوحات کسی کی محبت بھری اور غلط انداز نظروں پر منحصر ہیں۔ ہائے محبت کیا پیارا نام ہے جس پر مجھ کو بار بار محبت آتی ہے اگر بس چلے تو قسمت سے بدل دوں۔ آنیوالے نے اگرچہ یہ نہیں کہا تھا کہ میں آؤں گا لیکن میں اس کے انتظار کی گھڑیاں کاٹ رہا ہوں۔ بغیر وعدے کے یہ بیقراری کیوں۔ یہ اضطرابی کیوں۔ بس کچھ نہیں۔ محبت ؎

غزل

از جناب مولوی سید غلام پنجتن صاحب شیدا بی۔ اے۔ ایل ایل بی

آج رندوں میں بندھی ایسی ہوا ساقی کی
کہ ہر اک مست لگاتا ہے صدا ساقی کی

پھر رہی ہے مری آنکھوں میں وہ مستی بھری آنکھ
آرہی ہے مرے کانوں میں صدا ساقی کی

راز میخانہ کا میخانہ سے کیونکر نکلے
ظرف رندوں کا ہے ہوشیار بار ساقی کی

آخرش حرمت مے شیخ کو کرنی ہی پڑی
ایسی ہوتی ہے نظر ہوشربا ساقی کی

کعبہ دیر و حرم میں کہیں راحت نہ ملی
زاہد خشک بھی چوکھٹ پہ گرا ساقی کی

شمع گل شیشے شکستہ ہیں صراحی اوندھی
ہاں مگر آنکھوں میں باقی ہے ادا ساقی کی

کھرا اور کھوٹا

ایک بیرونی ہمعصر کے نورانی صفحات پر جن کے خیالات شاعری کی نسبت بہت اعلیٰ وارفع ہیں اور جو لسان الملک کے حصہ نظم کو فرسودہ خیال کرتا ہے کیمبرج سے آئی ہوئی ایک مختصر غزل دیکھکر اس بات کا افسوس ہوتا ہے کہ ہم کہتے کچھ ہیں اور ہیں کچھ، اور دم دقدم میں جب تک ہمعانی نہو خالی خولی دعوی محض صدا بصحرا کا حکم رکھتی ہے، چونکہ ان سطور کے لکھنے سے ہمارا منشا مخاصمہ ومحاوجہ نہیں ہے اس لئے ہم رسالہ کا نام دینا مناسب سمجھتے ہیں اور نہ شاعر کا۔ بلکہ ایک ادبی پرچہ کے اڈیٹر کی حیثیت سے اسکو اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ نظم یا نثر تحریرات میں اگر کوئی بات ایسی دیکھیں جو صحیح مذاق ادبیت کو بگاڑنے والی ہو تو اسکی طرف پبلک کو متوجہ کردیں؛ تاکہ ہماری نئی ہونہار پود گمراہ کن نظائر کی تقلید سے پرہیز کر سکے۔ اب ناظرین کرام ملاحظہ فرمائیں کہ مندرجہ ذیل اشعار بدمذاقی کی کیسی روشن مثال میں شاعر صاحب فرماتے ہیں۔

کیا شکایت بے نیازی یار کی انتہا ہے وعدۂ دیدار کی

اجانتے پہلے مصرع میں شکایت پر اضافت ہے یا بے نیازی پر۔ لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ یہ فک اضافت کا کون سا محل ہے۔ اور مصرع کس وزن میں موزوں ہوتا ہے۔

ناخدائی یوں تو سب کرتے مگر شکر اسنے جس نے ناؤ پار کی

اس شعر میں جو ناؤ ہے یہ غالباً پورب کا نائی (حجام) ہوگا ورنہ ناؤ بمعنی کشتی میں اتنا المبا (و) ہمارے کانوں نے آج تک نہیں سنا ہے۔ کیا ناموزوں شعر کہنا ہی شاعری کا اعلیٰ معیار ہے؟

چشم عرفاں اور دنیا کا فریب منزلیں ہیں وادی پُرخار کی

اس شعر کا مطلب ہمارے فہم ناقص میں تو کچھ نہیں آتا۔ چشم عرفاں اور دنیا کے فریب کو وادی پُرخار کی منزلوں سے جو مناسبت ہے کوئی صاحب عرفان ہی سمجھ سکتا ہے

کفر و دیں کا مبدء و مرجع ہے ایک کیوں نہ کھاؤں پھر قسم زنار کی

غالباً محترم اڈیٹر کے خیال میں یہ شعر نہایت فلسفیانہ اور جدت طرازی کا بہترین نمونہ ہوگا

اس لئے کہ اسمیں دو نہایت وزنی لغت مبدر اور مرجع استعمال ہوئے ہیں۔ مگر یہ نہ معلوم ہوا کہ شاعر صاحب کو خدا واسطے قسم کھانے کی کیا ضرورت پیش آئی کہ وہ مہادیو جی کے مندر میں سٹر یٹی کر دھنی کی قسم کھانے دوڑے گئے۔

دشت پیمائے جنوں نے دم لیا　　　منتوں سے سایۂ دیوار کی

افسوس ہے کہ ہم اس شعر کو بھی نہیں سمجھے، اول تو دشت جنوں میں دیوار کا ہونا ایک حل طلب مسئلہ ہے۔ دوسرے یہ کہ دیوار کی منتیں کر کے دیوار کے سایہ میں دم لینا بھی عجیب و غریب ترکیب ہے اگر دیوار کے مالک کی منتیں کی ہوتیں تو کوئی معنے بھی ہوتے۔

مڑ کے ظالم دیکھ لینا تھا تجھے　　　ڈبڈبائی آنکھ کو بیمار کی

تمام خوبیوں سے قطع نظر کر کے صرف دوسرے مصرع کی علامت مفعول (کو) کو دیکھئے کہ کس قدر محاورے میں ڈوبا ہوا ہے۔ اور اگر اس (کو) کو دور کر دیا جائے تو مصرع لنگڑا ہو جاتا ہے۔

جلوہ فرما ہے رگ جاں کے قریب　　　جس نے موسیٰ طور پر گفتار کی

اول تو گفتار کرنا ہی مخل کلام ہے دوسرے حضرت موسیٰ بیچ میں ایسے بُرے کود پڑے کہ مصرع میں نہایت بھونڈی تعقید دافع ہو گئی۔

تیرے دست و بازو اور میرا گلا　　　آبرو ہیں خنجر خونخوار کی

شعر غنیمت ہے اور اگرچہ پہلے مصرعے میں تقطیع میں بازو کا و نہیں گرتا بلکہ اور کا ا گر جاتا ہے لیکن پڑھنے میں بجائے بازو کے باز پڑھا جاتا ہے جو مذاق سلیم میں نہایت ناگوار ہے کاش دست و باز و تیرے اور میرا گلا کہتے۔

خوب جی بھر کر اُسے دیکھا مگر　　　پھر بھی حسرت رہ گئی دیدار کی

شعر بھی صاف ہے اور اچھا ہے لیکن مصرع اولی میں بھر کر اور مگر کی تثلیث را سے جو سمع خراش جھرا ٹا پیدا ہوتا ہے یہ نہ ہوتا اگر جی بھر کے کہا جاتا اس کے بعد صرف مقطع باقی رہتا ہے جسے نظر انداز ہی کرنا بہتر ہے۔ افسوس اس بات کا ہوتا ہے کہ جو چیز بن چکی ہے اُسے بگاڑا جا رہا ہے۔ شاعری کی اصلاح ضرور کیجئے۔ نئے نئے خیالات لائیے۔ نئی نئی ترکیبیں لائیے مگر نہ یہ کہ کوا ہنس کی چال چلا اپنی بھی بھولا۔ زبان کو

بلگاڑ نے تمام محاسن شعری کو ترک کرنے، اور عیوب شعری کو اختیار کرنے سے آپ کی شاعری ترقی نہ کرے گی۔

ترسم نہ رسی بکعبہ اے اعرابی — کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است

(ایڈیٹر)

شہید وفا (۸)

بسلسلہ گزشتہ

(گم گشتوں کا ہے جو کھوج درکار — بدلا ہے یہاں سے رنگ گفتار
پیر گردون عربدہ ساز — کرلے پہ ہے فاش پردۂ راز
خامے کی زبان کچھ کہے گی — غفلت کب تک یہی رہے گی)
آخر ہوا کیا وہ کہاں ہے اینک؟ — جیتا ہے کہ مر گیا ہے اینک؟
کہتے ہیں کہ وہ جہاز دولت — (اینی کی جس پہ تھی امانت)
کرتا تھا سفر بہ کامیابی — اور باد مراد ہمرہ تھی
جس دم نزد خلیج بسکے — پہنچا تو ہوا نے ٹھاٹھ بدلے
آئے نظر اور ہی کچھ آثار — موجوں نے سر اٹھایا یکبار
مشرق کی طرف دیا تھپیڑا — لیکن کیا حق نے پار بیڑا
گو تھی پیش نظر تباہی — مانند نسیم صبحگاہی
پہنچا وہ جہاز تیز رفتار — آتشکدۂ[۱] جہاں کے اس پار
اور جھیل کے موجوں کے تھپیڑے — گرد راس امید چندے
ہر ایک طرح کڑی اٹھا کے — موسم کی بری بھلی اٹھا کے
گھوما کیا گرد خطۂ گرم — تھی باد مراد رو بہ آزرم
یوں تا بہ جزائر طلا کی — تقدیر نے کی اسکی رہنمائی
ڈالا القصہ اس نے لنگر — مشرق کے بہشت میں پہنچکر
اینک نے کی یہاں تجارت — اور دیکھ کے منفعت کی صورت

۱؎ منطقہ حارہ۔

بس کچھ تصویر ہائے چینی　　اُن روزوں بہت تھی مانگ جنکی
بچوں کے لئے لئے کھلونے　　ساماں کئے سارے واپسی کے

* * * * *

لے دے کے چلا وطن کو دولتؔ　　پہنچی تھی واپسی کی ساعت
چندے وہ جہاز حسب دلخواہ　　کرتا رہا بے تکان طے راہ
کتنے ہی صاف حلقۂ بحر　　یوں طے کئے گزرے جسطرح لہر[1]
تھا گرچہ حریف شور دریا　　اس کو نہ ہوئی ذرا بھی پروا
وہ اس کی محافظت کی دیبی[2]　　جو تھی تصویر دلفریبی
سینہ تانے کھڑی ہوئی تھی　　موجوں سے نظر لڑی ہوئی تھی
(پہلے تو چل گیا فسوں کچھ　　حاصل ہوا بحر کو سکوں کچھ
پھر چلنے لگی ہوا مخالف　　پھر دور فلک ہوا مخالف
طوفان نے روز بد دکھایا　　پھر دولت نے تھپیڑا ایسا کھایا
پھر راہ سے ہٹ گیا وہ بیراہ　　اور جہاز پڑا [illegible] راہ
خطرے کی پکار اٹھی ادھر کو　　ٹکرایا چٹان سے اُدھر جو
بس کام نہنگ مرگ میں تھے　　[illegible]
ایک ایک اور دوسرے دو　　قسمت کے دھنی تھے بچ گئے جو
تختوں پہ جہاز کے وہ مضطر　　بہتے پھرے ساری رات یکسر
سورج نے جب نقاب اٹھائی　　ٹاپو ملا اترے جان پائی
ٹاپو تھا کہ (خال روئے دریا)　　سرسبز مگر غضب کا سونا

* * * * *

موجود غذا تھی واں سبھی کچھ　　کھانے کے لئے نہ تھی کمی کچھ
میوے شاداب پھل مہنتا　　ہر قسم کے گدّے قوت افزا
اور رحم کا گر نہ دھیان رکھیں　　اُن بے بسوں کی بھی جان لے لیں
جو گرچہ ہیں انتہا کے وحشی　　ہر بھولے پن سے رشک ایلچی
یاں ایسے انھوں نے ایک رہ　　رخ جس کا بحر کی طرف تھا

---

[1] چو پردم و چو پردوس و چو پردہ چہ حسد ؛ ہمہ روئیدہ ... از شعر (سعدی)

[2] جہاز کے روکار پہ ایک زنانی تصویر بنائے تھے جو محافظت کی دیبی سمجھی جاتی تھی۔

کٹی چھوٹی سی اک بنائی　　پتے خرمے کے لے کے چھائی
اس طرح بنا کے چھوٹا سا گھر　　آدھا غار اور آدھا چھپر
اس دار نعیم میں رہے وہ　　دنیا میں بہشت پا گئے وہ
لیکن یہ بہار دائمی بھی　　حق میں اُن کے الم فزا تھی

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

ان تینوں میں تھا جو سب سے کمسن　　تھے جسکے ابھی مراد دل کے دن
جسدن کشتی ہوئی تھی برباد　　ایسا زخمی ہوا وہ ناشاد
اس درد سے پانچسال بھگتا　　زندہ در گور تھا وہ گویا
تنہا اس کو یہ چھوڑتے کیا　　رشتہ الفت کا توڑتے کیا
آخر راہ اس نے لی عدم کی　　ہوکر آزاد قید ہستی
بعد اُس کے یہ دو رہے جو باقی　　سوچے تدبیر مخلصی کی
افتادہ درخت جو پڑے پائے　　پٹڑی سوکھی سی اک اٹھالائے
ہتیار نہ تھے جلا جلا کے　　کشتی اُس کی لگے بنانے
کرتے رہے انڈین کے مانند　　اس کام کو دونوں کے یکچند
ساتھی اس کا جو دوسرا تھا　　بے پروا اور چلبلا تھا
تھا دھوپ میں اکدن آتش افروز　　گرمی کا ہوا اثر جگر سوز
راہ عدم آخر اس نے بھی لی　　اینک کا رہا نہ کوئی ساتھی
غربت میں یہ سانحے جو دیکھے　　بس ''لا یتقدمون'' کہہ کے
راضی برضا ہوا وہ ناچار　　ہرچند تھا موت کا طلبگار

٭ ٭ ٭ ٭ ٭

جنگل سے ڈھکے ہوئے وہ کہسار　　چوٹی تک وہ ہجوم اشجار
وہ لہلہے مرغزار خوشرنگ　　سبزے پہ تھے گل کہ نقش ارتنگ
وہ پیچ میں جادہ ہائے پُرپیچ　　پیچ و خم زلف بھی جہاں ہیچ
بستی سے صعود کر رہے تھے　　کہسار کی نردبان لگا کے
جاتے تھے زمین و آسماں کو　　شرماتے تھے راہ کہکشاں کو

وہ سر بفلک کشیدہ نرجیل
سر پہ لئے چتر بال جبریل

وہ جنبش کرمکان صحرا
چشمک زن تھے ستارے گویا

وہ جلوۂ طائران خوشرنگ
وہ بال افشانیاں وہ آہنگ

وہ بیلیں سدا بہار تھیں جو
شاخوں کے گلے میں ہار تھیں جو

کہسار سے تا کنار دریا
دامان زمیں شجری تھا

القصہ وہ خانہ باغ ہستی
زریں کرایاغ ہستی

تھا قدرت کبریا کا مظہر
دنیا کی بہشت تھا سراسر

لیکن جنہیں دیکھنا تھا منظور
شکلیں وہی تھیں نگاہ سے دور

صورت نہ کہیں کوئی دلاویز
بولی نہ کسی کی الفت آمیز

ہاں اڑتے ہوئے طیور آبی
اور سمع خراش چیخیں اُن کی

یا موج محیط کوہ پیکر
ساحل پہ وہ اُس کا شور اور شر

یا نخل بلند اور تناور
گلبار تھے جو سر فلک پہ

وہ اُن کا جھومنا ہوا سے
وہ گونجنا بن کا اُس صدا سے

یا نہروں کا جہاں گزرا ترانا
موجوں کا پیچ و تاب کھانا

بس یہ سامان پیش و پس تھے
غربت میں جو اُس کے ہمنفس تھے

گھبرا کے جو سوئے ساحل آتا
کچھ اور ان کے سوا نہ پاتا

پہروں سر غار بحر رو بہ
وہ زورق آرزو شکستہ

بیٹھا رہتا یہ لو لگائے
کشتی کوئی شاید آہی جائے

تھا دھیان بندھا ہوا مکاں کا
جویا تھا نشان بادباں کا

لیکن واں بادباں کہاں تھا
جز دامن حسرت و تمنا

کاٹی رات انتظار میں گر
پھر وقت سحر وہی ہے منظر

ہے گرد وہی ہجوم اشجار
ہے مہر اسی طرح شرربار

ہے بحر پہ دھوپ دھوپ بر پہ
پاؤں تلے دھوپ دھوپ سر پہ

ہر سمت اک آگ سی لگی ہے
دنیا دوزخ بنی ہوئی ہے

اس سے جو ملی نجات بارے
آنکھیں لگے پھر دکھانے تارے

پھر صبح ہوئی ہے پھر وہ بیتاب — بیٹھا اُسی دھن میں ہے لب آب
اس طرح ہے بحر فکر میں غرق — گویا نہیں اس میں مردے میں فرق
محویت عالم خیالات — دکھلاتی ہے عجب طلسمات
پھرتی ہیں وہ صورتیں نظر میں — ہر دم ہے خیال جن کا سر میں
ہے حافظہ اُن کا آئینہ دار — جو ہیں خط استوا کے اُس پار
وہ لوگ وہ جگہیں وہ مناظر — تھے جتنے تعلقات خاطر
بچے اور اُن کا شور و غوغا — آپنی اور لطف چاہتوں کا
وہ چھوٹا سا گھر سڑک وہ ڈھلوان — وہ گرنی وہ سایہ دار گلیاں
وہ موڑ کا معرکہ وہ ڈیوڑھی — وہ نخل قدیم وہ حویلی
وہ اس کا رفیق اسپ نقرہ — کشتی وہ جسے بحیرہ پیما
وہ صبح نومبر یخ اندود — سبزے کے وہ تختے شبنم آلود
پڑتی وہ پھواریں ہلکی ہلکی — بو مردہ گلوں کی بھینی بھینی
وہ یخ کا بروئے بحر جمنا — رنگ اُس کا وہ روپ چپت کا سا
بیٹھی ہوئی وہ صدائے امواج — اس پہ وہ [illegible] نوائے امواج
اس طرح غرض تھے کٹتے ایام — تھیں سحر نہیں دن کو شبکو اوہام
اک دن یونہی سوچ میں تھا غرقاب — بیداری میں تھا دیکھتا خواب
آنکھوں تلے شکلیں پھر رہی تھیں — کانوں میں صدائیں گونجتی تھیں
ناگہ اُسے یوں دیا سنائی — نوبت کہیں بجتی ہے خوشی کی
یا چرچ میں اس کے ہیں بجائے — شادی کے جرس نے شادیانے
گو اور نہ تھی اُسے خبر کچھ — پر دل پہ ہوا عجب اثر کچھ
بس کانپ کے سہم سا گیا وہ — بیخود کچھ دیر تک رہا وہ
پھر ہوش آیا تو سامنے تھا — ٹاپو وہی اور وہی بحیرہ
ہر چند کہ تھا بہشت منظر — لیکن تھا اُسے سقر سے بدتر
اس حالت اضطرار میں گر — وہ ہو نہ رجوع سوئے داور
تنہائی کا جانگداز صدمہ — چھوڑے ہرگز نہ اُس کو زندہ

القصہ یہ بیکسی یہ بن باس　　یہ مجمع رنج و حسرت و یاس
صدموں نے پیر کر دیا تھا　　خواب راحت خیال سا تھا
گزرے تھے اسی طرح کئی سال　　لیکن نہوئی تھی آس پامال
فکر زن جبر خیال فرزند　　تھے نشتر قلب آرزومند
اب تک دل کو وطن کی تھی یاد　　تھا کلک خیال کلک بہزاد
واں کی ہر چیز تھی نظر میں　　پھرتی تھی ہر اک گلی نظر میں
آخر کشش اس کی رنگ لائی　　تقدیر نے کی یہی کی رسائی
سچ کہتے ہیں جی ہے تو جہاں ہے　　شاہد اس کی یہ داستاں ہے
یوں کہتے ہیں راویانِ دانا　　اینک اسی حال میں ابھی تھا
جو ایک جہاز سیل رفتار　　ہو کر طوفان میں گرفتار
دولت کی طرح سے راہ بھولا　　یاں پر لب ساحل آکے ٹھہرا
آیا ہے کہاں نہ تھی خبر یہ　　طالب پانی کا تھا مگر یہ
ٹاپو نظر آیا جان پائی　　قسمت آب بقا پہ لائی
کہسار کو دور ہی سے دیکھا　　بہتا پانی کہیں سے دیکھا
سمجھے کہ ضرور یاں پہ ہوگا　　چشمہ، تالاب، ندی، نالا
کچھ لوگ جہاز سے اتر کے　　پانی کی جستجو میں نکلے
عالم تھا وہاں مقام ہو کا　　اٹھا اک شور ہائے ہو کا
ناگاہ کسی درے سے نکلا　　اک شخص بشکل غول صحرا
لمبی ڈاڑھی بڑے بڑے بال　　چہرہ انساں کا ریچھ کی کھال
اعجوبۂ روزگار تھا وہ　　مجنوں کی یادگار تھا وہ
صورت سے عیاں تھا غصہ و غم　　الفاظ زباں پہ غیر مفہم
دیوانوں کی طرح بڑبڑاتا　　ہاتھوں سے اشارے کچھ بتاتا
پیاسوں کو تا بہ نہر لایا　　گویا تھا وہ غول خضر پایہ
پایا جو نشان آبِ شیریں　　جی اٹھے وہ تشنگانِ غمگیں
چہلیں بھی سوجھیں دل لگی بھی　　باتیں نکلیں ادھر ادھر کی

ابتک ان سب کے ساتھ تھا جو — سنتا تھا بغور ہر سخن کو
برسوں کی خامشی نے گویا — اسکو گونگا بنا دیا تھا
باتوں سے جو آشنا ہوئے گوش — یاد آگیا لہجۂ فراموش
کچھ کچھ جو کھلی زباں اسکی — باتیں کیں اُن سے ٹوٹی پھوٹی
مطلب اسکا سمجھ گئے وہ — لے آئے جہاز پر اُسے وہ
آفت سے چُھٹا جو اِس آئے — سب اہل جہاز پاس آئے
قابو میں زبان بھی کچھ آئی — قالب میں جان بھی کچھ آئی
کہنے لگا سرگزشت جو تھی — روداد کوہ و دشت جو تھی
قفل لب زنگ خوردہ کھولا — رُک رُک کے اٹک اٹک کے بولا
سُننے والوں کے اڑ گئے ہوش — ہمدردی کا دلوں میں تھا جوش
حالت کا ہوا جو اس کی احساس — کپڑے دیئے اور دیا فری پاس
اینک سے مگر یہ کب تھا ممکن — احدی کی طرح جو کاٹتا دن
کرتا رہتا تھا کچھ نہ کچھ کام — ملتا تھا کام ہی میں آرام
لیکن جتنے جہاز پر تھے — سب اس کے وطن سے بے خبر تھے
اُن میں تھا ایک بھی نہ ایسا — جو کچھ یہ پوچھتا بتاتا
جن کا نشان تھا یہ مہجور — واں ان کا نہ ذکر تھا نہ مذکور
اب جو اُس قید سے چھٹا تھا — رستہ یہ پہاڑ ہو رہا تھا
تھا بسکہ جہاز وہ شکستہ — کٹتا تھا مشکلوں سے رستہ
اینک کے لئے یہ دیر تھی قہر — ہاں تھی دل میں کچھ اور ہی لہر
تھا اس کا خیال آگے آگے — اور موج ہوا تھی پیچھے پیچھے
آخر آئی وہ صبح موعود — جب موج نسیم شبنم آلود
انگلنڈ کی سرزمیں سے آئی — جاں ان کے جسم میں سمائی
واں جتنے تھے افسر اور سپاہی — از راہ سلوک و خیر خواہی
چندہ کی راہ سب نے ڈالی — بھر دی اینک کی جیب خالی
ساحل پہ جہاز جب لگایا — اینک مرکز پہ اپنے آیا

غلاف کعبہ

گزشتہ سے پیوستہ

از جناب مولوی سید علی شبیر صاحب مترجم ہائیکورٹ

غلاف کعبہ کا مکے میں ورود

مکۂ معظمہ میں غلاف کعبہ کا محمل عموماً وقت مقررہ یعنے ۳۰ ذیقعدہ تا یکم ذیحجہ کو داخل ہوجاتا ہے اور شریف کے باغ کے متصل مسجد عایشہ[1] کے نزدیک اترتا ہے اس کے ورود کے وقت مکے میں بڑی خوشی منائی جاتی ہے اور اس کے آتے ہی وہاں رونق اور گھما گھمی بہت بڑھ جاتی ہے تمام باشندگان مکہ اور حاجی اس کے دیکھنے کے لئے جاتے ہیں۔ سلطانی فوج مقیم مکہ نہایت ادب سے اس کی سلامی اُتار کر اپنے ہمراہ مکے کے اندر لاتی ہے۔ جو امیر الحاج ہوتا ہے اُسکو (۲۱) توپوں کی سلامی محمل کی تعظیم میں دیتے ہیں۔ مصری و ترکی[2] سوار و پیدل فوج اس کے جلوس میں چلتی ہے اور بینڈ والے دلکش آواز میں سلطانی ترانہ بجاتے ہوئے اس کو بیت اللہ تک پہنچاتے ہیں۔ یہاں سے فوج بارکوں کو چلی جاتی ہے اور محمل حرم میں داخل ہوجاتا ہے۔ ڈاکٹر حاجی نور حسین صاحب صابر نے اپنے سفرنامے رفیق الحاج میں

---

[1] مکہ سے کوئی تین میل وادی فاطمہ کی طرف سار جو حرم سے باہر تنعیم کی بلندی کے پاس ایک مسجد ہے جو مسجد عایشہ کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں سے عمرہ کا احرام باندھا جاتا ہے اس مسجد کے پاس ایک بڑا حوض اور ایک مسجد اور ہی بنی ہوئی ہے جسے مسجد جدید کہتے ہیں۔

[2] یہ کیفیت اُسوقت کی ہے جبکہ حجاز میں سلطان ترکی کا پرچم لہراتا تھا اور مکۂ معظمہ آل عثمان کے زیر نگین تھا جنگ یورپ کے دوران میں جو سنہ ۱۹۱۴ء سے شروع ہوکر تخمیناً ۶ سال رہے مکے کے نالائق شریف حسین پاشا نے نصاری سے سازش کر کے اور ترکوں سے بغاوت کر کے علم آزادی بلند کیا اور اس وقت حجاز پر اسی کی حکومت ہے اور یہ دین فروش شاہ حجاز کے نام سے مخاطب کیا جاتا ہے مسلمانان عالم اسکی حکومت کو حکومت نصاری تصور کر کے اس سے سخت بیزار ہیں اور تائید غیبی کے انتظار میں یہ شعر پڑھتے ہیں:- شہر خالی است ز عشاق مگر ز طرفے ٭ مردے از غیب بروں آید و کارے بکند

یہ سماں ان الفاظ میں دکھایا ہے :-

"محمل مصری کی رونق اُس کی سج دہج۔ تزک واحتشام بہت بڑھی ہوئی تھی سب سے اول خاکی وردی میں مصری فوجی افسر نکلے۔ جن کے ساتھ برہنہ تلواروں کے جوان تھے بعدہٗ خچروں کا توپ خانہ۔ اس کے بعد ایک ضعیف نقیب چل رہا تھا اس کے دونوں جانب ایک بٹالین کے نوجوان سپاہی مارٹن ہنری سے مسلح خاکی وردی میں برابر قدم اٹھا رہے تھے۔ مصری فوج کی وردی مضبوط۔ چست اور صاف تھی۔ اُن کے ہتیار پرتلا۔ کرچ۔ بوٹ سب درست تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا یہ یورپین افواج سے ہیں صرف تُرکی ٹوپی کا فرق تھا۔ بعد ازاں ایک اونٹ پر مطلا و زرین کپڑے سے ستور محمل نکلا۔ جس کے پیچھے ایک اونٹنی پر ایک معمر بزرگ آدمی سلطان خدیوی جھنڈا سنبھالے تھا محمل کے آگے باجا بج رہا تھا۔ اسوقت کا منظر و کیفیت خوش کن، رقت خیز تھی۔ شہر میں محمل کے داخل ہوتے ہی ہر طرف سے اللہ اکبر سُبحان اللہ اور دعائیہ کلمات کی پکار زور سے ہوئی۔ شریف کے مکان کے سامنے فوج سے محمل کی سلامی اُتاری۔ بازار میں دونوں طرف ہزارہا مخلوق عورت مرد بچے بوڑھے جوان موجود تھے۔ سینکڑوں پردہ دار مستورات برقع پوش کھڑی تھیں۔ عجیب رونق سے محمل گزر رہا تھا۔ باب النبی کے سامنے محمل بڑی کروفر سے اُتارا گیا اور اُس کا زرین لباس اُتار کر خالی محمل حرم شریف میں رکھدیا گیا۔"

عرفات و منٰی میں محمل

۹ ذیحجہ کو عرفات[1] میں جبل رحمت کے قریب اور ۱۰، ۱۱ و ۱۲ ذیحجہ کو منٰی[2] میں اپنی مقررہ جگہ پر محمل مصری معہ اپنی ہمراہی فوج کے خیمہ زن ہوتا ہے نویں ذیحجہ کو خطبہ عرفات ختم ہونے کے بعد

---

[1] عرفات مکہ معظمہ سے جانب مشرق نو کوس ہے۔ یہاں ایک بہت بڑا میدان اور ایک پہاڑ سی ہے جسے جبل عرفات یا کوہ رحمت کہتے ہیں۔ نویں ذیحجہ کو تمام دنیا کے حاجی یہاں جمع ہوتے ہیں پہاڑی کے نزدیک ایک مسجد ہے جسے مسجد ابراہیمی کہتے ہیں یہاں ممبر کے پاس کھڑا ہو کر امام خطبہ پڑھتا ہے جو تین چار بجے شروع ہو کر سر مغرب ختم ہوتا ہے اس کے بعد ہر شخص حاجی کے (بقیہ صفحہ آیندہ)

ایک بھاگڑ مچتی ہے اور ہر شخص قدم اٹھائے۔ مزدلفہ کا رُخ کرتا ہے اُس وقت محمل مصری و محمل شامی بھی اپنی فوجی ترتیب کے ساتھ روانہ ہوتے ہیں اور مزدلفہ میں رات گزار کر صبح مِنیٰ میں پہنچ جاتے ہیں۔ اگلے زمانے میں محملوں کی جائے قیام پر اور اس بات پر کہ ہمارا محمل آگے رہے یا تمھارا بعض اوقات بڑے خون خرابے ہوجاتے تھے اور جن لوگوں کا اثر قوی ہوتا تھا وہ اپنے محمل کو آگے رکھہ کر روانہ ہوتے تھے۔ آگے والا محمل ہیری سمجھا جاتا تھا اور پیچھے والا پھسڈی۔ برکھارٹ جو ۱۸۱۴ء میں حج میں شریک تھا کہتا ہے کہ آجکل محمد علی پاشا یہاں موجود ہے اس لئے محمل شامی والے دبی بلی بنے ہوئے ہیں اور محمل مصری کے مقابلہ پر نہیں آرہے ہیں۔

عرفات و مزدلفہ و مِنیٰ میں دونوں محمل ایک دوسرے کو ہر نماز کے وقت اکتیس اکتیس توپوں کی سلامی دیتے ہیں۔ اس طرح پانچوں وقت کی نماز میں (۳۱۰) توپیں چلتی ہیں علاوہ اس کے جب شریف مکہ کی سواری نکلتی ہے یا کوئی فوجی افسر آتا ہے تو اُس کے مرتبہ کے لحاظ سے محمل کی ہمراہی فوج علحدہ توپیں چلاتی ہے۔

غلاف کعبہ کی ساخت اور اُس کے حصے اور کتبے

کعبہ پر غلاف چڑھا کر محمل کی واپسی مصر کا ذکر اس جگہہ بے موقعہ ہے اس لئے آخر میں اُسکا ذکر کیا جائے گا یہاں غلاف کی ساخت اور اُس کے حصّوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) لقب سے پکارا جانے لگتا ہے۔ قیام عرفات حج کا سب سے بڑا رُکن ہے۔

سے مِنیٰ مکہ معظمہ سے تین چار میل عرفات کے راستے پر واقع ہے یہاں بہت سے مکان بنے ہوئے ہیں جو صرف ایام حج میں کرایہ پر دیدیے جاتے ہیں۔ باقی ایام میں خالی پڑے رہتے ہیں۔ حاجی عرفات سے واپس آکر مِنیٰ میں تین دن قیام کرتے ہیں۔ اسی جگہ قربانی بھی کیجاتی ہے۔

لے۔ مکہ معظمہ سے چار کوس کے فاصلہ پر عرفات و مِنیٰ کے درمیان ایک میدان ہے جسے مزدلفہ کہتے ہیں مِنیٰ سے ڈیڑھ دو کوس ہوگا یہاں ایک مسجد بنی ہوئی ہے جسکا صرف ایک ہی مینار ہے۔ حاجی عرفات سے واپسی کے وقت نویں ذیحجہ کی رات کو یہاں قیام کرتے ہیں۔ کنکریاں جو شیطان پر مِنیٰ میں پھینکی جاتی ہیں۔ حاجی اسی جگہہ سے چنتے ہیں۔

چونکہ مذہب اسلام میں خالص ریشمی کپڑے کا استعمال نادرست ہے اس لئے غلاف کا تانا سوت کا اور بانا ریشم کا رکھا جاتا ہے مگر نہایت سیاہ چمکدار کپڑے کا ہوتا ہے۔ غلاف میں آٹھ ٹکڑے ہوتے ہیں یعنے کعبے کی ہر سمت کے لئے دو دو ٹکڑے۔ ان ٹکڑوں کے کناروں پر سفید کپاس کی گوٹ لگی رہتی ہے اور ان کے باندھنے کے لئے رسیاں بھی ہوتی ہیں۔ کعبے کی لمبائی (۴۲) فٹ چوڑائی (۳۳) فٹ اور اونچائی (۴۸) فٹ ہے۔ دیوار کے ہر طرف غلاف کے دو ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا چھت کے قریب سے دیوار کے ایک تہائی حصے یعنے (۱۶) فٹ تک آتا ہے اور دوسرا ٹکڑا دیوار کا باقی دو تہائی حصہ (۳۲) فٹ ڈھک لیتا ہے۔ اسطرح چاروں دیواروں پر آٹھ ٹکڑے آجاتے ہیں۔ دیواروں پر جہاں دونوں ٹکڑوں کا جوڑ ملتا ہے وہاں سیون کو چھپانے کے لئے حزام ٹانک دیتے ہیں یہ کوئی دو فٹ چوڑی ایک پٹی ہوتی ہے جو کعبے کی دو تہائی اونچائی یعنے (۳۲) فٹ پر چاروں طرف لپٹی رہتی ہے اور اسطرح کسوت (غلاف کعبہ) کے آٹھوں ٹکڑوں کی سیونیں اس سے چھپ جاتی ہیں۔ حزام پر بہت ہی گھنا اور سنہرا کام کیا جاتا ہے۔ تھوڑے فاصلہ سے یہ بالکل سونے کا پترہ معلوم ہوتی ہے اس کے بھی چار ٹکڑے ہوتے ہیں یعنے ہر دیوار پر ایک ایک ٹکڑا آجاتا ہے۔

قدیم غلاف کعبہ کے کتبوں کے متعلق کوئی تفصیلی حالات کسی کتاب میں ہماری نظر سے نہیں گزرے البتہ ابن جبیر نے کچھ مختصر کیفیت لکھی ہے جو ہدیہ ناظرین کی جاتی ہے:-

"یہ غلاف بہت سبز تھا اور اس پر سرخ خطوط تھے۔ مقام ابراہیم[1] کے سامنے والی دیوار کے پردے پر جس میں کعبے کا دروازہ نصب ہے بسم اللہ کے بعد اِنَّ اَوَّلَ بَیتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لکھا ہے۔ چاروں پردوں پر

---

[1] خانہ کعبہ کے دروازے کے قریب ایک جالی دار گنبد ہے جسے مقام ابراہیم کہتے ہیں یعنے حضرت ابراہیم کھڑے ہیں یعنے حضرت ابراہیم کے قیام کی جگہ اسمیں وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم نے کھڑے ہو کر خانہ کعبہ تعمیر کیا تھا۔ اس پتھر پر خود قدموں کے نشان ہیں یہ پتھر کسی قدر بلندی پر ایک آئینہ دار چوکھٹے میں رکھا ہوا ہے جس پر زردوزی کا سیاہ غلاف پڑا رہتا ہے۔

خلیفہ[1] کا نام اور اُس کے حق میں دعائیں تحریر ہیں ان تحریروں کے گرد دو سُرخ جدولیں ہیں اور اُن میں چھوٹے چھوٹے خلیفہ کے لئے دعائیں تحریر ہیں"

زمانۂ حال کے غلافوں کے کتبوں کے متعلق مختلف طور پر جو معلوم ہوا اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ حزام کے پہلے اور دوسرے ٹکڑے آیت الکرسی اور تیسرے اور چوتھے ٹکڑے پر سلطان وقت کا نام و خطاب وغیرہ ہوتا ہے۔ حزام کی زمین سرخ ریشم کی ہوتی ہے اور اُس پر سنہری کام کے حروف ہوتے ہیں کعبے کے دروازے[2] پر غلاف کا ٹکڑہ جو مثل پردے کے لٹکتا ہے۔ اس کو علما برقع کہتے ہیں اور عوام الناس بُرقع سیدتنا فاطمہ کہتے ہیں اور جنابۂ فاطمہ زہرا صلواۃ اللہ علیہا سے اس کو منسوب کرتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ سلطان صالح ایوب نجم الدین[3] مصری کی بیوی فاطمہ نے جس کا خطاب شجرۃ الدار تھا پہلے پہل غلاف کعبہ میں اس برقع کا اضافہ کیا تھا جس کی وجہ سے وہ برقع فاطمہ کے نام سے موسوم ہو گیا۔ اس برقع پر بھی نہایت لسیوان سنہری کام ہوتا ہے اور آیات قرآنی بنی رہتی ہیں۔

[1] اس زمانہ میں خلیفۂ بغداد الناصر لدین اللہ تھا جس کا زمانہ خلافت ۵۷۵ھ سے ۵۹۲ھ تک ہے خلیفہ اولاً سبز غلاف بھیجا کرتا تھا بعد میں سیاہ بھیجنے لگا تھا۔

[2] خانۂ کعبہ کا دروازہ مشرق کی طرف قد آدم سے کسیقدر بلندی پر لگا ہوا ہے اس کے کواڑ سال کی لکڑی کے ہیں جن پر سونے کا ملمع کئے ہوئے چاندی کے پتّر جڑے ہوئے ہیں اور آیات قرآنی سے منقش ہیں دروازے کے اندر کی جانب سرخ رنگ کا ریشمی پردہ لٹکا رہتا ہے جو شام سے محمل کے ساتھ آتا ہے۔ داخلی کے وقت ایک سیڑھی دروازے سے لگا دیجاتی ہے یہ دروازہ ایام حج میں روزانہ صبح و شام کھولدیتے ہیں اور فی کس ڈہائی روپے لیکر اندر جانے دیتے ہیں بعض تاریخوں میں مفت بھی داخلی ہوتی ہے۔ عورتوں مردوں کی داخلی کے علٰحدہ علٰحدہ دن مقرر ہیں۔

[3] سلطان صالح ایوب نجم الدین کا شمار اولیاء اللہ اور صاحبانِ خرقہ میں ہے وہ اپنے ہاتھ سے کھجور کے پتوں کی ٹوکریاں بنا کر اپنی گذر اوقات کرتا تھا اور شاہی خزانہ سے کبھی ایک پیسہ نہیں لیا تھا اسکا زمانہ سلطنت ۶۳۷ھ سے ۶۴۷ھ تک ہے۔ قاہرہ کے محلہ نحاسین (کسارطہ) میں سلطان صالح کا مزار ہے اور یہاں آپ کا مولود جو ایک قسم کا عرس ہے ربیع الثانی کے مہینے میں ہرسال بڑی دہوم دہام سے کیا جاتا ہے۔

بقول برکہارٹ ۱۸۱۴ء میں بر قع پر روپہلی کام تھا۔ غلاف میں حجر اسود اور رکن یمانی کی جگہ کتری ہوئی رہتی ہے جس میں سے یہ دونوں متبرک پتھر نظر آتے رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں غلاف کعبہ پر کل قرآن بنا جاتا تھا اب صرف سات سورتیں یعنے سورہ کہف۔ سورہ مریم۔ سورۂ آل عمران۔ سورۂ توبہ۔ سورۂ طٰہٰ۔ سورۂ یٰسین اور سورۂ تبارک بنتے ہیں۔ علاوہ اس کے یہ آیت بھی بنی رہتی ہے۔ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّۃَ مُبَارَکًا وَّ ھُدًی لِّلْعَالَمِیْنَ[1]

غلاف کعبہ پر جس خط میں آیات قرانی اور دعائیں بنی ہوتی ہیں اسکو خط طومار کہتے ہیں یہ عربی خوشنویسی کی سب سے بڑی قسم ہے اور بہت دور سے پڑھی جا سکتی ہے یہ بیان عیسائی سیّاحوں کے تصانیف سے اخذ کیا گیا ہے۔ اب زمانۂ حال کے مسلمان حاجیوں کے بیانات بھی ملاحظہ ہوں۔

مولوی نادر علی صاحب وکیل میرٹھ اپنے سفرنامہ مرات العرب میں کہتے ہیں:۔

"تمام عمارت کعبہ پر چھت سے تا حد زمین غلاف ابریشم سیاہ جس پر کلمۂ طیبہ بافتہ ہوتا ہے ہر وقت پڑا رہتا ہے۔ جدا جدا حصے جن میں پورا کلمۂ طیبہ بنا رہتا ہے علحدہ معلوم ہوتے ہیں اور سنہری عبارت میں بخط نسخ آیات قرآنی و سلطان وقت کا نام بافتہ ہوتا ہے۔"

ڈاکٹر حاجی نور حسین صاحب صابر اپنے سفرنامہ رفیق الحاج میں تحریر فرماتے ہیں:۔

"غلاف پر کلمۂ شریف اور اللہ جل جلالہٗ بنا ہوتا ہے۔ چھت کے قریب چاروں طرف غلاف پر مطلّٰی آیات بیّنات بافتہ ہیں۔"

خان بہادر حاجی محمد عبد الرحیم صاحب اپنے سفرنامہ حرمین الشریفین میں لکھتے ہیں:۔

"عمارت کعبہ پر ایک سیاہ غلاف ہمیشہ پڑا رہتا ہے جس پر کلمۂ طیبہ نہایت واضح خط میں بافتہ ہوتا ہے اور اوپر کی جانب چاروں سمت میزاب رحمت سے ذرا نیچے سنہری عبارت میں بخط نسخ آیات قرآنی معہ نام سلطان المعظم

---

[1] مطلب یہ ہے کہ سب سے پہلا مکان جو خدا کی عبادت کے لئے لوگوں نے بنایا وہ مکہ میں اور اہل عالم کے لیئے وہ موجب برکت و ہدایت ہے۔

خادم حرمین الشریفین با فتنہ ہوتا ہے۔"

باعتبار وضاحت و تفصیل مسلمان حاجیوں اور عیسائیوں کے بیان میں جو کچھ فرق ہے ناظرین خود اُسکا اندازہ فرما سکتے ہیں:-

پرانا غلاف اتار کر کعبے پر نیا غلاف چڑھانا۔

زمانۂ قدیم میں نیا غلاف ڈالنے سے کئی روز قبل پرانا غلاف اُتار لیا جاتا تھا۔ چنانچہ ۱۸۱۴ء میں جب برکہارٹ نے سفر حجاز کیا تھا پندرہ روز تک کعبہ برہنہ رہا تھا۔ یہ رسم برٹن کے وقت میں یعنے ۱۸۵۳ء میں باقی نہیں رہی تھی۔ اب عموماً چند گھنٹے میں دوسرا جامہ پہنا دیا جاتا ہے۔ زمانۂ قدیم میں نیا غلاف ڈالنے کی کوئی خاص تاریخ مقرر نہ تھی جیساکہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں۔ نئے غلاف کے بدلنے کی رسم بھی سیاحوں نے اپنے سفرناموں میں تحریر نہیں کی ہے۔ البتہ ابن جبیر نے یہ تحریر فرمایا ہے۔

"قربانی کے دن[1] امیر عراقی[2] کے فرودگاہ سے کعبہ کا غلاف چار اونٹوں پر لاد کر جدید قاضی کے ہمراہ بھیجا گیا۔ قاضی کا لباس سیاہ تھا اور اس کے ساتھ سپاہی سیاہ علم لئے ہوئے چل رہے تھے۔ اس روز یہ غلاف کعبہ شریف کی چھت پر ڈالا گیا اور تیرھویں تاریخ منگل کے دن سب شیبی[3] غلاف چڑھانے میں مصروف ہوئے۔"

اس زمانے میں نیا غلاف ہر سال بالعموم ۱۰ ذیحجہ کو رات کے وقت کعبے پر ڈالا جاتا ہے نیا جامہ پہنانے کے کئی روز قبل کعبے کو غسل بھی کرا دیتے ہیں اور اندر باہر سے جھاڑنے اور دھونے کے بعد عطر و گلاب و مشک وغیرہ اُس کی دیواروں پر لگا دیتے ہیں پرانے

---

[1] مکے میں ۱۰ ذیحجہ سے قربانی شروع ہوتی ہے اور ۱۲ تاریخ تک ہوتی رہتی ہے یہاں قربانی کے دن غالباً ۱۰ ذیحجہ مراد ہے۔ [2] ابن جبیر کے زمانہ (۵۸۶ھ) میں عراق یعنے بغداد سے غلاف کعبہ آتا تھا اس لئے امیر عراقی یعنے قافلۂ عراق امیر الحاج۔

[3] شیبہ بن عثمان بن طلحہ کلید بردار کعبہ تھے ان کی اولاد بنی شیبہ یا شیبی کہلاتی ہے ان کو کعبے کے معاملات میں بہت دخل ہے۔ اور پرانے غلاف کے یہی لوگ مالک ہوتے ہیں۔ اس سے قبل بھی متن وحاشیہ میں بنی شیبہ و شیبی کی کسی قدر تصریح کی جا چکی ہے۔

غلاف کے نیچے جو مٹی دیواروں پر جم جاتی ہے حاجی اُس کو بھی جھاڑ پونچکر بطور تبرک اپنے گھروں کو لیجاتے ہیں۔

غسل کعبہ کی کوئی تاریخ معین نہیں ہے۔ سیاحوں نے مختلف تاریخیں لکھی ہیں کسی نے ۲۲ ذیقعدہ لکھی ہے کسی نے ۲۳ کوئی ۲۵ کہتا ہے کوئی ۲۸۔

کچھ تو اس خیال سے کہ طواف کے وقت جہاں جہاں تک بدویوں کا ہاتھ پہنچتا ہے غلاف کعبہ پھاڑ پھاڑ کر لیجاتے ہیں اور کچھ اس وجہ سے کہ آٹھ ذیحجہ کو تمام لوگ عرفات چلے جاتے ہیں اور بیت اللہ بغیر محافظوں کے رہجاتا ہے یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ زمین سے کوئی پانچ گز بلندی تک ایک سفید کپڑا کعبے کے گرداگرد لپیٹ دیتے ہیں اور اسیطرح غلاف کعبہ اوپر کی جانب اُلٹ دیا جاتا ہے۔ غلاف اُلٹنے کا طریقہ ابن جبیر کے زمانہ میں بھی تھا چنانچہ وہ لکھتے ہیں:۔

> "جب کعبے کا لباس درست کر چکے تو عجمیوں کے ہاتھ سے پردوں کو محفوظ رکھنے کے واسطے اُس کے دامن اونچے کر دیے۔ بات یہ ہے کہ یہ لوگ پردوں کو بیدریغ کھینچتے ہیں اور بشوق تمام اُن پر گرتے ہیں۔ ان پردوں میں کعبہ شریف کا جمال ایسا نظر آتا ہے گویا دلہن کو دیبائے سبز کا لباس پہنا دیا۔"

خلافت بنی امیہ کے زمانے میں غلاف ان دنوں میں بالکل اتار ہی لیا جاتا تھا۔ اور اُس کی بجائے سفید کپڑا اڑھا دیا کرتے تھے مکے والوں کی اصطلاح میں اس سفید پارچہ کا نام احرام کعبہ ہے اور جب یہ کعبے کے گرد لپیٹ دیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ کعبے نے احرام باندھ لیا۔ عموماً ۲۹ ذی قعدہ کو احرام کعبہ باندھا جاتا ہے اور یہ رسم بقول حاجی ولاور علی صاحب وکیل صاحب سیاحت حرمین لکھتے ہیں کہ زمانہ سلطان مراد خاں ۱۲۳۰ھ سے چلی آرہی ہے مگر میرا خیال ہے کہ یہ رسم بہت قدیم ہے اور خلافت بنی امیہ کے زمانہ سے جاری ہے یہ ممکن ہے کہ سلطان موصوف کے زمانہ سے بالالتزام کعبے کو احرام باندھا جانے لگا ہو چونکہ ان دنوں بیت اللہ میں حاجیوں کی کثرت ہوجاتی ہے اس لئے غلاف کی حفاظت کے واسطے احرام باندھا جاتا ہے مگر بہت سے بدوی اور دوسرے حاجی اس احرام کو بھی پھاڑ کر لیجاتے ہیں یہ لوگ نیک نیتی و خوش اعتقادی کے باعث

غلاف کعبہ کا کوئی ٹکڑا چرا لینا گناہ نہیں سمجھتے۔ مگر خانۂ کعبہ کے عہدہ دار (فرزندان شیبہ) چونکہ اس کو فروخت کر کے روپیہ پیدا کرتے ہیں اس لئے وہ اپنے بیرحم ڈنڈے کیساتھ اس کی بھی حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

شروع میں کچھ دن تک نئے غلاف کو زمین سے رگڑے سے بچانے کے لئے ڈوریوں سے باندھ دیا جاتا ہے۔ یعنے نیچے کے دامن کے گوشوں کو چھت میں ٹانک دیتے ہیں جس سے سامنے ہر طرف نیچے کی جانب دو لمبی لمبی زبانیں سی لٹکتی رہتی ہیں۔ اور کعبے کا نیچے کا حصہ کھلا رہتا ہے۔ کچھ دن بعد غلاف چھوڑ دیتے ہیں اور تمام عمارت ڈھک جاتی ہے اور کسوت کو پیتل کے مضبوط چھلّوں سے جو دیوار کی جڑ میں لگے ہوتے ہیں باندھ دیتے ہیں۔ جسوقت کعبہ غلاف سے ڈھک جاتا ہے یا جبکہ بالکل عریاں رہتا ہے[1] تو عموماً حاجی اور خصوصاً عورتوں کے غول کے غول اس کے گرد جمع ہو جاتے ہیں اور خوشی سے کلکاریاں لگاتے ہیں۔ اس سمے کا ذکر برکھارٹ نے اپنے سفرنامے میں ان الفاظ میں کیا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ایک وسیع چار دیواری میں ایک بڑی مکعب عمارت[2] کا سیاہ غلاف سے ڈھکا ہوا دکھائی دینا پہلے پہل ایک عجیب منظر معلوم ہوتا ہے اور دل پر ایک خاص اثر کرتا ہے۔ چونکہ غلاف ڈھیلا ڈھیلا باندھتے ہیں اس وجہ سے ہوا کا ذرا سا جھوکا بھی اُسمیں لہریں پیدا کر دیتا ہے اور اُس وقت حاجیوں کا مجمع جو کعبے کے گرد رہتا ہے دعائیں مانگتا ہے اور نعرہائے خوشی بلند کرتا ہے یہ اُن فرشتوں کی موجودگی کی علامت سمجھی جاتی ہے جو کعبے کے محافظ ہیں اور حاجی یہ خیال کرتے ہیں کہ اُن کے پروں کی ہوا سے غلاف ہل رہا ہے۔

نئے غلاف کے بعد کعبہ کی خوشنمائی

نیا غلاف ڈالنے کے بعد کعبے کا منظر نہایت دلکش و دلفریب ہو جاتا ہے۔ مشتاق حاجیوں کے جم غفیر بڑے جوش و خروش کیساتھ

---

[1] کعبہ غسل کے وقت بالکل عریاں کر دیا جاتا ہے۔ [2] مکعب عمارت سے کعبہ مراد ہے جسکا طول ۱۸ گز۔ عرض ۱۱ گز۔ اور بلندی ۱۶ گز۔ انگریزی گز کے حساب سے۔

اس نئے غلاف کو دیکھنے۔ چھونے۔ آنکھوں سے لگانے اور چومنے کے لئے چاروں طرف سے جھپٹتے ہیں اور اُس سے لپٹ لپٹ کر دعائیں مانگتے ہیں۔ یہ ایک ایسا دلکش و موثر نظارہ ہوتا ہے جس کی تصویر الفاظ میں کھینچنا غیر ممکن ہے۔ اس موقع پر بلبلوں کے پھولوں پر منڈلانے اور شمع پر پروانوں کے صدقے ہونے کی تشبیہ ایک ناقص تشبیہ ہے۔ عرب۔ ایرانی اور ہندوستانی مسلمان جن کی زبانوں کی عمارت شاعری کی بنیاد پر قایم ہے۔ اور جن کے محاورات میں ہزارہا شاعرانہ استعارات و تشبیہات بھری پڑی ہیں کعبے کو ایسے موقعوں پر اپنی نظم و نثر میں ایک دلہن سے مثال دینے لگتے ہیں جو اس کی خوشنمائی۔ زیب و زینت اور حاجیوں کے اشتیاق کی مناسبت سے تشبیہ نام ہے۔ علاوہ اس کے مسلمانوں کی یہ معمولی زبان ہے کہ ہر خوشنما و خوبصورت چیز کو دلہن کہنے لگتے ہیں۔ عیسائی چونکہ ان خدمات واثرات سے بیخبر اور ان استعارات سے نابلد ہوتے ہیں وہ ایسے الفاظ سُنکر اپنی عقل کے تیر تکے لگانے لگتے ہیں جیسا کہ برٹن کہتا ہے:-

"کعبے کو دلہن یا کنواری[1] سے تشبیہ دینے کی رسم کی اصلیت قدیم زمانے کے رواج سے پائی جاتی ہے۔ گرجے کو بھی کنواری یا دلہن سے نسبت دیتے ہیں۔ اسی طرح کعبے کو بطور عورت کے خطاب کرتے ہیں مثلاً جیسا غلاف اتر جاتا ہے تو اُسکو عریانہ (ننگی) کہتے ہیں اور جب اُس پر سفید کپڑا لپٹا دیتے ہیں تو محرمہ یعنے احرام باندھی ہوئی کہتے ہیں۔ عربی کے مشہور شاعر عبد الرحیم[2] برعی نے بھی کعبے کے دلہن ہونے کا خیال اپنے اس مصرعہ میں ظاہر کیا ہے۔ وعروسِ مکتبۃ بالکرامات تجلّی ؂

---

[1] عیسائیوں کی اصطلاح میں کنواری سے مراد حضرت مریم ہے۔ [2] شیخ عبد الرحیم برعی عاشق رسول اور عرب کے مشہور لغت گو بزرگ ان کا قصیدۂ مناجاتیہ بہت مشہور ہے۔ جسے قصیدۂ برعیہ کہتے ہیں۔ حجاز میں ان کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے ان کے قصائد اکثر بدوی عرب بڑے ذوق وشوق سے پڑھا کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے حج کے بعد پندرہ سولہ مرتبہ مدینہ منورہ جانا چاہا مگر کسی نہ کسی وجہ سے جس کے متعلق عجیب وغریب روایتیں مشہور ہیں پہنچ نہ سکے (بقیہ صفحہ پر)

یعنے کعبے کی دلہن کرامات کے ساتھ جلوہ دکھا رہی ہے۔ شاعر کا یہ خیال
غالباً کعبے کے برقعے ازار اور خواجہ سراؤں کی نگہبانی کی وجہ سے
پیدا ہوا ہے۔"

یہ ممکن ہے کہ گرچے کو دلہن یا کنواری سے تشبیہ دینا رسوم قدیم سے ہو اور حضرت مریم کی مناسبت سے اُس کو کنواری بھی کہتے ہوں مگر لفظ کعبہ میں (ہ) یا (ۃ) علامت تانیث لفظی موجود ہے اور عربی میں یہ لفظ مونث استعمال ہوتا ہے پس ازروئے قواعد اس کے لئے تمام صفات محرمہ وعریانہ وغیرہ تانیث کے برتے جاتے ہیں برٹن کا یہ کہنا کہ کعبے کا برقع و ازار و خواجہ سرا دیکھ کر حضرت عبدالرحیم برعی کو کعبے کے دلہن کہنے کا خیال پیدا ہوا ہے محض ایک قیاس ہے ورنہ لفظ کعبہ جب عربی میں مونث ہے تو اُس کے لئے لوازمات تانیث استعمال کرنا یا اُسکو دلہن کہنا کوئی حیرت کی بات نہیں ہے۔ بالفرض اگر کعبے کو مذکر تسلیم کرلیں جیسا کہ اردو میں بولتے ہیں یا تذکیر و تانیث کا کوئی امتیاز ہی نہ رکھیں جیسا کہ زبان فارسی میں اسمائے غیر ذی روح کی تذکیر و تانیث نہیں ہوتی تو بھی کعبے کو اُس کی زیبائش و خوبصورتی کے لحاظ سے دلہن کہنا مقام استعجاب نہیں ہے۔ چنانچہ فارسی و اردو میں بلالحاظ اس امر کے کہ کوئی خوشنما چیز مذکر ہو یا مونث اُسکو بطور استعارہ و مجاز دلہن یا عروس کہتے ہیں اور کعبے کی خوشنمائی و دلفریبی تو اسدرجہ مسلمہ ہے کہ فارسی میں عروس عرب ایک محاورہ ہوگیا ہے جس کے معنی کعبے کے ہیں اکثر کتب لغات میں یہ محاورہ موجود ہے اسی طرح بعض اور محاورات بھی لفظ عروس سے مرکب موجود ہیں۔ مثلاً شتران راہ کعبہ کو عروس بیابان کہتے ہیں۔ حوروں کو عروس نہار اور آفتاب کو عروس جزح کہتے ہیں۔

حضرت حافظ فرماتے ہیں:۔ نو عروسان گلستاں ہمہ زیور بستند ٭ دلبر ماست کہ با حسن خداداد آمد

(بقیہ صفحہ گزشتہ) آخری مرتبہ مکہ مدینہ کے درمیان رستے میں وادی خفیف کے متصل موضع جدیدہ میں ہجر رسول اللہ میں تڑپ تڑپ کر جان دی۔ اس مقام پر انکا مزار ہے جس پر قبہ بنا ہوا ہے۔ قبر پر غلاف پڑا رہتا ہے جس پر سنہری حرفوں میں ان کا نام بنا رہتا ہے ان کا عرس سال کے سال ہوتا ہے اور شرکت عرب و بدوی اور حجاج انکی بہت تعظیم کرتے ہیں اور اس مقام پر پہنچکر اکثر حاجی اونٹوں پر سے اتر پڑتے ہیں ٭

تحفۃ العراقین میں خاقانی نے خاص کعبہ کو عروس و حور وغیرہ الفاظ سے خطاب کیا ہے فرماتا ہے۔

مانی بہ عروس حجلہ بستہ　　در حجلۂ چارسو نشستہ
حوری بمثال عبقری[1] پوش　　شاہی بمثال دواج[2] بردوش

بعض اوقات بلا لحاظ خوبصورتی بھی بطور استعارہ کسی چیز کو عروس کہہ بیٹھتے ہیں مثلاً

عجوزہ ایست عروس جہاں ولے ہشیار　　کہ ایں مخدرہ در عقد کس نمی آید

خواجہ حافظ نے ہنر کو عروس ہنر فرمایا ہے:۔

اے عروس ہنر از دہر شکایت منما　　حجلۂ حسن بیارائے کہ داماد آمد

اردو لغات کی کتابوں میں بھی عروس کے مجازی معنی خوبصورت۔ عزیز۔ پیاری چیز لکھے ہوئے ہیں۔ اس درویش نے اپنے ایک ترجیع بند میں جو مکہ معظمہ کی تعریف میں ہے۔ حاجیوں کے جذبات اور کعبے کی زینت کی تصویر ان لفظوں میں کھینچی ہے۔

کس ٹھاٹھ کا کعبے نے جوڑا ہے نیا پہنا　　مشتاقوں کو دوبھر ہے اب اس سے جدا رہنا
کیا نور کی دلہن ہے کیا نور کا ہے گہنا　　جو نور برستا ہے اُس نور کا کیا کہنا

بالفرض اگر تم نے کل روئے زمیں دیکھا
مکہ ہی نہ جب دیکھا تو کچھ بھی نہیں دیکھا

اسی طرح ایک اور نظم میں جسکا عنوان "مشتاق کعبہ" ہے اس احقر نے غسل کعبہ کی کیفیت ان الفاظ میں ظاہر کی ہے:۔

کیوں آرہی ہیں لپٹیں مشک و گلاب کی اب　　کعبے کو کیا مطوف دلہن بنارہے ہیں

غرضکہ یہ مسلمانوں کے مذہبی جذبات ہیں اور یہ کوچۂ عشق و صیغۂ محبت ہے اسمیں غیروں کی رسائی مشکل ہے:۔

---

[1] عبقری۔ نفیس لباس۔ کہتے ہیں کہ ریگستان میں عبقر کوئی موضع ہے جہاں جنات رہتے ہیں۔ اس کی مناسبت سے عرب لوگ ہر نفیس چیز کو عبقری کہتے ہیں۔

[2] دواج۔ لحاف۔ بالاپوش۔

پرانے غلاف کعبہ کی تقسیم و فروخت۔

پرانا غلاف آج سال بھر تک لٹکے لٹکے بہت فرسودہ ہوجاتا ہے جا بجا اُس میں سوراخ پڑجاتے ہیں اور دھوپ ، مینہ ۔ اور گرد وغبار سے اُس کا رنگ مدہم پڑجاتا ہے۔ علاوہ ازیں زمانۂ حج میں کچھ تو اس رسی کی کھچاوٹ سے جو اُسمیں بندھی رہتی ہے اور ہوا چلتے وقت بہت تن جاتی ہے اور کچھ حاجیوں کے چھونے سے غلاف نیچے سے بالکل پھٹ جاتا ہے۔ بعض اوقات پرانا غلاف اتارنے وقت بڑا طوفان بے تمیزی برپا ہوتا ہے اور حاجیوں اور مکے والوں میں خوب لپہ ڈگی ہوتی ہے۔ حاجی چاہتے ہیں کہ یہ وقف ہے اس کے ٹکڑے اور دھجیاں مفت مل جائیں اور اہل مکہ اس کے دام کھڑے کرتے ہیں وہ ایک ایک دھجی کے لیئے کیا بلکہ ایک ایک ڈورے کے لئے حاجیوں کو حلال کرڈالنا مباح سمجھتے ہیں مگر رسماً پُرانا غلاف کلید بردار کعبہ کا حق ہوتا ہے۔ اور یہ حق نسلِ بعد نسلِ منتقل ہوتا ہے۔ کلید بردار سے غلاف کے مختلف چھوٹے بڑے ٹکڑے اہل مکہ خرید کر حاجیوں کے ہاتھ نفع سے فروخت کرتے ہیں بعض اوقات غلاف کے کچھ زرین ٹکڑے سلطان المعظم کے پاس قسطنطنیہ بطور تبرک روانہ کردیے جاتے ہیں یا شریف مکہ کو نذر کردیے جاتے ہیں۔ غلاف کے ٹکڑوں کی قیمت کا کوئی صحیح اندازہ نہیں ہے کم و بیش قیمت پر سات روپے گز سے پندرہ روپے گز تک مل جاتا ہے مگر اس تبرک کیساتھ بھی دغل فصل ہونے لگا ہے اور بازار میں دھڑلے کے ساتھ نقلی غلاف بھی فروخت ہوتا ہے جو ارزاں قیمت پر مل جاتا ہے اکثر لوگ بیت اللہ کے اندر بھی نقلی غلاف کے ٹکڑے فروخت کرتے پھرتے ہیں اور حاجی اصلی غلاف کے دھوکے میں خرید لیتے ہیں یہ نقلی غلاف بھی بالکل اُسی نمونہ پر بنایا جاتا ہے مگر اسکا کپڑا کسی قدر ہلکا ہوتا ہے۔ بعض حاجیوں نے اپنے سفرناموں میں بھی غلاف کا ذکر کیا ہے مگر کسی صاحب نے یہ نہ بتایا کہ نقلی غلاف کہاں سے آتا ہے اور آیا یہ کارستانی اہل ایشیا کی ہے یا اس میں بھی اہل یورپ کا کچھ دخل ہے مکۂ معظمہ میں بیت اللہ کے دروازۂ بابُ السلام کے سامنے ایک دُکان ہے جس میں غلاف فروخت ہوتا ہے بیت اللہ کے بعض دوسرے دروازوں پر بھی غلاف کے ٹکڑے بکتے ہیں اصلی غلاف (بقول بعض نیک گمان حاجیوں کے) شریف مکہ ۔ کلید بردار کعبہ یا اور معتبر

آدمیوں کے ذریعہ سے مل سکتا ہے مگر اس درویش کا نفس سرکش کلید بردار و شریف مکہ سے بہت بدگمان ہے۔ چونکہ غلاف کا بیوپار انہیں لوگوں کے ہاتھ میں ہے اس لئے قرینہ اس کا مقتضی ہے کہ یہی لوگ نقلی غلاف کہیں سے تیار کرا کے منگاتے ہوں گے اور کھلے خزانے فروخت کرتے ہوں گے۔ یہ ظاہر ہے کہ نقلی کپڑے کی کھپت اور نکاسی جس آسانی سے کسی مشہور بزاز کے ہاں ہوسکتی ہے دوسرے شخص کے پاس نہیں ہوسکتی۔ بھولے بھالے جنتی حاجی ان کے اعتبار پہ بڑی بڑی قیمت دیکر وہی مصنوعی ٹکڑے آنکھوں سے لگاتے ہوں گے اور ہوشیار اور کاٹیاں آدمیوں کو اصلی غلاف بھی مل جاتا ہوگا۔

غلاف کعبہ کی صدریاں بھی بنائی جاتی ہیں جو بادشاہوں کے لائق تحفہ سمجھی جاتی ہیں ان کے پہننے والے کی نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اُس پر کوئی ہتیار کارگر نہیں ہوتا۔ غلاف کے بڑے بڑے ٹکڑے چادر کے طور پر جنازوں پر بھی ڈالتے ہیں چھوٹی چھوٹی دھجیاں نشانی کے طور پر قرآن شریف میں رکھی جاتی ہیں یا نظر بد سے بچانے کے لئے تعویذ کی جگہ بچوں کے گلے میں ڈالی جاتی ہیں۔ مسلمانوں کے گھر میں غلاف کعبہ کا ٹکڑا موجب خیر و برکت سمجھا جاتا ہے پنجاب کی طرف کئی مسلمان عورتیں جو اپنے تئیں حاجی بتاتی ہیں۔ مختلف تبرکات کے ساتھ غلاف کا ٹکڑا بھی شہر شہر لئے پھرتی ہیں اور لوگوں کی آنکھوں سے لگا کر پیسے وصول کرتی ہیں۔ گاؤں گھوس میں جس کسی فقیر یا ملّا کے پاس اس کا ٹکڑا ہوتا ہے وہ بڑا بزرگ خیال کرتا ہے۔

غلاف کعبہ کی تقسیم و فروخت کی نسبت علماء کی رائے

غلاف کعبہ کو پھاڑ پھاڑ کر ٹکڑے کرنے اور اُس کو فروخت کرنے کے بارے میں علماء میں بڑا اختلاف ہے۔ مولوی فخر الدین قاضی خاں اپنے فتاویٰ کی کتاب الوقف میں لکھتے ہیں کہ بادشاہ وقت

---

[1] میں نے اس قسم کی بہت سی حجانی عورتوں سے بات چیت کی ہے اور مختلف سوالات مکہ معظمہ وغیرہ کے متعلق کر کے اُن کے دلوں کو ٹٹولا ہے مگر اکثر کو دھوکے باز پایا جو نا سمجھ اور خوش عقیدہ عورتوں کو ٹھگنے کے لئے اپنے کو حجن ظاہر کرتی ہیں اور بعض اوقات اس آڑ میں لوگوں کو دھوکہ بھی دیتی تھیں۔

غلاف کعبہ فروخت کر سکتا ہے اور اس کے روپیہ سے ضروریات کعبہ کی تکمیل کر سکتا ہے اور اس کے روپیہ سے ضروریات کعبہ کی تکمیل کر سکتا ہے صرف بادشاہ ہی کعبہ کا متولی ہو سکتا ہے کسی دوسرے کو یہ حق نہیں ہے۔ سراج الوہاج میں ابو بکر الحدادی نے غلاف کعبہ کا فروخت کرنا۔ ایک مقام سے دوسرے مقام پر لیجانا اس کو کاٹنا اور اس کے ٹکڑوں کا قرآن شریف میں رکھنا ناجائز قرار دیا ہے وہ فرماتے ہیں "کہ کعبے کی چیزوں میں سے اگر کوئی شخص کوئی چیز لے آئے تو اسکو واپس کر دینا چاہیئے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ ہم نے اسکو بنی شیبہ (کلید بردار کعبہ) سے خریدا ہے کیونکہ بنی شیبہ اس کے مالک نہیں ہیں"

علامہ نجم الدین طرطوسی نے اس کا قول فیصل ان اشعار میں بیان کیا ہے۔

وما علی الکعبۃ من لباس ان رث جایز بیعۃ الناس

ولا یجوز اخذہ بلا شرا للاغنیاء لیس للفقرا

جس کا مطلب یہ ہے کہ کعبے کا تو کوئی لباس ہے نہیں مگر خیر جسکو لباس کعبہ کہا جاتا ہے جب وہ پرانا ہو جائے، تو لوگوں کو اس کا فروخت کرنا جائز ہے لیکن امیروں کو بلا قیمت لینا جائز نہیں ہے البتہ غریب مفت بھی لے سکتے ہیں۔ علمائے متاخرین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ سلطان وقت کو اس کا اختیار ہے چاہے مفت دے چاہے فروخت کر دے۔ مگر اس زمانہ میں عرصۂ دراز سے بنی شیبہ غلاف کعبہ کے مالک سمجھے جاتے ہیں وہ اس کے ٹکڑے کھلے خزانے فروخت کرتے ہیں اور امیر غریب سب سے ٹکے وصول کرتے ہیں۔

کعبے پر غلاف ڈالنے کے بعد محمل کی واپسی

محمل غلاف کعبہ کی واپسی کا ذکر نہ کیا جائے تو غالباً یہ مضمون ناقص رہجائے گا۔ اس لئے مختصراً کچھہ حالات لکھے جاتے ہیں غلاف جب کعبے پر ڈال دیا جاتا ہے تو محمل خالی رہجاتا ہے اور وہ قرآن جو آتے وقت اس کی چھت میں لٹکاتے ہیں۔ اب محمل کے اندر رکھہ دیتے ہیں۔ حج ختم ہونے کے بعد محمل و مصری قافلہ براہ جدہ ینبوع ہوتا ہوا مدینۂ منورہ چلا جاتا ہے۔ محمل مصری آتے وقت کبھی مدینے ہوتا ہوا نہیں آتا بلکہ ہمیشہ واپسی پر مکے سے مدینے جاتا ہے اور عموماً صرف تین دن یا کچھہ زاید

وہاں قیام کرتا ہے۔ زمانہ سابق میں جاتے وقت بھی خشکی کا راستہ اختیار کیا جاتا تھا اب دریائی رستے سے واپس بھی ہوتی ہے قاہرہ پہنچکر محمل شہر سے باہر مقام حسوہ میں ٹھہر جاتا ہے اور پہلے حاجیوں کا قافلہ شہر میں داخل ہوتا ہے اس کے بعد دوسرے دن صبح محمل کو جلوس کے ساتھ شہر میں لیجاتے ہیں۔ سنہ۲۵ء میں جسطرح محمل کا جلوس نکلا تھا اس کی کیفیت ولیم سبن کی کتاب سے ترجمہ کرکے لکھی جاتی ہے۔

"سورج نکلنے کے آدھ گھنٹے بعد محمل کا جلوس باب النصر سے شہر میں داخل ہوا۔ محمل کے آگے آگے پیدل فوج باقاعدہ کا ایک دستہ تھا اس کے پیچھے محمل آیا پھر وہ عجیب قوی ہیکل بڑے بڑے بالوں والا سیاہ فام شخص جس کو شیخ الجمل (اونٹ والا شیخ) کہتے ہیں نکلا یہ تقریباً برہنہ صرف ایک پجامہ پہنے ہوئے اونٹ پہ سوار تھا اور ہر وقت اپنا سر ہلاتا رہتا تھا۔ گزشتہ کئی سال سے یہ شخص محمل کیساتھ مکے آتا جاتا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ وہ رستے بھر سر ہلاتا چلتا ہے سرکار سے اس کو دو اونٹ اور اخراجات سفر ملتے ہیں چند سال قبل ایک بوڑھی عورت بھی محمل کے ساتھ مکے جایا کرتی تھی اسکو ام القطاط[1] یعنے بلیوں کی ماں کہتے تھے اس کے ساتھ ہمیشہ پانچ چھ بلیاں بھی اونٹ پہ بیٹھی رہتی تھیں۔ شیخ الجمل کے پیچھے ترکی سواروں کا ایک رسالہ اور پھر کوئی بیس اونٹ جن پر سرخ و سبز خوشنما کپڑوں کے زین تھے نکلے ہر ایک اونٹ کے زین کو جھنڈیوں اور شترمرغ کے پروں سے سجایا گیا تھا اونٹوں کے گلے میں کوڑیوں کے ہار بھی پڑے تھے اس کے بعد کچھ بدوی نکلے ابھی زمیلہ تک جو قلعے کے سامنے سے بڑا میدان ہے محمل کے پہنچنے میں کوئی پاؤ گھنٹہ تھا اسوقت میں بڑی کوشش اور گھس پیٹھ کے بعد محمل کے پاس پہنچ گیا اور اسکو تین مرتبہ چھو چھو کر

[1] قط گربہ نر کو کہتے ہیں اور اسکی جمع قطوط زیادہ فصیح ہے مگر اہل مصر قط کی جمع قطاط بھی لیتے ہیں

ہیں نے اپنا ہاتھ چوما پھر محمل کی جھالر پکڑ کے اُس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ محمل کا محافظ جو پیچھے پیچھے چل رہا تھا اُس نے اول تو مجھے بُری طرح گھورا پھر درود پڑھتے ہوئے چلنے کے لئے مجھ سے کہا۔ واللہ اعلم میرے اچھے کپڑوں کو دیکھ کر یا درود پڑھنے کی وجہ سے اُس نے مجھے وہاں سے ہٹایا نہیں۔ اور محمل کی جھالر پکڑے ہوئے میں چلتا رہا۔ ورنہ دوسرے شخصوں کو وہ صرف ایک مرتبہ محمل چھو لینے دیتا تھا غرضکہ میں امبلہ تک اُسی طرح چلتا رہا جب میں نے اپنے ایک مسلمان دوست سے اسکا ذکر کیا تو اُسکو بڑا تعجب ہوا اور وہ مجھ سے کہنے لگا کہ آجتک میں نے نہیں سُنا کہ کسی شخص کو ایسا موقعہ نصیب ہوا ہو تم پر خدا کا فضل اور پیغمبر صاحب کی خاص مہربانی ہے اس کے بعد اُس نے مجھے نصیحت کی کہ اس کا ذکر کسی سے نہ کرو ورنہ لوگ تم سے حسد کرنے لگیں گے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ محمل کی اسقدر تعظیم کیوں کیجاتی ہے بہت سے لوگ اس کو بڑے جوش کے ساتھ چھو رہے تھے ایک سپاہی جب محمل کے پاس گیا تو اُس نے محمل کو مخاطب کر کے یہ الفاظ کہے۔ "اے میرے مالک تو نے مجھے حج سے محروم رکھا"[۵] جن سڑکوں پر سے محمل گزر رہا تھا وہ تماشائیوں سے کچا کچھ بھری ہوئی تھیں تمام دکانیں بند تھیں اور ان کے چبوتروں پر لوگ بیٹھے ہوئے تھے کل ایک گھنٹے میں محمل رمیلہ پہنچا۔ اس میدان کو طے کرنے کے بعد جب محمل قرامیدان[۶] میں داخل ہوا تو قلعہ سے بارہ توپوں کی سلامی

۵۔ تبرکات کی اس قسم کی تعظیم عموماً جہلا کرتے ہیں جو قابل اعتبار نہیں بیت المقدس میں حضرت عیسیٰ کے آثار و تبرکات کے ساتھ عیسائیوں کی خوش اعتقادی اس سے بدرجہا بڑھی ہوئی ہے صلیب عیسیٰ تو دینی و دنیوی تمام حاجتوں کو پوری کرنیوالی خیال کیجاتی ہے کرسمس کے موقعہ پر رومن کیتھلک عیسائیوں کے گرجوں میں حضرت مریم کا زچگی خانہ جو بنایا جاتا ہے زیارت کے قابل چیز ہے۔ ۶۔ قرامیدان تواعد کے میدان کو کہتے ہیں (بر صفحہ آئندہ)

دیگئی۔ پھر قلعہ کے شمالی دروازے کی طرف سے جسے باب الوزیر
کہتے ہیں محمل واپس ہوا ایک عجیب رسم جو اس موقع پر اور جلوس کسوۃ
کعبہ و جلوس روانگی محمل کے موقعہ پر دیکھنے میں آئے وہ یہ تھی کہ بہت
سے لڑکے غول بنا بنا کر شہر میں پھرتے ہیں ہر ایک کے ہاتھ میں کھجور
کی ایک ایک چھڑی ہوتی ہے جسے نوک سے لیکر آدھی دور تک دو تین
شاخوں میں چیر دیتے ہیں اس کو مقرعہ کہتے ہیں جب کوئی یہودی
یا عیسائی ان کو ملتا ہے تو وہ اس کو پکڑ کر کہتے ہیں "ہات العادۃ" یعنے
حسب عادت نذرانہ لا۔ جو شخص اس نذرانہ کے دینے سے جس کی مقدار
چار پانچ پیسے یا زیادہ سے زیادہ دس پیسے ہوتے ہیں انکار کرتا ہے تو
لڑکے اس کو قمچی سے شپا شپ شپا شپ جھوڑنا شروع کرتے ہیں[۱]
محمل شہر میں گشت کرتا ہوا مسجد حسینؑ کو جاتا ہے وہاں اس میں
سے قرآن نکالکر مسجد میں رکھ دیا جاتا ہے اور ادنےٰ طبقہ کے بہت
سے عورت مرد اس کی زیارت کے لئے وہاں جاتے ہیں اور اسکو
چومتے اور آنکھوں سے لگاتے ہیں"۔

خاتمہ

مضمون ختم ہوگیا مگر شوق تحریر باقی ہے۔ یہ گنہگار دو مہینے تک "غلاف کعبہ" سے لپٹا رہا آج بصد حسرت اس سے جدا ہوتا ہے کاش یہ مضمون متشرع و مقدس بزرگ کے قلم سے لکھا جاتا تو یقیناً زیادہ وقعت کی نظر سے دیکھا جاتا اور یہ درکشیں بھی اس طعن سے محفوظ رہتا:۔

اہلکارے کہ خرقہ در بر کرد
جامۂ کعبہ را جلِ خر کرد

(بقیہ مضمون صفحہ گزشتہ) قرا کے معنی سیاہ کے ہیں۔ یعنے وہ میدان جو نوبیوں کے دھوئیں سے سیاہ ہوجائے۔

[۱] ۔ ہندوستان کے اکثر شہروں میں بھی ہولی کے موقعہ پر ہندو لڑکے اور محرم میں مسلمانوں کے شریر بچے غیر مذہب والے راہگیروں کے ساتھ اسی قسم کی شرارت کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ اب میرے حال وقال کا اختلاف رفع فرمائے اور صاحب شریعت اسلامی کے احکام بجا لانے کی توفیق عطا کرے تاکہ میں اپنے نفس سے شرمندہ نہ ہوں اور مجھ کو میرے دل سے یہ آواز نہ سنائی دے :-

ترا سب ظاہر و باطن ہمیں معلوم ہے شبیر[1]
ترے افعال طفلانہ ترے اقوال پیرانہ

غزل

از سید محبوب علی صاحب اطہر حیدرآبادی

آنکھوں میں رکھیں اہل نظر بگیاں مجھے — گر اس کے در کی خاک کرے آسماں مجھے
واں میرا ذکر ہے کہ قضا نے کیا ہے یاد — رہ رہ کے آج آتی ہیں کیوں ہچکیاں مجھے
اب کیا دکھائے گردش تقدیر دیکھیے — سرمہ کی طرح پیس چکا آسماں مجھے
آئی بہار وحشت دل اور بڑھ گئی — صحرا دکھائی دیتا ہے ہر بوستاں مجھے
کیوں آئیں میری لاش پہ کیوں انکو رنج ہو — اچھا ہے خاک کردے جو سوز نہاں مجھے
ظالم کے جھوٹے وعدوں نے خاموش کر دیا — دیکر زبان - اس نے کیا بے زباں مجھے
کیا تاب لاتا تابش خورشید حشر کی — دامن ترے کرم کا ہوا سائباں مجھے
اطہر کہاں میں - اور کہاں نظم دلنشیں — استاد نے سکھائی یہ طرز بیاں مجھے

---

[1] یہ [illegible] خطاکار کی ایک غزل کا مقطع ہے جس کے بعض اشعار یہ ہیں :-

رہے کچھ دن یہاں ہم بھی ولیکن مثل اسیرانہ — جو اٹھے تو ضعیفانہ جو بیٹھے تو حقیرانہ
مجھے جھکنے نہیں دیتی مجھے دبنے نہیں دیتا — تکبر یہ گدایانہ رعونت یہ فقیرانہ
کہیں کس سے نہیں کس سے کہاں جائیں کدھر دوڑیں — مزاج اپنا مریضانہ قویٰ اپنے امیرانہ
جو مسجد سے ہوئے پروا وہ کب خاطر میں لاتا ہے — در دربار شاہانہ در ایوان وزیرانہ

بشاشت

از جناب مولوی محمد نجم الغنی صاحب قریشی

میں خوشی پر بشاشت کو ترجیح دیتا ہوں۔ میں اول الذکر کو ایک فعل اور آخر الذکر کو طبیعی خیال کرتا ہوں۔ خوشی ایک فعل ہوتا ہے اور بشاشت مستقل اور دائمی ہوتی ہے۔ جن لوگوں کو اکثر انتہائی خوشی ہوتی ہے انہیں لوگوں کو اسی نسبت سے غم میں بھی مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ برخلاف اس کے بشاش رہنے سے ہم کو وہ بات نصیب نہیں ہوتی جو خوشی سے حاصل ہوتی ہے مگر ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ ہم غم کے گڑھے میں گرنے سے بچ جاتے ہیں خوشی بجلی کی چمک کی مانند ہوتی ہے جو ذرا سی دیر کے لئے بادلوں میں چمک کر غائب ہو جاتی ہے بشاش رہنے سے دماغ میں ایک قسم کی پائدار روشنی قایم رہتی ہے اور ہم مستعد اور ہمیشہ متین رہتے ہیں۔

وہ لوگ جو اصولوں کی سختی سے پابندی کرتے ہیں خوشی کو آزمایش کی حالت کا سخت ترین موقع سمجھتے ہیں اس وجہ سے کہ خوشی کے وقت انسان کے دل میں ایک قسم کا جوش اور ایک خاص قسم کی شوخی پیدا ہو جاتی ہے اس لئے یہ حالت زندگی کی اُس حالت سے مختلف ہوتی ہے جس میں ہر لمحہ بڑے سے بڑے خطرے میں مبتلا ہو جانے کا خدشہ لگا رہتا ہے۔

بشاشت کے لئے ان اقسام کی ذمہ داریوں میں سے کوئی استثنا نہیں ہے یہ سنجیدگی اور اطمینان کی قسموں میں سے ایک قسم ہے یہ طبیعت کو انسانیت کی موجودہ اطمینانی حالت سے نامناسب حالت کی طرف بھٹکنے نہیں دیتی اور اُن لوگوں کے کیرکٹروں میں یہ ایک ضروری چیز سمجھی جاتی ہے جو بت پرستوں میں فیلسوف مانے جاتے ہیں اور اُن لوگوں کے لئے بھی یہ ایک معروف چیز جنہوں نے عیسائیت میں بزرگی اور پارسائی کا رتبہ پایا ہے۔

اگر ہم بشاشت کے مسئلہ پر تین نسبتوں سے غور کریں یعنے اپنی نسبت اور دوسروں کی نسبت جن سے ہم بات چیت کرتے ہیں اور اللہ عزوجل کی نسبت۔ تو یہ مسئلہ

ان تینوں نسبتوں میں سے ہر ایک نسبت پر پورا پورا اترتا ہے ایک شخص جس کو اعلیٰ درجے کی طبیعت عطا ہوئی ہے تو اُس کے خیالات صرف اعلیٰ ہی نہیں ہوتے بلکہ اُسکو اپنی روح کے تمام شعبوں کی قوتوں پر کامل قدرت حاصل ہوتی ہے اُس کا تخیل سلجھا ہوا ہوتا ہے اور اُس کا فیصلہ ناقابل تنسیخ۔ اُس کے مزاج میں یکسانیت اور توازن پایا جاتا ہے یہ سب باتیں اُس میں ہر وقت پائی جاتی ہیں خواہ وہ مصروف ہو یا تنہا۔ قدرت نے جو نیک کام اُس کے لئے بنائے ہیں وہ ان کو ضرور کرتا ہے ہر جائز خوشی سے فائدہ اٹھاتا ہے اور اُن غموں سے جن میں اتفاقی طور پر وہ مبتلا ہو جائے اپنے آپ کو زیادہ متاثر نہیں ہونے دیتا۔

اگر ہم اس شخص کو اُن لوگوں کے سلسلے میں شمار کریں جن سے وہ بات چیت کرتا ہے تو اُس سے لوگوں کی قدرتی محبت پیدا ہو جاتی ہے اور لوگ اُس کی نسبت اچھی رائے قایم کرتے ہیں۔ بشاش رہنے والا شخص صرف صاحب مروت اور ممنون ہونے والا ہی نہیں ہوتا بلکہ جن لوگوں سے وہ گفتگو کرتا ہے اُن کو بھی اپنا ہی جیسا بنا لیتا ہے ایک شخص اپنے آپ کو بہت خوش پاتا ہے اُسے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کا سبب کیا ہے مگر اس کا سبب اُس کے ساتھی کا بشاش رہنا ہے۔ بشاشت ایک قسم کی اچانک روشنی ہوتی ہے جو طبیعت میں پوشیدہ خوشی کو نامعلوم طریقہ سے پیدا کر دیتی ہے۔ دل خود بخود خوشی سے لبریز ہو جاتا ہے اور قدرتی طور سے دوستی اور خیر خواہی کے لئے اُن لوگوں کی طرف بڑھتا ہے جنہوں نے اُس پر ایسا اثر ڈالا ہو۔

جب میں بشاش رہنے کے مسئلہ کی تیسری نسبت پر غور کرتا ہوں تو دل یہی چاہتا ہے کہ قدرت کی مسلسل شکر گزاری میں مصروف رہوں۔ اندرونی طور سے بشاش رہنا ہی قدرت کی مکمل عبادت اور شکر گزاری میں داخل ہے ہم کسی حالت میں بھی ہوں مگر اس سے ایک قسم کی تسلیم و رضا ظاہر ہوتی ہے اور اس طریقہ گویا انسان پوشیدہ طریقہ سے قدرت کی رضا جوئی کرتا رہتا ہے۔

میری رائے میں صرف دو چیزیں ایسی ہیں جو یقیناً ہمکو بشاشت سے محروم کر دیتی ہیں۔ ان میں سے ایک گناہ کی طرف مائل ہونا ہے۔ وہ شخص جسکا میلان

بدی کی طرف ہوتا ہے اس کو سکون اور اطمینان قلب نصیب نہیں ہوتا جس پر روح کی صحت کا انحصار ہے اور جو نیکی اور معصومیت کا قدرتی وسیلہ ہے بدکار آدمی سے بشاشت کوسوں دور رہتی ہے اگر بدکار آدمی کے لئے بشاشت کے مرادف کوئی لفظ زبان میں ڈھونڈا جائے تو نہیں ملسکتا بلکہ ایسا لفظ تلاش کرنا چاہیئے جو سینکڑوں درجہ حماقت یا دیوانگی سے بڑھا چڑھا ہو۔

دہریت یعنے خدا کی ہستی سے انکار کرنا یہ بات بھی ایسی ہے جس سے انسان بشاشت سے بالکل محروم ہوجاتا ہے خدا کی ہستی کو نہ ماننا فطرت انسانی کے لئے ایک ایسا خاص قسم کا سخت ترین جرم ہے جس کی تشریح ناممکن ہے بلکہ حیرت ہوتی ہے کہ بظاہر بڑے بڑے سمجھدار لوگوں کے دلمیں اس قسم کے خیالات کیونکر پیدا ہوجاتے ہیں یہ بلاخوف و تردید کہا جاسکتا ہے کہ خدا کی ہستی ایک ایسی ہستی ہے جس میں شک و شبہ کی ذرا بھی گنجائش نہیں ہے اور یہی ایک ایسی برحق ہستی ہے جس پر ہمکو یقین کامل رکھنا چاہیئے یہی حقیقت میں وہ ہستی ہے جس کا پرتو ہم ہر چیز میں، ہر واقعہ میں اور ہر خیال میں پاتے ہیں اگر ہم خدا کی ہستی سے انکار کرنیوالے گروہ کے ہر فرد کے کیرکٹر کو غائر نگاہوں سے دیکھیں تو ہمکو معلوم ہوجائے گا کہ ہر شخص غرور، غصہ اور بات بات پر نکتہ چینی کے خمیر سے بنا ہوا ہے۔ دراصل یہ تعجب کی بات نہیں ہے اگر لوگ کسی قسم کی بےچینی رکھتے ہوں تو ایسا دوسروں کے ساتھ کیوں ہو اور ایسے شخص کے لئے یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ خود اس قدر بےچین کیوں نہ ہو جس کی ہستی ہر وقت خطرہ میں رہتی ہے ایسے شخص سے کسی کو کوئی نفع بھی نہیں پہنچتا۔

بدکردار اور خدا کی ہستی کے منکر اگر بشاش رہنے کے لئے نامعقول جدوجہد بھی کریں تو یقین مانیئے کہ ان کو اسکا شائبہ تک نصیب نہیں ہوسکتا وہ لوگ جو اسی سبب سے عذاب، بربادی اور بدبختی میں مبتلا رہتے ہیں ان کے لئے یہ ناممکن ہے کہ وہ کسی حالت میں خوش رہ سکیں اور دنیا کی لذتوں سے فائدہ اٹھا سکیں۔

دو بڑے اصول جو بیان کئے گئے ہیں یہ فطرتاً اور اصولاً بشاش رہنے کے

منافی ہیں۔ ان کے بعد میں کسی اور دوسری چیز کو ان کے مماثل نہیں سمجھتا جو بدکردار آدمی کے دل سے اس عجیب و غریب چیز کو نکال سکے۔ دکھ، درد، شرم، ملامت، افلاس اور ضعیفی۔ یہی نہیں بلکہ خود موت کا بھی اگر خیال کیا جائے اور ان سب چیزوں کے قیام کے اختصار پر غور کیا جائے اور ان سے جو فوائد مترتب ہوتے ہیں اُن پر بھی اک نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ سب چیزیں بھی بُرائی کے نام سے موسوم کئے جانے کی مستحق نہیں ہو سکتیں۔ سمجھدار آدمی ان سب باتوں کو صبر و شکر سے، حلم و بردباری سے اور ہشاش بشاش رہکر برداشت کریگا۔ سمندر کا خطرناک سے خطرناک طوفان بھی اُسکو مایوس نہیں کر سکتا اس وجہ سے کہ وہ جہاز میں اطمینان سے بیٹھا ہوا ایک خوشگوار بندرگاہ پر پہنچنے کے لئے قدرت سے لو لگائے ہوئے ہے اور اس کے ساتھ یقین کامل بھی رکھتا ہے۔

ایک شخص جو قدرت کی مشیّت پر صحیح اُصولوں کا پابند رہکر چلتا ہے اُس کے لئے بشاش رہنے کے دو دائمی ذرایع اپنی آغوش کھولے رہتے ہیں ایک یہ ہے کہ وہ اپنی ناچیز ہستی پر غور و خوص کرتا رہے اور دوسرا یہ ہے کہ اللہ عزوجل کی عبودیت کا ہر حالت میں اقرار کرتا رہے اگر اپنی ہستی پر غور کیا جائے تو ہمکو اس بات سے حقیقی مسرت ہوتی ہے کہ جو ہستی قدرت نے ہمکو عطا کی ہے وہ لاتعداد ہستنوں کے گزر جانے کے بعد بھی (ایک نئی ہستی ہے جب اس کی ابتدا اور انتہا پہ غور کیا جاتا ہے اور دوسرے شعبوں پہ نظر غائر ڈالی جاتی ہے کہ اپنی ابتدا سے چند ہی سال میں انہوں نے کس قدر حیرت انگیز ترقی کی ہے اور یہ ترقی ان شعبوں کی تکمیل کا باعث ہو گی اور اس تکمیل سے خوشیوں میں اضافہ ہو گا تو خدا کے شکر و مباہات کے بے انتہا جذبات دل میں خود بخود پیدا ہو جاتے ہیں راستباز آدمی کو اس قسم کی آگاہی سے دائمی روحی مسرت ہوتی ہے اور یہ باتیں اُسکو ہر گھڑی خوش و خرم رکھتی ہیں مگر اس کو یہ علم ہونے نہیں پاتا کہ وہ کیوں اسقدر خوش و خرم رہتا ہے۔

سمجھدار آدمی کے لئے بشاش رہنے کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ اللہ عزوجل کا خیال ہر وقت اور ہر حالت میں دل میں رکھے یہ وہ بزرگ و برتر ہستی ہے کہ دنیا و

مافیہا اس کی ادنیٰ سی قدرت نمائی کا ادنیٰ کرشمہ ہے مگر ہمکو یہ سب باتیں کس قدر شاندار، پرشوکت اور عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ اللہ عزوجل ہمکو ہر جگہ اپنی عنایتوں سے سرفراز کرتا رہتا ہے اور یہی چاہتا ہے کہ ہمکو ہر طریقہ سے خوش و خرم رکھے اُس کی برتری، سچائی اور شبیت یہی چاہتی رہتی ہے کہ اُن لوگوں کو جو اُس سے نیکی کی توفیق چاہتے ہیں ہمیشہ شاداں و فرحاں رکھے۔

ہر شخص کو چاہیئے کہ ان خیالات پر غور و خوص کرتا رہے اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ ہر قسم کی کمزوری اور برائی کے خیالات دل سے نکل جائیں گے۔ اس قسم کے خیالات اُن لوگوں کے دل میں جن پر کوئی خاص مصیبت نہیں آتی چکر لگاتے رہتے ہیں کسی برائی سے جو تکلیف ہمکو محسوس ہوتی ہے، پریشاں کن ضرور ہوتی ہے اگر اس پریشانی میں خوشی اور حماقت کے چھوٹے چھوٹے واقعات کا اور اضافہ کر دیا جائے تو صبر و استقلال ہاتھ سے جاتا رہے گا مگر اس پریشانی میں اگر صبر و استقلال سے کام لیا جائے تو ہمارے دل میں ایک قسم کا سکون اور اطمینان پیدا ہو جاتا ہے اور یہ بات ہماری خوشی کا باعث ہوتی ہے ہم سے بات چیت کرنے والے بھی خوش ہوں گے اور ہمارا خدا بھی خوش ہوگا۔ جسم کو خوش رکھنا ہمارا فرض ہے۔

یہاں تک جو بیان ہوا ہے اس میں بشاشت کے متعلق خلقی طبیعی تصلت پر غور کیا گیا ہے اور ساتھ ہی اس کے ایسے اسباب بیان کئے گئے ہیں جن پر انسان کاربند ہوکر اور ہشاش بشاش رہ کر اپنی روح کو تر و تازہ اور زندہ رکھ سکتا ہے اچھا! آؤ اب بشاشت کی نظری حالت پر غور کریں اور اُن اسباب پر روشنی ڈالیں جنکا اچھائی یا برائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

بشاشت کا سب سے پہلا کام یہ ہے کہ انسان کی صحت کو ترقی دیتی ہے برخلاف اس کے کڑھن اور راندردنی رنج و غم دل و دماغ کے ریشوں کو نامعلوم طریقہ سے صدمہ پہنچاتے رہتے ہیں اور اس صدمہ سے جسم کی مشین کو بتدریج نقصان پہنچا رہتا ہے اس کے علاوہ ان چیزوں سے خون میں ایک قسم کا عنصر ہیجان اور حیوانی جذبات میں جو رکاوٹیں پیدا ہوتی رہتی ہیں ان کا تو ذکر کرنا ہی فضول ہے۔

بشاشت کا جیسا گہرا تعلق جسم سے ہے ویسا ہی طبیعت سے بھی ہے یہ تمام تفکرات اور پریشانیوں کو رفع کرتی ہے، غصے کے جذبات کو ٹھنڈا کرتی ہے اور روح کو دائمی حالت سکون میں رکھتی ہے جس دنیا میں ہم پیدا کئے گئے ہیں اسمیں ایسی چیزیں بیشمار موجود ہیں جن سے ہم اپنی طبیعت کو خوش و خرم رکھہ سکتے ہیں۔

اگر ہم خیال کریں کہ دنیا انسان کے قبضہ میں ہے تو یقینی یہ خیال ہوگا کہ دنیا ہمارے ہی واسطے بنائی گئی ہے ا اگر ہم قدرتی خوبصورتی اور دلچسپیوں کے متعلق خیال کریں تو اس سے یہ نتیجہ نکلیگا کہ دنیا ہمارے عیش و آرام کے لئے بنائی گئی ہے سورج جو دنیا کی سب سے بڑی جان بخش شے ہے ہماری زندگی کے لئے ہر قسم کا ضروری سامان مہیا کرتا رہتا ہے اور انسان کی طبیعت کو بشاش رکھنے اور دلکو خوش رکھنے کا ایک خاص ذریعہ ہے۔

وہ مختلف پرندے جو دنیا میں پیدا کئے گئے ہیں ہماری پرورش کا ذریعہ ہیں اور اُن کے دل خوش کن نغمے ہمارے لئے سامان مسرت مہیا کرنے والے ہیں۔ چشمے، دریا اور جھیلوں کے منظر سے طبیعت میں ایک قسم کی تازگی پیدا ہوتی ہے۔

بڑے بڑے مبصروں نے دلائل سے ثابت کیا ہے کہ تمام دنیا بہ نسبت اور رنگوں کے سبز رنگ سے بھری ہوئی ہے اور سبز رنگ روشنی اور سایہ کا ایک ایسا صحیح مرکب ہے جس سے بصارت کو کسی قسم کا نقصان یا کمزوری پہنچنے کی بجائے اُس کو آرام اور تقویت پہنچتی ہے اسی وجہ سے بہت سے مصور اپنی آنکھوں کے سامنے سبز کپڑا لٹکائے رہتے ہیں جس سے اُن کی بینائی کو خواہ وہ اپنے فن میں کتنی ہی محنت کیوں نہ کریں۔ کوئی نقصان نہیں پہنچتا **سر اڈاک نیوٹن** نے اس کے وجوہ جو بیان کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

”تمام رنگ جو زیادہ شوخ ہوتے ہیں اُن حیوانی جذبات کو جن کا تعلق بصارت سے ہوتا ہے مغلوب اور پریشان کرتے رہتے ہیں برخلاف اس کے وہ رنگ جو زیادہ دھندلے ہوتے ہیں اُن سے حیوانی جذبات کافی طور پر کام نہیں کرتے جب کرنوں کے دیکھنے سے ہمارے تخیلہ میں سبز رنگ کا خیال پیدا ہو جائے تو اس صورت میں کرنیں بصارت پر ایسی مناسب نسبت سے گرتی ہیں کہ جذبات حیوانی یکساں حالت میں

کام کرتے رہتے ہیں اور کرنوں اور جذبات حیوانی میں برابری کی حیثیت سے کشمکش ہوتی رہتی ہے جس سے طبیعت میں خوشی اور خرمی کے احساسات پیدا ہو جاتے ہیں"۔

اس کے اسباب خواہ کچھ ہی ہوں مگر اس کا نتیجہ یقینی ہے اسی وجہ سے شعرا بہر رنگ میں خاص طور سے طبیعت کو خوش کرنے والی صفت بیان کرتے ہیں۔

قدرت کے کاموں میں ان دونوں اغراض پر غور کرنے کے لئے کہ وہ کیسے مفید ہوتے ہیں اور اپنی خوبصورتی کیوجہ سے دلکو اپنی طرف کیسا کھینچتے ہیں ہم کو نباتی دنیا پر غور کرنا چاہیئے۔ ان کے نہایت ضروری حصے بہت ہی لطیف اور خوبصورت ہوتے ہیں اور وہ تخم ہوتے ہیں جن سے پودوں کی نسل چلتی اور بڑھتی ہے اور اسی وجہ سے وہ پھولوں یا کلیوں میں رہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے انہیں اپنے اس ارادہ کو پوشیدہ رکھا ہے کہ ظاہر میں ان کی سرسبزی اور شادابی میں مصروف رہے اور شاداب ہو اس کے اپنی بقا کا راز بھی انہیں مضمر رکھے اسی طرح ایک کسان یا باغبان بھی یہ چاہتا ہے کہ تمام ملک کو باغ بنا دے اور اس کے باغ کا ہر درخت پھل پھول لائے مگر اس کے دل میں صرف یہ ہی خیال ہوتا ہے کہ فصل اچھی ہو اور اس کے نفع میں اضافہ ہو۔

یہ بات بھی غور کرنے کے قابل ہے کہ وہ معمولی معمولی چیزیں مثلاً پہاڑوں کی قدرتی سرسبزی اور شادابی، آبشار، صحرا اور اسی قسم کے قدرتی مناظر جس کی نسبت ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان چیزوں سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، قدرت نے ان ہی چیزوں میں ایک قسم کی ایسی دلربایانہ کشش پیدا کر دی ہے اور اس خصوص میں اس احتیاط سے کام لیا ہے کہ یہ ہی چیزیں انسان کی طبیعت میں بشاشت اور خرمی پیدا کر دیتی ہیں وہ لوگ جنہیں فلسفہ میں دخل ہے جب وہ یہ دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی چیز اپنے اصلی خواص میں نظر آتی ہے تو اس سے کوئی خوشی حاصل نہیں ہوتی۔ مگر جب وہ اس بات پر غور کرتے ہیں تو اس خیال کو بہت بلند کر سکتے ہیں کہ "قدرت نے ان چیزوں کو ایسی قوت کیوں دی ہے جو ہمارے دل میں اُن کے ذائقہ، رنگ، آواز، خوشبو، سردی اور گرمی سے تخیلی ذوق پیدا ہو جاتا ہے"۔ اس سے قدرت کا سوائے اس کے اور کیا مقصد ہو سکتا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ حیثیت رکھنے والے

آدمی کی طبیعت میں بھی ان چیزوں کے صفات سے خوشگوار جذبات پیدا ہوں۔
الغرض تمام دنیا اس قسم کی چیزوں سے بھری پڑی ہے جن کے دیکھنے یا اُن کے تصور سے انسان کے دل میں خوشی، خرمی اور ستایش کے جذبات پیدا ہو جاتے ہیں۔

دن اور رات کے انقلاب، موسموں کی تبدیلی اور اس تبدیلی سے جو انقلاب وقوع ہوا کرتے ہیں، انسان اپنے ذاتی خیالات سے ان باتوں پہ غور کر کے اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ یہ سب باتیں انسان کی طبیعت میں یکے بعد دیگرے کیسے کیسے مسرت کے خیالات پیدا کرتی رہتی ہیں۔

میں یہاں دلچسپی کے مصنوعی ساماں کا جو دوستی سے، کتابوں سے، گفتگو سے اور زندگی کے اتفاقی مشاغل سے حاصل ہوتے رہتے ہیں ذکر نہیں کروں گا اس وجہ سے کہ میں یہاں خوشی پیدا کرنیوالے انھیں اسباب کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جو ہر مرتبہ کے شخص کو میسر آسکتے ہیں تاکہ میں اِن سے کافی وضاحت کے ساتھ ثابت کر سکوں کہ قدرت نے دنیا میں مخلوق کو اس لئے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ اپنی طبیعت میں اندرونی پیچ و تاب، غم و غصہ اور کڑھن رکھے یا انسان کی طبیعت ملول اور رنجیدہ ہے ہر شخص کو چاہیے کہ وہ اپنی طبیعت کو برائی کی طرف نہ بھٹکنے دے اور ساتھ ہی اس کے دل میں پاکیزہ خیالات رکھے جن سے طبیعت میں اطمینان اور سکون پیدا ہو اور اس کو اس قابل کردے کہ اگر کوئی مصیبت یا آفت میں بھی وہ مبتلا ہو جائے تو اس کو ہشاش بشاش رہکر برداشت کرے۔ ان خیالات کی اصولی ترقی سے انسان کی طبیعت میں آسودگی، خرمی اور لازوال خوشی پیدا ہو جائیگی۔

پیشتر اس کے کہ میں ناظرین کو دنیا کی انتہائی خوبیوں کی طرف متوجہ کروں مجھے اس بات کا اقرار ہے کہ دنیا میں برائیاں بھی بہت سی ہیں جو انہیں اچھائیوں سے جو ہمیں میسر ہیں قدرتی طور پہ پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اطمینان اور آسودگی سے زندگی بسر کرنے کے جن طریقوں کو بیان کیا گیا ہے اگر انسان ان پہ اصولاً کاربند ہو کر چلے تو یہ برائیاں انسان کی طبیعت کو متاثر نہیں کر سکتیں۔ قدرت کے کاموں میں اچھائی اور برائی۔ خوشی اور غم کے متعلق مسٹر لوک نے اپنے

اپنے ایک مضمون میں جو قدرتی وجوہ بیان کئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں :-
"قطع نظر اور سب باتوں کے ہم کو ایک دوسرا سبب یہ بھی ملتا ہے
کہ خدا نے اُن تمام چیزوں میں جن کا ہمارے خیالات اور احساسات
سے تعلق ہے خوشی اور غم کے نشیب و فراز کیوں پیدا کر دیے ہیں
اور ان کو ایک دوسرے میں کیوں مخلوط کر دیا ہے اس کی وجہ
یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہم اُن تمام خوشیوں کو جو ہمیں دنیا میں حاصل
ہوتی ہیں ناکافی، غیر تشفی بخش اور سچی خوشی سے معرا سمجھ کر اللہ
عزوجل سے لو لگائیں جس کے پاس لازوال خوشیوں کا انمول خزانہ ہے"

رات کے پچھلے پہر مور کی پکار

از جناب مولوی میر سعادت حسین صاحب نجیب

ہائے کیا آواز تھی کیسی تھی یہ پیاری صدا　　جس نے مجھکو خواب سے چونکا دیا تڑپا دیا
ہائے میں اچھی طرح سننے نہیں پایا اُسے　　چاند یا لیکر نسیم صبح کا جھونکا اُسے
نیند ماتا نہ سمجھا میں کہ کیا آواز تھی　　نغمۂ جاں سوز مطرب یا صدائے ساز تھی
زمزمہ طوطی کا تھا بلبل کی یا چہکار تھی　　کوک کوئل کی تھی یا تھی پپیہے کی پہ پی
کونسا طائر الٰہی یہ ترنم ریز تھا　　جس کا نغمہ ایسا حسرت خیز درد انگیز تھا

اے طلیم بذح پیغمبر تو ہے غماز چمن　　تجھ ہی سے معلوم ہوتے ہیں ہمیں راز چمن
ساز کے مانند ہیں تجھ میں صدائیں بیشمار　　تار کی صورت نسوں میں ہو جوش ہیں نغمہ ہزار

پھر بس سننا چاہتا ہوں وہ نوائے دلفریب اک ذرا پھر لا دے مجھ تک وہ صدائے دلفریب

شرق کی جانب سے آئی پھر ہوا مستانہ وار اور وہ ہی ہمراہ اپنے لیکے صوت خوشگوار
ہائے یہ آواز ہے طاؤس رقصاں کی پکار جس کو سنتے ہی مرا دل ہو گیا پھر بیقرار
سن لیا ہے جب سے بیرے لب پہ آہ سرد ہے ہائے اس آواز میں کیا لوچ ہے کیا درد ہے

میرے پیارے مور نیلا کس لئے نالاں ہے تو کیا تری جاں پہ بنی ہے کس لئے گریاں ہے تو
رقص کرتے کرتے ایسا کس لئے روتا ہے تو آنسوؤں سے اپنا منہ کس واسطے دھوتا ہے تو
سوز داغ جسم نے کیا ہائے پھونکا ہے تجھے کیوں یہ کیسی آہ و زاری ہے بتا کیا ہے تجھے

صبح کو باقی بہت کچھ دیر ہے اے بیقرار چاند ابھی ڈوبا نہیں تارے ابھی ہیں آشکار
نیند میں ہیں عندلیب زار بالائے گلاب سرو پر قمری ہے آموں پر ہے کوئل محو خواب
سو رہے ہیں سب کے سب خاموش ہے سارا جہاں استراحت میں ہیں سب راحت سے تو بیزار

ہاں بلے بس سمجھا درد الفت نے ستایا ہے تجھے اتنی جلدی خواب راحت سے جگایا ہے تجھے
کس کی الفت ؟ اُسکی جس نے دی ہے یہ صورت تجھے ایسی گردن ایسی دُم اسطرح کی رنگت تجھے
آہ کہکر رو رہا ہے کیا اُسی کی یاد میں جس نے یہ تاثیر بھر دی ہے تری فریاد میں
ہے اگر ایسا تو سب عشاق میں اول ہے تو یعنی اے طاؤس سب مخلوق میں افضل ہے تو

کیونکہ جو کرتا ہے خالق کی عبادت اسطرح

اے بجیب افضل نہو مخلوق میں وہ کسطرح

دنیا سے گئے جب تو یہ انجام ہوا پہلے تو بہت نعش پہ کہرام ہوا
ملفوف کفن میں کر کے یاروں نے عدیل مٹی میں ملا دیا تو آرام ہوا

(عدیل کنتوری)

رضیہ سلطان

از جناب مولوی محب حسین صاحب ایڈیٹر معلم نسواں

تاریخ فرشتہ میں لکھا ہے کہ جس قدر اوصاف بادشاہان عاقل اور صاحب الرائے کے لئے ضروری ہیں وہ سب سلطان رضیہ میں موجود تھے صاحب نظر اور کاردان اشخاص اس لائق و فائق عورت میں کسی قسم کا کوئی عیب و نقص نہیں پاتے تھے وہ قرآن مجید سمجھکر پڑھتی تھی اور بعض علوم و فنون سے بقدر احتیاج واقف تھی۔ اپنے باپ کے زمانۂ حکومت میں وہ مہمات ملکی میں دخل دیتی تھی اور فرمانروائی کرتی تھی چونکہ اُس کا باپ اسمیں بہت ہی بڑی عقل اور فراست مشاہدہ کرتا تھا اس لئے وہ اُسکو امور سلطنت میں دخل دینے سے نہیں منع کرتا تھا بلکہ جب وہ ملک گوالیار فتح کرکے واپس آیا اُسوقت اُس نے چند اراکین سلطنت کو جمع کرکے اپنی بیٹی رضیہ بیگم کو اپنا ولیعہد مقرر کیا۔

امرائے موصوف نے سلطان سے کہا "جب آپ کے قابل و لائق لڑکے موجود ہیں تو پھر اس صورت میں آپ کیوں لڑکی کو اپنا ولیعہد مقرر فرماتے ہیں" اس کے جواب میں سلطان نے کہا "میرے لڑکے شرب خمر اور اقسام مناہی اور ہوا پرستی میں مبتلا ہیں اور بار سلطنت اٹھانے کی قابلیت نہیں رکھتے ہیں۔ رضیہ گو عورت ہے مگر حقیقت میں مرد ہے اور ایسے لڑکوں سے بہتر ہے۔

القصہ ۶۳۴ھ میں سلطان رضیہ سریر سلطنت پر جلوہ افروز ہوئی۔ اور لباس مردانہ پہنکر اور تاج زرین سر پر رکھ کے اس نے دربار عام کیا اور وہ شرعی پردے کے ساتھ جس میں چہرے اور ہاتھوں کا ڈھاکنا ضرور نہیں دربار عام میں تخت حکومت پر بیٹھی۔ اس نے وہ تمام ضوابط و قواعد شمسی از سر نو جاری کئے جو عہد حکومت میں سلطان رکن الدین فیروز شاہ میں بیکار اور مہمل ہو گئے تھے اور وہ عدالت و رحم و کرم کے ساتھ بکار و بار حکومت چلاتی تھی۔

جب سلطان رضیہ ممالک ہندوستان کی شہنشاہ ہوئی تو بعض عمائد سلطنت نے

بغاوت اختیار کی اور نظام الملک محمد جنیدی وزیر سلطنت۔ ملک علاء الدین شیرخانی ملک سیف الدین کوچی ملک اعزالدین کبیرخانی وغیرہ امراء شہر دہلی کے قریب جمع ہوئے اور انھوں نے سلطان رضیہ کی علانیہ مخالفت شروع کی اور ہند کے مختلف صوبوں کو بغرض ترغیب و تحریص بغاوت خطوط تحریر کئے ملک نصیر خاں جاگیردار ملک اودھ بقصد امداد ملکہ ممدوحہ دہلی کیجانب رجوع ہوا۔ جب یہ جاگیردار دہلی کے قریب پہنچا تو امرائے مخالف مذکورہ بالا نے اسکو لڑبھڑ کر قید کر لیا۔ اور وہ اسی حالت میں بباعث کبرسنی راہی ملک بقا ہوا۔ مگر سلطان رضیہ نے اپنی عمدہ تدبیر اور لائق رائے سے ان تمام باغی امیروں کے مجمع کو درہم و برہم کر دیا اور سب میں انتشار و پریشانی پھیلادی ان میں سے ہر اک امیر ایک ایک طرف بھاگا اور سلطان رضیہ نے اُن کا تعاقب کیا بعد ازآں اُس نے ملک سیف الدین کوچی اور اس کے بھائی کو گرفتار کر کے قتل کرا دیا۔ اور ملک علاء الدین شیرخانی سرحد کابل پر مارا گیا اور اُس کا سر دہلی میں لایا گیا اور ملک نظام الملک وزیر ریاست سرمور کے پہاڑوں میں بھاگ کر فوت ہوا۔

جب سلطان رضیہ کی حکومت کو قوت حاصل ہوئی اور اُس کی مملکت میں تسلط ہوا تو اس نے خواجہ مہدی غزنوی کو جو ملک نظام الملک جنیدی وزیر سابق کا نائب تھا اپنا وزیر مقرر کیا اور اُسکو نظام الملک کا خطاب عطا فرمایا۔ ملک سیف الدین ایبک کو قتلغخاں کا خطاب دیکر نائب لشکر معین کیا اور ملک اعزالدین کبیرخانی کو جسنے اسکی اطاعت کی تھی صوبہ لاہور تفویض کیا اور ممالک لکھنوتی اور دیول و سندھ وغیرہ بلاد مختلف امرا کے سپرد کئے۔ اسی لائق عورت کے زمانے میں جن مسلمانوں کو ہندوؤں نے قلعۂ رنتھنبور میں سلطان شمس الدین التمش کے عہد حکومت سے محصور کیا تھا اُنھوں نے رہائی پائی ۶۳۷ھ میں جب حاکم لاہور نے اطاعت سے انحراف کیا تو سلطان رضیہ نے خود لشکر آراستہ کر کے اُس پہ چڑھائی کی اور اُسکو زیر کیا۔ اُسی سال ملک التونیہ جو حاکم بھٹنڈہ نے جو ترکان چہلگانی سے تھا علم بغاوت بلند کیا اور سلطان رضیہ اُس کی سرکوبی کے لئے بہت بڑا لشکر جمع کر کے روانہ ہوئی۔ مگر بدقسمتی سے اس لڑائی میں وہ قید ہوگئی۔ امرائے ترک نے سلطان رضیہ کو

مقید کر کے قلعہ بھٹنڈہ میں رکھا اور بہرام شاہ بن شمس الدین التمش کو تخت پر بٹھایا۔
آخرکار ملک التونیہ حاکم بھٹنڈہ نے سلطان رضیہ کے ساتھ نکاح کیا تھوڑی ہی مدت میں سلطان رضیہ نے ملک التونیہ کو ملا کر اور گکھروں۔ جاٹوں۔ اور اطراف و جوانب کے زمینداروں کو جمع کر کے اور چند امراء سلطنت سے سازش کر کے دہلی پر لشکر کشی کی اور اپنے بھائی بہرام شاہ پر حملہ کیا۔
بہرام شاہ نے بھی بسرداری ملک اعز الدین بلبن ایک بہت بڑا لشکر اس کے مقابلہ کے لئے روانہ کیا ان دونوں لشکروں کی باہمی جنگ و جدال کے بعد سلطان رضیہ کو شکست نصیب ہوئی اور وہ قلعہ بھٹنڈہ میں بھاگ کر چھپی۔ مگر اس نے تھوڑی مدت میں اپنے پراگندہ لشکر کو بڑے استقلال کے ساتھ جمع کیا اور پھر دہلی پر چڑھائی کی مگر بدقسمتی سے اس معرکہ میں بھی اس کو شکست نصیب ہوئی اور وہ زمینداروں کے ہاتھوں سے ماری گئی۔ اور بعض مورخین کا اعتقاد یہ ہے کہ خود بہرام شاہ نے اس کو قتل کر دیا اس لائق و فایق عورت نے کامل تین سال اور چھ ماہ اور چھ دن بڑے جاہ و جلال سے ہندوستان کی بادشاہت کی اور عورتوں کی لیاقت حکومت کو بخوبی ثابت کر دیا۔
مندرجہ بالا واقعات سے واضح ہے کہ عورتوں میں بھی مردوں کی طرح حکومت و سلطنت کا مادّہ موجود ہے اور وہ استقلال و ثبات شجاعت اور دلیری میں مردوں سے کچھ کم نہیں ہیں مگر اظہار قابلیت کے لئے تربیت و تعلیم ضرور ہے۔ ممکن ہے کہ اگر عورتوں کو مردوں کی طرح تعلیم دی جائے تو وہ بھی علم و فن میں کامل ہوں اور بحیثیت مجموعی قوم کو فائدہ پہنچائیں۔ العاقل تکفیۃ الاشارہ

از جناب [illegible] صاحب

هفت اقلیم پئے سیر تہ پا دارم　　دامن دیدۂ خود پُر ز تماشا دارم
غم آمرزش عصیاں مخور ساکت باش　　نفس خویش ز الواث مبرّا دارم
آہ سرد و دل پُر درد و رخ زرد مدام　　نعمت جملہ علامات مہیّا دارم
از من زار چہ پرسی تو حدیث مجنوں　　یاد از دفتر عشاق قصصہا دارم
کالا ملا بہر ربا دارے ابنائے جہاں　　دلق و عمامہ و تسبیح و مصلّا دارم

نقش قدم

ساتواں باب

یوجین اقبال کرتا ہے

جسوقت میں وہاں کھڑا ہوا انگلیوں سے کھڑکی کے شیشہ پر بجارہا تھا۔ اور میرا ذہن اس مقدمہ کے حل میں مصروف تھا۔ باہر کے دروازہ کے کھلنے کی آواز آئی۔
میرا خیال تو یہی تھا کہ شاید کورونر آگیا ہے۔ دفعتًہ مجھ پر منکشف ہوا کہ کوئی شخص سیڑھیوں سے نیچے اترا۔ لیکن معلوم نہوسکا کہ کون باہر گیا۔ مگر جواب فوراً مجھے ملگیا۔
ایک بی بی اُس قدیم وضع کے زینے اتر کر پھاٹک کی طرف گئی۔ وہ نہایت خوش قطع لباس پہنے سمور کا چوغا اوپر سے اوڑھی تھی۔ اور اوس کے سر پر ایک خوبصورت ٹوپی تھی۔
میں نے اس کے لباس کو اس لئے بغور دیکھا کہ یوجین نے کہا تھا کہ مس ہاتھورن ہمیشہ سیاہ لباس پہنا کرتی ہے۔ تو اس وقت اُس کے باہر جانیکی وجہ کیا تھی؟ کیونکہ یہ دکانوں کو جانے اور خرید فروخت کا وقت تھا۔
آیا اسکی غرض مکان سے فرار کرانے کی تھی۔ کیونکہ اس کے خیال میں یوجین نے اس جرم کا ارتکاب کیا تھا۔ اور اسے خوف تھا کہ شاید اُس سے اسبات کی تصدیق طلب کیجائے؟
میں نے اوسے پھاٹک سے باہر جاتے دیکھا۔
"کیا آپ مجھ سے کچھ دریافت کرنا چاہتے ہیں صاحب؟"
جب میں نے پلٹ کر دیکھا تو بسٹی تھی۔ وہ نہایت پاکیزہ لڑکی نظر آئی۔ اور ایسا معلوم ہوا کہ نہایت سہمی ہوئی تھی۔
ایک پولیس افسر کے مقابلہ کے خیال نے اُسکو خوف زدہ کردیا تھا۔ میں نے پوچھا "کیا تمھارا ہی نام بسٹی ہے؟"

"جی ہاں صاحب"
"بیٹھ جاؤ بچی۔ میں تم سے فقط چند باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ میں ایسا سمجھتا ہوں کہ تم اس مکان میں مدت سے ہو؟"
"کئی سال سے"
"تم کو اس مدت میں مس ہاتھورن سے بہت اچھی طرح کا اتفاق رہا ہوگا؟"
"جی ہاں۔ میں اونکو اچھی طرح جانتی ہوں"
"تم انکو بہت چاہتی ہو؟"
"وہ دنیا میں مہربان ترین اور حسین ترین لیڈی ہیں"
"میں اس بات کو سنکر بہت خوش ہوا۔ میرا ذاتی خیال بھی انکی نسبت یہی ہے۔ بیتی کیا تم نے ان کو کبھی سوتے میں چلتے ہوئے دیکھا یا سنا ہے؟"
"آپ نے یہ کیا فرمایا؟ (حیرت سے)
"وہ مجھ سے کہتی تھیں کہ لڑکپن میں وہ نیند میں چلتی تھیں"
"جی ہاں"
"کیا تم نے کبھی کبھی دیکھا ہے؟"
"دو مرتبہ"
"انھوں نے مجھ سے کہا کہ جہانتک انکو خود اس کا علم ہے کئی سال سے یہ اتفاق نہیں ہوا"
"ہم نے اون سے نہیں کہا"
"ہم سے تمھارا کیا مطلب ہے؟"
"بکا نیوالی اور میں"
"پہلے مرتبہ کا واقعہ تو بیان کرو"
"تقریباً تین سال ہوئے جب مجھے یہاں آکر تھوڑا عرصہ گذرا تھا۔ بکانیوالی اور میں اوپر سونے کے لئے جا رہے تھے۔ ہم دونوں ایک مہمانی میں گئے تھے رات کے دو بجے ہوگئے۔ ہم نے اوپر کے دالان میں روشنی دیکھی۔ اور مس ہاٹرسن کو دیکھا کہ شمع ہاتھ میں لئے سفید لباس پہنی سیدھی کتاب خانہ میں چلی گئیں اور ہماری طرف مطلق توجہ نہیں کی"
"خوب! کتابخانہ میں؟"

"جی ہاں۔ مجھے اس قدر خوف طاری ہوا کہ میں کانپنے لگی لیکن بچانیوالی نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر رکھدیا اور کہا۔ خاموش رہو۔ یہ مس بیاٹرلیس ہے جو نیند میں چلتی ہے۔ یہ اونکا ایک کھیل ہے۔"

"اس کے بعد انھوں نے کیا کیا؟"

"اپنا جزدان اوپر سے اتار کر اسمیں سے ایک خط نکالا اور اوسے آگ میں ڈال دیا۔ اور جزدان کو اسکی جگہ میں رکھکر شمع اٹھالی۔ اور اپنے کمرہ میں جاکر آہستہ سے اوسکا دروازہ بند کر لیا۔"

یہ نہایت عجیب واقعہ تھا۔ میں نے کبھی کسی نیند میں چلنے والی کی نسبت ایسی کوئی بات نہیں سنی اس سے ظاہر ہے کہ مس بیاٹرلیس نیند میں کیا کچھ نہ کر سکتی ہونگی جبکہ یہ بیہوشی اون پر طاری ہوتی ہوگی۔ اس واقعہ نے میرے عقیدہ کو اور بھی مستحکم کر دیا۔

"تم نے جو کچھ دیکھا تھا اون سے کہا تو نہیں؟"

"نہیں بلکہ اونھوں نے جب پوچھا کہ اون کا کوئی خط مجھے ملا ہے جو اونھوں نے لکھ کر رکھا تھا۔ تب میں نے کچھ نہ کہا۔"

"ہاں۔ وہ دوسرا واقعہ کیا ہوا؟"

"ایک سال قبل۔ اور اوسی طرح واقع ہوا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ وہ کتبخانہ میں ادھر ادھر ٹہلتی تھیں۔ اور اپنے ہاتھوں کو ملتی جاتی تھیں۔ اور پھر ہاتھوں کو جوڑ کر اسطرح پر پھیلاتی تھیں کہ گویا کسی سے رحم کی التجا کرتی ہیں۔"

بیچاری لڑکی۔ اتنے دنوں قبل بھی گو یا جج صاحب کی مخفی قدرت کا اثر اوس پر محسوس ہوتا تھا۔ اور اوس کی نیندان پریشان خوابوں سے خراب ہوتی تھی۔"

"تم نے کل شب کو کوئی آواز تو نہیں سنی جس سے معلوم ہو کہ بیاٹرلیس نیند کی حالت میں چلتی ہوں؟"

"نہیں صاحب۔"

"اگر میں تم سے کہوں کہ کل رات کو ایسا امر واقع ہوا تھا تو تم کو تعجب تو ہوگا؟"

"جی نہیں"

"بھلا کیوں؟"

"اس لئے میں نے ہمیشہ دیکھا ہے کہ جب مس بیاٹریس رات کو نیند میں چلی ہے تو صبح کو انھوں نے خستگی کی شکایت کی ہے"

"ہاں۔ ٹھیک۔ اور آج صبح کو؟"

"انھوں نے وہی شکایت کی"

"جب تم اپنی بی بی کو اس واقعہ کے بعد جگا نے گئیں۔ تو کیا تم نے اُن کو اپنی کرسی پر سویا پایا تھا؟"

"جی ہاں"

"لباس پہنے ہوئی تھیں؟"

"جی ہاں"

"چراغ بھی جل رہا تھا؟"

"روشنی دھیمی کردی گئی تھی"

"وہ کیسا لباس پہنے تھیں؟"

"سیاہ لباس جس پر سرخ رنگ کے پٹے ہیں"

"تمکو اس بات کا یقین ہے؟"

"جی ہاں"

"مس بیاٹریس ابھی مکان سے باہر گئی ہیں۔ مگر اُن کے جسم پر وہ سیاہ لباس نہیں تھا جس کا تم نے ابھی ذکر کیا ہے"

"جی نہیں"

"سنئے۔ میرے پوچھنے کی ایک خاص غرض ہے۔ کیا تم اس سیاہ لباس کو یہاں میرے دیکھنے کے لئے لاسکتی ہو؟"

"لیکن میں"

"یہ یاد رکھو کہ میں تمھاری حسین بی بی کو کوئی نقصان پہنچانا نہیں چاہتا ہوں۔ بلکہ کوشش کر رہا ہوں کہ ان کو بچاؤں کیا تم لباس کو یہاں لاؤگی؟"

"اگر آپ کو اصرار ہے تو خیر؟"

"ہاں میں ضرور اصرار کرتا ہوں۔ تم اُسے لاکر اس کرسی پر رکھ دو۔ اور جب میں مکان سے چلا جاؤں۔ تو تم اُسے واپس لیجانا"

"میں ضرور لے آؤنگی۔ صاحب۔ لیکن فرمائیے تو۔ کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ یہ خوفناک کام انھوں نے کیا ہے؟"

"میری اچھی لڑکی۔ میں سچ کہتا ہوں کہ مس پیاٹر ایک مکھی کو بھی تکلیف نہیں دیتی"

"بے شک۔ وہ ایسی ہی ہیں۔ وہ اس شہر میں بہترین اور عزیز ترین بی بی ہیں"

"بسی۔ یہ خیال تمھارا بہت ہی مستحسن ہے۔ یقین مانو کہ میں کوشش کر رہا ہوں کہ تمھاری بی بی کو زحمت اور تکلیف سے بچاؤں۔ تم اُس لباس کو ضرور یہاں لاکر رکھ دو"

"جی ہاں"

"اب میں کتب خانہ میں جاتا ہوں کہ مسٹر پوبین سے کچھ گفتگو کروں"

"پکانیوالی کہتی ہے کہ"

"کیا؟"

"کہ جس بدمعاش نے وہ کام کیا ہے۔ وہ باورچی خانہ کے دروازہ میں سے آیا تھا۔ باغ کی زمین آدھی رات کی بارش کے آگے تک بالکل خشک تھی۔ اور آج صبح کو ہم نے کیچڑ سے آلودہ نقش قدم باورچی خانہ کے فرش پر دیکھے۔ جو زینہ دالان میں اور سیڑھیوں تک بھی نظر آتے ہیں"

میں سچ کہتا ہونکہ اسباب کے سننے سے میرے دلمیں اس مقدمہ کی نسبت بہت دلچسپی پیدا ہوئی لیکن چونکہ میرے خیال میں کوئی اور ہی نتیجہ گیا تھا۔ اس لئے میں نے اس کی طرف چنداں توجہ نہیں کی۔ شاید آگے چلکر اس میں کچھ اہمیت پیدا ہو اگر مقدمہ کی صورت بدل جائے۔ بہرحال بسی باہر چلی گئی۔ اور میں اس کے پیچھے چلا۔

کتب خانہ کا دروازہ کھولتے ہی میں نے پوبین کو ادھر اُدھر ٹہلتے ہوئے دیکھا انکے چچا کی لاش نے بظاہر اونھیں خوف زدہ نہیں کیا تھا۔ اگر ان کی پریشانی حواس غالباً اسی وجہ سے ہوگی۔

"کیا آپ فارغ ہوگئے؟" اوس نے پوچھا

"میں کامیابی کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہوں۔ مسٹر ٹربور زمبری اور بسی نے مجھے عمدہ بتلائے ہیں۔ جن سے میرے گمان کو تقویت ہوگئی ہے"

انھوں نے میری طرف نہایت دردآمیز وضع سے دیکھا۔ اُن کے چہرہ سے

یاس کے آثار ظاہر ہوتے تھے۔

"جی ہاں معروضہ کی بنا پر کہ رات کو یہاں کوئی چور آیا تھا"

میں نے اون کی طرف تیز نظر کی "مسٹر یوجین۔ آپ یقیناً اس سے بہتر جانتے ہیں" یہ میں نے نہایت آہستگی سے مگر معنی خیز لہجہ میں کہا۔

وہ ایک آہ بھر کر کانپنے لگا "آپ کا اس سے کیا مطلب ہے مسٹر کرافرڈ؟"

"صرف یہی کہ تمام علامتیں ایک ہی نتیجہ کی طرف اشارہ کرتی ہیں کہ جج ٹریورز کی موت ایسے شخص سے واقع ہوئی جو اس مکان کے رہنے والوں میں سے ہے"

اوسکے غم و غصہ کی حد نہیں تھی۔ مجھے بجز اس کے کوئی چارہ نہ تھا کہ اوس کے ساتھ گہری ہمدردی ظاہر کروں۔ کیونکہ میں واقف ہو چکا تھا کہ اوس میں کیسے عمدہ اور شریفانہ صفات ہیں۔

"آپ نے تو ایسا خیال ظاہر کیا ہے کہ باہر سے کوئی آیا ہوگا" اون سے نہایت نرم لہجہ میں کہا۔

"بے شک اوس طرف فی الجملہ احتمال تھا لیکن وہ اب بالکل زایل ہو گیا ہے"

"اور حالت غیظ میں خودکشی کا خیال؟"

"بالکل بے بنیاد ہے۔ بہت ہی ناتجربہ کار کورونر کی جوری بھی ہرگز اس خیال کو قبول نہ کریگی"

یہ سنتے ہی وہ کرسی کو ٹیکا دیکر بیٹھ گئے۔

"آئی مسٹر یوجین۔ اور مردانہ اس امر کا مقابلہ کیجیے۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ یہ معاملہ بہت سخت ہے لیکن شاید اس سے کبھی بدتر ہوتا"

"جی درست۔ شاید اس سے کبھی بدترین ہوتا؟"

"ہم اس کی نیک تاویل کرینگے۔ اور فرض کرینگے۔ بلکہ یقین کرینگے کہ اپنے دل میں بس نیا کر نے" یہ سننا ہی تھا وہ اچھل پڑا اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ اوس کی آنکھیں ابل پڑیں۔ اور اسکی سانس تیز چلنے لگی۔ اس نے دانت پیسکر کہا "یا الٰہی۔ کیا آپ کو ایسا گمان ہے کہ انھوں نے یہ فعل کیا ہے؟"

"جی ہاں۔ واقعات سے مجھے یہی معلوم ہوتا ہے۔ سب باتیں اسی طرف اشارہ کرتی ہیں"

"غیر ممکن۔ ناقابل قبول!"

"شاید ایسا ہی ہو لیکن آپ کا دل ہی جانتا ہوگا کہ میں سچ کہتا ہوں۔ اور آپ کے دل میں کوئی بات ہے۔ کوئی خوفناک بات ہے جو آپ کو پریشان کر رہی ہے"

"جی نہیں۔ ہرگز نہیں"

"لیکن میں کہتا ہوں ہاں۔ اور میں ہرگز غلطی پر نہیں۔ زیادہ اخفا کی ضرورت نہیں۔ مناسب ہے کہ ہم ایک دوسرے کی بات کو سمجھ لیں"

وہ آپے سے باہر ہو جاتا تھا۔ اور مجھے چھوڑ کر کتب خانہ میں ادھر اُدھر ٹہلنے لگا تھا اوس کا چہرہ کچھ اسطرح کھینچ جاتا تھا کہ میں نے کبھی کسی اور کے چہرہ کی ایسی حالت نہیں دیکھی شدید جذبات اوس کے دل میں موجزن تھے۔ میں اوس کے دل کی حالت کا اوس وقت میں کوئی اندازہ نہ کر سکا۔ لیکن بہت جلد وہ بات مجھ پر ظاہر ہو گئی۔

"مجھ سے صاف صاف بیان کیجئے کہ کیا آپ گمان کرتے ہیں کہ اوسی کا ہاتھ تھا جس سے اون کی موت واقع ہوئی ہے" یہ کہکر اُس نے لاش کی طرف اشارہ کیا جو کرسی پر تھی

"جی ہاں۔ ایک اور چیز بھی ہے جس سے مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو بھی اس بات کا یقین ہے"

"وہ کیا چیز ہے"

"آپ نے اوس کے بچانے کے لئے کوئی کام کیا ہے"

"میں نے؟" یہ کہتے ہی اوس کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

"آپ ہی نے وہ نوٹوں کا بستہ نکال لیا ہے"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"میں نے آپکو اس بڑے فینئے کو جلاتے دیکھا جو اوس پر بندھا ہوا تھا"

بجائے اس کے میں اوسکو غمگین پاتا میں نے اوس کو شگفتہ خاطر پایا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اوس نے کسی بات کا مصمم ارادہ کر لیا تھا۔ اور اب اوس کو عمل میں لانا تھا

"آپ نے مجھے دیکھا؟"

"جی ہاں۔ اوس تابدان میں سے جہاں میں اسوقت چھپا ہوا تھا۔ آپکا مطلب اوس نوٹوں کے بستہ کے اٹھا لینے سے یہ تھا کہ چور کا آنا ظاہر ہو"

"جی ہاں۔ ایسا ہی ہے"

"اس طریقہ سے آپ نے گمان کو دوسری طرف پھیرنا چاہا تاکہ بیاٹریس محفوظ رہے"
"نہیں آپ غلطی پر ہیں۔ بیاٹریس کو اس جرم کی سزا نہیں دیجا سکتی ہے"
"بھلا یہ کیونکر؟"
"اس لئے وہ بیگناہ ہے"
"تو پھر آپ کس کو چھپایا چاہتے تھے؟"
"اپنے آپ کو"
"کیا؟"
"میں اقبال کرتا ہوں کہ میں نے اپنے چچا کو قتل کیا ہے"

اٹھواں باب

باہمی مشاورت

کبھی کبھی پُرانے سراغرساں کو بھی حیرت ہوتی ہے۔ اور میں اعتراف کرتا ہوں کہ یوجین کے اس بے باکانہ اور دلیرانہ جواب سے میرا سر چکرانے لگا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اس وقت میری حالت نقش بہ دیوار کی تھی۔ میں بجز اس کے کچھ کر نہ سکتا تھا کہ وہاں کھڑے ہو کر اس جوان کو حیرت سے گھورا کروں۔

میرے جذبات ایک تغیر پیدا ہو گیا۔ پہلے تو جیسا کہ میں نے بیان کیا ہے مجھے استعجاب ہوا۔ اس کے بعد حیرت ہوی۔ اور آخر کار میں نے اوس کو قدر کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا۔

میرے سامنے ایک شخص کھڑا تھا جو معمولی انسان سے زیادہ تھا۔ ایک شجاع مرد تھا۔ اوسے اپنی منگیتر کے جرم کا یقین تھا۔ اور اوس نے اپنی تمام قوت اس میں صرف کی اوسے بدگمانی سے محفوظ رکھے۔ اور چور کے مکان میں آنے کے خیال پر زور دینے لگا اور اب جو اوسے اس میں کامیابی نہوی۔ تو اوس نے منصوبہ ارادہ کیا کہ اپنے آپ کو عشق کی قربان گاہ میں بطور قربانی کے پیش کردے۔

میں نے یہ بات تھیٹر کے تماشوں میں دیکھی تھی۔ لیکن روزمرہ زندگی میں ہرگز ایسی مثال کے دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا تھا۔

مثل تمام معمولی عقل والوں کے ہیں اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ تہور اور شجاعت کا زمانہ گذر چکا ہے۔ اور لوگوں میں وہ اعلیٰ روح تیار جسکا ذکر ہم ناولوں اور افسانوں میں پڑھتے ہیں اور کھٹیروں میں دیکھائی جاتی ہے۔ اور جو دولت کمانے کی کشمکش میں بے موقع نظر آتی ہے۔ بالکل مفقود ہے۔

مجھے اب اپنی غلطی کا اعتراف کرنا پڑتا ہے جب یہ حیرتناک موقع میری نظروں کے سامنے پیش ہوا۔ تو میں نے اپنے آپ کو بہت کچھ سنبھالا یوجین کو اپنی چھاتی سے نہ لگالوں کیونکہ میں نے اوسے نہایت اعلیٰ درجہ کا جانباز مرد پایا تھا۔

میں اوسے ایسے جرم کا مرتکب سمجھوں یہ محال تھا۔ ایسی صورت میں بجائے اس کے کہ میں اوسے قاتل سمجھوں اپنے آپکو قاتل سمجھنا آسان تر تھا۔ وہ اپنا سر نیچے کئے ہوئے تھا۔ گویا کہ وہ نہایت یاس کی حالت میں ہے۔ اور اپنی طرف اشارہ کرتا تھا کہ دیکھے اوس کے حق میں میرا کیا فیصلہ ہوتا ہے۔

تھوڑی دیر تک تو میں محو حیرت تھا۔ آخر کار میں نے کہدیا۔

"یہ ایک غیر متوقع اظہار ہے۔ مسٹر یوجین"

"جی ہاں۔ مجھے یقین تھا کہ آپکو حیرت ہوگی" اوس نے سخت دلگذار آواز میں جواب دیا۔

"بیٹھ جائیے صاحب۔ ہمکو فرصت سے اس معاملہ میں گفتگو کرنی چاہیئے۔ کیونکہ اِس بیان سے مقدمہ کی شکل بالکل بدل جاتی ہے"

وہ اپنی کرسی پر تکیہ دیکر بیٹھ گیا۔ میں نے اوس کے چہرہ کو دوبارہ دیکھا۔ اگرچہ اُسکا رنگ فق ہوگیا تھا۔ مگر اُس سے استقلال ظاہر ہوتا تھا۔

"ہاں صاحب۔ تو کیا اس بات سے آپ چاہتے کہ میں باور کروں کہ آپ ہی اپنے چچا کے قاتل ہیں؟"

"جی ہاں"

"تو یہ امر خوفناک امر کیسے واقع ہوا؟"

"ہم دونو جھگڑنے لگے۔ اور مجھ پر حملہ کرنے کے لئے بڑھے۔ اس وقت میں ہی نے بلا ارادہ وہ چھڑی اُٹھالی اور اوسے کام میں لایا اس کے بعد وہ اپنی کرسی پر ٹیکا دیکر مر گئے"

"بہت ٹھیک۔ لیکن اون کے گلے پر جو نشان ہیں اون کی نسبت آپ کیا فرماتے ہیں؟

کیونکہ گلے کا گوشت ناخنوں سے نوچا گیا ہے۔"

"شاید میں نے انکا گلا دبایا ہو۔"

"مجھے اپنا ہاتھ دیکھنے دیجئے۔ واہ! آپ کے ناخن تو بالکل چھوٹے ہیں بلکہ نہیں ہیں۔"

"میں نے آج صبح کو ناخن کاٹے ہیں" ادسن نے جلدی سے کہا۔

"شاید میں یہ نہ ثابت کرسکوں اگر ضرورت ہو تو۔ مسٹر یوجین۔ آپ کی غرض پہلے اپنے جرم کے چھپانے میں کیا تھی۔ اور پھر اس کے اقبال کرنے میں کیا ہے؟"

"کیا آپ نہیں دیکھ سکتے ہیں کہ جب تک کسی باہر والے کی نسبت گمان تھا تو میں نے سمجھا کہ اس کو مخفی رکھوں۔ لیکن آپ نے جب اُن کا نام لیا۔ بیاٹریس کا۔ کہ اونکی نسبت گمان ہے۔ تو میں مصمم ہو گیا کہ اپنے جرم کا اقبال کروں۔ کیونکہ میں ہرگز اون کے نام کو دھبہ نہ ہونے دونگا۔ نہیں۔ ہرگز نہیں۔ اگرچہ مجھے ہزاروں موت مرنا ہو جائے۔"

سر چھپر نیچے جھک گیا۔

"مسٹر یوجین"

"جی جناب"

"میری طرف دیکھیے"

"ذرا مشکل سے ادسن نے سر اٹھایا"

"اپنا ہاتھ مجھے دیجئے"

"کیا آپ ایسے ہاتھ کو چھوئینگے جو خون آلود ہے؟"

"قسم بخدا۔ میں آپ کے مردانہ ہاتھ کو بجائے کسی اور کے ہاتھ کے بخوشی پکڑونگا۔ اب آپکی آنکھوں میں سید معاد یکھنے سے میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں کہ جو حکایت آپنے مجھ سے کہی ہے۔ وہ بالکل غلط اور خلاف واقعہ ہے۔"

"کیا؟"

"ذرا تحمل سے کام لیجیے۔ میں آپ کی غرض اصلی کو سمجھ گیا ہوں۔ خدا میرا گواہ ہے کہ آپ کے خیالات نہایت سرفروشانہ اور جانبازانہ ہیں۔ مجھے آپ سے پوری ہمدردی ہے لیکن میں نے عزم بالجزم کرلیا ہے کہ ہرگز آپ کو اسطرح پر قربانی ہونے نہ دونگا۔ سچ میں بڑی قدرت ہے اور سچ ہمیشہ غالب آتا ہے۔"

"اس میں کوئی قربانی نہیں ہے۔ میں ہی مجرم ہوں۔ اور"
"یہ کسی اور سے کہئے۔ میں نے اکثر جرم کو قاتلوں سے چھپا کر دیا ہے۔ لیکن مجھے پہلا موقع ہے جو میں مجبور ہو رہا ہوں کہ ایک شخص کو اوسکی مرضی کے خلاف بیگناہ ثابت کروں میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ آپ کے ساتھ استدلال کروں۔ مسٹر بوچین۔ اور جب تک عاقلانہ طور پر آپ عمل کرینگے۔ اوسی قدر اوس شخص کی سختی میں تخفیف ہوگی جس کی طرف جرم کا گمان ہے"
"تو آپ میری بات کو سچ نہیں سمجھتے؟"
"میں جانتا ہوں کہ آپ اس جرم سے ایسے ہی بری ہیں جیسا کہ میں ہوں۔ اور آپ اس کو کسی اور طور سے تاویل نہیں کر سکتے ہیں"
"جب تو سارا معاملہ غارت ہو جائیگا"
"نہیں ایسا نہیں ہوگا"
"آپ مجھے کس طرح پر امیدوار بنا سکتے ہیں؟"
"سنئے۔ اور آپکو معلوم ہو جائیگا۔ میں صاف صاف گفتگو کرنا چاہتا ہوں کیونکہ یہی بہتر طریقہ ہے جو بات میں نے دریافت کی ہے وہ اسی طرف اسکا شاید تک نہیں۔ اسلئے یہ معاملہ آپ اور مس بیاٹریس پر آکر ٹھہرتا ہے۔ واقعات سے جنکو میں عنقریب ظاہر کرونگا واضح ہوگا کہ وہی اسکی مرتکب ہوئی ہیں"
اوس نے سنکر ایک آہ کی
"کیا آپکو کبھی معلوم ہوا ہے کہ مس بیاٹریس راتوں کو سوتے ہی میں چلا کرتی ہیں؟"
"ہرگز نہیں"
"تو آپ کو معلوم نہیں کہ وہ نیند میں چلنے کے عارضہ میں مبتلا ہیں؟"
"ہاں مجھے یاد آیا کہ وہ بعض اوقات ایسی باتوں کا ذکر کرتی تھیں کہ بچپن میں اون سے ایسی حرکت سرزد ہوتی تھی۔ لیکن مجھے معلوم ہوا کہ وہ اب اس عادت سے پاک ہیں"
"مگر نہیں۔ وہ اب بھی اسمیں مبتلا ہیں"
"کیا یہ ممکن ہے؟"
"میری اور بستی دونوں آپکو اس کے متعلق واقعہ بتا سکتی ہیں جو گذشتہ تین سال میں واقع

ہوئی ہیں۔ جبکہ مس باتھورن سارے مکان میں رات کو نیند میں چلتی رہیں۔ اور بہت سے کام کئے مثل ایک خط کے جلا دینے کے جو انکی جزدان میں تھا جبکہ وہ بالکل نیند میں تھیں"

"عجیب؟"

آپ کا چہرہ شگفتہ ہونے لگا۔ اور انھوں نے اپنا دم روکا اسطرح پر کہ گویا کوئی امید اونکے دل میں پیدا ہو رہی ہو۔

"ہر ایک ایسے واقعہ کے بعد انھوں نے صبح کو تھک جانے کی شکایت کی۔ اور آج صبح کو بھی ایسی ہی شکایت کی۔ کیونکہ انھوں نے خود مجھ سے کہا کہ وہ ایسی تھکی ہوئی ہیں گویا میلوں رستہ طے کیا ہے"

"جی درست"

"مختصر یہ کہ بیاٹریس کل رات کو نیند میں چلی ہیں۔ اور جو کچھ اوس حالت میں اون سے سرزد ہوا ہے اونکیں مطلق یاد نہیں۔ نہ انکو اس کا ذمہ دار قرار دیا جاسکتا ہے۔ وہ بالکل بیگناہ ہیں"

"خدا کا شکر!" اوس نے خلوص سے کہا۔

اُن کی حالت بالکل بدل گئی۔ وہ مثل سابق مایوس و از خود رفتہ یہیں رہے جن کی آنکھوں سے ناامیدی برس رہی تھی۔ اور مصمم ہو چکے تھے کہ اپنے آپ کو اور اپنی ساری امیدوں کو قربان کر دیں تاکہ اوس لڑکی کا نام جس کے ساتھ اُن کو عشق تھا۔ خاک میں نہ ملجائے اور خاص و عام کی زبان پر نہ آئے۔

ان کے دل میں ایک نئی امید پیدا ہوی۔ انکا چہرہ شگفتہ ہوا۔ آنکھیں چمکنے لگیں اور صورت بھی بدل گئی۔

اب وہ نہایت شوق سے میری گفتگو سننا چاہتے تھے۔ لیکن میں آہستہ آہستہ آگے بڑھتا تھا۔ اور پھونک پھونک کے قدم اٹھاتا تھا۔

اگر مجھ سے کوئی غلطی ہو جاتی۔ تو شاید ویسی خطرناک نہوتی جیسی کہ مین معاملہ میں ہوتی لیکن میرا منصوبہ درہم برہم ہو جاتا جس سے میں بچنا چاہتا تھا۔

"اب جو آپ کو معلوم ہو گیا ہے کہ میرا کیا مقصود تھا۔ اور میں کیا ثابت کیا چاہتا ہوں، تو آیا اپنا پورا بھروسا مجھ پر رکھینگے۔ مسٹر لوصین؟" میں نے یہ سوال کیا۔

"جی ضرور"

"شروع سے میرا مطلب سمجھ لیجے۔ اس مقدمہ مین کافی شہادت کی نشانیاں ہیں۔ کہ کوئی چور

رات کو مکان میں داخل ہوا تھا۔ اور روپیہ چرا لیا جس کو آپ کے چچا نے روکا۔ اور اس نے چھری کا استعمال کیا۔ میں کہتا ہوں کہ اسطرح یہ کافی شہادت موجود ہے کہ معمولی کورونر کی جوری کی توجہ اپنی طرف پھیر لے۔ اور آپ کو بعض باتیں بتلاتا ہوں جن سے جرم کے گمان کو اوس طرف محکم بنا لیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ اگر اوس لڑکی نے اوس مخصوص حالت میں اسکا ارتکاب کیا ہے۔ تو مجھے یقین ہے کہ اگر اونکو اس کی حقیقت سے اطلاع ہو جائے تو بجائے فائدہ کے ان کو نقصان پہنچیگا۔ اور کیا عجب کہ اون کے دماغ پر بُرا اثر پڑے۔

اُس نے میرا ہاتھ گرمجوشی سے پکڑ لیا۔

"خدا آپ کو تسکین بخش الفاظ کا نیک صلہ دے۔ آپ کہتے ہیں کہ کافی شہادت کسی چور کے مکان میں آنیکی موجود ہے؟"

"جی ہاں۔ ایک شخص نظر آیا تھا جو طوفان کے بعد اس احاطہ سے باہر جا رہا تھا۔ اور اُسکے نقش قدم کتابخانہ کی کھڑکی تک نظر آتے ہیں۔ کورونر کی توجہ اوس طرف پھیری جائیگی۔ اور بیاٹریس کو بچا یا جائیگا۔"

"اگر وہ اوس شخص کو گرفتار کرلیں تو اوسکا کیا نتیجہ ہوگا؟"

"اوس صورت میں البتہ مجبوری ہے۔ اور ہمکو حقیقت واقعہ کو ظاہر کر دینا ہوگا۔ کیونکہ کسی بیگناہ پر جرم عاید کرنا ہرگز مناسب نہیں۔"

"بہت مناسب۔ مجھے اطمینان ہے۔"

"مسٹر لوچین۔ اب میں چند باتیں ایسی پوچھتا ہوں جو ان کے متعلق ہیں۔"

"میں بھی جواب دینے کو تیار ہوں۔"

"یہ بیان کیجے کہ آپ نے شب کو کیا دیکھا۔"

"طوفان کے شروع ہونیکے بہت دیر بعد تک میں بیدار تھا۔ کیونکہ کسی آواز نے مجھے جگا دیا تھا یا شاید ہی خواب دیکھ رہا ہونگا۔ میں نے اپنی کھڑکی سے باہر کیطرف دیکھا۔ بعد اپنے کمرہ کا دروازہ کھول کر دالان میں دیکھا۔ مجھے بہت حیرت ہوی کیونکہ میں نے ایک روشنی دیکھی۔ اور کسی شخص کو دیکھا کہ ہاتھ میں شمع لئے ہوئے سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ ذرا غور سے معلوم ہوا کہ وہ بیاٹریس تھیں۔"

"مجھے معلوم نہوا کہ وہ کہاں جا رہی ہیں۔ اور میں مطلق واقف نہ تھا کہ وہ نیند میں چلا کرتی ہیں۔ میرا پہلا خیال تو یہ ہوا کہ اون سے بات کروں یا انکے پیچھے جاؤں۔ لیکن میں نے اپنا ارادہ بدل دیا۔

"آہ کاش میں ایسا کیا ہوتا۔ تو کس قدر غم و غصہ سے محفوظ رہتا۔ میں نے اپنے چچا کو کتابخانہ میں کھانستے سنا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ اوسوقت تک اندھے تھے"

"وہ کونسا لباس پہنے ہوی تھیں؟"

"جی جو اس رات کو پہنی تھیں۔ یعنی سیاہ لباس جس پر سرخ پٹے ہیں"

"کیا اون کے پاس کوئی دوسرا لباس بھی ہے جو مثل اسکے ہو؟"

"کوئی نہیں جس پر سرخ پٹے ہوتا"

"آپ کو یقین ہے کہ وہ اوسی کو پہنی ہوی تھیں؟"

"جی ہاں میں قسم کھا سکتا ہوں"

"بہت اچھا۔ آپنے پہلے اون کے پیچھے جانیکا قصد کیا۔ اور بعد کو اپنا ارادہ بدلدیا۔ تو پھر کیا کیا؟"

"اپنے کمرہ میں جا کر سو رہا۔ نہیں اپنے بستر پر کروٹیں بدل رہا تھا یہانتک کہ طوفان موقوف ہو گیا۔ اور ایکدم غنودگی مجھ پر طاری ہوی۔ جس سے پکانیوالی کی خوفناک آواز نے مجھے جگایا"

"تو گویا اوسوقت آپ کے دل میں یہ خیال گذرا کہ اُن کے آدھی رات کو نیچے اترنے کا بھی سبب تھا۔ اور اون کے بچانے کیلئے اوس نوٹوں کے بستہ کو لیکر آپ اپنے کمرہ میں چلے گئے؟"

"محض اون کی پردہ داری کے لئے"

"میرے نوجوان دوست۔ اس سے تو آپنے گویا گمان کو اوہی طرف پھیرا؟"

"میں نے نتیجہ کا مطلق خیال نہیں کیا۔ میں جانتا تھا کہ کیا کر رہا ہوں۔ اور راضی تھا کہ جو مصیبت پیش آئے اوسے خود جھیلوں اور اونکو بچاؤں"

"خیر۔ تو اب ہم ایک دوسرے کے مطلب کو سمجھ گئے ہیں"

"کیا آپکو اوس کے جرم کا یقین ہے؟"

"یہ ایک دوسرا مسئلہ ہے میں اسقدر کہہ سکتا ہوں کہ بالفعل شبہہ اوسی طرف سے ہوتا ہے۔ مگر میں جرم قطعاً اون پر عاید نہیں کر سکتا ہوں"

"تو آپ اعتراف کرتے ہیں کہ اُنہیں بچاؤ کا موقع ہے؟"

"جی ہاں۔ مگر نہایت ضعیف"

"میں آپ سے التجا کرتا ہونکہ اسکی تحقیقات میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھئے"

"ضرور کوئی فروگذاشت نہ کرونگا۔ اگر کوئی ایسے واقعات رونما ہوجائیں جو ان کے جرم کے

متعلق میرے خیال کو ضعیف کر دیں۔ تو میں دوسری طرف توجہ کرونگا۔ میں بخلوص دل امید رکھتا ہوں کہ معاملہ آپ کے حسب دل خواہ طے ہو جائیگا۔"

"تو اب آپ کیا کرینگے؟"

"مس ہاتھورن کہاں گئی ہیں؟"

"میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ وہ بعض بیماروں کی مزاج پرسی کے لئے گئی ہیں۔ جن کے ساتھ وہ ہمیشہ کچھ سلوک کیا کرتی ہیں۔"

"خیر۔ تو میں ذرا اِدھر اُدھر نگاہ کر لیتا ہوں۔ آپ مہربانی کر کے یہیں میرا انتظار کیجیے۔ کیونکہ شاید مجھے آپ سے پھر ملنا پڑے۔"

نواں باب

شمع کی چربی کے قطرات

میں نے اوس تمام مقام پر نظر دوڑائی۔ اور باورچیخانہ کیطرف نیچے اترنیکا ارادہ کیا۔ جیسا کہ میں نے میری سے وعدہ کیا تھا۔ وہ ناشتا تیار کرنے میں مصروف تھی جسکی خوشبو نے میری اشتہا کو تیز کر دیا۔

میرے داخل ہوتے ہی وہ سر اٹھا کر مسکرانے لگی "ہاں جناب مجھے یقین تھا کہ آپ ضرور آئینگے۔"

"میری تم نے مٹی بھرے پیروں کے نشانوں کا ذکر کیا تھا۔"

"جی ہاں جناب۔ میں نے مکان کے اندر کے نشان کو تو صاف کر دیا ہے۔ مگر آپ اس طرف تکلیف فرمائیں تو آپکو دکھلا دونگی۔"

دروازہ کے باہر ہی میں نے گِل آلود قدموں کے نقش دیکھے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ کوئی شخص بارش کے وقت یا اوسکے بعد تختوں پر سے آیا ہے۔ گیلی مٹی اوسوقت سوکھ گئی تھی۔ میں نے جھک کر اونکو بغور دیکھنا شروع کیا۔ جو اوس گیلی مٹی میں ٹوٹی ہوئی دیوار کی حد تک برابر چلے گئے تھے۔

یہ نشان جانے اور آنے دونوں کے تھے۔ یہ عورت کے جوتے کے نشان تھے لیکن اتنے چھوٹے تھے کہ شاید ہی کسی لیڈی کے جوتے اتنے چھوٹے ہونگے۔

میری کے جوتوں کی طرف دیکھنے سے معلوم ہوا کہ اوس کے پیر بڑے ہیں۔ بلکہ بستی کے پیر بھی اس نزاکت کی نعمت سے محروم ہیں جس سے یقین ہو گیا یہ نشان قدم اون دونوں کے نہیں ہیں۔

تو پھر کون ہوگا؟ کیا بیاٹریس ہوگی؟ کیا وہ طوفان کے وقت باہر گئی تھی؟ یہ ایک عمدہ شہادت ہوگی۔ بشرطیکہ اون کے جوتوں پر مٹی پائی جائے۔

یہ ایک نیا اور دلچسپ مطلب معاملہ پیش ہوا۔ تب میں نے میری سے اور بھی سوالات اس نقش قدم کے متعلق کئے۔ اور اس بات کا یقین حاصل کر لیا کہ اوس نے گذشتہ عصر کی سیڑھیوں کو صاف کیا تھا۔ نہ باورچی خانہ کے فرش کو بھی۔ یہی وجہ تھی کہ اوس نے جب یہ مٹی کے نقش قدم دیکھے تو اوسے غصہ آیا۔

ایک معمولی عقل والا سراغرساں بھی ایسے واقعات کے قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرتا ہے۔ اگرچہ وہ اوس کی رائے کے خلاف ہوں۔ یا اوس کے خیالات کو درہم برہم بھی کر دیتے ہوں۔ اس صورت میں ایک چیز نے مجھے سرگرداں کیا تھا اور میں نے اپنا سر حیرانی سے ہلایا۔

اگر فرض بھی کر لیا جائے کہ سیڑھیوں پر یہ نقش قدم بیاٹریس کے تھے۔ تو اس آمد و رفت کی تاویل کس طرح کیجا سکتی تھی۔ کیونکہ آنے اور جانے کے نشان قدم دونوں موجود تھے۔ اور آنیکے نشان جانیکے نشان اس قدر زیادہ واضح تھے کہ معمولی حالت میں خیال گذرتا کہ کوئی شخص۔ ایک لڑکی یا عورت بلحاظ نقش قدم۔ مکان میں باورچی خانہ کے دروازہ سے داخل ہوا تھا جبکہ اوس کے جوتوں کو مٹی لگی ہوئی تھی۔ اور جب باہر نکلا تو یہ مٹی تقریباً چھوٹ گئی تھی۔

اس عجیب متضاد خیال کے ساتھ میں اوپر گیا۔ مجھے کوئی نہیں ملا۔ مکان بالکل سنسان تھا۔ سب عورتیں باہر چلی گئی تھیں۔ اون کے کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا بیشک مجھے کس قدر پس و پیش ہوا کہ ایک جوان لیڈی کی غیاب میں اوس کے کمرہ میں داخل ہوں۔ لیکن چونکہ وجہ معقول تھی اسلئے میرا عذر بھی معقول تھا۔

میں سیدھا ایک نابدان کی طرف بڑھا۔ جس میں متعدد جوڑے جوتوں کے میں نے دیکھے۔ جو نہایت سلیقہ کے ساتھ دھرے ہوئے تھے۔

میں نے اپنی نظر کمرہ کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑائی۔

اگر مجھے ایک بھی جوڑ نظر آتا جس میں مٹی لگی ہوی تھی۔ تو مجھے اطمینان ہو جاتا۔ لیکن سب جوتے صاف و پاک تھے۔ اور مجھے یاد آگیا کہ جس وقت میں اون سے باتیں کر رہا تھا تو وہ سلیپر پہنے ہوی تھیں۔

یہ مقدمہ ہر لحاظ زیادہ پیچیدہ ہو جاتا تھا۔ میں نے انگیٹھی کی طرف دیکھا کہ شاید کچھ مٹی وہاں نظر آئے۔ جس کو شاید صاف کرتے وقت جھیل ڈالا ہو۔ لیکن وہاں مٹی کا نام تک نہ تھا۔

جب میں اس نقطہ خیال پر پہنچا تو مجھے ایک قسم کا گمان پیدا ہونے لگا کہ شاید جو کچھ میں نے ابتک تصور کیا ہے صحیح ہو گویا یہ ایک پانسے کا کھیل ہو۔

اوس لڑکی کے کمرہ سے باہر نکل کر میں سیڑھیوں کے نیچے اترا کہ دیکھوں بستی نے میرے حکم کی تعمیل کی ہے یا نہیں۔

جب میں ملاقات کے کمرہ میں داخل ہوا تو مس پیاٹریس کا لباس کرسی پر دھرا پایا۔ اب اس سے شاید کوئی ثبوت مجھے ملجائیگا۔ اوس کو لیکر میں کھڑکی کے قریب گیا اور اوس کو اچھی طرح دیکھنے لگا۔ کیا وہ پھٹا ہوا مقام مجھے ملجائیگا؟ مس پیاٹریس نے تو کہا تھا کہ وہ ایک جگہ سے پھٹ گیا تھا جسے اونھوں نے سیا تھا۔

اونکا خیال تھا کہ وہ کہیں پیچ میں الجھ گیا ہوگا۔ لیکن میرا خیال تو اوس کی نسبت کچھ اور ہی تھا۔ میری پاکٹ بک میں اوس کپڑے کا ٹکڑا محفوظ تھا جس کو میں نے مردہ جج کے سیدھے ہاتھ میں سے نکالا تھا۔

تلاش کے بعد مجھے ایک مقام ملا جہاں اونھوں نے سیا تھا۔ یہ مقام ایک ... کے نیچے تھا جہاں سے وہ نظر نہ آتا تھا۔ میں نے اپنا چاقو نکالکر اوس کے ٹانکے کو جو مس پیاٹریس نے نہایت احتیاط کے ساتھ سیا تھا ادھیڑ ڈالا۔

میرا خیال یہ تھا کہ دیکھوں وہ سوراخ جو لباس میں ہوگیا تھا آیا اوس کپڑے کے ٹکڑے سے مطابق ہو سکتا تھا یا نہیں۔

جب میں نے اوس سوراخ کی وضع و قطع کو دیکھا تو مجھے سخت پریشانی ہوی اور میں فوراً اپنے پاکٹ بک میں سے اوس ٹکڑے کو نکالکر پھیلا دیا۔ یہ ٹکڑا اوس سوراخ کا سہ چند تھا۔ علاوہ بریں یہ ٹکڑا مربع تھا۔ بخلاف اس کے وہ سوراخ لمبا اور پتلا تھا

جب کہ ایک میخ میں الجھ جانے سے ہوسکتا ہے۔
اس مسئلہ کے کامل تصفیہ کے لئے میں نے دونوں کپڑوں کا باہم مقابلہ کیا وہ لباس نیا اور چمکتا ہوا تھا۔ بخلاف اس کے وہ ٹکڑا جو میرے پاس تھا پرانا اور بوسیدہ تھا۔ اس میں کوئی شبہ کا مقام باقی نہ رہا۔
جہانتک اس کپڑے سے اوس پر الزام قایم کرنیکا خیال تھا تو وہ بالکل بے سود ٹھیرا۔ بہر حال اسکا کوئی قصہ ضرور ہوگا۔ اور میں نے عزم کرلیا کہ اوسکی تہ تک پہنچے بغیر میں ہرگز اس کی تفتیش کو ترک نکرونگا۔ میں نے پھر اوس ٹکڑے کو اپنے پاکٹ بک میں رکھ لیا اگرچہ ان سب تحقیقات میں بہت کچھ وقت صرف ہوا۔
ڈوروتھی کے آنیکا وقت قریب آرہا تھا۔ اسوجہ سے میں نے عجلت نہیں کی چونکہ ابر کی وجہ سے تاریکی چھائی ہوئی تھی میں نے دیاسلائی روشن کی اور دروازہ کے قریب لے گیا جو کتابخانہ کے دروازہ اور نیچے اترنے کی سیڑھیوں کے قریب تھا۔
یہاں مٹی کے نقش قدم کا دیکھنا چنداں مشکل نہ تھا۔ میں نے اُن کو مختلف مکانات پر دیکھا تھا۔ مگر کتابخانہ کے دروازہ کے قریب کوئی نشان نظر نہ آیا۔ اوس کو میں نے ذہن نشین کرلیا۔
شمع کی چربی کے دھبے مجھے اوس لباس کے سامنے دامن پر نظر آئے جو شاید خود اس لڑکی کو نظر نہ آئے تھے۔ اور ان سے میرے دل میں ایک نیا خیال پیدا ہوا۔
میں دوبارہ سیڑھیوں پر چڑھا۔ اور کتنی ہی دیاسلائیاں جلائیں۔ مگر مجھے ایک دھبا بھی چربی کا کہیں نظر نہ آیا یہانتک کہ میں اوپر کے دالان تک پہنچا۔ وہاں مجھے ایک دھبا نظر آیا۔ اور پھر دوسرا اور تیسرا۔ اسی طرح سے پے درپے۔ یہانتک کہ میں مس ہانفورن کے کمرہ تک پہنچ گیا۔ اس سے مجھے کچھ دھارس بندھی میں نے قدم بقدم اوس کا پتا اوس کے کمرہ سے زینہ کے اوپر تک لگالیا۔
چونکہ اس کی کوئی شہادت یا علامت ہاتھ نہ آئی کہ وہ شمع لئے ہوئے سیڑھیوں کے نیچے اتری ہوگی۔ تو میں واپس آیا کہ دیکھوں اوس نقطہ سے وہ کہاں تک گئی تھی۔
جیسا کہ میرا خیال تھا۔ وہ قطرات پیچھے کسی غلام گردش تک چلے گئے تھے۔ ایک دآموز تک بھی ان کی پیروی کرسکتا تھا یہ قطرات ایک دروازہ کے سامنے ختم ہوگئے

میں اوس دروازہ کے دستہ کو پھرانے ہی تھا کہ اندر سے ایک آواز سنائی دی۔
چونکہ اسوقت سب کچھ سنسان نظر آیا۔ میں نے آہستہ سے دستہ کو پھرا کر دروازہ کھولا۔ وہ کمرہ خالی نہ تھا۔ ایک عجیب قطع بوڑھی بی بی جن کے بال گھونگر والے تھے چاکولیٹ کے پینے میں مصروف تھیں۔ اون کا ناشتا اون کے لیئے وہیں لایا گیا تھا۔ اور کچھ کتاب کا مطالعہ بھی کرتی جاتی تھیں۔
میں فوراً سمجھ گیا کہ یہی مردہ جج کی چچی مس ٹرلونز ہیں۔ آہستہ سے دروازہ بند کر کے میں کتابخانہ کی طرف چلا۔ اس خیال سے کہ اس کام میں بوجین سے مدد لوں۔ میں نے اون سے لباس اور شمع کے قطرات کا حال بیان کیا۔
"تو وہ قطرات سیڑھیوں کے نیچے تک نظر نہیں آئے؟ ہائے میری کوئی تھوڑی دیر اور بیاٹریس پر نظر نہیں اٹھی کہ مجھے معلوم ہوجاتا کہ وہ چچی کے پاس جارہی تھیں آیئے ہم چلکر بڑی بی سے ملاقات کریں۔ وہ فی الحقیقت نہایت مہربان بی بی ہیں"۔
"ٹھیریئے۔ اتنی جلدی نہ کیجیے۔ پہلے اس کا تو تصفیہ کریں کہ اون کو کیا بہانہ بتلائینگے کیونکہ میں ایسا خیال کرتا ہوں کہ سارا ماجرا سنانا نہیں چاہتے ہیں"۔
"ہرگز نہیں۔ یہ بے موقع ہوگا"۔
"تو فرضاً اگر ہم اون سے کہیں کہ بیاٹریس کی کوئی قیمتی چیز کھوگئی ہے۔ اور اونکا گمان ہے کہ وہ چوری گئی ہے۔ لیکن چونکہ آپ جانتے ہیں کہ وہ اپنی نیند میں چلتی ہیں۔ اسلیئے آپ کا خیال ہے کہ وہ مکان ہی میں کہیں گرگئی ہوگی۔ اسطرح پر اون کے آنے جانیکی حقیقت دریافت کرسکینگے جو ہمارا اصلی مطلب ہے"۔
"بہت خوب جناب میرے ساتھ چلیئے"
"مجھے اپنے دوست کیطرح واقف کرائیے۔ کیونکہ شاید وہ گھبرا جائیں"۔
ہم تھوڑی دیر میں اون کے دروازہ تک پہنچ گئے۔ بوجین نے اس دروازہ پر اس زور سے ہاتھ مارا کہ مردہ بھی اوس سے جاگ اوٹھے۔
"اندر آئیے"، ایک آواز آئی۔ ہم کمرہ میں داخل ہوگئے۔
وہ پست قد بوڑھی بی بی ناشتا کھانے میں مصروف تھیں۔ لیکن فوراً چونک اٹھیں۔ اور اپنے ہاتھوں سے بالوں کو درست کرنا شروع کیا۔ کیونکہ ایک بیگانہ شخص

بوجین کے ساتھ داخل ہوا تھا۔

"پچی۔ یہ میرے دوست کرافرڈ ہیں" بوجین نے کہا۔

اگرچہ وہ بہری نہیں۔ مگر بوجین کو اونکے سنانے میں دقت نہوی۔ کیونکہ وہ اون کی وضع سے واقف تھا۔

"تمھارے ہر ایک دوست سے بھی بخوشی ملونگی۔ بوجین" انھوں نے جواب دیا۔ اور میرے ساتھ ہاتھ ملانے سے مجھے معلوم ہوگیا کہ پچی پالی بوجین کو بہت چاہتی تھیں

"پچی۔ ہمارے آج صبح یہاں آنے کی ایک خاص غرض ہے۔ بیاٹریس کی الماس کی انگھوٹھی گم ہوگئی ہے اور ہم سمجھتے کہ نوکروں نے اوسے چرایا ہوگا۔ اسلئے مکان میں ہم اوس کی تلاش کرنے آئے ہیں"

اور دھیمی آواز میں اوس نے کہا "خدا اس جھوٹ کو بخشے۔ لیکن یہ اوسی کی بہتری کیلئے ہے"

"انگھوٹھی کھوگئی؟ عجیب۔ یہ تو اچھا نہیں ہوا۔ کل رات تو دونوں انگوٹھیاں وہ پہنے ہوئے تھیں۔ اتنے میں کیسے کھوگئی؟"

"پچی۔ بیاٹریس کل رات آپ پاس آئی تھیں؟"

"ہاں بوجین"

"تو آپ ہمکو تلاش کرنے دینگے؟"

"میں خود مدد دونگی"

ہم اودھر اودھر دیکھنے لگے۔ اگرچہ ہمارے دل کسی اور ہی خیال میں معروف تھے یہ تو ظاہر ہے کہ وہ تلاش بے سود ہی۔ انگھوٹھی اسوقت مس ہاتھورن کی انگلی میں تھی اسلئے فوراً ہم نے اس کام کو ختم کرلیا۔

"بوجین۔ وہ تو یہاں نہیں ہے" انھوں نے مایوسی سے کہا۔

"جی نہیں۔ تو ہم کہیں اور تلاش کرینگے۔ اب آپ ہمکو کوئی بات بتلاسکتی ہیں؟"

"بخوشی سے"

بوجین نے میری صرف مڑکر کہا "مس پالی نہایت درجہ پابند وقت ہیں بلکہ منٹوں کے حساب سے کام کرتی ہیں۔ وقت پر اٹھتی ہیں۔ وقت پر کھانا کھاتی ہیں۔ وقت کہ وہ ہمکو

صحیح وقت بیاٹریس کے یہاں آنے اور یہاں سے جانیکا بتلا سکینگی۔"
"یہ تو بہت ہی اچھا ہوگا"
"پھر اوس نے ان کی طرف دیکھکر پوچھا۔
"جی ہم کو مس ہانخورن کے یہاں آنے کی وجہ معلوم ہے"
"تمکو کچھ معلوم ہے یوجین؟"
"جی ہاں۔ انکو نیند میں چلنے کی عادت ہے"
"یہ صحیح ہے"
"یہ بات آپکو مدت سے معلوم ہے؟"
"ہاں۔ وہ میرے کمرہ میں کئی بار آئی ہیں۔ اور بیٹھی یا اوس کوچ پر لیٹ گئی ہیں۔ اور تھوڑی دیر تک ٹھیر کر پھر اپنے کمرہ میں چلی ہیں"
"یہ بہت عجیب ہے۔ کیونکہ مس بیاٹریس میری بی بی ہونیوالی ہیں۔ تو مجھے اسکو موقوف کرنا ہوگا" یہ کہکر اوس نے قہقہہ لگایا۔
"مگر یوجین۔ اون کے کام سب بے ضرر ہیں"
اسوقت میں نے خیال کیا کہ بلحاظ اون حالات کے جو ہمکو معلوم ہوئے ہیں۔ انکے نام کچھ ایسے بے ضرر نہ تھے۔
"جی۔ اگر ہمکو معلوم ہو جائے کہ وہ کب یہاں آئی تھیں اور کب گئیں۔ تو شاید ہم انگیٹھی کا پتہ لگا سکیں"
"وہ شمع روشن کر کے یہاں سے شبہ ہے اپنے کمرہ میں چلی گئیں اور اوسکو خاموش کر کے کرسی پر بیٹھ گئیں۔ اور انکی آنکھ طبیعی نیند سے بند ہو گئی"
"کیا آپ اون کے ساتھ اونکے کمرہ تک گئی تھیں؟"
"جی ہاں"
"اور آپ فوراً واپس آگئیں؟"
"ہاں"
"تو وہ کیا وقت ہوگا؟"
"جب وہ یہاں آئیں تو دو بجے میں تین ۳ منٹ کم تھے۔ اور جب میں نے ان کو اونکے

کمرہ میں چھوڑا تو میں نے گھڑی دیکھی۔ اوسوقت تین بجنے میں دس منٹ کم تھے"
میں نے بے اختیارانہ یوجین کا ہاتھ پکڑ لیا۔ کیونکہ مجھے صد درجہ کا اطمینان ہوگیا۔
"شکر ہے یوجین کہ پیارے بیس بچ گئی۔ وہ اس خوفناک جرم سے بالکل بے گناہ ہیں"
"پھر مجرم کون ہوگا؟" (باقیدارد)

از جناب مولوی سید علی نواز صاحب تصور امانت خانی

جب اپنے ظرف عشق قاتل کو دیکھتے ہیں
اک خون بھرا کٹورہ ہم دل کو دیکھتے ہیں

دم توڑتا ہے کیونکر بسمل کو دیکھتے ہیں
آسان ہونے والی مشکل کو دیکھتے ہیں

کیسی نظر سے قاتل بسمل کو دیکھتے ہیں
آنکھوں میں اپنی بسمل قاتل کو دیکھتے ہیں

مرنا جو دل جلوں کا آتا ہے یاد ان کو
گل کر کے اپنی شمع محفل کو دیکھتے ہیں

سمجھے کہ ہستیاں یہ افتادہ ہیں فنا کی
گرتے ہوئے زمیں پر جب طفل کو دیکھتے ہیں

کانٹوں سے بھر رہے ہیں ہستی کا میری دامن
چبھتی ہوئی نظر سے وہ دل کو دیکھتے ہیں

گرداب ایک چکر اس کے نصیب کا ہے
دریا میں خاک اڑاتا ساحل کو دیکھتے ہیں

چکر میں آسماں کے دوران سر کو پایا
تلووں کے آبلوں میں اب دلکو دیکھتے ہیں

بیشک ہے اس میں لیلی پردہ بھی ہے زیبا
مجنوں کا دل سراپا محمل کو دیکھتے ہیں

مٹی میں ملنے والے جلووں کی آرزو کیا
گل یاد آ رہے ہیں ہم گل کو دیکھتے ہیں

منزل میں ہیں بہ عشرت طے کر چکے جو رستہ
ہم دور سے بحسرت منزل کو دیکھتے ہیں

کعبہ میں رکھ کے گویا توڑیں گے یہ بتوں کو
حق کوش اس نظر سے باطل کو دیکھتے ہیں

دل کی کشش نے کھینچا آہوں سے دامن برق
کیا کھینچے جذب عشق کامل کو دیکھتے ہیں

کعبہ حبیب کا گھر ہمکو ہے اے تصور
ہر وقت سر جھکا کے ہم دلکو دیکھتے ہیں

علو ہمت

از جناب خان بہادر مولوی میرزا سلطان احمد خانصاحب

ہمت مردان مدد خدا

یہ جتنی کائنات اور مخلوق ہم اپنے ارد گرد دیکھتے ہیں اگر اس سے یہ سوال کیا جائے کہ تمھیں کس نے بنایا یا تم کس طرح بن گئے تو سب کی طرف سے یہی جواب ہوگا کہ "ہمیں اسکی بابت کوئی خبر نہیں ہے"۔

اگر یہ کائنات خدا نے بنائی ہے (ضرور بنائی ہے) تو یقیناً مخلوق کی جانب سے کوئی ایسی درخواست شامل ہی نہوگی۔ جو کچھ بنایا خود خدا نے بنایا۔ اس کا عزم اور ارادہ ہوا اور یہ سب کچھ بن گیا۔ کن فیکون کا یقینی و صحیح وہ سب ہے۔ اور اگر بقول بعض (جو صحیح نہیں ہے) یہ سب ٹھاٹھ اتفاقاً ہی بن گیا ہے تو اس حالت میں مخلوق کی کوئی درخواست خلقت نہیں بنے گی۔ دونوں حالتوں میں ہم بغیر اپنی خواہش کے بنائے گئے ہیں۔ اور جس طرح پر کسی بنانے والے کا ارادہ ہوا اُسی طرح پر ہم بن گئے۔ ہماری مرضی اور ہمارے ارادہ کو کوئی دخل نہیں دخل کیسے ہوتا جب ہماری بنیاد پڑی نہ ہم تھے اور نہ ہمارا عزم اور ارادہ تھا۔

ورقِ عقل و ہوش ہیں برہم
سخت ابتر ہے گنجفہ میرا

جس ارادہ اور جس عزم کی بدولت ہماری خلقت ہوئی اور جس حکم سے ہم اس پشت میں آئے، وہ ارادہ کیا مضبوط، کیسا اٹل اور کیسا مستقیم ہوگا اور اُس کی ہمت اور ہمت کا علو کیسا شاندار اور عظیم الشان ہے۔ اس لئے جس جس رنگ میں خلقیں کیں وہ بھی اپنی ذات میں بہت کچھ استواری اور علو رکھتی ہیں۔ اگرچہ صانع اور خالق، مصنوعات اور مخلوقات سے کیسا ہی مغایر ہو اپھر بھی مصنوعات اور مخلوقات میں اُس کا کچھ نہ کچھ عکس اور اثرات ہوتا ہے کم سے کم اُس کی وہ سنت اور حکمت کے جواہر تو ضرور ہی درخشان اور نمایاں ہوتے ہیں۔ درجہ بدرجہ ہر مخلوق اور ہر صنعت صانع اور خالق کے فضائل سے کچھ نہ کچھ حصہ رکھتی ہے۔

کائنات اور مخلوقات پر درجہ بدرجہ نگاہیں ڈالکر دیکھو صانع اور قادر کا ظہور کچھ نہ کچھ پایا ہی جاتا ہے۔ ہر خلقت حکمت کے اظہار اور دوربینی کے اعتراف میں رطب اللسان ہے۔ ساری مخلوق ایک طرف اور انسان ایک طرف۔ گویا یہ ایک مجموعہ کائنات ہے

ذرا اُس کا دماغ اور عجب دماغ چیر دیکھو، کتنی حکمتیں بھر رکھی ہیں۔ جسے ضمیر (اور کانشنس) کہتے ہو اُس کی تہہ نہیں لگتی۔ صدیاں گذر گئیں ابتک اُس کی تہہ اور اُسکی بوقلمونیوں تک کوئی پہنچ سکا۔ اس کا فلسفہ بڑے بڑے فلسفیوں سے بھی حل نہ ہو سکا اور خود ہی اکبار مغلوب ہو کر رہ گئے ؎

بازار عشق میں کوئی سودا نہ بن سکا تو ہم اُس کے ہاتھ بک گئے جس کی خرید کی

باوجود اس بات کے پھر بھی مقرآن ان میں جو عزم، جو ارادہ، جو حکمت، جو قدرت، جو ہمت اور جو علو پایا جاتا ہے وہ کسی دوسری مخلوق میں کہاں !۔

چہ نسبت خاک را با عالم پاک

دوسری مخلوق جیسی بنی تھی ویسی ہی ابتک بھی ہے۔ کون کہہ سکتا ہے اس میں خود بخود یہ ترقی ہوئی یا اس درجہ تک اُس نے

اس دل کا کوئی الفتِ دنیا میں نہیں جواب
بیٹھا ہوا ہے سکہ تیرے زرِ خرید کا

اس سے ثابت ہے کہ قدرت نے سب سے بڑھ کر حضرت انسان کی فطرت میں بلند پیمائی اور علو ارادت ودیعت کر رکھا ہے۔ اور اس کی بدولت اوس نے اپنے ابنائے خلقت میں عزت اور شہرت پائی ہے۔ اگر اسکی ذات میں یہ خصوصیت نہ ہوتی تو اسے کوئی احترام حاصل نہ ہوتا اور نہ کائنات کی ترقیات اور عروج کا وسیلہ اور قبلہ شمار ہوتا

ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ

کوئی شخص، کسی شخص کی شخصیت، کوئی خاندان، کوئی کنبہ، کوئی گروہ اور کوئی قوم اسوقت تک قایم نہیں رہ سکتی جبتک اسمیں فطرتی جذبات کے مطابق پختہ ارادت اور علو ہمتی نہ پائی جائے تاریخیں دیکھو گے تو تمھیں پتہ لگ جائیگا علو ہمتی اور بلند ارادہ سے صدیوں کی قوموں نے

لے وہ لوگ ذرا غور سے سوچیں جو یہ کہا کرتے ہیں کہ دنیا یا یہ سارا اٹھاٹھ خود بخود ہی بن گیا۔ اگر واقعی مادہ یا مواد میں اس قدر طاقت اور ہوش و حکمت اور سمجھ تھی تو چاہئے تھا کہ ابتک ان مواد مختلفہ کی حالت ہی کچھ اور ہوتی رہتی۔ انسان میں بقا جو دلیل اس بات کی ہے کہ وہ مادہ میں کوئی طاقت اور قدرت نہیں ہے جو بجائے خود محتاج ہے اور دست نگر۔

پستی ارادہ سے ترقی یافتہ قومیں اور بلند پایہ افراد دونوں گرداب ذلت اور مغاک شقاوت میں گھر گئے ہیں۔ بعض اوقات تو ہیں معلوم نہیں کرتی ہیں کہ اُن کے ارادوں اور اُن کے حوصلوں میں رفتہ رفتہ کیا فرق آرہا ہے، اور اُن کی بلند خیالی کے پرزے کس طرح بتدریج کمزور پڑتے جاتے ہیں۔ انھیں خبر اس وقت لگی ہے جب ایک دفعہ اُن کی بنیاد ہل ہل کر گر جاتی ہے اور قومی مجموعہ بگڑ بگڑ کر ایک دوسرے سے الگ ہو جاتی ہے۔

بلند خیالی اور علو ہمتی کیا ہے؟ بلند خیالی اور علو ہمتی شیخ چلی کے منصوبوں یا خیالات سے بہت کچھ امتیاز اور فرق رکھتی ہے۔ بلند خیالی اور علو ہمتی یہ نہیں ہے کہ انسان ان امور اور اُن مراتب کے حاصل کرنے یا اُن فتوحات کا عزم رکھے حیطہ امکان سے باہر ہوں، یا ماحول اور مراحل جن کے موافق نہوں۔ بلند خیالی اور علو ہمتی وہ ہے جو قانون قدرت اور ماحول کے مطابق ہو، جو انسانی قدرت اور انسانی طاقت کے اندر اُس کے مخالف نہو۔ جو کچھ ہمارے سامنے اور ہمارے ارد گرد پایا جاتا ہے وہ سب قدرت نے ایک حد تک ہمارے ماتحت رکھا ہے، اُس حد تک کہ جہاں تک ہماری طاقتیں اور ہمارے ارادے اُس کا مقابلہ کر سکتے ہیں۔ سورج بھی ہمارے ماتحت ہے اور چاند بھی، ہوا بھی، ستارے بھی، ہمیں قدرت نے یہ طاقت بخش رکھی ہے کہ ہم ایک خاص حد تک اُن کی آزمائش اور چھان بین کر سکیں، اور اُس سے کائنات کی آزمایش اور راحت کے واسطے کوئی مفید سبیل نکال سکیں جس قدر ہم نے مواد کائنات سے کام لیا ہے وہ سب ہماری علو ہمتی کی دلیل اور ثبوت ہے۔ اور ہم فطری ہمت سے کام نہ لیتے تو یہ سامان جو اس وقت دیکھ رہے ہیں اس کا نام و نشان بھی نہ ہوتا۔ انسان خدا نہیں ہے، انسان صحیح معنوں میں صانع اور خالق نہیں ہے لیکن خدا نے اُسے یہ مادہ اور یہ طاقت بخش رکھی ہے کہ وہ قدرتی چیزوں سے ایک حد تک کام لے سکے۔ اور اگر مختلف قسم کی نظریں اور مثالیں ہمارے ارد گرد اور سامنے موجود نہ ہوتیں تو ہم سمجھ سکتے تھے کہ انسان کی علو ہمتی اور بلند خیالی کا صرف ہی نام ہے، لیکن انسان نے روز روشن کی طرح یہ ثابت کر دیا ہے کہ انسانی علو ہمتی اور انسانی بلند خیالی کی طنابیں کہاں تک رسائی رکھتی ہیں، اور اُن میں کس قدر زور اور طاقت ہے۔

معادی اور معاشرتی دونوں رنگوں میں انسان برابر ترقی کرتا چلا آیا ہے اور اسی طرح ایک زمانۂ مقررہ تک (جس کا علم خدا ہی کو ہے) برابر ترقی کرتا چلا جائیگا۔ جب حالت یہ ہے

تو کیا یہ ضرورت نہیں کہ وہ قومیں، وہ گروہ اور وہ نسلیں جو بدقسمتی سے بلند خیال اور علو ہمتی کھو چکی ہیں پھر کوشش کریں اور اس ہر باد رفتہ اندوختہ کو حاصل کر کے چھوڑیں۔ چونکہ علو ہمتی انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اسواسطے کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اُسے نہ پاسکیں، کوشش شرط ہے۔ کوشش اُسوقت سرسبز ہوتی ہے جب ہمت ساتھ دیتی ہے جب ارادہ ہو۔ ارادہ کب بابرکت ہوتا ہے؟ جب صادق ہو۔ صداقت کب میسر آتی ہے؟ جب انسان اپنے ماحول پر گہری نگاہیں ڈالے اور مشاہدات و تجربات سے اپنی موجودہ اور گذشتہ حالت کا مقابلہ اور موازنہ کرے۔ یہ کیفیت کب رونما ہوتی ہے؟ جب انسان اپنی مجموعی قوتوں سے صحیح طور پر کام لینے کا عادی ہو۔

علو ہمتی نرے ارادہ ہی سے سرسبز اور کامیاب نہیں ہوسکتی۔ ارادہ اور علو ہمتی کے ساتھ صائب رائے اور موقعہ شناسی اور دوربینی کی بھی ضرورت ہے۔ ہم آسمان پر کود کر نہیں پہنچ سکتے اور نہ اس کی کیفیات سے آگاہ ہو سکتے ہیں۔ مگر عادی کیفیات کے علم اور انکشاف کے واسطے علم اور حکمت کی ضرورت ہے نرے ارادے اور علو ہمتی سے ہی انسان بڑھ نہیں سکتا جبتک کسی کی اُستادی سے فایدہ نہ اٹھایا جائے یا کسی کو اُستاد اور ہادی نہ بنایا جائے۔ انسان سفر کا ارادہ کرسکتا ہے لیکن جب تک پاؤں چلنے نہیں یا سامان سواری میسر نہ آئے تب تک کس طرح سفر کرسکتا یا چل سکتا ہے۔ یہ علو ہمتی ہی تو ہے کہ بہت جلد جلد دور دراز فاصلہ پر خبر جا پہنچتی ہے لیکن ایسا باتوں سے کس طرح ہوسکتا ہے جب تک ڈاک تار وغیرہ کا انتظام نہ ہو۔ اشراقین کو بھی دل کی توجہات سے کام لینا پڑتا ہے۔ بہت لوگ باوجود بلند خیالی اور علو ہمتی کے کامیاب نہیں ہوتے۔ اکثر وجہ یہ ہوتی ہے کہ حکمت، وقت، موقعہ شناسی اور دوراندیشی سے کام نہیں لیا جاتا۔ دنیا عالم اسباب ہے یا یہ کہ محل اسباب۔ جبتک ہئیت اسباب نہ ہو تب تک کچھ نہیں بن سکتا۔ بہت سے کام بے شک ایسے بھی ہو جاتے ہیں کہ ہمیں اُن کے اسباب کا پتہ نہیں لگ سکتا مگر اسباب ہونے ضرور ہیں روحانیات میں دعا بھی ایک سبب یا ایک ذریعہ ہے۔ نیک بخت کسی مشکل یا کسی ضرورت کے وقت ہاتھ اٹھا کر دعا کرتے ہیں، قبولیت یا کامیابی پر کہا جاتا ہے کہ دعا اور تضرع کے بعد یہ کامیابی ہوئی۔ گویا ایک سبب کے ہونے سے ایک کام ہوا اور ایک مراد بر آئی۔

ہمت ہارنا ایک ایسا فعل ہے جس مایوسی رفتہ رفتہ غالب ہوتی جاتی ہے اور

قوتوں میں سستی آتی جاتی ہے۔ جن جن قوموں اور جن جن افراد نے ہمت ہاری وہی رفتہ رفتہ رہ گئے اور لوگ کہنے لگے کہ یہ قوم یا یہ افراد دنیا کی منڈی میں رہنے کے قابل نہیں اس دنیا میں تنازع البقا کی بحث ہمیشہ چھڑی رہتی ہے۔ جس نے ایسا تنازع نہیں کیا وہ ختم ہو گیا، اُس کے دعاوی پر پانی پھر گیا اور اُس کے حقوق دوسروں کے تفویض ہو گئے۔ اگر ٹرین میں کوئی سواری کوئی مسافر کھڑا رہے اور اپنی جگہ نہ لے تو اس کے واسطے کوئی جگہ ابنوہ کی صورت میں باقی نہیں رہے گی، وہ ساری منزل تنگی اور ترشی ہی سے گذارے گا جب کوئی شخص ٹرین میں کرایہ دے کر سوار ہوا ہے تو اس کو یہ حق اور فرض ہے کہ اپنے واسطے جگہ محفوظ کرے۔ اسی طرح جب ہم زندگی کے سفر میں ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی جگہ حاصل کریں اور وہ چیزیں جو اس زندگی کے سفر میں ہمارے لئے آرام دہ ہیں کوشش اور محنت سے بہم پہنچائیں۔ یہ موقعہ ہمیں اس وقت تک نہیں مل سکتا ہے، جب تک کہ بلند خیالی اور علو ہمتی کے ہم درجہ بدرجہ وارث نہوں۔ بچہ سے لیکر بوڑھے تک مرد اور عورت دونوں کیواسطے بلند خیالی اور علو ہمتی کی معہ ضروریات اور شرائط کے ضرورت ہے اسباق الاشیا یا اسباق اخلاق میں سب سے بڑا سبق بھی بلند خیالی اور علو ہمتی ہے تعلیم کا بڑا جزو یہی ہے۔ جو تعلیم اس سے معرا ہے وہ محض کہانی ہے جس کا کوئی اثر اور کوئی نتیجہ نہیں ہے۔ مبارک ہیں وہ نسلیں جو اس مقدس اور مفید ورثہ کی وارث ہیں اور جن کے دلوں میں یہ امنگ پائی جاتی ہے۔ غور کرو تم میں یہ کمی تو نہیں ہے؟۔ اگر یہ جوہر تم میں ہے تو تمھیں صد ہا شکستیں بھی کم حوصلہ اور بزدل نہیں بنا سکتی ہیں، کیونکہ بلند خیالی اور علو ہمتی تمھاری رہبر اور ہادی ہے۔ اگر ساری عمر تمھیں کچھ بھی نہ ملے پھر بھی علو ہمتی کے شاکی نہو۔ بلند خیالی اور علو ہمتی تمھارا مقصد زندگی ہونا چاہئے یہی کامیابی اور ترقی کا پہلا راز ہے۔

غیروں کو جس طرح ہے زمانہ میں اب عروج ؛ حاصل کبھی کہیں یہی جاہ و جلال تھا

راحت نہ ملی کہیں سر مو مجھکو ـــ آرام نہ آیا کسی پہلو مجھکو
دی جان تو پہنچا ہوں یہاں منزل گور ـــ آغوش میں لے نا کسطرح تو مجھکو

(عدیل کنتوری)

اُردو شعرائے دکن

لسان الملک کی صفحات پر سب سے پہلے ادیب الملک نواب نصیر حسین خاں خیال نے شعرائے دکن کی محفل جمائی اس کے بعد مولوی ظفر یاب خانصاحب نے سراج اورنگ آبادی کے حالات پر روشنی ڈالکر داد تحقیق دی اس میں سراج کے معاصرین اور دوسرے دکنی شعرا کے جہاں جہاں نام آگئے ان پر حواشی لکھکر بہت سی مردہ روحوں کو زندہ کیا۔ ہمارے کرم فرما نواب سید محمد علیخاں صاحب لکھنوی نے تین اور نام بھیجے ہیں جو سابقہ مضامین میں چھوٹ گئے تھے۔ اگرچہ یہ نوٹ نہایت مختصر ہیں لیکن ان کی اشاعت کی غایت اس کرمنامہ سے واضح ہوگی جو سید صاحب نے ہمارے نام تحریر فرمایا ہے اور جس کو ہم بجنسہٖ شکریہ کے ساتھ درج کئے دیتے ہیں۔ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اُردو کی ادبی نشو و نما سب سے پہلے دکن ہی سے شروع ہوئی تھی اور سرزمین دکن نے عجیب عجیب لعل گران بہا اگلے تھے جو زمانہ کی گردشوں سے تہ گمنامی میں دفن ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ بحمد اللہ یہاں کا ادبی خزانہ بڑی حد تک محفوظ ہے لیکن ہاں یہ وہ ایسی جگہوں پر اور ایسے ہاتھوں میں ہے جہاں اس کی کماحقہ قدر و منزلت نہیں کی جاتی یا نہیں ہو سکتی۔ اسلئے ہم سید صاحب کے ہمنوا ہو کر ان ابنائے ملک سے جو ایسے خزاین کے مالک ہیں استدعا کرتے ہیں کہ اب تک اسطرح کے جو ادبی ذخیرے زمانہ کی دست برد سے بچے ہوئے ہوں ان کو پبلک میں لانے کی طرف کشادہ دلی سے اقدام فرمائیں تاکہ ہمارے ملکی اور قومی ادب و لٹریچر کی قدیم یادگار کلیتہً صفحہ ہستی سے محو جانے سے محفوظ رہے۔ لسان الملک کے صفحات اسکے نام کی رعایت سے ایسے گراں بہا باقیات الصالحات کو جگہ دینے کیلئے ہمیشہ وقف رہینگے۔ (ایڈیٹر)

مخدومی زاد عنایتہ۔ بعد سلام سنت الاسلام۔ مدعا نگار ہوں کہ لسان الملک جلد ۲ نمبر ۱ و ۲ میں جناب مولوی ظفر یاب خانصاحب اورنگ آبادی کا مضمون متعلق ریختہ گویان دکن پڑھا

واقعی خانصاحب والاشان نے بڑی تحقیق و تلاش سے قابل قدر مضمون مذکور لکھا ہے۔
حسن اتفاق سے میں تاریخ عادل شاہی دیکھ رہا تھا اوس میں مختصر تذکرہ شعرا ریختہ گو بیجاپور کا درج ہے۔ علاوہ اون کے شعرا کے جنکا ذکر مضمون صدر میں مندرج ہے سلطان علی عادل شاہ ثانی ہاشمی و میرزاں (مرزا) قابل ذکر ہیں معلوم نہیں کہ ان کے حالات کیوں قلم انداز ہوئے بہرکیف مجھے مناسب معلوم ہوا کہ میں اس کمی کو پورا کردوں ممکن ہے کہ اور حضرت کے پاس اس قسم کا مواد موجود ہو اور وہ بھی توجہ کریں جسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ لسان الملک اچھا خاصا تذکرہ قدیم ریختہ گویان دکن کا بن جائیگا۔ امید کہ معزز رسالہ لسان الملک میں ان موصوفہ شعرا کے حالات مندرجہ ذیل شائع فرمائینگے۔

آپکا نیازمند سید محمد علی

سلطان علی عادل شاہ ثانی ریختہ کے دلدادہ اور ریختہ گو تھے۔ اسوجہ سے بیجاپور میں شعراء اردو (دکھنی) کا مجمع تھا۔ صاحب تاریخ عادل شاہی نے کلام سلطان کا ایک مصرعہ لکھا ہے جو ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔ ملا نصرتی ایک دن دربار سلطان علی عادل شاہ میں حاضر تھے فوارہ چھوٹ رہا تھا۔ سلطان نے ارشاد کیا مصرع اڑتا سو لیو فوارہ پانی بھی کیا ہے ملا نصرتی نے فی البدیہہ عرض کیا۔ مصرع تجھ بادشاہ کے اوپر اڑنیکا مورچل ہے ہاشمی۔ یہ بزرگوار پایہ تخت بیجاپور کے اکمل شعرا سے تھے۔ یوسف زلیخا کا اردو ترجمہ نظم میں کیا اور صاحب دیوان تھے۔ ہاشمی کور مادرزاد تھے گو چشم ظاہرمیں نہ تھی مگر بصیرت باطنی سے مالامال تھے۔ سیدی مسعود خان اڈھےمرتبہ کا امیر تھا گو ہاشمی سے عقیدت خاص تھی ایک دن ہاشمی خان مذکور کی ملاقات کو گئے اتفاق سے خانصاحب زنانے محل میں تشریف رکھتے تھے۔ ہاشمی کو وہیں طلب کیا۔ مستورات کو بھی معلوم تھا کہ ہاشمی اندھے ہیں اپنی جگھہ سے نہ کوئی اٹھا اور نہ پردے کا انتظام کیا ہاشمی نے غزل شروع کی وہ غزل کیا تھی کہ مہ جبینان محل کا حلیہ معہ رنگ و لباس و زیور کے پتہ دار درج تھا جن سے نازنینان محل آراستہ تھے۔ ان اشعار سے بیگمات میں ہاشمی کی بے بصری کے متعلق شبہات پیدا ہوئے اور فوراً اپنی اپنی جگھہ سے اوٹھ کے گوشوں میں جا چھپیں افسوس مورخ مذکور نے بیحد ظلم کیا کہ ان کا کلام درج نہ کیا میرزاں (مرزا) بیجاپور کے مشہور و منتخب مرثیہ گو تھے انکی زبان سواء حمد و نعت و منقبت کے کسی بادشاہ یا امیر کی مدح سرائی سے آشنا نہ تھی۔

ان کے مراثی کی بہت قدر منزلت کیجاتی تھی ایک دن سلطان علی عادل شاہ نے مرزا کو طلب کیا اور فرمائش کی کہ میرے متعلق بھی کوئی نظم لکھئے مرزا نے عرض کیا کہ جو زبان حمد و نعت منقبت کے واسطے وقف ہوئی ہے اب وہ میرے قبضہ میں نہیں رہی جب سلطان نے زیادہ اصرار کیا مرزا نے ۲ مرثیہ نظم کئے اون میں اپنے مخلص کے ساتھ بادشاہ کا نام نہایت خوبی سے نظم کر دیا۔ مرزا ایسے زکی و قادر الکلام تھے کہ اکثر مجلس ہی میں مرثیہ نظم کر کے خاص لہجہ سے پڑھتے تھے۔ ایک مجلس میں بڑا مجمع تھا اور مرزا مرثیہ بڑے سوز و گداز سے پڑھ رہے تھے گریہ و بکا کا جوش و خروش تھا جب یہ مصرع پڑھا۔ زلان بھا کان اتاران کر رکھو پیہ طبق اب ہر چند کوشش کرتے ہیں دوسرا مصرع بہم نہیں ہوتا۔ اسوجہ سے مرزا کو سخت کوفت و رنج ہوا دفعتہً غنودگی طاری ہوی اوس حالت میں کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت سیدہ عالم تشریف فرما ہیں اور ارشاد کرتے ہیں کہدے۔ بی آوینگے محشر کون یو تحفہ گر لیجاتا ہے فوراً ہی انکی بیداری ہوا اور مصرعہ تعلیمی پڑھ دیا۔ مرزا کی وفات کا واقعہ اسکی خلوص و عقیدت پر دال ہے مرزا شب عاشورہ مرثیہ خوانی میں گزرانتے حسب عادت اپنی شب قتل جو شب عاشورہ تھے۔ امام باڑہ میں مرثیہ خوانی کرتے رہے قریب صبح طہارت خانے میں گئے ایک دشمن نے انکو خنجر سے شہید کیا۔ عشرہ کے دن عزادار اپنے مکانوں سے تعزیہ اور علم جلسہ پر ٹھنڈے کرنے لیجاتے تھے سلطان علی عادل شاہ نے حکم دیا کہ تمام شہر کے تعزیہ اور علم دروازہ ابراہیم پور (فتح دروازہ) پہ جمع ہوں حکم شاہی کی تعمیل کی گئی جب علم و تعزیہ جمع ہو چکے تو حکم ہوا کہ مرزا کی نعش آگے لیجائے اور نعش کے بعد علم و تعزیے رہیں۔ مرزا کی نعش کے ساتھ مرثیہ خوانی ہوتی جاتی تھی اور اہل شہر کا مجمع کثیر تھا۔ اوسکے بعد علم اور تعزیے تھے۔

تدبیر میرے واسطے کیا کیا نہ ہوئی — رغبت کسی شے پہ مجھکو اصلا نہ ہوئی

چھوڑا گھر بانبری خاطر اے قبر — رونے کی عزیزوں کی بھی پروا نہ ہوئی

(عندلیب کنتوری)

دستۂ گل

انتخاب غزلیات منعقدہ ۲۳ رجب سنہ ۱۳۴۲ھ

جناب آزاد صاحب

قصد گلہ احباب اقدام شقاوت ہے — یہ مذہب الفت میں الفت سے بغاوت ہے

وہ روح دو عالم جو تکوین کی علت ہے — واللہ محبت ہے باللہ محبت ہے

ہیں اور وہی الفت جو وجہ مصیبت ہے — تم اور وہی نفرت۔ افتاد طبیعت ہے

اب ضبط شکایت کی تاکید سے کیا حاصل — اب دل ہے کہ سرتاپا لبریز شکایت ہے

ہیں اور گلہ ناممکن۔ یہ حوصلہ ناممکن — تسلیم کا بندہ ہوں تسلیم کی عادت ہے

اب راز دروں جان ہمراز سے کیا کہیے — اب لطف غم پنہاں ناقابل قسمت ہے

قربان طلب! جس نے یہ فلسفہ سمجھایا — بیگانۂ درد دل بیگانۂ راحت ہے

اے کاش! کوئی دانا یہ نکتہ سمجھ سکتا — تقریب غم الفت تقریب فراغت ہے

آزاد علائق کا پابند ہو۔ ناممکن — ہر حال میں آزادی آزاد کی فطرت ہے

اختر۔ جناب سید علی اختر صاحب

ہر صبح طرب ساز صد شام مصیبت ہے — افسانۂ ہستی کا ہر لفظ قیامت ہے

رہ رہ کے تڑپ دلکی ہے برق غم ہستی — تھم تھم کے جھلک تیری اے حسن قیامت ہے

ہر ذرہ مضطر ہے جب شوق کا آئینہ — جلووں کی تڑپ یارب کیوں باعث حیرت ہے

بے پردہ پرستش میں اظہار عطا پنہاں — داماں قیامت بھی اک موجۂ رحمت ہے

اے جلوۂ پنہاں پھر مایل بیدادی — مدت سے سکوں پرور پھر روح محبت ہے

ہیں خواب کا افسانہ ایام وطن اختر — وہ ولولۂ عشرت آسودۂ غربت ہے

الم۔ جناب ڈاکٹر میر مہدی حسین صاحب رضوی

گھٹ جاتی ہے جو بڑھکر وہ تیری عنایت ہے
بڑھ کر جو نہیں گھٹتی وہ میری محبت ہے

دلخواہ جفا اسکی جاں بخش وفا اسکی
آفت ہے ادا اسکی انداز قیامت ہے

پاڑی ہے زمیں اب تو اس در کی جو ہو سو ہو
آ حشر اٹھا دیکھیں کتنی تری طاقت ہے

یا تیرے تغافل سے یا اپنے تحمل سے
زندہ ہوں مگر ظالم مردے کی سی حالت ہے

گر اس بت کافر کو دیتے ہو دل اپنا دو
کیا خوف الم صاحب ایمان کی سلامت ہے

باغ۔ جناب میر کاظم علیصاحب

گل میں تیری رنگت ہے گل میں تیری صنعت ہے
ہر شاخ کا ہر تنہ نیرنگ حقیقت ہے

کچھ شکوہ دشمن ہے کچھ تیری شکایت ہے
پر درد یہ قصہ ہے پر غم یہ حکایت ہے

وہ دل ہوں کہ جس دل میں نیرنگ حقیقت ہے
وہ چشم تماشا ہوں جس میں تری صورت ہے

یارب دل گم گشتہ مل جائے تو اچھا ہو
سوئی ہوئی قسمت کی کھوئی ہوئی دولت ہے

دل سونپ دیا اس کو مدت سے تقاضہ تھا
اللہ حافظ ہے آ گئے مری قسمت ہے

زلفوں نے جمایا ہے وہ رنگ سر محشر
گھنگھور گھٹاؤں میں پوشیدہ قیامت ہے

فتنے ترے رستے کے کہتے ہیں یہ اٹھ اٹھکر
ہشیار وہ آتے ہیں اٹھنے کو قیامت ہے

یہ شاخ کی جنبش ہے بازار ہے قدرت کا
یہ پھول کی نکہت ہے ایجاد قدرت ہے

اک دل ہے وہ افسردہ اک سر ہے وہ آشفتہ
یہ باغ کی پونجی ہے یہ باغ کی دولت ہے

تصور۔ جناب سید علی نواز صاحب رضوی

وہ حسن لطافت سے سرمایہ حیرت ہے
صورت میں ہے آئینہ آئینہ میں صورت ہے

بو پھول کی اڑنے میں کچھ دیر نہیں لگتی
ہستی کے چمن کی بس اتنی ہی حقیقت ہے

ہے مہد جنوں پیدا اے نجد نژاد من
جو بال کا بگولا ہے وہ قیس کا قامت ہے

خون دل عاشق کو بیدرد بہاتا جا
مارا ہوا اچھا ہے لوٹی ہوئی دولت ہے

سعد جگری کو ہاں بیتابی دل چمکا
اس آگ کے شعلوں میں بجلی کی صورت ہے

ہیں زخم کے دامن کو صحرائے جنوں سمجھا ٹانکوں میں مگر قاتل تار رگ وحشت ہے
رونے میں یہ ہنسنا ہے ہنسنے میں وہ ہے رونی اب شمع و تصور کی محفل میں یہ حالت ہے

ضامن۔ محمد سید ضامن کنتوری

پیمانہ سے رندوں کا پیمانِ ارادت ہے ہر موج شراب ان کو محراب عبادت ہے
ہے مستحق رحمت زحمت کش محرومی زحمت جسے سمجھے ہو دیباچۂ رحمت ہے
اے ذوق تماشا بس اے جوش تمنا بس کیا تاب ہے ذرّے کی کیا ظرف کی وسعت ہے
یہ دعوے خودداری سر نفس فروشی پہ ق ممنون سفارش ہے محتاج شفاعت ہے
آنا ہے تو مردانہ میدان عمل میں آ زانوئے تامل کب جولانگہ ہمت ہے
ہستی کے تصور میں شکل اپنی نظر آئے اک صورت وہی کو ہم سمجھے حقیقت ہے
کیوں عمر کو کہتے ہیں یہ لوگ گرانمایہ جب زیست کا بیڑا یہ رکھوائی حاجت ہے
تقلیل تمنا کر اے طالب آسایش مرہون زوائد کو ہر بات مصیبت ہے
ہاں کس بات پہ ہے نازاں او یرزہ دراضامن کیا سر پہ کوئی تیرے دستار فضیلت ہے

عدیل حضرت سید محمد عسکری صاحب کنتوری

ہم کچھ نہیں کہہ سکتے جادو ہے کرامت ہے بتخانہ کو دیکھ آئے اللہ کی قدرت ہے
ہوں ظلم و ستم لاکھوں کچھ بھی نکریں پروا ہم حق پہ رہیں قایم یہ عین شجاعت ہے
یہ جھریاں پڑی ہیں جوجیں ہیں سراپو بھی سرچشمۂ ہستی کیا آئینۂ حکمت ہے
جب دور چلے ساقی تھوڑی سی پلادینا توبہ پہ بھی قایم ہوں تیری بھی مروت ہے
کچھ شرم و حیا ہوتی کچھ مہر و وفا ہوتی دل لے کے مکرتے ہو یہ شان مروت ہے
گردش میں ہے پیمانہ ہاں دور چلے ساقی کیا جانئے کل کیا ہو جو دم ہے غنیمت ہے

دکھلائیں عدیل آؤ دیکھو تو لسان الملک

جو صفحۂ رنگیں ہے گلزار فصاحت ہے

واصفی۔ جناب مولوی محمد عبدالصمد صاحب

یہ عالم ہستی اک آئینۂ حیرت ہے　　ہر رنگ کا نقشہ ہے ہر رنگ کی صورت ہے
کہنا بھی زباں سے کچھ میرے لئے آفت ہے　　جب شکر یہ وہ بگڑیں کیا جای شکایت ہے
میں چشم سے ساقی کی آیا ہوں جو چکر میں　　دور ہے ساغر بھی کیا گردش قسمت ہے
اس برق تجلی سے یہ پوچھ رہا ہوں میں　　دل کس نے جلایا ہے یہ کسکی شرارت ہے
ہم نے ترے کوچے میں پائی نہ ذرا راحت　　جنت کو سلام اپنا گر ایسی ہی جنت ہے
کس گل سے جدا ہو کر یہ رنگ ہوا اس کا　　کیوں اسقدر آوارہ گلزار میں نکہت ہے
اے واصفی اُن سے تھی کب جور کی بھی امید　　ہم جانتے ہیں اُنکی ہمپر یہ عنایت ہے

واقف۔ جناب واقف صاحب

کہنے ہیں نہ جو آئے اے دل یہ وہ لذت ہے　　احباب کا شکوہ بھی اک جزو محبت ہے
قاضی بھی ستم پیشہ ساقی بھی خفا ہم سے　　اس جام شکستہ پہ پھوٹی ہوئی قسمت ہے
جلوہ ترا شامل ہے ہر سُوزش پنہاں میں　　چھالا مرے دل کا ہے یا دیدۂ حسرت ہے
خاک دل عاشق کی اب تک ہے یہ بربادی　　کچھ گوشۂ تربت میں اک بوئی محبت ہے

محشر میں بھی واقف کی نظریں تری جانب ہیں
ابتک وہی مستی ہے ابتک وہی صورت ہے

یٰسین۔ جناب غلام یٰسین صاحب قایم خانی

فرقت کی اذیت بھی کیا طرفہ اذیت ہے　　جینا تو مصیبت تھا مرنا بھی مصیبت ہے
نظروں ہی سے مارا بھی نظروں نے جلایا بھی　　آنکھوں میں ستمگر کی جادو ہے کرامت ہے
بے ساختہ وہ جلوہ ہوسی کی وہ بیہوشی　　رحمت میں بھی زحمت ہے وصلت میں بھی فرقت ہے
آئینے میں عکس رُخ کس طرح جما تیرا　　آئینے کی حیرت سے بڑھکر مجھے حیرت ہے

اُس بندۂ الفت کو پروا نہیں کچھ اسکی
یٰسین حزیں سے اب اور کوئی ملامت ہے

نگہ از ین ورق روشن سوادِ جلوہ خوانی کن

لسان الملک

نمبر (۵و۶)	مئی و جون ۱۹۲۴ء	جلد (۲)

رشحاتِ کلکِ جواہر سلک

ہز اکسلنسی راجہ راجایان مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر یمین السلطنتہ جی سی آئی ای المتخلص بہ شاد صوفی۔

جس میں اثر نہیں ہے وہ ہے فغاں ہماری — خونابہ ریز آنکھیں ہیں رائیگاں ہماری
مانے ہوئے تھا شاہی سارا جہاں ہماری — سمجھے ہوئے تھا عزت ہندوستاں ہماری
بے نام و بے نشاں ہیں گم کردہ کارواں ہیں — پوچھو نہ حالتِ دل اہل جہاں ہماری
ہند و عرب کے دریا قبضے میں تھے ہمارے — جاری سمندروں میں تھیں کشتیاں ہماری
مغرب کی وادیوں میں پڑھتے تھے ہم نمازیں — فاراں کی گھاٹیوں میں گونجی اذاں ہماری
شیرازۂ سیاست بکھرا تھا ہم نے باندھا — قانون دیں ہیں دیکھو دل سوزیاں ہماری
اک دن وہ تھا کہ عزت دیتے تھے ہم جہاں کو — اک یہ ہے کہ ذلت ہے ہمعناں ہماری
اک دن وہ تھا کہ نوبت بجتی تھی اپنے در پر — اب بوم ڈھونڈھتے ہیں سقفِ مکاں ہماری
خیبر کے پتھروں میں گاڑا ہے ہم نے نیزہ — بدر و اُحد میں چمکی تیغ و سناں ہماری

ہم نے دُھوئیں اُڑائے روما کی سلطنت کے — مانے ہوئے تھا اٹلی شہ زوریاں ہماری
ہم کیا تھے یرشلم کے مینار جانتے ہیں — اونچی تھیں آسماں سے سرداریاں ہماری
فغفور اپنا تابع قیصر مطیع اپنا — مانے ہوئے حکومت ہر حکمراں ہماری
کفار کے سروں پر چمکیں ہماری تیغیں — سینوں میں دشمنوں کے ڈوبی سناں ہماری
ہم آٹھ سو برس تک فرمانروا رہے ہیں — تھی شان سلطنت کی شان نشاں ہماری
دنیا کے تکدوں کو ہم نے بنایا مسجد — گرجاؤں میں بھی گونجی صوت اذاں ہماری
ہر طرح شاد کامی ہمکو رہی میسر — لیکن بہار اب ہے صرف خزاں ہماری

اے شاد ہم ہیں حق پر تم یہ یقین رکھو
محنت کبھی نہ ہوگی یہ رایگاں ہماری

دیگر

دہر کا انقلاب ہوں اب مرا اعتبار کیا — ذلت لازوال ہوں عزت و اقتدار کیا
سرخوش عہد الست ہوں کیوں نہ ہوں بلا پسند — میں ہوں بلاکش ازل مجھ کو بلا سے عار کیا
نالۂ دلگداز ہوں آہ جگر خراش ہوں — شعلہ شررفشاں ہے کیا برق شرارہ بار کیا
محو جمال یار ہوں رہن خیال یار ہوں — اُٹھ گئے سب حجاب حسن آنکھ ہو پردہ دار کیا
پشت فرس ہے زیر جل گردن خر میں طوق زر — ابلق روز و شب پہ ہے چرخ بھی شہسوار کیا
تاج تعز من تشاء ہم کو خدا نے تھا دیا — سمجھے مگر نہ عیش میں تاج کا ہے وقار کیا
ہند عرب کی سرزمیں سرخ ہمارے خون سے ہے — ایسا بھی قوم کا کوئی دیکھا ہے جاں نثار کیا
دہر سے عدل اُٹھ گیا داد طلب ہوں کس سے ہم — اس نئی روشنی میں اب دن ہوا تیرہ و تار کیا
تھا ہمیں جن پہ اعتبار انکو ہمیں سے بغض ہے — ہوگئی جس سے دشمنی اُس پہ ہو اعتبار کیا
دامن صبح چاک ہے ماہ کا چہرہ بھی ہے فق — دیکھ لیا مگر مرا سینۂ داغدار کیا

شاد نے دل بھی دیدیا جان حزیں بھی نذر کی
دیکھا ہے آپنے کہیں ایسا وفا شعار کیا

امواجِ شمسی

ہر شے میں ترا جلوۂ زیبا نظر آیا | مجھ کو تو اندھیرا بھی اُجالا نظر آیا

سائنس کی ترقی نے اس حقیقت کو روشن کر دیا ہے کہ آفتاب کی سطح پر گیاس کی ایک عظیم الشان موج کا جزر و مد ہمیشہ رہتا ہے جس کی محرک آفتاب کے متعلقہ ستارے ہیں بالکل اسی طرح جس طرح کہ ہمارے کرے (زمین) کی امواج محیط کا محرک چاند ہے لیکن اس بڑی موج سے ہم کو چنداں تعلق نہیں کیوں کہ اس کا اثر ہم تک کبھی نہیں پہنچتا البتہ اس بڑی موج کے علاوہ اور موجیں بھی آفتاب سے اُٹھتی ہیں جن کی حرکت زمین تک پہنچتی اور عجیب و غریب اثرات ظاہر کرتی ہے جن سے ہم ہمیشہ متاثر ہوتے رہتے ہیں۔

ہے یہ کہ موجیں ہی تو ہیں جن سے دنیا میں یہ سب کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ انہیں موجوں ہی کی بدولت ہم دیکھتے سنتے جیتے جاگتے اور سب کچھ کرتے ہیں اگر یہ نہوں تو پھر کچھ بھی نہ ہو۔

آفتاب کی طرح دوسرے ستاروں سے بھی موجیں اُٹھتی اور ہم تک اُن کی روشنی پہنچاتی ہیں اگر یہ نہوں تو ہم ستاروں کے وجود سے بیخبر ہیں اور فطرت کی بہت بڑے چمنستان نور کی سیر کا لطف نہ اٹھا سکیں اور نہ ان پر طرح طرح کے قیاسات قائم کر کے اپنے شعر و ادب کے تاج کی ترصیع کا موقعہ پا سکیں۔ لیکن ان کا فائدہ بس اسی قدر ہے ورنہ ہماری زندگی پر ان سے اور کسی طرح کا بدیہی اثر نہیں پڑتا۔ تیسری قسم کی موجیں وہ ہیں جن کو امواجِ صوتی کہتے ہیں۔ ہر نغمہ ہر راگ، ہر گفتگو اور دنیا کا تمام شور و ہنگامہ انہیں موجوں سے پیدا ہوتا ہے یہ موجیں بھی ہمارے لئے نہایت ضروری ہیں اس لئے کہ حواس خمسہ میں سے شنوائی کی طاقت اگر زایل ہو جائے تو انسان کی زندگی کا آدھا لطف جاتا رہے اور شنوائی اُسی وقت بکار آمد ہے جب آواز کا وجود ہو۔ امواجِ صوتی کے نسبت یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کا تعلق آفتاب سے نہیں ہے کیونکہ یہ ہوا، پانی، پتھر اور دوسرے مادوں سے اٹھتی ہیں اور آفتاب کے اور ہمارے درمیان کروڑہا

میل تک مادے کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ ایک زمانہ میں لوگوں کا خیال تھا کہ اجرام شمسی جب حرکت کرتے ہیں تو ان کی حرکت سے آواز پیدا ہوتی ہے۔ یہ خیال خوش آیند ضرور تھا مگر حقیقت سے بعید تھا اب سائنس نے ثابت کردیا ہے کہ آواز کی موجوں کا مورث مادہ ہے۔ ممکن ہے کہ دوسرے عالموں کے مادوں سے بھی آواز پیدا ہوتی ہو لیکن ہم تک اُس کا پہنچنا محال ہے۔ اسی لئے ہم یہ کہیں گے کہ گو آفتاب میں بھی آواز کا ہونا تسلیم کیا جاسکتا ہے اور تسلیم کرنا چاہیئے اس لئے کہ جب اسکی گیاسیں پھٹتی ہوں گی تو ضرور ایک شور مچتا ہوگا لیکن چونکہ ہمارے اور آفتاب کے درمیان مادے کا وجود نہیں ہے اور امواج صوتی مادے ہی سے ٹکرا کے پھیلتی ہیں تو پھر آفتاب کی امواج صوتی کے ہم تک پہنچنے کا ذریعہ کیا ہے؟

یہیں سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آفتاب کی وہ موجیں کس ذریعہ سے زمین تک پہنچتی ہیں جو ہم کو حرارت، روشنی اور حیات بخشتی ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارے اور آفتاب کے درمیان ایک چیز ہے جس کو ایتھر (ایثر) کہتے ہیں بلکہ صحیح طور پر یوں کہئے کہ آفتاب، زمین چاند بلکہ کل ستارے سب کے سب ایتھر کے ایک عظیم الشان اور بے کنار سمندر میں پیرتے رہتے ہیں۔ شاید پیرنے کا لفظ بھی ناموزوں ہوگا اسلئے کہ ہم اور اور جو کچھ بھی ہے وہ ایتھر کے اوپر نہیں ہے بلکہ ایتھر کے اندر ہے جو کل عالم کو محیط ہے۔ یہی وجہ ہے ہر ستارہ خواہ وہ کتنے ہی بعید از قیاس فاصلے پر ہو، اپنی موجیں ہم تک بھیج سکتا ہے اس لئے کہ ہم دونوں ایک ہی محیط اعظم (ایتھر) میں گھرے ہوئے ہیں غرضکہ آفتاب سے ہم تک جو پہنچتی ہیں وہ ایتھر کی موجیں یا امواج اثیری ہیں اور چونکہ تمام اثیری موجیں حقیقتًہ ایک نوعیت کی ہیں اور ایک ہی راستے پر حرکت کرتی ہیں*۔ ہم ان موجوں کو مختلف ناموں سے یاد کرتے اور انکی نسبت یہ خیال کرتے ہیں کہ وہ باہم ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں رکھتیں مگر ہے یہ کہ وہ سب ایک ہیں اور یہ حقیقت اس واقعہ سے ثابت ہوتی ہے کہ وہ آفتاب سے ہم تک ایک ہی رفتار سے سفر کرتی ہیں۔

ان موجوں کی رفتار کا مسئلہ بھی ہمارے لئے خاص دلچسپی رکھتا ہے ہم یہ فطرتًا معلوم کرنے کے لئے کوشاں رہتے ہیں کہ کونسی چیز کس قدر تیز رفتاری سے چلتی ہے۔ آدمی،

* اس لئے ایک ہی رفتار سے حرکت کرتی ہیں۔

گھوڑا گاڑی۔ موٹر کار و ریل گاڑی ان میں سے ہر ایک کی رفتار کم زیادہ ہوتی ہے کہتے ہیں کہ جرمنی میں ایک ریل گاڑی ایک ہی پٹری پر برقی قوت سے چلائی گئی تھی جس نے ایک گھنٹے میں ۱۳۰ میل کی مسافت طے کی تھی۔ موٹر کاروں اور آلہ ہائے پرواز کی رفتار کا مقابلہ اس رفتار سے کیا جا سکتا ہے مگر گولی کی رفتار اس سے تیز ہوتی ہے زمین بھی بقول شخصے ایک نیم گرم گولی ہے جس پر ہم بستے ہیں اسکی رفتار بھی فی سکنڈ (ثانیہ) ۲۰ میل ہے جو خاصی رفتار ہے۔ ریڈیم جس وقت مشتعل ہوتی ہے تو اس کے ذرات ٹوٹ کر اس طرح اڑتے ہیں جیسے بندوق سے گولی نکل کر جاتی ہے، ان کی رفتار ہزارہا میل فی سکنڈ ہوتی ہے۔ خوش قسمتی سے یہ ذرّے بہت ہی چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں ورنہ جو چیز ان کے سامنے آجائے وہ پاش پاش ہو جائے۔ فولادی تختی سے یہ ذرات اس طرح گزر جاتے ہیں جیسے آٹے کے ریزے چھلنی سے۔

اس پر بھی جب ان رفتاروں کا مقابلہ امواج شمسی کی رفتار سے کیا جاتا ہے تو یہ چیزیں ان کے سامنے غیر متحرک یا زیادہ سے زیادہ رینگتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ اس لئے کہ روشنی کی شعاعیں اور دیگر امواج شمسی (کہ ان کو بھی روشنی سے تعبیر کر سکتے ہیں بشرطیکہ ہماری آنکھیں دیکھنے کی تاب لا سکیں) فی سکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو (۱۸۶۲۰۰) میل کی مسافت طے کرتی ہیں۔ یہ ہے رفتار امواج شمسی کی جو ایتھر کے بحر زخار میں جولانی دکھاتی رہتی ہیں اور جن کا مقابلہ دنیا کی کوئی متحرک چیز نہیں کر سکتی۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ تمام موجیں جو ایتھر کے سمندر میں گرم جولاں ہیں انکی رفتار ایک ہے پھر چاہے یہ موجیں آفتاب سے اٹھتے ہوں یا دوسرے اجرام فلکی سے۔ آفتاب ہم سے .... میل کے فاصلہ پر ہے اس لئے اس کی موجیں یا شعاعیں ہم تک ۸ ½ منٹ میں پہنچتی ہیں، لیکن دوسرے ستارے جو ہم سے بہت زیادہ فاصلے پر ہیں ان کی موجیں باوجود یکہ اسی رفتار سے چلتی ہیں پھر بھی کہیں برسوں میں ہم تک پہنچتی ہیں لیکن یہ مسلمہ ہے کہ روشنی کی شعاعیں چلتی ایک ہی رفتار سے ہیں اور ابتدا سے انتہا تک ان کی رفتار میں کمی بیشی نہیں ہوتی۔ اس کے یہ معنے ہوئے کہ جب آفتاب کی وہ شعاعیں (موجیں) جن سے ہم اس کو دیکھتے ہیں ہم تک ۸ ½ منٹ میں پہنچتی ہیں تو بعض دور دراز ستارے ہزارہا سال قبل اپنی موجیں بھیج چکے ہوں گے

اگرچہ ہماری نظریں ان کو آج دیکھ رہی ہیں کیونکہ قریب سے قریب ستارے کی روشنی بھی اب سے چار سال پہلے اسکو چھوڑ چکی ہے۔

یہاں تک نور رفتار کا ذکر تھا اب ہم امواج شمسی کی بعض اور خصوصیتوں پر نظر کرینگے یہہ موجیں بڑی بھی ہوتی ہیں اور چھوٹی بھی اور بعض تو اسقدر چھوٹی ہوتی ہیں کہ ایک انچ جگہ میں ہزاروں کی تعداد میں سما جاتی ہیں مگر ہیں وہ سب موجیں ٹھیک اسی طرح جیسے سمندر کی موجیں کہ کوئی تو بہت بڑی ہوتی ہے اور کوئی بالکل ہی چھوٹی مگر اس چھٹائی بڑائی سے ان کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں آتا البتہ جس طرح سمندر کی بڑی اور چھوٹی موجیں جہازوں، کشتیوں یا دوسرے پانی میں تیرنے والی اشیاء پر مختلف اثر ڈالتی ہیں اُسی طرح آفتاب کی موجیں اپنی درازی و کوتاہی کے لحاظ سے ہم پر مختلف اثر پیدا کرتی ہیں۔

ہم سمندر میں دیکھتے ہیں کہ بڑی موجیں اپنے مد و جزر میں زیادہ وقت لیتی ہیں لیکن چھوٹی چھوٹی لہریں نامحسوس وقت میں اٹھتی اور فرو ہو جاتی ہیں اگر ہم ساحل کے کنارے کھڑے ہو کر بڑی اور چھوٹی موجوں کی فی منٹ رفتار کا شمار کریں تو ہم کو بڑا فرق معلوم ہوگا بظاہر یہ صورت خیال کو پریشان کرنے والی ہے خصوصاً اس بات کو معلوم کرنے کے بعد کہ امواج شمسی کی رفتار ہمیشہ ایک رہتی ہے مگر اس کا سبب یہ ہے کہ بڑی موجوں میں مد و جزر بدیر ہوتا ہے یعنے اٹھنے اور گرنے کی تعداد اوقات کم ہوتی ہے برخلاف اس کے چھوٹی لہریں بہت جلد جلد اٹھتی اور گرتی ہیں اس کی مثال بہت ہی آسان ہے۔ فرض کرو کہ ایک پانچ چھ برس کا لڑکا ایک جوان آدمی کیساتھ راہ چل رہا ہے راستہ چلنے میں جوان جتنی دیر میں ایک قدم اٹھاتا ہے اتنی ہی دیر میں لڑکا دو قدم اٹھاتا ہے کیونکہ جوان کا قدم لڑکے کے قدم سے دور پڑتا ہے اور زیادہ جگہ گھیرتا ہے مگر آخر میں چلکر دونوں ایک معینہ مسافت کو ایک ہی وقت میں طے کرتے ہیں یہی حالت آفتاب کی چھوٹی لہروں کی ہے اور ان کا شمار بھی کیا گیا ہے۔ جس لہر کو ہم سُرخ روشنی سے تعبیر کرتے ہیں وہ خلا یا فلک اثیر میں فی سکنڈ ایک لاکھ چھیاسی ہزار دو سو میل چلتی ہے اور اسکا مد و جزر یا چڑھاو اُتار فی سکنڈ (.........) بار ہوتا ہے لیکن اُودی روشنی کا مد و جزر سرخ روشنی کا تقریباً دوچند ہوتا ہے حالانکہ دونوں

قسم کی روشنیاں خلا میں ایک ہی رفتار سے چلتی ہیں؛ امواج شمسی کا اثر ہمارے اوپر
ان کے مدوجزر کی کثرت وقلت کے لحاظ سے مترتب ہوتا ہے اور یہی قابل لحاظ مسئلہ
ہے یعنے جبکہ لہروں کا چڑھاؤ اُتار فی سکنڈ ۴۰ سنکھ ہوتا ہے تو ہمکو اس کی روشنی سرخ
نظر آتی ہے جب وہ کسی قدر اور تیز ہوتا ہے تو ہم زرد دیکھتے ہیں اور جب اسکی تیزی
تقریباً (۸۰) سنکھ فی سکنڈ ہوتی ہے تو اُودا نظر آتا ہے اور جب یہ مدوجزر اس سے بھی
زیادہ تیز ہوجاتا ہے تو اُسوقت ہمکو کچھ نہیں دکھائی دیتا اور ہم کہتے ہیں کہ کچھ نہیں ہے
لیکن یہی ہماری غلطی ہے اس لئے کہ روشنی اب بھی موجود ہے اگرچہ ہماری آنکھیں
اس کو نہیں دیکھ سکتیں۔ یہ روشنی اس قسم کی ہے کہ ہم اس کو کسی رنگ کا نام نہیں
دے سکتے۔ کیونکہ ہمارے لئے اُسمیں کوئی رنگ نہیں ہے اس لئے ہم اُسکو اودی سی تیز
روشنی کہیں گے۔ تقریباً تیس سال قبل ایک عالم نے اس بات کو دریافت کیا ہے کہ
چونٹیاں اس اودی سی تیز روشنی کو دیکھ سکتی ہیں مگر ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کو اسکا
رنگ کیسا نظر آتا ہے اتنا تو معلوم ہوا ہے کہ وہ اس کو دیکھتی اور اُس سے خوف
کرتی ہیں اگر تم اودی روشنی ان کے بچوں پر ڈالو تو انہیں اُس سے کوئی خوف نہ ہوگا
لیکن اگر اودی سی تیز روشنی ان کے سوراخ میں پہنچاؤ تو وہ فوراً سوراخ چھوڑ کر اور
اپنے انڈے بچے لیکر بھاگ جائیں گی اس خوف سے کہ مبادا ان کو ضرر نہ پہنچ جائے۔

ہمکو آفتاب کی موجوں کے منجملہ روشنی کی موجوں یا شعاعوں کے متعلق زیادہ معلومات
حاصل ہے اس لئے ہم انہیں کا ذکر کریں گے لیکن سلسلہ بیان کے قایم رکھنے کے لئے
مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم بڑی سی بڑی موجوں سے جن کا چڑھاؤ اتار بہت سست ہوتا
ہے شروع کرکے روشنی کی موجوں تک پہنچیں جن کی جگہ بڑی سی بڑی اور چھوٹی سی
چھوٹی موجوں کے تقریباً درمیان میں ہے۔ روشنی جو آفتاب سے ہم تک آتی ہے
وہ ہمکو "سفید" نظر آتی ہے مگر نیوٹن نے سب سے پہلے جو تجربہ کیا وہ یہ تھا کہ اس نے
کھڑکی میں سوراخ کرکے اسمیں ایک پہلودار شیشہ کا ٹکڑا بٹھادیا اس شیشے کے ٹکڑے
گزر کر جو روشنی مقابل کی دیوار پر منعکس ہوئی وہ مختلف رنگ کی تھی اسکو نیوٹن نے
spectrum کا نام دیا تھا اور اب ہم یہ جانتے ہیں کہ سفید روشنی آفتاب
کی مختلف امواج کے ملنے سے پیدا ہوتی ہے اور اسی کو دن کی روشنی کہتے ہیں۔

چونکہ پہلودار شیشے میں سے گزرتے وقت بعض قسم کے موجوں کو بمقابلہ بعض کے پیچ کھانا پڑتا ہے اور اس طرح وہ ایک دوسرے سے جدا جدا ہو کر شے مقابل پر ایک جگہہ منعکس ہونے کے بجائے الگ الگ اور اپنے اپنے رنگ میں منعکس ہوتی ہیں اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ سفید روشنی میں یہ سب رنگ شامل ہوتے اور اُس سے حاصل کئے جا سکتے ہیں اسی لئے کہا گیا ہے کہ "روشنی رنگوں کی ملکہ ہے"۔

جب ہم ایک پہلودار شیشے کو لے کر دیکھتے ہیں تو ایک کنارے پر سُرخ اور دوسرے پر اُودا رنگ نظر آتا ہے اندھیرے ہیں (لیکن چونٹیاں اس اندھیرے کو اُجالا دیکھتی ہیں) اُودے رنگ کے بعد اُودی سی تیز رنگ کی موجیں موجود ہوتی ہیں اور اگر ہم شیشے کے اس پہلو میں جہاں سُرخ رنگ کے نیچے اندھیرا دکھائی دیتا ہے تھرمامیٹر لگائیں تو وہ گرم ہو جائے گا۔ وجہ یہ ہے کہ یہاں بھی آفتاب کی موجیں موجود ہیں جن کو سُرخ سی ہلکی موجیں کہتے ہیں یہی وہ موجیں ہیں جن کے اثر کو محسوس کر کے کہتے ہیں کہ آج آفتاب گرم ہے۔

حسب ذیل نقشے کو دیکھئے اس سے واضح ہوگا۔

آفتاب
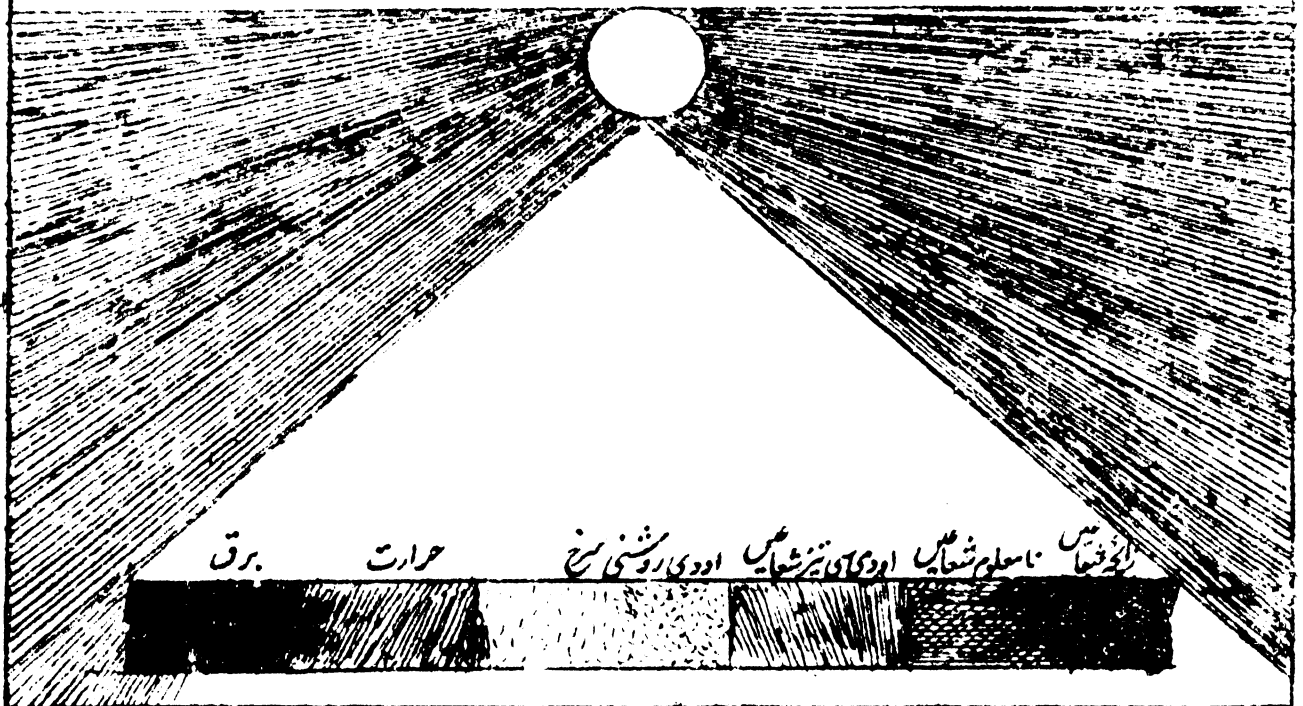
کہ اُودی سے تیز شعاعوں کے آگے بھی شعاعیں ہیں جنکو نہ ہم دیکھ سکتے، نہ محسوس کر سکتے ہیں اور نہ ان کے متعلق کوئی علم رکھتے ہیں لیکن ان کی موجودگی یقینی ہے ان میں سے

بہت چھوٹی اور بہت تیز رفتار شعاعیں غالباً وہی ہیں جنکو اکس ریز یا رانجنی شعاعیں کہتے ہیں۔ یہ نام جرمن پروفیسر رانجن کا دیا ہوا ہے جس نے سب سے پہلے ان شعاعوں کو دریافت کیا تھا حرف × انگریزی جبر و مقابلہ میں عدد یا مقدار نامعلوم کے لئے مستعمل ہوتا ہے اور چونکہ ان کا حال نامعلوم تھا اس لئے پروفیسر انجن نے ان کو اکس ریز کا نام دیا جواب تک ان کے ساتھ چلا آتا ہے ممکن ہے کہ ایتھر کی بہت چھوٹی چھوٹی نامحسوس لہریں ہوں، اور یہ بھی ممکن ہے کہ آفتاب کی خفیف ترین موجیں ہوں جو ہم سے میلوں اُدھر فضائے جوی یا کرۂ ہوا میں مخلوط ہو کر رہ جاتی ہیں اسوجہ سے ہم تک کبھی نہیں پہنچتیں۔

ہمارے مندرجۂ صدر نقشے میں کسی جگہ آفتاب کی وہ لہریں بھی ہوں گی جو قطب نما کی سوئیوں پر ایسا عجیب و غریب اثر ڈالتی ہیں ہم کو یہ بات تو معلوم ہی ہے کہ بعض قسم کی دھاتوں میں مقناطیسیت پیدا کی جاسکتی ہے جس سے وہ ایک خاص سمت کی طرف پھر سکتی ہیں بشرطیکہ اُن میں کافی مقناطیسیت ہو کیونکہ خود زمین ایک بہت بڑی مقناطیس ہے جو ان کو اپنی جانب کھینچتی رہتی ہے۔ مقناطیسیت سمندر کے نامعلوم راستوں میں ہمارے جہازوں کی رہنمائی کرتی ہے اس کے علاوہ اور صورتوں میں بھی اس کا عمل دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔ اکثر اوقات ہمکو آفتاب میں دھبے نظر آتے ہیں اور ہمکو یہ بھی معلوم ہے کہ یہ دھبے اُن ہولناک مقناطیسی طوفانوں کے نقش قدم ہیں جو آفتاب میں آئے دن آتے رہتے ہیں یہ حقیقت اب پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ مقناطیسی سوئیوں کی حرکت آفتاب کی انہیں طوفانوں کی تابع ہے جو ۹ کروڑ میل کے فاصلہ سے اپنا اثر ڈالتے ہیں۔

لیکن جب یہ امر فیصل شدہ ہے کہ "ہر شے اسی جگہ پر اپنا عمل کرتی ہے جہاں وہ ہے" تو مقناطیسی طوفان کے اثر کا گرینج میں مقناطیسی سوئیوں پر مترتب ہونا یہ معنے رکھتا ہے کہ ایسی لہریں موجود ہیں جو آفتاب سے چلکر گرینج تک پہنچتی اور وہاں پہنچ کر اپنا عمل کرتی ہیں اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں، یا اگر ہم ان کی پیمایش کر سکے تو کسیدن کہہ سکیں گے کہ ہمارے نقشے میں ان کی جگہ کہیں نہ کہیں اکس (×) ریز کے قریب ہے۔

آفتاب کی معمولی روشنی کے متعلق جو تمام رنگوں کا مجموعہ ہے صرف ایک بات کہنی ضروری معلوم ہوتی ہے اور وہ یہ کہ

ہماری زندگی کا اِمکان اسی روشنی کیوجہ سے ہے

بیشمار صدی قبل جب کرۂ ارضی کی ہوا بہت غلیظ او ر گرم تھی اور آفتاب کی موجیں اسمیں سے گزر کر سطح زمین یا سطح سمندر تک نہیں پہنچ سکتی تھیں اسوقت لازمی طور پر اس کرہ میں ادنے درجہ کی حیات مثل اُن چھوٹے چھوٹے کیڑوں کے پائی جاتی ہوگی جو آفتاب کی روشنی کا تحمل نہیں کرسکتے اور اس کو دیکھ کر مرجاتے ہیں مگر جیسی جیسی زمین ٹھنڈی اور اس کے اطراف کی ہوا لطیف ہوتی گئی ویسی ویسی آفتاب کی روشنی اسمیں سے مرور کرنے لگی اور زمین جیسی جیسی اس سے اثر پذیر ہوتی گئی اسمیں اعلیٰ قسم کے جانداروں کا وجود ممکن ہوتا گیا۔ آفتاب کی روشنی کی موجیں سطح زمین پر رہنے والے نباتات وحیوانات کی یکساں روح پرور ہیں اگر یہ نہ ہوتیں تو شاید چند حشرات اور بوٹیوں کے سوا حیات نباتی وحیوانی کا وجود ہی نہ ہوتا۔ دنیا بجائے دار الحیوٰۃ ہونے دار الموت ہوتی۔ حیات اپنی بقا و قیام کے لئے قوت چاہتی ہے اور آفتاب کی موجیں قوت ہیں ہم دیکھتے او جانتے ہیں کہ پانی کی قوت اور سمندر کی موجیں بڑی بڑی کلوں اور جہازوں کو متحرک کردیتی ہیں۔ اچھا تو آفتاب کی موجوں میں یہ قوت ہے کہ وہ حیات کی کل کو حرکت میں رکھتی ہیں۔ ہری پتیاں آفتاب کی موجوں کو شیر مادر کی طرح پی جاتی ہیں اور اُسی کی قوت سے پھول پھل دیتی، جنگلوں، باغوں، اور کھیتوں کو ہرا بھرا رکھتی ہیں۔ ہماری ہر سانس ہماری ہر جنبش، ہماری ہر حرکت بلا واسطہ امواج شمسی کی تحریک سے سرزد ہوتی ہے غرضکہ ہر جاندار کا ہر فعل و عمل روشنی کی متغیر صورت ہے ہم یہ خیال کرتے ہیں کہ روشنی محض دیکھنے کی قوت دیتی ہے، لیکن حقیقت نفسُ الامری یہ ہے کہ اگر روشنی نہوتی تو نہ آنکھوں کا وجود ہوتا اور نہ اُن رگوں کا جن کے قبض وبسط پر آنکھوں کی بست وکشاد منحصر ہے یعنے وہ غذا ہی نہ ہوتی جو ان کے زندہ رکھنے کے لئے خون پیدا کرتی ہے۔

ہم آفتاب کی صرف انہیں امواج روشنی سے مستفید نہیں ہو رہے ہیں جو اس وقت ہم پر گرتی ہیں بلکہ اُن موجوں سے بھی فائدہ حاصل کر رہے ہیں جن کو زمین تک پہنچے زمانہ ممتد گزر چکا ہے۔ پتھر کی کوئلے کا ہر ڈھیلا جو ہزارہا ضرورتوں کے کام آتا ہے اور جس پر دنیا کے اہل تجارت کی نقل وحمل کا دارومدار ہے انہیں ہرے بھرے درختوں کی دفن شدہ ہڈیاں ہیں جو کبھی آفتاب کی روشنی پر جیتے تھے۔

ہم اوپر کہہ آئے ہیں کہ پہلو دار شیشے کے جس پہلو کی طرف سُرخ رنگ کی لکیر نظر

آتی ہے اس سُرخ لکیر کے آگے تاریکی میں اگر تھرما میٹر (مقیاس الحرارۃ) لگائیں تو وہ گرم ہو جائے گا جس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ سُرخ موجوں کے بعد اور موجیں بھی ہیں۔ یہ حرارت کی موجیں ہیں جو روشنی کی موجوں کے ساتھ ہم تک آتی اور روشنی کی موجوں کو ہمارے لئے کار آمد بنانے میں مدد دیتی ہیں۔ چونکہ یہ حرارۃ شعاعوں سے مرکب ہوتی ہے اسلئے اس کا مناسب نام حرارۃ مشتعل رکھا گیا ہے اور یہی مشتعل حرارت اور روشنی ہماری حیات کے ضامن ہیں۔ آفتاب کے ان کارناموں پر نظر کرتے ہوئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ اگلے زمانہ کے لوگ جو اس کے خالق سے ناواقف تھے اسی کو خدا جانتے ہوں لیکن آج کے روشن زمانہ میں بھی روشنی کو خدا کا پرتو کہنے والے موجود ہیں۔

اب اسی پیمانۂ امواج میں اور دیکھیئے تو معلوم ہوگا کہ امواج حرارت کے بعد دوسری موجیں بھی ہیں چنانچہ جس طرح پروفیسر رانجن نے اُن چھوٹی چھوٹی غیر محسوس اور سریع الحرکت موجوں کا پتہ لگایا تھا جن کا نام اس نے اکس ریز رکھا تھا اور ہم ان کو رانجنی شعاعیں کہتے ہیں اسی طرح کچھ عرصہ ہوا ایک شخص مسمی ہیرٹز نے ان موجوں کو دریافت کیا ہے جو اس کے نام پر ہیرٹزی موجیں کہلاتی ہیں یہ شخص چند سال ہوئے مر چکا ہے مگر اس کا نام بقائے دوام کے تاج کا درخشاں گوہر ہو کر چمکتا رہے گا اور یہ موجیں بہت طولانی ہیں جن میں بعض بعض تو نصف میل لمبی ہیں اور یہ برقی امواج ہیں یہ برقی موجیں دنیا کے لئے بہت کار آمد ثابت ہوئی ہیں اور انہیں سے بے تار خبر رسانی اور بے تار کے آلہ ہائے گفتگو وغیرہ میں کام لیا جاتا ہے لیکن اس کے سوا ان کے اور بھی فوائد ہیں جب ہم تمام واقعات کو یکجا کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کل مختلف الاقسام موجیں درحقیقت برقی امواج ہیں روشنی اور مشتعل حرارت اصل میں برقی امواج ہیں جو آفتاب کی بے تار کی متبرزی زمین پر بھیجتی رہتی ہے آفتاب فی الواقع برقی قوت کا بہت بڑا مرکز ہے جس کو وہ چھوٹی اور بڑی مختلف قسم کے موجوں میں ہم تک پہنچاتا رہتا ہے اور ہم ان کو روشنی، حرارت، برق، وغیرہ کے مختلف ناموں سے پکارتے ہیں۔

یہاں تک تو وہ باتیں بیان ہوئیں جو تحقیق شدہ ہیں۔ مگر اب ایک سوال اور باقی رہتا ہے اسی نیوٹن نے جس نے یہ دریافت کیا تھا کہ آفتاب کی روشنی مختلف رنگوں کا مجموعہ ہے اس عجیب و غریب قوت کا بھی پتہ لگایا تھا جس کا نام اس نے گراویٹیشن

(کشش مرکزی) رکھا ہے اور جس کی نسبت وہ کہتا ہے کہ یہ قوت آفتاب میں پائی جاتی ہے جو زمین کو اپنی طرف کھینچتی رہتی ہے اس طرح کہ اگر زمین خوش قسمتی سے گردش میں نہ ہوتی تو کھچ کر آفتاب سے جا ملتی۔ مگر زمین کی گردش اور آفتاب کی کشش میں ایسا کچھ توازن ہے کہ نہ تو اس کا تعلق آفتاب سے قطع ہوتا ہے اور نہ وہ سیدھی آفتاب کیطرف کھچ سکتی ہے بلکہ اس کے گرد چکر لگاتی رہتی ہے جب سے کہ سر ایزک نیوٹن نے اس نظریہ کو دریافت کیا ہے محققین بجائے خود اسکی فکر و جستجو میں ہیں کہ یہ کشش کیا ہے؟ مگر ابھی تک اس سے زیادہ کچھ نہ معلوم ہو سکا جتنا نیوٹن نے دریافت کیا تھا۔ اب بعض لوگ یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ کشش مرکزی آفتاب کی دوسرے امواج کی طرح برقی موج ہے جو ایتھر میں سے گزر کر کشش کا عمل کرتی ہے فقط اتنی بات حل طلب رہجاتی ہے کہ تمام امواج کا ہمکو علم ہے کہ طے مسافت میں وقت لیتی ہیں پس کشش مرکزی کی موج کو بھی وقت لینا چاہیئے لیکن بظاہر کشش مرکزی کی موج کی طے مسافت میں مطلق کوئی وقت صرف نہیں ہوتا بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے پھر بھی بہت ممکن ہے کہ ایسا نہو اور یہ معما بھی مستقبل کے ہاتھوں حل ہو جائے۔

اب ایک سوال اور رہجاتا ہے یعنے کہ آفتاب کے موجوں کو حرکت میں لانے والی کیا چیز ہے؟ اس کا جواب بھی ہے۔ یہ موجیں آفتاب کے ذرات یا اجزائے صغار سے شروع ہوتی ہیں جب یہ اجزائے صغار یا ذرے گرم ہو جاتے ہیں تو وہ فضائے ایتھری (ایتھر) میں لہر دوڑا دیتے ہیں جیسے جب برقی رو تار میں دوڑائی جاتی ہے تو تار گرم ہوجاتا ہے اور اسکی گرمی امواج ایتھری (ایتھر کی امواج) میں تحریک پیدا کرتی جس کو ہم برقی روشنی کہتے ہیں) اور یہ بھی یہ کہ تمام روشنی برقی ہے! ٹھیک اسی طرح جب آفتاب کے ذرات گرم ہوجاتے ہیں تو وہ موجیں بھیجنے لگتے ہیں جن کو روشنی اور حرارت سے تعبیر کیا جاتا ہے بعض وقت وہ اسقدر گرم اور روشن ہوجاتے ہیں کہ پھوٹ پڑتے ہیں اور ان میں سے گولیاں سی نکلنے لگتی ہیں۔ لیکن اب آخری سوال یہ ہے کہ وہ کیا شے جو ان ذرات آفتاب کو روح حرارت بخشتی ہے؟ اسکا جواب ابھی تک کسی نے نہیں دیا ہے ممکن ہے کہ آگے چلکر کوئی اسکا جواب بھی دیسکے لیکن اسی کے ساتھ نئے سوالات بھی پیدا ہو سکے وہی خدا جو عین نور و بطون بہا ہے اسکو جان سکتا ہے کہ اس کی قدرت کے جلوے کیا

کررہے ہیں اور کیا کرتے رہیں گے۔ ؎

کس ندانست کہ منزلگہ مقصود کجاست
اینقدر ہست کہ بانگ جرسے می آید

ضامن کنتوری

نغمۂ شوق

از جناب نواب مرزا جعفر علیخاں صاحب بی اے۔ اثر لکھنوی (الہ آباد)

(حضرت شاد صوفی مدظلہ کے تتبع میں)

---

(۱)

دلبر شیریں ادا دل ہے ترا مبتلا
تو ہے مرا مدعا درد دیا کردوا تیرا ہی ہے آسرا کوئی نہیں دوسرا سن لے مری التجا
دلبر شیریں ادا دل ہے ترا مبتلا

(۲)

غم میں ترے اے حسین لب پہ ہے جان حزیں
درد ہوا دلنشیں چین کوئی دم نہیں خوں ہیں ہی تر آستیں نالۂ شب آتشیں رحم بہت نازنیں
غم میں ترے اے حسیں لب پہ ہے جان حزیں

(۳)

بزم فروز جمال شمع حریم خیال
ایک دل پُر ملال غم میں ترے ہے نڈھال جینا ہوا ہے وبال رونگا اسکا سوال وصل ہو اب یا وصال
بزم فروز جمال شمع حریم خیال

(۴)

شاہد گلگوں عذار طرہ کشائے بہار

تو جو نہیں ہمکنار سینہ و دل ہے فگار موت کا ہے انتظار کوئی نہیں رازدار کس سے کہوں حال زار
شاہد گلگوں عذار طرۂ کشائے بہار

(۵)

ہجر میں تیرے پری تلخ ہوئی زندگی
میری خبر کیوں نہ لی مجھ سے خطا کیا ہوئی کیا سبب ناخوشی دردیں کیوں کی کمی شرط وفا تھی یہی!
ہجر میں تیرے پری تلخ ہوئی زندگی

(۶)

ساقیٔ مستی فروش زلف دوتا تا بدوش
ایک گدا خرقہ پوش حلقۂ طاعت بگوش در پہ کھڑا ہے خموش دے وہی صہبائے دوش لوٹ لے جو عقل و ہوش
ساقیٔ مستی فروش زلف دوتا تا بدوش

(۷)

آئی ندا ہجر جام فنا نوش کر
دہر ہے اک رہگذر پیش عدم کا سفر توڑ طلسم صور دل کی طرف کر نظر عشق ہے کچھ ہے اگر
آئی ندا ہجر جام فنا نوش کر

(۸)

عشق ہے وجہ حیات عشق کی سب کائنات
دلکشی ممکنات نقش و نگار ثبات حامل صد کیفیات مظہر حسن و صفات مطلع انوار ذات
عشق ہے وجہ حیات عشق کی سب کائنات

رباعی

کیا جانیئے کیا جنوں میں کہہ جاتے ہیں
منہ دیکھ کے سننے والے رہ جاتے ہیں
ہے جذبۂ شوق ایک موج طوفاں
لیجائے جدھر یہ سیل بہہ جاتے ہیں

ضامن کنتوری

حدیقۂ عثمانی

نذیر جنگ بہادر (نواب ...... مرزا نذیر بیگ) خلف اکبر مرزا قادر بیگ صاحب مرحوم سابق صدر تعلقدار سرکار عالی۔ آپ کی ولادت غرۂ رمضان ۱۲۸۴ھ کو بمقام میرٹھ واقع ہوئی سات سال کے سن میں اورنگ آباد دکن تشریف لائے، جہاں اُس زمانے میں آپ کے پھوپا جان مرحوم نواب محسن الملک مہتمم بندوبست تھے۔ نواب صاحب نے آپ کی تعلیم و تربیت خاص اپنی نگرانی میں شروع کی، اور ذی علم معلّم، اور لایق اتالیق مقرر فرمادئے شہسواری، تفنگ اندازی، نیزہ بازی وغیرہ کے مردانہ فنون کو اُس زمانہ کے شرفا علی العموم پسند کرتے تھے۔ کتابی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپنے ان فنون میں بھی کمال حاصل کیا۔ حیدرآباد سے بغرض تعلیم آپ اس کے بعد علیگڈھ روانہ کئے گئے جہاں تھوڑے ہی عرصے میں آپ طلبہ کالج کی رُوح رواں بن گئے۔ کالج کرکیٹ ٹیم، جس کے آپ نائب کپتان بھی رہ چکے ہیں، آپ کے زمانہ میں شباب پر تھی۔ دوران طالب علمی میں آپ نے مسٹر الکمپین کا طلائی تمغہ حاصل فرمایا تھا۔ بعد فراغ تعلیم آپ علیگڈھ سے بلدہ واپس تشریف لائے تو یہاں آپ کی شادی نہایت شان و شوکت سے نواب میر محمود علی خاں مرحوم کی دختر نیک اختر کے ساتھ کی گئی اس عقد سے آپ کو خدا نے ۵ صاحبزادیاں اور پانچ صاحبزادے عطا فرمائے۔

نواب محسن الملک مرحوم معدنیات کے معاملات کی یکسوئی کی غرض سے ۱۲۹۷ف میں منجانب سرکار عالی انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں کے امرا کی صحبت حاصل کرنے کی خاطر آپ کو بھی اپنے ہمراہ لیتے گئے انگلستان میں آپنے کم و بیش چھ مہینے قیام فرما کر وہاں کی اعلیٰ سوسائٹی سے پورا فایدہ حاصل فرمایا۔

سرکار عالی کی ملک ملازمت میں آپ ۲۵ دے ۱۲۹۹ف کو داخل ہو کر مددگار معتمد مال (شاخ لوکلفنڈ) کی خدمت پر مامور ہوئے اس عہدہ پر آپ ۲۲ دی ۱۳۱۶ف تک

فائز رہے، لیکن اس عرصے میں سرپور تانڈور کی عملداری اور بیدر، ناندیڑ، گلبرگہ اور اورنگ آباد
کی اول تعلقداری کے طویل المدت منصرمانہ فرائض انجام دیتے رہے۔ ۱۰ خورداد ۱۳۱۷ف
کو آپ دوم تعلقدار بناکر واسی ضلع عثمان آباد روانہ کیے گئے، اور اسی حیثیت سے پربھنی
میں بھی رہے، حضور پرنور کے عہد میں آپ کے خدمات ۲۱ امرداد ۱۳۲۱ف کو علاقہ
صرفخاص مبارک کو منتقل کیے گئے، جہاں آپنے ۲۰ آبان ۱۳۲۴ف تک صدر محاسبی و
نظامت مخارج کے فرائض انجام دیئے۔ آخرالذکر تاریخ کو آپ کا تقرر چند روز کے لئے
صوبہ داری ورنگل پر ہوا، لیکن حضور نے ۱۸ آذر ۱۳۲۵ف کو حیدرآباد طلب فرماکر آپ کو
معتمدی فوج کے عہدۂ جلیلہ پر سرفراز فرمایا جس پر آپ ہنوز کار فرما ہیں۔

اس خدمت کے اہم فرائض کے ساتھ ہی آپ حسب قاعدہ مجلس وزراء (کابینٹ کونسل)
کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ جب ۱۶ دے ۱۳۲۹ف کو باب حکومت کی تنظیم جدید
بروئے عمل آئی تو کابینٹ کونسل کی ذمہ داریوں سے آپ کو سبکدوشی حاصل ہوگئی، اور
اُن کے بجائے محکمہ جات طبابت (شاخ انگریزی و یونانی) اور علاج حیوانات آپ کے
سپرد کیے گئے۔ آپ کو اسٹاف شاہی کے رکن رکین ہونے کا شرف حاصل ہے، اور اپنی
وفاشعاری اور اپنے مالک کی رضاجوئی کے باعث آپ ہمیشہ عطایائے شہریاری سے
بہرہ اندوز ہوتے رہتے ہیں۔ پیشگاہ خسروی سے ۲۹ جمادی الآخر ۱۳۳۵ھ کو نذیر جنگ
کا خطاب آپ کو سرفراز ہوا، باوجود اس رفعت قدر کے آپ بڑے منکسر المزاج اور فقیر
دوست ہیں، اور اہل ملک کی فلاح و بہبود میں ہمیشہ ساعی رہتے ہیں۔

نواب نذیر جنگ بہادر جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد کے فیلو (رفیق)، جامع اسلامیہ علیگڈھ
کے رکن، اور کئی علمی و ادبی مجالس کے سرگرم معاون ہیں۔ زندہ دلی کے شوق کی بدولت
جو آپ کو ابتدائے عمر سے ہے، آپ کے گھوڑے سالہاسال سے بمبئی، مدراس، پونا،
بنگلور، اوٹی اور حیدرآباد و سکندرآباد کی گھوڑ دوڑوں میں شریک ہو رہے ہیں، اور کئی
بار انعامی پیالے حاصل کر چکے ہیں۔ آپ تیز دست شکاری اور ٹینس کے مدامی شوقین ہیں۔
ٹینس میں آپ کی سروس نہایت سخت ہوتی ہے اپنے اس شوق کے باعث آپ کو
حضرت غفران مکان کے ساتھ ٹینس اور نیزہ بازی میں شریک ہونے کی عزت حاصل ہو چکی
ہے۔ حیدرآباد میں کریکٹ کے شوق کو میجر مرزا قادر بیگ کی معیت میں آپ نے از سر نو

زندہ فرمایا ہے، اور مسلم ٹیم ۱۹۲۳ء کے موسم سرما میں اپنے مخالف کھلاڑیوں پر نمایاں کامیابی حاصل کر چکی ہے۔

نواب صاحب کی دوسری شادی نواب نادر جنگ مرزا طفیل علی بیگ مرحوم کی دختر بلند اختر اور کرنل سر افسر الملک بہادر کی برادر زادی سے ہوئی، جو نہایت روشن خیال خاتون ہیں۔ نذیر جنگ بہادر کے فرزندوں کے نام یہ ہیں۔ مرزا البشیر بیگ، مرزا مہدی بیگ، مرزا محسن بیگ، مرزا قادر بیگ، مرزا البشیر بیگ صاحب ناظم نظم جمعیت سرکار عالی ہیں۔

(۲)

فخر یار جنگ بہادر (نواب...... فخر الدین احمد خاں) خلف خان بہادر غلام احمد خاں صاحب سابق رکن مال ریاست کشمیر۔ ۲۲ بہمن ۱۲۹۲ف کو اپنے وطن دھوگری ضلع جلندھر میں پیدا ہوئے۔ ہوشیار پور، جلندھر، اور سیالکوٹ کے ہائی اسکولوں میں مدرسہ کی تعلیم پائی، اور علیگڈھ کالج سے بی۔ اے میں کامیابی حاصل کی۔ آخر الذکر مقام پر ایام طالبعلمی میں سر تھیوڈر مارسین پرنسپل اور ڈاکٹر ضیاء الدین احمد پروفیسر خاص طور سے آپ پر نظر شفقت فرماتے تھے۔

بی۔ اے پاس کر لینے کے بعد آپ نے فلاحت کی جانب توجہ فرمائی، اور پانچ چھ سال اس شغل میں گزارے۔ کچھ عرصہ تک سرکار عظمت مدار کے محکمۂ سیاسیات میں کابل برٹش ایجنسی کے اندر کارگزار رہے انہیں ایام میں مرحوم امیر صاحب کابل ہندوستان تشریف لائے تو آپ کو خصوصیت کے ساتھ سر ہنری میک موہن کی معاونت کیغرض سے مقرر کیا گیا، اور بعد ختم کار گورنمنٹ ہند نے آپ کے مساعی کو قابل تعریف قرار دیا۔ اس کے بعد آپ نے ریاست پٹیالہ میں بند و بست کا کام سیکھا، اور وہاں مجسٹریٹ مقرر ہو گئے۔ بالآخر گورنمنٹ ہند کے سررشتہ فینانس میں آپ کا تقرر عمل میں آیا، لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد خرابی صحت کے باعث آپ نے اپنے سابقہ شغل فلاحت کی جانب مکرر عود فرمایا۔

غرۂ فروردی ۱۳۲۲ف کو آپ کے خدمات سرکار انگریزی سے سرکار آصفیہ میں منتقل ہوئے، جہاں من حیث مددگار صدر محاسب شاخ تعمیرات عامہ آپ کا تقرر عمل میں آیا۔ آپنے اس موقعہ پر اپنے فرائض کو اس خوبی کے ساتھ انجام دیا اور سررشتۂ مذکور کی ایسی اصلاح فرمائی کہ ۱۰ دے ۱۳۲۴ف کو نائب صدر محاسب کی خدمت پر آپ کو ترقی دی گئی۔

۱۶ امرخورداد ۱۳۲۵ف کو منصرم صدر محاسب سرکار عالی کے منصب جلیلہ پر فائز ہوئے اور چار ماہ بعد ۲۰ مہر کو اس عہدہ پر مستقل فرما دیے گئے ۔ معتمد سرکار عالی صیغہ فینانس کی خدمت پر آپ کو تاریخ ۱۰ امرخورداد ۱۳۲۸ف ترقی ملی، جس پر آپ ہنوز کارفرما ہیں۔ یہ امر قابل ذکر ہے کہ آپ کے خدمات شایستہ کے اعتراف کے طور پر پیشگاہ خسروی سے آپ کی سہ سالہ مدت ملازمت سرکار عظمت مدار کو وظیفہ میں محسوب کیے جانے کی غرض سے منظوری شرف صدور لائی، اور اب آپ دولت آصفیہ میں مستقل طور پر کار فرما ہیں۔

آپ کے صدر محاسب مقرر ہونے کی تاریخ سے اس وقت تک مالیات سے متعلق جس قدر اصلاحات قلمرو آصفیہ میں ہوئی ہیں، ان سب میں آپ کا مفید مشورہ شریک رہا ہے اس طرح سرکار عالی کی توفیر آمدنی کے باب میں بھی آپ کی رائے کو بڑا دخل ہے سرکار عالی کے پرامیسری نوٹ آپ کے عہد صدر محاسبی میں اور کرنسی نوٹ عہد معتمدی میں جاری ہوئے اور ان کے اجرا میں آپ کے ساعی لازمی طور پر شریک ہیں آپ کو مالیات کے متعدد کمیشنوں اور کمیٹیوں میں ازروئے فرمان مبارک شریک ہونے کا موقعہ ملا ہے، اور یہ عزت بھی آپ کے نصیب میں آئی ہے کہ بعد ختم کار بارگاہ خسروی سے اظہار خوشنودی فرمایا گیا۔ ان تمام کمیٹیوں میں آپ کی شرکت سے سب سے زیادہ دیرپا و مفید اثر سیلری کمیشن کمبش ٹائیم اسکیل کو ہوا، جس کی تجاویز بروئے عمل آنے پر ممالک محروسہ سرکار عالی کے درماندہ عمال و افسران ماتحت کی تنخواہوں میں معتدبہ اضافہ کے ساتھ ساتھ امیدواران ملازمت کا معیار قابلیت بھی بلند ہو گیا۔

فخر یار جنگ کا خطاب آپ کو ذی قعدہ ۱۳۴۱ھ میں عطا ہوا تھا۔

نواب فخر یار جنگ بہادر جامع عثمانیہ کے فیلو، جامع اسلامیہ کے رکن اور کئی علمی و ادبی تحریکات کے دلسوز معین ہیں۔ خود اپنے گھر میں رواجی تعلیم کے ساتھ ساتھ آپ کو اسلامی تربیت کا خصوصیت کے ساتھ خیال ہے۔ خداوند عالم نے آپ کو پانچ فرزند عطا کیے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اسلامی تربیت سے آراستہ ہے۔ علی الترتیب ان کے نام یہ ہیں، مشتاق احمد خاں، اشتیاق احمد خاں، رفیق احمد خاں، توفیق احمد خاں، عتیق احمد خاں

(۴)

اکبر یار جنگ بہادر (نواب ..... محمد غلام اکبر خاں) خلف احمد شیر خاں صاحب

آپ کا تعلق آفریدیوں کے مشہور قبیلہ ملاخیل کی شاخ زرغون خیل سے ہے آپ کے بزرگ فرخ سیر بادشاہ کے عہد میں درۂ خیبر سے آکر نواب محمد خاں غضنفر جنگ فرخ آبادی کے خلف اکبر قایم جنگ کے آباد کئے ہوئے قصبۂ قایم گنج ضلع فرخ آباد میں آباد ہوئے خود آپ کی پیدایش ذیقعدہ ۱۲۹۳ھ میں قصبۂ گوجر خاں ضلع راولپنڈی میں ہوئی، جہاں آپ کے پدر بزرگوار انسپکٹر پولیس تھے۔ آپ نے ابتدائی تعلیم تو اپنے والد ماجد اور دوسرے معلمین سے وطن ہی میں پائی، لیکن عربی وفارسی درس کی تکمیل ۱۳۰۲ف میں اورنگ آباد تشریف لاکر فرمائی، اور وہیں بقدر ضرورت انگریزی ادب کو حاصل فرمایا۔ یہ امر قابل اظہار ہے کہ توفیق الٰہی شامل حال ہوئی، اور آپ نے اُستاد سے زیادہ اپنے مطالعہ پر اعتماد فرمایا اسی عرصے میں قانونی کتابوں کا مطالعہ بھی فرماتے رہے اور ۱۳۰۴ف میں وکالت درجہ سوم کا امتحان پاس کر کے اورنگ آباد میں وکالت شروع کردی۔ شہریور ۱۳۰۶ف میں بغرض وکالت آپ حیدرآباد تشریف لائے، اور اگلے سال وکالت درجۂ دوم میں کامیابی حاصل فرمائی۔ وکالت درجۂ اول کی سند آپ کو آذر ۱۳۱۵ف میں ملی، اور بلا تاخیر آپ نے اپنے کام کو عدالت العالیہ تک وسعت دی۔ اس موقعہ پر آپنے اس قدر محنت اور نیک نفسی سے کام کیا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں آپ کا شمار ہائیکورٹ کے سربرآوردہ وکلا میں ہونے لگا۔

حیدرآباد میں بلحاظ پیشہ کے یہ کامیابی اس قدر بڑی کہی جاسکتی ہے۔ کہ اس سے زیادہ توقع کسی وکیل کو مشکل ہوسکتی ہے۔ لیکن ابھی عزّ ووقار کی کئی منزلیں آپ کے لئے باقی تھیں، وہ بھی خدا لے آسان کردیں۔

اپنے پیشہ کی ضرورتوں کو نظر انداز کئے بغیر، اس دوران میں آپ تھوڑا سا وقت ہمیشہ علمی وادبی مطالعہ کی غرض سے ضرور نکالتے رہتے تھے، اور کبھی کبھی آپ کو اپنی جماعت کے اغراض ومقاصد کی اشاعت کی خاطر بھی وقت دینا پڑتا تھا، اپنے حسن خلق اور دانشوری کی بدولت ہم پیشہ وکلاء کے دلوں میں گھر کر لیا تھا آپ کی ذات سے اُن کی مجلس کی رونق ہمیشہ دوبالا ہوتی رہی۔ اسی وجہ سے وکلاء کی موقر جماعت نے تین بار آپ کو اپنا قایم مقام بنا کر مجلس وضع آئین وقوانین میں بھیجا سنہ ۱۳۲۰ف میں آپنے دکن لارپورٹ کے نام سے ایک قانونی ماہواری رسالہ جاری فرمایا، جو آپ کے زمانہ ادارت میں نہایت کامیاب رہا۔ چند سال تک آپنے بلدیہ حیدرآباد کی نائب صدر نشینی کے فرایض بھی انجام دئے

مولوی غلام اکبر خاں صاحب کی وکالت کی ترقی اور اس پیشہ میں آپ کی کامیابی کا حال سمع ہمایونی تک پہنچا تو پیشگاہ جہاں پناہی سے آپ کو خورداد ۱۳۲۷ف میں حیدرآباد ہائیکورٹ کی رکنیت پر سرفراز فرمایا گیا، اور دوران رکنیت میں سرکار عالی کے متعدد وقیع کمیشنوں میں شرکت کی عزت بھی آپ کو حاصل ہوئی۔ معتمدی عدالت وکوتوالی وامور عامہ کے منصب جلیلہ پر آپ کو بہمن ۱۳۳۲ف میں ترقی ملی، جبکہ آپ رکنیت عدالت العالیہ کے فرائض کو نہایت نیک نامی وتن دہی سے پانچسال انجام دے چکے تھے اس عرصے میں اپنے فرائض کی بجاآوری کا جو موقع ملسکا ہے، آپ نے ہر طرح اپنے آپ کو اس اہم خدمت کا اہل ومستحق ثابت کر دکھایا ہے۔

ہم کسی جگہہ بیان کر آئے ہیں کہ مولوی صاحب کو علمی وادبی دلچسپیاں ہمیشہ رہی ہیں، اور اب یہ بیان کردینا ہمارے لئے ضروری ہے کہ آپ نے ملک کے مختلف ہفتہ وار وماہوار رسالوں کو عرصہ تک اپنے رشحات قلم سے سیراب فرمایا ہے اور افسر، دلگداز، وفادار، انتخاب لاجواب، میں آپ کے مضامین ایک مدت تک شایع ہوتے رہے ہیں۔ قانون ومذہب سے آپ کو ہمیشہ وابستگی رہی، اور سچ یہ ہے کہ اسی ذہنی چھان بین کی بدولت آپ کے قلب کے اندر ایک بڑا مذہبی انقلاب پیدا ہوگیا، اور آپنے اپنے لئے ایک راستہ ڈھونڈ نکالا۔

بہ تقریب عقد خوانی حضور پرنور مولوی غلام اکبر خاں صاحب کو اکبر یار جنگ کا خطاب حسب فرمان خسروی مزینۂ غرہ شوال ۱۳۴۱ھ عطا ہوا۔

نواب اکبر یار جنگ بہادر کی دو شادیاں ہوئیں۔ پہلی بیوی سے ایک صاحبزادی بقید حیات ہیں، اور موجودہ بیوی سے دو اولادیں ہیں۔ آپ کے فرزند کا نام غلام احمد خاں ہے۔

سید منظر علی اشہر

غزل

فروغ مہر سے یکتا جگر کے داغ بنے
تمام پارۂ دل لعل شبچراغ بنے

خدا کی دین ہے ہر چند مال ہو کہ جمال
خوشامدوں کی بدولت وہ بد دماغ بنے

زمیں کے نیچے وہ سوتے ہیں جنکے تھے خیال
ادہر مکان ہو اس رخ پہ خانہ باغ بنے

عظمت شاعر

از جناب نواب شبیر حسین صاحب جوش ملیح آبادی

اے کہ تو ہے عظمت شاعر سے مطلق بیخبر اے کہ تو ہے ناشناسائے رموز خیر و شر
اے کہ ہستی ہے تری مور و ملخ سے پست تر "شعر" کو پہچان، او بیگانۂ علم و ہنر

کیا بتاؤں تجھ سے میں اُو پست فطرت! کیا ہوں میں
عشق کے سینے سے جو نکلا ہے وہ دریا ہوں میں

میں جہاں میں دفتر کونین کی تفسیر ہوں جو دو عالم کی حدیں جکڑے ہے وہ زنجیر ہوں
"عشق" کی فطرت ہوں خواب حسن کی تعبیر ہوں میں ستاروں کی زباں ہوں چاند کی تقریر ہوں

میرے دل کی بزم میں وہ حسن گرم ناز ہے
جو زمیں کا بھید ہے، اور آسماں کا راز ہے

میں نہ گر ہوتا تو گونگے تھے زمین و آسماں ایک چشم بے بصارت، اک دہان بے زباں
کون تھا جو کھولتا فطرت کی الجھی گتھیاں؟ ناقۂ لیلیٰ کو حاجت تھی کہ ہو اک سارباں

کس نظر کے سامنے ہموار و ناہموار تھا
شعر سا مونس نہ ہوتا تو سفر دشوار تھا

رنج و غم لے بیٹھے ہیں دریا بھری برسات میں خوف ہر شے پر برستا ہے اندھیری رات میں
خود بخود اک جوش سا ہوتا ہے محسوسات میں گردشوں کا ہے ازل سے سلسلہ ذرات میں

جنگ کے میداں میں لایا ہوں پیام اتحاد
میں ہوں ان بے ربط اجزا میں نظام اتحاد

حامل اسرار فطرت ہے دل درد آشنا وارث کونین ہوں، گو ہوں بظاہر اک گدا
ہاں مرے قبضہ میں ہے سر رشتۂ راز بقا میرے دل کے ساز میں ہے اک قیامت کی صدا

جانتا ہوں میں حدیں تریاق کی اور زہر کی

نبض میرے ہاتھ میں رہتی ہے نظم دہر کی

شہد میری گفتگو ہے، سانس ہے میری گلاب
فکر سے میری نمایاں ہے عناصر کا شباب

خاک کا پتلا ہوں، لیکن اک طلسم آب و تاب
جس کے ہر ذرّے میں گردش کر رہا ہے آفتاب

مجھ میں پاتے ہیں جو اپنے حُسن کی تفسیر کو
دیکھتے ہیں نازنیں پہروں مری تصویر کو

کیمرا ہوں غور سے دیکھو تو اپنے عہد کا
سامنے جو چیز آئی اس کا فوٹو لے لیا

بن گیا جو نقش پھر وہ حشر تک قایم رہا
آ مری سرکار میں او تشنۂ جام بقا

خواہ کتنا ہی تحیر خیز و لاثانی ہے تو
میری آنکھوں سے اگر اوجھل رہا فانی ہے تو

واعظوں کی بزم ہو، یا مطربوں کی انجمن
مجلسیں غربت کی ہوں، یا محفل اہل وطن

پُرخطر روحوں کے جنگل ہوں کہ حوروں کے چمن
گھر سہاگن کا ہو، یا بیوہ کا ہو بیت الحزن

صفحہ تاریخ کی جدول سے باہر رہ گیا
میں نہ پہنچا جس جگہ، وہ نقش مٹ کر رہ گیا

جوش

وقت صبح چلتی ہے ہوا میرے لئے
جھوم کر آتی ہے مستانہ گھٹا میرے لئے

حسن میں پیدا ہوئے ناز و ادا میرے لئے
ساز سے باہر نکلتی ہے صدا میرے لئے

روز یہ سب ہوتے ہیں حاضر مرے دربار میں
تاکہ میں تصویر ان کی کھینچ دوں اشعار میں

محسوسات

گرمیٔ نار حُسن سے سوز نفس کہاں نہیں
شعلہ فروش بجلیاں دشمن خس کہاں نہیں

اک ہمیں لے کے آئے تھے ہمت بے نیاز شوق
شاہ نورد جستجو مور و مگس کہاں نہیں

میکدہ ہو کہ خانقاہ بادۂ شوق چھپ کے پی
رہزن عیش بے خلش بیم عسس کہاں نہیں

عالم مادی میں ہے موج صدا کو مد و جزر
قافلہ گرم کوچ ہے بانگ جرس کہاں نہیں

دل میں طپاں ہے آرزو سینے میں دل ہے بیقرار
تن میں ہے دردمند روح قید قفس کہاں نہیں

ہر نگہ وجود میں ہے حرکت کا نام زیست
زخمہ خور امید و بیم تار نفس کہاں نہیں

ضامن علی غنیمت طلب عرصۂ زندگی ہے یہ
دل کو سکوں کہیں نہیں شعبدۂ ہوس کہاں نہیں

ارارَاط

از جناب مولوی سیّد مختار احمد صاحب

Ararat.- (Arārat, Heb. Harārāt, Samaritan. Masis, Arm. Aghridāgh & Egridage, Tur. Koh-i-Nūh, Pers.)

ارَارَاط۔ فرنگی (عرارَة۔ = مقابس نازنین) ہرارات سامری مَسِس یا مِسِک اَرمنی + اَغری دَاغ (= ڈھالو پہاڑ) ترکی کوہ نوُح۔ فارسی +) ارمینیہ کا بلند ترین پہاڑ جو خطوط طولِ شرقی ۴۴° ۔ ۴۵° ۔ اور خط عرض شمالی ۳۹° ۔ ۴۰° کے درمیان واقع ہے یہ دریائے اَرَس کے سطح میدان سے شروع ہوتا ہے اس کا طول (۲۵) عرض (۱۳) اور محیط (گھیرا) اسّی میل ہے۔ کوہ ارارط کی دو چوٹیاں ہیں بڑا ارَارَاط (۱۶۷۵۰ قدم) شمال مغرب میں اور چھوٹا ارَارَاط (۱۲۸۴۰ قدم) جنوب مشرق میں واقع ہے دونوں چوٹیاں جن میں آٹھ یا نو میل کا فاصلہ ہے ایک تنگ۔ چپٹے اور گول شکل کے پشتے (تیغہ کوہ) سے ملے ہوئے ہیں جس کو سردار بُلغ کہتے ہیں اس تیغہ کوہ کے آر پار ایک درّہ واقع ہے۔ عربی میں زمانہ جاہلیت سے بڑے ارارط کو جَبلُ الحارث اور چھوٹے ارارط کو جَبلُ الحُوَیرِث کہتے ہیں۔ عربی میں حارث کے معنی قلبہ راں یا ہل جوتنے والا ہیں اور حُوَیرِث حارث کی تصغیر ہے۔ اگرچہ کوہ ارَارَاط کی اونچائی (۱۶۷۵۰ قدم) ہے لیکن چونکہ اس پہاڑ کا دامن بمقام اَرلیخ ۲۵۰۸ قدم کی بلندی پر واقع ہے اس لحاظ سے یہ دنیا کے اور عظیم الشّان پہاڑوں سے ارفع ہے۔ جب شمال سے اس فریدُ العصر ایک ڈال سنگی ستون کو دیکھا جائے تو دنیا کا غالباً نہایت ہی رفیع الشان منظر معلوم ہوتا ہے بڑے ارَارَاط کی شکل کرُوی مخروط ہے اس کی چوٹی تقریباً ایک مدوّر سطح مُرتفع ہے جس کا محیط ڈیڑھ یا دو سو گام یا قدم ہے اور جو تمام جانبوں سے مائل (ڈھلوان) یخ زار (آئس فیلڈ) ہے اور اس پر سے بہمن بَرف (سَیلِ یخ یا ایولنش) ۳۲۵۰ قدم عمق تک ڈھلکتے ہیں۔ بڑے ارَارَاط کے شمال مشرقی

ڈھلان کو ایک عمیق وادی (گہرا نشیب) جدا کرتی ہے جسکو **وادی ماریعقوب** کہتے ہیں اس کے بالائی حصّے میں ایک جوف ہے جس کو چاروں طرف سے کھڑی چٹانی دیواریں احاطہ کئے ہوئے ہیں اس کا تحتانی حصہ ان دنوں ایک چٹیل میدان ہے۔ لیکن کبھی آباد تھا یعنے ۵۶۴۵ قدم کی بلندی پر ایک قریہ **ارگری** اور **ماریعقوب** (سینٹ جیمز) کی خانقاہ تھی + چھوٹا ارارات ایک خوش قطع پیکانی مخروطہ ہے جبل ارارات **افسردہ** آتش خیز پہاڑ ہے۔ ۲۰ جون ۱۸۴۰ء کو ایک ہولناک زلزلہ آیا جس سے پہاڑ کا بڑا حصّہ میدان میں ڈھل آیا اور ایک پُر رونق بستی **ارگری** (ارمنی **اکوری**) کو نیست و نابود کردیا۔ اس حادثہ میں کوئی سولہ سو باشندے تلف ہوئے اس کے علاوہ چشمۂ ماریعقوب اور خانقاہ ماریعقوب مع رُہبان جو دو میل کی انچائی پر واقع تھی تودہ خاک ہوگئی۔ کوہ ارارات پر پانی کی عدم یابی سے کیونکہ اسمیں صرف دو چشمے ہیں، گھاس پھوس اور جھاڑ جھنکار کے سوا نہ سرسبز جنگل ہے اور نہ اس کے دامن ہرے بھرے ہیں بلکہ ایک سنسان بیابان اور ہو کا مکان ہے۔ لیکن قرون وسطیٰ میں اصطخری (۳۴۰ھ / ۹۵۱ء) کے بیان کے موافق اس پر نباتات اور حیوانات کی کثرت تھی مقدسی (۳۷۵ھ / ۹۸۵ء) نے لکھا ہے کہ ارارات کی چوٹیوں پر ایک ہزار سے زیادہ مواضع تھے۔ ارمنی مؤرخ توما ارظرونی (دسویں صدی م) نے ذکر کیا ہے کہ کوہ مذکور پر بارہ سنگھے جنگلی سور۔ شیر ببر اور جنگلی گدھے پائے جاتے ہیں۔

پہلے پہل اس پہاڑ پر چڑھنے میں پروفسر فریڈرک پیروٹ ۹ر اکتوبر ۱۸۲۹ء کو کامیاب ہوئے۔ من بعد ارلیخ واقع شمالی دامن سے اس پہاڑ پر بیس دفعہ سے زیادہ ہی چڑھا گیا ہوگا ان میں سب سے مشہور اور قابل ذکر چڑھائی وہ تھی جو ۱۸۵۰ء میں روسی جنرل چودزکو نے کوہ قاف کی تثلیث (مثلثی پیمائش) کی غرض سے اختیار کی تھی یہ دونوں چوٹیوں پر چڑھ گیا اور بڑے ارارات پر نو مساحت کے کام میں کوئی ایک ہفتہ ٹھہرا رہا۔ کوہ ارارات تین حکومتوں دولتہ علیہ عثمانیہ، سلطنت ایران اور سلطنت روس میں منقسم ہے۔ ایرانی قلمرو (آذربائیجان) چھوٹے ارارات کے شرقی دامن سے شروع ہوتی ہے۔ جنوبی حصّہ ترکوں سے متعلق ہے اور شمالی حصّہ جس میں بڑے ارارات کی چوٹی واقع ہے روسی علاقہ میں داخل ہے۔ دول ثلثہ کی سرحدوں کا اتصال چھوٹے ارارات میں ہوا ہے۔ اتفاقاً

یہ بیان بھی ضروری ہے کہ ملت عیسویہ کے اعتقاد میں عالم گیر طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی کوہ ارارات پر ٹھہری تھی جیسا کہ توراۃ سفر تکوین ۸/۴ میں مذکور ہے کہ "ساتویں مہینے کی سترھویں تاریخ کو کشتی اراراط کے پہاڑوں پر ٹک گئی" لیکن قرآن مجید ۱۱/۴۴ میں ہے کہ سفینۂ نوح نے جبل جودی پر جو جزیرہ (میسوپوٹامیہ) میں دریائے دجلہ کی شرقی جانب جزیرۂ ابن عُمر کے نزدیک ایک پہاڑ ہے' قرار لیا۔ ارضی و اثری تحقیقات کوہ جودی کے مستقر کشتی ہونے کی مؤید ہے اور توراۃ مقدس کا بیان بھی قرآن شریف کے منافی نہیں ہے کیونکہ اراراط (ارمینیہ) کے پہاڑوں سے خواہ مخواہ اغری داغ یا کوہ مسس مُراد لینا لازم نہیں بلکہ اس کا اطلاق جودی پر بھی بخوبی ہو سکتا ہے اس لئے کہ قدیم الایام میں جودی ارمینیہ میں واقع تھا۔ سر ولیم اسمتھ وغیرہ بھی ہم سے متفق الرائے ہیں دیکھو **جبل جُودی یا جُودی داغ**۔ حمد اللہ مستوفی ۷۴۰ھ/۱۳۴۰ نے **ماست کوہ** (اراراط کا نام ہے) کی نسبت لکھا ہے کہ "شہر نخچوان سے جانب غربی چودہ فرسنگ پر ایک سخت بلند پہاڑ ہے جو تیس چالیس فرسنگ سے دکھائی دیتا ہے۔ قلّہ کوہ برف سے کبھی خالی نہیں رہتا اور اکثر مقامات برف میں مخفی رہتا ہے اس پہاڑ کا دور (گھیرا) تیس فرسنگ ہے" **اراراط** قدیم زمانے میں ارمینیہ کا وہ قطعۂ زمین جو دریائے ارس اور وان و اُرمیہ جھیلوں کے واقع تھا۔ توراۃ اشعیا ۳۷/۳۸ میں اراراط کا اطلاق تمام ارمینیہ پر ہوا ہے + اشوُر (اسیریا) کے مسماری کتبات میں اس سرزمین کا نام **اررتو** لکھا ہے جس پر اشوری بادشاہوں کی کئی مہمیں اور یورشیں ہوئیں ✤

غزل

[illegible]

بنائے لاکھ دل کو وہ بُت بے پیر پتھر کا — ہلادے گی جگر یہ آہ پُر تاثیر پتھر کا

دل موسیٰ کے بدلے طور ٹھہرا جلوہ گہ تیری — کہاں چمکا ہے جا کر اختر تقدیر پتھر کا

بنا دیتی ہے اظلم ظالموں کو صحبت ظالم — ہوئی ہے تیز کیا منہ چاٹ کر شمشیر پتھر کا

خیال ماسوا ہوگا مخل بزم تصوّر میں — رہیگا صدمہ کیا آئینۂ تصویر پتھر کا

مداوا سرگرانی ہائے وحشت کا اگر ہوتا — کبھی میرا لہو ہوتا نہ دامنگیر پتھر کا

تبانِ سنگدل کی سخت گیری نے مجھے مارا — دل حرماں کشیدہ ہو گیا نخچیر پتھر کا

بلا کی ٹالنے والی ہے خاموشی یہ کہتے ہیں — نشانہ کب ہوئی ہے بلبل تصویر پتھر کا

غزل پڑھتے ہوائے اطہر کہ بجھواتے ہو انملیاں — بتاؤ تو ہے کوئی میل بھی زنجیر پتھر کا

کسی کی تلاش

از جناب مولوی سید معجز حسین صاحب لکھنوی

اس لئے پڑتی ہے شب بھر آسماں سے چاندنی
ماہ کو بھی ہے کسی خورشید رو کی جستجو

ماہتاب کی دلفریب و دلاویز رات میں چاند جو کہ خدا کی صنعت میں غایت حسن و جمال کا نمونہ خیال کیا جاتا ہے بے حجابانہ طریقہ سے آسمان سے نکلکر اپنی صاف و شفاف روشنی دنیا کی ہر شے پر ڈال رہا تھا دنیا کی تمام چیزیں دلکشی و دل آرائی کا مکمل نمونہ ہو گئی تھیں لیکن یہ تمام اسباب دلچسپی و دلکشی کسی ماہ طلعت کی غیر موجودگی کی وجہ سے بالکل بے لطف نظر آتے تھے اس کی اس وقت کی حالت کا اندازہ کرنے سے اچھی طرح اس امر کا پتہ چلتا تھا کہ اس کو کسی کی تلاش تھی۔

وہ کون ہوگا؟

یقیناً وہ تو ہی ہوگا۔

وہ تیرا متلاشی تھا اسکو تیری جستجو تھی اس کی متجسس نظریں تیری تلاش میں سطح آب پر گرتی تھیں پہاڑوں پر پڑتی تھیں۔ درختوں سے ملتی تھیں اور تجھے نہ پاکر ناکام واپس آتی تھیں۔ اس کو تیرے ساتھ دعوے ہمسری نہ تھا نہیں نہیں بلکہ اس نے تیرے نہرے رنگ کو کہیں دیکھ پایا تھا اسی وجہ سے یکبار دیدم و دو بار ہوس کا مصداق بنکر تجھے ڈھونڈتا پھر رہا تھا لیکن "افسوس اس نے تجھے نہ پایا!"

وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اپنے نقرئی رنگ کی روشنی کو تیرے کندنی رنگ کے چہرے پر ڈال کر ایک ایسا خوشنما عکس ساطع کرے جو گنگا جمنی ہو سکے اور ایسے خوشنما نظارے سے دوسروں کا بھی دل محظوظ و مسرور ہو۔

"لیکن تو کہاں"

کیا تجھے اس کی بھی خبر ہے کہ چاند اپنی نقرئی کشتی دریا میں آہستہ آہستہ کھیہ رہا تھا

اُسکو تری تلاش تھی تیرا انتظار تھا وہ تجھے اپنی نقرئی کشتی میں بٹھا کر عجائبات عالم کی سیر کرانا چاہتا تھا کشتی روپہلی تو سنہرا" یہ کتنے مزے کی بات ہے"۔

کاش تو اُس کے پیش نظر ہوتا تو یقیناً اُسکی روشنی تجھ سے گلے ملتی ہمکنار ہوتی اور تیری گود میں لوٹ جاتی اور یہ بھی ممکن تھا کہ تیرے قدموں سے لپٹتی شاد شاد ہوتی اور باغ باغ ہوتی۔

"مگر تیرا پتہ کہاں"

تجھے کیا معلوم کہ چاند نے کئی مرتبہ تجھے پیا پیا کہکر پکارا جسکو تاروں نے سُنا ہوا ان سُنا۔ ان چیزوں کو اُس کی اس حرکت پر تعجب ہوا وہ محض اسوجہ سے کہ اُن کی نظروں میں اُس سے زیادہ کوئی خوبصورت کوئی دوسری چیز نہیں ہے۔

"مگر پیا کا چہرہ نظر آنا مشکل تھا"

"پیا کے پیروں میں مہندی لگی تھی"

پیا کو یہ بھی نہیں معلوم کہ چاند اُس کی تلاش میں کدھر سے نکلا وہ اسی کے مکان کے عقب سے برآمد ہوا دنیا کے ہر راستے اور در و دیوار پر اُس کی نظریں پڑ رہی تھیں وہ عالم سکوت میں ہر چیز کو دیکھ رہا تھا مقصد بر آری کی سبیل نہ ہونے سے اُسکی طبیعت اس امر پر مجبور ہوئی کہ وہ بلند اور بلند ہو۔ تاکہ اپنی مشتاق آنکھوں سے اُس حسن کے اعلیٰ نمونے کا درشن کرے جو کہیں چھپا بیٹھا ہے۔

چاند نے کسی کی تلاش میں اپنی روشنی ڈالی اور پتہ پتہ پر پھیلا دی تھی لیکن وائے ناکامی کہ وہ مشتاق دید کی نظروں سے اوجھل ہو کر خدا معلوم کس پردہ میں بیٹھ گیا تھا جہاں کسی کی دسترس نہ تھی رات بھر کا تھکا ماندہ خوبصورت مسافر تلاش یار میں منزلیں طے کرتا چلا جا رہا تھا کہ کہیں تو پیو کے درشن ہو جائینگے۔

"مگر یہ نہ ہونا تھا نہ ہوا"

نوبت بانیجا رسید کہ صبح ہو گئی معلوم ہوا کہ پیا کی سیج کسی اونچے اور پوشیدہ مقام پر تھی جسے کوئی نہیں دیکھ سکتا تھا۔

دختر بہار

مسز ایلزبیتھ بیرٹ براؤننگ کی ہشت سالہ عمر کی تصویر سے خطاب.......

۱

یہ شکل کاغذی یہ حسن جاں نثار	بیجان ہے مگر ہے روح روزگار
اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۲

تصویر ہے تری یا قاف کی پری	یا شان دلبری آئی ہے روبکار
اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۳

گلدستہ ہاتھ میں دامن میں گل بھرے	شانو پہ لپٹے گل گلے میں گلوں کے ہار
اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۴

گندھے کاکلوں میں گل بندھے گیسوؤں میں گل	ہے تو خود گلوں میں گلوں کی ہے تاجدار
اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۵

گردن میں ہے لچک آنکھوں میں ہے چمک	اللہ ری لٹک دل کردیا فگار
اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۶

ہونٹوں پہ ہے ہنسی نگاہوں میں سرخوشی	دل کی مسرتیں ہیں چہرہ سے آشکار
اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۷

بچپن ہے گو ابھی چتون ہے کہہ رہی	ہوگی یہی کلی پیرایۂ بہار
اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۸

دیکھے جو تجھ کو حور آنکھ نہیں آئے لوز ہے چشمہ شور تری چشم عشوہ بار

اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۹

کیا جانتے تھے ہم ہے تو وہی صنم جو ہو گی اکدن سرنامۂ وقار

اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۱۰

چمکا ترا شباب جب مثل آفتاب اور حسن طبع بھی ہوا عالم آشکار

اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۱۱

قدرت نے خود دھرا ترے فرق ناز پر فضل و کمال کا اک تاج زرنگار

اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۱۲

کھلے گل چمن چمن۔ ہرا ہو گیا سخن گلستان نطق میں ہوئی تو جو آبیار

اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۱۳

اللہ رے نصیب اسکے تھی جسکی تو ہم آہنگ و ہمنوا ہم آغوش و ہمکنار

اے دختر بہار اے نازنیں نگار

۱۴

ہے آج ایلز بیتھ پرٹ براوننگ عالم میں تیرا نام عنوان افتخار

اے دختر بہار اے نازنیں نگار

ضامن کنتوری

شکسپیر اور اسکے باقیات الصالحات

از بن جانسن

از جناب مولوی سید تفضل حسین صاحب ناشر

شکسپیر میں تجھ سے حسد نہیں کرتا۔ تیرے کمال اور تیری شہرت کا مجھے کامل اعتراف ہے۔ میں اقرار کرتا ہوں کہ تیرا کلام اس پایہ کا ہے کہ نہ تو انسان اس کی تعریف کا حق ادا کر سکتے ہیں اور نہ فرشتے۔ میرا قول راست ہے اور ساری دنیا کا اس پر صاد ہے تو جاہلوں کی تحسین و آفریں سے بے پروا ہے، حاسدوں کے مکر و عناد سے ایمن ہے، دوستوں کی اندھا دھند مدح سرائیوں سے بالاتر ہے۔

اے زمانہ کی روح! اسٹیج کی جان! میرے شکسپیر، اٹھ! میں تیری قبر چاسر[1] یا سپنسر کے پہلو میں نہ بناؤں گا نہ بومانٹ[2] سے کہوں گا کہ تجھے جگہ دینے کے لئے ذرا ہٹ کر آرام کرے۔ تو یادگار ہے، مقبرہ سے بے نیاز تو زندۂ جاوید ہے جب تک کہ تیرا کلام باقی ہے اور ہمیں اس کے پڑھنے کا مذاق اور داد دینے کی توفیق ہے۔ بیشک وہ بھی بڑے شاعر تھے، مگر تجھ سے اُن کو کوئی نسبت نہ تھی تو اپنے سب معاصرین سے گوئے سبقت لے گیا اور تیرا کلام آب و تاب میں ان سے بدرجہا بڑھ چڑھ کر ہے۔ کیا ہوا اگر تجھے یونانی اور لاطینی زبانوں میں دخل نہ تھا میں یونان و روما کے نام نامی گرامی شاعروں کو پکارتا ہوں کہ تھوڑی دیر کے لئے اٹھ بیٹھیں اور آنکھیں کھول کر ذرا دیکھیں تو سہی، تیری ٹریجیڈی کی کیا شان ہے اور وہ کیونکر اسٹیج کو ہلا ہلا دیتی ہے اور تیری کامیڈی اُن کے دانت کیسے کھٹے کرتی ہے یہی نہیں ان کی خاک سے اس وقت تک جس قدر شاعر پیدا ہوئے وہ سب مل کر بھی تیری گرد کو نہیں پہنچ سکتے۔

اے برطانیہ، فخر و مباہات کر، تجھے وہ باکمال فرزند کرامت ہوا، جس کے آگے تمام یورپ کے باکمال شعرا سر جھکاتے ہیں وہ ایک عہد کے لئے نہ تھا، سارے زمانہ کے لئے تھا۔ فنون لطیفہ ابھی پورے شباب پر تھے کہ وہ ملک الشعرائی کا تاج پہن کر ہماری

ساختہ نوازی کے لئے آیا اور اپنے نغموں سے ہمیں مسحور کردیا۔ خود فطرت اسکی صنعت گری پر نازاں تھی اور اس کے ہاتھ کا سلا ہوا جوڑا پہن کر پھولوں نہ سماتی تھی، جو تراش خراش میں کیا ہی موزوں اور چست ہوتا تھا جب سے وہ کسی اور خیاط کو خاطر ہی میں نہیں لاتی۔ یونان قدیم کے جلنے بھی زندہ دل، شوخ بیان، شیریں زبان شاعر تھے، ان میں سے اب ایک بھی ہمارے دلوں کو خوش نہیں کرتا سب کے سب قدامت اور گمنامی کے گڑھے میں پڑے ہوئے ہیں، گویا فطرت کو اُن سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا لیکن میں سب کچھ فطرت ہی سے منسوب نہ کرونگا۔ میرے سلیم الطبع، شکسپیر! اسمیں تیری صناعی کا بھی حصہ ہے، کیونکہ ہرچند شاعر کو مادہ فطرت ہی سے ملتا ہے مگر صورت گری اسی کے کمال صنعت کی محتاج ہے جیسے اشعار تیرے ہیں ایسا ایک پائندہ شعر گڑھنے کے لئے پسینے میں نہانا پڑتا ہے۔ سڈول بنانے کو طبیعت کی بھٹی میں ڈالن، سندان تخیل پر رکھکر عروض کے ہتوڑے سے کوٹنا، الٹنا پلٹنا اور مناسب تاؤ دیکر ٹھنڈا کرنا، یہ سب مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں، نہیں تو وہ آذر ہی کے بجائے اندیشہ ہے کہیں نفریں کا سزاوار نہ ہوجائے۔ اچھا شاعر بنتا بھی ہے اور پیدا بھی ہوتا ہے اور تو ایسا ہی تھا۔

دیکھو باپ کی شباہت اس کی اولاد میں باقی رہتی ہے، اسی طرح شکسپیر کے مضامین ومعانی کی ذریت فوج در فوج اس کے برجستہ اور موزوں اشعار کی صفوں میں آراستہ وپیراستہ کھڑی ہے اور ایک ایک مصرع خنجر آبدار کی طرح چمک چمک کر جہالت کی آنکھوں کو خیرہ کر رہا ہے۔

اے ایون کے راج ہنس، کیا اچھا نظارہ ہوتا جو ہم تجھے اب بھی اپنے دریاؤں اور جھیلوں پر نمودار ہوتے اور ٹیمز کے کناروں پر خوش پروازیاں کرتے ہوئے دیکھتے جو الزبیتھ اور جیمس کو اسقدر محظوظ کرتی تھیں مگر ٹھیر! میں دیکھتا ہوں کہ تو کرۂ فضا میں بلند ہوا اور تجھے ستاروں نے اپنے جھرمٹ میں لے لیا۔ چمک، اے آسمانِ شاعری کے ستارے چمک اور مغموم سٹیج کو ڈانٹ یا ہنسا جو تیری پرواز کے بعد سے رات کی طرح سیاہ پوش ہے اور جسے تیرے کلام کی روشنی کے سوا طلوع صبح کی امید نہیں ہے۔

شکسپیر کی تصویر

جو اسکی کلیات کے پہلے اڈیشن میں چھپی تھی (از بن جانسن)

یہ سلیم الطبع شکسپیر کی شبیہ ہے اس کام میں مصور نے فطرت کا خوب مقابلہ کیا اور ہو بہو شکسپیر کو کاغذی پیراہن پہنا کر ہماری آنکھوں کے سامنے کھڑا کر دیا کیا عمدہ چہرہ بنایا ہے کاش اسی خوبی سے وہ شاعر کے ذہن رسا کا چربا بھی اتار سکتا، پھر تو نگارخانۂ چین بھی اس کے سامنے ہیچ تھا مگر یہ بات اس کے امکان سے خارج تھی۔ پس اے شخص تو اس کی تصویر کیا دیکھتا ہے اسکی تصنیف کا مطالعہ کر:

ثنائے سخن

از جناب مولوی احمد عارف صاحب حیدرآبادی

جی میں ہے کیجئے ثنائے سخن — فکر ہے لیکن اسکو کیا کہیئے
جو ہے تیغ حجت قاطع — ترکش تیر بے خطا کہیئے
ہے محاکات کا یہ شیرازہ — اس کو مرآۃ با صفا کہیئے
بزم حاضر کا باعث رونق — عمر رفتہ کا نقش پا کہیئے
نغمۂ بلبلان باغ ادب — پردۂ ساز جوش نوا کہیئے
عشق و عرفاں کے راز کا مخبر — ترجمان گل و صبا کہیئے
موج دریائے علم و حسن بیان — گوہر چشمۂ بقا کہیئے
ہے یہ لاریب حامل جذبات — باغ تخئیل کی فضا کہیئے
لکھیئے اسکو انیس خستہ دلاں — مونس درد آشنا کہیئے
بذلہ سنج محافل فضلاء — نکتہ دان خرد فزا کہیئے
قوم کے درد کی دوا جو یہ ہے — اسکو پھر نسخۂ شفا کہیئے
نازش ساز شوخی و رندی — نغمۂ صوت دلکشا کہیئے
رونق افروز مجلس انشاء — شمع بزم شعرا کہیئے
مایۂ انبساط جوش شباب — غم ربا کہیئے جانفزا کہیئے
دلکش و دلپسند و صلح کل — دلنشیں اور دلربا کہیئے
گتھیاں دل کی کھولدیتا ہے — ناخن صد گرہ کشا کہیئے
راحت قلب ہر غریب و امیر — یاور ہر شہ و گدا کہیئے

جس کے جلوے ہوں اسقدر عارفؔ — اسکو اک شان کبریا کہیئے

علاء الدین جوینی

از جناب مولوی حکیم سید شمس اللہ صاحب قادری ایم آر اے ایس

مغلوں کی تاخت و تاز کا ہولناک فتنہ تاریخ اسلام کے اہم ترین واقعات میں شمار ہوتا ہے۔ ساتویں صدی ہجری کے اوایل ایام میں مشرق سے اس کا ظہور ہوا۔ تیس چالیس سال کے اندر اندر دریائے چین سے لیکر شام و مصر کے حدود تک اور دشت قبچاق سے لیکر خلیج فارس تک تمام ملک ان لوگوں کے تحت تصرّف میں آگیا۔ اور ایسی وسیع ترین سلطنت قایم ہوگئی کہ جسکی مثال تاریخ میں مشکل سے مل سکتی ہے۔

ان وحشیوں کی اس غارتگری سے ایران و ترکستان کو بیحد نقصان پہنچا۔ بیشمار بلاد و بقاع تباہ ہوگئے کروڑہا نفوس کی بے گناہ جانیں تلف ہوگئیں علم و فن کے مرکز، دولت و ثروت کے مخزن خراب و برباد ہوگئے۔ ان لوگوں نے بڑے بڑے مشاہیر روزگار، علما و فضلا کو گائے بکریوں کی طرح ذبح کر ڈالا۔ سینکڑوں کتب خانوں میں آگ لگا دی۔ الغرض اس عالمگیر طوفان سے بہت سے خراب نتایج ظاہر ہوئے منجملہ اُن کے علوم و فنون کو جو ان علاقوں میں منتہائے کمال پر پہنچے ہوئے تھے دفعتاً انحطاط و تنزّل ہوگیا چنانچہ جو لوگ اسلامی علوم و فنون سے تھوڑی سی بھی واقفیت رکھتے ہیں اُن سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے۔

لیکن یہ ایک تعجب خیز امر ہے کہ ادبیات کی ایک شاخ یعنے فن تاریخ کو اس زمانہ میں خوب ترقی ہوئی اور ان وحشی مغلوں کے عہد میں بہت سی اعلیٰ درجے کی تاریخی کتابیں فارسی زبان میں تصنیف ہوئیں جن کی مثال کسی اور زبان میں مشکل سے مل سکتی ہے مثلاً علاء الدین عطا ملک جوینی نے ۶۵۸ھ کے حدود میں تاریخ جہانکشائی تصنیف کی۔ غازان خاں کے وزیر رشید الدین فضل اللہ نے

سنہ ۷۱۰ھ میں اپنی عدیم النظیر کتاب جامع التواریخ کو تالیف کیا۔ ابو سلیمان فخر الدین داؤد بن محمد البناکتی نے جامع التواریخ سے انتخاب کر کے سنہ ۷۱۷ھ میں روضۃ اولی الالباب فی تواریخ الاکابر و الانساب لکھی جو تاریخ بناکتی کے نام سے مشہور ہے۔ شہاب الدین عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی نے سنہ ۷۲۸ھ میں تجزیۃ الامصار و تزجیۃ الاعصار کے نام سے تاریخ جہانکشائی کا تکملہ لکھا جو تاریخ وصاف کے نام سے مشہور ہے حمد اللہ بن ابی بکر بن احمد بن نصر المستوفی القزوینی نے تاریخ گزیدہ اور ظفرنامہ دو کتابیں تصنیف کیں۔ پہلی کتاب جامع التواریخ کا خلاصہ ہے دوسری کتاب شاہنامہ کی طرز پر لکھی گئی ہے جسمیں پچھتر ہزار شعر ہیں پچیس ہزار اشعار میں تاریخ عرب مذکور ہے بیس ہزار اشعار میں ایران کے واقعات مندرج ہیں باقی تیس ہزار اشعار میں مغلوں کی تاریخ بیان کی ہے قاضی القضات ناصر الدین ابی سعید عبداللہ بن عمر بن علی البیضاوی نے سنہ ۶۷۴ھ میں نظام التواریخ لکھی سلطان ابو سعید مرزا کے زمانہ میں محمد بن علی بن محمد بن حسین بن ابی بکر الشبانکاری نے مجمع الانساب تالیف کی وغیرہ وغیرہ۔

ان تمام تصنیفات میں تین کتابیں تاریخ جہانکشائی، جامع التواریخ، تاریخ وصاف خاص امتیاز رکھتی ہیں زمانہ تصنیف کے اعتبار سے جہانکشائی کو باقی دونوں کتابوں پر شرف تقدم حاصل ہے۔ اقوام مغول اور خصوصاً اُن مغلوں کے متعلق جو ایران میں برسر حکومت رہے ہیں ان تین کتابوں سے بہتر اور معتبر کوئی دوسری کتاب دنیا میں نہیں مل سکتی۔ کیونکہ ان کے مصنفین ہمعصر ہونیکے علاوہ شاہی درباروں کے بارسوخ ارکان تھے اور ان لوگوں نے اپنی تصنیفات میں عینی اور یقینی واقعات کو درج کیا ہے۔

جہانکشائی کا مصنف علاء الدین جوینی دربار مغولیہ میں منصب عالی رکھتا تھا پندرہ سال تک امیر ارغوں آقا حاکم ایران و ایشیائے کوچک کے دبیران خاص میں شامل رہا پھر ہلاکو خاں نے اسکو اپنا پرویٹ سکرٹری بنا لیا اس کی وفات کے بعد ابقا خاں اور تکودار خاں نے بغداد اور عراق عرب کی حکومت تفویض کی۔ جسکو اس نے چوبیس سال تک انجام دیا اس لئے یقین ہوتا ہے کہ اس نے

اپنی کتاب میں سچے واقعات اور عینی مشاہدات درج کیا ہے۔

جامع التواریخ کا مصنف رشید الدین فضل اللہ بن ابی الخیر بن عالی الہمدانی ابتداء میں ابقا خاں کا طبیب مقرر ہوا اس کے بعد غازان خاں اور اُس کے بھائی اولجائتو خاں کے عہد میں تقریباً بیس سال تک وزارت کے فرایض انجام دے۔ غازان خاں کے حکم سے اس نے اپنی عدیم النظیر تاریخ لکھنی شروع کی جو اولجائتو خاں کے عہد میں اتمام کو پہنچی۔ اس نفیس کتاب میں اس نے اپنے اُن معلومات کو جمع کیا ہے جو اُسے بادشاہان مغول کی طویل ملازمت کے دوران میں ذاتی مشاہدات کی بنیاد پر حاصل ہوئے ہیں یا وہ قابل اعتبار مسموعات ہیں جنہیں اُس نے چین، تبت، ہندوستان، ترک، عرب، اور یہود و نصاریٰ کے بڑے بڑے علما و حکما اور پیشوایان دین سے سُنا تھا۔ اس لئے اس کتاب کی قدر و قیمت اُس سے بہت بالاتر ہے جو ہمارے تصور میں آسکتی ہے یہ کتاب نہ صرف مغلوں کی تاریخ ہے بلکہ اس میں جمیع مِلل و دول کے حالات از منہ قدیم سے مصنف نے اپنے زمانے تک قلم بند کئے ہیں۔

تاریخ وصاف کا مصنف شہاب الدین عبد اللہ بن عز الدین فضل اللہ شیرازی طبیب رشید الدین فضل اللہ صاحب جامع التواریخ کا معاصر ہے اس کا فرزند خواجہ غیاث الدین محمد شاہی دربار کا متوسل تھا اور عرصہ تک دیوان استیفا کی خدمت جلیلہ انجام دیتا رہا ہے مصنف نے اس کتاب میں یا تو اپنے چشم دید واقعات لکھے ہیں یا اُن حالات کو درج کیا ہے جو اُس نے اپنے معاصر مشاہیر اور ارکان سلطنت سے سنے ہیں تاریخ وصاف کا موضوع جہانکشائی کی طرح صرف اقوام مغول کی تاریخ بیان کرنا ہے لیکن ان مصنفین نے اپنے زمانہ کی بعض دیگر سلطنتوں کا تذکرہ بھی لکھدیا ہے۔

تاریخ جہانکشائی میں ۶۵۵ھ تک واقعات مذکور ہیں۔ تاریخ وصاف جہانکشائی کا ذیل ہے۔ اسمیں ۶۵۶ھ سے ۷۲۸ھ تک یعنے ہلاکو خاں کے بغداد فتح کرنیسے سلطان ابو سعید کی حکومت کے اواسط ایام تک (۷۲) سال کے وہ حالات درج ہیں جو مغلوں کی سلطنت اور اُن کے مقبوضہ علاقوں میں پے بہ پے حادث ہوئے ہیں

تاریخ وصاف کا موضوع بہت اچھا ہے مگر مصنف نے اپنے اظہار لیاقت کے لئے کثرت سے دقیق الفاظ استعمال کئے ہیں۔ ہر مقام پر تصنع سے کام لینے کے علاوہ عبارت کو مقفی اور مسجع کر دیا ہے جس کی وجہ سے ہر جگہ تعقیدات پیدا ہو گئی ہیں اور نفس مضمون منتشر ہو گیا ہے جو وقایع نگاری میں بہت بڑا عیب ہے۔

ان تین کتابوں میں صرف ایک کتاب تاریخ وصاف ۱۲۶۹ھ میں بمقام بمبئی چھپ گئی ہے بقیہ دونوں کتابیں یعنے جہانکشائی اور جامع التواریخ جو نہ صرف زمانہ تصنیف کے اعتبار سے اس پر تقدم رکھتی ہیں بلکہ تکلف انشاء اور ملال انگیز عبارت سے بھی معرا ہیں صرف بڑے بڑے کتب خانوں میں محفوظ ہیں اور مدت دراز تک کسی نے بھی ان کے طبع و اشاعت کی طرف التفات نہیں کیا۔

انگلستان میں مسٹر گب ایک بہت بڑا عالم شرقیات گزرا ہے۔ عربی، فارسی، ترکی ادبیات سے اسکو خاص دلچسپی تھی۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں عین عالم شباب میں جب اس کا انتقال ہو گیا تو اس کی شفیق ماں نے رقم کثیر اس غرض سے وقف کی کہ اس کی آمدنی سے عربی، فارسی، ترکی زبانوں کی مفید عام اور نادر و نایاب کتابیں طبع کیجائیں تاکہ اس تقریب سے اس کے ذی علم فرزند کا نام دنیا میں باقی اور ہمیشہ یادگار رہے چنانچہ اس سلسلۂ اوقاف میں اسوقت تک پچیس تیس کتابیں شایع ہو چکی ہیں ارکان گب میموریل نے جب قابل اشاعت کتابوں کو انتخاب کیا تو ان میں جامع التواریخ اور جہانکشائی کے نام بھی شامل کر لئے۔ جامع التواریخ کی تصحیح موسیو ادگار بلوشہ کے تفویض ہوئی۔ محمد بن عبد الوہاب قزوینی جہانکشائی کی تصحیح پر مامور ہوئے۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جامع التواریخ[1] کی جلد اول کا جزو دوم طبع ہوا اس کے ایکسال بعد جہانکشائی کی

---

[1] جامع التواریخ کی (جو اسوقت دنیا میں موجود ہے) دو جلدیں ہیں۔ پہلی جلد میں مغلوں کے حالات ہیں دوسری جلد میں دنیا کی عام تاریخ مرقوم ہے۔ علاوہ اس کے رشید الدین فضل اللہ نے مسالک و ممالک (جغرافیہ) کے متعلق تیسری جلد لکھنے کا ارادہ کیا تھا لیکن کثرت مشاغل کیوجہ سے یہ جلد تیار نہ ہو سکی جلد اول کو موسیو ادگار بلوشہ نے تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

حصۂ اول میں اقوام ترک و مغل، چنگیز خاں اور اس کے آبا و اجداد کی تاریخ مذکور ہے

پہلی جلد شایع ہوئی۔ باقی جلدیں ابھی زیر طبع ہیں۔

علاءُ الدین کے آباؤ اجداد

علاء الدین کا خاندان ایران کے ممتاز ترین خاندانوں میں شمار ہوتا ہے اس کے آباؤ اجداد سلاطین سلجوقیہ اور شاہان مغول کے درباروں میں بڑے بڑے عہدوں پر مامور تھے خصوصاً صاحب دیوان کی خدمت جلیلہ اس خاندان میں مدت سے چلی آرہی تھی۔ اسی سبب سے اس خاندان کے اکثر ارکان "صاحب دیوان" کے لقب سے مشہور تھے۔

اس خاندان کا سلسلۂ نسب فضل بن ربیع تک پہنچتا ہے۔ امام شمس الدین محمد بن احمد الذہبی نے اسکی تفصیل اسطرح بیان کی ہے۔ "صدر المعظم صاحب الدیوان

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) اس حصہ کو موسیو برزین نے جو روس کے مستشرقین سے ہیں معہ روسی ترجمہ کے سنہ ۱۸۶۸ء میں بمقام سینٹ پیٹرز برگ چھاپ کر شایع کیا ہے لیکن ممالک معاصر کے جو حالات مذکور تھے انہیں حذف کر دیے ہیں۔

حصۂ دوم میں چنگیز خاں کی حسب ذیل اولاد و احفاد کا تذکرہ ہے۔ اوکتائی قاآن جوچی (توشی) قاآن۔ چغتائی قاآن۔ تولی قاآن پسران چنگیز خاں کیوک خاں بن اوکتائی قاآن۔ منگو قاآن بن تولی قاآن۔ قوبیلائی قاآن بن تولی قاآن۔ تیمور قاآن بن چیم کیم بن قوبیلائی قاآن اس حصہ کو موسیو ادگار بلوشہ نے شایع کیا ہے۔

حصۂ سوم میں ایران کے حسب ذیل شاہان مغول کا تذکرہ ہے۔ ہولاکو خاں بن تولی قاآن بن چنگیز خاں۔ ابقا قاآن بن ہولاکو قاآن تنکودار خاں بن ہولاکو خاں معروف بہ سلطان احمد۔ ارغون خاں بن ابقا قاآن۔ کیخاتو خاں بن ابقا خاں۔ غازان خاں بن ارغون خاں اس حصہ کے ابتدائی اجزا کو جس میں ہولاکو خاں کے حالات ہیں موسیو کاترمر نے فرانسیسی ترجمہ کے ساتھ سنہ ۱۸۳۶ء میں شایع کیا ہے اور اس پر بہت سے کارآمد حواشی لکھے ہیں۔

ابوالمظفر علاءالدین عطا ملک ابن بہاءالدین محمد بن شمس الدین محمد بن بہاءالدین محمد بن علی بن محمد بن محمد بن محمد بن علی بن محمد بن نصر بن ایوب بن فضل بن الربیع۔

فضل بن ربیع تاریخ اسلام کے مشاہیر رجال سے ہے اس کا باپ ابتداء میں خلیفہ منصور عباسی کا حاجب مقرر ہوا پھر ترقی پاکر وزیر ہو گیا اور مہدی و ہادی کے زمانہ تک اس خدمت کو انجام دیتا رہا۔ فضل بن ربیع مہدی و ہادی کے زمانہ میں منصب حجابت انجام دیا کرتا تھا۔ ربیع کی وفات کے بعد ہارون الرشید نے اسکو اپنا وزیر مقرر کیا۔ اس کے احوال و اعمال سے تاریخ و تراجم کی سینکڑوں کتابیں مشحون ہیں۔ جن کا ذکر بخوف طوالت قلم انداز کیا جاتا ہے۔

۵۸۵ھ میں سلطان تکش خوارزم شاہ نے سلطان طغرل (اخیر فرمانروائے سلجوقیہ) پر فوج کشی کی تو علاقہ خوارزم سے نکل کر رے کی جانب روانہ ہوا۔ اثناء راہ میں جب بمقام آزادوار (واقع جوین) قیام کیا تو بہاءالدین محمد بن علی اُس کی خدمت میں حاضر ہوا۔ بہاءالدین محمد بن المویدالکاتب البغدادی بھی موجود تھا۔ بادشاہ کے سامنے دونوں میں خوب بحث مباحثے ہوئے۔ بہاءالدین محمد بن علی نے وزیر کے ایماء سے فی البدیہہ یہ رباعی موزوں کی۔

لطف شرف گوہر مکنوں ببرد	جود کف تو رونق جیحوں ببرد
حکم تو بیک لحظہ اگر رائی کنی	سودائے محال از سر گردوں ببرد

اسکو سُنکر سلطان بیحد مسرور ہوا اور بہاءالدین کو بہت کچھ انعام واکرام سے سرفراز کیا۔ [1]

بہاءالدین محمد بن علی کا ماموں منتخب الدین بدیع الکاتب الجوینی اپنے زمانہ کے مشہور خوشنویسوں سے ہے سلطان سنجر سلجوقی نے اس کو اپنے دیوان الانشاء کا رئیس مقرر کر رکھا تھا ملا نورالدین محمد عوفی نے اپنے تذکرہ لباب الالباب میں اس کے بعض سوانحات قلم بند کئے ہیں[2] اس نے فن انشاء میں بہت سے رسائل تصنیف کئے ہیں جن کا مجموعہ روس کی مجلس السنہ مشرقیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے

---

[1] تاریخ جہانکشائی جلد دوم ورق ۶۹۔　[2] تذکرہ مذکور طبع لیڈن جلد اول صفحہ ۷۸-۸۰

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سلطان سنجر نے مشہور شاعر رشید الدین وطواطہ کو قتل کرنا چاہا تھا لیکن اسی منتخب الدین کی سفارش پر سلطان نے اس کا قصور معاف کر دیا دولت شاہ سمرقندی نے اپنے تذکرۃ الشعراء میں اس واقعہ کی تفصیل کو اس طرح تحریر کیا۔

سلطان سنجر نے ۵۴۲ھ میں اتسز خوارزم شاہ پر چڑھائی کرنے کی غرض سے خوارزم کی جانب روانہ ہوا۔ اثناء راہ میں قصبہ ہزار اسپ کا محاصرہ کیا۔ حکیم اوحد الدین انوری سلطان سنجر کے لشکر میں موجود تھا اُس نے یہ رباعی تیر پر لکھ کر قلعہ ہزار اسپ میں پھینکی۔

اے شاہ ہمہ ملک زمین حسب تراست　　وز دولت اقبال جہاں کسب تراست

امروز بیک حملہ ہزار اسپ بگیر　　فردا خوارزم وصد ہزار اسپ تراست

رشید وطواطہ نے اس کے جواب میں یہ شعر تصنیف کیا۔ اور اُسے تیر پر لکھ کر سنجر کے لشکر میں ڈال دیا۔

گر خصم تو اے شاہ شود رستم گرد　　یک خر ز ہزار اسپ نتواند برد

اس واقعہ سے مدت سے رشید وطواطہ نے جلوس اتسز کے موقع پر ایک قصیدہ لکھا تھا اُس کے مطلع میں کہتا ہے۔

چوں ملک اتسز تخت ملک در آمد　　دولت سلجوق و آل او بسر آمد

ان بے عنوانیوں کی بناء پر سلطان سنجر رشید وطواطہ سے کبیدہ خاطر ہو گیا تھا اور عہد کر لیا تھا کہ اگر کسی وقت ہاتھ آئے تو اُسے قتل کرا کے اعضاء کے سات ٹکڑے کرا دوں گا۔ جب ہزار اسپ فتح کر لیا تو رشید وطواطہ پریشان ہو کر بڑے بڑے امرا اور اعیان دولت سے التجا کرنے لگا تاکہ سلطان سنجر سے اُس کی سفارش کر کے عفو تقصیر کرا دیں۔ لیکن سلطان کے غیظ و غضب کو دیکھ کر ہر ایک نے انکار کر دیا۔ آخر الامر رشید وطواطہ جب منتخب الدین بدیع کے یہاں پہنچا تو اُس نے رشید وطواطہ کے ساتھ تشفی آمیز گفتگو کی اور ایک مرتبہ موقع پا کر سلطان سے عرض کیا کہ وطواطہ چھوٹا سا جانور ہے اُس کے اعضاء میں اس قدر گنجایش کہاں ہے کہ اُس کے سات ٹکڑے ہو سکیں۔ اگر حکم ہو تو صرف دو ٹکڑے کر دیئے جائیں منتخب الدین کی اس گفتگو سے سلطان کو بیساختہ ہنسی آگئی اور اُس نے رشید وطواطہ کی

جان بخشی کا حکم دیدیا سلہ

علاء الدین کا دادا شمس الدین محمد بن محمد سلطان محمد خوارزم شاہ کے ملازمین سے تھا۔ دیوان استیفاء کی خدمت اس کے تفویض تھی۔ ۶۱۷ھ میں محمد خوارزم شاہ جب مغلوں سے شکست پاکر بلخ سے نیشاپور کو بھاگا تو شمس الدین بھی اُس کے ہمراہ موجود تھا محمد خوارزم شاہ کے بعد جب اُس کا بیٹا سلطان جلال الدین منکبرنی تخت نشین ہوا تو اس نے بھی شمس الدین کو قدیم خدمت پر بحال رکھا۔ سلہ

علاء الدین کا باپ بہاء الدین محمد بن محمد اُن حکام و عمال کے دربار میں صاحب دیوان تھا جو چنگیز خانی فتوحات کے بعد ہولاکو خاں کے فتح ایران تک مغلستان اور اُس کے مغربی ولایات میں مغلوں کی طرف سے حکمرانی کر رہے تھے اوکتائی قاآن کی طرف سے جنتمور نام ایک مغول سردار خراسان و مازندراں میں حکمراں تھا۔ اس نے سنہ ۶۳۰ھ میں اپنے ایک امیر کلبلات کو لشکر دیکر نیشاپور کی جانب روانہ کیا تاکہ قراجہ اور تغان سنقر کا استیصال کرے یہ دونوں امیر سلطان جلال الدین منکبرنی کے ایماء سے نیشاپور اور اُس کے اطراف و انواح میں تاخت و تاراج کیا کرتے تھے اس زمانہ میں بہاء الدین محمد نیشاپور میں رہا کرتا تھا۔ اس ہنگامہ سے پریشاں ہوکر وہاں کے اشراف و اکابر کے ساتھ طوس میں چلا آیا۔ اور تاج الدین فریزنی کے یہاں (جو قلعہ طوس کا حاکم تھا) پناہ لی۔ امیر کلبلات نے جب قراجہ کو شکست دی۔ تو طوس کو واپس چلا آیا۔ اور اس نووارد جماعت کے حالات سنکر انہیں اپنے یہاں طلب کیا۔ اور انہیں ہر قسم کی امداد و اعانت دے کر جنتمور کے یہاں روانہ کردیا۔ جنتمور نے ان لوگوں کی خوب خاطر تواضع کی اور تھوڑے ہی عرصہ میں بہاء الدین محمد کو خراسان و مازندراں کا صاحب دیوان بنادیا۔ اس واقعہ کے دو سال بعد سنہ ۶۳۳ھ میں جنتمور نے ایک سفارت اوکتائی قاآن کے دربار میں روانہ کی جس میں کرگوز اور بہاء الدین محمد شریک تھے۔

سلہ۔ تذکرہ دولت شاہ طبع لیڈن صفحہ ۹۰ ۔ سلہ۔ حبیب السیر جلد دوم صفحہ ۱۳۴

اسمٰعیلیوں کا آخری بادشاہ ہے اور رضامندی کے بعد ایک یرلیغ لکھ دے جس میں صلح وتسلیم کے شرائط مذکور ہوں۔

جب قلعۂ اَلموت فتح ہو گیا اور حکومت اسمٰعیلیہ نیست ونابود ہو گئی تو علاء الدین کو اندیشہ ہوا کہ کہیں الموت کا کتب خانہ تباہ وبرباد نہ ہو جائے کیونکہ اُسے بانیان اَلموت نے بڑی کوشش وجانفشانی سے قایم کیا تھا۔ حسن صباح کے زمانہ سے اس وقت تک قریباً ایک سو ستر سال کے طویل عرصے میں کثرت کے ساتھ نفیس ونادر کتابیں اُسمیں جمع کی گئی تھیں۔ پس علاء الدین نے ہولاکو خاں کو ایک عرضداشت لکھی اور اُسے توجہ دلائی کہ اَلموت کی نفیس کتابیں ضایع نہ کی جائیں۔ ہولاکو خاں نے اس بات کو بہت پسند کیا اور علاء الدین کو حکم دیا کہ وہ بذات خود قلعہ میں جاکر کتب خانے کو دیکھے اور وہاں کی کتابوں کو جو بادشاہوں کے مطالعہ کے لایق ہوں انتخاب کرے۔ علاء الدین نے کتب خانے اور خزانے کا بالاستیعاب معائنہ کیا۔ وہاں سے بہت سے مصاحف عمدہ کتابیں۔ رصدی آلات وغیرہ چن لئے۔ لیکن ایسی کتابوں کو جو اسمٰعیلیہ مذہب کے متعلق تھیں جلوادیا۔ اس کتب خانے میں حسن صباح کی ایک مبسوط سوانح عمری تھی جسے اُس کے معتقدین نے بڑی جدّ وجہد سے تصنیف کیا۔ عجب اتفاق ہے کہ علاء الدین نے اس کتاب کو نہیں جلوایا۔ بلکہ اپنے ساتھ لایا۔ اور اپنی تاریخ کی آخر جلد میں اُس کا مختصر ساخلاصہ بھی درج کر دیا۔ پھر یہ سوانح عمری رشید الدین فضل اللہ کو ملی تو اس نے حشو وزواید کو حذف کر کے کتاب کے پورے مطالب اپنی کتاب جامع التواریخ کی جلد دوم میں درج کر لئے۔ یہ دونوں انتخاب تاریخ اسمٰعیلیہ اور خصوصاً حسن صباح کے متعلق بہت بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور ان میں کثرت سے ایسے قیمتی معلومات درج ہیں جو کسی دوسری کتاب میں نہیں ملسکتے۔ [۱]

اسمٰعیلیوں کے استیصال کے بعد ہولاکو خاں نے فتح بغداد کا ارادہ کیا اور لشکر لیکر خلیفۃ المستعصم کے مقابلہ پر روانہ ہوا۔ مغولیہ لشکر کرمانشاں اور حلوان سے گزرتا ہوا

[۱] اس کتاب کا خلاصہ جہانگشائی میں صرف آٹھ صفحوں پر درج ہے برخلاف اسکے رشید الدین نے اس کے انتخاب ...مع التواریخ کے پچاس صفحات پُر کئے ہیں۔

بغداد پہنچا۔ اس مہم میں ایران کے تمام بڑے بڑے اعیان وعلماء ہلاکو کے ہمراہ موجود تھے مثلاً بزرگ کوکا۔ ایلکا۔ امیر رفیق۔ آرغون آقا سیف الدین خواجہ نصیر الدین طوسی۔ علاء الدین عطا ملک وغیرہ[۱] ۶۵۶ھ میں بغداد فتح ہو گیا۔ اس واقعہ کے ایک سال بعد ہولاکو نے یہاں کی حکومت علاء الدین کے تفویض کی اور اُس کے بھائی شمس الدین جوینی کو منصب وزارت سے سرفراز کیا۔

بغداد کی حکومت

ہولاکو خاں کے انتقال تک علاء الدین بغداد کی حکومت کو برابر انجام دیتا رہا۔ ۱۹ ربیع الاول ۶۶۳ھ کو ابقاخاں برسر حکومت ہوا اس نے اپنے باپ ہولاکو خاں کے انتظامات میں بہت کم رد و بدل کیا شمس الدین جوینی اپنی قدیم خدمت وزارت پر بحال رہا امیر سوغونجاق کو ممالک بغداد و فارس کی حکومت سرفراز کی۔ علاء الدین کو اس کا نائب مقرر کیا۔ اصفہان اور عراق عجم اس کے بھتیجے بہاء الدین محمد بن شمس الدین جوینی کے تفویض ہوئے۔ ابقاخاں نے ۶۶۳ھ تک قریباً سترہ سال حکمرانی کی۔ اس عرصے میں عراق عرب (بغداد) کی حکومت امیر سوغونجان کے نام سے نامزد تھی لیکن یہ امیر عموماً بادشاہ کی مصاحبت میں رہا کرتا تھا اور تمام انتظامی مہمات علاء الدین کے ذمہ تھے۔ اس اعتبار سے اس صوبہ میں اسی کی مستقل حکومت تھی۔

امام شمس الدین ذہبی نے لکھا ہے کہ علاء الدین نے اپنے زمانہ حکومت میں رفاہ خلائق کے بہت سے کام انجام دیئے۔ زراعت وتجارت کو خوب ترقی دی۔ جس کی وجہ سے عراق عرب کے باشندوں کو بہت بڑا فائدہ پہنچا ایک لاکھ دینار سرخ صرف کرکے شہر انبار کے پاس دریائے فرات سے ایک نہر کھدوائی اور اُسکو کوفہ اور نجف تک جاری کیا اس نہر کے کنارے دیڑھ سو قریے آباد کرائے اور ان کے اطراف جو اراضی افتادہ پڑے ہوئے تھے اُن میں زراعت شروع کرادی۔ ان اسباب سے یہ علاقہ جو مغلوں کی تاخت وتاز کے بعد پامال اور جنگل سا ہو گیا تھا از سر نو آباد و معمور اور سرسبز وشاداب بن گیا۔

---

[۱] جامع التواریخ طبع کاترمر ص ۲۶۴

نجف میں امیر المومنین حضرت علیؑ ابن ابی طالب کے مشہد کے پاس ایک رباط تعمیر کرایا تھا جسمیں آکر فقرا اور طلباء قیام کرتے تھے۔ انہیں خورد نوش اور دیگر ضروریات کا سامان سرکاری طور پر دیا جاتا تھا۔[1]

ابن العبری نے لکھا ہے کہ علاء الدین کے زمانۂ حکومت میں بغداد میں ایک عیسائی نے اسلام قبول کر لیا تو وہاں کے جاثلیق[2] دنہا نے جو نصارائے نسطوریہ سے تھا اُسے گرفتار کر کے دجلہ میں غرق کرنا چاہا۔ جب یہ خبر منتشر ہوئی تو اہل بغداد نے علاء الدین سے فریاد کی علاء الدین نے اُسے ہر چند منع کیا مگر جب وہ اپنی حرکت سے باز نہ آیا تو اہل بغداد نے جمع ہو کر اُس کے مکان میں آگ لگا دی۔ علاء الدین نے اپنے چند سپاہی روانہ کئے تاکہ جاثلیق کو کسی طرح بچا لیں۔ ان لوگوں نے ایک ایسے خفیہ راستے سے جو دجلہ کے پاس بنا ہوا تھا علاء الدین کے محل میں پہنچایا۔ اس طرح سے اسکی جان بچ گئی۔[3]

علاء الدین بغداد میں قریباً ۲۴ سال حکمراں رہا۔ یعنے ہولاکو کے عہد میں قریباً ۶ سال ۶۵۷ھ سے ۶۶۳ھ تک ابقا خاں کے زمانے میں قریباً ۱۷ سال یعنے ۶۶۳ھ سے ۶۸۰ھ تک۔ تکودار کے عہد میں قریباً ایک سال یعنے ۶۸۰ھ سے ۶۸۱ھ تک۔ اس عرصے میں بہت سے حاسد و مفسد آدمیوں نے مغولیہ دربار میں اس کی شکایتیں لکھیں لیکن ان میں سے ایک بھی کارگر نہیں ہوئی۔ قراُبوقا نام ایک شخص مغولوں کی طرف سے بغداد میں شحنہ تھا۔ اس کے نائب اسحٰق آرمنی نے سازش کر کے ایک اعرابی بدوے یہ مشہور کرا دیا کہ علاء الدین اپنی آل اولاد اور مال و متاع کو لیکر شام میں جانا چاہتا ہے اس لئے مجھے بادیہ سے طلب کیا ہے تاکہ میں اس کی رہبری کروں۔

---

[1] تاریخ دول الاسلام۔

[2] جاثلیق (*Catholique*) ممالک شرق میں عیسائیوں کے صدر پادری کو جاثلیق کہتے ہیں

[3] اس واقعہ کو کاترمر نے اپنی کتاب کنوز مشرقیہ (*Mines d'orient*) میں ابن عبری کی سریانی تاریخ (*Chranicon Syriacum*) کے حوالہ سے لکھا ہے۔ دیکھو کتاب مذکور کا صفحہ ۲۲۵ و ۲۲۶۔

اس زمانہ میں شاہان مغول اور ممالیک مصر وشام میں سخت عداوت تھی۔ دونوں کو اگر کسی شخص کی نسبت یہ گمان ہوتا کہ فریق مخالف کیساتھ اُس کے تعلقات قایم ہیں تو وہ سخت مجرم سمجھا جاتا تھا۔ اعرابی کا بیان جب منتشر ہو گیا تو مغولیہ سرداروں نے علاء الدین کو گرفتار کر کے انقاخاں کے دربار میں حاضر کیا لیکن بادشاہ کے حکم سے اعرابی شکنجے میں کسا گیا اور اُسکو تکلیف ہونے لگی تو بیقرار ہو کر اقرار کر دیا کہ اسحق ارمنی کے کہنے سے میں نے اس پر یہ تہمت لگائی ہے پس بادشاہ نے اس کی سزا میں اُس اعرابی اور اسحق ارمنی کو قتل کرادیا اور علاء الدین رہا کر دیا گیا۔ [1]

نقیب النقبا تاج الدین علی بن محمد بن رمضان الحسنی العلوی المعروف بابن الطقطقی عراق کے مشہور مالدار لوگوں میں تھا۔ خالصۂ دیوانی کی بہت سی املاک اس کے یہاں اجارہ پر تھیں جس کی وجہ سے اسکو عجیب عزت وثروت حاصل ہو گئی تھی۔ اس نے انقاخاں کو ایک عرضداشت روانہ کی اور اُسمیں لکھا کہ علاء الدین بغداد کی حکومت سے معزول کر دیا جائے شمس الدین جوینی نے جو وزیر اعظم تھا یہ عرضداشت اپنے بھائی علاء الدین کے یہاں روانہ کر دی اور اس کی پشت پر یہ دو شعر لکھ دیے۔

کم لی اُبَنّہ منک مُقابہ قائم   یُبدی سباناً کلما بنہسة

وکانک الطفل الصغیر بمہدہ   یزداد نوراً کلما حرکتہ

علاء الدین نے ابن الطقطقی کے استیصال کا مصمم ارادہ کر لیا اور ایک جماعت کو اس کے مکان پر تعینات کر دیا تا کہ رات کے وقت حملہ کر کے اُسے قتل کر ڈالے اور خود بھی عین وقت پر آ کر اپنے روبرو اُسے قتل کرادیا اور اُس کی جائیداد ضبط کر کے اپنے قبضہ میں کر لی۔ [2]

اسی تاج الدین کے فرزند صفی الدین محمد بن الطقطقی نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام "غنیۃ الفضلا فی تواریخ الخلفا والوزرا" ہے لیکن وہ تاریخ الفخری کے نام سے

---

[1] تاریخ مختصر الدول لابن العبری طبع بیروت صفحہ ۴۹۷ - ۴۹۸۔

[2] عمدۃ المطالب فی انساب آل ابی طالب۔ تالیف جمال الدین احمد بن علی بن عقبۃ الحسنی العلوی المتوفی ۸۲۸ھ۔ قلمی نسخہ صفحہ ۲۱۶۔

اوکتائی قاآں بہاء الدین محمد کے ساتھ کمال عنایت سے پیش آیا اور بہت سا انعام و اکرام دینے کے علاوہ پائیزہ[1] اور یرلیغ آلتمغا[2] دے کر تمام ممالک ایران کا صاحب دیوان مقرر کیا۔
۶۳۷ھ میں جنتمور کی بجائی گرگوز خراسان و مازندران کا حاکم مقرر ہوا اور اسی دوران میں کسی خاص وجہ سے اوکتائی قاآں کے اردو میں چلا گیا تو اپنے ممالک متصرفہ کی حکومت بہاء الدین کے تفویض کی ۶۴۳ھ میں گرگوز کے بعد امیر ارغون بلاد غربی کا حاکم قرار پایا اسی سال کیوک خاں نے جب اس کو اپنے دربار میں طلب کیا تو اس نے بہاء الدین کو آذربائیجان۔ گرجستان۔ اور بلاد روم میں اپنا نائب بنایا۔ اس کے بعد ۶۴۴ھ یا ۶۴۵ھ میں اس نے دوسرا سفر کیا تو بہاء الدین مصاحب کی حیثیت سے اُس کے ہمرکاب رہا۔ اس کے تھوڑی مدت بعد امیر ارغون نے تیسرا سفر اختیار کیا تو بہاء الدین کو انتظام مملکت کیلئے بلاد غربی میں اپنا قایم مقام بنایا۔ امیر حسن نام ایک دوسرے شخص کو اس کا مشیر کار قرار دیا۔

لہ۔ پائیزہ سونے یا چاندی کی ایک تختی ہوتی ہے جو اختلاف مراتب کے لحاظ سے اظہار خوشنودی کی حالت میں بادشاہ سرفراز کرتا ہے اس پر ایک جانب خدا کا نام اور دوسری جانب بادشاہ کا نام یا مخصوص علامت محکوک ہوتی ہے۔ بادشاہان مغول جب کسی آدمی پر عنایت کرتے تو اُس کے اعزاز و مرتبہ کی حیثیت سے بطور اظہار اعزاز کے اسے مرحمت کیا کرتے تھے یہ نشان خصوصاً روسائے قشوں اور امیران صدہ و ہزارہ کو دیا جاتا تھا ایک پائیزہ پر شیر کا سر منقور ہوتا تھا اور یہ سب سے بالاتریں پائیزہ سمجھا جاتا تھا۔ جامع التواریخ طبع کاترمر صفحہ ۱۷۷-۱۷۹۔
لہ۔ یرلیغ کے معنی حکم یا فرمان شاہی کے ہیں۔ آل تمغا سُرخ مہر کو کہتے ہیں جن فرامین اور احکام و مراسلات پر سُرخ مہر ہوتی تھی وہ یرلیغ آلتمغا کہلاتے تھے اس قسم کے دو مراسلات فرانس کے خزانہ اسناد رسمی میں محفوظ ہیں۔ انہیں ارغون خاں اور اولجائتو خاں نے بادشاہ فرانس فلپ لے بل کے نام ارسال کیا تھا (دیکھو سفرنامہ مارکوپولو صفحہ ۷۷۵-۷۸۱۔ اگر یہ مہر آب زر سے کی جاتی تو اُسے التون تمغا کہتے تھے اور اگر اس کا رنگ سیاہ ہوتا تو قراتمغا کہلاتی تھی۔ جامع التواریخ طبع بلوشہ صفحہ ۲۴۷۔

۶۵۱ھ میں امیر ارغون نے بہاء الدین کو عراق وغیرہ کی حکومت حوالہ کی لیکن اس وقت بہاء الدین کی عمر ۶۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی۔ اس لئے اس نے ارادہ کیا کہ بقیہ عمر اعمال دیوانی کی انجام دہی میں گزار دے۔ لیکن دیگر امرانے جب اس بات کو منظور نہیں کیا تو ناچار عراق کی جانب روانہ ہوگیا اور جب اصفہان میں پہنچا تو اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ یہ واقعہ ۶۵۱ھ کا ہے۔

عَلاءُ الدّین عطاءِ مَلِک

علاء الدین عطا ملک جوینی ۶۲۳ھ میں پیدا ہوا ابھی بیس سال کا نہیں ہوا تھا کہ ملازمت اختیار کرلی اور امیر ارغون کے دبیران خاص میں شامل ہوکر رسل و رسائل کے خدمات انجام دینے لگا۔ امیر ارغون ۶۴۱ھ سے ۶۵۴ھ تک قریباً پندرہ سال شاہان مغول کی طرف سے اُن تمام ولایت کا حاکم رہا ہے جو آب جیحوں کے مغرب میں واقع ہیں یعنے ممالک خراسان دمازندران وافغانستان وعراق وفارس وکرمان ولورستان واران و آذربائیجان وگرجستان وموصل وحلب وغیرہ۔ ۶۵۴ھ میں جب ہُولاکو خاں ایران میں آیا تو امیر ارغون آقا کو اپنے سرداران خاص میں شامل کرلیا۔ بالآخر ۲۵ ذی الحجہ ۶۷۳ھ کو طوس کے مرغزار رادکان میں اس نے وفات پائی۔ امیر نوروز جس کی سعی وکوشش سے غازاں خاں نے اسلام قبول کیا تھا۔ اسی ارغون آقا کا فرزند ہے۔

امیر ارغون نے اپنے ایام حکومت میں منغولستان کے چھ سفر کئے اور وہاں کے دارالسلطنت قَراقُورم میں جاکر شاہی درباروں میں شریک ہوا ان اسفار میں علاء الدین بھی دبیر خاص کی حیثیت سے ہمراہ موجود تھا۔ اور اسی سیر وسفر اور نقل وحرکت میں اس نے اپنی عمر کے دس سال گزارے۔ چنانچہ جہانگشائی کے دیباچہ میں اس واقعہ کی طرف اس طرح اشارہ کرتا ہے۔

> از خداوندان فضل وافضال سزد کہ برکاکت وقصور الفاظ از راہ کرم ذیل عفو واقالت بپوشانند چہ مدت دہ سال می شود کہ پلئے در راہ اغتراب نہادہ واز تحصیل اجتناب نمودہ واوراق علوم نسخ علیہ العنکبوت شدہ [۱]۔

---

[۱] جہانگشائی طبع لیسٹرن صفحہ (۷)

۹۔ ربیع الاول ۶۴۹ھ کو جب منکو قاآن برسرحکومت ہوا تو اس کی تہنیت میں ایک عظیم الشان دربار منعقد کیا اور اُس میں شریک ہونے کے لئے اپنی سلطنت کے تمام اعیان و امرا اور مشاہیر رجال کو دعوت دی۔ امیر ارغوں بھی خوب شان و شوکت کے ساتھ اپنے علاقہ سے نکلا اور ایک سال کے بعد ۲۰ صفر ۶۵۰ھ کو قراقورم میں پہنچا دربار کے برخاست ہونے پر امیر ارغوں تو اپنے علاقہ میں واپس آگیا لیکن علاء الدین قریباً ایک سال پانچ مہینے تک یہاں مقیم رہا اس کے بعد رجب ۶۵۱ھ کے اوائل ایام میں ایران کو واپس چلا آیا۔

علاء الدین اس عرصہ میں منگو قاآں کے دربار میں رہا۔ وہاں کے اکثر اعیان و علماء نے اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ ایک ایسی تاریخ تصنیف کرے کہ جس میں اقوام مغول کے عروج و اقبال سے اس وقت تک جس قدر حوادث عظیمہ ظہور پذیر ہوئے ہیں وہ سب درج ہو جائیں۔ علاء الدین نے علم و ہنر کی کساد بازاری کو دیکھ کر اس امر خطیر سے درگزر کرنا چاہا مگر بہت جلد اُسے یہ معلوم ہو گیا کہ اقوام مغول کی تاریخ و سرگزشت کے فراہم کرنے میں اُسے جو سہولت و آسانیاں ہیں مشکل سے کسی دوسرے شخص کو میسر آسکتی ہیں۔ کیونکہ اُس نے تقریباً دس سال تک مغلوں کے تمام مقبوضہ ممالک میں سیاحت کی تھی۔ اور کئی مرتبہ ماوراء النہر، ترکستان، ایغورستان اور مغلستان سے لیکر چین و ماچین کی سرحدوں تک اُسے سفر کرنیکا اتفاق ہوا تھا سلطنت مغولیہ کے بہت سے وقایع عظیمہ اس نے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کئے تھے۔ شاہان مغول کے دربار میں اس کو خاص رسوخ حاصل تھا۔ وہاں کے بڑے بڑے لوگوں سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے۔ جن کے توسط سے اس کو مغلوں کے متعلق سچے سچے حکایات و روایات معلوم ہو سکتے تھے۔ ان اسباب و وجوہات کے ذہن نشین ہوتے ہی علاء الدین نے اپنی تاریخ لکھنی شروع کی اور اپنے مسموعات و مشاہدات کو جمع کر کے قریباً آٹھ سال کے عرصہ میں ختم کیا۔

قراقورم کے زمانہ قیام میں علاء الدین نے اردو بالیغ کے آثار و کتبات علیحدہ بہت دلچسپی سے دیکھے اور ان مشاہدات کو اپنی تاریخ میں موقعہ بموقعہ نہایت عمدہ پیرایہ سے درج کیا۔ اردو بالیغ ایغورستان کا قدیم دار السلطنت ہے مدت ہوئی کہ تباہ و برباد

ہو گیا تھا۔ اوکتائی قاآن نے اس قدیم بنیاد کے قریب ایک نیا شہر بسایا اور قراقورم اُس کا نام رکھ کر اُسے اپنا دار الحکومت قرار دیا۔

علاء الدین جب قراقورم سے واپس آیا تو امیر ارغون کے دربار میں قدیم خدمت پر بحال ہو گیا۔ ۶۵۴ھ میں ہولاکو خاں کے ایران میں آنے کی وجہ سے امیر ارغون منگو قاآن کے دربار میں واپس جانے لگا۔ روانہ ہونے سے پہلے بلخ کے علاقہ میں مرغزار شغورخان میں آیا اور اپنے بیٹے کرائے ملک، امیر احمد بتیکچی اور علاء الدین کو ہولاکو خاں کی خدمت میں بھیجکر انہیں عراق، خراسان اور ماژندران کے بترتیب مہمات اور تدبیر مصالح پر متعین کیا۔ اس تاریخ علاء الدین ہولاکو خاں کے ملازمین خاص میں شامل ہو گیا۔ پھر اس کے مناصب و مدارج میں روز بروز ترقی ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ مجد الملک یزدی نے اس کی مخالفت شروع کی جس کیوجہ سے اس کے اختر اقبال کو زوال ہونے لگا جس کا تذکرہ آیندہ اوراق میں آئیگا۔

اسی زمانہ میں ہولاکو خاں اسمٰعیلیوں کا قلع قمع کرنے کی غرض سے خراسان سے نکلا۔ اور روزانہ کوچ کرتا ہوا جنوشان (قوچان) میں آیا۔ یہ مقام مغولوں کی گزشتہ تاخت و تاز میں تباہ ہو گیا تھا۔ سوائے جامع مسجد کی ایک دیوار کے باقی تمام عمارات وقنوات وغیرہ منہدم ہو گئے تھے۔ علاء الدین نے اس حالت کو دیکھ کر ہولاکو خاں سے عرض کیا تو اُس کے از سر نو آباد کرنے کا حکم دیا اور خزانہ شاہی سے رقم کثیر عنایت کی تاکہ ضروری عمارات تعمیر کی جائیں اور قنوات وکاریز کی مرمت کی جائے۔ جب تعمیر کا کام ختم ہوا تو علاء الدین نے یہاں کے باشندوں کو جو تباہی کے بعد جلاوطن ہو گئے تھے بلا کر آباد کرایا۔

جہانکشائی کے مطالعہ سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ اسمٰعیلیوں کے استیصال کے لئے ہولاکو خاں نے جس قدر لڑائیاں کی ہیں اُن سب میں علاء الدین ہولاکو کے ہمراہ موجود اور کاروبار میں شریک وسہیم تھا ہولاکو خاں نے سب سے پہلے الموت کے مضبوط ومستحکم قلعہ میمون دز کا محاصرہ کیا جو اسمٰعیلی بادشاہوں کا مسکن ومستقر تھا کئی معرکہ آرائیوں کے بعد اہل قلعہ نے مجبور ہو کر اطاعت قبول کرنی چاہیئے۔ جس کی بناء پر ہولاکو نے علاء الدین کو حکم دیا کہ وہ قلعہ کے اندر جا کر رکن الدین خورشاہ سے گفتگو کرے۔ جو الموت کے

مشہور ہوگئی ہے۔ اسمیں مصنف نے علاءالدین کی خوب برائیاں کیں اور اقسام اقسام کے جھوٹے روایات اور اتہامات اس سے منسوب کئے ہیں اور نہایت طعن کے ساتھ اسکا مجہول النسب ہونا بیان کیا ہے لیکن اسکی اصلی وجہ وہی عداوت ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے دیکھو کتاب مذکور مطبوعہ ڈرن برگ کے صفحات ۲۲- ۲۳- ۷۵- ۲۴۸- ۲۳۹- ۲۴۱-

مجدالملک کی مخالفت

ابقاخاں کے اخیر زمانے میں مجد الملک کی مخالفت سے اس خاندان کو سخت نقصان پہنچا۔ چنانچہ اس کے تفصیلی واقعات یہ ہیں۔

مجدالملک یزد کا باشندہ تھا اس کا باپ صفی الملک یزد کے اتابکوں کا وزیر تھا لیکن مجد الملک نے خواجہ بہاءالدین بن شمس الدین جوینی کے یہاں اصفہان میں آکر ملازمت کرلی پھر یہاں سے شمس الدین جوینی کے پاس چلا آیا۔ جہاں اُس نے بہت سے خدمات انجام دیئے۔ ایک مرتبہ سفیر ہوکر روم میں گیا۔ اتفاق سے مجدالدین ابن الاثیر جو علاءالدین کا نائب تھا اسکا ہمسفر ہوگیا۔ راستہ میں ابن اثیر نے ممالک مصروشام کی شان وشوکت کے حالات وحکایات بیان کئے۔ جس کی بنا پر مجدالملک اُسکو پابزنجیر کرکے بیسو بوقا گورگاں کے پاس لایا اور کہنے لگا کہ شمس الدین جوینی اور اُس کا بھائی علاءالدین دونوں مصریوں کے خیرخواہ ہیں اور انہوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر اہل مصر ہمارے علاقوں پر حملہ کریں تو ہم اُن کی حکومت تسلیم کرلیں گے بیسو بوقا گورگاں نے یہ باتیں جب ابقاخاں کو سنائیں تو اُس نے ابن اثیر کو قابل سزا قرار دیکر پانسو چوب مارے۔ پھر اُسے شمس الدین جوینی کے یہاں روانہ کردیا۔ شمس الدین جوینی کو جب مجد الملک کی خباثت نفسی سے اطلاع ہوئی تو اُسے اپنا زیربار احسان کرکے اپنے قابو میں کرنا چاہا اور سیوا اس کی حکومت دے کر دس ہزار دینار سرخ اور بیشمار زر وجواہر انعام دے۔ لیکن مجد الملک اندیشہ مند تھا اس لئے تھوڑے عرصے کے بعد بیسو بوقا گورگاں کے یہاں جاکر ملازم ہوگیا اور شمس الدین جوینی اور اُس کے بھائی علاءالدین کو ہر قسم کی تکلیف و ایذا پہنچانے میں کوشش

کرنے لگا۔[1]

ذی القعدہ ۶۷۵ھ کے اوائل ایام میں ابقاخاں تبریز سے خراسان کو روانہ ہوا تو اثنائے راہ میں کچھ عرصہ تک قزوین میں مقیم رہا۔ مجد الملک شاہزادہ ارغون بن ابقاخاں کے ایک مصاحب کے توسط سے ابقاخاں کی خدمت میں پہنچا اور عرض کیا صاحب دیوان بادشاہی مال وزرا اعیان وامراکو رشوت میں دیا کرتا ہے تاکہ اُس کی باتوں کو یہ لوگ پوشیدہ رکھیں مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں شاہزادہ بھی اُس کے ساتھ نہ مل جائے لہذا خدمت عالی میں اسکا معروضہ کردینا مناسب معلوم ہوا جس قدر محاصل سرکاری خزانہ میں داخل ہوتا ہے صاحب دیوان اُس سے اپنے لئے املاک خرید لیا کرتا ہے اس کفران کی نوبت یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس نے سلاطین مصر سے سازش کرلی ہے اور معین الدین[2] پروانہ اسکی تحریک پر بند قدار[3] سے ملکر لشکر مغولیہ کے قتل و غارت میں مشغول ہے اس کے بھائی علاء الدین نے مملکت بغداد پر کامل قبضہ کرلیا ہے اور اپنے لئے ایک مرصع تاج بنا رکھا ہے بہت سے خزاین جمع کرلئے ہیں

[1] جامع التواریخ رشیدی۔ ق ۳۱۲۔

[2] معین الدین سلیمان بن علی بن محمد ملقب بہ پروانہ۔ ابتداء میں لڑکے پڑھایا کرتا تھا۔ لیکن اپنی سعی وکوشش سے سلاجقہ روم کے دربار میں وزیر ہوگیا۔ پھر مغلوں سے مصالحت و معاونت کر کے ممالک روم میں ہر قسم کا تسلط حاصل کرلیا۔ ۶۷۵ھ میں بند قدار نے روم پر حملہ کیا اور وہاں کے بڑے بڑے اعیان و امراکو قتل کرڈالا (جو قوم مغول سے تھے) بعض لوگوں نے ابقاخاں کو لکھا کہ یہ کارروائی بند قدار نے پروانہ کی سازش سے کی ہے۔ اس بنیاد پر ابقاخاں نے ۶۷۶ھ میں پروانہ کو قتل کرادیا مغلوں نے غیظ و غضب میں آکر اس کے اعضا کو جدا جدا کر کے ایک دیگ میں اُبالا۔ اس کے بعد گوشت کو کھالیا۔

[3] الملک الظاہر رکن الدین بیبرس المعروف بہ بند قدار۔ مصر کے ممالیک بحریہ سے ہے۔ ۶۵۸ھ ہجری سے ۶۷۶ھ ہجری تک برسر حکومت رہا۔

کہ اگر کسی وقت موقع ملے تو خود سر ہو کر مملکت بغداد پر قبضہ کرلے اگر بادشاہ میرے حال پر مہربانی فرمائے تو میں ثابت کردوں گا کہ صاحب دیوان نے سرکاری مال سے چار سو تومان[1] کی املاک اپنی ذات کے لئے خریدے ہیں دو ہزار تومان کے جانور جمع کئے ہیں وہ رقم اس کے علاوہ ہے جو اس نے ملاحدہ الموت اور بغداد کی تباہی کے وقت جمع کرلی ہے۔ بندہ ان تمام حالات سے بالکلیہ واقف ہے اس لئے صاحب دیوان نے مجھے سوا اس کی حکومت دی ہے اس کے علاوہ ہزار دینار سرخ اور بہت کچھ زر و جواہر بھی عنایت کیا ہے تاکہ ان کو حق سکوت خیال کرکے ان واقعات کو افشا نہ کردوں۔ شاہزادہ ارغون نے ایک دن موقع پاکر ابقاخاں سے سارے واقعات سنا دیئے۔ ابقاخاں نے شاہزادہ کو تاکید کی کہ یہ واقعات اُسوقت کسی پر ظاہر نہ ہوں۔ جب تک کہ ان کا تدارک نہ کیا جائے۔

۶۷۵ھ میں ابقاخاں دارالملک تبریز میں آیا۔ یہاں سے قشلاق بارّ اس (فراباغ) میں جاکر گرمی کے ایام گزارے۔ پھر یہاں سے رودبار[2] میں آکر موسم بہار بسر کیا۔ اس جگہ مجد الملک امیر طغاچار اور اُس کے نائب صدر الدین زنجانی کی وساطت سے ابقاخاں کی خدمت میں حاضر ہوا اور شاہزادہ ارغون سے جو کیفیت بیان کی تھی اُس پر بہت سے حاشیے اضافے کرکے اس نے بادشاہ کو بالمشافہہ

---

[1] ۔ مرزا مہدی خاں کوکب نے جو نادر شاہ کا میر منشی تھا اپنی ترکی لغات الموسوم بہ سنگلاخ میں لکھا ہے کہ تومان ایک سکہ کا نام ہے جسکی قیمت ایک ہزار دنیار طلائی ہوتی ہے۔

[2] ۔ رودبار ایک ناحیہ کا نام ہے۔ ابو بکر محمد بن علی الراوندی نے اپنی تاریخ سلاطین سلجوقیہ الموسوم بہ راحۃ الصدور و ایۃ السرور میں لکھا ہے کہ یہ مقام چمن سلطانیہ کے قرب و جوار میں زنجان کے پاس واقع ہے لیکن بعض مصنفین کی رائے میں یہ نام خود چمن سلطانیہ کا ہے منغول چمن سلطانیہ کو قونقور اولانگ کہا کرتے تھے (جامع التواریخ ص۲۳۱) مورخین نے اسکا نام تلفظ مختلف طور سے ادا کیا ہے مثلاً قونکغور اولانگ جامع التواریخ ص۳۰۳ ۔ قنقور اولانگ ۔ جامع التواریخ ص۳۲۹ ۔ قنغرلام ۔ نہایۃ الارب فی فنون العرب لاحمد بن عبدالوہاب النوری جلد ۲۵ ص۶۷ ۔ قنغر نہایۃ الارب فی فنون العرب لاحمد بن عبدالوہاب النویری جلد ۲۵ ص۶۷ ۔

سنائے۔ بادشاہ نے صاحب دیوان کو گرفتار اور اُس کے دفاتر کی تنقیح کرنے کا حکم دیا لیکن صاحب دیوان نے اولجائی خاتون سے اپنی سفارش کرائی اور خود بھی عرض کیا کہ میرے جسقدر املاک ہیں اُن کا حقدار بادشاہ ہے۔ اس بناء پر صاحب دیوان کی رہائی ہوگئی اور ایلچیوں کو واپس آنیکا بادشاہ نے یرلیغ روانہ کردیا مجد الملک کو جب اس واقعہ کی اطلاع ملی تو اُس نے ایک طومار عرضی لکھی کہ صاحب دیوان اس واقعہ کی وجہ مجھے تباہ کردے گا اس لئے مناسب ہے کہ بادشاہ یا تو مجھے اپنے امیران دولت میں شامل کرلیں یا حکم دیدیں کہ میں اس مملکت سے باہر چلا جاؤں۔ بادشاہ نے اسکا جواب دیا کہ اگرچہ میں نے صاحب دیوان کے حال پر عنایت کی ہے لیکن اس حرکت کی بناء پر میں تم سے ناراض و خشمناک نہیں ہوں لہذا تم دربار میں آکر امیر طغا چار کے ساتھ شاہی ملازمین میں شریک ہو جاؤ[ل]

سنہ ۶۷۹ھ کے موسم بہار میں ابقاخاں نے مجد الملک کو آب آمویہ سے لے کر حدود مصر تک تمام مملکت کا مشرف مقرر کردیا اور اس کا یرلیغ جب مراغہ کے بُت خانے میں تمام خوانین و امرا و ارکان دولت کے سامنے پڑھا گیا تو سبھوں نے یک زباں ہوکر کہا کہ آجتک سلاطین مغلیہ نے کسی تازی کے متعلق ایسا یرلیغ نافذ نہیں کیا ہے مجد الملک کو جب ایسا جلیل القدر منصب مل گیا تو سلطنت کے تمام کبیر و صغیر نے اُسی کو اپنا ماوا و ملجا قرار دیا۔ اس تاریخ سے صاحب دیوان کو روز بروز تنزل ہونے لگا۔[ک]

مجد الملک کو جب معلوم ہوگیا کہ صاحب دیوان پر میرے مکاید کا کچھ بھی اثر نہیں ہوا تو علاء الدین کے درپئے آزار ہوگیا ربیع الاول سنہ ۶۸۰ھ میں علاء الدین سالانہ پیشکش لیکر بغداد سے ابقاخاں کے دربار میں آیا تو مجد الملک اور اُس کے اعوان و انصار نے اس کی مخالفت شروع کی اور اُس پر انواع و اقسام کے بہتان لگائے صاحب دیوان ان تمام واقعات سے آگاہ تھا اُس نے اپنے بھائی کو کہلا بھیجا کہ یہ لوگ جو کچھ کہیں اُس سے انکار نکرنا کہیں ایسا نہو کہ نقصان پہنچ جائے

[ل] جامع التواریخ صہ ۳۱۲ و ۳۱۳۔ [ک] جامع التواریخ رشیدی صہ ۳۱۳

لا بارک اللہ بعد العرض فی المعال

مخالفین نے بیان کیا کہ سالانہ بیس تومان (یعنے ۲۰۰۰۰۰ دینار) محاصل بمع اضافہ ہوتا ہے لیکن ان میں سے ایک حبہ بھی داخل خزانہ نہیں کیا جاتا۔ مملکت بغداد دس سال سے علاء الدین کی ضمانت و کفالت میں ہے اس بناء پر دو سو تومان یعنے (۲۰۰۰۰۰۰) دینار اس کے ذمہ باقی ہیں۔ علاء الدین کو معلوم تھا کہ یہ سب طغیان وافترا ہے لیکن مصلحت کے خلاف سمجھکر اُس نے اُن کا مقابلہ نہ کرنا چاہا اور اس رقم کو قبول کر کے فوراً داخل خزانہ کر دیا۔ مجد الملک نے جب یہ دیکھا کہ علاء الدین کو اس سے بھی کچھ نقصان نہیں پہنچا تو ایک دوسری چال چلا اور ابقا خاں سے کہنے لگا کہ ۶۶۹ھ میں بہت سے امرا نے بغداد میں جاکر حسابات کی تنقیح کی تھی اور اڑھائی سو تومان یعنے (۲۵۰۰۰۰۰) دینار علاء الدین کے ذمہ باقی نکالے تھے لیکن اسوقت تک بارہ سال گزر چکے ہیں مگر یہ رقم ابھی تک غیر وصول ہے پہلے زمانہ میں یہ علاقہ علاء الدین کے یہاں امانی تھا سوا اس کے یہ رقم رعایا کے ذمہ واجب تھی امرا نے تحقیقات کے بعد ان حالات کو جب بادشاہ سے بیان کیا تو اُس نے حکم دیا کہ رعایا سے اس رقم کا وصول کیا جانا مناسب نہیں ہے کیونکہ اس کیوجہ سے رعایا کو سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے سوا اس کے کہ ملک میں بہت سی خرابیاں برپا ہو جائیں گی لیکن مجد الملک نے بادشاہ کے ذہن نشین کرایا کہ اس رقم کو علاء الدین نے رعایا سے وصول کر لیا ہے اور اُسکو اپنے مکان میں مدفون کر لیا ہے۔

انہیں ایام میں ابقا خاں نے اپنے بھائی منگو تیمور کو لشکر کثیر دے کر شام کی جانب روانہ کیا۔ اس کے چندیوم بعد خود بھی سیر و شکار کے بہانہ سے مشتاۃ بغداد کا ارادہ کر کے اربل و موصل میں چلا آیا۔ یہاں سے دیر اسیر میں آکر سیر و شکار میں مصروف ہوا پھر یہاں سے بغداد کی جانب کوچ کر کے اپنا لشکر منگو تیمور کے تعقب میں شام کی جانب روانہ کر دیا۔ علاء الدین بھی بادشاہ کے ہمراہ موجود تھا لیکن غرہ رجب ۶۸۰ھ کو دیر اسیر سے بغداد میں چلا آیا تا کہ شاہی لشکر کے لئے سامان رصد اور آذوقہ کا انتظام کرے۔ مجد الملک نے علاء الدین کی اس غیبت سے فائدہ اٹھا کر بقایائے کہن کی حکایت کو پھر تازہ کیا جس کی بنیاد پر بادشاہ نے اُمرائے دربار کی

ایک جماعت علاء الدین کے عقب میں روانہ کی تاکہ اُس سے تمام بقایا وصول کریں علاء الدین سے بمقام تکریت ان سے ملاقات ہوئی اور اُنہوں نے بادشاہی فرمان کو من وعن سُنا دیا۔ علاء الدین ان لوگوں کو تکریت سے بغداد میں لایا۔ خزانہ اور مکان میں جس قدر سیم و زر تھا ان کے حوالے کر دیا۔ پھر اپنے املاک وملبوسات اثاث البیت حتیٰ کہ اپنے زن و فرزند بھی فروخت کر ڈالے اور ان سے جو کچھ رقم وصول ہوئی وہ بھی ان کے حوالے کردی۔ اس کے بعد ایک مچلکہ لکھدیا کہ میرے پاس ایک درم بھی نکلے تو بادشاہ کا گنا ہگار اور قابل مواخذہ ہوں لیکن بادشاہ کو اطمینان نہیں ہوا اور اُسنے تغاچار۔ یارغوچی اور مجد الملک وغیرہ کو روانہ کیا تاکہ پوشیدہ دفینوں کی تحقیقات کریں۔ یہ لوگ جب بغداد میں آئے تو علاء الدین سے اسکا سکونتی مکان خالی کرالیا۔ پھر اسکے تمام ملازمین اور دوست واحباب گرفتار کرلئے گئے اور اُنہیں انواع واقسام کی تکالیف دیں پھر اس کے خاندانی قبرستان کو کھدوایا۔ لیکن وہاں کوئی دفینہ برآمد نہ ہوا تو کفن ہی نکلوا لیئے پھر بغداد کی مساجد و رباطات میں جو کچھ سامان ملا اُس کو جمع کرلیا مکان میں جاکر خورونوش کے اسباب نکلوالئے۔ علاء الدین قید کردیا گیا۔ اور اُسے وہاں اقسام اقسام کی تکلیفیں دیں تاکہ خفیہ خزانہ کی نشاندہی کرلے مگر اُس کے پاس ایک حبہ بھی باقی نہیں تھا اس لئے کسی چیز کی نشاندہی نہ کرسکا۔ آخر الامر یہ لوگ اسی سامان کو لیکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور تمام کیفیت بیان کی۔ دربار میں بہت سے شاہزادے اور خواتین حاضر تھے اُنھوں نے دست بستہ ہوکر گزشتہ زمانہ کی تمام باتیں بادشاہ کو یاد دلائیں اور مجد الملک کی ناکامی کا تذکرہ کیا۔ خصوصاً بولوغون خاتون اور شاہزادہ تونغوراتائی نے اسمیں بہت کچھ حصہ لیا۔ جس کی بنا پر ۴ رمضان سنہ ۶۸۱ھ کی صبح کو بادشاہ نے علاء الدین کو قید کی سختیوں سے آزاد کر دیا۔ [۵]

مخالفین کو اپنے دعاوی میں جب اس طرح ناکامی ہوئی اور علاء الدین ہر طرح سے بے گناہ ثابت ہوگیا تو اُنہیں اپنے ناجائز افعال اور جھوٹے اقوال کیوجہ سے سخت ہراساں ہونا پڑا تاہم وہ لوگ اپنی فتنہ پردازی سے باز نہیں آئے اور چند

۵۔ جامع التواریخ تسلسلہ الاخوات

روز تک غور و فکر کرنے کے بعد یہ نیا بہتان باندھا کہ علاء الدین ملوک مصر و شام سے
خط و کتابت کیا کرتا ہے اور بہت سے مفسد عیسائیوں کو اپنا ہمنوا بنا کر بادشاہ سے
اسکا معروضہ کیا اور اپنے اس جھوٹے دعوے کو اس طرح بیان کیا کہ اُس میں سچائی کی
جھلک نظر آنے لگی لیکن القاخاں کو ان باتوں کا یقین نہیں آیا کیونکہ اُسے معلوم
ہو گیا تھا کہ یہ لوگ علاء الدین پر ہمیشہ کذب و افترا باندھا کرتے ہیں تاہم اس نے تحقیقات
کے لئے اپنے امرا کی ایک جماعت ان لوگوں کے ساتھ بغداد کو روانہ کی۔ یہ کمیشن قریباً
ایک مہینے تک بغداد میں مقیم رہا اس عرصے میں مخالفین نے شہر کے بدمعاش اور
اوباش آدمیوں کی جماعت کثیر مہیا کر لی جنھوں نے کمیشن کے سامنے بیان کیا۔ کہ
علاء الدین نے متعدد مرتبہ اپنے آدمی حکام و عمال مصر و شام کے یہاں روانہ کیے ہیں
علاوہ ازیں دو تین بدو عرب بھی پیش کئے جنھوں نے یہ کہا کہ علاء الدین کے طرف
سے ملوک مصر و شام کے دربار میں ہمیں کئی مرتبہ جانیکا اتفاق ہوا ہے۔

ان عربوں کے وہاں جانیکا اصلی واقعہ یہ ہے کہ ۶۷۸ھ میں جب بندقدار نے
وفات پائی تو امرائے مصر میں باہم مخالفت پیدا ہو گئی۔ سُنقر اشقر جو بحری ترکوں سے
تھا لشکر کثیر لے کر علیحدہ ہو گیا۔ شام کے ایک شیخ القبائل عیسیٰ بن مہنا نے اس کے
ساتھ موافقت کر لی اور یہ دونوں دمشق میں آکر الفی[1] سے برسرپیکار ہوئے اسی
اثناء میں بحری ترکوں کے ایک لشکر نے ساحل فرات پر حملہ کرنا چاہا اور یہ لوگ کوچ
کرتے ہوئے عانہ و حدیثہ کے قریب پہنچ گئے تو علاء الدین نے سنقر اشقر اور امیر عیسیٰ
کے یہاں اپنا سفیر بھیجا اور اُنھیں بادشاہ مغول کی اطاعت و متابعت کی ترغیب
دلائی۔ انھیں ایام میں الفی سے ان لوگوں سے شکست پائی تو سخت پریشان اور
ہراسان ہو گئے۔ امیر عیسیٰ نے سفیر کے ساتھ اپنے بھائی کو بغداد روانہ کیا اور

[1] الملک المنصور سیف الدین قلاؤون الصالحی المعروف بالالفی۔ مصر کے ممالیک بحریہ سے
ہے۔ علاء الدین آق سنقر نے اس کو ہزار دینار پر خریدا تھا۔ اس لئے الفی کے نام سے
مشہور ہو گیا۔ ۶۷۸ھ سے ۶۸۹ھ تک قریباً گیارہ سال اس نے حکمرانی کی ہے۔ نہایۃ الادب
فی فنون العرب للنویری جلد ۲۹ صـ ۱۰۵

دونوں نے نہایت خوشی سے بادشاہ مغول کی اطاعت قبول کر لی۔
مخالفین نے اس سفارت کو سازشی کارروائی ثابت کرنا چاہا۔ شہادت میں جماعت کثیر پیش ہوئی۔ بعضوں کو رشوت دیکر اپنا ہمداستان بنالیا۔ بعضوں نے انکے خلاف اصلی واقعات بیان کئے۔ اس حالت میں کمیشن کے لئے فیصلہ کرنا سخت دشوار ہوگیا اور وہ لوگ علاء الدین کو اپنے ہمراہ لے کر بادشاہ کے یہاں روانہ ہوئے۔
۲۰ ذی الحجہ ۶۸۰ھ کو ہمدان میں آئے اسی دوران میں اباقاخاں کا انتقال ہوگیا اور اس کی جگہ تکودار[1] المعروف بہ سلطان احمد نے جلوس فرمایا۔

---

[1] سلطان احمد کا اصلی نام تکودار ہے۔ فارسی کتابوں میں نکودار (نون کے ساتھ) لکھا ہے لیکن صحیح تکودار (تائے مثناۃ فوقانیہ کے ساتھ) معلوم ہوتا ہے کیونکہ ہیتوں Hayton نام ایک ارمن کا شہزادہ ہے وہ غازان خاں اور اس کے آباؤ اجداد کے دربار میں مدت تک ملازم رہا ہے۔ اس نے ۷۰۵ھ میں ایک کتاب مشرق کی تاریخ وجغرافیہ کے متعلق تصنیف کی ہے اور اسمیں خصوصیت کے ساتھ مملکت مغولیہ کے حالات درج کئے ہیں۔ اس کا نام "تاریخ مشرق کا پھول" La Fleur de la terre d'orient des Histoires ہے یہ کتاب فرانسیسی زبان میں تصنیف ہوئی ہے پھر لاطینی زبان میں اسکا ترجمہ ہوا۔ متن اور ترجمہ دونوں یورپ میں چھپ گئی ہیں اس کتاب میں سلطان احمد کا نام اس طرح لکھا ہے۔ تنگودار Tangodor تنگودر Tangodar تنگودار Tagodar تاگودار Tagodar (دیکھو Academic des Inscriptions Paris 1906, 312, Historiens Armeniens, Tome II, pp. 185) فرانسیسی اور لاطینی میں عربی فارسی خطوط کی طرح حرف ت۔ ن۔ سے تصحیف نہیں ہو سکتا ہے سوا اس کے مصنف خود اس بادشاہ کا معاصر ہے لہذا جو صحیح تلفظ اس نے اس نام کا سنا ہے وہی لکھا ہے کسی سے نقل نہیں کیا کہ سہو تصحیف کا احتمال ہو سکے اس لئے یقین ہوتا ہے اسکے نام کا پہلا حرف نون نہیں۔ بلکہ تائے مثناۃ فوقانیہ ہے سوا اس کے شہاب الدین احمد بن عبدالوہاب النویری المتوفی ۷۳۲ھ نے جو اس بادشاہ کا معصر ہے اپنی تاریخ نہایۃ الادب فی فنون العرب میں اس بادشاہ کا نام سات مقام تکدار لکھا ہے اور تصریح کی ہے کہ اسکا پہلا حرف تائے مثناۃ فوقانیہ ہے۔

سلطان احمد کو علاء الدین کا تمام واقعہ معلوم تھا۔ پس اُس نے تمام مواخذات سے اُسے فوراً بری کر دیا اور مراغہ سے ہمدان میں اپنے ایلچی بھیجے تاکہ اُسے بعزت تمام اپنے ساتھ دربار میں لے آئیں۔ ۵ روز کے بعد آرمینیہ میں پہنچکر شرف ملازمت حاصل کیا یہاں سے بادشاہ کی مشایعت میں الطاق[1] کو آیا۔ اسجگہہ بادشاہ نے اپنی تخت نشینی کا دربار منعقد کیا جسمیں تمام شاہزادے اور بڑے بڑے اعیان و امرا دور دور سے آکر جمع ہوئے نوروز تک جشن ہوتے رہے۔ اس کے بعد بادشاہ انتظام کی طرف متوجہ ہوا۔ بہت سے شاہزادوں اور امرا کو مختلف ممالک پر تعینات کیا۔ شمس الدین جوینی پر خاص مراعات مبذول کیں۔ خراسان۔ مازندران۔ عراق۔ اران آذربائیجان، وغیرہ ممالک پہلے سے اس کے تصرف میں تھے۔ بلاد روم کو بھی سلاطین سلجوقیہ کی مشارکت کیساتھ اس کے حوالے کر دیا۔ دیار بکر، موصل، اربل، اس کے فرزند شرف الدین ہراون کے تفویض کئے۔ علاء الدین کو حسب سابق حکومت بغداد پر بحال کر دیا[2]۔

مجد الملک اور اُس کے اعوان و انصار نے علاء الدین سے جو کچھ مال و زر حاصل کیا تھا اُس کو اپنے تصرف میں کر لیا۔ اور ایک حبہ بھی خزانہ شاہی میں داخل نہیں کیا۔ سلطان احمد کو جب یہ حال معلوم ہوا تو اُس نے ان سب کو قید کرا دیا۔ اور اپنے امرائے بزرگ کو سونجاق و اور وزیر کو حکم دیا کہ علاء الدین کا تمام مال و اسباب تفتیش کر کے نکالا جائے۔ پس ان امرا نے میدان میں ایک خیمہ نصب کیا اور ان کے مکانات سے تمام مال و اسباب لا کر اسمیں جمع کرنے لگے جب سب سامان جمع ہو گیا تو بادشاہ نے مجد الملک کو بلا کر اسکی کیفیت دریافت کی جسکا جواب اُس سے کچھ نہ بن پڑا اور نہ اصل واقعہ سے انکار کر سکا۔ پھر تمام سامان کو بادشاہ نے علاء الدین کے حوالہ کر دیا۔ اس سامان میں مجد الملک کے ملبوسات بھی آ گئے تھے بعض آدمیوں نے جب انکی تلاشی لی تو جیبوں سے بہت سے

[1] الاطاق۔ جسکو مورخین الطاق۔ الاتاغ۔ الداق۔ وغیرہ لکھا ہے۔ ایران کے مغول بادشاہوں نے اپنا ییلاق مقرر کیا تھا اور گرمیوں کا موسم یہاں آکر بسر کیا کرتے تھے اس کا محل وقوع ابھی تک اچھی طرح تحقیق نہیں ہوا ہے۔ زمانہ حال کے بعض محققین گمان کرتے ہیں کہ اس سے وہ سرسبز و شاداب مرغزار مراد ہے جس کے شمال میں آذربائیجان جنوب میں نقشار شرق میں آرمینیہ واقع ہیں

[2] جامع التواریخ۔

۵ یکشنبہ ۵ صفر سنہ ۶۸۱ھ کو علاء الدین ہمدان سے ...

دُراج و تعاویز و رقیات برآمد ہوئے ہیں جن پر سُرخ و زرد روشنائی سے عبرانی خطوط تحریر تھے مغلوں کے یہاں یہ شیوہ سخت معیوب سمجھا جاتا تھا مجد الملک سے ان کے رکھنے کی وجہ دریافت کی تو اُس نے کوئی جواب نہیں دیا اس پر بادشاہ نے بخشیوں[1] کو اشارہ کیا تو اُنہوں نے ان تعویز و رقیات کو علیحدہ علیحدہ پانی میں دہویا جب ایک تعویز کا پانی چھڑکتے تو جادو کی عجیب و غریب باتیں ظہور میں آتیں اور پھر اُس پر اُسکا فضلہ یا مصارہ ڈال دیا جاتا تو تمام تماشا دفع ہو جاتا تھا۔

یہ واقعہ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام لشکر میں مشہور ہو گیا جس کیوجہ سے لشکر کے تمام کبیر و صغیر مجد الملک سے برافروختہ ہو گئے اور سبھوں کی یہ خواہش ہوئی کہ بہت جلد اسکی زندگی کا خاتمہ کر دیا جائے تاکہ دنیا اس کے شر و فساد سے محفوظ رہے۔ رات کیوقت اہل لشکر کی کثیر جماعت مجلس کے اطراف جمع ہو گئی اور ہر ایک نے اس کو لعن طعن کرنا شروع کر دیا نصف شب گزرنے پائی تھی کہ بعض آدمیوں نے حملہ کر کے اسکو قتل کر ڈالا صبح اس کے اعصاب کو جلتی آگ میں بریاں کر کے اہل لشکر نے کھا لیا۔ باقی اعضا قطع کر کے مملکت مغلیہ کے مختلف اضلاع کو روانہ کر دیے گئے مثلاً سر بغداد میں ہاتھ عراق میں پاؤں فارس میں بھیجے گئے ایک شخص نے سو دینار دیکر زبان خرید لی۔ اور اُسکو اپنے ساتھ تبریز میں لایا اس واقعہ کی یادگار میں کسی اہل عصر نے یہ رباعی موزوں کی ہے یہ واقعہ ۸ جمادی الاول ۶۸۱ھ کا ہے[2]

جویندۂ مال و ملک و توفیر شدی | روزے دو سہ دفتر تز و بر شدی
فی الجملہ بیک ہفتہ جہانگیر شدی | اعضائے تو ہر یکے گرفت اقلیمے

مجد الملک الطاف میں ہلاک کیا گیا اس کے اعوان و انصار جو زیادہ تر نصرانی مذہب کے پیرو تھے بادشاہ کے حکم سے بغداد کو روانہ کئے گئے ان کی جماعت جب شہر کے دروازے پر پہنچی تو اہل شہر نے ان کو سنگسار کرنا شروع کیا یہاں تک کہ

---

[1] بخشی منگولیہ زبان کا لفظ ہے بت پرست مغول اور گوتم بدھ کے پیرو اپنے پیشوایان مذہب کو اس لقب سے پکارا کرتے تھے جامع التواریخ طبع کاٹرمر حاشیہ متعلقہ صفحات ۱۸۴ و ۱۹۹

[2] تاریخ وصاف طبع بمبئی صفحہ ۱۰۹۔

سب ہلاک ہو گئے پھر بازار میں آگ سلگائی اور اسمیں انکی لاشوں کو ڈالکر جلا دیا۔

اس واقعہ کے تقریباً چھ ماہ بعد علاء الدین کا انتقال ہو گیا اس کی مجمل کیفیت یہ ہے کہ جب سلطان احمد تخت نشین ہوا تو اُس کے بھائی شاہزادہ ارغون نے اسکی مخالفت پر کمر باندھی اور خود کو حقدار سلطنت سمجھنے لگا شمس الدین جوینی اور علاء الدین سلطان احمد کے مقربین خاص سے تھے اس بناء پر شاہزادۂ ارغون کو ان کے ساتھ بھی خصوصیت پیدا ہو گئی۔ ۶۸۱ھ کے اخیر ایام میں شاہزادۂ ارغون خراسان سے نکلا۔ قشلاق کا ارادہ کرکے بغداد میں آیا اور کہنے لگا کہ میرے باپ کے عہد کا کثیر بقایا علاء الدین کے ذمہ واجب ہے علاء الدین کے جسقدر ملازم ومتوسل تھے اُن کو گرفتار کر لیا اور نہایت سختی کے ساتھ اس کا مواخذہ ومطالبہ کرنے لگا۔ نجم الدین اصفر علاء الدین کا نائب وپیشکار تھا حال ہی میں اسنے وفات پائی تھی۔ شاہزادۂ ارغون نے اسکی قبر کھدوائی اور لاش کو راہ گزر پر ڈال دیا۔ ان واقعات کے سننے سے علاء الدین کو سخت رنج والم ہوا یہانتک کہ سر میں درد شروع ہو گیا جس کے صدمہ سے ۴۔ ذی الحجہ ۶۸۱ھ کو بمقام مغان اس کی رُوح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ اس کے دوست احباب نے نعش کو تبریز میں لا کر مقبرۂ چرن داب میں دفن کیا۔

علاءُ الدّین کے اہل خاندان

علاء الدین کی وفات کے بعد اس کے اہل خاندان پر کیا کیا حوادث گزرے اسکی تفصیل کے لئے ایک طومار کی ضرورت ہے تاہم مجمل طور پر ان کا ذکر کرنا نامناسب نہیں ہے۔

شمس الدین جوینی (برادر علاء الدین) قریباً بائیس سال تک سلطنت مغولیہ کا وزیر اعظم رہا۔ دریائے جیحون سے لیکر بلاد روم تک تمام ممالک اس کے تصرف میں رہے۔ سلطنت مغولیہ میں بادشاہ کے سوا کوئی دوسرا شخص اس سے زیادہ عزت وثروت نہیں رکھتا تھا اس کی روزانہ آمدنی ایک تومان یعنے دس ہزار دینار وصول ہوتی تھی اس کے سوانحات زندگی اور جود وکرم کے افسانے تمام تاریخوں میں مذکور ہیں جن کے اعادہ کی اس چھوٹے سے مضمون میں گنجایش نہیں ہے الغرض ۴۔ شعبان ۶۸۳ھ ہجری کو ارغون خاں کے حکم سے بعض لوگوں نے آذربائیجان میں اسکو قتل کر ڈالا اس کے

بعد اس کے تین فرزند تھوڑے ہی عرصے میں قتل کر دیئے گئے۔ منصور بن علاء الدین حلہ میں رہا کرتا تھا حاکم بغداد نے اُسے طلب کر کے اپنے دربار میں مار ڈالا۔ اسی زمانے میں اس کے بعض اور اہل خاندان بھی تہ تیغ کئے گئے عبداللہ شیرازی صاحب وصاف ۶۹۳ھ میں تبریز میں آیا تو چرنداب میں جاکر شمس الدین اور اُس کے بھائی علاء الدین کے مقبرے کی زیارت کی جس میں ان دونوں کے علاوہ ان کے سات فرزند بھی مدفون تھے [۱]

شرف الدین ہارون بن شمس الدین جوینی یگانۂ عصر عالم تھا۔ بڑے بڑے ارباب کمال اکی مجلس میں جمع ہوا کرتے تھے۔ خلیفہ مستعصم باللہ عباسی کی پوتی رابعہ جس کا لقب سیدہ نوبہ ہے اس سے منسوب تھی خواجہ فخر الدین مستوفی قزوینی کے اغوا دینے سے ارغون خاں نے ۶۸۵ھ میں اسکو قتل کرا دیا۔ کہتے ہیں کہ اسی روز سیدہ نوبہ کا بھی انتقال ہو گیا [۲]

خواجہ بہاء الدین شمس الدین کا ایک اور فرزند تھا اباقا خاں کے زمانہ میں عراق عجم کی حکومت اس کے تفویض تھی ۶۷۸ھ اپنے باپ کے حین حیات اجل طبعی سے اس کا انتقال ہو گیا صاحب وصاف نے اس کے مفصل حالات لکھے ہیں [۳]

علاء الدین کی کئی لڑکیاں تھیں منجملہ ان کے ایک لڑکی کا نکاح شیخ صدر الدین ابراہیم بن سعد الدین محمد الحموئیہ الجوینی الشافعی سے ہوا تھا انہیں صدر الدین کے ہاتھ پر غازان خاں بن ارغون خاں نے اسلام قبول کیا پھر اسکی متابعت میں ایک لاکھ سے زیادہ بت پرست مغول مشرف باسلام ہو گئے اس تاریخ سے شاہان مغول نے بت پرستی ترک کر دی اور ان کا مذہب اسلام مقرر ہو گیا۔ خواجہ ہمام تبریزی نے ان کی

---

[۱]۔ تاریخ وصاف طبع بمبئی صفحہ ۶۰۔ [۲] تاریخ وصاف صفحہ ۶۵۲ [۳] تاریخ وصاف صفحہ ۶۵۲

[۴]۔ حموئیہ خاندان قدیم الایام سے جوین اور اس کے مضافات میں آباد تھا۔ اور اُس علاقے میں بہت ہی معزز و محترم سمجھا جاتا تھا شیخ صدر الدین کے جد اعلیٰ ابو عبداللہ محمد بن حموئیہ الجوینی خراسان کے مشائخ کبار سے۔ ۵۳۰ھ میں انتقال فرمایا۔ اور جوین میں مدفون ہوئے (کامل ابن اثیر۔ واقعات ۵۳۰ھ) شیخ سعد الدین الحموئیہ شیخ نجم الدین کبرٰی کے اجلہ اصحاب سے تھے۔

مدح میں بہت سے قصاید لکھے ہیں ۷۴۲ھ میں بمقام تبریز انہوں نے وفات پائی ہے۔

مشاہیر علما و شعرا جنہیں اس خاندان سے توسل رہا ہے

یہ خاندان دولت مغولیہ میں ویسا ہی ہوا ہے جیسا کہ خلفائے عباسیہ کے زمانہ میں آل برمک۔ اس خاندان کے تمام ارکان علم و فضل اور جود و کرم میں یکتائے زمانہ تھے۔ ان کی مجالس ہمیشہ علماء فضلاء اور شعرا سے معمور رہتی تھیں بڑے بڑے ارباب کمال ان کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتے تھے آل برمک کی طرح یہ لوگ بھی دفعتہً قتل ہوگئے اور انکے خاندان پر ایسی تباہی آئی کہ اسکا نام و نشان بھی صفحہ ہستی سے محو ہوگیا ایک مرتبہ علاء الدین اور اس کے بھائی نے ابقاخاں کی دعوت کی جس کی تہنیت میں کئی روز تک جشن منائے اور بڑی بڑی رقمیں غربا و مساکین کو عطا کیں جن کی تعداد ہزار جائزہ سے زیادہ تھی امام شمس الدین ذہبی نے تاریخ الاسلام میں لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے نام پر کتاب تصنیف کرتا تو اس کے صلہ میں ہزار دینار سرخ دیے جاتے تھے شعرا کو بھی ہمیشہ انعام و اکرام ملا کرتا تھا جن علما و فضلا نے ان کے نام پر کتابیں تصنیف کی ہیں یا جن شعرا نے ان کی مدح میں قصاید لکھے ہیں ان میں سے بعض مشاہیر کے نام یہ ہیں۔

استاد البشر خواجہ نصیر الدین محمد بن محمد بن حسن الطوسی المتوفی ۶۷۲ھ ہجری۔ اس نے اپنی کتاب اوصاف الاشراف شمس الدین کے نام پر لکھی ہے۔ بہاء الدین بن شمس الدین کے نام پر مجسطی کا ترجمہ کیا ہے۔

صفی الدین عبد المومن بن یوسف بن فاخر الارموی۔ مشہور خوشنویس اور موسیقی داں تھا۔ اسحٰق بن ابراہیم موصلی کے بعد جو ہارون الرشید کا ندیم تھا۔ اس پایہ کا موسیقی داں کوئی نہیں ہوا ہے۔ خلیفہ مستعصم باللہ کے یہاں سے اسکو پانچ ہزار درم سالانہ ملا کرتے تھے جب بغداد فتح ہوگیا تو صفی الدین ہولاکو خاں کے یہاں چلا آیا۔ اس نے سالانہ دس ہزار درم مقرر کردیے۔ ہولاکو کی وفات کے بعد علاء الدین کے ندیموں میں شامل ہوگیا اس نے دیوان الانشاء کی خدمت تفویض کردی جسکو مدت دراز تک انجام دیتا رہا

۲۸ صفر ۶۹۳ھ کو وفات پائی اسکی تصنیفات سے متعدد کتابیں ہیں منجملہ اُن کے ایک کتاب موسوم بہ رسالہ شرفیہ ہے جسکو شرف الدین ہارون کے نام پر تصنیف کیا ہے۔

امام کمال الدین میثم بن علی بن میثم البحرانی المتوفی ۶۷۹ھ نے علاء الدین کے نام پر نہج البلاغۃ کی شرح لکھی ہے[1]

قاضی نظام الدین اصفہانی نے اس خاندان کی مدح میں بہت سے اشعار و قصاید تصنیف کئے ہیں جنکو ایک مجموعہ میں جمع کر کے اُسکا نام شرف ایوان البیان فی شرف بیت صاحب الایوان رکھا ہے[2]

اُن مشاہیر شعرا میں جو ان دونوں بھائیوں کے معاصر و مداح تھے خواجہ ہمام الدین تبریزی اور شیخ سعدی شیرازی بہت مشہور ہیں۔ خواجہ ہمام کا دیوان ان کے مدایح و مراثی سے مملو ہے سوا اس کے خسرو شیریں نظامی کی طرز پر اس نے ایک عشقیہ مثنوی لکھی ہے جسکا نام صحبت نامہ ہے اور اُسکو خواجہ شرف الدین ہارون بن شمس الدین کے نام پر معنون کیا ہے۔

شیخ سعدی نے اس خاندان کی تعریف و توصیف میں متعدد قصاید نظم کئے ہیں اپنے رباعیات و مقطعات وغیرہ کو شمس الدین کے نام پر جمع کر کے اُسکا نام صاحبیہ رکھا ہے۔

علی بن احمد بن ابی بکر نے ۷۳۴ھ میں شیخ کا کلیات جمع کیا ہے اُس کی ابتدا میں ایک تمہید لکھی ہے جس میں چند واقعات ایسے درج ہیں کہ جن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ کے ساتھ ان دونوں بھائیوں کے گہرے تعلقات قائم تھے۔

ایک دفعہ شمس الدین نے شیخ کے یہاں پانسو دینار روانہ کئے لیکن لانیوالے اُن میں سے ڈیڑھ سو دینار نکال لئے۔ شیخ کو جب اس تخلیط کا حال معلوم ہو گیا تو اُسنے شمس الدین کو یہ قطعہ لکھکر روانہ کیا۔

خواجہ تشریفم فرستادی و مال	مالت افزوں باد و خصمت پایمال
ہر بہ دیناریت سالے عمر باد	تا بمانی سیصد و پنجاہ سال

[1] روضات الجنات آقا محمد باقر الخونساری طبع طہران جلد ۴ صفحہ ۱۴۲ و ۱۴۳ - [2] مجالس المومنین لقاضی نور اللہ شوستری

شمس الدین نے اپنے غلام سے باز پرس کی اور رقم کی بابت تلافی مافات کرکے شیخ سے معافی کا خواستگار ہوا۔

علاء الدین نے جلال الدین ختنی کو جو شیراز میں ایک معزز عہدہ پر مامور تھا ایک خط لکھا کہ دس ہزار دینار شیخ کے یہاں روانہ کرو۔ سوء اتفاق کہ اس حکم کے پہنچنے سے پہلے جلال الدین کا انتقال ہو گیا شیخ کو جب یہ کیفیت معلوم ہوئی تو اُس نے یہ قطعہ لکھ کر علاء الدین کے یہاں روانہ ہو گیا۔

پیام صاحب دیوان علاء دولت و دیں	کہ دیں بدولت ایام او ہمی نازد
رسید و پایہ دولت فزود سعدی را	بسے نماند کہ سر بر فلک برافرازد
مثال داد کہ صدر ختن جلال الدین	قبول خدمت او را تعہدے سازد
ولیک بر سر او خیل مرگ تاختہ بود	چنانکہ بر ہمہ ابنائے دہر می تازد
جلال زندہ نخواہد شدن بریں دنیا	کہ بندگان خداوندگار بنوازد
طمع ندارم ازو در سرائے عقبیٰ نیز	کہ از مظالم مردم بما نہ پردازد

علاء الدین نے رقم مذکور فوراً روانہ کردی۔

ایک بار شمس الدین نے شیخ کے یہاں ۵۰ ہزار دینار روانہ کئے۔ شیخ نے لینے سے انکار کردیا۔ لیکن صاحب دیوان نے بہت کچھ منت و سماجت کی تو شیخ نے اس رقم کو صرف کرکے شیراز میں قلعہ قہندز کے نیچے ایک خانقاہ تعمیر کرا دی۔

شیخ ایک مرتبہ حج بیت اللہ سے فارغ ہوکر تبریز میں آیا۔ اور شمس الدین کی ملاقات کے لئے روانہ ہوا اسی اثنا میں ابقاخاں کی سواری نکلی۔ دونوں بھائی اُس کے ہمراہ موجود تھے راستہ میں ان کی نظر شیخ پر پڑ گئی۔ فوراً گھوڑوں سے اُتر کر شیخ کے پاس چلے آئے اور نہایت تعظیم و تکریم سے سلام کرکے اُس کے ہاتھ کو بوسہ دیا اس کیفیت کے دیکھنے سے ابقاخاں کو سخت حیرت ہوئی اور نہایت استعجاب سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے انھوں نے جواب دیا کہ وہی شیخ سعدی ہیں جن کی نظم و نثر سارے عالم میں مشہور ہے۔ ابقاخاں نے دوسرے دن شیخ کو اپنے دربار میں طلب کیا عرصہ تک گفتگو ہوتی رہی چلتے وقت کہنے لگا کہ مجھ کو کچھ نصیحت فرماتے جائیے شیخ نے کہا کہ مرنے کے بعد صرف اعمال ساتھ جائیں گے اب تمکو اختیار ہے کہ اچھے اعمال ساتھ لیجاؤ یا بُرے ابقاخاں نے

کہا کہ اس مضمون کو نظم کر دیجئے شیخ نے اُسی وقت یہ قطعہ لکھدیا۔

شہے کہ حفظ رعیت نگاہ میدارد — حلال باد خراجش کہ فردِ چوپانی است
وگرنہ راعی خلق است زہرمارش باد — کہ ہرچہ میخورد از جزیت مسلمانی است

اس قطعہ کو سنکر ابقاخاں کے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے اور کئی مرتبہ پوچھا کہ میں راعی ہوں یا نہیں مگر شیخ نے ہر بار یہی جواب دیا کہ اگر آپ راعی ہیں تو پہلا شعر مناسب حال ہے ورنہ دوسرا شعر۔ اور چلتے ہوئے حسب ذیل اشعار پڑھے۔ ابقاخاں پر جن کا نہایت اثر ہوا۔

بادشہ سایۂ خدا باشد — سایہ با ذات آشنا باشد
نشود نفس عامہ قابل خیر — گر نہ شمشیر بادشا باشد
ملکت او صلاح نپذیرد — گر ہمہ رائے او خطا باشد
ہر صلاحے کہ در جہاں آید — اثر عدل بادشا باشد

تصنیفات

علاء الدین کے تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

۱ تاریخ جہانکشائی

۲ تسلیۃ الاخوان۔ چھوٹا سا رسالہ ہے اسمیں اُن مصائب کا ذکر ہے جو مجد الملک کی وجہ سے علاء الدین اور اُس کے بھائی شمس الدین پر وارد ہوئے ہیں اس کے دو حصے ہیں پہلے حصہ میں ابتدا سے ۴ رمضان تک حوادثات مذکور ہیں۔ دوسرا حصہ اُس تاریخ سے شروع ہوتا ہے جبکہ ابقاخاں نے اسکو بے قصور قرار دیکر رہا کردیا تھا اس کے بعد مجد الملک نے ایک دوسرے واقعہ میں پھر اسکو متہم کیا جس کیوجہ سے سلطان احمد کے جلوس تک علاء الدین کو پھر بہت سے مصائب برداشت کرنے پڑے ان مضامین کا خلاصہ ہم گزشتہ اوراق میں درج کردیا ہے۔

۳۔ مکاتب و فرامین۔ جو خواجہ منتخب الدین بدیع الکاتب الجوینی کے مجموعہ الرسائل میں شامل ہیں۔ اس کتاب کا ایک نسخہ سینٹ پیٹرزبرگ کی مجلس السنۂ مشرقیہ Institut des Langues Orientales کے کتب خانہ میں

موجود ہے جس کے صفحات (۲۵۶ تا ۳۸۴) پر یہ مکتوبات مندرج ہیں۔

تسلیۃ الاخوان

Quatsmere کا ترجمہ[1] نے لکھا ہے کہ تسلیۃ الاخوان عربی زبان میں ہے
لیکن یہ غلطی ہے۔ اصل میں اس رسالہ کی زبان فارسی ہے اور جہانگشائی کے نمط پر علاءالدین
نے اس میں ہر جگہ عربی اشعار اور ضرب الامثال درج کئے ہیں Schefer شفیر
نے بھی اس کے متعلق ایک غلطی کی ہے اس نے اس کے نام کو تثلیث الاخوان پڑھکر
la trinite des Frees فرانسیسی زبان میں اس کا ترجمہ کیا ہے۔[2]
فرانس کے کتب خانۂ ملی Bibliotheque Nationale میں جہانگشائی
کے متعدد نسخے موجود ہیں منجملہ اُن کے ایک نسخہ کے اخیر میں تسلیۃ الاخوان بھی شامل
ہے یہ نسخہ پہلے شیفر کے مملوکات سے تھا چنانچہ اس نے اپنی کتاب کرستمائی دسن سال
(صفحہ ۱۵۳۔۱۵۴) میں اس کا ذکر کیا ہے اور اُسمیں تسلیۃ الاخوان کے متعلق لکھا ہے
کہ یہ رسالہ شمس الدین جوینی کے تالیفات سے ہے اس کا نام 'تبصرۂ خازن' ہے۔
اور اسمیں شمسُ الدین نے اپنے وہ حالات لکھے ہیں جو اولجائی خاتون کے توسط سے اباقاخان
کی خدمت میں معروضہ کئے تھے حقیقت میں یہ بھی شفیر کی فاحش غلطی ہے کیونکہ یہ امر
بہت سی دلائل سے ثابت ہوسکتا ہے کہ یہ رسالہ تسلیۃ الاخوان ہے منجملہ اُن کے
سب سے بڑی اور بیّن دلیل یہ ہے کہ صاحب وصاف اور صاحب روضۃ الصفا نے جہاں
علاءالدین کے مصائب و مشکلات کا ذکر کیا ہے وہاں تصریح کی ہے کہ یہ سب باتیں
تسلیۃ الاخوان سے منقول ہیں۔ اور ان لوگوں نے جو واقعات و حوادثات بیان کئے
ہیں وہ اس رسالہ سے بعینہ مطابقت رکھتے ہیں۔[3]
جہانگشائی کے ایک اور نسخہ (Persian Supp. No. 206) میں جو فرانس کے

---

[1] Moines d'Orient, pp. 234
[2] Chrestamathic des Persan, vol. II, pp. 150
[3] تاریخ وصاف صفحہ ۹۶۔۱۰۲۔ روضۃ الصفا جلد ۵ صفحہ

کتب خانہ ملی میں محفوظ ہے تسلیۃ الاخوان کا دوسرا حصہ شریک ہے۔ موسیو ادگار بلوشہ نے اِس کتب خانے کے فارسی کتابوں کی جو فہرست مرتب کی ہے اُسمیں اس نسخہ کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جہانگشائی کے چار جلد ہیں تسلیۃ الاخوان کے حصہ دوم کو اسکی چوتھی جلد قرار دیا ہے اور یہ بھی تصریح کی ہے کہ اِسمیں سلطنت مغول کے وہ واقعات مذکور ہیں جو ۶۵۱ھ کے بعد ظہور پذیر ہوئے لیکن یہ اُسکی سراسر غلطی ہے کیونکہ جہانگشائی کی جلد سوم میں حکومت اسمٰعیلیہ کے قلع قمع ۶۵۵ھ تک واقعات مندرج ہیں۔ اس رسالہ میں ایک موقع پر اتقاخاں کی وفات اور سلطان احمد تکودار کے جلوس کا ذکر آیا ہے جو ۶۸۱ھ کا واقعہ ہے ان دو سنین یعنے ۶۵۵ھ اور ۶۸۱ھ کے مابین ۲۵ سال گزرے ہیں اور اس زمانہ میں بہت سے واقعات کا ظہور ہوا ہے مثلاً بغداد کی فتح، ہولاکو خاں کے اخیر ایام حکومت، اتقاخاں کا پورا عہد سلطنت، مگر ان میں سے کسی واقعہ کا ذکر اسمیں موجود نہیں ہے بلکہ علاء الدین نے صرف اپنے وہ حوادث لکھے ہیں جو ۶۸۱ھ کے نصف اول میں اس کے اوپر گزرے ہیں اور اسی ضمن میں اتقاخاں کی وفات اور سلطان احمد کے دربار تخت نشینی کا ذکر کیا ہے اگر اس رسالہ کو جہانگشائی کی چوتھی جلد فرض کرلیں تو اسکی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ مصنف نے ۲۵ سال کے حالات سے کیوں چشم پوشی کی اور اس بنیاد پر یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ یہ رسالہ پانچویں یا چھٹی جلد ہے اس سے پہلے ایک یا دو جلدیں اور ہونگی جسمیں مذکورۂ بالا ۲۵ سال کے حالات درج ہوں گے۔ لیکن یہ امر بینہ دلائل سے ثابت ہے کہ قلع قمع حکومت اسمٰعیلیہ (۶۵۵ھ) کے بعد علاء الدین نے جہانگشائی کا ایک حرف بھی نہیں لکھا۔

خواجہ نصیر الدین طوسی نے (جو علاء الدین کا معاصر اور خود اس کے ساتھ واقعہ بغداد میں ہولاکو کے ہمراہ موجود تھا) فتح بغداد کے حالات لکھ کر جہانگشائی کے آخر میں ملحق کئے ہیں چنانچہ یہ ضمیمہ جہانگشائی کے اکثر نسخوں میں اب تک موجود ہے اگر علاء الدین استیصال حکومت اسمٰعیلیہ کے بعد اپنی تاریخ کا سلسلہ جاری رکھتا تو اُسمیں فتح بغداد کے حالات ضرور آجاتے اور ایسی حالت میں نصیر الدین طوسی کا الحاق لغو اور بےموقع ہوتا۔ صاحب وصاف نے جو علاء الدین کا معاصر ہے اپنے دیباچے میں تصریح کی ہے

کہ جہانکشائی میں قلع قمع اسمٰعیلیہ تک حالات مذکور ہیں چنانچہ اسکی اصل عبارت یہ ہے۔

تاریخ جہانکشائی جوینی بل جام جہاں نمائی معانی مشتمل بر ذکر احوال دولت مغول و دیگر سلاطین و ملوک اطراف در نوبت خانیت ایشان از مبادی خروج بادشاہ جہاں کشائی چنگیز خاں تا زماں فتح بلاد اہل الحاد بخجستہ مواکب کواکب عدد ہولاکو خاں [1]

صاحب وصاف نے یہ بھی لکھا ہے کہ میری کتاب جہانگشائی کا ذیل ہے۔ وصاف میں ۶۵۶ھ سے ۷۲۸ھ تک واقعات مذکور ہیں یعنے اس کی ابتداء اُس زمانہ سے ہوئی ہے جہاں کہ جہانکشائی کی جلد سوم ختم ہو جاتی ہے اگر علاء الدین ۶۵۵ھ کے بعد جہانکشائی میں اور واقعات اضافہ کرتا تو صاحب وصاف اپنے ضمیمہ کو اُس زمانہ سے شروع کرتا جہاں کہ جہانکشائی ختم ہوئی ہے نہ کہ ۶۵۶ھ ہجری سے۔

صاحب وصاف نے جہانکشائی کے پورے متن کو مختصر کر کے وصاف کی جلد چہارم میں ملحق کر لیا۔ اس خلاصہ میں سب سے اخیر واقعہ اسمٰعیلیوں کی تباہی کا ہے۔ اور اسی واقعہ پر جہانکشائی کی تیسری جلد ختم ہوتی ہے۔

تاریخ جہانکشائی

تاریخی اہمیت۔ جہانکشائی بلحاظ اپنے موضوع مضمون کے تاریخ مشرق میں بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ علاء الدین کو اسکی تالیف کے وقت جو مراعات مہیا تھے وہ کسی دوسرے مصنف کو مشکل سے میسر آ سکتے تھے۔ علاء الدین دولت مغولیہ کے اعظم عہدوں پر تھا سالہا سال تک اسنے سلطنت مغلیہ میں سیاحت کی تھی۔ اور اہم واقعات اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کئے تھے۔ اس کے آباؤ اجداد اور عزیز و اقارب دربار خوارزم شاہیہ کے معزز عہدوں پر مامور تھے قلعہ الموت کا مشہور کتب خانہ [illegible] سے گزر چکا تھا اور اسی سے انتخراج کر کے اس نے اپنی تاریخ اسمٰعیلیہ [illegible] ایسے اسباب تھے کہ اسکو صحیح صحیح حالات کے فراہم کرنے میں [illegible] نہیں ہوئی اور اس نے بہت سہولت و آسانی [illegible]

---

[1] تاریخ وصاف صفحہ ۴۔ [2] تاریخ وصاف صفحہ [illegible]

حالات جمع کر لئے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کتاب کو علاء الدین کی زندگی ہی میں شہرت عظیم حاصل ہوگئی اور خاص و عام نے اسے قبولیت کی نگاہوں سے دیکھنا شروع کیا۔ اور مورخین نے خواہ معاصر ہوں یا متاخر اپنی تصنیفات میں اقوام مغول کے حالات اسی کتاب سے نقل و اقتباس کئے اور اسکو اپنا معتبر و مستند ماخذ قرار دیا۔

عبداللہ بن فضل اللہ شیرازی نے جہانگشائی کی تین جلدوں کو اختصار کر کے اپنی تاریخ وصاف میں ملحق کیا ہے اور اس کے دیباچہ میں یہ بھی تصریح کی ہے وصاف جہانگشائی کا ذیل ہے۔ جہانگشائی ۶۵۵ھ کے واقعات پر تمام ہوئی ہے وصاف میں اس کے بعد حالات شروع ہوئے ہیں اور ۷۲۸ھ پر اس کا سلسلہ ختم ہوا ہے۔

رشید الدین فضل اللہ وزیر غازاں خاں نے اپنی بسوط کتاب جامع التواریخ میں جہانگشائی کے تمام مضامین درج کئے ہیں لیکن بعض مضامین شلاً خراسان و ایران کے حکام مغولیہ کا تذکرہ یا خوارزم شاہیوں کی تاریخ کو اختصار کے ساتھ نقل کیا ہے برخلاف اس کے چنگیز خاں اور اسکی اولاد و احفاد کے سوانحات اور اسمٰعیلیوں کے عروج و زوال کی سرگزشت بغیر کسی حک و اضافہ کے درج کی ہے۔

ابوالفرج غریغوریوس بن ہارون الطبیب المعروف بابن العبری المتوفی ۶۸۵ھ نے جو مراغہ کے نصارائے یعقوبیہ کا جاثلیق اور علاء الدین معاصر ہے۔ سریانی زبان میں دنیا کی ایک عام تاریخ لکھی ہے اور اسمیں ایک موقع پر لکھا ہے کہ علاء الدین کی جہانگشائی اپنی موضوع پر عدیم النظیر کتاب ہے اور میں نے اپنی کتاب میں خوارزم شاہیوں۔ اسمٰعیلیوں اور مغولوں کے حالات اسی کتاب سے نقل کئے ہیں [1]

شہاب الدین احمد بن یحیٰی بن فضل اللہ الکاتب الدمشقی المتوفی ۷۴۹ھ نے بیس جلدوں میں مسالک الابصار فی ممالک والامصار کے نام سے تاریخ و جغرافیہ میں ایک مفید و کارآمد کتاب تصنیف کی ہے۔ اسکی تیسری جلد میں جہانگشائی کے حسب ذیل مضامین کا بجنسہ عربی میں ترجمہ کیا ہے۔

۱۔ ذکر قواعدی کہ چنگیز خاں بعد از خروج نہاد و یاسا ہا کہ فرمود (جہانگشائی

---

[1] کتاب مذکور طبع لیپزگ ص ۴۲۵

جلد اول کے صفحہ ۱۶ تا ۲۵ سے مسالک الابصار جلد سوم کے اوراق ۳۳ تا ۳۶ کا مقابلہ کرو)

۲۔ ذکر خروج چنگیز خاں و ابتدائے انتقال دولت و مملکت ملوک جہان بدو (جہانکشائی جلد اول کے صفحات ۲۵ تا ۲۹ سے مسالک الابصار جلد سوم کے اوراق ۳۲ تا ۳۳ کا مقابلہ کرو)

۳۔ ذکر ابناء چنگیز خاں (جہانکشائی جلد اول کے صفحات ۲۹ تا ۳۲ سے مسالک الابصار جلد سوم کے اوراق ۳۶ و ۳۷ کا مقابلہ کرو۔

تاریخ گزیدہ۔ تاریخ بناکتی۔ روضۃ الصفا۔ اور حبیب السیر وغیرہ کے مصنفین نے بھی اپنی کتابوں میں جہانکشائی سے بکثرت مطالب اخذ کیے ہیں اور حالات عہد مغولیہ کے متعلق اس کو ایک عدیم النظیر تصنیف بتایا ہے۔

وضع و ترتیب کتاب جہانکشائی باعتبار مضامین کے تین جلدوں میں منقسم ہے۔

جلد اول میں طول و طویل دیباچہ کے بعد مغولوں کے قدیم رسم ورواج اور چنگیز خاں کے احکام و قوانین بیان کیے ہیں اس کے بعد مغولوں کی تاریخ شروع ہوتی ہے پھر چنگیز خاں کے فتوحات و واقعات خروج سے وفات تک (۶۱۵ھ تا ۶۲۴ھ) تحریر کیے ہیں اور ان حالات کے ضمن میں ایک موقع پر اقوام اویغور کے رسم و رواج اور مذاہب کا نہایت اہمیت رکھنے والا تذکرہ حاصل کیا ہے۔

ان واقعات کے بعد چنگیز خاں کے حسب ذیل جانشینوں کی تاریخ مذکور ہے۔

تذکرہ اوکتائی قاآن بن چنگیز خاں ۶۲۶ھ تا ۶۳۹ھ۔

واقعات زمانہ نیابت توراکینا خاتون مادر کیوک خاں ۶۳۹ھ تا ۶۴۳ھ تذکرہ کیوک خاں بن اوکتائی خاں ۶۴۳ھ تا ۶۴۴ھ۔

حالات توشی (جوجی) خاں و چغتائی خاں پسران چنگیز خاں۔

جلد دوم میں سلاطین خوارزم شاہیہ کی تاریخ مذکور ہے اور خصوصاً اس خاندان کے اخیر بادشاہوں کا تذکرہ خوب شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اس کے ذیل میں ترکان کفار یعنے ملوک قراختائی و گورخانیہ کی تاریخ بیان کی ہے جو پچانوے سال

یعنے ۵۱۲ھ سے ۶۰۷ھ تک ماوراالنہر اور مشرقی ترکستان کے بہت بڑے حصہ پر آب جیحوں سے کاشغر اور ختن تک فرمانروا رہے ہیں اس کے بعد نومسلم ترکوں کے اُن خاندانوں کی تاریخ لکھی ہے جو ملوک افراسیابیہ و ایلک خانیہ وآل خاقان کے نام سے مشہور ہیں اور آل سامان کے بعد قریباً دو سو سال تک ماوراء النہر اور ترکستان میں حکمراں رہے ہیں اور بعض سلاطین خوارزم شاہیہ نے بھی ان کی اطاعت کی ہے۔

ان واقعات کے بعد اُن حکام کا تذکرہ ہے جو اوکتائی قاآں کے زمانہ سے ہولاکو کے فتح ایران تک یعنے ۶۲۶ھ سے ۶۵۳ھ تک ایران میں مغلوں کی طرف سے حکومت ایران پر مامور ہوئے ہیں۔ مثلاً جن تمور۔ نوسال۔ گرگوز۔ ارغون وغیرہ۔

جلد سوم میں منگوقاآں بن تولی خاں بن چنگیز خاں کی تخت نشینی (۶۴۹ھ) اور حکومت کے ابتدائی زمانہ کا احوال ہے اس کے بعد ہولاکو خاں کے فتح ایران کا تذکرہ لکھا ہے جو ۶۵۳ھ کا واقعہ ہے اس کے ضمن میں اسمٰعیلیوں کے قلع وقمع کی مفصل سرگزشت بیان کی ہے اس کے آخر میں ملوک اسمٰعیلیہ کا تاریخی تذکرہ ہے اور اسمیں اسمٰعیلیوں کے مذہب اعتقادات کے حالات خوب شرح وبسط کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

زمانہ تصنیف جہانکشائی کا اگر اول سے آخر تک مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب کسی معین زمانہ میں تصنیف نہیں ہوئی ہے بلکہ مصنف نے بغیر کسی ترتیب کے اس کے مختلف اجزا مختلف سنین میں تصنیف کئے ہیں چنانچہ جلد اول میں فتح خراسان کا تذکرہ کرتے ہوئے خود مصنف نے اسبات کا اشارہ کیا ہے۔

و اگر فارغ دل باشد کہ روزگار بر تعلیق و تحصیل مصروف کند و ہمت او بر ضبط اجزا مشغول باشد در زمان طویل از شرح یک ناحیت تفصے نکند و آنرا در عقد کتابت نتواند کشید تا بداں چہ رسد کہ از روئے ہوسی محرر ایں کلمات را با آنکہ طرفۃ العینے زمان تحصیل میسر نیست چہ گر در اسفار بعید یک ساعت در فرصت نزول اختلالی میکند و آں حکایات را سوادی می نویسد۔

کتاب کے مختلف مقامات میں بلا لحاظ تقدیم و تاخیر کے مختلف تاریخیں درج ہیں اور یہ اس بات کی بین دلیل ہے کہ کتاب کے مختلف اجزا مختلف ازمنہ میں لکھے گیے ہیں

جلد سوم میں ایک موقع تحریر ہے کہ اس جلد کی تالیف کے وقت منگو خاں بقید حیات موجود تھا۔ تاریخ وصاف سے ثابت ہے کہ منگو خاں نے ۶۵۶ھ میں وفات پائی ہے[1]
جلد اول میں فتح سمرقند و بخارا کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

"تا چنانک غایت وقت کہ شہور سنہ ثمان وخمسین است زمانہ است عمارت و رونق آں بقاع بعضے باقرار اصلی رفتہ و بعضے نزدیک شدہ۔"

اگر ان دونوں مقامات کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جلد سوم ۶۵۶ھ سے پہلے تصنیف ہوئی ہے اور جلد اول اس کے دو سال بعد ۶۵۸ھ میں لکھی گئی ہے اس قسم کے اور بہت سے مقامات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ کتاب کے بعض اجزا پہلے اور پہلے اجزا بعد لکھے گئے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ اوراق میں بیان کیا ہے کہ علاء الدین جب امیر ارغوں کے ساتھ منگو خاں کے دربار تخت نشینی میں شریک ہونے کے لئے قراقرم میں آیا تو اسکے بعض دوستوں کی فرمایش سے ۶۵۱ھ میں اس کتاب کی ابتدا کی لیکن کتاب میں اسکا کہیں تذکرہ نہیں ہے کہ مصنف نے اسکی تالیف سے کب فراغت حاصل کیا۔ کتاب میں ایک موقع پر ۶۵۸ھ کا ذکر آیا ہے اور اس کے بعد کسی اور سن کا ذکر نہیں ہے۔ اس لئے یہی سن زمانہ تصنیف کا آخری سن قرار دیا جا سکتا ہے اور اسکی بنیاد پر یہ رائے قایم ہو سکتی ہے کہ جہانکشای ۶۵۱ھ اور ۶۵۸ھ کے مابین سات سال کے عرصہ میں تالیف ہوئی ہے۔

جہانکشای نہایت نفیس اور عمدہ فارسی میں لکھی گئی ہے لیکن اسمیں دقیق اور غامض الفاظ کے ساتھ مصنف نے عربی اشعار و امثال اور احادیث و اقوال اس کثرت سے نقل کئے ہیں کہ کتاب مشکل اور اسکی زبان نہایت مغلق ہو گئی ہے اس ملال انگیز کیفیت کو دو آدمیوں نے دور کرنے کی کوشش کی ہے اور ان دونوں نے کتاب کے تمام مشکل و مغلق لغات عربی اشعار و امثال کو کتاب سے خارج کر دیے ہیں اور محض واقعات کو بلا کسی قسم کے اضافہ کے صاف و سلیس عبارت میں اختصار کے ساتھ لکھدیا ہے۔

---

[1] تاریخ وصاف۔ طبع بمبئی صد ۱۱۔

(۱) ان میں کا ایک خلاصہ ۹۳۵ھ کا لکھا ہوا ہے اور فرانس کے کتب خانہ ملی میں محفوظ ہے۔ فرانس کے ایک مشہور مصنف بیرن دوسون Baron d'Ohsson نے فرانسیسی زبان میں اقوام مغول کی ایک ضخیم تاریخ لکھی ہے جس کا نام یہ ہے۔

Historie des Mongols

اسکی تالیف میں مصنف مذکور نے اسی خلاصہ سے استفادہ حاصل کیا ہے۔

(۲) ہمارے یہاں امام ابو جعفر محمد بن جریر الطبری کی تاریخ کے فارسی ترجمے کا ایک قلمی نسخہ موجود جو ۷۵۶ھ میں لکھا گیا ہے۔

اس ترجمہ منصور بن نوح سامانی (۳۸۹ھ ۳۸۷ھ) کے زمانہ میں ہوا ہے اسکے بعد کسی نے ۶۱۵ھ تک خلفائے عباسیہ کے حالات اسمیں الحاق کئے ہیں اور یہ الحاقی حصہ فارسی کے تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں میں موجود ہے ہمارے نسخہ میں اس کے علاوہ ایک اور الحاقی حصہ جس میں چنگیز خاں اور اسکی اولاد کے حالات ہیں اور اس کے ضمن میں شاہان خوارزم اور ملوک اسمٰعیلیہ اور حکام مغولیہ کے تذکرے مذکور ہیں اور اس حصہ میں کسی نامعلوم الاسم مصنف نے جہانکشائی کے حشو زوائد کو خارج کرکے محض واقعات کا اختصار کیا ہے اور اس کی تمہید اسطرح لکھی ہے۔

اکنوں بدانکہ چوں تاریخ ابن جریر باخبر رسید لازم شد احوال خروج بادشاہ جہانگیر چنگیز خاں بداں الحاق کردند و چوں عبارات و اشارات صاحب اعظم سعید خواجہ علاء الحق والدنیا والدین طالب مشواہ بغایت بلند بود۔ بر سبیل ایجاز مقصود قصص ابرام کردہ شد تا حفظ آں آسان تر باشد۔

چنیں فرمود صاحب سعید کہ در شہور ۶۵۱ھ احدی و خمسین و ستمانہ کہ بحضرت خاں ہمہ خاناں منگو قاآں مشرف گشتیم و آثار معدلت او مشاہدہ کردم جمعے از یاراں اشارت فرمودند کہ تاریخے می باید ساخت و مجموعہ می باید پرداخت کہ تاریخ آیات قیاصرہ و ماضی روایات اکاسرہ بود چوں چند نوبت دیار ماوراء النہر و ترکستان تا حد چیں و ماچیں در نظر آمدہ بود و از معتبراں ...... قولاں استماع کردہ و از التزام دوستاں کہ حکم خرم بود چارہ ندید۔ آنچہ محقق بود در قید کتابت آوردہ و آں را تاریخ جہانکشائی جوینی نام نہاد۔

(۹) شہید وفا

بسلسلۂ گزشتہ

واں تک پہنچا جو وہ دل افگار
بیکس مضطر غریب ناچار

اکر ہوئیں حسرتیں گلو گیر
اُترا خاموش مثل تصویر

بولا چالا نہ کچھ کسی سے
رستا لیا گھر کا بیکسی سے

اینک گھر کی طرف رواں تھا
لیکن گھر کس کا؟ گھر کہاں تھا

تھوڑا سا دن ابھی تھا باقی
مطلع تھا صاف دھوپ بھی تھی

پیدا ٹھر تھی ہوا میں کچھ کچھ
تھی آمد شب فضا میں کچھ کچھ

ناگاہ ہوائے بحر آئی
کُہرے کو اپنے ساتھ لائی

درے میں چھا گیا اندھیرا
تاریکی نے جہاں کو گھیرا

قسمت نے دکھایا پھیر یہ آہ
پوشیدہ ہوئی نگاہ سے راہ

کھیتوں کی پگ ڈنڈیوں میں بھٹکا
دامن کہیں جھاڑیوں میں اٹکا

اس حال سے چل رہا تھا یہ راہ
کانوں میں صدا اک آئی ناگاہ

اک شاخ پہ سینہ باز بیٹھا
کچھ نغمہ سرائی کر رہا تھا

کب لطف نصیب اسکو تھا وہ
پتہ ٹوٹا ہوا ہُوا وہ

ہونی تھی فلک سے برف باری
ہر چیز پہ تھی اُداسی طاری

ناگاہ نظر پڑا اُجالا
بستی کا نشاں بتانے والا

اینک نے جو یہ سُراغ پایا
گرتا پڑتا وہاں تک آیا

✤ ✤ ✤ ✤ ✤ ✤

پھر واں سے گلی کی راہ پکڑی
آہستہ چلا بصد خرابی

اُس گھر کی طرف ہوا قدم زن
جو تھا کبھی عشرتوں کا مامن

پیدا ہوئے اسکے پیارے جسمیں
تھے سات برس گزارے جسمیں

لیکن کیا جانے بات کیا تھی　　دل پر چھائی تھی اک اُداسی
سینے میں دم جو گھٹ رہا تھا　　آگے کو قدم نہ اُٹھ رہا تھا
جب پہنچا آ کے گھر کے نزدیک　　در بند تھا اور مکان تاریک
بجلی چمکی تو دیکھتا ہے　　دیوار پہ کاغذ اک لگا ہے
کاغذ تھا وہ اشتہار نیلام　　دل تھام کے رہ گیا یہ ناکام
کھینچی ایک آہ سرد جانسوز　　تھی آہ کہ ناوک جگر دوز
تڑپا جو بہت غم نہاں سے　　نکلا فقط اس قدر زباں سے
دنیا ہی سے یا گزر گئی وہ　　یا میرے حق میں مر گئی وہ

* * * * *

آخر وہ بلا کشیدہ اٹھا　　دل مردہ و آبدیدہ اٹھا
بستی سے تھوڑی دور ہٹ کر　　تھی ایک سرا قدیم واں پر
جو جائے پناہ بیکساں تھی　　غربت زدوں کو جہاں اماں تھی
پہلے رہتی تھی خوب آباد　　لیکن اب ہو چلی تھی برباد
وہ دور اگلا گزر چکا تھا　　مالک اس کا گزر چکا تھا
تھی مریم لبن اس کی بیوہ　　اس کا تھا زبس یہی ذریعہ
آمد ہر چند گھٹ گئی تھی　　وہ اسکو چلائے جا رہی تھی
بھولا بھٹکا جو کوئی آتا　　کھٹیا[1] ایک آدھ پا ہی جاتا
ٹھہرا آکر یہیں وہ ناشاد　　جاتا گھر کس کے خانہ برباد

* * * * *

مریم تھی زبسکہ نیک خصلت　　خوش خُلق شریف بامروّت
تنہائی پر اُس کی رحم کھاکر　　بیٹھا کرتی تھی پاس آکر
حالات نئے پرانے کہتی　　تیرے میرے فسانے کہتی
اینک ایسا بدل گیا تھا　　بالکل چہرہ بدل گیا تھا
نادانستہ لگی وہ کہنے　　اک دن حالات اسکے گھر کے
مرنا لخت جگر کا اس کے　　اسطرح اُجڑنا گھر کا اسکے

---

[1] چارپائی

بڑھتی ہوئی آنی کی فلاکت ۔ وہ بے زری اور وہ مصیبت

ہمدردی کو فلپ کا آنا ۔ لڑکوں کا مدرسے کو جانا

آنی کی خبر ہمیشہ لینا ۔ آخر کو پیامِ عقد دینا

انکار وہ اس کا اسکا اصرار ۔ ہونا شادی کا آخر کار

فرزند فلپ کی وہ ولادت ۔ وہ شادی و عیش و جشن و عشرت

کہتی رہی وہ سنا کیا یہ ۔ تھا مرثیہ اسکو ماجرا یہ

لیکن نہ ہوا وہ ٹس سے مس بھی ۔ چہرے پہ ذرا شکن نہ آئی

اس طرح سنی وہ ساری گفتار ۔ گویا اسے کچھ نہ تھا سروکار

آخر ہوئی ختم جب کہانی ۔ بولا اک سانس بھر کے ٹھنڈی

بدقسمت بدنصیب اینک ۔ بیکس اینک غریب اینک

حیف اے مقتول بیوفائی ۔ افسوس اے کشتۂ جدائی

کھینچی پھر ایک آہِ پُر درد ۔ دل بیٹھ گیا بدن ہوا سرد

طوفان وفا اٹھا جو دل میں ۔ پیدا ہوا جوش آب و گل میں

بجھتی ہوئی شمع جیسے بھڑکے ۔ یا طائر پر شکستہ پھڑکے

امڈا دریائے شوقِ دیدار ۔ آنکھوں میں سمایا جلوۂ یار

جی میں آیا کہ چل کے دیکھو ۔ اور آخری اک نظارہ کر لو

جس کے لئے ہم ہوئے ہیں برباد ۔ بس ہے وہ اگر ہے شاد و آباد

تھی جبکہ بدلتی شام کی دھوپ ۔ خون گشتگی شفق کا بہروپ

اس دھن میں چلا قتیل اندوہ ۔ افتاں خیزاں چڑھا سر کوہ

یاں آ کے عجیب حال گزرا ۔ اگلا پچھلا خیال گزرا

بیٹھا تو جگر میں درد اٹھا ۔ سرگشتہ بسان گرد اٹھا

بستی کیطرف نظر اٹھائی ۔ کی جذبۂ دل نے رہنمائی

گرفی کا سامنے تھا مینار ۔ شعلہ تھا چراغ کا ضیا بار

اس لو پہ بیقرار لپکا ۔ سیدھا پروانہ وار لپکا

+ + + + +

بستی کے سرے پہ سب سے پہلا — خوش وضع مکان تھا فلپ کا
پائینِ مکاں تھا مختصر باغ — تھا جس سے دل بہشت پُر داغ
پیچھے اس باغ کے تھا صحرا — پہنائی میں دامنِ تمنّا
تھا باغ کا اک ادھر بھی پھاٹک — سیدھی تھی روش برآمدے تک
ٹٹّی مہندی کی تھی دورویا — آراستہ بیچ میں چمن تھا
گلشن کے بیچ میں کھڑا تھا — شمشاد کا نخل اک پُرانا
پختہ روشیں تھیں گرد اُس کے — کٹتی تھیں جو دوسری روش سے
اینک کترا کے راہ سیدھی — گلزار میں آیا چوری چوری
شمشاد کا تھا درخت جس جا — واں چور کی طرح آ کے دبکا
دالان پر اک نظر جو ڈالی — دیکھی صورت نہ دیکھنے کی
لیکن یہ اسیرِ زندگانی — محرومِ نویدِ شادمانی
تھا ظلِ عدم نمائے ہستی — گر دل کا قتیل چیرہ دستی
ہستی اپنی ہی جب مٹا دی — کس کا غم اور کہاں کی شادی

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

روشن تھیں جو شمعہائے کافور — دالان بنا تھا بقعۂ نور
چاندی کے ظروف قاعدے سے — نعمت خانوں پہ سب چُنے تھے
افروختہ بیچ میں تھی گلخن — گرد گلخن کھلا تھا گلشن
دہنے پہ فلپ تھا جلوہ فرما — دیرینہ رقیب تھا جو اس کا
اُس کا وہ روئے زعفرانی — تھا جامِ طرب سے ارغوانی
آغوش میں طفلِ لالہ رخسار — تھا رُخ سے فروغ بخش انظار
اور تھی پسِ پشت ایک دختر — غیرت دہ ماہ و مہرِ انور
وہ سرو سا قد وہ گل سا چہرہ — وہ زلفِ سیہ کمند دلہا
صورت میں ایسی دلکشی تھی — گویا اینی جواں ہوئی تھی
ڈوری میں بندھی تھی اک انگوٹھی — جسکو سوئے طفل تھی بڑھاتی
نیچے کبھی لائے گہ ہٹالے — لینے وہ بڑھے تو یہ ہٹالے

جتنے تھے سب اسپنس رہے تھے | چہلیں تھیں اور چہچہے تھے
بائیں پہ کھڑی تھی طفل کی ماں | بچے پہ نظر تھی دل میں ارماں
مڑتی تھی نگاہ جب اِدھر سے | باتیں کرتی بڑے پسر سے
استادہ تھا پاس ہی جو اسکے | خوش تھا مادر کی گفتگو سے

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

القصہ وہ مرکے جینے والا | اُگلا ہوا موت کا نِوالا
جب دیکھ چکا یہ رنگ صحبت | یعنے کہ پلٹ گئی ہے قسمت
بی بی جو کبھی تھی اسکی محبوب | وہ آج ہے دوسرے کی مطلوب
اُس کا وہ طفل لالہ رُخسار | جس سے نہیں اسکو کچھ سروکار
وہ خاص جو اسکی ہیں نشانی | اٹھتی ہوئی اُن کی وہ جوانی
وہ گھر کی چہل پہل وہ زینت | وہ ارزش لطف و مہر والفت
بدلا ہوا اسطرح کا نقشہ | راج اپنی جگہ پہ دوسرے کا
ہرچند کہ سن چکا تھا سب کچھ | مریم نے بھی کہا تھا سب کچھ
پر کب ہے شنیدہ مثلِ دیدہ | تھرایا دلِ ستم رسیدہ
لغزش ہوئی پا کو سر کو چکر | نزدیک تھا گر پڑے زمین پہ
دونوں ہاتھوں سے دل سنبھالا | ٹھہرا اک دم پکڑ کے ڈالا
ڈر تھا کہ جو ہوگا راز افشا | ہو جائے گا عیش برہم ان کا
گو نالوں کو درد نے اُبھارا | اللہ رے ضبط دم نہ مارا

✣ ✣ ✣ ✣ ✣

واں سے اُلٹا پھرا دبے پاؤں | اپنے سائے کو بھی نہ دی چھاؤں
طاقت جو طاق ہو چکی تھی | دیوار کی اُس نے آڑ پکڑ لی
آہستہ سے واکیا درِ باغ | باہر نکلا چلا سوئے راغ
چارہ جز صبر اور کیا تھا | لکھا قسمت کا پیش پا تھا
چاہا چھاتی پہ رکھ کے پتھر | ہو سربسجود پیش داور
گھٹنوں میں سکت کہاں تھی اتنی | اوندھا گرا اور زمین پکڑ لی

تھا مورد رنج و درد و آفات ——— کرنے لگا حق سے یوں مناجات

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

اللہ! یہ رنج اور صدمے ——— کیونکر اُٹھیں قلب ناتواں سے
یارب مجھے کیوں وہاں سے لائے ——— اچھا تھا وہیں جہاں سے لائے
مجھ کو صحرا وہ کیا بُرا تھا ——— دنیا سے الگ تھلگ پڑا تھا
اے خالق قادر و توانا ——— بینا تو ہی ہے تو ہی دانا
ہر درد کی تو ہی بس دوا ہے ——— تیرے ہی کرم کا آسرا ہے
مونس نہ انیس تھا جہاں پر ——— ساتھی نہ جلیس تھا جہاں پر
ہمدم تو ہی تھا تو ہی ہمراز ——— غربت میں بھی تیری آس دمساز
اس حال میں بھی ہے تجھ سے اُمید ——— درکار ہے صرف تیری تائید
تو چاہے تو یہ غم بھی بٹ جائے ——— تھوڑی سی جو زندگی ہے کٹ جائے
چھوٹے نہ عنان صبر یارب ——— ہو سہل مجھے یہ جبر یارب
مجھ پہ جو گزرنی ہو گزر جائے ——— ہاں راز نہ دل سے تا لب آئے
بجھ کر شمع حیات رہجائے ——— پردے میں مگر یہ بات رہجائے
عیش اُس کا نہو یہ سُنکے برہم ——— ابتک زندہ ہے تا بہ اینیدم
راحت میں خلل گر آیا اُسکی ——— تڑپے گی رُوح قبر میں بھی
بچے مرے لخت دل ہیں میرے ——— مالک بندے ہیں وہ بھی تیرے
اچھے رہیں خوش رہیں جہاں ہوں ——— پھولیں پھلیں اور کامراں ہوں
گو وہ پہچانتے نہیں ہیں ——— میں کون ہوں جانتے نہیں ہیں
تھا جوشش خوں کا یہ تقاضا ——— جا کر ملتا گلے لگاتا
ہے یہ منشائے بخت واژوں ——— اُن سے نہ ملوں انہیں نہ دیکھوں
ملنے میں یہ خوف ہے مبادا ——— ہو جائے کہیں نہ راز افشا
افشا کروں راز! یہ نہو گا ——— میں ہوں جانباز یہ نہ ہوگا
ہاں المدد اے شکیب اے صبر ——— ہاں اے دل اختیار کر جبر

✤ ✤ ✤ ✤ ✤

یہ کہہ کے ہوا سکوت طاری کام آئی نہ دل کی استواری
غم مستولی ہوا خرد پر چھاپا مارا غشی نے آکر
کچھ دیر پڑا رہا وہ بیہوش ہستی ہوئی اپنی بھی فراموش
غش سے جو دم ہوا افاقہ اٹھا سبزہ سے لڑکھڑاتا
چلنا تھا اگرچہ سخت دشوار لی راہ سرا کی چار ناچار
کنج عزلت کا رہ گرا تھا اک دُھن تھی۔ دُھن میں جا رہا تھا
ہنگام روش صدائے ہر گام تھی صبر کا اس کو دیتی پیغام
انفاس اسی نغمہ سے تھے دمساز دل سے یہی آرہی تھی آواز
"میں ہوں جانباز یہ نہ ہوگا افشا کروں راز یہ نہ ہوگا"

* * * * *

با اینہمہ رنج و درد جانکاہ تھا راہ رضا سے وہ نہ گمراہ
صبر اس کا تھا اور ہمت اسکی تھی شمع امید حسرت اسکی
اللہ پہ تھا وہ بسکہ شاکر تھا کوہ الم نہ بار خاطر
دل سے تھا جو رجوع الی الحق پروا تھی نہ غم کی اسکو مطلق
اس کے لئے سختئ زمانہ گویا تسکیں کا تھی بہانہ
تھی غم میں خوشی اسے ہوں جیسے شیریں تہ آب شور چشمے
اک دن مریم سے گفتگو میں کرنے لگا اسی طرح وہ باتیں
"کیوں! گرنی والے کی یہ زوجہ مجھ سے کیا تم نے ذکر جسکا
ڈرتی نہیں اس خیال سے کیا شاید شوہر ہو اس کا جیتا
مریم بولی کہ۔ "سچ جو پوچھو ڈر سوتے جاگتے ہے اسکو
ہاں تم باور اگر کرا دو مردہ دیکھا ہے تم نے اسکو
شاید دل کچھ نہ کچھ بہل جائے ہر وقت کی اک خلش نکل جائے
یہ سن کے کیا ملال اس نے اور دل میں کیا خیال اس نے
"اچھا یہ کہانی بھی سنے گی وہ میری سنائی بھی سنے گی
رہنا ہے ابھی تو یوہیں خاموش جب تک نہ قضا سے ہوں ہم آغوش"

تھا بسکہ غیور و ذی حمیت　　خیرات کی تھی نہ اسکو عادت
دو بھر تھی اگرچہ زندگانی　　کچھ کام کرے یہ جی میں ٹھانی
تا اکل حلال ہاتھ آئے　　اپنی محنت کا آپ کھائے
ہر فن میں اسکو دسترس تھا　　پیشہ تھا ہر ایک اسکو آتا
نجار وہ تھا لُہار وہ تھا　　ہر کام میں ہوشیار وہ تھا
بُنتا کبھی ماہی گیروں کے جال　　بنتا کبھی گودی میں وہ حمال
اپنی محنت سے یوں وہ مغموم　　پیدا کرتا تھا رزق مقسوم
یوں ہی جب ایک سال پورا　　آکر اسکو وطن میں گزرا
بگڑی یکبار حالت اُسکی　　ناساز ہوئی طبیعت اُس کی
بیماریٔ دل نے زور پکڑا　　اور ضعف نے دست و پا کو جکڑا
محنت سے ہو گیا وہ ناچار　　ہونے لگی روح جسم کو بار
جانا ہوا بند گھر سے باہر　　آخر کو وہ تھا اور بستر
لیکن اینک نے یہ غم و درد　　جھیلا جیسے ہیں جھیلتے مرد
کشتیٔ حیات ڈوبتی تھی　　موت آنکھوں کے آگے پھر رہی تھی
لیکن طوفاں زدہ جہازی　　ہوں دیکھ کے جیسے خوش وہ کشتی
جوان کو بچانے آرہی ہو　　پیغام حیات لا رہی ہو
یوں ہی مرنا تھا اسکو جینا　　تھی موت حیات کا سفینہ
تھی زندگی اپنی بار اسکو　　تھا موت کا انتظار اسکو

+ + + + +

دی در پہ قضا نے جبکہ دستک　　چونکا اس خواب غم سے اینک
گو چھایا تھا موت کا دھندلکا　　اک نور امید اسس سے جھلکا
یعنی یہ ہوا خیال پیدا　　دنیا سے ہوا جو میرا جانا
پہنچے گی خبر یہ اینی کو بھی　　دیکھے گی مری وفا کو وہ بھی
کھل جائے گا اُسپہ حال میرا　　ثابت قدم وفا تھا کیسا
مریم کو یہ سوچکر بلایا　　پاس اپنے بٹھا کے یوں سنایا

بی دیکھو ہے ایک راز میرا — لیکن میں جبھی کروں گا افشار
اس بات کی پہلے تم قسم کھاؤ — اللہ کو درمیاں میں لاؤ
جبتک مرے دم میں دم ہے باقی — تم میری کرو گی راز داری
مرجاؤں میں جب تو پھر ہو مختار — تم شوق سے کردو اسکو اظہار
یہ سنکے وہ نیک بخت بولی — بھائی نہ کرو یہ بدشگونی
کیا کہتے ہو تم یہ۔ مرنا کیسا — ہوجاتا ہے اب مزاج اچھا
اینک نے کہا یہ دور رکھو — تم پہلے کتاب ہاتھ میں لو
کھاؤ سوگند راز داری — سُنلو پھر داستاں ہماری
مغموم ہوئی وہ سُن کے یہ بات — رکھا ڈر کر کتاب پر ہات
جب کر چکی وہ یہ عہد پکا — اینک نے اُسے بغور دیکھا
گویا ہوا پھر وہ کشتۂ درد — مریم تمہیں یاد بھی ہے وہ مرد
نام اینک آرڈن تھا جس کا — شوہر ایبی کا جو تھا پہلا
مریم بولی کہ یاد کیسی — آنکھوں میں ابھی ہے شکل اسکی
مجھکو ہے یاد وہ زمانہ — اس کا ہر روز ادہر سے آنا
مردانہ وہ آن بان اسکی — اور مستانہ وہ شان اسکی
وہ قد وقامت وہ تنکے چلنا — گویا تھی نہ کچھ کسی کی پروا
مریم سے یہ سنکے اسنے کی آہ — بولا کہ یہ واقعہ ہے جانکاہ
بی بی جو بلند تھا کسی روز — خالق نے کیا وہ سر زمیں دوز
وہ جس کو نہ تھی کسی کی پروا — اب پاس نہیں کسیکو اسکا
شاید مشکل سے تین دن اور — دنیا میں رہوں گا میں کسی طور
مرتا ہوں جب تو کیوں نہ کہدوں — سُنلو! میں اینک آرڈن ہوں

✢ ✢ ✢ ✢ ✢

مریم نے یہ سُن کے چیخ ماری — حیرت زدہ ہوکے یوں پکاری
تم — تم اینک آرڈن ہو — باور آتا نہیں یہ دل کو
کیا جانے کہہ رہے ہو یہ کیا — تم سے وہ ایک فٹ تھا اونچا

بولا وہ ہے سچ تمہارا کہنا، سر میرا کیا خدا نے بیجا
اندوہ فراق و رنج غربت، ان صدموں نے کی یہ میری حالت
جانے دو یہ ذکر۔ ہے یہ کافی، میں ہوں وہی جس نے کی تھی شادی
اب بس۔ کیا لوں میں نام اُسکا، جس نے دو بار نام بدلا
ہاں شادی کی تھی میں نے اس سے، شوہر جسکا ہے اب فلپ رے
بیٹھو سُن لو کہوں میں جو کچھ، خاموش سنو نہ تم کہو کچھ
یہ کہہ کے سُنائی داستاں سب، گزرا تھا جو کیا بیاں سب
دولت کا وہ ڈوبنا وہ بن باس، وہ تنہائی وہ عالم یاس
پھر ایک جہاز کا وہ آنا، ملاحوں کا اسکو ساتھ لانا
چھپ کر اپنے گھر وہ جانا، گھر والوں کو مست عیش پانا
کرنا اخفا کا عہد محکم، اور اس کا نباہ تا بہ ایندم
جب کر چکا ختم وہ یہ تقریر، منکر ہوئی پیر زال دلگیر
بہنے لگے اشک چشم تر سے، پراں ہوئے ہوش اسکے سر سے
پاس اسکو نہ عہد کا اگر ہو، سر پہ وہ اٹھالے سب نگر کو
اک ایک کو جا کے یہ خبر دے، افشا راز نہفتہ کر دے
لیکن خوف خدا تھا طاری، تھی اسکو قسم کی پاسداری
دم سادھ کے چپ رہی وہ ناچار، اینک سے کی فقط یہ گفتار
للّٰہ اے آرڈن نہ رو کو، جا بندو مجھے بلا لو اُن کو
چُپ سا رہا ایکدم کو وہ بھی، آخر بولا بہ ترش روئی
مریم دیکھو نہ عہد توڑو، حالت پہ میری مجھ کو چھوڑ دو
جبتک میرے دم میں دم ہے باقی، رکھنا ہے مجھے یہ راز مخفی

+ + + + +

بیٹھو، سُنو باتیں اور دو چار، جب تک باقی ہے تاب گفتار
دیکھو مری تم سے ہے وصیت، تمکو جو دم ملے وہ عورت
کہنا کہ دم اخیر تک بھی، تھی دل میں مرے محبت اُسکی

لہ۔ یعنے اپنی بیبی مسز آرڈن تھی اور اب مسز فلپ ہے۔

ذکر اسکا تھا مرتے دم بھی لب پر | توڑا دم اسے دعائیں دیکر
ہوتا نہ اگر یہ پردہ حایل | تھا اب بھی اسی کا مال یہ دل
اور بیٹی میری ہے جو اپنی | تصویر یہ ہے جو کہ اپنی ماں کی
اس سے کہنا کہ اے جگر بند | رکھے تجھے حق ہمیشہ خرسند
فرزند سے بھی مرے یہ کہنا | تجھ کو سونپا خدا کو بیٹا
پھولا پھلا رکھے شاد رکھے | خالق تجھے بامراد رکھے
کہنا یہ فلپ سے بھی کہ بھائی | ہیں ساتھ ترے دعائیں میری
منظور تجھے نہ کچھ بدی تھی | مقصود انہیں کی بہتری تھی
بچے میرے جو چاہیں آنا | میت پہ مری انہیں بلانا
جی بھر کے نہ جیتے جی تھا دیکھا | اب دیکھیں کہ میں ہوں باپ انکا
ماں ان کی مگر نہ آنے پائے | کیوں مجھ کو مرا ہوا وہ دیکھے
کیوں دل پہ اٹھائے دکھ وہ ناشاد | بھولی ہوئیں باتیں آئیں کیوں یاد

+ + + + +

اتنا کہکر ہوا وہ خاموش | آیا ہنگام رخصت ہوش
بوڑھی مریم نے جب دوبارہ | اقرار کا پھر کیا اعادہ
اکبار پھر اسنے اسکا چہرہ | حسرت آگیں نظر سے دیکھا
ظاہر جس سے یہ مدعا تھا | ہو راز نہ زندگی میں افشا
جب تیسری شب نے منہ دکھایا | بیمار کا وقت آخر آیا
یہ خستہ و زار سو رہا تھا | بیٹھی تھی سرہانے وہ ضعیفہ
دریا میں ہوا جو زور امواج | اٹھا ناگاہ شور امواج
جس سے در و بام ہل گئے سب | سوتے تھے جو دہل گئے سب
چونکا اینک بھی اس صدا سے | اٹھا بستر سے لڑکھڑا کے
پھیلا دیے دونوں ہاتھ یکبار | جیسے ہو کوئی مست و سرشار
چلایا وہ جہاز آیا | لینے ہمکو جہاز آیا
یہ کہہ کے گرا گرا تو بیہوش | تا حشر رہے گا اب وہ خاموش

ختم شد

ضامن کنتوری

نقش قدم

مسلسل از صفحہ (۱۸۲)

دسواں باب

ایک تازہ معاملہ

ان کے سوال نے مجھے بیدار کر دیا کہ میں یہاں بیگناہ کی دریافت کے لئے نہیں آیا تھا بلکہ مجرم پر اس واقعے کو ثابت کرنے آیا تھا۔ اس وقت یہ بات میرے کل ذہن میں نہ تھی۔

"ان سے پوچھئے تو کہ آیا ان کو ان اوقات کا یقین ہے"۔

یوجین نے پوچھا اور پھوپھی پالی نے مسکرا کر جواب دیا "میں ہرگز وقت میں غلطی نہیں کرتی ہوں جو کچھ میں نے کہا ہے اُسے یقین مانیئے۔

میں نے اپنی گھڑی اُن کی گھڑی سے ملائی۔ آدھے منٹ کا بھی فرق نہیں تھا اور مجھے معلوم تھا کہ کھانے کے کمرہ کی گھڑی کا بھی وہی وقت تھا۔

یوجین اور میں اُن سے رخصت ہوئے اور ہم دونوں کتاب خانے میں گئے۔ بیچارہ جوان اس امید افزا خبر سے بالکل از خود رفتہ ہو رہا تھا۔ "آپ کا اس کی نسبت کیا خیال ہے؟"

"ظاہر ہے کہ اگر وقت کے متعلق ہمکو کوئی غلطی نہیں ہوئی ہے تو معاملہ کی صورت حسب ذیل ہے:-

طوفان کے ختم ہونے کے قبل آپ نے مس ہیاٹ بس کو شمع لئے ہوئے چلتے دیکھا آپ کے چچا اُس وقت کتابخانے میں زندہ تھے۔ کیونکہ آپنے انہیں کھانستے ہوئے سُنا مس ہیاٹ بس سیدھی پھوپھی پالی کے کمرہ میں چلی گئیں اور آپ کی چچی کے روبرو ایک گھنٹہ سے زیادہ تک سوتی رہیں۔ تین بجنے میں دس منٹ کم تھے جب وہ اپنے کمرہ میں چلی گئیں

اور مس پالی نے ان کو اُن کے کمرے میں آرام سے سوتے ہوئے چھوڑا۔ خوب خیال رکھئے۔ تین بجنے میں ۵ منٹ کم تھے جب ایک پکانے والی نے آپ کے چچا کو کتاب خانے میں مردہ پایا۔ جہاں وہ سرد ہو گئے تھے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کم سے کم بیس منٹ آگے مر چکے تھے"۔

بوجین نے ایک خوشی کا نعرہ لگایا ادریس کے چہرے پر بشاشت کے آثار ظاہر ہونے لگے اور میرا ہاتھ پکڑ کر بار بار ملایا۔ یہاں تک کہ میں نے اپنا ہاتھ چھڑا لیا" مسٹر کرافرڈ یہ سب کچھ آپ کی بدولت ہے۔ میں ہرگز ہرگز اسے نہ بھولوں گا"۔

"بوجین۔ اس سے بہتر بریت کا ثبوت نہیں مل سکتا ہے اس طرف سے تو آپ پورا اطمینان رکھیں۔ بیاٹریس مثل ایک معصوم بچے کے بیگناہ ہے"۔

"خدا کا شکر۔ یہ میرے لئے ایک خوفناک خیال تھا یعنے اُسوقت بھی جبکہ میں نے خیال کیا تھا کہ وہ حالت بیہوشی میں اس جرم کی مرتکب ہوئی ہیں"۔

"بیشک اسکا تصور آپ کی تمام زندگی کو ہمیشہ کے لئے تلخ کر دیتا۔ اور مجھے یقین ہے کہ ان کو بھی دیوانہ بنا دیتا اگر وہ حقیقت سے واقف ہو جاتی"۔

"بیشک۔ بیشک۔ آپ کے ذریعہ سے ہم کیسی پریشانی سے بچے ہیں لیکن تعجب ہے کہ میری نے ان کو نہیں دیکھا"۔

"وہ اُسوقت باورچیخانہ کے دروازے بند کرنے میں مصروف تھی جبکہ مس پالی بیاٹریس کو اُن کے کمرے تک پہنچانے جارہی تھیں"۔

"یہ بات نہایت خوش آیندہ اور غیر متوقعہ ہے میں تو بالکل دوسرا شخص بنگیا ہوں"

"آپ کو ایک بات کا بندوبست کرنا لازم ہے۔ بیاٹریس کو کھوئی ہوئی انگوٹھی کے معاملہ سے واقف کردو تاکہ وہ بھی پالی خیال نکریں کہ ہم نے ان کو فریب دیا ہے"۔

"بہت خوب۔ لیکن ایک چیز مجھے پریشان کر رہی ہے"۔

"وہ کیا ہے"

"ہم نے تو دریافت کرلیا کہ کون بیگناہ ہے"۔

"جی ہاں"۔

"لیکن کوئی شخص تو مجرم ضرور ہوگا"۔

"درست ہے۔"

"تو پھر آپ اب کس طرف رجوع کریں گے؟"

میں ان کی باتوں پر مسکرایا۔

"مسٹر یوجین۔ میرے گمان میں ایک اور بات بھی ہے۔"

"آپ کا مطلب اُس چور سے ہے؟"

"کیا میں نے آپ سے اسکا ذکر کیا تھا؟"

"نہیں۔ لیکن آپنے اتنا کہا تھا کہ ایک شخص اس نواح میں رات کو گھومتا ہوا نظر آیا تھا اور آپنے مجھ سے پوچھا تھا کہ آیا کوئی شخص میرے پیچھے پیچھے بھی آیا تھا یا نہیں لیکن مجھے اب یاد آیا کہ آپنے یہ بات اُسوقت پوچھی تھی جبکہ آپ کو معلوم نہ تھا کہ میز کے خانہ کا روپیہ کیا ہوا تھا۔"

"بایںہمہ ایک شخص ضرور اس احاطہ سے کل رات کو طوفان کے بعد باہر گیا جس کے چہرے پر خوف کے آثار پائے جاتے تھے۔"

"کیا فرمایا؟"

"اس مکان کے راز کے حل کرنے کے لئے اب ہم کو اُسی کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔"

"کیا وہ نقب زن تھا؟"

"بیشک۔"

یوجین کچھ مبہوت سا نظر آیا۔

"تو ایسا ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں ہمکو بعض عجیب باتیں دریافت کرنی ہونگی۔"

"تحقیقات کی روشنی میں اس سے زیادہ گہرے اسرار مفقود ہو گئے ہیں جیسے کہ صبح کا کہر جو آفتاب کی شعاعوں سے اڑ جاتا ہے۔"

"نقب لگانے والا تو ہمیشہ مال اور روپیے کے لئے آتا ہے۔"

"ہمیشہ۔"

"اور یہ شخص بھی اس قاعدۂ کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتا ہے لیکن اُسنے کیا کیا؟ اُس نیم باز میز کے خانے میں ایک ہزار ڈالر سے زیادہ کے نوٹ تھے۔ اُس نے اُسکو

ہاتھ تک نہیں لگایا۔ حالانکہ ایک منٹ کی تلاش میں اُسے بہت کچھ مل جاتا۔ اور پھر میرے چچا کی طرف دیکھئے۔ الماس کی گھنڈی اور انگوٹھی اور گھڑی جن کی قیمت ایک ہزار ڈالر سے کسی طرح کم نہ ہوگی۔ ان کو بھی اس نے چھوا نہیں۔ تو مجھے کہنا پڑتا ہے کہ یہ اپنے پیشہ میں ایسا انجان نکلا کہ میں نے اسکا ثانی آجتک دیکھا نہیں"۔

"لیکن اس بات میں میں آپ سے متفق نہیں ہوں۔ اسمیں تین مفروضہ پیدا ہوتے جن میں سے ہر ایک اُس کے کسی چیز کے نہ لیجانے کے لئے کافی ہوگا"۔

"تین؟ ان کو بیان تو فرمائیے"۔

"بہت اچھا میں سلسلہ وار بیان کرتا ہوں پہلے تو ہم فرض کریں گے کہ وہ چور ایک معمولی آدمی تھا اور یہاں چوری کی غرض سے آیا تھا اور کمرے میں داخل ہوا سخت گیر جج صاحب سے مقابل ہوا اور اُن کو اس حربہ سے مارا جو پہلے اُس کے ہاتھ لگا جس کو ہم وہی چھڑی فرض کریں گے اس کے بعد خوف زدہ ہوکر اُس نے کیا کیا ہے؟ وہاں سے بھاگ نکلا"۔

"یہ نہایت معقول نقشہ آپنے کھینچا ہے"۔

"تو ہم اسے مفروضہ نمبر ایک کہیں گے"۔

"تو کیا آپ اسکو صحیح سمجھتے ہیں؟"

"اسوقت تو نہیں"۔

"میرا مفروضہ بیان فرمائیے"۔

"ہم فرض کریں گے کہ وہ چور نقد رقم اور جواہرات چرا لیتا لیکن کسی ناگہانی آواز نے اُسے ڈرا دیا اور وہ بھاگ گیا"۔

"یہ زیادہ قرین عقل ہے"۔

"ان کے علاوہ ایک تیسرا مفروضہ بھی ہے"۔

"تو وہ کیا ہے؟"

"انتقام"۔

اُس نے متفکرانہ میری طرف دیکھا" یہ البتہ ممکن ہے لیکن میں اسکا احتمال نہیں کرسکتا ہوں"۔

"کیا آپ کو معلوم ہے کہ آپ کے چچا کا کوئی دشمن تھا؟"

"نہیں جناب"۔

"شاید انہوں نے اپنے حین حیات کسی کو اپنا دشمن بنا لیا ہوگا؟"

جی ہاں۔ چچا بہت سخت گیر اور مستقل مزاج تھے۔ ایک وقت تو وہ پولیٹیکل اُمور میں کسی قدر مشہور بھی تھے۔ لیکن جیسے کہ وہ عدالت کے کاموں سے دستکش ہوئے۔ انہوں نے اپنا وقت سفر اور مطالعہ میں صرف کیا"

"یہ کسی دشمن کا کام ہے۔ میں اُس شخص کو ڈھونڈھ نکالوں گا جو طوفان کے بعد یہاں سے جاتا ہوا نظر آیا تھا اور دریافت کروں گا کہ آیا وہ آپ کے چچا سے واقف تھا"

"چچا ڈانیل کو پچھلے زمانے میں بہت سی تکلیفیں لاحق ہوئی تھیں"

"اہا۔ کس طرح کی؟"

"پہلے تو ان کی بی بی کیطرف سے"۔

"لیکن میں تو ان کو مجرد سمجھتا تھا"

"جی نہیں۔ انہوں نے جوانی میں شادی کی تھی۔ لیکن دو سال بعد ان کی بی بی دیوانی ہوگئیں اور کسی پاگل خانے میں ان کو بھیج دیا گیا جہاں وہ مرگئیں"

"یہ تو میرے لئے تازہ خبر ہے تو وہ زن مردہ تھے؟"

"جی ہاں صاحب"

"اور لاولد بھی؟"

"نہیں۔ اُن کے ایک لڑکا تھا"

"کیا وہ بھی مر گیا؟"

"مجھے اُس کے مرنے کی اطلاع نہیں"۔

"تو پھر اُس کا کیا حشر ہوا؟"

"اُس نے اپنے والد کی مرضی کے خلاف شادی کی تھی دونوں میں سخت جھگڑا ہوا اور اُس لڑکی کو مکان سے نکالدیا گیا کہ پھر اس مکان میں نہ آئے یہ اُس وقت واقع ہوا جب میں سفر میں تھا اور جب میں یہاں آیا تو میرے چچا نے سارا ماجرا اپنی طرز پر مجھے سُنایا اور مجھ سے کہا کہ جری سے کوئی علاقہ نہ رکھوں ورنہ وہ مجھ سے سخت

ناراض ہو جائیں گے۔

"میں نے ان کی اطاعت کی کیونکہ میں نے اس کے بعد کبھی اپنے چچا زاد بھائیکو نہ دیکھا اور نہ انکی کیفیت اسکے بعد سنی لیکن باوجود اس ممانعت کے بھی اگر اُس سے مجھ سے ملاقات ہو جاتی تو میں ضرور اسکی مدد کرتا۔"

"وہ کیسے آدمی تھے۔ کیا بالکل بے باک اور وحشی تھے؟"

"نہیں لیکن خود سر اور منہ زور تھے اگر اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا جاتا تو عمدہ نتیجہ نکل سکتا تھا لیکن چچا نے اُن کی طبیعت کو نہیں سمجھا۔"

"اس بات کو کتنا عرصہ گذرا ہوگا؟"

"گذشتہ اگسٹ میں تین برس ہوئے۔"

"اور وہ بالکل روپوشس ہو گئے؟"

"بالکل۔"

"کیا ان کا کوئی فوٹو یہاں ہے؟"

"اُن کے والد نے اول سب چیزوں کو جلا دیا جس سے اُس لڑکے کی یاد تازہ ہو سکتی تھی لیکن میرے کمرے میں ایک فوٹو چھپا ہوا ہے۔"

"مہربانی کر کے لے آیئے۔"

"وہ باہر جا کر فوراً لے آئے جو ایک خوبصورت نوجوان کی تصویر تھی جس کے بشرہ سے تنک مزاجی ٹپک رہی تھی۔"

"بالکل اپنے باپ کے شبیہہ ہیں"۔ میں نے کہا۔

"جی ہاں۔ ہر شخص کا خیال ہے کہ وہ ایک اچھا لڑکا تھا یعنے جیسا کہ شہر کے سڑکوں کو ہونا چاہیئے"۔

"کیا میں اس تصویر کو تھوڑے دنوں تک اپنے پاس رکھ سکتا ہوں؟"

"بیشک۔ لیکن آپ اسکو کیا کریں گے؟"

"شاید مجھ سے اُن سے راستہ میں کہیں مڈبھیڑ ہو جائے شاید ان کے والد نے آخر میں اپنے کئے سے پشیمان ہو کر وصیت نامہ کو چاک کر دیا ہوگا جس سے اُن کی جائداد اُن کے لڑکے کو پہنچ جائے گی۔"

"یہ صحیح ہے۔ میں بہت خوش ہوں گا اگر ایسا ہو میری والدہ نے مجھے مرفۃ الحال چھوڑا ہے اس لئے مجھے اپنے چچا کی جائداد کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور بایٹرپس بھی اُس کی اپنی جایداد سے متمول ہے۔"

میں نے نوٹ کو اپنے جیب میں رکھ لیا۔ میرا ارادہ اُس سے کیا تھا۔ وہ آئندہ چلکر ظاہر ہوگا۔

"تو اب ہم اس معاملہ کو جہاں تک اسکا تعلق بایٹرپس سے ہے تصفیہ شدہ سمجھیں گے۔ سنیئے وہ آواز دروازے پر شاید کورونر اور اسکی جوری کے آنے کی ہوگی۔"

"ہم نے ابتک جو کچھ کیا ہے ان سے کچھ نہ کہئے اور انہیں خود اپنی تحقیقات کر لینے دیجئے غالباً اُن کا فیصلہ کسی نامعلوم شخص کے قاتل ہونے کی نسبت ہوگا۔ اور اس اثنا میں میں اُس عجیب شخص کی تلاش میں جاتا ہوں جو اس احاطہ سے کل شب کو آپ کے چچا کے مرنے کے بعد باہر جاتا ہوا نظر آیا تھا۔"

"آپ کو اُس طرف سے کیا کوئی زیادہ امید ہے؟"

"میرے عزیز یوجین۔ کسی کو ضرور اس بھید کی خبر ہے اور اب جو ہم نے اس مقدمہ کو چھان مارا ہے تو یقین ہے کہ یہ شخص اگر راضی ہو جائے تو ہم کو بہت کچھ بتلا سکتا ہے۔"

"خدا آپ کو کامیاب کرے۔ مسٹر کرافرڈ۔"

"شکریہ۔ اگر اس مقدمہ میں کوئی بات ہوگی تو میں ضرور اسکو دریافت کرونگا۔ خدا حافظ"

یہ کہکر میں نے اُن کا ہاتھ دبایا اور اپنی ٹوپی لے لی۔ جونہی میں باہر نکلا کورونر داخل ہوئے۔ مجھ سے کچھ پوچھا اور میں نے چند باتیں اُن کو بتلا دیں کیونکہ میرا مقصود یہ تھا کہ انکو اُس راہ سے پھیر دوں جس کی میں پیروی کر رہا تھا۔

یہ ہرگز مناسب تھا کہ مس ہاتھورن کا نام اس مقدمہ میں لیا جائے پس اس بات کا اطمینان کر کے کہ اب مجھے وہ دوسری تلاش کرنی ہے میں اُس مکان سے باہر نکلا۔ (باقیدارد)

قطراتِ اشک

از جناب ناظر صاحب

خوشی بھول بھی جاتی ہے، مگر غم کی یاد ہمیشہ تازہ رہتی ہے، بالخصوص ایسا غم جو دل، دماغ اور روح پر خون کا چھاپہ لگا چکا ہو اس نظم کا تعلق جس واقعہ سے ہے ہم بھی اُس سے بے تعلق نہیں ہیں اس لئے آج ایک دوست کو دوسرے دوست کی زبان سے پُرسا دینے میں ہمزباں ہو رہے ہیں۔ جناب ناظر کی نظم ان کے عنایت نامہ کے ساتھ بجنسہ ہدیۂ ناظرین کیجاتی ہے۔ (اڈیڈیٹر)

مکرمی۔ تسلیم۔ ایک مختصر نظم "قطرات اشک"۔ مرسل ہے یہ ایک عزیز شفیق کے فرزند دلبند کی وفات کا نوحہ ہے جو اسی زمانہ میں موزوں کیا تھا لیکن اب اسے بھیجنے کا ہوش آیا ہے امید ہے کہ آپ کا ذوق انتخاب اسے پسند کریگا اور آپ اسی طرح اسے شایع کردیں گے۔

چاہیں تو آپ دونوں ناموں کی تصریح کرسکتے ہیں۔ ہاشم سے مراد سید ہاشم ہیں اور احمد سے مراد مولوی سید نثار احمد صاحب مرآج۔ ہاشم میاں سے راقم مسطور کو جو روحانی تعلق تھا یہ اس کی موت انجامی کی اک آہ ہے:۔ خاکسار ناظر۔

کیا خاک اڑگئی چمن روزگار کی　　گرد و غبار دامن باد صبا میں ہے
پاتا ہوں ہر نہال چمن کو جلا ہوا　　آتش سفیر بلبل رنگیں نوا میں ہے
ہے کس کی زندگی کی دُبارہ مری مراد　　مضمر ہجوم یاس مرے مدعا میں ہے
ہے یہ نمود و بود کہ جب تک حیات ہے　　اور وہ حیات جس کی نفس کائنات ہے
اب دے نہ دے نشاط و سرور اے فلک مجھے　　یہ بجھ گیا ہے جی کہ تقاضا نہیں رہا
خالی رہی نہ دلمیں تری جائے شکر ہے　　غم کا رہا ہجوم تو بیجا نہیں رہا
ہاشم کی نعش دوش پہ لیکر چلے ہیں لوگ　　خورشید حشر سر سے کچھ اونچا نہیں رہا
برحق ہے موت جانتے ہیں سبکو آئے گی　　لیکن یہ موت دل سے بھلائی نہ جائیگی
اس جوش غم میں عنصر آبی کی خیر ہو　　رُوکوں سرشک دیدۂ پرآب کسطرح
گرایسے حادثات جہاں میں ہوں فلک　　پورے ہوں حشر کیلئے اسباب کسطرح

دیکھیں تو آج دن کو نکلتا ہے کیونکہ مہر — دیکھیں تو آج شب کو ہو مہتاب کس طرح
گو ہم کو تجھ سے شکوۂ مہر و وفا نہیں — ہاں یہ گلا کریں تو کچھ اس کا گلہ نہیں
والد کو بیقرار کیا تم نے کیا کیا — یہ کس کو غم میں زار کیا تم نے کیا کیا
وہ دامن کرم جو گلوں میں بھرا ہے — آلودۂ غبار کیا تم نے کیا کیا
ہر ایک اس کی بزم میں جمشید وقت تھا — افسوس سوگوار کیا تم نے کیا کیا
ناظر اسی دعا میں ہے دن ہو کہ رات ہو — احمد کو عمر خضر ہو تم کو نجات ہو

دستۂ گل

انتخاب غزلیات مشاعرہ منعقدہ شوال المکرم ۱۳۴۳ھ

اختر۔ جناب سید علی صاحب

شان تسکیں بھی نگاہ ناز قاتل میں رہے — اتنی آسانی تو یارب میری مشکل میں رہے
کیا قیامت ہے کہ وہ دشمن کی محفل میں رہے — جس کے ارمانوں کی اک دنیا مرے دل میں رہے
ڈوب جائے میری رگ رگ میں ادائے برق حسن — آتش عریاں کا عالم سوزش دل میں رہے
شوق کی دنیا میں ہو گرم عمل روح کشش — اور لیلیٰ بیخبر اے قیس محمل میں رہے
تنگنائے دل میں یوں اٹھتی ہے ارمانوں کی لہر — موج جیسے مضطرب آغوش ساحل میں رہے
گونج ہو جس کی فضائے روح میں سامان وجد — وہ ترنم جنبش تار رگ دل میں رہے
منزل ہستی میں اطمینان کامل کی تلاش — کیا کہیں اختر کہ ہم فکر باطل میں رہے

اطہر۔ جناب سید محبوب علی صاحب

ان کی شرم اور اپنی بیتابی سے مشکل میں رہے — وصل کی شب نکلے کچھ ارمان کچھ دل میں رہے
خود بخود کھچکر چلے آئیں جگر تھامے ہوئے — یا خدا اتنا اثر تو جذب کامل میں رہے
قتل کیجے شوق سے گر امتحاں منظور ہے — اسکی بھی حسرت نہ باقی آپکے دل میں رہے
اشک حسرت بنکے جو نکلے وہ نکلے تو سہی — دل کے چھالے بن گئے ارمان جو دل میں رہے
موت بھی آئے تو ایسے وقت آئے اے خدا — میری آنکھوں میں رہے وہ یا مرے دل میں رہے

قافلے والے کہاں سے جاکے پہنچے ہیں کہاں　　اور ہم بیدست و پا پہلی ہی منزل میں رہے
اٹھ کر ان کے شمع رُخ کو چھوڑ کر جائیں کہاں　　صورت پروانہ ہم جل بھن کے محفل میں رہے

امید۔ جناب سید شاہ علیخان صاحب جاگیردار

تذکرے اپنی وفا کے اُسکی محفل میں رہے　　جان دیدی پھر رہے تو کوئے قاتل میں رہے
وہ اداکس کام کی ہے جو نہ ہو جانِ ادا　　وہ وفا کس کام کی ہے جو وفا دل میں رہے
سر ہی کیا چکر میں ہے تقدیر بھی چکر میں رہے　　عشق کے قیدی سدا بند و سلاسل میں رہے
چاہنے والوں سے اتنی بیرخی اچھی نہیں　　تل برابر تو مروت آنکھ کے تل میں رہے
قیس میرا جذب لیکر آزمائے تو سہی　　میرا ذمہ ہے جو لیلیٰ اپنی محمل میں رہے
اب جگر میں درد ہے آنکھوں میں آنسو لب پہ آہ　　کچھ نہ تھا جس وقت تک ظالم کی محفل میں رہے
جو سلوک امید الفت میں کیا اچھا بُرا　　ظرف کہتا ہے حساب دوستاں دل میں رہے

باغ۔ جناب سید کاظم علی صاحب

جس کو میں چاہوں مرا ہو کر مرے دل میں رہے　　کیا قیامت ہے وہی دشمن کی محفل میں رہے
وقف ہیں دونوں مکاں بہر نگاہ ناز یار　　آنکھ میں آکر بسے یا منزل دل میں رہے
آمد و رفت نفس پیدا کرے نغمہ کی لے　　ساز ہستی کی صدا ہر جنبش دل میں رہے
یہ کبھی ممکن نہیں ہے دونوں گھر آباد ہوں　　دل میں اُسکے میں رہوں اور وہ مرے دل میں رہے
مرنیوالے جس کے اوپر بے تکلف مرمٹیں　　وہ ادائے خاص بھی انداز قاتل میں رہے
مدعا یہ ہے کہ درد دل نہ ہو دل سے جدا　　مدعی بنکر رہے لیکن مرے دل میں رہے
دوست کہتے ہیں اُسے جو کام آئے وقت پر　　باغ اپنا ہے وہی جو ساتھ مشکل میں رہے

تصور۔ جناب سید علی نواز صاحب آمانت خانی

شمع محفل بن کے ہم کب اُس کی محفل میں رہے　　ضبط سوز غم سے جو شعلے اٹھے دل میں رہے
اس سے کیا مجنوں تجھے لیلیٰ جو محمل میں رہے　　تیری لیلیٰ وہ ہے مجنوں جو ترے دل میں رہے
عشق کہتا ہے کہ حیرت حسن کی دل میں رہے　　حسن کہتا ہے کہ یہ آئینہ محفل میں رہے
حسرتیں ہوں یا ہوں ارماں رنج ہو یا ہو خوشی　　آرزو کا ہے تقاضا کچھ نہ کچھ دل میں رہے
یاد ایام یہ آنکھیں آنکھیں تھیں یہ دل تھا دل　　وہ انہیں آنکھوں میں پھرتے تھے اسی دل میں رہے
جسقدر عقدے کھلے اتنی تمنائیں بڑھیں　　مشکلیں جتنی ہوئیں آسان مشکل میں رہے

اہلِ عالم کو مبارک ہو کشاکش کار کی ۔۔۔ اے تصور ہم تو ساری عمر مشکل میں رہے

جوشؔ ۔ جناب نواب شبیر حسین خان صاحب (ملیح آبادی)

کم سے کم یادِ فنا انسان کے دل میں رہے ۔۔۔ کچھ مطلب زندگی کے حرفِ باطل میں رہے
اے فقیہ شہر بس! ساقی مجھے اک جام دے ۔۔۔ کیوں کوئی الجھا ہوا اوہامِ باطل میں رہے
دل وہ دل ہے شوق ہو جس کو کسی کے تیر کا ۔۔۔ سر وہ سر ہے جو تلاشِ تیغِ قاتل میں رہے
احترامِ ضبط و پاسِ وضعِ جانِ عشق ہے ۔۔۔ تازگی چہرے پہ ہو پژمردگی دل میں رہے
تجھ سے اتنی التجا ہے اے خدائے حسن و عشق ۔۔۔ جاگتے سوتے خلش سی اک مرے دل میں رہے
آہ کرنا جرم ہے خاموش رہنا مشتبہ ۔۔۔ مطمئن کس طرح کوئی تیری محفل میں رہے
ہر جُنوں کو سکھا دیتی ہے طرزِ گفتگو ۔۔۔ شرحِ غم کی وہ خلش جو مدتوں دل میں رہے
وائے بدبختی کہ اب دنیا کی یہ تعلیم ہے ۔۔۔ دوستی ہونٹوں پہ ہو اور دشمنی دل میں رہے
آہ وہ حرفِ تمنا جو نہ لب تک آ سکے ۔۔۔ ہائے وہ آسودگی کا ذوق جو دل میں رہے
رہرو فانی گزر اس طرح راہِ دہر سے ۔۔۔ راستے میں جسم ہو اور روح منزل میں رہے
کنجِ عزلت سے نکل طوفانِ غم کی زد پر آ ۔۔۔ خاک ہے وہ موج جو آغوشِ ساحل میں رہے
واقفِ اسرار بن اے کاوشِ دیدارِ دوست ۔۔۔ وہ نظر کے سامنے کیوں آئے جو دل میں رہے
ہو نہ ہو اے جوشؔ یہ بے چینیاں ہیں عشق کی ۔۔۔ ورنہ کیوں ہر وقت ہنگامہ سا اک دل میں رہے

ذہینؔ ۔ جناب سید خواجہ محی الدین صاحب

دل چلا پہلو سے شاید تیری محفل میں رہے ۔۔۔ یہ تھکا ماندہ مسافر اپنی منزل میں رہے
میری جاں دیکھو مجھے کیوں دیکھتے ہو آئینہ ۔۔۔ ہو اگر کوئی مقابل کا مقابل میں رہے
آتشِ رخ سے اڑا ہے جو سپند خالِ یار ۔۔۔ ہو مزا جب داغ بنکر یہ مرے دل میں رہے
تو غبارِ خاکساراں کو اڑا تو جب ہے لطف ۔۔۔ طوطیا بنکر یہ چشمِ ماہِ کامل میں رہے
تیرہ بختوں کو بلا سے کیوں نہ الفت ہو ذہینؔ ۔۔۔ قلبِ بسمل جبکہ زلفِ ماہِ کامل میں رہے

سرمدؔ ۔ جناب محمد عظمت اللہ خان صاحب

تیر اک وہ بھی شکستہ دستِ قاتل میں رہے ۔۔۔ ہائے میری آس یوں ٹوٹی ہوئی دل میں رہے
یا خدا آتے رہیں آزارِ الفت کے مزے ۔۔۔ کچھ جگر میں داغ ہوں کچھ درد بھی دل میں رہے
سوزِ فرقت نے مجھے کیا کیا عطا کیں دولتیں ۔۔۔ لب پہ کچھ چھالے رہے کچھ آبلے دل میں رہے

شباب۔ جناب صاحبزادہ نواب محمد معین الدین علیخاں صاحب

چاہیئے جیسا مکیں ہو ویسی منزل میں رہے
قیس کے دل میں ہو لیلی۔ تو مرے دلمیں رہے

مقصد دل دونوں جانب کے ہوئے پورے شوق
وہ رہے آباد گھر میں شاد ہم دل میں رہے

ہو رقم ہر قطرۂ خوں سے انا الحق صاف صاف
شان یکتائی کی ایسی رقص بسمل میں رہے

ضبط کے معنی یہ ہیں اے سالک راہ طرب
مسکراہٹ ہو لبوں پر گو الم دل میں رہے

بے عوض نکلا نہ کوئی دلکا خواہاں اے شباب
عمر بھر ہم سر بکف قاتل کی منزل میں رہے

واصفی۔ جناب مولوی محمد عبد الصمد صاحب

جب سے ہم شوق نگاہ ناز قاتل میں رہے
تیر بنکر دل کے سارے ولولے دل میں رہے

کچھ تو ہوں معلوم راہ عشق کی دشواریاں
خضر بھی اچھا ہے میرے ساتھ منزل میں رہے

دل ہمارا مضطرب یوں قلزم الفت میں ہے
جسطرح بیتاب کوئی موج ساحل میں رہے

سوز غم میں ضبط گریہ اور آفت ہو گیا
آبلے بنکر ہمارے اشک سب دل میں رہے

ایسے خود رفتہ ہوئے ہم اُسکے ناز و حسن سے
یہ نہیں معلوم خلوت میں کہ محفل میں رہے

رکھ لے اے شوق شہادت پردہ اتنا قتل کا
خون بھی چھپ کر مراد امان قاتل میں رہے

بیخودی میں ہوش ہو مجھ کو تو سمجھوں واصفی
وہ بسے آنکھوں میں میری یا مرے دل میں رہے

واقف۔ جناب مولوی داؤد علیخاں صاحب

اسطرح کینہ اگر صیاد کے دل میں رہے
کیا اسیری کی ہوس قلب عنادل میں رہے

حشر کے دن ہی سہی دیدار کا وعدہ تو ہو
اسقدر امید تو ٹوٹے ہوے دل میں رہے

لطف جب ہے راز پنہاں سے ہو واقف یاں
کچھ ترے دل میں رہے اور کچھ مرے دل میں رہے

دو ہی پہلو ہیں مری تسکین کے اے ناوک فگن
دل ترے پیکاں میں یا پیکاں مرے دل میں رہے

تیر برساتے تو ہو واقف کے دل پر تم مگر
چٹکیاں لینے کا ہی پہلو کوئی دل میں رہے

یٰسین۔ جناب مولوی غلام یٰسین خانصاحب قائم خانی

ایک مدت یاس و ارماں کیا مرے دلمیں رہے
دو مخالف مل کے باہم ایک منزل میں رہے

کچھ تو سرخی خون کی اور کچھ تو خنجر کی چمک
چشم بسمل میں رہے دامان قاتل میں رہے

مثل عاشق گر دل معشوق میں بھی عشق ہو
پھر تو لیلی دشت میں اور قیس محمل میں رہے

اے خیال یار تنہا تو ہی رہ جلوہ کناں
تیرے ہوتے غیر کوئی کیوں مرے دل میں رہے

فخر کیا یٰسین کیجے ہستی موہوم پر
ابتدا گل سے ہوئی تھی عاقبت گل میں رہے